

جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو

جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو

فرحت اشتیاق

فرحت اشتیاق



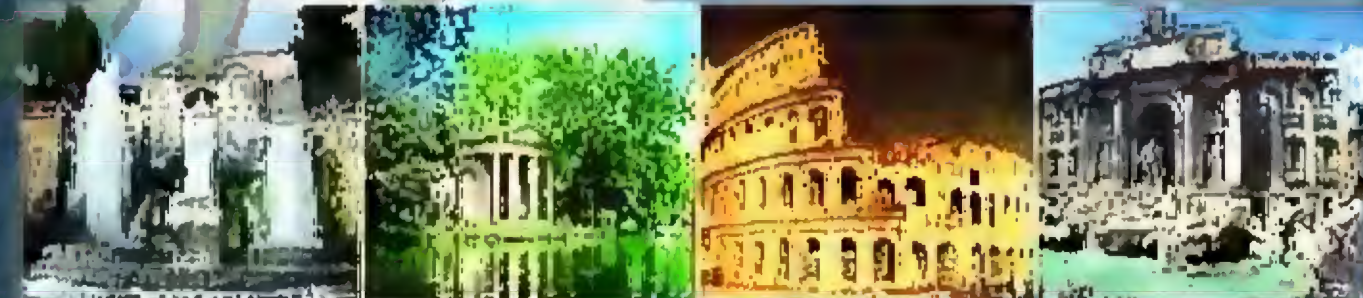
WWW.PAKSOCIETY.COM

جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو

والی کے شیر روم میں سکندر کی لیزا سے ہونے والی ملاقات کیا جنس ایک اتفاق ہے یا سکندر کی زندگی بھر کسی اتفاق سے درجہ ہوئے والی ہے؟ اپنے جس ماضی کو وہ برسوں پہلے دھن کہہ چکا تھا کیا وہ ایک بار بھر زندہ ہو جائے گا؟
کیا وہ تالین آڈرٹ لہ کی لیزا سکندر کی زندگی کے اندھیروں کو مٹانے اس کی زندگی میں آئی ہے یا بھراں اندھیروں کو پسٹانے؟
سکندر کو ہر رات نظر آنے والے خواب ایک خوابوں کا آئینہ اس کی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ وہ خواب کبھی نہیں ہو چکا تھا وہ زندگی سے نفرت کیوں کر کرتا؟ اور مر جانے کی خواہش کیوں رکھتا ہے؟
ہمارے نئی دور مائوٹی شیر روم سے شروع ہونے والی یہ داستان اپنے اپنے انداز میں سکندر اور لیزا دونوں کو ان کے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے پائے گی۔ وہ ماضی جہاں محبت، فقر، حسد، رقابت، اہمیت اور روشنی سب کچھ تھا۔ "جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو" محبت، حسد، اور رقابت کے جذبوں کے اثر و گنجشہ کی دل کو بے چین کر دینے والی داستان ہے۔

فرحت اشتیاق کے دیگر کچھ ناول

1. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
2. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
3. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
4. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
5. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
6. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
7. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
8. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
9. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو
10. جوتے کھینچیں سنگی سمیٹ لو



علی میاں پبلیکیشنز
فون: 37247414

E-mail: alimianpublications@yahoo.com



فرحت اشتیاق



یہ کون تھا؟ کون اس کی بے بسی پر ہنس رہا تھا؟
بے چینی سے گردن بدلتے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں غمایا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم پر ایک لبرؤس سی طاری تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد چاروں طرف نگاہیں گھمایاں۔ اسے اندھیرا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بند سائڈ میل پر رکھا۔ لمب روشنی کیا۔ لمب روشنی کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ہولے ہوئے لرز رہے تھے۔ لمب نے کمرے میں پھیلے اندھیرے کو کم عمر داتا تھا مگر اسے یہ روشنی ناکافی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اس اندھیرے اس شانے اور اس خاموشی سے وحشت ہو رہی

وہاں اندھیرا بہت تھا۔ بہت ناک سنا تھا۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلتا چاہتا تھا۔ وہ بھاگنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ ہاتھ پاؤں ہلانے میں رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے جاتا رہا تھا۔ کوئی تو آجائے اس کی مدد کے لیے۔ کوئی تو آکر اسے اس اندھیرے سے نکال دے۔ وہ رو پڑا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ مگر اس بہت ناک شانے میں اس کی آواز سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اسے اندھیرے سے روشنی ملنے والے جاتے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے روئے کی آواز میں کسی کے قہقہے کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

مکمل ناول



تھی۔ وہ بیٹہ سے اٹھا۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔
 اس نے سوچ بچو روڑے کے پاس آکر کمرے کی تمام لائٹس
 تھیں۔ یہاں تک کہ چھت پر لٹکا فافوس
 بھی۔ ایک بل میں کمرہ روشنی میں نہ آیا تھا۔ روشنی
 ہو جانے کے بعد اس کی وحشت تو ختم ہو گئی تھی مگر
 گھٹن کا احساس ابھی بھی تھا۔ وہ کمرے کے دوسری
 طرف کھڑکیوں کے پاس آیا۔ اس نے ایک ایک کمرے
 کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ چھت پر بھروسہ کمرے
 کا دروازہ کھول کر اپنے روم کی بالکونی میں آگیا۔ وہ بہت
 صبر سے مہری سانس لے رہا تھا۔ خود کو پرسکون اور
 نارمل کرنے کے لیے۔

جگہ نہیں بلکہ یورپ کے ایک خوب صورت ملک میں
ہے۔ دہلی میں سب وہاں وقت روٹھ کے ایک خوب
صورت اور شاندار ہوٹل کے برآمدے میں
ہے وہ ریٹک پر بازو جما کر کھڑا ہو گیا۔ یہ رات کا
آخری سہر تھا اس لیے سامنے نظر آتی سڑک پر لگاؤ
چھڑیاں گزرتی نظر آ رہی تھیں اس کا دل اتنی تک
گھبرا اٹھا۔

آخر یہ خواب اس کا چچا چھوڑ دیوں نہیں دیتے؟
 برس برس ہوئے اس نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا
 تھا۔ اسے سوئے سے خوف آیا کرتا تھا۔ بول لگتا تھا
 اوھر وہ سوئے گا، اوھر کچھ نہ کچھ بُرا ہو جائے گا۔ نیند
 سے فرار کی یہ کوششیں اتنی کامیاب ثابت ہوئی تھیں
 کہ اب جب وہ خواہو، کو ایک مضبوط اور توانامرد سمجھتا تھا؟
 یہ سمجھتا تھا کہ اسے کسی بھی چیز سے ڈر نہیں لگتا، وہ
 رات کو یہ مسکون نیند سونا چاہتا تھا۔ تب اسے نیند لاکھ
 کوشش کرنے پر بھی نہیں آتی تھی۔ وہ
 insomnia (بے خوابی) کا مریض ہو گیا تھا۔ وہ پوری
 پوری رات نیند کے آبلے کی کوششیں کرتے گزار
 دیا کرتا تھا۔ جب اس کیفیت کو بہت راتیں گزر جائیں
 تھیں نہ ہونے کی وجہ سے دن کے اوقات میں
 سونات زندگی سمار ہوئے سے غور و غریب جوڑ رکھو
 گویا لے لیا کرتا تھا۔ ان گولہ لٹکے ساتھ نیند اسے آجاتی

تھی۔ مگر غیبا رہنے ساتھ بہت سے ڈرائے خواب
 بھی لے کر آئی تھی۔ غلط سوچنا تھا کہ وہ خوابوں سے
 نہیں ڈرتے۔ وہ تو کن خوابوں سے آج بھی استغاثہ ڈرتا
 ہے۔ جتنا بارہ سال پہلے ڈرتا تھا۔

چند منٹ گھڑی گھڑی سانس لینے کے بعد تھکن کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بدن کی لڑزش بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی سو وہ ابیس کر بے میں آ گیا۔ اس نے ٹھنکیاں اور بالکونی کا دروازہ اسی طرح کھلے رہنے دیے تھے۔ وہی وہی آواز آتی کر کے بیٹھ بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے اپنے گرو آواز میں چاہے ہے نہیں سوہ ایک کے بعد ایک قبیل قبیل تبدیل کر رہا تھا۔ نا ایلن میں آتے ہی ہر گرامر اسے قطعاً ”جیجی“ میں ملے۔ آ رہے تھے

ہجر و پھر بھی انہیں سنا دیا جتا تھا۔ اب اپنے اندر کی
و شست اور سنا نامٹائے کو باقی رات اس نے سنجی کام کرتا
تھا۔ فونڈی کی بے شمار آوازوں کی طرح یہ رات بھی جاگ
نکرنے لگا اٹھا کر پتہ ہوئے گزراں بھی۔

صبح وہ ایک نارمل انسان کی طرح آفس روانہ ہو گئی کے لیے تیار تھا۔ یوں جیسے رات کچھ ہوا ایسا نہ ہو۔ بہترین تراشی خراش والے سوٹ میں لباس پہننے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک عجیب مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ اس کی یہ تیار ہو کر دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خود سے اور نہاری دنیا سے نفرت میں مبتلا ایک انسان ہے۔ وہ اندر سے ٹھوکتا ہو چکا ہے۔ یہ سوٹ، یہ ٹائی، یہ سلیف سے جینا، یہ ٹائی، یہ کف لنکس اور یہ بہترین جوئے دیکھ کر کون سوچے گا کہ وہ مسترد و شرماء self destructive (خود) (خود) suicidal temperament (خود) کشی کا رجحان رکھتا ہے۔ خود پر سے نفرت اور حقارت کی نگاہیں، ہٹاؤ، شے کے سامنے سے ہٹنا اس نے کرنا بلکہ ایگزبرف کیس کیا لپ ناپ بلک میں یہ پاپ ریسرچ ہے۔ اس نے اسے ہر اس ویا ویتوریا وینٹو via vittorio veneto اس کا ہو گیا۔

سے اس کا واسطہ پڑا تھا ان سے کل اور آئی رکی
ہائے جیلو کے بعد اس کی صرف اور صرف پروٹیشن
قومیت کی کھنگو ہوئی تھی۔ کام کی بات مکمل پیشہ ورانہ
انداز میں۔

شام کے پانچ بج رہے تھے استے میل سے جا کر
کچھ نہیں لیا تھا۔ اپنے ہوٹل روم میں بند ہو جانا تھا یا
شاہ روم کی گلیوں کو چال میں تھا پڑنا تھا اور اس میں
سے کوئی کچھ چیرا جس کے لیے ایسی کشش نہ رکھتی تھی
کہ وہ آفس سے جلدی اٹھنے کی خواہش رکھتا۔ مگر
چونکہ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ ایک ایک کر کے سارا
آفس خالی ہو رہا تھا سو وہ بھی آفس سے نکل آیا تھا۔

تہہ سچہ ہی ناقص رہتا جبکہ اس کا آفس barberini
vin تھا۔ گویا آفس اور اس کے ہوٹل کے بیچ میٹرو
نے اس ایک ہی اسٹاپ کا فاصلہ تھا۔ مگر کل جب وہ
کل سے آفس پہلے دن گیا اور آفس کی گاڑی نے
اسے ایک کیا تب محض ایک اسٹاپ کا یہ فاصلہ طے
لڑنے میں اسے سو گھنٹہ لگ گیا تھا۔ دنیا کے تمام
بڑے شہروں کی طرح ٹریفک جام روم کا بھی مسئلہ تھا۔
تب کل ہی اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ آئندہ وہ آفس
نیو یارک میں جایا آ کر رہے گا۔ اس کے لیے یہ کوئی ناک کا
مسئلہ نہیں تھا۔ روم کا انداز مگر اؤڈن ٹرین سسٹم لندن یا اور
یورپ میں جتنا مربوط تو نہ تھا مگر پھر بھی ٹریفک جام میں جھنسنے
سے بدتر تھا۔ پھر آفس جانے آنے کے لیے لی
گاڑی اور ڈرائیور والی سہولت کو اس نے پہلے دن ہی
خیر یاد کر لیا تھا۔

میٹرو اسٹیشن پر روش کا حصہ بننا وہ بھی ٹرین میں سوار
ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ارد گرد کھڑے اور بیٹھے ہوئے رومن
مردوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر کو
اپنے کام پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ مگر اس جلدی اور
ہنگامہ بازی کے باوجود بھی ان میں سے کوئی
ایک بھی اسے ایسا نظر نہیں آ رہا تھا جو خوش لباس نہ
ہو۔ فیشن اور اسٹائل رومنوں کے لیے ایک بہت
مہمیاں بات ہے۔ عورتوں کے لباس ان کا ایک لب
پہنڈ بیٹھو، میڈلر، مردوں کے سوشل ٹائپیں جوئے
بلیٹ کیس، ہر کچھ فیشن کے عین مطابق تھا۔ بے حد
اسٹائلش تھا۔ ٹھیک ہی کہا جاتا تھا کہ رومن بڑے
classy اور اسٹائلش لوگ ہوتے ہیں۔ اسے اگلے
دن اسٹیشن پر اترتا تھا۔ اور اس کا اسٹیشن فوراً ہی آگیا
تا۔ barberini via پر میٹرو اسٹیشن سے بہت
نزدیکی اس کا آفس تھا۔

یہ اس کی ادب میں اپنا ہیڈ آفس رکھتی ملٹی نیشنل
کمپنی کا جنرل یورپ میں واقع ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ آفس
آپنا تھا۔ وہ جن رومنوں کی اشجاء میں سے کہے یہ رہاں بھیجا
گیا تھا ان میں مصروف ہو گیا تھا۔ آفس میں جن لوگوں



طرح کے مشرومز کا اضافہ چاہتا ہے 'pomodoro' چاہتا ہے۔ نجانے وہ اسے کیا کہا اٹھا اٹھا کر دکھا رہے تھے ساتھ ان اشیاء کے نجانے کیا کیا اٹالین نام لے رہے تھے۔ وہ دونوں محل سے لے وقت دے رہے تھے۔

وہ اس بے کار کی مشقت سے بیزار ہو گیا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے ہوٹل جا کر کھانا کھائے۔ جہاں انگریزی سمجھی جاتی ہے اور بولی بھی جاتی ہے۔ قریب تھا کہ وہ انگریزی ہی میں ان دونوں کا شکر ادا کرنا وہاں سے پلٹ جاتا کہ اچانک بن بالکل پیچھے والی میز سے اٹھ کر ایک اٹالین لڑکی اس کے پاس آئی۔

"may I help you" (میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں) یہ بڑی شستہ انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئی تب اس نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ اتنا وقت یہاں کھڑے ہو کر ہوا کر چکا تھا تو اب یہاں سے کھانا کھا کر ہی جانا چاہیے۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

وہ ابھی اس لڑکی کو انگریزی میں یہ سمجھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ کس طرح کا بڑا آرڈر کرنا چاہتا ہے کہ وہ بڑی روانی سے گٹ بہت گرمی سامنے کھڑے مرد و خاتون سے اٹالین میں چند چلے ہوئی۔ چلے اگر الفاظ تو زور زور سے بھی بولے گئے ہوتے تب بھی اس کے سر کے اوپر ہی سے گزرتے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی عورت "اے" کہتی مسکراتے ہوئے اندر چلی۔ کچن میں چلی گئی تھی جبکہ مرد اس اٹالین لڑکی سے اٹالین ہی میں کچھ بات کرنے لگا تھا۔ وہ زبان غیر میں باتیں کرتے ان دو افراد کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ مرد کے مسکرا مسکرا کر اپنی طرف دیکھنے سے اتنا اندازہ اسے ہو رہا تھا کہ گفتگو اس کی بہت ہو رہی ہے۔

"یہ آپ سے معذرت کر رہے ہیں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔"

لڑکی اب اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ لویا اٹالین جملوں کا انگریزی ترجمہ خواہ وہ بیان کیا گیا تھا۔

اسے راستے کا دل میں کچھ اندازہ ہو گیا تھا اور اس کی جیب میں روم کا پرا جامع نقشہ بھی موجود تھا گویا راستہ بتانے کا امکان نہ تھا چنانچہ بجائے میٹرو اسٹیشن کی طرف جانے کے اس نے پہل اپنے ہوٹل تک جانے کا فیصلہ کیا۔

یہ جون کا مہینہ تھا اور روم میں موسم خاصا خوش گوشت تھا۔ سورج آج کل قریباً پونے نو بجے غروب ہوا کرتا تھا سو ان دونوں یہاں شاملیں بڑی بسی تھیں۔ وہ *via veneto* سے *via barberini* کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد قدم بھارتیں تھیں، نواریں تھیں مگر اسے روم کی ہسٹری میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ابھی بھی اس خواب کے حصار میں تھا۔ اب اگلے کئی روز اسے اس خواب کے حصار ہی میں رہنا تھا۔ اور لگنے لگی دن خوف کے سبب سوئے نہیں تھا۔

اس نے آج صبح نہ تو ناشتا کیا تھا نہ ہی وہ پیر میں لیج۔ تیس میں خالی پیٹ کافی کے تین کپ ضرور پیئے تھے۔ اسے سرک کے کنارے ایک *pizzeria* نظر آیا تب اسے اپنے آج تمام دن کچھ بھی نہ کھانے کا احساس ہوا۔ وہ یہاں سے برا کھانا ہوا چلا جائے پھر ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر رات گئے تک سنا آفس کا کام کرنا رہے گا اس نے دل ہی دل میں طے کیا۔ ابھی چونکہ ڈنر ٹائم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس چھوٹے سے ریزیا میں اسے میزوں پر دو چار لوگ ہی بیٹھے نظر آئے۔ وہ اپنا بڑا آرڈر کرنے کاؤنٹر پر آ گیا تھا۔ مگر اٹالین میں اٹالین بیٹھے بغیر اپنے لیے کچھ آرڈر کرنا اس قدر مشکل کام ہے کہ اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

بڑا آرڈر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو تقریباً دس منٹ گزر گئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے درمیان عمر کے اٹالین مرد اور عورت انگریزی سے گفتگو کر رہی تھیں۔ وہ دونوں مرد و عورت خوش اخلاقی سے مسکرا مسکرا کر اس کے انگریزی لفظوں کے جواب میں حلف مہیا تھا اور اسے دھار رہے تھے۔

اچھا وہ اپنے پرا کی یہ *topping* چاہتا ہے، فطال

چاہئیں۔ اس کے لیے senza کا لفظ استعمال نہ کیجئے۔
 یعنی آپ کہیں گے senza situati vino۔
 وہ مسکرا کر اسے بتا رہی تھی۔ غالباً اسے بلاوجہ اور
 بات بے بات مسکراتے کی عادت تھی۔ اسے
 جتنے جتنا ہنس رہی تھی۔ اس وقت اس کا کسی سے بھی
 خوش اخلاقی رکھانے اور گفتگو کرنے کا موزن تھا مگر اس
 سے مدد لینے کی حماقت کر رہا تھا۔ اس کا غمزہ نہ تو جھٹکا
 ہی تھا۔ اس نے سنجیدگی سے صرف اس کی بات سنی
 تھی۔ جواب میں کچھ بھی نہیں بولا تھا مگر اس نے اپنی
 لڑکی کو اس کے کچھ بولے بولے سے یقیناً کچھ
 فرق نہیں بڑھا تھا۔ وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے اسے
 مزید بتا رہی تھی۔

"انہیں زیادہ مشکل زبان نہیں ہے۔ انہیں کے
 بہت سے لفظ تو آپ یقیناً پہلے ہی سے جانتے ہیں۔"
 "papuccino espresso gelato pasta"

pizza cafe solo paparazzi

وہ اپنی آنکھوں پر لگے اسٹائلش گھاسڑ کو ہاتھوں سے
 سین کرتے ہوئے بولی۔ وہ چھپچھپ سناٹا میں سال کی
 ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے بلیک ٹرک کی کپڑی
 پینٹ ٹریڈ کلر کے اسٹائلش ٹاپ کے ساتھ بکس ریشی
 تھیں۔ اس کے سٹکی ہاں سرخ مائل براؤن ٹرک کے
 تھے اور اس نے ان کی اونچی کر کے بولی بنا رہی
 تھی۔ لہولہ بر سرخ رنگ کی لپ اسٹیک لگی تھی۔ اس
 کے خوب صورتی سے تراشے ناؤں پر سرخ رنگ کی
 نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے بلیک فریم والے
 اسٹائلش اور فیشن کے مطابق گھاسڑ لگا کر ہاتھ پٹیل
 رہا تھا۔ گھاسڑ ڈیزائن گھاسڑ ہیں۔ شاید اربابی کے یا کسی کی
 ٹرک کے کسی اور ڈیزائن گھاسڑ کے۔ بڑے تھام انڈینز کی طرح
 فیشن اور اسٹائل یقیناً اس کے لیے کبھی بے حد اہمیت
 رکھتا تھا۔ اس کے انداز شاہانہ تھے اور اس کی شخصیت
 میں ایک وقار تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھ سامنے لٹکی
 اس سے گفتگو کر رہی تھی تو بغیر کسی اونچپنی کے فی سنی
 پر وہ اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"میں نے تب کیا آؤڈر کر دیا ہے۔ اصل میں
 میں اس ٹیبل پر بیٹھی تھی اور آپ لی ساری بات سن
 رہی تھی۔"

اس نے کاونٹر کے قریب نرم میز کی جانب اشارہ
 کرنا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس میز کی طرف
 دیکھا۔ وہاں اس لڑکی کا چند لمحے پہلے کھانا پڑا اور کولڈ ڈرنک
 کالہن جیوا گلاس رکھا ہوا تھا۔

"تھینکس!" اس نے پر تکلف انداز میں سنجیدہ
 سی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سا ٹھکرا کر لیا۔

"آپ کے براؤں میں کسی بھی طرح کا میٹ نہیں ہوتا
 چاہے بہت اٹاک بھی نہیں ہونا چاہیے اور وہ ان
 تھی نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کو بالکل سادہ مشرو مزار
 سبزی والا پڑا چاہیے۔" وہ مسکرا کر اس سے بولی۔

"میں انڈین ٹیکس آگین" اس بار اس نے یہ الفاظ
 سنجیدگی سے کہے۔

"مالی ہلڈز" وہ خوش اخلاقی سے مسکرائی۔

"آپ ملے یہ کر دیکھتے ہیں پڑا بنا رہا ہے۔ جس
 سے بدردہ منٹ لگیں گے۔ تب تک آپ بیٹھ
 جائیں۔" وہ ملے پے کرنے کے بعد اپنے لیے کوئی اور
 میز منتخب کر کے وہاں بیٹھنے کے ارادے سے مڑا تھا۔ وہ
 لڑکی بھی اس کے ساتھ کاونٹر پر سے ہٹ چکی مگر جیسے ہی
 کاونٹر سے ہٹ کر وہ اس لڑکی کی میز کے قریب پہنچے وہ
 اس سے بولی۔

"آپ بیٹھئے۔" اس نے بالکل ابھی ابھی اس کی مدد
 کی تھی۔ فوراً "بدا اخلاقی دیکھا کر بیٹھنے سے منع نہیں
 کر سکتا تھا۔ ہاں، اب میں اسے یہ پیش کش اور بے
 نیگانی گراں گزری تھی۔ سہرا حال وہ مجبوراً اور مردانہ
 اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا" بے حد پر تکلف
 انداز میں۔

"ٹیکسٹ" ہم آپ کو اپنے کچھ آؤڈر کرنا ہوا
 کہیں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے رہے ہوں
 اور ان کے اجزا دیکھنا چاہیں تو پودک کے لیے
 strutto کا لفظ یاد رکھیے اور وہاں کے لیے vino

کر رہا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ سے بین تھی۔

"Grazie signore alberto"

البرٹو مسکرا کر آہواہواں سے پلٹ گیا تھا۔ "Grazie" شکر یہ کہ وہ کہتے ہیں یہ تو براہ کرم کا مطلب ہے آپ کو؟

"جی۔" اس کے طویل جملوں کے جواب میں اس کے چہرے ایک یاد الفاظ سے زیادہ طویل نہیں تھے۔

"البرٹو اور سلویا میاں ہوئی ہیں۔ البرٹو میں چھوٹی سی قسبیاں جب سے یہ دونوں یہ پریریا چلا رہے ہیں۔" جن معلومات کے حصول میں اسے قطعاً کوئی

وجہ تھی وہ اسے وہ فراہم کر رہی تھی۔

اس کے بڑی صحبت سے چھپا چھپانے کا واحد طریقہ اسے یہ سمجھ میں آیا کہ اپنا پراکھانا شروع

کر دے۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اس سے معذرت کر کے یہاں سے اٹھ جائے گا۔ سکندر کو کھانا شروع

کرتے دیکھ کر اس نے بھی اپنا ٹھنڈا ہو چکا پراکھانا شروع کر دیا تھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا کہ پراکھانے پریریا آئے ہیں۔ آپ کو صحیح معنوں میں اٹالین پراکھانہ مرانا ان

پھونے پھونے پریریا میں ملے گا جو بڑے ہو طوں میں نہیں مل سکتا۔ رومن پراکھانہ خاصیت یہ ہے کہ اس کا

کرسٹ (crust) بڑا ہوتا ہے اور اٹالین پیرکاجو مرانا آپ کو اس میں ملے گا کہ کس اور نہیں مل سکتا۔

انکی سے باہر دیگر بیشتر ممالک میں جو پراکھانہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں وہ عموماً "پراکھانہ امریکن ہرٹون

ہوتا ہے۔ ان بے چاروں نے کبھی اصل اٹالین پراکھانہ کا مواجہ نہیں چکھا ہوتا" اس کے وہ اسی پر خوش

ہو جاتے ہیں۔"

وہ اس طویل گفتگو میں دلچسپی رکھتا بھی ہے یا نہیں، اسے پراکھانہ اور امریکن فرق معلوم کرنے میں

کوئی دلچسپی ہے بھی یا نہیں اس سے بے نیاز وہ کھانے ہوئے مکالمے بولنے میں مگن تھی۔ اس کی

انگریزی بڑی رواں اور شستہ تھی۔ اس کا لہجہ پرفتن تھا۔ مگر پرفتن اس کی انگریزی میں کسی کہیں اٹالین تلفظ

کی جگہ نہ تھا۔ شوق سے وہ اس کی وہ پراکھانے

ہوئے کچھ سوچ کر مسکرائی تھی۔

"اتنی دیر سے آپ کے ساتھ بیٹھی ہوں اور میں نے اپنا تعارف بھی نہیں کروایا" وہ جواباً خاموش رہا۔

پراکھانہ لیتے ہوئے اس نے شخص خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔

"میں لیڑا ہوں۔" وہ اب اس کی طرف سے نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ بھی اپنا تعارف کر لے۔

"سکندر۔"

"نورسٹ (سیاح) ہیں؟ روم چھوٹے آئے ہیں؟"

"نہیں" آتش کا کام ہے۔"

اب قبل اس کے کہ اس کا مزید تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے گفت و شنید جس میں اسے رتی برابر بھی دلچسپی نہ تھی مزید بات کی طرف

جاتی کہ اسے پراکھانہ آخری لقمہ کھا کر چھری اور کانا میز پر رکھتے ہوئے اس سے بولا۔

"آپ کا بہت شکریہ لیڑا! آپ نے میری مدد کی۔ اب میں چلا ہوں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے زبردستی چہرے پر مروت اور شائستگی کی مسکراہٹ سجائی۔ وہ جواباً خوش دلی سے مسکرائی

تھی۔ اس نے چھری اور کانا پلیٹ پر رکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا

"چاز (ciao) سکندر۔ آپ سے مل کر خوش ہوئی۔" سکندر نے اس کا ہاتھ ہاتھ مصافحے کے لیے

تھام لیا تھا۔

"چاز لیڑا۔" اس نے بھی اٹالین ہی انداز میں اسے خدا حافظ کہا، چہرے پر خوش اخلاقی والی ہلکی سی مسکراہٹ رکھتے۔

وہ اپنے ہونٹ کی طرف جانے والے راستے پر رواں تھا۔ وہ پتھروں سے بنی کئی سو سال قدیم اسٹریٹ

سے گزر رہا تھا۔ ارد گرد کئی کئی سو سال پرانی عمارتیں تھیں۔ اس سڑک پر بھی ایک فوارہ تھا۔ ایسا لگتا تھا

روم کی ہر سڑک ہر جگہ میں ایک فوارہ تھا۔ کئی جگہ یہ شخص خوب صورتی کے لیے تھے اور کئی جگہ پانی بہنے

لے لیے۔

کریں۔ نہ چہ سابقہ پھر نوک ملک سنوارنے کا کام گھر پر
لےئے اسٹوڈیو میں کرنا تھا۔ یعنی نے اسے بہت تاکید
کرتے سمجھا تھا کہ وہ گھر سے بغیر کھانا کھائے جا رہی ہے
مگنا اینٹنگ شروع کرنے سے پہلے کہیں باہر سے بچ
کر لے مگر کام کی دھن میں اسے کھانے پینے کی
خواہش ہوا ہی نہیں کرتی تھی۔ یہاں وہ سر میں دکانیں
اور بار بند ہو جاتے تھے اور لوگوں کی آمد و رفت بھی
تدریس کم ہو جاتی تھی۔ سو یہ وقت لے اینٹنگ کے
لیے اچھا لگا کرتا تھا۔

نانچ بچے کے قریب جب وقت کی چٹنی ہونے لگی
اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تو اس نے اپنا
پور ٹیبل ایل اور دیگر سامان میٹ کمرگاہی میں رکھا
تھا۔ سال کے ان مہینوں میں جب وہ دم میں ہوتی
تھی تب اسے یہاں اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنا اچھا
لگا کرتا تھا۔ ان یادوں میں الزبتھ اور سلوا کا پریرا بھی
شامل تھا جب ہی وہ اکثر دسٹر یہاں پر اکھائے چلی آیا
کرتی تھی۔ اپنے بچپن میں وہ یہاں کتنا آتی تھی۔ اس
نے گاڑی پر سیریا کے پاس لاکر روکی تھی کہ وہ اندر آگئی
تھی۔

اندر آتے ہی اسے ایک میز پر وہ بیٹھا نظر آیا تھا۔ وہ
جس سے وہ کل یہاں پر ملی تھی۔ سکندر مجو شاید
پاکستان تھا یا شاید انڈین۔ خاموش خاموش سا اپنے
آپ میں گم سا۔

وہ آرٹ تھی اور اسے حسن سائز کرتا تھا۔ اور وہ
فخض مردانہ حسن اور دجاعت کا مجسمہ تھا۔ اس کا چہرہ
نٹ سے نقصانہ مضبوط جسم مجو ڈائمنڈ گھٹے سیاہ بال
جن میں بکاساٹھ تھا۔ اس کی پوری شخصیت اس کے
چہرے کا ہر نقش مردانہ دجاعت کا شاہکار تھا۔ گہری سیاہ
آنکھیں جن میں مقناطیسیت تھی ایک حزن تھا
اور اسی تھی اور ایک اسرار تھا۔ اس کے ہونٹوں کا لٹاؤ
بڑا خوب صورت تھا اس کا نچلا ہونٹ اوپر ہی ہونٹ
سے زیادہ بھرا بھرا تھا اس کی پیشانی بہت چمکی لگی تھی۔
ناک آریائی نسل کے کسی فرد کی طرح بالکل سیدھی
اور لمبی تھی۔ کل اس سے ملنے کے بعد جب اس نے

دوبارہ اس اور سترہویں صدی میں پائے گئے یہ زمانہ
ترانے میں لوگوں کی پالی کی ضروریات پوری
کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

بغیر رات بچکے وہ اپنے ہوٹل تک پہنچ گیا تھا۔ اس
کے ہوٹل کی بلڈنگ بھی سولہویں صدی میں کسی
رومن بادشاہ کے لیے بنایا گیا ایک محل بھی جسے بعد
میں نے سربے سے تھیر کر کے اس ہوٹل کی شکل دی
گئی تھی۔ ہوٹل میں تمام تر جدید اور جدید ترین
سہولیات موجود تھیں مگر اس طرح کہ اس کی اصل
شکل اور تاریخی حیثیت بھی برقرار رکھی گئی تھی۔

کھانا وہ کھا کر آچکا تھا۔ اب رات گئے تک اسے خود
کو آفس کے کاموں میں مصروف رکھنا تھا۔ اس نے
دوم سروس کال کر کے اپنے لیے کالی منگوائی تھی۔ اور
خود کو کاسینو میں غرق کر لیا تھا۔ وہ گہری رات کے
خواب کو آج کسی بھی فیسٹ پر سوچنا نہیں چاہتا تھا۔



وہ دسپرسے گھر سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ آج کل
via barberini کے پاس ایک زلی کی سوسائٹی
قدیم پتھروں سے بنی ایک زلی سڑک اور اس سڑک پر
موجود سولہویں صدی میں بنائی گئی چنڈیلڈ گلو کو پینٹ کر
رہی تھی۔ وہ اپنا ایریل گیمونس پینٹ اور برش لے کر
دن کے ان اوقات میں وہاں لوگوں کی زیادہ آمد و رفت
نہیں ہوا کرتی تھی، محبوب وہاں آجایا کرتی تھی۔ اس نے
ہر ہر زاویے سے وہاں کی گئی تصاویر دیکھ کر رکھی تھیں۔
وہ ان تصاویر کی مدد سے بھی اس جگہ کو پینٹ کر سکتی
تھی۔ مگر ایک تو اسے کسی بھی لینڈ اسکیپ کو اس کی
اصل جگہ پر موجود رکھنا پڑے گا۔ اس میں مزہ آتا کرتا تھا
اور وہ سرت اسے اپنے وہم کی گلیوں میں وقت گزارنا
اچھا لگا کرتا تھا۔ اگلے ماہ کے آخر میں فلورنس میں اس
کی پینٹنگز کا سولو شو تھا۔

اس بار اس کا موضوع رومن لینڈ اسکیپ تھا۔ کچھ
لینڈ اسکیپ بھی اسے پینٹ کرنے تھے۔ چار پانچ دن
لگ کر اس کو اس پینٹنگ کے خود غافل یہاں آکر واضح

اس کا لہجہ یا لٹاکا بد تیز و زور والے نہیں تھے نہ سرخسنگ اور سیاٹ ضرور تھے سو اس کی وہاں موجودگی سے بے نیاز سرخسنگ کرو بارہ کھانا کھا رہا تھا۔ اپنی اس عزت افزائی پر اس کے چہرہ بلیق روشن ہو گئے تھے۔ شرمندہ سی ہوئے وہ ایک مہربان خوشی سے اس کی میز کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ شرمندگی اور غصہ محسوس کرتی وہ کلاؤن پر آکر البرٹ سے بات کرنے لگی تھی۔

البرٹ کو یہ جانے کی تو ضرورت نہیں تھی کہ اسے کیسا بڑا چال ہے سو وہ یہاں آکر ہوش ایک ہی طرح کا پڑا کھا رہی تھی۔ البرٹ نے اسے ہیلو اور خیر و خالیت دریافت کرتے اس نے سر کر دیا تو جس میز پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اب خالی تھی۔ وہ اپنا کھانا ختم کر کے وہاں سے جا چکا تھا۔

وہ اس کی بد اخلاق اور بد تمیزی پر حیران تھی۔ لگتا تو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ پھر اس درجہ بد تمیزی؟ وہ حیران بھی ہوئی تھی اور اس کا مود بھی خراب ہوا تھا۔ یہ خراب مود اس وقت مزید خراب ہو گیا تھا جب گھر آتے ہی اس نے نوٹوں کی کال ریسیو کی۔ اپنی ہاں سے بات کرنا اس کے لیے بھی کچھ بھی خوش گوار ثابت نہیں ہوا کرتا تھا۔ سو ایسا ہی آج بھی تھا۔ پہلے منٹ اس کی ضرورت پوچھنے اور اس سے محبت کا اظہار کرنے کے بعد اپنے منٹ وہ اپنے اصل مقصد اور کام کی بات پر آگئی تھیں۔

”ہیں rehab centre (معالجہ صحت سینٹر) سے آئی ہوں۔ اب اپنی ساری زندگی بالکل کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ چھ کچھ پیسے چاہیں لیزا۔ جیسے ہی مجھے جاب ملے گی میں تمہارے پیسے واپس کر دوں گی۔“

اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ آئی تھی۔ محبت میں پیار میں یا آئے پر وہ کبھی بھی یاد نہیں کی جاتی تھی۔ جب پیرس کی ضرورت پیش آئی تھی تب یاد آیا کرتی تھی۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اس کی ہاں کی اپنے چوتھے شوہر سے بھی گزشتہ سال طلاق ہو چکی

اس کے بارے میں یہ سب سوچا تب خود ہی نہیں بھی بڑی تھی۔ وہ واقعی کئی کئی آرٹسٹ تھی۔ اسے راستے میں ملتے آتے جاتے لوگوں کو بھی بغور ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت تھی۔ گھر جا کر اس کی بیٹی سے عکس شپ ہوئی پھر سیم کا فون آگیا اور وہ اس غیر معمولی مردانہ حسن و وقار سے چہرے کو بھولی گئی۔ مگر اس وقت اسے دیکھ کر اسے وہ پھر سے یاد آگیا تھا۔ کیا خوب ہوا اگر وہ اس چہرے کو بینٹ کر منٹ

وہ خوش دل سے مسکراتی اس کی میز کے نزدیک آگئی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنا برا کھانے میں مصروف تھا۔ جلدی جلدی جیسے کھانے کو انجوائے نہ کر رہا ہو۔ بلکہ کوئی ضرورت پوری کر رہا ہو۔ وہ اس کے پاس آگئی تھی۔

”سینور مسکند رہا“ اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا۔

”چچاؤ (ciao)“ جواباً مسکرایا نہیں تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچان نہ ہو۔ صرف ایک دن میں تو کوئی کبھی کو نہیں بھول سکتا۔ وہ اپنی دل میں حیران ہوئی۔

”کیسا لائق ہے۔ ہم آج پھر ایک ہی وقت پر یہاں موجود ہیں۔“ وہ فرمایا ”مسکرا کر بولی۔“

وہ ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل سی لڑکی تھی۔ وہ جواباً اسے خاموش اور اجنبی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

جب اس نے مروا ”اور اخلاق“ بھی اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت نہ دی تو کچھ ڈھیٹ بن کر اس نے خود ہی پوچھا۔ کیا واقعی وہ اسے نہیں پہچانتا تھا؟ کل وہ اپنی دہر تک ساتھ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ساتھ بیٹھ کر اکٹھا کھانے اس کا پڑا آرڈر کرنے میں مدد کروانے کے لیے اس نے اپنا پڑا نمونہ اس کے ہوجانے دیا تھا۔

”یہاں کئی لوگ میری خالی ہیں۔ آپ وہاں بیٹھ جائیں۔“ وہ سنجیدگی سے اسے گھرا صاف انداز کر کے بارہ سر جھک کر کھانا کھانے لگا تھا۔

تھمب اور اس درجہ شراب نوشی ہی کے سبب آکٹون ان کی باز دست ختم ہو جا کر رہی تھی۔ پچھلے پانچ سالوں میں وہ پانچ ہی مرتبہ علاج کے لیے جا چکی تھیں۔ ہر بار وہاں سے واپس آکر اس عہد کو ہرانی تھیں کہ اب شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگا میں کی عمر چند ہفتے بھی نہیں گزر رہا ہے۔ اتنے میں اپنے عہد پر قائم رہے۔

لے دو ٹوہرا سے کوئی خرچ کیا کروں بات کرنا بے معنی محسوس ہوا تھا۔ لڑ تو وہاں جاتا ہے جہاں کچھ امیدیں ہوتی ہیں۔ غمگین ہوتی ہیں۔ اس کو اپنی ماں سے کبھی ملے اور میری والدہ لائق رہا ہی نہیں تھا۔ جب اس کے پاپا سے انمول نے طلاق نہیں لی تھی جب وہ سب ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ خود تو تب بھی کبھی اسے اپنی ماں نہیں دیکھی تھی۔

”میں میسجنگو ایلنگی۔“

ڈوہرا میلان MILAN میں رہتی تھیں اور سالوں کے جن مہینوں میں ان کے پاس نوکری نہیں ہوتی تھی تب وہ اس سے اسی طرح فون پر رابطہ کیا کرتی تھیں۔ اسے غصہ بھی تھا وہ بھی کبھی ٹھیک ٹھیک اس نے کھلی ہی آن لائن اپنی ماں کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلوادینے تھے۔ ”میری بھینجے بھوک نہیں ہے۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“

دو بجے میں ڈنر کی تیاری کرتی تھی کو اطلاع دیتی اور اپنے اسٹوڈیو میں آگئی جی۔ یہ وہ اس شخص بچپن کی بہت سی خبریں، نازہ ہو گئی تھیں۔ وہ بے رہا ہے کیوں پر رنگ بھر رہی تھی تب ہی فون کی بیل بجی تھی۔

”سیم“ کال کرنے والے کا نام دیتے ہی اس کی اواسی ایک لمحوں میں دور ہو گئی تھی۔ اس نے لپک کر کال ریٹرن کی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے سیم کہ اس وقت مجھے تمہاری ضرورت ہے؟“ اس کے لہجے میں ہنس کے لیے لہانہ محبت اور شہ تھی۔

”میرا دل مجھے بتا رہا ہے۔“ وہ جواباً کھکھکاتی تھی۔ ”دوسرا ہے سیم کی کھکھکاتی زندگی سے بھرپور آواز سن رہی تھی۔“

اس سے اگر کوئی سچا پار کرنا تھا کسی کو اگر اس کی پرزائیخی، نونہ صرف اور صرف سیم تھی۔ کتنے کو وہ اس سے صرف ایک سال بڑی تھی مگر اس کی بول پر وا کرتی بول اس کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ کوئی جھوٹی ہی بچی ہو۔ بچپن میں جب ان دونوں بہنوں نے اس اور باپ دونوں کی جانب سے عدم توجہ کا دکھ، مانتا تھا تب اس کی پروا کرتی اس سے بے تحاشا محبت کرتی سیم بہن اور دوست ہونے کے ساتھ ساتھ جیسے اس کی ماں اور باپ بھی بن گئی تھی۔ جیسے ماں باپ اپنے بچوں کی پروا کرتے ہیں ایسے وہ اس کی پروا کیا کرتی تھی۔

”کبھی گزر رہی ہیں تمہاری چٹھیاں؟“ سیم نے اس سے پوچھا۔

”صرف میں۔ سیم تم بھی آ جاؤ۔“ مگر تمام انیلاہنڈ کی طرح وہ بھی روم کو روکنا کھاتی تھی۔ اور اپنے دماغ سے اسے غمگین تھا۔

”ابھی تو میں آفس کے کام سے ترکی جا رہی ہوں۔ لڑ۔ اگر کام جلدی ختم ہو گیا تو آپ اس کی تمہارے پاس۔“

”سیم نے عادت کے مطابق اسے اس کے تک سیم سے پکارا یہ تک سیم ایسے دیا بھی اسی نے تھا اور اس سے پکارا بھی وہی کرتی تھی۔ اس نے سیم کو ماں کے فون کی بابت بتایا۔ سیم اس کے مقابلے میں بہت مضبوط اور پریار تھی۔ وہ اب بھی ہویاری اور پیار سے سمجھا رہی تھی۔

”کیوں مہی پاپا کے بارے میں سوچ سوچ کر انہاں کو کھاتی ہو لڑ؟ وہ دونوں جیسے ہیں کیسے ہی رہیں گے۔ مہی کو پیسے بھجواؤ مگر ملینے سوچنا اور دل جانا پھر ڈو کہ وہ ایسی بھول ہیں۔ تم دنا اپنی چٹھیاں انہاں کے کرنے آئی ہو۔ خوب انہوں نے گدہ لودا اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری کتنی شکوکہ مکمل ہو گئیں؟“

سیم نے اس کا موڈ تبدیل کرنے کے لیے فوراً ہی کھکھک کا موضوع اس کی سولو ایکٹیشن کی طرف موڑ دیا تھا۔ سیم سے اس پورے ایک گھنٹے بات ہوئی رہی تھی۔ اور ایک گھنٹے بعد جب وہ فون بند کر رہی تھی تب

اسے یا، بھی نہیں رہا تھا کہ گھنٹہ بھر پہلے وہ کس بات سے اس اس اور دھکی ہوئی تھی۔



آفس میں وہ اور وزیر فوسا ساتھ بیٹھے ایک کانفرنس پر نظر پڑی کر رہے تھے۔ وزیر فو بھی اسی کی طرح ان کی کمپنی میں ایک لیجنل ایڈوائزر تھا۔ جنہی یورپ میں ان کی کمپنی کی جوبلیکل ٹیم قائم کر رہی تھی اس کا ایک ذیبن وکیل۔

وہ دونوں انتہائی سنجیدگی سے آپس میں پیشہ ورانہ گفتگو کر رہے تھے۔ جب وزیر فو کے آفس کے دروازے پر ایک گھنٹس ہوئی تو وزیر فو نے اس آفس میں اپنے فارمیسی قیام کے دوران اسے ایک علیحدہ کمپن فرام کر لیا تھا۔ مگر کسی نہ کسی دسکشن یا مسنگ کے لیے اس کا زیادہ وقت وزیر فو کے آفس ہی میں گزر رہا تھا۔

اس نے اور وزیر فو دونوں نے "giorno buon" کہتی اس خوب صورت فوٹو کی طرف نظرس گھما کر دیکھا۔ انیس سوچ اور دن کے وقت کا انٹین میں سلام کرتی لڑکی کوئی اور نہیں اسے پریا میں ٹی لڑکی ہی تھی۔ کیا روم اتنا چونا شہر تھا جہاں یہ لڑکی اسے ہلا چکا رہا بار گرا رہی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر خواہواہی پڑا۔ اور سستی بے تکلف، ہونے کی کوشش کرتی تھی اور یہ چیز اسے اس لڑکی سے جڑا رہی تھی۔

"چاؤ عزیزان" وزیر فو گرم جوش سے مسکراتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا تھا۔ وہ انتہائی پریاک اور دستاورد انداز میں اس کا غیر مقدم کر رہا تھا۔

"ہیں اندر آجاؤں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آؤ بیٹھو۔"

سکندر نے ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد فوراً ہی کانفرنس کے صفحات اپنے سامنے کر لیے تھے۔ وہ

کر رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئی ہے۔

"اس لیے بوجھ رہی تھی کہ کہیں تم بڑی نہ ہو۔" وزیر فو وزیر فو کو جواب دیتی سکندر کے برابر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وزیر فو اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں انٹین میں بات کر رہے تھے اور اسے سلام سے بہت کران دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ہاں یہ ضرور یہاں چل رہا تھا کہ وہ دونوں آپس میں بے تکلف ہیں "خالبا" دوست ہیں۔

"بابے" چونکہ اس بار اسے مخاطب کیا گیا تھا اس لیے اسے کانفرنس پر سے نظرس اٹھا کر اسے دیکھنا پڑا۔

"ہائے" وہ جواباً سنجیدگی سے بولا۔

"آپ نے پہچانا مجھے؟" وہ اس سے انگریزی میں مخاطب تھی۔ یہ سوال اس نے بظاہر مسکرا کر پوچھا تھا۔ عمر وہ عانتا تھا۔ اس وزیر فو میں اس کے اسے نہ پہچاننے کا اثر دینے کا دورے جتانے والے انداز میں حوالہ دے رہی تھی۔

"جی۔ آپ لیزا ہیں۔" آپ نے پریا میں بچھے راز اور کر کے میں مدد کی تھی۔ "وہ چہرے پر بغیر شرمندگی کا کوئی تاثر لائے اسی سنجیدگی سے بولا۔

"ہیں تب کو یاد ہوں؟ میں سمجھ رہی تھی شاید آپ مجھے پہچانے نہیں ہیں۔" وہ پھر مسکرا کر وزیر فو طرز گرد رہی تھی۔

وزیر فو جوان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا فوراً "مسکرا کر بولا تھا۔

"آپ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ یعنی میں تعارف کروانے والی فارم ہٹنے سے بچ گیا۔"

لیزا اس کی بات پر مسکرائی۔ بلا وجہ اور بات ہے بات مسکراتے رہنے سے یہ لڑکی گفتگو نہیں تھی اس نے کوئی تعارف میں اس سے مخاطب تھا۔

"اس تعارف میں میں یہ اضافہ کر لو سکندر کہ لیزا میری بیٹی کی دوست ہے۔ ویسے میں اس سے چار سال بڑا ہوں۔ ہم اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ میں اسکول میں اس سے میٹر تھا مگر جاری دوستی بہت

کھینے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
 ”اچھا تم تو وہی گھیا ہے۔ چلو سکندر! آئیں باہر چل
 کر کچل کرتے ہیں ہم تینوں۔“

وہ بڑھوٹے اسے بھی کچل کی دعوت دی تھی۔ اسے
 اپنا بریفنگل منیچوہ اوڑھ لیا وہاں پر رقرار کر کھانا تھا وہ
 انکار کر کے بھنگنہ میں کاملاً پڑھ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ
 دونوں یہ تاثر لیں کہ وہ لیزا کو قصداً ”آنور کرنا چاہتا
 ہے۔ اور اس کی وجہ سے انکار کر رہا ہے۔“

”اوکے چلو“ اس نے سنجیدگی سے چپنے کی ہانی
 بھری تھی۔

”اس سے قریب ہی ایک ریستورنٹ میں وہ تینوں
 بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ان کا کچل سروس نہیں کیا گیا تھا۔ وہ پٹر
 نے سب سے پہلے ایک پاکستان جس میں نئی طرح کے
 روزنامے ہوتے تھے اور ایک باؤل جس میں اولیو
 آئل تھا ان کی میز پر لا کر رکھا۔“

وہ وہاں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اسے پہلی
 مرتبہ چاہتا تھا کہ اٹلی کے لوگ اپنے کھانے کا آٹھ ٹاؤس
 طرح کرتے ہیں۔ لیزا اور روپر ٹوٹے اپنی اپنی پلیٹوں
 میں ایک ایک رول اٹھا کر کھا تھا۔ وہ رول کے ٹکڑے
 ہاتھوں سے توڑ توڑ کر اولیو آئل میں ڈبو رہے تھے اور
 اسے مزے لے کر کھا رہے تھے۔ اسے بھی آفر کی گئی تو
 ان کے کھانوں کے طور طریقوں کا ساتھ دینے کے لیے
 چند ٹولے رول کے اس نے بھی اولیو آئل میں ڈبو کر
 کھا لیے تھے۔

اسی دوران ان کا آرڈر کر دیا گیا تھا۔ وہ
 فریڈ مشرومر اور پائٹا کھا رہا تھا۔

”اس کے اس ٹان سپریم سے (attitude) پر نہ
 جانا۔ یہ کافی سمجیہ قسم کی آرٹسٹ ہے۔ اور خاصی
 مستی بھی۔“

روپر لیزا کی طرف دیکھ کر سکندر سے ہنستے ہوئے
 بدلا۔ وہ اس کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ
 بات تھا کہ ”اس نے وہاں ان عورتوں سے بے“

تھی۔“ اب اس کی وجہ سے کمرے میں انگریزی بولی
 جا رہی تھی۔

”بہت سے لوگ تو اس غلط فہمی تک میں جھلا
 ہو چکے تھے کہ ہم ہوائے فرزند کر ل فرزند ہیں۔“

لیزا بھی گڑبڑو اور اس کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔
 روپر اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”موجودہ ہم دونوں لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے
 کے بجائے اس پر خوب ہنسا کرتے تھے۔“

وہ سکندر کو بتا رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص پرنٹنگ
 انداز میں بہت ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔ شائستگی اور مروت کا
 مظاہرہ کرتا ہوا۔

”یہ اتنا صرف تو پورا ہو گیا سب تم سکندر صاحب کا
 بھی سکھانے تو ارف کر دے۔ میں ان کے بارے میں
 صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان کا نام سکندر ہے یہ لپچے
 کسی انٹرنیشنل کام سے رہا میں پورے انہیں دیکھو اور
 مشرومر والا پائینڈ ہے۔“

اس لڑکی کی ٹان سپریمیں باتیں اور بلاوجہ فری ہونا
 اسے کس قدر اذیت دے رہا تھا۔ کاش روپر اسے نہ ہوتا
 تو وہ اسے بتاتا۔

”سکندر رہا میں ہماری کمپنی کے لیجھل ایڈوائزر
 ہیں۔ بہت ہی قابل اور ذہین لار ہیں۔ اس سے ہی کے
 کام سے دو تین ہفتوں کے لیے دور میں ہیں۔“ روپر
 لیزا کو بتاتے لگے۔ اب اس وقت کانٹریکٹ کا کچھ کام تو ہو
 نہیں سکا تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ مدد تو ہے ہزاروں
 کر کے اپنے کمپن میں چلا جائے مگر وہ دوستوں کو
 منگوا کر مچھو ڈر کہ لیزا اور روپر اسے انگریزی ہی میں
 بولی۔

”سینک میں اس کی رہنمائی میں کچھ جلدی
 آگئی۔ میں نے سوچا میں پہلی مرتبہ تمہارے اس
 آئی ہوں۔ تم یقیناً مجھے اپنے ساتھ کچل کرنے کی
 دعوت دو گے۔“

وہ مسکرا کر بے تکلفی سے بولی تھی۔ روپر ٹو پھر
 ”اچھا“

سے میسم انداز میں کہا۔ چونکہ انہیں آفس جلدی والیں سمجھا تھا اس لیے بھول دیر لوگ کہ وہ لوگ جلدی ختم کر کے اٹھ رہے تھے انہیں حلب سے اس سے ملنے کے لیے ایک مختصر خط لکھ کر دیا تھا۔ جبکہ کھانا دوس سے پندرہ منٹ کے اندر کھالینے جانے والی چیز تھی۔

دیر ٹوٹتے ہوئے اسے بتا رہا تھا، "آفس ٹائمنگ کے دوران بھی ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا لچ انٹرنز کے لیے بڑی عام سی بات تھی۔ وہ لوگ ریسٹورنٹ سے اٹھ رہے تھے جب لیوانے اسے اپنا فون نمبر دیا۔" لکھنا کبھی نہیں آؤٹ میں دلچسپی ہو جائے اور تم مجھ سے کوئی پیٹنگ ہونا چاہو۔" وہ بلاوجہ بے تکلف ہوتی مسکرا کر بولی تھی۔

"یا قیمت تم دونوں کو مونا چھوڑوے اور تم لیوانے سے ملنا چاہو۔" دیر ٹو مسکرا کر بولا تھا۔ دیر لڑا کو چھیڑ رہا تھا۔

لیوانہ بھی تھی۔ "ہاں ہانگل۔" وہ تینوں آفس آگئے تھے لیوانہ اپنی میٹنگ کے لیے چلی گئی تھی جبکہ وہ آتے کے ساتھ ہی اپنے کہن میں آگیا تھا۔ اسی طویل لچ میں اچھا خاصا وقت برباد ہو گیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے فوراً اپنے کاسوں میں مضمون ہو گیا تھا۔



دلیرا بہت اچھی لڑکی ہے۔

اگلے روز وہ اور دیر ٹو آفس میں ساتھ بیٹھے تھے۔ کام کے دوران جب کافی کے لیے وقفہ کیا گیا تب کافی کے بھونٹ لیتا دیر ٹو اپنی بیوی اور بچے کی بات کرتے کرتے ایک دم ہی لیوانے کے بارے میں بات کرنے لگا۔ یاد خود لگتی رہتی یا پھر اس کا ذکر ہوتا رہے گا۔ ایسے جیسے بتائیں وہ کتنی اہم شخصیت ہے اس نے دل میں بے زاری اور کوفت محسوس کی پر چہرے پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

"ایسے ہی لالہ بالی لا پڑا اور غیر سنجیدہ سی لگتی ہے"

انٹرنیو بارہ کر دیا ہے۔ اس نے انٹرنیٹ میں پورے دوام اور دھم دھن میں ایریا کی دیواروں پر چند پیشگو کا مٹی اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ ایک اپنا آرٹسٹک ٹک بن سکے اس مقصد کے لیے کسی دلچسپ آرٹسٹ سے ان کی کمپنی کو رابطہ کرنا تھا اور دیر ٹو کے مشورے پر انہوں نے لیوانے سے رابطہ کیا ہے آج اسی حوالے سے لیوانہ کی ان کی کمپنی کے کچھ سیکرٹریز کو ٹیڈ کے ساتھ میٹنگ سے جس میں ان پیشگو کا موضوع اور معلومات ملے کیا جاتا تھا لیوانہ انہیں بتا کر گئی۔

"دیکھو یہ نہیں یہ ہم سے اپنی صرف ایک میٹنگ کے لیے کیا یاد دلاؤ کرتی ہے۔" دیر ٹو بولا "ہنسی تھی۔" "اب منگی آرٹسٹ کے تجربے تو ہوں گے نا؟" دیر ٹو کو جواب دینے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"تمہیں آرٹسٹ میں انٹرنسٹ (دلچسپی) ہے؟" اس بار اس کے لیے اور الفاظ میں نمایاں بے تکلفی تھی۔ اس نے جیسے از خود ہی یہ فرض کر لیا تھا کہ اگر وہ اس کے بچپن کے دوست کا کوئی نقش لبا ہے تو وہ اس کے ساتھ بے تکلف ہو کر بات چیت کر سکتی ہے۔ "دیکھیں۔ مجھے بالکل بھی انٹرنسٹ نہیں ہے۔" فوراً اسے اپنا کھاتے ہوئے اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ لیوانے بغور اسے دیکھا تھا ہاتھیں کھول۔

تم Destiny (تقدیر) پر یقین دیکھتے ہو سکتے ہو؟

کچھ دیر کے بعد دیر ٹو سے بات کرتے کرتے لیوانے نے اپنا ٹک اس سے پوچھا تھا۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اسے اس کا وستانہ وہ بے تکلفانہ انداز میں بات کرنا گراں گزر رہا تھا۔ مگر وہ اس کا اظہار اپنے چہرے سے ہونے نہیں دے رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے پہلے پڑھنا اور اب دیر ٹو کا آفس یہ تقدیر ہی ہے نا جو ہم یا دیر ٹو میں نہ کہیں مل رہے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں شاید۔" اس نے شانے اچکا کر بے نیازی

لو۔ کھانے کی میز پر وہ چاروں سوہ دوت۔ شہزادہان سکندر سے مخاطب تھے۔

"ہارورڈ سے گریجویشن کے بعد پھر وہیں سے لاء پڑھو۔"

"جی ہاں۔" وہ مؤدب بنا جوں با "گردن ہاں میں ہاں کر بولا تھا۔

زمین نے اسے بغور دیکھا تھا۔ اسے سکندر کی فرماں برداری اور سخاوت مندی والی اس اداکاری سے نفرت تھی۔

پاپا کے ماسٹے لٹا اچھا بن کر آخر وہ خود کو کیا ثابت کرنا چاہتا تھا؟ ان کی امواجان "شہزاد خان" کے آگے

مختلف دشمن رکھ رہی تھیں۔ وہ اسی طرح شوہر کی خدمت میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ شہزاد خان اس

گھر کے حاکم اٹلا تھے۔ جو وہ پسند کرتے تھے وہ یہاں ہوا کرتا تھا جو پسند کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی وہ

کر سکتا۔ بیکار سی امید تھی پھر بھی وہ امید سے باپ کی طرف دیکھا رہا شاید ابھی وہ اس کے بارے میں بھی

اپنی کسی خواہش کا اظہار کریں۔ "زمین میں چاہتا ہوں تم کو جو زمین تم فلاں جو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیتا۔" مگر

اس کی حسرت حسرت ہی رہی تھی۔ سکندر شہزاد کے آگے انہیں وہ نہ بھی نظر آتا تھا نہ ہی آسکتا تھا۔ وہ

سنجیدگی سے سکندر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ اس کے کیرئیر پروفیشن اور مستقبل کے حوالے سے

انہوں نے کیا کیا پلان کر رکھا ہے وہ یہ سب کچھ سکندر کو بتا رہے تھے اور وہ جی ہاں "اچھا ہاں اور اس کے پاپا اٹھان کے ہر ماں ان سے اتفاق کر رہا تھا۔

سکندر کی تمام تر کیرئیر پلاننگ شہزاد خان نے کر رکھی تھی۔ جبکہ زمین شہزاد کے لیے ان کی کوئی کیرئیر پلاننگ نہ تھی۔ وہ چاہاں پر بھی پڑھنا چاہے اور جو کچھ

بھی پڑھنا چاہے انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ سپر اس پر بھی خرچ کریں گے مگر اس کے لیے ان کے اس

طرح کے کوئی خواب نہ تھے جیسے سکندر کے لیے اور ان کے پاس

کون سا کارنامہ مبرا انجام دے دیتا تھا جو وہ اس سے امیدیں اور اس باندھتے ان کی امیدوں کا مرکز ان

مکلفہ دوسروں کی بہت بڑا کرنے والی بڑی باری لڑکی ہے۔ پاپا ہے سکندر لاسٹ ایئر جب میری بیوی

پرنسٹن تھی۔ ڈیوری کا نام بالکل قریب تھا۔ تب اچانک ہی مجھے آفس کے بہم سے تین چار دنوں کے

لیے اسپین جانا پڑ گیا تھا۔ میں اپنی بیوی کے لیے فکر مند تھا۔ میں اس کی ماں اور بہن سے اس کا خیال رکھنے کی

یاد دے کر گیا تھا۔ لیکن دونوں چھٹیوں میں روم آئی ہوئی تھی۔ جانے ہوا جن روز میری بیوی کو اسپتال

جانے کی ضرورت پڑی تب اس کی ماں اور بہن سے بھی ملے۔ اس کے پاس چھٹی تھی۔ وہ اسے اسپتال

لے کر گئی تھی۔" اس قسم میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس کی

سجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر جب اسے فیصلہ ہی میں کوئی دلچسپی نہ تھی تو کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی کہاں

تھی۔ اس نے محض سرا کر یہ مانتا رہا تھا کہ اس نے دیر لڑکی لہذا کے متعلق ساری بات سنی ہے۔

اسے اندر حسرت سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ چلا

رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اسے اندر حسرت سے نکلتا تھا۔ کوئی تبوں نہیں آ رہا اسے اندر حسرت سے نکالنے وہ دم کے

لیے چلا نا بڑی طرح رو رہا تھا۔ اسے کسی کے چہرے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہاں کوئی تھا جو اس کی بے بسی کا

انتہا دیکھ رہا تھا۔ اس پر تھکے لگا کر بیٹھ رہا تھا۔ وہ بے چینی اور اضطراب میں گروہیں بڑی رہا تھا۔

پورا دن پورا دن میں مل رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سوتے میں گیس جلے جانے کہیں بھاگ جانے کی

فشار کر رہا تھا۔ اس کے لبوں نے بہت جلدی ہلکی ہلکی اور دلپٹا ہلپٹا کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

چپٹی سے ہاتھ پاؤں چلاتے اس نے یک دم ہی انہیں کھول دی تھیں۔

"سکندر! میں چاہتا ہوں تم ہارورڈ میں ایڈمیشن

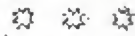
شاید بد صورت ہی نہ تھی۔

اس کے والد ایک بے تحاشا بظلم آدمی تھے۔ ایک بھوپور مروانہ در عجب دار شخصیت کے حامل منہبوط جسم لہذا قد چوڑا سینہ چہرے پر سختی منوچھیں گہری سیاہ آنکھیں جن میں خوب صورتی اور ذہانت دونوں چمکتی تھیں۔ یہی منہورت کی ناک، کشادہ پیشانی۔ وہ چلتے تو یوں لگتا کسی رماست کا حاکم چلا آ رہا ہے۔ پوچھتے تو ان کی شخصیت کے رعب گھبراہی مروانہ آواز اور جاہ و جلال کے آگے بڑے بڑوں کا چلائی ہو جایا کرتا۔

وہ زندگی میں ہر جگہ ہر میدان میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ ورلڈ بینک میں ایک انتہائی اہمچی اور اہم پوسٹ پر جاب کر رہے تھے۔ وہ پارکمنٹ کے بعد انہیں پاکستان میں اپنے خاندانی برسر کو سنبھالنا تھا جسے اپنی اس کے بار اسنبھال رہے تھے۔ شہر مار خان کی ملازمت کے سبب وہ لوگ دانشمندانہ رہتے تھے۔ ان کی فیملی چار افراد پر مشتمل تھی۔ شہر مار خان، ان کی ماں جنیس و بھالی اموجان بلایا کرتے تھے اور دو دونوں بھالی۔

ان کی ماں ایک بڑی ہی نرم خور اور مہربان خاتون تھیں۔ وہ جسے سڑوں میں پوسنے والی ہر ایک سستہ ہمدردی کرنے والی کہتے پچھلی اور شوہر پر جان چھڑکتے والی وہ اعلا تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھیں۔ مگر شادی کے بعد شہر مار خان کے گھنے پرانوں نے شوہر اور بچہ بعد میں بچوں کی خاطر اپنے گھر اور پروفیشن کی قربانی دے کر خود کو پوری طرح اپنے گھر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ شہر مار خان کا جس طرح کا مزاج تھا وہ جس طرح اپنی بات منوانے کے عادی تھے جس طرح کی حاکمانہ ان کی طبیعت تھی ایسے مزاج کے حامل شخص کے ساتھ گزارا کرنا ان کی اموجان ہی کا وعف تھا۔ وہ شوہر کی ہاں میں ہاں ملاسنے والی اور شوہر کے شوہر نے کہہ دیا ہے بس ان کے لیے حکم ہو گیا ہے۔ وہ عقل و صورت میں اپنی ماں پر تھا اور ان کی ماں

کا اٹھارہ سالہ ولی عمر تھوڑا سکندر شہر مار خان۔ وہ اپنے اندر بہت سی گروہٹ محسوس کرتا ہوا سوچ رہا تھا وہ کھانے کے بعد کمرے میں آیا تھا۔ عجیب سی ایک سوچ اس کے اندر آئی تھی۔ کاش ایسا ہو سکندر کا باور میں داخلہ نہ ہو سکے۔ گویا ممکن ہی بات تھی پھر بھی وہ سوچ رہا تھا سکندر ہمیشہ ہی تو فلاح عالم نہیں ہوا کرتا۔ سکندر بھی ہار بھی تو جاتا ہے تو اب کی بار کیوں نہیں؟



وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں تمام افراد غیر معمولی تھے high achievers اس کے دادا اس کے پاپا اس کا بھائی۔ اس کے پاپا بڑے فخریہ انداز میں اپنے والد کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں کیمبرج پڑھنے گئے تھے جب کسی کا پچہ اگر میٹرک پاس کر لیا کرتا تھا تو ماں باپ کے خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہ ملکتے تھے۔ وہ اس زمانے میں نہ صرف یہ کہ کیمبرج میں پڑھ کر آئے تھے بلکہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ذہانت و قابلیت کا سکھہما کر گئے تھے۔ پھر اس کے پاپا جو بارہوڈ کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ وہاں کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ اس کے پاپا ایک مغور آدمی تھے۔ ایسے ویسے لوگ اور ایسا کسی کارکردگی تو ان کی نگاہ میں نہ ہی نہ سکتی تھی۔ وہ اپنے کوچھے خاندان کا اعلیٰ نسب اور اپنی خاندانی ذہانت و قابلیت پر فخر کیا کرتے تھے۔

”بیسے تو بہت لوگ کما لینے ہیں۔ بیسے ہونا خلی کی بات نہیں خلی کی بات تو آپ کا اعلیٰ نسب اور اعلیٰ تعلیم و تعلیم قابلیت کا ہونا ہے۔ ان دو چیزوں کے ساتھ آپ نے بیسے بھی کمالیا ہو تو یہ اصل فخر کی بات ہے۔“ اس نے بچپن سے اپنے پاپا کے منہ سے یہ ہی جملے سنے تھے۔

گھروہ کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کے طے کرہ معیار کے مطابق ذہین و قابل نہ تھا۔ وہ غیر معمولی قابلیت ذہانت اور مثال و جاہرت کی حامل اپنی فیملی میں

سکندر اپنے کھلونے لے کر بس کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ شہیار خان نے ہر وہ چیز جو اسے نہیں صرف سکندر کو ملانی ہوئی تھی، سکندر اس کے ساتھ سنبھل کر لیا تھا۔ سکندر اس سے پیار کرتا تھا۔

وہ کبھی اس کے ساتھ کھیل لیا کرتا اور کبھی شہیار خان کے جالب دارانہ رویے پر اس کا دل زیادہ دکھا ہوا تو بد مزیزی سے اسے اپنے کمرے میں سے نکال دیا کرتا تھا۔ عجیب سا رشتہ تھا اس کا اپنے بھائی کے ساتھ۔ کبھی اسے اس پر پیار آتا اس کے ساتھ کھیلنے کو جی چاہتا اور کبھی وہ اسے اپنا منب سے برا دشمن سب سے برا حریف نظر آتا پھر اسے سکندر سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ اپنے بھائی کی نگاہوں میں کبھی بھی اہمیت اس لیے نہیں پاتا تھا کہ اس کے بد مقابل ہر جگہ پر سکندر موجود تھا۔

سکندر ہر سال اسکول میں ٹیپ کرتا تھا اور وہ اپنی کلاس میں سینئر، ٹیچر پوزیشن لیا کرتا تھا۔ اسکول ایک ہی تھا تو رولٹ بھی ایک ہی دن ہوا کرتا تھا۔ اس کی رپورٹ کلرڈ پر ایک افسوس بھری نگاہ ڈالنے کے بعد شہیار خان کی فوج کا اصل حکر سکندر ہو کر آتا تھا۔

وہ سکندر کو ہرانے کے لیے ہر سال گزشتہ سال سے زیادہ محنت کیا کرتا تھا۔ عجیب سی ایک ریس تھی جس کا ایک غیر اعلیٰ مقامی طالبہ تھا جو اس کا پڑ بھائی سے تھا۔ وہ سکندر سے آگے نکل سکے اس سے زیادہ اچھے مار کس لائے مگر تمام ریزکوششوں کے باوجود وہ سکندر سے پیچھے ہی رہتا۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں اس کے اڑکھن تو زیادہ ہوتے مگر کہیں نہ کہیں وہ سکندر سے پیچھے ہی ہوتا۔

وہ ملل اسکول میں تھا۔ ملل اسکول میں یہ اس کا آخری سال تھا جبکہ سکندر اس سے ایک کلاس آگے ہونے کے سبب ملل اسکول سے نکل چکا تھا۔ اس سال اس نے بے شامشا محنت کی تھی۔ وہ اتار کو جاکر جاگ کر رہا تھا، یہاں تک کہ بعض دن وہ تھکا ہوا سناں سے اسے اٹا پڑھتے دیکھ کر آرام کرنے اور پڑھائی کو اتنا

ایک خوب صورت ڈھول تھیں، سون بھی خوب صورت تھا مگر اس کا تھکا ہوا اپنے باب جیسا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے وہ رعب اور ذہانت تھیں جھلکنی تھی جس کے باپ کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی شخصیت میں وہ Charisma (شہر) نہیں تھا جو اس کے باپ کی شخصیت میں تھا۔ یہ سب اگر کسی میں تھا تو صرف اور صرف سکندر شہیار خان سے اسے اپنے بھائی کے ساتھ نہ دیکھا جاتا تو وہ ایک خوش شکل پینڈو آدم اور چار رنگ لڑکا تھا مگر جہاں وہ دونوں بھائی ساتھ ہوتے وہ پس منظر میں چلا جاتا تھا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سکندر شہیار خان اور زمین شہیار خان کے ساتھ کسی جگہ پر ہوں اور دیکھنے والے اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ محنت سمجھنے میں وہ اس چیز کو زیادہ محسوس نہیں کیا کرتا تھا مگر وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بھائی سکندر اس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ان دونوں بھائیوں کی عمول میں بس مادہ کا فرق تھا۔ وہ سکندر سے دس ماہ چھوٹا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سکندر سے دنیا میں آئے میں دس ماہ پیچھے نہیں بلکہ اسے زندگی بھر مریدان میں سکندر سے چند قدم پیچھے رہنا تھا۔ جب وہ دونوں بھائی چھوٹے تھے وہ تب بھی محسوس کرتا تھا کہ بھائی کے لیے جو اہمیت سکندر کی ہے وہ اس کی نہیں سبب وہ سکندر کو اس سے زیادہ اس لیے اہمیت دیتے ہیں کیونکہ سکندر ان کے جیسا ہے۔ سکندر بچپن کی پکارتاں میں بھی زبانیت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا کرتا تھا۔

زمین نے نہ محبت کنٹرول والی چوڑی کھلونے کی کان پر پینڈو کی تھی اور سکندر نے اسکر بیل۔ شہیار خان تو بڑے بیٹے کی اس اوپر نمائش ہی ہو گئی۔ وہ بچہ بچہ اس نے اسے تو محض نہ محبت کنٹرول والی تو ہی دوائی تھی جبکہ سکندر کو اسکر بیل کے ساتھ نہ محبت کنٹرول والی کار ایریڈیٹ اور کھلونوں کی دوسرے کھڑے ایک پور ایڈیٹ بھی ملوا دیا تھا۔ اس کے دل کو جوٹ لگی تھی۔ اسے دکھ ہوا تھا وہ اراچی دار سے پھیلائی نہیں تھا۔ تمام میں

صرف جسد محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے ہرانا چاہتا تھا مگر اس روز کے بعد اسے سکندر سے عجیب سی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سکندر سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ سکندر اس سے جتنا پار کرتا اسے جتنا اپنی طرف کھینچتا وہ اتنا ہی داس سے دور بھاگتا اس سے الگ الگ رہتا۔

”تم نے میرے ساتھ کھیلنا کیوں چھوڑ دیا ہے زین؟ اپنے الگ دوست بنالیے ہیں، لان کے ساتھ کھیلتے ہو کیوں؟“

وہ اس کے پاس آکر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس سے صرف دس ماہ بڑا تھا مگر بارہویں گرامر اس کی فکر یوں کر آگیا اس سے کئی سال بڑا ہو۔

”مجھے تمہارے ساتھ کھیلنے میں مزہ نہیں آتا سکندر! تمہارے کھیل بھی کیا ہوتے ہیں؟! کو خوش کرنے کے لیے تم نے سونمٹنگ کرتی ہوئی ہے یا رائیڈنگ؟ کیونکہ اس سے اسٹیمنا بڑھتا ہے، جبکہ مجھے فٹ بال کھلنا ہو۔ تاکہ تمہاری طرح ایسا ہی خوشامد کرنے کے لیے میں یہ بورنگ کام نہیں کر سکتا۔“ وہ اچھی خاصی بد خیمزی سے بولا تھا۔

سکندر کے چہرے پر ایک دم ہی شرمندگی اور دکھ آگیا تھا۔ اس کے دل کو بد خیمزی نے سکندر کے دل کو دکھایا ہے وہ جانتا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے دل کو کھنکھوڑایا تھا۔

سکندر ہر چند کہ شش کرتا رہتا تھا کہ وہ اس سے قریب ہو جائے مگر اس نے اس کی کوششوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیا تھا۔ اس نے اپنے دوست کو اپنی دلچسپی سب سکندر سے اس حد تک الگ کر لی تھیں کہ بعض اوقات دن بھر میں صرف کھانے کی میز پر ہی ان بچانوں کی ملاقات اور گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس نے خود کو بظاہر بڑا لبرال اور مضبوط ماہر بنایا تھا جیسے اب اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یا سکندر کو اس سے زیادہ کیوں اہمیت دیتے ہیں جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سکندر سے بیشک پیچھے کیوں رہ جاتا ہے۔ وہ اس کی طرح غیر معمولی کیوں

سر رہتا نہ کرنے تک کی مائیک کی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ اسے اس بار سکندر سے جگر آگے نہیں کلنا تھا تو کم زکما اس کے برابر نہ آتا تھا۔ اسے تو کر کے دکھانا ہے جو سکندر کر کے دکھا چکا ہے اور پھر جب ان کا رزلٹ آیا تو اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی کاٹس میں فرسٹ پوزیشن لی تھی بلکہ پورے محل اسکول میں بھی اس نے ٹاپ کیا تھا۔

سکندر اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے اسے گلے لگا کر مبارکبادیں دیں۔

”مجھے بتاؤ زین، اس بار تمہیں ایسا ہی کوئی کارنامہ کرتا ہے۔ بریالی ہوئی تو کتنی کی تھی تم نے۔“

اسے لگا تھا سکندر اس سے جملے کا ناخوش ہو گا مگر ایسا نہ ہوا تھا۔ شاید یہ مقابلہ بازی یک طرفہ بھی یا شاید سکندر اسے اس قابل ہی نہ سمجھتا تھا کہ اس سے مقابلہ کرتا۔ اس نے جمل کر سوچا تھا۔ اس نے تحریر انداز میں اپنا رزلٹ باپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ باپ پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کہ وہ سکندر شہر اسے کسی بھی طرح کم نہیں۔ اس کاٹس ترین خاندان میں وہ کسی سے کم نہیں۔

”گلد۔ ویل ڈن زین۔ اچھی کوشش کی ہے تم نے اس کا مطلب ہے اگر تم کوشش کرو تو اس سے بھی بہتر رزلٹ لاسکتے ہو۔ اور ال 88 پر سٹیج ہے نا تمہاری۔ لاسٹ ایئر سکندر نے محل اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کی 92 پر سٹیج تھی۔ تم بھی اگر اور محنت کرو نا تو اچھی پر سٹیج لاسکتے ہو۔“

باپ کے ان رویارہیں پر اس کی ساری خوشی خجماگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ وہ کتنی بھی کوشش کر لے، کتنی بھی محنت کر لے، وہ سکندر شہر اسے ہوشہ پیچھے رہے گا۔ وہ اس روز اپنے کمرے میں بیٹھ کر گفتگوں کر رہا تھا۔

اس کے باپ کو احساس تک نہ ہوا تھا کہ اپنے چند جملوں سے انہوں نے اپنے معصوم بچے کا دل کس بری طرح توڑا تھا۔ اس روز سے پہلے تک اسے سکندر سے

نہیں۔ ٹکڑے سڑے سائے کی عمر میں وہ اندر سے آج بھی وہی بچہ تھا جو باب کی ایک نگاہ التفات کا مستحق رہا کرتا تھا۔ جو چاہتا تھا وہ سکندر سے بڑھ کر کچھ ایسا کر دکھائے کہ اس کے بابا اسے سکندر کی مثال نہ دے سکیں بلکہ سکندر کو اس کی مثال دیں۔

مگر سکندر واقعی سکندر تھا۔ وہ جتنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ دنیا فتح کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں ہمیشہ شکست کا سامنا نہیں کیا تھا تو اب کی بار کیسے کر لیتا؟ اس کا بارود میں ایڈیشن ہو گیا تھا۔ ایڈیشن مل جانے کی خبر شہیار خان اور اموجان کو سنانے کے بعد روہما بھاگا اس کے کمرے میں آیا تھا۔ گھر میں پھیلنے شروع شراپے نے اسے یہ خبر دی ہے جوے دی تھی۔ اسی لیے فوری طور پر گھڑت باہر جا رہا تھا۔ "زین امیر بارود میں ایڈیشن ہو گیا۔" سکندر بے تحاشہ خدشہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سنجیدہ نگاہوں سے سکندر کی طرف دیکھا تھا۔

"مبارک ہو۔"

"بابا اور اموجان بہت خوش ہیں زین۔ تم بھی خوش ہوئے ہو ناظرین؟"

"ہاں بہت۔" اس کے لیے میں خوشی نہیں بلکہ مستحضرانہ ہنسی شائستگی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اسے روزانے کی طرف جاتا دیکھ کر سکندر حیرت سے بولا تھا۔

"جی سیکان ہمارا فٹ بال مچ ہے۔"

"آج نومنت جاکو زین پلنز۔"

"کہیں آج کیا خاص بات ہوئی ہے؟ تمہارا ایڈیشن؟ آئی ایم سوری میرے لیے یہ اتنی امپورٹنٹ بات نہیں کہ میں اپنے سارے پروگرامز کنسل کر کے تمہارے ساتھ گھر بیٹھ جاؤں۔"

اموجان اور بابا کے سامنے تو ہرگز نہیں مگر اسنے میں وہ سکندر کے ساتھ اسی ٹون میں بات لیا رہا تھا۔ سکندر کی بات کا جواب دیا کرتا تھا، کیونکہ خود سے تو وہ

اسے بہت ہی کم شاذ و نادر ہی غلبہ کیا کرتا تھا۔ اس کے بے رخی اور بد تمیزی کے لیے جواب نے سکندر کے چہرے پر پچھلی خوشی کو کس طرح مٹا دیا ہے وہ کتنا ہرٹ ہوا ہے۔ اس پر وہ جان لیوے بغیر کرے۔ وہ ہی نہیں ٹکڑے ہی نگل گیا تھا۔ وہ جی کے پاس نہیں گیا تھا وہ فٹ بال ٹیمنے نہیں گیا تھا، وہ غصے میں غلبہ مرکزوں پر اگیلا پھر رہا تھا۔ کیوں سکندر ہر بار جیت جاتا ہے کہیں؟ کیا وہ جانا کر زندگی میں ایک بار وہ بار جاتا؟

وہ جاتا تھا، یقین سے دہرائی جاتی کہانی ایک بار پھر دہرائی جاتی تھی۔ اب اگلے سال اپنے پونیورسٹی میں ایڈیشن کے لیے اسے بارود میں ایڈیشن کے لیے جان کی بازی لگانا پڑی تھی۔ جتنی محنت اور کوشش اس کے بس میں تھی گروا لینی تھی بیوہ سکندر کو ایک بار پھر ہراس میں رکھتا تھا مگر کم از کم اس کے برابر تو آجائے۔ اس کے اندر سکندر کے لیے گروا نہیں ہی کر دیتا تھا۔ ہوروی تھیں۔ باب نے اس سے کوئی امید نہ باندھی تھی۔ مگر وہ خود اپنے آپ سے یہ ضد باندھ رہا تھا کہ اگلے سال اسے ہر حالت اور ہر مت پر بارود ہی میں داخلہ لینا ہو گا۔

رات کے خواب کے اس پر ابھی تک اثرات تھے۔ اس کی طبیعت خشک نہیں تھی۔ اتنے کم دنوں کے وقفے سے وہ خواب پھر نظر آ کر اس کی تمام توانائیاں نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کل رات نیند لانے کے لیے اس نے والے لی تھی۔ کیونکہ اس کے سر میں شدید درد تھا اور اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے کبے چند گھنٹوں کی نیند سے حد ضروری ہے۔ مگر وہ چند گھنٹوں کی نیند ہی اس کے لیے بے پناہ آفتوں کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ خواب سے بیداری کے بعد وہ پھر اسی درد اور آزارت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

وہ 32 سال کا بظاہر بہت صحت مند اور بھرپور مرد نظر آتا تھا مگر اس کے ساتھ عرصے کی سانس تھکے وہ پیریشن کا دائمی مریض تھا۔ اسے انوسینیا

کتنی شدید تکلیف ہے۔ اسے گردن دائیں! نہیں نہ
جھکا تاکہ گردن زیادہ سے زیادہ کسی نے کچھ سوچا ہو گا تو یہ
ہی کہ رات سوتے میں اس کی گردن میں کوئی جھٹکا دینا
اکیسا ہے۔ رورٹوں نے تو اس سے یہ بات پوچھ بھی لی
تھی۔

”ہاں سوتے میں جھٹکا اکیسا تھا۔“

اس نے رورٹوں کی بات کا اثبات میں جواب دیا تھا۔
رورٹوں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ چار پارچہ دونوں کے
لیے کھونٹے پھرے۔ دیش جا رہا تھا۔

”تم بھی دیش ضرور چلنا سکندرو۔ اٹلی آئے ہو“
دیش صوبے لہجہ واپس چلے گئے تو تھمارا مڑب اور حوران
جائے گا۔“

روم چلا دو قیام پڑے تھے اسے اسے دیکھنے اور وہاں
گھومتے پھرنے کا کوئی شوق نہ تھا تو وہ اٹلی کے کسی اور
شہر میں کیا جاتا ہر حال اس نے ”ہاں کو خوش کروں گا“
کہہ کر رورٹوں کی اس بات کا بھی اثبات ہی میں جواب دیا
تھا۔ کچھ رات اسے آفس کے انتہائی اہم کام سے
نہیلز چلنا تھا۔ وہاں کی ایک کمپنی کی ان کی کمپنی کے
ساتھ ایک انتہائی اہم نوعیت کی میٹنگ تھی۔ آفس کی
جانب سے اس کے جانے کے انتظامات مکمل تھے۔

اٹلی کی انتہائی تیز رفتار اور موٹگی ترین ٹرین
Alta velocita جوالی کے مختلف شہروں کے
درمیان چلا کرتی تھی اس میں اس کی سیٹ ریزرو
کردائی جا چکی تھی۔ Alta velocita نے
اسے سواٹھٹھ میں فیپلز پہنچا دیا تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ
بجے اس کی میٹنگ تھی اور میٹنگ سے قبل کے چند
گھنٹے گزارنے کے لیے آفس کی جانب سے نہیلز کے
ایک پراہٹاں ہوٹل میں اس کے لیے روم بھی بک
کر دیا جا چکا تھا۔

وہ آفس میں پورا دن گزار کر شام میں ہی اٹھا تھا۔
درو تھا تو ہوا کرے۔ اس نے واپس کے لیے روزانہ کی
طرح واک کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میٹرو فیکسی با آفس کی
گالری میں ایسے ہوٹل نہیں جائے گا۔ اس نے خود
لازینی سے سوچا تھا۔ اسی وہ Via Barberini

(سبہ خیال) کی تکلیف! اس حق تھی۔ اسے ڈراوے نے
خواب آتے تھے اور یہ ڈراوے نے خواب اسے ساتھ اس
کے لیے مانگ کرین کا دروازے تھے۔ اس کی گردن کے
پچیلے حصے سے ایک شدید درد اٹھتا تھا جو اس کے
کندھوں ہاتھوں اور سر تک پھیل چلا کرتا تھا۔ ڈاکٹر
نے اسے اعصابی درد بتایا تھا۔ اس کی میڈیسنوں سے
رکھی تھیں۔ اسے خوش رہنے اور کوئی بھی پریشان کن
بات نہ سونے کو ہدایت کر رکھی تھی۔ مگر کیا خوش
رہنے کی کوشش کرنے سے انسان خوش رہ سکتا؟
ڈاکٹر نے اس کی تمام نکالنے کا سبب اس کے ڈپریشن
اور زندگی سے نااہلی کی کو قرار دیا تھا۔

یہ وجوہات ختم کرنے سے وہ قاصر تھا سو وقتاً فوقتاً
انٹھنے اس درد کو خاموشی سے سہ لیا کرتا تھا۔ کبھی نہ ہوتا
تو وہ درمیانوں نہ ہوتا اور اگر ہونے پر آتا تو کئی کئی دن
اس کو بے حال اور اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس درد
کے ساتھ اس کے اندر غصہ اور زندگی سے نفرت لوٹ
آیا کرتی تھی۔ وہ بہت غصہ ہو جاتا تھا معمولی معمول
باتوں پر اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا
کہ یہ غصہ درحقیقت اس کے اندر کی اداسیاں اور
محرومیاں تھیں۔ جیسے جیسے یہ درد بڑھتا اس کا ورہیل
بھی بڑھتا اور اس کے اندر اپنی زندگی ختم کر لینے کی
خواہش پھر پیدا ہونے لگتی۔ یہ کیفیت مستقل نہیں
رہتی تھی۔ کبھی چند دن کبھی چند گھنٹے کبھی محض چند
منٹ بعد یہ اس کا مستقل طور پر بچپا بھی نہیں چھوڑتی
تھی۔

طبیعت جیسی بھی تھی اسے دفتر تو ہر حال میں جانا
تھا۔ وہ ہوٹل میں بیٹھ کر اس درد کے خیرے اٹھانے کے
مبذوں نہیں تھا۔ اس پر طاری ہوا خود کو ختم کر دینے کا
اجناس اسے خود کو تکلیف اور اذیت دینے پر افسار باندھ
تھا۔ اس کی گردن میں اس شدت کا درد تھا کہ وہ اپنی
گردن دائیں بائیں جھکا نہیں پاتا تھا۔ اس درد سے
پچھلے ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سانس بھی جیسے کچھ کھینچ
کر آ رہی تھی۔ مگر وہ روز کی سارا ہو کر آفس جا رہا
تھا۔ دفتر میں وہ کسی کو پتا نہیں چلے دے رہا تھا کہ اسے

جس پر تھا جب پیچھے سے ایک گاڑی اسے مارا دی تھی اس کے نزدیک آکر رکی۔

”دیکھو تقدیر نے پھر ہمیں ملا دیا۔“

لیزا نے اس کے گاڑی کا شکشہ نیچے کرتی ہوئی اس سے بولی تھی ”وہ ہوا“ کچھ بھی نہیں بولا۔ آخر اس لوگ کی یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کی بے تکلفی سخت ناپسند کرتا ہے۔

”آؤ دیکھو۔ کہاں جاتا ہے تمہیں میں ڈراپ کرو تھی ہوں۔“

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس کی کوئی دوست ہے۔ وہ اپنا غصہ دیا تھا اسٹنگل سے لے کر میں بولا۔

”تو تمہیں کم میں ڈاک کر کے جانا چاہتا ہوں۔“

”مگر تم ان سگنل سے تکلف مت کرو۔ میں نہیں ڈراپ ہوں۔“ لیزا کا بے تکلفی اور اصرار لیا جملہ اس نے

کمال نہیں ہونے دیا تھا۔ بجار میں جاسے روز تو اس کی یہ دوست اور بجار میں جائے لحاظ اور اخلاقیات۔

غصہ اور جارحیت اس پر پوری طرح حاوی تھی۔

مجبب میں تمہیں منع کر چکا ہوں تو تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی؟ میں تمہارے ساتھ بات کرنے کیلئے باوجود سنی کرنے میں بالکل بھی انٹرنلڈ نہیں ہوں۔ تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ روز تو

کی دوست ہو تو اس کی دوست بن کر رہو۔ میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش مت کیا کرو۔“

وہ بہت بد تمیزی سے خاصی تیز آواز میں بولا تھا۔

لیزا اس کی بد تمیزی پر حیرت سے آنکھیں پھاڑنے لگیں چکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے دہل رہا نہیں تھا۔ وہ غصے سے تیز تیز قدم اٹھا

وہاں سے فوراً آگے بڑھ گیا تھا۔

وہ اپنے ہونٹ آچکا تھا۔ اسے شدید تکلیف تھی۔

وہ آتے ہی بغیر لباس تبدیل کیے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ مگر اسے لیٹنے میں کچھ بہت تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ

کرانہ گندھے اور بازوؤں میں درد کی شدت کے باب۔ اپنی مرضی کے مطابق کمرٹ بھی نہیں لے پا رہا تھا۔ اس کے سر میں ناقابل بیان حد تک درد تھا۔

جب یہ درد حد سے بڑھتا محسوس ہوا تب وہ بندے اٹھا۔ وہ اپنے ساتھ وہ تمام میڈیسینز لایا ہوا تھا۔ نوڈا کٹر نے اس کے لیے تجویز کر رکھی تھیں۔ اس نے گلاس میں پانی نکالا اور خالی پیٹ وہ تیز اثر والے لی جودا کٹر نے اس کے اس درد کے لیے تجویز کر رکھی تھی۔

دوا لے کر وہ واپس بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ خود کو پر سکون کرنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس

دوا سے درد کم ہونے کے ساتھ ساتھ غیند بھی طاری ہوا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود پر غیند کا غلبہ محسوس کیا تو سوچا کہ اچھا ہے وہ تھوڑی دیر سوئے ابھی

اس کی دوا لگی میں خاصے ٹھنڈے پانی ہیں۔ وہ سو کر اٹھے گا تو درد ختم نہیں بھی ہوا ہو گا تو کم ضرور ہو چکا ہو گا۔



اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کتنی دیر سوئے اسے اندازہ نہیں ہو رہا

تھا۔ بائیس گھنٹہ میں کی تھی مگر گردن اور کندھے کا درد اپنی جگہ پر قرار تھا۔ اسے باو آیا وہ اس سے آکر دوا

لے کر سو گیا تھا۔ اس وقت چونکہ سورج غروب نہیں ہوا تھا باہر سے روشنی آ رہی تھی اس لیے اس نے

کمرے کی لائٹس بھی آن نہیں کی تھیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟ اسے جلنے کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔ اس نے

پاس رکھا موبائل اٹھا کر اس میں وقت دیکھا۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ شاید وہ سو یا کل میں ٹائم غلط دیکھ رہا ہے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی کی

طرف دیکھا۔ صبح کے چار بج کر دس منٹ اور اس کی ٹرین کو رات کے ایک بجے روانہ ہونا تھا۔

وہ گھبرا کر ایک دم ہی بیڈ پر اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اس کی ٹرین ریس ہو گئی۔ اب وہ وقت پر نہیں ملے گا۔ اسے دوا

پائے گا؟ اس طرح سے کمرے میں گھبراہٹ اسے دوا نہیں لیتی چاہیے تھی۔ چند گھنٹوں کی تو بات تھی

بڑا اشت کر لیتا درد۔ بہرحال جو ہو چکا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب اس کو فوری طور پر اس پریشانی کا کوئی حل

دعوں نہ تھا۔ اسے فوری طور پر نہیں تھپنے کے لیے کوئی

اور راستہ بھولنا تھا۔

اس نے ہول کے رہسپیشن کا نمبر ملایا۔ وہاں پر اسے بتایا گیا کہ Alta velocita یا eurostar ان دونوں تیز رفتار ٹرینوں میں سفر کے لیے پہلے سے سیٹ ریزرو کروائی جاتی ہے۔ اچھا تو وہ سوٹ ریزرو کروا لیتا ہے، اگلی ٹرین روانہ کئے بغیر ہوگی۔ رہسپیشن پر موجود لوگ نے اسے اس کی مطلوبہ معلومات پیش منٹ کے بعد فون پر پہنچائی تھیں۔ صبح چھ بجے eurostar نے روانہ ہونا تھا مگر اس میں کوئی سیٹ دستیاب نہیں تھی اور اگلی Alta velocita نے روم سے نکلنے کے لیے روانہ ہی فتح اٹھ چکے ہونا تھا۔

وہ حقیقتاً "سرفشان" ہو گیا تھا۔ وہ سرودوں ہاتھوں میں پکڑ کر بچتا تھا۔ میٹنگ کی اہمیت اس کی حساس نوعیت اسے تو وہاں وقت سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، جبکہ یہاں تو اس کے صبح وقت پر ہی پہنچنے کے لانے پر اسے بہتے تھیں۔ رور ٹوکے کے علاوہ اس کے پاس اپنے یہاں کے آفس کے کسی بھی فرد کا کنٹریکٹ نمبر نہیں تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ کسی نہ کسی سے تو اسے مدد لینی پڑے گی۔ اٹلی اس کا ملک نہیں، اسے یہاں کی زبان نہیں، اتلی ہٹل سے تو معمولی سی معلومات ہی اسے آ رہی تھیں، بعد بھانجی گئی تھیں۔

ہنگامہ کیا بھی جنہیں آرٹ میں دلچسپی ہو جائے اور تم مجھ سے کوئی مینٹنگ نہواتا چاہو۔"

رور ٹوکے کے علاوہ اور کون انگلیشن ہے جسے وہ جانتا ہے اور جس کا کنٹریکٹ نمبر اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے ذہن دوڑانا شروع کیا تو ایک دم ہی اسے رور ٹوکے کی لیزا کے ساتھ لے کر ٹالور اس ٹاؤن کے اپنا فون نمبر بتا دیا۔ اس نے وہ چٹ کماں رکھی تھیں۔ جیسے ہی وہ فون پر اٹھا، وہاں رور ٹوکے کے سامنے موت ظاہر کرنے کو اس نے وہ چٹ جب سے اپنا والٹ نکال کر اس میں رکھی تھی۔ یہ سوجھ کر کہ باہر جا کر بھیج سکے گا۔ مگر پھر اسے وہ جھٹکنا یاد نہیں رہی تھی۔ وہ ایک دم ہی تیز رفتاری سے اٹھا والٹ اس کے

کوٹ کی جیب میں تھا اور کوٹ صوفے پر پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے والٹ میز پر پورا کا پورا خالی کر دیا۔ اس میں سے وہ جٹ نکل آئی تھی۔ وہ لیزا کا موبائل نمبر لیا تھا۔ اس نے تیز رفتاری سے وہ نمبر ڈائل کیا تھا۔ وہ فیملز جلدی پہنچنے کا کوئی قبلہ ذریعہ اس سے نہ چھلے گا۔ اس کا تو یہ ملک ہے، وہ اسے ضرور کوئی قبلہ بتا سکے گی۔ تیل جا رہی تھی۔ مگر یہ ٹائم کیا اسے فون کرنے کا کوئی مناسب ٹائم ہے؟ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو پوسٹل باج جا رہی تھی۔

وہ لیزا کا دوست نہیں۔ اس کا لیزا پر ایسا کوئی حق نہیں کہ وہ اسے بے وقت فون کمر کا سکے، جبکہ گزشتہ شام وہ اس سے کافی ٹھیک ٹھاک بدتمیزی بھی کر چکا ہے۔ اس خیال کے آنے کی وجہ سے اس نے فوراً ہی لائن کٹ دی تھی۔ نہیں، لیزا کو فون کرنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ ابھی اس نے لائن کٹی ہی تھی کہ لیزا کے نمبر سے اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے فوراً ہی کال ریسپونڈ کی تھی۔

"ہیلو۔" وہ آہستگی سے بولنا تھا۔ جواباً وہ انگلیشن میں رولٹی سے کوئی جملہ بولی تھی، جو ظاہر ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ جواباً "انگریزی میں بولا تھا۔"

"لوہہ سمندر پر اٹھو؟" وہ جیسے ان جانے نمبر سے کال کرنے والے کو اب شناخت کر پائی تھی۔

"میرے پاس نامعلوم نمبر سے کال آئی اور پھر فوراً ہی لائن کٹ دی گئی تو میں نے حیران ہو کر سوچا کون ہے اس ٹائم پر کال کرنے والا کون ہے؟ یہ جیک کرنے کے لیے وہ ہی نمبر ملایا۔" وہ اپنے اسی قصور خوش اخلاق انداز میں بولی تھی۔

"آٹم سووی میس نے تمہیں غلط وقت پر کال کی۔"

"کوئی بات نہیں، میں جاگتی ہوئی ہی تھی۔ تم چاؤ کسے فون کیا تھا؟ کوئی پرائیم؟" وہ کل اس سے کتنی بدتمیزی سے پیش آچکا ہے اس بات کا کالک سا بھی تاثر اس کے لہجے میں موجود نہیں تھا۔ اس کی وہ ہی ہے

"تم زحمت مت کرو لیزا۔" اسے فوراً نہیں بتا تھا کہ خود کس طرح ہلنے روڑا لپیٹنا چاہئے گا۔ ٹیکسی و فیرو کا بھی اگر سزا دیت کرنا ہے تو زبان کا مسئلہ راستے میں اور مشکل تک پہنچنے میں درپیش آسکتا تھا۔ لیزا اس کے ادھر سے چلے گئے جواب میں فوراً بولی تھی۔

"بھی ان فارمیٹرز کو رہنے دو اس وقت تمہارے لیے اہم ہے رقت پر نیپلز پہنچنا۔ تم جلدی سے تیاری کرو میں فوراً پہنچ رہی ہوں۔"

ہاں اس وقت اسے مسئلے کا حل وجود نہ تھا۔ اس نے نیم رضامندی کے ساتھ لیزا کو اپنے ہوس کا نام بتا دیا تھا۔



اس کا گھر قریب تھا باہر واقعی اپنے زمانے کے مطابق تیز دروازے ہوئے تھے۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی ہندو منیٹ کے اندر اس کے ہوٹل میں موجود تھی۔ وہ ہوٹل کی لابی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لیزا نے اسے گل کی تھی۔ "میں پہنچ گئی ہوں تمہارا جاکو۔"

وہ اپنا لیڈر بریف کیس ہاتھ میں لے کر باہر آ گیا تھا۔ اسے سخت شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ کسی سے آپ اتنی بد تمیزی کریں اور پھر شخص ہارے شخصوں کے اندر اندر اسی شخص سے مدد لیں۔ اسے لیزا کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ مگر وہ دروازے پر پہنچ کر ہنس مٹا کر بولے۔ اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اس نے کریم کلر کی جرسی فی شرٹ بلیک جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ اس کے سرخی ہاٹھ اور اڑنا بال شانوں سے کچھ نیچے گتے تھے اور اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ اس نے آگے کے بالوں کو کاتوں کے پیچھے کر رکھا تھا۔ پینک لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر تھی تھی۔ ہوش کی طرح ٹیس اور ڈینٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ سیٹ بلیٹ باندھے ہوئے بیٹھی تھی۔

"چلو سکندر۔"

"جاکو۔" اس کے برابر الی میڈیٹ بیٹا آیا تھا۔

تکلفی و خوش دلی کی آواز اس کی سماعتوں سے گھرا رہی تھی۔

"مجھے صبح آٹھ بجے نیپلز پہنچنا ہے ایک بہت ہی اہم میٹنگ کے لیے۔ اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور میری ٹریفک ٹرس ہو گئی ہے۔ پلینز تم مجھے یہ گائیڈ کرو کہ میں اب کس ذریعے سے سفر کروں کہ نیپلز درست وقت پر پہنچ سکوں۔"

"تمہیں نیپلز جانا ہے، ہوں۔" اس نے سوچنا شروع کیا۔

"جناز کا آپشن تو فغول ہے فلائٹ کا نام تو ایک گھنٹے سے بھی کم ہے۔ مگر یہاں سے ایئر پورٹ پہنچنے پر پھر وہاں تمام فارمیٹرز سے گزرتے سفر کرنے کے بعد نیپلز پہنچنے کے تو وہاں بھی ایئر پورٹ سے شہر کے مرکز تک پہنچنے میں تھیں کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ جتنی بھی فاسٹ ٹرینیں ہیں ان میں تھیں کہ تم بھی ایک دن پہلے سیٹ پر بیٹو کر والی پڑے گی کیونکہ ٹورسٹ سیزن ہے اور ان پر رش ہو گا سلو ٹرینز سے پہنچنے میں تھیں نہیں سے ساڑھے تین گھنٹے لگ جائیں گے۔" وہ جیسے مختلف آپشن پر غور کرتی جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"ہائے روڈ۔" وہ ایک دم ہی بولی۔ "تمہیں یاد ہے روڈ نیپلز جانا چاہیے۔ صبح سویرے کا وقت ہے ٹرس وقت تمہیں زیادہ ٹریفک نہیں ملے گا اور ڈرائیور اگر مجھ جیسا ہوا تو تم ڈھائی گھنٹے میں نیپلز میں ہو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔

ابھی وہ بول رہی تھی کہ لیزا نے فوراً ہی مزید بولی۔

"تم مجھے اپنے ہوٹل کا نام بتاؤ۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں، جتنی دیر مجھے پہنچنے میں لگے گی تم اس میں اپنی تیاری کر لو۔"

وہ اس سے صرف مشورہ اور حل معلوم کرنا چاہتا تھا اس کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ بالکل بھی مناسب نہیں تھا اپنی وجہ سے کسی کو زحمت دینا ٹینڈ سے اٹھانا اور پھر دوسرے شہر جانا۔

درد، اس وقت صرف اس کے سر میں درد نہیں ہوتا تھا ایک دن منہ کے لیے اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔ سیٹ کی پشت سے کمر نکالی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لیزا کی توجہ ڈرائیونگ پر ہے۔ اس کا حسیان اس پر نہیں گیا ہو گا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں لیزا نے اس سے پوچھا۔
”تھیک ہے۔“ وہ اپنے الفاظ میں زور پیدا کرتا فوراً بولا۔

”مجھے نہیں لگ رہی۔“ وہ جواباً بھجی گئی سے بولا۔ اس بار وہ جواب میں چپ رہا تھا۔ اس کا انجی طبیعت کو موضوع گفتگو بنانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چونکہ اسے گردن دائیں بائیں کرنے میں تکلیف ہو رہی تھی اس لیے اس سے بات کرنے کے لیے وہ پورا کا پورا اس کی طرف مڑا۔ اب جبکہ وہ اس کا احسان لے چکا تھا اور وہ اتنی غیر معمولی حد تک جا کر اس کی مدد کر رہی تھی تب اخلاق اور تہذیب کا اضافہ یہی تھا کہ وہ اپنے کل شام کے رہنے پر اس سے معذرت کرے۔ اس کے کچھ کہنے سے بھی پہلے بتا نہیں لیزا نے اسے اسنے غور سے کیوں دیکھا تھا۔ وہ سنجیدگی پر زور دہاری سے گویا ہوا تھا۔

”اگم ایکسٹری میلی سواری لیزا میں نے کل تمہارے ساتھ کالی میں لی ہو کیا تھا۔“ اچھوٹکی میں کسی اور بات پر اب سیٹ تھا۔

”کہ میں تمہارے سامنے آگئی اور تم مجھ پر خفا ہو گئے۔“ وہ اس کا جملہ اچک کر مسکرا کر بولی۔ جسے اسے انتقام پر وہ جیسے اپنی ہی کئی بات کا مزہ لیتی تھی۔ اسے اتنی ملا تھوڑی کے بعد اب اندازہ ہو چکا تھا کہ بات بے بات مسکرا کر ادا رہے تھا بلو لیزا اس لڑکی کی ناکت تھی۔
”بے فکر رہو میں نے تمہاری باتوں کا برا نہیں مانا۔ مجھے کل ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کسی اور بات سے اپ سیٹ ہو سوئے تم کس بات پر اب سیٹ تھے؟“

پھر وہی ذاتی سوال آخری لڑکی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کیوں کرتی تھی؟ شاید نہیں۔ یقیناً

اس نے بھی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ پانچ پینٹیس، پانچ جائلز پر سورج نکل رہا تھا گویا اچھی سورج بھی نکل رہا نہ ہوا تھا جب سوا پانچ بجے انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

”اگم سواری لیزا! تمہیں میری وجہ سے اس قدر راحت اٹھنا پڑی ہے۔“

جو وقت لوگوں کے سونے اور آرام کرنے کا ہوتا ہے اس وقت اپنے آرام وہ بستر سے نکل کر وہ اسے ایک دوسرے شہر پہنچانے جا رہی تھی۔ وہ سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے ایسا کون سا دستہ بند رکھا تھا جو بدلے میں اپنے لیے کسی احسان کی توقع نہ تھا۔

”سننے پر تکلف ہماری بھر کم جملے مت بولو، تم زور دے کر لڑکھو اور وہ بڑے میرے بچپن کا دوست ہے۔“ اگر وہاں موجود نہیں ہے تو اس کی غیر موجودگی میں مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

”اگم اس وقت جاگتی ہوئی کیسے تھیں؟“ سے یاد آیا۔
دو دن پہلے یہی کہہ رہی تھی کہ وہ جاگتی ہوئی تھی۔

لیزا اس کے سوال پر ہنس۔ ”میں اپنے اسٹوڈیو میں تھی، پینٹنگ کر رہی تھی۔ تمہارا شاید بھی واسطہ نہیں پڑا اگم آرٹسٹ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کام کی دھن سوار ہو جائے تو دن اور رات کے احسان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔“

اس کی نگاہیں اسٹیرنگ پر جمے لیزا کے احوال پر پڑیں۔ اس کی انگلیاں بھی محسوس تھیں۔ بلاشبہ یہاں تک ایک آرٹسٹ ہی کے ہاتھ تھے۔ ٹرین من ہونے کی فکر اور فیملی وقت پر پہنچنے کی غرض سے اسے اپنا درد بھول گیا تھا۔ اب یہ مسکون ہو کر گاڑی میں بیٹھا تھا اور وہ اس کا احساس جاگ تھا۔ وہ لوگ ہائی روے کی طرف رواں دواں تھے لیزا کا دماغ تھا کہ وہ اسے ساڑھے سات اور پونے آٹھ کے چھ فیملز پہنچا دے گی۔ اسے دوبارہ درد کی شدت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہی گردن کے پچھلے حصے سے اٹھتا کندھے اور بازوؤں تک جاتا ہوا

پراس کی مدد کے سہارے نیپلز جا رہا تھا۔ تب فوراً اپنی ٹون ٹارنل کر کے اپنے تخت سے کا اثر ڈالنے لگے۔

"میں اکیلا ہوں" میری فیملی نہیں ہے۔ "لیزا نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اس کے فیملی نہ ہونے والے جملے کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا اس نے اگر نوٹس لیا تھا تو اس کے بل بھر میں بدلتے لب و لہجے کا ایک انٹالین لڑکی کے نیلے فیملی کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی جو وہ اس کے جملے میں موجود کرب کو محسوس کر پاتی تھی۔

"مہو تم اچھے خاصے بد فیئر پروجیکٹوں میں بد فیئر تھیں ٹوٹ کر رہی ہے۔"

وہ جملہ مکمل کرنے کے بعد مسکرائی تھی۔ وہ جس رفتار سے ڈرامیوگ کر رہی تھی اسے نہیں تھا اسے مقررہ وقت سے پہلے نیپلز پہنچا دے گی۔ ایک ایسا بار تو اس نے اتنے خطرناک انداز میں موڈ کا تھا کہ اسے لگا تھا اب ایک سیکنڈ منٹ ہوا کہ تب۔

"تم مجھے پام پر پہنچانے کے لیے اس اسپڈ سے ڈرامیو کر رہی ہو؟"

"نہیں" یہ میری طاقت ہے ان فیکٹ یہ تمام انٹالینز کی عادت ہوتی ہے" ٹاسٹ ڈرامیوگ، ہم انٹالینز کی پہچان ہے۔"

جواب قابل فخر مگر نہ تھی وہ اسے بھی فخریہ انداز میں بیان کر رہی تھی۔ وہ اس کے فخریہ انداز میں گردن اڑھکی کر کے بولنے پر مسکرایا تھا۔ چند منٹ خاموشی سے ڈرامیو کرتے رہنے کے بعد لیزا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سیدھا ہنسا دینا اس کے من سے اس بارہائی دے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی نگاہیں محسوس کر کے وہ پھر گردن ان کی طرف نہ ٹھکانے کے باعث سیٹ پر بیٹھے پراس کی طرف گھوا۔

"تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے نا؟ تم نے کوئی میڈیسن لی؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میڈیسن لے لی تھی۔" تکلیف زیادہ نہیں ہے۔۔۔ لاؤ اب میں ڈرامیو کروں؟" اس نے لیزا کے انٹالین صبح سویرے نہ استنا سر نہ ہونا۔

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات آئے تھے کہ وہ اس سوال کو ناپسند کر رہا ہے تب ہی وہ جلدی سے معذرت کرنے والے انداز میں بولی۔

"نہیں جانا چاہیے۔ مت جانا مگر دوبارہ مجھ پر اپ سیٹ مت ہونا۔"

جملے کے آخر میں وہ مسکرائی تھی، تکلیف کے باوجود اس بار وہ بھی مسکرایا تھا۔

"تمہاری گردن میں تکلیف ہے؟" اسے اب لیزا کا چند منٹ بل اہلی جانب بخور دیکھنا سمجھ میں آیا تھا۔ وہ جس طرح پورا کا پورا اس کی طرف گھبراہٹ کرتے کے لیے اسے لیزا نے محسوس کیا تھا۔

"ہاں" مشاعرے سوتے میں جھٹکا اٹھا۔ وہ لہجے کو قصداً بہت لاہو دیا کر بولا۔ لیزا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی سیٹ بیک کو تپتے کی طرف کر دیا۔

"تم آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھا جاؤ" چاہو تو پیچھے سیٹ پر لیٹ جاؤ۔" وہ اس آفر پر اب کی بار نہیں بڑا تھا۔

"تم کیوں نہیں؟" میں نے کیا کوئی لطیفہ سنایا ہے؟" لیزا نے اسے گھورا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی۔" وہ ہنسی روک کر بولا۔

"تم کیا پینٹ کرتی ہو؟" اس نے پہلی بار اس سے کوئی سوال کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پوچھا تھا۔

"زیادہ تر لینڈ ایکسپل لائف اور پورٹریٹس" کبھی کبھ اور موڈ میں جاسکے تو وہ بھی پینٹ کر سکتی ہوں" ورنہ میرے خاص موضوعات یہ ہی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ پراس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تم وہ باتیں رہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہاری فیملی بھی وہیں رہتی ہے؟"

لیزا نے یہ سوال شاید ٹول اہی پوچھ لیا تھا۔ مگر اس کے لب ایک دم ہی بیچ گئے تھے۔ چہرے پر سختی اور کردار اپن آ گیا تھا۔

"بہتر ہو جائے گا اگر تم مجھ سے برسل سوالات نہ کرید۔" سخت لہجے میں بولتے بولتے اسے ایک دم ہی یاد آیا کہ وہ اس وقت اس کی گاڑی میں اس کے آسرے

کہا وہ جواباً فوراً بولا۔

"and organized crime" اور منظم جرائم لیزا نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ وہ اپنے یو ایس سے ہمیں وہ اپنے پورے اٹلی سے محبت کرتی تھی۔ تب ہی اس کے خلاف کچھ سناتا ہے پسند نہیں تھا۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا۔ برا کی بدائش فیملی میں ہوئی تھی تو دنیا بھر میں منظم جرائم کا آغاز بھی تو ہمیں سے ہوا تھا کیا ہاں؟" (camorra) دنیا کا خطرناک ترین باپا نہیں؟

وہ اپنی منہل پر پہنچ چکا تھا اب پر سکون تھا اس لیے اسے لیزا کو چرانے میں لطف بھی آیا تھا۔

"ہاں ہے۔ مگر عام لوگوں کے ساتھ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ فیملی کی ریپریشن ہی زیادہ ہے۔" فوراً فیملی کے دفاع میں بولی تھی۔

آٹھ بجے وہ اسے اس سڑک پر لے آئی تھی جہاں اس کی بیٹی کا ہیڈ آفس واقع تھا جن کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔ جس علاقے میں وہ تھے وہاں جدید عمارتیں تھیں۔ وہ سلسلے نظر آتی بلڈنگز کو دیکھ رہا تھا جب لیزا اس سے بولی۔

"ہیڈنگ کے علاوہ ہیں ایک تاریخی اور ایک ماڈرن اس ماڈرن علاقے سے ذرا نکلو تو ہمیں تاریخی عمارتیں مگر جاگہ اور فوارے جابجا نظر آئیں گے۔

اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ اپنی دل پاور کو استعمال کر کے تکلف اور ورد کے کسی بھی احساس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دے رہا تھا۔

کوٹھے گئے بعد اس کی میٹنگ تھی اور اس کے لیے اسے بہت الٹ اور ایکٹو رہنا تھا اپنے ذہن کو مکمل طور پر حاضر رکھنا تھا اب چونکہ اس کی منزل نزدیک آچکی تھی تو لیزا کا شکریہ ادا کرنے کا وقت آچکا تھا۔

اس نے دل میں ارادہ کیا تھا وہ اٹلی سے واپس جانے سے قبل لیزا کو کوئی بہت اچھا اور قیمتی تحفہ دے کر جائے گا۔ اس کے احسن کا بدلہ چکانے کے لیے

اسے مسلسل شرمندگی کا احساس تھا۔

"تم آؤ اس سے بڑھ کر اور میری ذرا پیونگ سے لطف اندوز ہو۔" وہ مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں بولی۔ "تمہاری اس ذرا پیونگ کے دوران صرف اللہ یا تو آسکا ہے اور آ رہا ہے۔" وہ اسی کی ٹون میں جواباً بولا۔

لیزا کا کھلا کر ہنسی تھی۔ "میری یہ ذرا پیونگ ہی نہیں ٹھیک وقت پر تمہاری منزل پر پہنچے گی۔" اسے بات بے بات کس قدر سننے کی عادت تھی۔

"تم نے میرے دماغ میں اب تک کہاں کہاں گھوم لیا؟ کتنی جگہوں کی سر کرلی؟"

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد لیزا نے اس سے پوچھا۔ اس کے میرے روم کینے میں اپنے شہر کے کتبے سے پناہ تھیں جیسی ہوئی تھیں۔

"کسی بھی جگہ کی نہیں" میں نے صرف

Via Barberini اور Veneto کے آس پاس کی جگہیں تے جاتے دیکھی ہیں۔" وہ صاف گوتی سے بولا۔

"کیا؟ تم eternal city میں ہو دنیا بھر کے ٹورسٹ کی ضرورت جگہ پر آئے ہوئے ہو اور وہاں پر کچھ بھی نہیں دیکھا؟"

وہ حیرت کی زیادتی سے چلائی تھی۔ لیزا کے لفظ اور اس کا انداز بنا رہا تھا کہ وہ اپنے شہر سے محبت کرتی ہے اور اس پر فخر میں بھی مبتلا ہے۔

"ہاں میرے پاس نام نہیں تھا اور میرا دل بھی نہیں چاہتا تھا۔"

وہ جواباً سنجیدگی سے بولا تھا لیزا نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

لیزا نے اپنے دماغ کے مطابق پونے آٹھ بجے اسے فیملی پہنچا دیا تھا۔

"Wel come to naples the birth place of pizza"

(یعنی اسکے پیدائشی شہر فیملی میں خوش آمدید۔) لیزا نے مسکرا کر قدرے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر

بیڈنی بکس کا تیار کردہ

سروئی میٹر آئل

JOHN HARTON

✽ گرتھ ۷۰۰ ہارن کو روکنے

✽ سے آئل آگاتا ہے۔

✽ ہارن کو مشین اور جھکا دیتا ہے۔

✽ مرادیں اور لوہوں کو بھرنے کے لئے

یکساں سفید

✽ ہر قسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

”سروئی میٹر آئل“ 12 بڑی بھریں ہر گرتھ کے لئے اس کی چوڑی
سکھڑا ہل بہت مشکل ہیں اور ایسی چوڑی مقدار میں چھڑا ہے۔ یہ ہارن میں
یا کسی دوسرے مشین میں دستیاب نہیں ہو سکتی جس کو بھی چھڑا جاسکے، ایک
بھری کی قیمت صرف = 100 روپے ہے۔ دوسرے مشین والے بھی آؤر تھوڑے
گرتھ چھڑا کر اس سے مشینوں میں سے مٹوانے والے بھی آؤ؟ اس
حساب سے گواہ ہیں۔

2 بھریں کے لئے = 250 روپے

3 بھریں کے لئے = 350 روپے

نوٹ:۔ اس میں ڈاک خرچہ اور پیسنگ ہارڈ شال ہیں۔

ہفت آؤر چھپنے کے لئے ہمارا پتہ:

پتہ: ”پتھر“ 53۔ اورنگزہب مارکیٹ، ریکٹر طورہ ایم اے جہاں دروازہ کراچی
رومینی خریدنے والے حضرات صوفی بیٹو آئل ان جگہوں
میں حاصل کریں

پتہ: ”پتھر“ 53۔ اورنگزہب مارکیٹ، ریکٹر طورہ ایم اے جہاں دروازہ کراچی

فون نمبر: 32735021

نہیں یہ تو بہت بھولی سوچ ہوتی مگر اسے یہ ضرور
جاننے کے لیے کہ وہ اس کے غلطوں اور دوستانہ رویے
کی دل سے قدر کرتا ہے۔

”تمہارا بہت شکریہ لیزا! تم سچ حقیقت میں
میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنی ہو۔ تمہاری وجہ سے
میں غمخیز ٹھیکہ وقت پر پہنچا ہوا ہوں۔“

اس نے تشکر کے احساس سے لہرزاؤں والی جملے
بولنے شروع کیے ہی تھے کہ لیزا گاڑی کو ایک پارک
پاس لاکر روکی ہوئی رہی۔

”ابھی کہاں سے شکریہ اٹھا؟ جب ہم روٹا واپس
پہنچ جائیں گے تب میرا شکریہ ادا کرنا۔“

”تم یہاں روکو گی؟ مگر کیوں؟ دیکھو میری دونوں
طرف کی ٹرین کی سپیشل ریزروئٹیں۔ میں شام میں
اپنے ملے ہوئے پروگرام کے مطابق Velocita

Alla سے روم آؤں گا۔“

”لور میں اتنی لمبی ڈرائیو وہ بھی خالی بیٹھ کر کے
واپس روٹا روانہ ہو جائوں؟ مجھے کیا مانگی سمجھو رکھا ہے؟“

سینہ پر سکندر؟ میں نے ابھی ناشتہ کرنا ہے کچھ دیر
آرام کرنا ہے، پھر چارلس کی واپس تمہیں ساتھ لے کر
نکتہ دہے، تمہیں تم بھرنے اپنی ٹرین میں کر دو۔“

لیزا اسے جواب دے کر گاڑی کا دروازہ کھول رہی
تھی۔

”آج ناشتہ کر لیتے ہیں جلدی سے۔ پھر تمہاری
میننگ کا نام پوچھا جائے گا۔“

وہ مسکرا کر کتنی گاڑی سے اتر چکی تھی۔ لیزا کا انداز
آئل تھا گویا وہ اسے ساتھ لے کر ہی واپس جائے گی۔

وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے اپنی زندگی کا
بڑا حصہ امریکہ میں گزارا تھا۔ جہاں بار کا مطلب وہ
جگہ تھی جہاں شراب نوشی کے لیے جایا جاتا تھا۔ آٹلی

آٹکرا سے جاتا تھا کہ یہاں بار کا مطلب امریکا کے لیے
بار سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں بار کا مطلب وہ جگہ تھی
جہاں انٹیلیجنس کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ پہلے کافی پیئے اور

خانا کھانے آیا کرے تھے اسی طرح شام یا رات کے
اوقات میں بھی یہاں زمانہ ترانے ترکانی پیئے ہی کے

کر دیا۔
وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے بولی تھی۔
”ہی لیزا! اسے اپنی سوچ کو ہٹاتا ہوا بلڈنگ کے اندر داخل
ہو گیا تھا کہ سرپرست اس کے لیے سب سے اہم چیز
اس کی مینٹگ تھی۔“

مینٹگ ختم ہونے پر اس نے لیبرا کو کال نہیں کی
تھی۔ اسے یہ بہت ہی بہت غلط محسوس ہو رہی تھی کہ
وہ اپنے دس کام چھوڑ کر یہاں فیصلہ میں اس کی خاطر
رہی ہوئی تھی۔ مگر لیزا نے خود ہی اسے فون کر لیا تھا۔
”ختم ہو گئی مینٹگ؟“

”ہاں۔“ وہ آج صبح سویرے سے اس کے احسان
لیتا شرمندہ سے شرمندہ تر ہوئے چلا جا رہا تھا۔

”آجاک! پھر میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ
فوراً ہی باور آ گیا تھا۔

”تم یہاں کب سے میرا انتظار کر رہی ہو؟“
”بہتر نہیں مینٹ ہوئے ہیں دیکھتے آئے
ہوئے زیادہ دیر سے نہیں کھڑی۔“ جتنی دیر تمہاری
مینٹگ چلی ہے میں نے دو آرٹ لیبر روز کر لیں۔
ایک دو جاہیں اور بھی جانے کا موذ تھا۔ بچپن کی کچھ
بوس مانہ کرنے کا گھر میں نے سوچا وہاں کہیں مجھے دیر
نہ لگ جائے بھر بلا وجہ تمہیں میرا انتظار کرنا پڑے
گا۔“

وہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔

”تمہاری مینٹگ کیسی رہی؟“

”بہت اچھی۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ہو گیا۔“ وہ
پر سکون انداز میں بولا۔ لیزا کے چہرے پر خوش بھرا ناز
آیا تھا۔

”چلو! یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔ تمہاری طبیعت اب
کیسی ہے۔“

اس نے مینٹگ کے اچھے انداز میں ہو جانے پر
خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی فوراً اس کی طبیعت
بھی پوچھی۔ ابھی وہ اس سوال کے جواب میں کچھ کہی

لیجے میزوں پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ باہری
سے لوگ اپنے روزمرہ استعمال کے درجہ کے بے اور
بولٹز خرید کر لے جاتے تھے۔ یہ بازار انٹالین سوشل لائف کا
ایک اہم حصہ تھا۔ وہ جتنے دنوں سے وہاں میں تھا
روزانہ آفس جاتے وقت راستے میں پڑتے ایک بار پر
لوگوں کو سینڈویچ پیمٹری ڈونٹ کے ساتھ جلدی
جلدی کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ یہ
جلدی ان کے اپنے کالم پر پہنچنے کی غلت کو ظاہر کیا کرتی
تھی۔ وہ دنوں اندر آگئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے جو بار
سینڈو کھڑا تھا۔ لیزا نے اس کو دو سینڈویچز اور دو کپ
کافی کا آرڈر کیا تھا۔ وہاں کچھ لوگ میزوں پر بیٹھے کافی
اور پیمٹری یا سینڈویچ کھا رہے تھے جبکہ زیادہ تعداد
میں لوگ کاؤنٹر کے سامنے ہی کھڑے جلدی جلدی اپنا
پائٹا منانے میں مصروف تھے۔ وہ اور لیزا ایک میز پر
بیٹھ گئے تھے۔

”تم لیزا اپنی سولت کے حساب سے وہاں چلی
جاؤ۔ میری مینٹگ پچ نہیں کتنے گھنٹے پہنچے؟“
مینڈویج کھاتے ہوئے اس نے بولا۔ وہ اسے اپنی وجہ سے
مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

”سینڈو سکندرا! میں کوئی بھی کلام اوجھڑا نہیں
کر لی۔ یہ میری عادت ہے۔“ وہیں ساتھ لے کر آئی
ہوں تو اب ساتھ واپس لے کر بھی جاؤں گی۔ ایسی کچھ
شکل مت بناؤ۔ میں آج کافی سالوں بعد فیصلہ آئی
ہوں۔ تمہاری بدولت اگر سال آئی گئی ہوں تو فوراً
وقت یہاں گزارنا چاہتی ہوں۔ جب تک تم اپنی
مینٹگ میں مصروف ہو گے میں یہاں کی کچھ آرٹ
ٹھیکر کو کوڈز کر لوں گی۔ Neapolitana پراکھا
لوں گی۔ برا عزم ہو گیا مجھے فیصلہ کا پراکھا کھائے
ہوئے۔“

وہ اسے یہاں نہ رکھنے کے لیے اب مزید کچھ بھی
کہہ نہیں سکتا تھا۔ پانچ گھنٹہ منٹ میں اپنے اس مختصر
ناشتے سے فاریغ ہو کر وہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ لیزا
نے اسے اس پیمٹی کے آفس کے سامنے اتار دیا تھا۔
”جب تمہاری مینٹگ ختم ہو جائے تو تم مجھے بھی

نہ بولا تھا کہ وہ فوراً سنجیدگی سے بولی۔
 ”اگر میرے سر میں سوال نہیں اور تم جواب دینا چاہو تو
 بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔“
 وہ اسے اس کی کئی بات بتا رہی تھی۔ وہ ہلکا سا
 مسکرایا۔
 ”میں یہ پرسوال نہیں۔ میری طبیعت ابھی
 بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ مگر صبح سے کافی بہتر
 ہے۔ اصل میں مجھے cervical pain رہا تھا۔“
 ”اوپر تب ہی تم اتنی تکلیف میں لگ رہے تھے۔
 تمہاری شکل دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا تمہاری طبیعت
 ٹھیک نہیں ہے۔“
 وہ فکر سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہ اس بار
 جواباً کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

”تمہاری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ورنہ میں
 نے سوچا تھا کہ میں فیملی کی ایک دُخ خوب صورت
 جگہ میں دکھاؤں گی تاکہ آئندہ تم فیملی کو صرف منظم
 جرائم دی کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کے خوب
 صورت کو مثل ایریا اور اس کی history
 rich (تاریخی اہمیت) کے حوالے سے بھی یاد
 رکھو۔“ وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔
 ”تم نے میری بات دل پر لے لی۔ مجھے یقین ہے
 فیملی بہت خوب صورت شہر ہے۔ میں فیملی کی بار
 آیا ہوں مگر میں نے کئی موزوں میں فیملی کی کافی خوب
 صورت جگہیں دیکھ رکھی ہیں۔“ لیزا اس کا جواب سن
 کر مسکرائی تھی۔
 ”بچاؤ برا لگاتے ہیں۔ فیملی اگر تم نے یہاں کا پورا
 نہیں کھانا تو یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہو جائے گی۔“
 وہ مسکرا کر بولی تھی۔ اس نے مراثیات میں بلا دیا
 تھا۔

”آج بھی سارے اٹلی میں فیملی کا پورا ہیٹ تسلیم
 کیا جاتا ہے۔“ لیزا اسے بتا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی
 طرح کسی بھی طرح کے گوشت کے بغیر دلا پزاکھا رہی
 تھی۔ شاید گوشت کے دلدادہ نہیں تھی۔ پرا تو مزے
 کا تھا ساتھ اس پاس کا احوال بھی پرا زندگی سے بھرپور
 ساتھ۔ اس پاس سے گزرتے مقامی لوگ غور سے
 ہنہہ آگیا۔ اچھا بیٹھا ہو تو پورا نہ ہو۔ تاریخی عمارتوں کے
 درمیان گھری یہ جگہ واقعی دیکھ جانے اور وقت
 گزارنے کے لائق تھی۔

جو کچھ زندگی اب تک اس کے ساتھ کر چکی تھی
 وہی ایک بار پھر بھرا گیا تھا۔ وہ نہ سکند کو برا لگتا تھا نہ
 ہی اس کے برادر آسکا تھا۔ وہ غمزدہ تھا اسے۔ ساری
 زندگی اسے سہری پر تھا تھا اتنی سی خواہش کی تھی
 اس نے کہ سکندر کی طرح اس کا بھی بار بار میں دانہ

”دبا بحر میں مقبول یہ دُش فیملی میں غریبوں کی
 آف کے طور پر تیار کی گئی تھی آج سوچو تو کس قدر
 بدلتا ہے۔“

اس مذاق اڑانے کے لیے اسے فون کیا ہے۔ دیکھ لو جنال میں ہوں وہاں تمہاری رسائی بھی ہو ہی نہیں سکتی۔

”تمہارا اتنی اچھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے اس بات کی مبارکباد۔ کیل فورنیا یونیورسٹی بہت اچھی ہے۔“

”سگرا بارڈر سے کہہ ۳۳ سے لگاتار ہی محل میں اس پر ہنسنے سکندر نے یہ ضرور کیا ہو گا۔ اسے سکندر کی خوشی سمجھنا اور اس کی ہنس اپنا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ سکندر کے لبوں کی ہنسی اور اس کی زندگی کی ہر خوشی اس سے چھین لے۔“



وہ دونوں راہی کے سفر پر تھے۔ گناہ ختم کرتے ہی انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا تھا۔

”میری وجہ سے تمہارا آج کا پورا دن ضائع ہو گیا۔ یقیناً تمہاری آج کے دن کے لیے اپنی بہت سی مصروفیات ہوں گی۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اب اس کے دذد میں دست کی تھی۔

”میں آج کل اپنی ویکیشن (چھٹیاں) منگوائے کر رہی ہوں بلکہ رات کی کوئی کمی نہیں۔ اچھا ہوا تمہارے ساتھ آئی اس ہفتے کی سال بعد میں نے فیملی دیکھ لیا۔ میں یہاں آخری بار شاید چھ سات سال پہلے آئی تھی۔“

وہ جتنا اس کا ممنون، زبرد اور احسان مند ہو رہا تھا وہ اتنا ہی یہ ثابت کرنے پر بھی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ آکر اس نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ وہ کہاں جاب کرتی ہے، جو آج کل اپنی چھٹیاں منگوائے کر رہی ہے اس سے پوچھا نہیں۔

پھر دھاتی ٹھنکے کا سفر طے کیا گیا تھا۔ وہ روم کی حلد میں داخل ہو رہے تھے۔ لیکن اس کی طرف دیکھ کر خیر مقدم کرنے والے لانداز میں مسکرا کر انہیں میں بولی۔

a roma la citta eterna”

”Benvenuto

ہو جائے اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے دن رات ایک کروڑ تھا، بے تحاشا محنت کی کئی راہوں کو جاگ جاگ کر دھاتھا، غم کو سکندر کے مقابلے میں بھر بار گیا تھا، یہاں سکندر کو رسائی نصیب ہوئی تھی وہاں اس کے قدم نہ پہنچ سکے تھے۔

شہر دار خان کو اس کے بارہ دیش داغہ نہ مل سکے کا زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بچپن کی باتیں تھیں جب وہ اسے سکندر کی مثالیں دے کر اس جیسا high achiever بننے کی تاکید کیا کرتے تھے اب شاید وہ اس سچائی کو تسلیم کر چکے تھے کہ ان کا دوسرے نمبر کا بیٹا ان ملاحقوں اور قابلیت سے محروم ہے جو پہلی پوزیشن لینے والوں کے پاس ہوتی ہے، جو سکندر شہر دار کیا اس ہے۔

وہ ذہن ہے مگر غیر معمولی ذہن نہیں وہ قابل ہے مگر غیر معمولی قابلیت کا حامل نہیں وہ سختی سے محراب قدرتی خوبی سے محروم ہے جس کے بل پر لوگ دنیا فتح کر لیا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ سکندر شہر دار نہیں۔ شہر دار خان اس کی تعلیم پر بھی اتنا ہی پیسہ خرچ کر رہے تھے جتنا سکندر کی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے حوالے سے انہوں نے کچھ پلان نہیں کر رکھا تھا، مستقبل کی ساری پلاننگ انہوں نے سکندر کی کر رکھی تھی۔ کس سال اس کی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز پوری ہوں گی اور کس پوزیشن کے ساتھ ہوں گی، پھر کس سال ولاء کا امتحان پاس کرے گا اور کتنے امتیازی نمبروں کے ساتھ کرے گا، پھر کس جگہ ملازمت سے اپنے شاندار بے مثال پروفیشنل کیریئر کا آغاز کرے گا۔ لہذا اس کا بارہ دیش ایڈمیشن نہ ہونا ان کے لیے کوئی دکھ کی خبر نہیں بننا تھا اس کا کیل فورنیا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا، سکندر نے اسے اس کے داخلے کی مبارکباد دینے کے لیے فون کیا تھا۔

”مبارک ہو زمین۔“

”کس بات کی مبارکباد؟“ اس نے خشک لبہ پر چپا تھا کہ اسے لگا تھا سکندر نے اس پر طنز کرنے اور

وہ اس کے اٹالین جیلے پر مسکرایا تھا۔

"citta eterna" ہا تو سمجھ میں آگیا۔ باقی
جیلے کا مطلب بتاؤ۔

"to roma the eternal city"
"Welcome"

(افغانی شہر دہلی میں خوش آمدید)

وہ بڑے جذب سے بولی تھی۔ اس نے بغور لیرا کو
دیکھا تھا۔

"تم اپنے شہر سے بہت پیار کرتی ہو؟" "ہاں بہت، مجھے اپنے دیار سے عشق ہے۔ یہاں
کی سڑکیں، یہاں کی گلیاں، یہاں قدم قدم پر کھری
ہسٹری۔ میں ان سب کی عاشق ہوں۔"

"حالانکہ تم تو رہتی ہی نہیں ہو۔ یہاں کی ہسٹری
آرت ہو یا آرکلیکچر سب کچھ ہر وقت حق تو
تمہارے ارد گرد موجود ہوتا ہے۔ عموماً تو خوب
صورت مشوں اور مارچنگ جگول پر رہنے والے لوگ
ان سب کو صبح شام دیکھ دیکھ کر فارغ انگشت
(for granted) لینے لگتے ہیں۔"

وہ اپنے شہر سے اس کی والمانہ محبت محسوس کر کے
سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں اپنے شہر کی کسی بھی چیز کو for granted
نہیں لیتی۔ میں دہلی کی ہسٹری آرت آرکلیکچر کو
بھی چیز سے بھر نہیں ہوتی۔"

لیرا نے بولتے بولتے ایک نظر اس کی طرف
دیکھا۔ اس وقت اپنی عادت کے مطابق مسکرایا نہیں
رہی تھی بلکہ قدرے سنجیدہ تھی۔

"پتا ہے سکندر! جب کوئی چیز ہم سے چھین جاتی
ہے تب ہمیں اس کی زیادہ قدر ہو جاتی ہے۔ اگر میں
ہمیشہ روم میں رہتی تو شاید اس کی یوں قدر نہ کرتی جتنی
آج کرتی ہوں کیونکہ اب یہ ہر وقت میرے سامنے
نہیں ہوتا۔"

اس نے لیرا کے چہرے پر ایک دکھ بھرا احساس
اتے دیکھا۔ وہ جس روز سے اس سے ملا تھا انے
اس لڑکی کو صرف بے تحاشا بیٹے اور بیٹے ہی دیکھا

تھا۔ خیال ہے وہ کتنے اندر کس طرح کا دکھ بسائے نہیں
تھی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی خوش نہیں؟ اور کسی کو نہیں
مگر کم از کم مسکرائیں اور خوشیاں بکھیریں اس لڑکی کو تو
خوش ہونا چاہیے تھا۔ زندگی کو اس لڑکی کو تو خوشیاں
دینی چاہیے تھیں۔

وہ آج صبح جب سے اس کے ساتھ تھا اپنی عادت
کے برخلاف کتنا زیادہ بولا تھا کتنی بار مسکرایا تھا وہ چند
دول بعد جب روم سے واپس چلا جائے گا تب لاکھ
وعدے کر لینے کے باوجود بھی اس بانجوان لڑکی سے کبھی
کوئی رابطہ نہیں دیکھے گا مگر پھر بھی وہ اس اجنبی لڑکی کو
اس لیے ہمیشہ یاد رکھے گا کہ اس کی وجہ سے آج
پورے بارہ سالوں بعد وہ اس طرح مسکرایا ہے انکا
زیادہ بولا ہے۔ لیرا اس کی سوچوں سے انجان اسے
بتا رہی تھی۔

"میں تیرہ سال کی تھی جب میرے مئی پاپا کی واپسی
وہس ہو گئی تھی۔ علیحدگی کے وقت ان دونوں کے
درمیان جس طرح جاتی تمام چیزوں کا ہواڑا ہوا تھا اسی
طرح ہم دونوں بہنوں کا بھی۔ اس مسئلہ نہ ہوا
میں میں پاپا کے حصے میں آتی تھی اور میری بہن مئی
کے۔ میری مئی کا تو یہ ملک تھا وہ یہاں سے کیوں
جاتی۔ میرے پاپا ایٹہ اٹالین نہیں تھے انہوں نے
یہاں کی صرف نیشنلسٹی لے رکھی تھی۔ مئی سے
علحدگی کے بعد وہ یہاں نہیں رہتا جاتے تھے اسی
لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر لندن چلے گئے تھے۔ اور
یوں سکندر! تیرہ سال کی عمر میں مجھ سے میرا روم چھین
گیا تھا۔"

وہ دکھ بھری لہجے میں بولتے بولتے ایک ہی کے
لیے خاموش ہوئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی
بات توجہ سے سن رہا تھا۔

"میں یہاں سے گئی تو میرا دل میں رہ گیا تھا۔ میرا
دل کبھی لندن کا نہ ہو سکا۔ میرا دل ہمیشہ یہیں رہا۔
میرے روم میں۔ میرے پاپا کا ملک تو نہ اٹلی تھا نہ
ان کا ملک تھا۔" "تھا؟" "تھا؟"
لندن میں ان کے لیے کچھ فرق نہ تھا۔ ان کی جذباتی

کرسچن ماں کی بیٹی تھی۔ اسے اس انکشاف پر حیرت ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی حیرت کا اظہار کر نہیں رہا تھا۔ ایسا کرنا اسے بچکانہ پن لگ رہا تھا۔

”باقی میرا تعارف یہ ہے کہ میں لندن میں رہتی ہوں۔ میں نے لندن سے پینٹنگ میں ماسٹر کیا ہے۔ میں وہاں راکس کالج آف آرٹس میں پینٹنگ ٹیچر اسکپ اور اسٹیل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ پینٹنگ میرا پیشہ (مشق) بھی ہے۔ پروفیشن بھی۔

جانب سے بیج جانے والے ٹائم میں میں ہینٹنگز جاتی ہوں، اپنی انٹریوشن کی تیاریاں کرتی ہوں۔ اپنی لائف میں کالی ٹرن مکافی مصروف رہتی ہوں۔ مگر میں جتنی بھی مصروف ہو جاؤں سال کے نو مہینے لازماً روم میں گزارتی ہوں۔ اپنے اس روٹین پر میں اٹھارہ

سال کی عمر سے کلمہ بند ہوں۔ میں نے دہائے جا کر بھی اپنا رشتہ کبھی یہاں سے ٹوٹنے نہیں دیا۔ اسی لیے میرے اسکول کے دوست بچپن کے ملنے جلتے والے ان سب سے میرا آج بھی یہاں پر وہی پہلے جیسا تعلق ہے۔ میں آج بھی لندن سے زیادہ روم ہی میں خود کو

ایڈ ہوم محسوس کرتی ہوں۔ میں یہاں ایسے آتی ہوں جیسے کوئی اپنے گھر آیا ہے۔ شاید اسی لیے انہیں میں مکمل انالین تھی گئی تھی اور روم میرا گھر بھی لگا تھا۔“

وہ دونوں اب دم کی مصروف اور شغف سے بھری مڑکوں پر سے گزر رہے تھے۔ اس کاؤنسل اب نزدیک ہی تھا۔ مگر شغف میں چھٹنے کے سبب وقت لگ رہا تھا۔

”میرا تعارف تو ہو گیا۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ؟“ وہ دونوں اس مڑک پر سے شغف میں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تب لیرا اس سے بولی۔

”میں! اس نے ایک پل کے لیے سوچا“ بھر سنجیدگی وہ بیماری سے بولا۔

”میں نے امریکہ سے لاء میں پچھلڈ ڈگری لی ہے۔ وہ ریونیو کی کیمپی کے وہاں واقع میڈ آفس میں لیگنل ایڈوائزر ہوں۔“

وہ جیسے ہی اپنے بارے میں مختصر گفتگوں میں دل کر

واپس آتی تو ان دونوں میں سے کسی بھی جگہ سے نہیں نکلتی۔“

لیرا کی ساری بات میں اس کے لیے حیرانی کی بات اس کے والد کا پاکستان سے تعلق ہونا تھی۔ اسے پہلے دن سے لے کر آج تک کبھی ایک پل کے لیے بھی لیرا کے مکمل انالین ہونے پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے بنا اختیار حیرت سے پوچھا تھا۔

”تمہارے والد پاکستان سے ہیں لیرا؟“ لیرا نے اس کی حیرت کو حیرت سے دیکھا پھر جیسے کچھ یاد کر کے اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

”دیکھو ذرا اہم کتنے دنوں سے مل رہے ہیں مگر ابھی تک ایک دوسرے سے مکمل طور پر اپنا تعارف تک نہیں کروایا ہے۔“

بات مکمل کر کے پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی پھر کچھ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

”ویسے ابھی تک تعارف ٹھیک سے نہ ہونے کی وجہ یہ بھی رہی کہ ہمیں پرسل باتیں کرنا پسند نہیں ہے سو میں تمہارے تعارف سے محروم رہی اور غم آتا روز ہو کر ملتے تھے کہ اپنے بارے میں بھی کبھی ڈھنگ سے کچھ بتائیں سکی۔“

وہ اس کی بدتمیزی اسے جتا رہی تھی اور آج مشکل وقت میں اس کی مدد کر کے اب امتحان تو دو رہتی تھی کہ اس کی بدتمیزی اور بد اخلاقی کا ذکر کر سکتے۔ وہ محو ذرا شرمندہ سا ہوا تھا۔ یہ بالکل راج تھا کہ آج تک اس نے اسے یہ موقع دیا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا مکمل تعارف کرا پاتی اس شرمندگی کے حصار سے نکلنے کے لیے سنجیدگی سے بولا۔

”تمہاری شکل صورت سے لے کر نام تک کسی بھی چیز سے مجھے کبھی یہ نہیں لگا کہ تم انالین اور کرسچن نہیں ہو۔“

”لیرا Hebrew (عبرانی) نام ہے اور یہ نام مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے پیار رکھتی ہوئی۔“

تو لیرا پاکستانی اور مسلمان باپ اور انالین اور

پوری طرح ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔
اس نے سرانبات میں ہلایا تھا۔ وہ سینور سکندر کا
لفظ بولا بڑے مزے میں کہتی تھی۔ وہ اس کے اس
انداز پر ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔



وہ اپنے ہوٹل دوم میں اگر ابھی جوتے ہی اتار آیا
تھا کہ اس کے موبائل پر کسی کی کال آنے لگی۔ اس کا
موبائل ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہ اٹھ کر میز کے پاس آیا۔
اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ یہ کال آمنہ کی تھی۔
اس کے چہرے کے سخت سے تاثرات دیکھتے ہی نری
میں تبدیل ہوئے تھے۔ اس نے بہت جلدی کے عالم
میں کال ریسیو کی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات
سے عاری نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہی وقت
میں بہت سے جذبات تھے۔ محبت، خوشی، غم، اسی، شکوہ،
نوحہ، غول پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔
(بالی آئندہ بابا بن شاء اللہ)

خاموش ہوا لیرا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔
”اتنا تفصیلی تعارف؟ میں سوتے سوتے تھک گئی۔ تم
بولتے بولتے نہیں تھکتے؟“

وہ اس کا ہنر سمجھ رہا تھا، مگر جواباً خاموش رہا تھا لیرا
آنکھوں میں شرارت سی چمک لے مسکرا کر مزید بولی۔
”تم اگر ایسے تعارف میں اس سے زیادہ ایک لفظ
بھی اور بولتے تو میں بہت حیران ہوتی کیونکہ میں بھی
توقع کر رہی تھی کہ سینور سکندر نے مجھے لپٹے پارے
میں کچھ بھی نہیں بتانا ہے۔“

وہ اس کے صاف گو انداز پر تھوڑا کھینچا ہوا تھا۔
جوڑی اس کے ہوٹل کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ خود کو
اس کھیا ہٹ سے نکال کر اس نے ممنونیت سے لیرا
کی طرف دیکھا۔ وہ بہت اچھے لفظوں اور بہت اچھے
انداز میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔
”لیرا! تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے میرے لیے بہت
زحمت اٹھائی ہے۔“

وہ مزید بھی کچھ اور جملے بولنا چاہتا تھا مگر لیرا نے
اسے اس کی بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔
”سینور سکندر! اس طرح کی رکھی باتوں سے مجھے
بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے اور ویسے بھی آپ کے اور
آپ کا روڈ انداز زیادہ اچھا ہے۔ ساری دنیا سے ناراض
شعبے میں بہت کم کم بولتے ہوئے۔“

وہ ہنس کر اسی بے تکلفانہ و شریر انداز میں بولی تھی
اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے وہ بھی خوش دلی سے
مسکرا رہا تھا۔ لیرا نے اس کی طرف اپنا اتھ بڑھایا تھا۔
”کیا اب ہم دوست ہیں؟“

اس نے مضامین کے لیے بڑھاپا لڑا کا ہاتھ تھا تھا۔
”ہاں۔“ وہ دوم سے جا کر زندگی بھر اس سے ملے گا
نہیں اس سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھے گا تو
لاستیچ میں کہاں سے آئی؟ مگر وہ ناول کر اس کا دل
بھی نہیں توڑ پایا تھا۔ تو اس کے سینور سکندر تھمرا رہی اس
دوست کی سمجھ advice (نصیحت) ہے کہ اپنے
دول دوم میں جا کر باب میڈ ہنس لے کر صرف اور
صرف آرام کرنا، کیونکہ تھمرا رہی طبیعت مجھے ابھی بھی

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے۔ جنہوں کے لیے ایک اور ناول

زور و محوم

راحت جبین



قیمت - 600 روپے

32755031

مال۔ وہ بچپن میں اس کی اور سیم کی آیا تھیں مگر اس نے انہیں بچپن میں اپنی ملازمہ نہیں سمجھا تھا۔

”بہن! کہاں ہے نئی آڈر فریش ہو گئیں پھر سنائی ہوں۔“ وہ منکر آکر بولی اور چپک سے کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کے اپارٹمنٹ میں 2 بیڈ رومز، کچن، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے علاوہ اوپر کی منزل پر واقع ایک کمرہ ہے جس نے اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا جو جوڑے ایک کمرہ اس کا تھا ایک مینی کا۔

ڈرائنگ روم زیادہ تر لیونگ روم کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ شب میں اس نے ٹی وی بھی دیکھ رکھا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے کچن میں کوئی دیوار نہ تھی۔ یہیں سے کھڑکی کی گولی چکر دار میٹرمی اوپر کمرے میں جاتی تھی۔ جہاں آخری اسٹیمپ چڑھا اور

اوپر کمرے میں موجود وہ کمرہ اندر داخل ہوتا ہے اسی جتا دیا کرتا تھا کہ وہ کسی آپریشن کا اسٹوڈیو ہے۔ وہاں ہوا بجا

اس کی مکمل اور نامکمل بینسٹن اور بینسٹن بنانے سے متعلقہ سامان، کچری حالت میں پراقتصر آتا تھا۔

اسٹوڈیو کا باہر کی طرف کھلنے والا شیشہ کاروبار باندھ چھوٹی سی یا گولی میں ختم تھا۔ وہاں اس نے کچھ کٹے اور ایک

آرام دہ کرسی رکھی ہوئی تھی۔ جب کبھی کام کرتے کرتے تھکاوٹ کا احساس ہوتا یا کئی گھنٹے اسٹوڈیو میں گزارنے پر چھین محسوس ہونے لگتی تھیں یا گولی میں

آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

اپنے اس اپارٹمنٹ کو اس نے اپنی سہولت کے مطابق سیٹ کر رکھا تھا۔ اس کے اندر کے لیے اپارٹمنٹ

سے جہاں وہ سال کے 10 ماہ گزارا کرتی تھی یہ

اپارٹمنٹ کہیں زیادہ پیارا تھا جس میں وہ سال کے صرف دو ماہ گزارتی تھی۔



”اب پوچھیں آپ کیا پوچھ رہی تھیں؟“

کچن میں موجود 4 کرسیوں والی چھوٹی میز پر وہ اور

نئی ساتھ بیٹھ کھانا کھا رہے تھے۔ کبھی اس نے اپنے

سکندر کو اس کے ہونٹ چھوڑنے کے بعد وہ سیدھی گھر آگئی تھی۔

”Eur Fermi“ پر اس کا اپنا خوب صورت اپارٹمنٹ تھا۔ خوب صورت رہائشی عمارتوں کے بیچ

گمشاد سڑک پر یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی جس کی تیسری منزل پر اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ ایسٹمنٹ میں

کینوں کے نیچے پارکنگ آریا تھا جبکہ گراؤنڈ فلور سے لے کر چوتھی منزل تک ہر فلور پر جس ایک ایک

اپارٹمنٹ تھا۔ تمام اپارٹمنٹس گمشاد اور خوب صورت تھے۔

5 سال قبل اس کے بپا نے اپنی کچھ پراپرٹی ان ہونٹوں، ہونٹوں میں برابر برابر تقسیم کی تھی جب اپنے جیسے

کا کچھ بیسہ بیٹک میں رکھ چھوڑنے کے بعد بقا پر م سے اس نے یہ اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ اس سے قبل ہر

سال وہ چھٹیوں میں روم آتی تو ہونٹ میں بھرتی تھی۔

اپنا یہ اپارٹمنٹ یہاں خرید کر اسے بڑا سکون ہوا تھا۔ اب اپنے روم سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہو گیا تھا۔

کہ اب یہاں اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ سال کے دو ماہ یہاں گزارتی تھی باقی وقت اس کے اپارٹمنٹ کی دیکھ بھال

نیکی کیا کرتی تھیں۔

کچن سے کام کیے جانے کی آواز اس آ رہی تھیں گویا

مینی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

”بائے نیکی!“ اس نے کچن کے دروازے سے اندر جھانکا۔

رات بھر کے جاگنے اور دوسرے شہریک جانے آنے کی جھنجھل اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر

منکر اہستہ ستور اس کے لبوں پر موجود تھی۔

”آئیں؟“ یہ اپنا ایک بیچ سورے تھیں

Naples جانے کی کیا سوچیں؟ بیچ ہر گزنگ چالی اپنی جلدی میں گھس گھسے پوچھنے تک کا موقع نہیں دیا کہ

اپنی افراتفری میں جاسکے کام سے رہی ہو۔

نئی نے گردن اٹھا کر دوبارہ فکر مند کی سے لے رکھا۔

ساتھ سال کی عمر میں وہ اب بھی جوان و جوانی تھیں

اور لہذا کو وہ اسی طرح عزیز تھیں جیسے ایک بچے کو اپنی

یہ سجدہ گئی میں تبدیل ہو گئی تھی یہ محمود خالد اس کے
پاپائی نگل تھی۔ اس نے ریسپورڈ اٹھایا۔

”اسلام ٹیکس لایا“ سیات انداز میں اس نے انہیں
سلام کیا۔ ایسے جیسے کسی جہن پیمان کے خود سے عمر
میں بڑے شخص کو ادب اور احترام سے سلام کیا جاتا
ہے۔

”و علیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟“ محمود خالد نے محبت
بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایک حساس تاثر آگیا۔ اسے اپنے
پاپس باکشن بلانے کے لیے، ہم کی طرح اس کی بھی
اٹھا کر کسی پاکستانی سے زبردستی شادی کر دینے کے لیے
یہ محبت بھرا لہجہ اور فکر ظاہر کرنا انداز بنایا جاتا تھا اور نہ
ساری زندگی اپنی دونوں بیٹیوں کو نظر انداز کرنے اور
انہیں تکلیف پہنچانے کے سوا انہوں نے کیا ہی کیا تھا؟

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! آپ کیسے ہیں؟“
اس نے ان سے۔ سچی بد تمیزی انہیں کی تھی، بھیسی
اور سچی توازن بات نہیں کی تھی مگر جس روز سے ان
کی وجہ سے اس سے اس کا ملک اس کا گھر اور اس کی
ہمسایہ چھین گئی تھی وہ ان سے پھر بھی وہی محبت نہ کر
پائی تھی جیسی زندگی کے 13 سالوں تک کرتی رہی
تھی۔ اس کے اندر وہ 13 سال کی بچی کی طرح بھی اپنے
باپ سے اپنا گھر چھین جالنے اور اپنی ہمسایہ سے پھر
جالنے پر تھا تھی۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! اس آج تمہاری یاد آ رہی
تھی۔ میں نے سوچا تمہیں خون کروں۔ میرا اندازہ یہی
تھا کہ آج کل تمہو کو آتی ہو گی۔“
”ہاں میں کہتے رہا آتی ہو گی ہوں جسے آپ نے مجھ
سے چھین لیا تھا۔“

وہ یہ بول نہیں پائی تھی ہاں سوچا ضرور تھا بولی تو
صرف اتنا تھی۔ ”جی۔“

وہ بچی اور جذباتی طور پر خود کو ان سے اتنی دُور لے جا
چکی تھی کہ ان سے بات کرنے سے ہوسے اسے گفتگو کا
موضوع یا جملے یوں سوچنے پڑتے گویا کسی اجنبی سے

دوستوں و عزیزوں کو کھانے پر بلا رکھا ہو، ماتب ڈانٹک روم
میں بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا اور نہ صرف وہ اور سچی ہوتے
تو ان ہی میں میرا کھانا نہایت سب ہو جایا کرتا۔

”اچھی افرا تری میں منہ اندھیرے Naples
جانے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔“ مینی نے نوالہ منہ میں
ڈالتے ہوئے کہا۔

”روبرٹو کا ایک کو لیگ نے سکندر نظام ہے اس کا روم
میں روبرٹو کی کپتانی میں لٹھلی ڈیڈ وارڈ ہے میں اس
سے کئی بار مل چکی ہوں۔“ اسے ایک مینٹک کے لیے
فیصلہ جانا تھا اس کی ٹرین میں ہو گئی تو بس پھر میں اسے
وہاں لے گئے۔ میں نے سوچا اس ہانے Naples بھی
دیکھ لوں گی۔ کتنے سال ہو گئے تھے مجھے وہاں گئے۔“
اس نے اپنی پلیٹ میں پاشا ڈالتے ہوئے مینی کو
جواب دیا۔

”روبرٹو کے کسی کو لیگ کے لیے خود کو اتنا خوار
کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔“ مینی نے تھوڑا
براسا منہ بنایا۔

”وہ اب صرف روبرٹو کا کو لیگ نہیں ہے میری بھی
اس سے دوستی ہو گئی ہے۔“
”تمہاری دوستیوں میں کیا کیا ہے۔ کس سے نہیں
ہو جاتی تمہاری دوستی؟“

”میری اچھی عادت کا ذکر تو لے لے انداز میں کریں
مینی۔“ اس نے جیسے براہِ ان کر صدمہ اسے احتجاج بلند
کی۔

مینی اس کے انداز پر مسکرائی تھیں۔ انہوں نے
اس کی پلیٹ میں چکن کا ایک پیس رکھا۔
”ٹھیک سے کھاؤ۔“ وہ ان کے محبت بھرے انداز پر
مسکرائی تھی۔ اسی وقت فون کی بیل بجی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھی تھی۔ سچن
کے سامنے والا کمرہ اس کا تھوڑا میان میں خوب
دھرت انٹینس مائیکروسٹ مزن کو رینگا تھا۔

وہ تیز رفتاری سے اپنے کمرے میں آگئی تھی اور
اکثریں پر چٹکا نمبر دیکھ کر ہی اسے چاچل گیا تھا کہ یہ
نل کس کی ہے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ایک دم

ہوا تو وہ کب کا وہ بارہ دو مہینے میں عدیل ہو چکی ہوئی۔
اپنی اپنی اچھی جاب کو چھوڑ دیا اسے حیات لگا تھا۔
میں وہ 13 سال کی لڑکا محسوس نہیں تھی جس کے بارے
میں اس کے مہی پاپا فیصلہ کریں گے کہ اس نے کہاں
رہتا ہے اور کس کے ساتھ رہتا ہے۔ اپنی عمر کے 18
ویں سال سے اپنے فیصلے اس نے خود کرتے شروع کر
لیے تھے۔

محسوس خالہ کو اس کے کسی ایک نہیں بے شمار
فیصلوں سے اختلاف تھا۔ مگر اسے ان کے اختلاف کی
کبھی فکر نہ رہی تھی۔ وہ دنیا میں اگر کسی کی مانتی تھی تو
وہ سیم تھی۔ اس کی بہن اس کی دوست اس کی ماں
اس کا باپ۔ کبھی وہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں ساتھ
رہا کرتی تھیں۔ کتنا ہمارا تھا ان دونوں بہنوں میں سیم
اس کا کس طرح خیال رکھا کرتی تھی۔ اسکول کے اندر
اسکول سے باہر وہ ہر جگہ لڑا کا ساری سنی رہتی۔ وہ دونوں
ایک کمرے میں ساتھ سوئی تھیں۔ رات در رات
جاگ کر باتیں کیا کرتیں۔ نینی ان کے کمرے میں
انہیں دیکھنے آتیں تو وہ دونوں سوئی ہی جا چکا کرتیں۔ ان
کے والدین کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ یہ شادی
ہی غلط ہوئی تھی۔ محمود خالہ مغرب کی ایک عورت کو
بیوی بنا لینے کے بعد اس سے شرفیت کی توقع رکھتے
تھے۔ اگر ایک اعلا تعلیم یافتہ مغرب صورت اور دولت
مند پاکستانی مسلمان مرد سے شادی کرنے کے لیے
دو ٹوریا جیو دینی نے اسلام قبول کیا تھا اپنا نام تبدیل کر لیا
تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ یہ تیر کی راہی
تھی۔ جس خطے سے ان کا تعلق تھا اس تعلق کی نسبت
سے انہیں جیسا ہونا چاہیے تھا وہ کسی ہی نہیں۔ محمود
خالہ دو ٹوریا کو خدیجہ بیٹا نے کی لاکھ کوششیں کر لیتے
انہیں کامیابی نہیں ملتا تھی۔ وہ مغرب کی ایک عورت
کو مشرقی انداز کی بیوی اور ماں کے روپ میں دیکھنا
چاہتے تھے مگر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟ دو ٹوریا نے اسے
اور سیم کو صرف پیدا کیا تھا۔ اس کے علاوہ حیثیت ایک
ماں کے ان کا ان دونوں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا

بات کر رہی ہو۔
”آج کل کیا ہو رہا ہے مینا؟ درست کر رہی ہو یا کسی
ایگزیکوشن کی تیاری ہے؟“
”ایگزیکوشن کی تیاری کر رہی ہوں۔ اگلے مہینے
فلورنس میں ٹیمر اسٹوڈیو ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے
جواب دیا۔
”گھر تو خوب مصروف ہو گئی تم؟“

وہ اس کے آرٹسٹ بننے کے مخالف رہے تھے ہر
وہ چیز جس سے اسے خوشی ملتی تھی وہ اس کے مخالف
رہے تھے پھر جیس نہیں اب وہ کیسے اس کی ہیڈسٹنڈ اور
ایگزیکوشن کے متعلق اتنے خوشگوار انداز میں بات کر
لیا کرتے تھے۔
”آئی کیسی ہیں؟“

اس نے مڑ کر اپنی سوئی ہوئی ماں کی خیریت پوچھی۔
یہ نہیں تھا کہ اس کے اور اس کی سوئی ماں کے بچے کوئی
روایتی قسم کے تعلقات تھے اب اس ایک غیریت اور
ایجنسیت تھی وہ کئی سال لندن میں محمود خالہ اور ان کی
بیوی کے ساتھ رہی تھی مگر یوں جیسے کسی دور کے
واقف یا ملنے ملنے والے کے ساتھ رہ لیا جائے۔
”بالکل ٹھیک ہے۔ مجھ سے کبھی رہتی ہے کہ میں
تمہیں تمہاری پچیسویں میں پاکستان لپوٹاؤں۔“
ان کے دل کی بات زبان پر آگئی تھی۔ ایک تار مار
تار اس کے جیسے برا بھلا تھا۔

وہ منٹ کی فون کال جس میں وہ کسی باتوں کے سوا
اس نے کوئی بات نہیں کی تھی ختم کر کے وہ بچے بچے
سے انداز میں بیل ریٹ کرتی تھی۔
وہ ہر وقت ہنسی مسکراتی رہتی تھی زندگی سے
خوش رہتی تھی مگر جس وقت بھی اس کی اپنے ماں یا
باپ سے بات ہوتی اس کے لبوں کی ہنسی اور جیسے کی
خوشی دور اور غم میں بدل جاتی۔ پیچھے آنسوؤں سے اس
کی آنکھیں پھلک جاتی تھیں۔ بچپن کی ہر محرومی ہر دکھ
یا د آجایا کرتا۔ اپنا دکھ یاد آجایا کرتا جیسا اس کا اور سیم
کا بچپن گزر رہا تھا۔

اس کی باب لکھیں۔ باب لکھیں۔ باب لکھیں۔

ساتھ رہنا تھا۔ وہ لوہو سیم ایک دوسرے سے لپٹ کر بہت دیر تک تھیں۔ آخری رات جو انہوں نے اپنے گھر میں ساتھ گزارا وہ دونوں ہمیں اس ساری رات روٹی رہی تھیں۔ سیم روٹی بھی روٹی اور اسے باز کر کے کھاتے تھے۔ سیم روٹی بھی روٹی تھی کہ لکڑیوں کے ٹکڑوں کو کوئی بھی کھاتی نہ تھی۔

”الگ می پاپا ہو رہے ہیں لڑا ہندوؤں نہیں ہمیں کوئی بھی الگ نہیں کر سکتا۔ میں ابھی 14 سال کی ہوں اب صرف 4 سال رک جاؤں۔ 18 سال کی ہو جاؤں پھر کھانا تم سے ملے گی۔ میں جب دل چاہے گا کیا کروں گی۔ پھر نہ میں مجھے تم سے ملنے، تمہارے پاس آنے سے روک سکیں گی نہ کیا۔“

پھر وہ محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی اور سیم و دو ٹوریا کے ساتھ اٹلی میں ہی رہی تھی۔ محمود خالد سے شادی کے لیے جوان کی ماں نے ظاہری طور پر اپنا مذہب تبدیل کیا تھا اسے ترک کر کے وہ واپس اپنے اصل مذہب میں آگئی تھیں۔ وہ خدیجہ سے بچہ دو ٹوریا ہو گئی تھیں۔ طلاق کے فوراً بعد ہی انہوں نے اس فریج فیشن ڈیزائنر سے شادی کر لی تھی جو ان کی اور محمود خالد کی طلاق کی وجہ تھا۔ انہوں ایک مشہور فیشن ڈیزائنر اور آرٹسٹ تھے۔ انہوں نے طلاق کے کرو ٹوریا نے کوئی گھاناے کا سودا نہیں کیا تھا۔ ان کا فیشن ڈیزائنر شو ہونا بھر کے فیشن اور ڈیزائن کے دہانے کے بجائے والے شہر Milan میں رہتا تھا سو شادی کر کے وہ اس کے ساتھ Milan چلی گئی تھیں۔ سیم بھی ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ سیم روم میں بھی لڑا اس کا اپنے روبرو ایک ریلوے تو تھا وہ Milan چلی گئی تو وہاں جیسے نا تو تھا محسوس ہوا۔

محمود خالد کی ملازمت شاندار تھی سولڈن میں بھی ان کے گھر میں رہی تھا۔ ٹیٹ اور نیش و آرام تھے جو روم میں تھے مگر وہاں کبھی ایک بل بھی ملنے سے خوش نہ رہ سکتی تھی۔ وہ نہ اس گھر کو اپنا سمجھتی تھی نہ اس اسکول کو نہ لندن کی سڑکیں اور گلیں کبھی اسے اپنا

لوہو سیم کی چھوٹی چھوٹی چھوٹی گھر کے روم و کمرے پر خوش اور ان کی باتیں میں رات کے پار پھر اینڈ کر کے گھر واپس آیا کرتی تھیں۔ لڑا مال اور باپ دونوں کی جانب سے نظر انداز کی گئی تھی جبکہ سیم اس معاملے میں اس کے مقابلے میں نسبتاً یوں خوش قسمت رہی تھی کہ بچپن میں محمود خالد سیم سے بہت بار کرتے تھے۔ سیم شکل و صورت اور ذہانت میں بالکل محمود خالد جیسی تھی جبکہ لڑا و کبھی بھی و ٹوریا کی طرح تھی اور ذہنی صلاحیتیں اور قابلیت بھی اس میں اپنے باپ جیسی نہ تھیں۔ وہ نہ کبھی باپ کی توجہ یا سیم کی باپ کی اسے توجہ دیا اور محبت اگر کہیں سے ملی تو سیم کے پاس سے۔ سیم نے یہ تھا شاخ و برگ صورت تھی۔ بچے پناہ ڈیٹ پر اعتماد اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ جبکہ وہ سیم کے مقابلے میں ہر چیز میں اوسط رہنے کی رہتی تھی۔ پڑھائی میں بری نہیں تھی اچھی تھی پر سیم کی طرح پوزیشن ہولڈر اور گولڈ میڈلسٹ کبھی نہیں رہی تھی۔ اسکول میں سب اسے سیم کی وجہ سے پہچانتے تھے۔ وہ سیم پر فخر کیا کرتی تھی۔ اپنی اس بے تحاشا حسنین اور ذہین مین پر اسے ناز ہوتا تھا۔

دوسری جانب سیم اس کے آرٹ کے حوالے سے سرشار رہتی تھی کہ اس میں بیننگ کی خدا و صلاحیت ہے اور وہ بڑی ہو کر ایک کامیاب آرٹسٹ بن سکتی ہے۔ اسے بھیجیں ہی میں یہ اعتماد سیم نے دیا تھا۔ جو وہ دار یا مال باپ کی ہوتی ہے اس کے لیے تو وہ ذمہ دار یا مال بھی سیم ہی نے بھالی تھیں۔ اس کی جنت بڑھانا اس کی پڑا کرنا ہر مشکل میں اس کے ساتھ کھڑے ہونا اور اس سے بے حد بے حسلیہ پیار کرنا۔

اسے کچھ بھی نہ دیا تھی طرح یا تو تھا جب و ٹوریا اور محمود خالد بالکل طور پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ محمود خالد نے اپنی پوسٹنگ لندن کروائی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر لندن جا رہے تھے جبکہ و ٹوریا اور محمود کے ایمین ملے شدہ معاہدے کے تحت سیم کو و ٹوریا سے

وہ اس واقعہ کے بعد محمود خالد سے ہر شے بچنے کے لیے دور ہو گئی تھی۔ سیم اس واقعہ کے بعد ہوسٹل شفٹ ہو گئی تھی۔ دوسرا بجائے اپنے بدکردار شوہر کو برا سمجھنے کے سیم کے خلاف ہو گئی تھیں۔ اور باپ نے اس واقعہ کے بعد اپنی کوئی عملی کوشش نہ کی تھی کہ سیم کو اپنے اس بلوا لیتے۔ وہ milan میں ہوسٹل میں رہ کر اپنے تعلیمی مدارج طے کر رہی تھی اور پہلے ہی کی طرح اب بھی سال میں ایک مرتبہ چھٹیوں میں منبہر خالد اسے اپنے پاس لندن بلوایا کرتے تھے۔ سال بھر میں وہ واحد موقع ہوتا تھا جب وہ دونوں ہمیں ایک دوسرے سے مل پاتی تھیں اور نہ تو وہ صرف فون پر ہی ایک دوسرے کی فواد سن پاتی تھیں۔

وہ 17 سال کی تھی جب محمود خالد نے ایک پاکستانی خاتون سے جنمیں اس کی داری اسے ان کے لیے منتخب کیا تھا شادی کر لی۔ ان کی باں سے محمود خالد کی شادی کو اس کی داری بیٹے کلاوئی کے جنم میں کیا گیا ایک غلط فیصلہ قرار دیتی تھیں۔

عائشہ ایک پڑوسی لکھی "جتنے خالد کی پیچیدہ اور مذہبی رجحان رکھنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے لیزا کے ساتھ نہ کوئی دیر پا دھاندلہ اسے آزاد نہیں سمجھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتی تھیں۔ وہ انہیں آنٹی کہتی تھی۔

گزارتے وقت کے ساتھ وہ باپ سے مزید دور ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ باپ کے گھر میں باپ اور لہن کی بیوی کے ساتھ یوں رہتی تھی جیسے کوئی مسلم ہو۔ جیسے وہ اس کا گھر نہ ہو۔ اس کا دل باپ کی طرف سے کبھی صاف نہ ہو سکا تھا۔ وہ ان سے کبھی لڑی نہ تھی۔ کبھی کوئی غصائی نہ کی تھی مگر اس نے زندگی کے کسی بھی چھوٹے بڑے فیصلے میں کبھی ان کی رائے اور ان کا مشورہ نہ مانا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھے اس نے فائن آرٹس پڑھا۔ وہ جانب سے ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان والیں جا رہے تھے وہ چاہتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے بس نے صاف منع کر دیا۔ تب یہاں

میں۔ اس کا دل تو وہیں اس کے دوا میں سیم کے اور اس کے مشترکہ کمرے ہی میں رہ گیا تھا۔ Milan میں چھ رہی تھی اور وہ لندن میں۔ سیم کے تعلیمی اخراجات دیکھا اخراجات کے لیے محمود خالد اسے باقاعدگی سے رقم بھجواتے تھے۔ سیم کی تعلیم پہلے ہی کی طرح بہت اچھی ہو رہی تھی۔ وہ اسی طرح کامیابیوں کے سہارے ڈگری ہو گئی اور گرنہ شاید دوسرا کافرنگ ہو کر کولس سوشل سٹی کی شاعرانہ تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا۔ وہ سوشل سٹی پر اپنا کوئی پیسہ خرچ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کا رویہ سیم کے ساتھ کوئی بہت دوستانہ نہ تھا۔ سیم فون پر بات ہونے پر اسے چاہا کرتی تھی کہ کولس بیوی کے ساتھ چیز کے طور پر ہی اس بیٹی کو صرف اور صرف ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ لیزا، سیم کے لیے کڑھا کرتی کہ وہ خود باپ کے ساتھ لندن میں عالی شان زندگی گزار رہی ہے اور سیم باں کی شفقت و محبت سے محروم سوشلے باپ کی راج نگاہوں اور کرکوی باتوں کے پچانہائی مشکل زندگی گزار رہی تھی۔ وہ تو سیم کی جو بہت بھادور اور پر اعتماد تھی تب ہی ان تمام حالات سے سمجھوتا کر گئی اگر سیم کی جگہ وہ خود ہوتی تو کبھی ان تنہا حالات کا سامنا نہ کر پاتی۔

وہ 16 سال کی تھی اور سیم 17 کی جب ایک رات نشے کی حالت میں کولس سیم کے کمرے میں آدھکا تھا مگر اس کے شوہر چارویں پر وہ اپنے اراہوں میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اسے جب یہ بات پتا چلی وہ ہلک ہلک کر رہی تھی۔ اس کی نازوں پٹی بہن کس آزمائش میں گھر گئی تھی۔ اسے اس روز اپنے باں اور باپ دونوں سے شدید ترین نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو زندگی بھر عاف نہیں کرے گی۔ باں دونوں رہنوں کا کیا تصور تھا جو انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا گیا؟ اس کے باپ نے ایک بیٹی کو گھر کا عیش و آرام اور تحفظ دے دیا اور دوسری کو سوشلے باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا؟

تھی۔ انہوں نے ایک سال بعد پھر ایک انٹالین ٹوی سے شادی کر لی تھی۔ سیم پھر کبھی ماں کے پاس نہ رہی تھی۔ اس کی باقی تمام تعلیم ہوسٹلز و میو میں ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سیم نے روم میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی وہ وہاں رہ رہی تھی۔

وہ چھٹیوں میں چند ہفتوں کے لیے محمود خالد کے پاس پاکستان بھی گئی۔ وہیں محمود خالد کے کاروباری دوست ہاشم اسد کی نگاہ انتخاب سیم پر آکر پھری تھی۔

وہ اپنی پہلی بونی کو طلاق دے چکا تھا۔ وہ یہ بیسیس ہے شک اس کے پاس بہت تھا۔ دولت کی دلیل پہل تھی، personality (شخصیت) بھی اچھی تھی، مگر اس کی شہزادی جیسی بہن کی شادی ایک شادی شدہ مرد سے ہو اس سے عمر میں 15 سال بڑا تھا اور جس سے وہ بالکل بھی محبت نہ کرتی تھی مگر اس طرح کروالی جاسکتی تھی؟

لیزانے سیم کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہ شادی نہ کرے۔ وہ بپا کو چھوڑ کر واپس آگئی مگر سیم نے روئے ہوئے اسے یہ سمجھایا تھا کہ اس کے لیے یہ شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے شادی سے انکار کیا تو بپا کو بزنس میں بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ جو نیا project شروع کرنے جارہے تھے اس کے لیے انہوں نے ہاشم سے قرض لینے رکھا تھا اور وہ قرض معمولی نہیں ایک بہت بڑی رقم تھی۔

”ہوئے وہ بپا کو Loss، ختم ہو جانے دو ان کا بزنس! وہ زندگی بھر تمہاری خوشیوں اور سکون کا گھانا گھونٹ آئے ہیں میں اس بار انہیں تمہاری زندگی بچانے نہیں کرنے دلاں گی۔“

وہ روئے ہوئے چلائی تھی، مگر اپنے چیخ و پکار کے باوجود بھی سیم کو بچا نہیں پائی تھی۔ سیم کی شادی ہاشم اسد کے ساتھ ہو گئی تھی۔

سیم کی شادی والے دن وہ لندن میں اپنے پارٹنرمنٹ میں خود کو بند کر کے سارا دن روتی رہی تھی۔ وہاں اس کے باپا کے ملک میں لن این کی ایک

ہم وطن اس کی بہن کی خوشیوں کو اجاڑنے جا رہا تھا۔

تعلیم مکمل کر کے لندن ہی میں جاب تلاش کر رہی تھی۔ پھر اسے جلد ہی ملازمت بھی مل گئی تھی۔

محمود خالد کے ساتھ ملے جانے کی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ سو اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا ٹور اپنی مرضی کے مطابق اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ وہ اپنے فیملے پر پوری طرح مطمئن تھی۔ وہ کیوں وہ کام کرے جو محمود خالد اس سے کہہ رہے ہیں۔ اس کے اور سیم کے بچپن

میں انہوں نے اور ٹورس لے ان دونوں بہنوں کی پروا کی تھی جو ان کی پروا کرے؟ وہ پچھلے 3 سالوں سے لندن میں تھا رہ رہی تھی۔ محمود خالد کی آج بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ان کے پاس کراچی آجائے۔ اس کی شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ 27 سال کی ہو گئی تھی اس کی شادی اب ہو چکی

چاہیے تھی مگر وہ شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی تھی اور تم از کم کسی پاکستانی سے ہرگز نہیں۔ کم از کم یہ اطمینان اور خوشی وہ اپنے سنگدل باپ کو ہرگز نہ دینا چاہتی تھی کہ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں اپنے ملک کے مردوں سے کروائی ہیں۔ ساری زندگی پاکستان سے باہر گزار کر کبھی وہ زندگی بھر اندر سے پاکستان ہی رہے تھے تب ہی ریشٹرنٹ کے بعد وہیں لوٹے تھے۔ وہیں اپنا بزنس شروع کیا تھا اور سیم جسے 14 سال کی عمر میں فوریا اور سوتیلے باپ کے حوالے کر کے اس کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے تھے اس پر پھر اپنا حق بنانے لگے ہو گئے تھے۔

اپنے نئے نئے شروع کیے بزنس میں مزید فائدوں کے لیے انہوں نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف کے ساتھ کروادی تھی۔ سیم کا شوہر ہاشم اسد اس سے عمر میں پورے 15 سال بڑا تھا۔ اسے اپنے باپ کی موت پر کسی پر شدید غصہ آیا تھا۔ کیا کوئی باپ ایسا ہو سکتا ہے؟

سیم کے ساتھ دست درازی کی کوشش دیکھنے والے واقعہ کے فوراً بعد ہی وٹوریا کی کھولس سے علیحدگی ہو گئی

سیم نے اسے کراچی سے نکاح سے کچھ دور
نکل فون کیا تھا۔ وہ بڑی ہمار لڑکی تھی۔ وہ انا سے
حوصلہ دے رہی تھی۔

”ہاں میں خوش رہوں گی ہاشم اچھے آدمی ہیں۔ تم
میری فکر کیوں کرنا ہو سوٹ پارٹ“

”اے سے 1 سال بولے شادی شدہ اور طلاق
یا تو جس شخص کے ساتھ تمہیں ازدواجی باندھا جا رہا
ہے تم اس کے ساتھ خوش رہو گی سیم؟“ وہ جواباً
پھوٹ پھوٹ کر ہوتے ہوئے بولی تھی۔

”میں کیا کو اس ظلم کے لیے کبھی معاف نہیں
کر دوں گی سیم! میں تمہاری زندگی کی خوشیاں چھیننے پر
انہیں کبھی بھی معاف نہیں کر دوں گی۔“ وہ زار و قطار
مدتے ہوئے بولی تھی۔

اور پھر وہ اپنی محمود خالد کو کبھی معاف نہیں کر سکی
تھی۔ باپ سے بات کر کے جیسے سب کچھ بھرے یاد آ
گیا تھا۔ وہ سیم کو یاد کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہوتے
ظلم و زیادتی کو سوچ کر آرزو ہوتے ہوئے ہنسی پکوں
کے ساتھ سو گئی تھی۔



اور یہ خوب مکمل بات تھی کہ صبح سویرے اس کی
آنکھ کھلی ہی سیم کے فون سے تھی۔

ہیش کی طرح پھر کی ہوا تھا کہ اوپر اس نے دل سے
”ہم کو یاد کیا اور سیم موجود ہوئی یا فون پر یا پھر زندہ۔“
”ہم کی آواز سننے ہی رات کی ساری اداسی اور دکھ پل بھر
پل رخصت ہو گیا تھا۔“

”سیم! کئی لوگوں۔“ اس نے بے اختیار اس کی آواز
سنی کرتا تھا۔

”ہاں! اینٹ پت تو ہے Sis؟ میرے ہیلو کا جواب
نہیں دینا ایک؟“ سیم حسب عادت خوشگوار موڈ
”کی۔“

”تاہم میں رات تمہیں سوچتے ہوئے سوئی تھی
میری آنکھ ہمارے فون سے کھلی ہے۔“ وہ
انہر کر جیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

سیم اس سے بات کرتے ہوئے کبھی اپنی شادی شدہ
زندگی کے دکھ سے نہیں سناچی تھی۔ وہ اس طرح ظاہر
کرنا چاہتی تھی کہ اپنی شادی سے خوش ہو، مگر وہ صرف
بیمیں نہ تھیں۔ صہیلان بھی نہیں، اور وہ جانتی تھی
سیم نے زندگی کے ساتھ سمجھو یا کر لیا تھا اس رشتے کو
بست اچھی طرح سمجھا بھی رہی تھی مگر دل سے خوش
نہیں تھی۔ کبھی باتوں میں غیر اختیاری طور پر سیم
کے منہ سے کچھ لپٹا نکل جاتا جو اسے یاد دلانا تھا کہ
سیم نے اپنی خوشنماں اور خواہشات کا گھا گھونٹ کر
سمجھوتے کی زندگی کو اپنا لیا ہے صرف اور صرف باپ
کی خوشی کی خاطر۔

سیم اس سے بات کرتے ہوئے نہ خود کوئی اداسی
ظاہر کرتی تھی نہ اسے اداس رہنے دیتی تھی۔ وہ ان
دونوں دفتری کام سے تڑکی لٹی ہوئی تھی اور اس کے
پاس اسے سانس کے لیے وہاں کے برت سے دلچسپ
قے تھے۔ شادی کے بعد سیم نے ہاشم کی خواہش پر اس
کی کچنی کو جو اس نے لیا تھا۔ مگر خاکہ سیم جیسی
غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل لڑکی کو ہاشم نے گھر پر پٹانے
کی جالانہ کوشش نہیں کی تھی۔

سیم سے بات کر لینے کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا
پھلکا محسوس کر رہی تھی۔



وہ اپنے آفس میں بیٹھا اب باپ پر کچھ کام کر رہا تھا
جب ہی اس کے سواکل پر کال آئی۔ کال کرنے والی
شخصیت کے نام بقدرے عجیب سے دیکھے ہوئے اس
نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو!“ اس کے ہیلو میں ہلکی سی اجنبیت موجود
تھی۔

”Chao! سکر ر۔“ لیزا خوشگوار موڈ میں بولی۔
جواباً وہ خاموش رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
لیزائے اسے کیوں فون کیا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ نومبر 2011

دیکھنے میں اتنا مڑا نہیں آئے جبکہ ان کے لیے ہم کسی دن صبح سے نکلیں گے۔ آج میں تمہیں steps Spannish لے کر چلوں گی۔ شام کے وقت وہ جگہ نہیں اپنچی گی۔“

لئے اس کی گائیڈ کس نے بتایا تھا کم از کم اس نے تو ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ روم بھڑھکا چاہتا ہے۔

”تمہارا شکریہ لیزا! اگر میرا کہیں بھی گھوٹے پھرے کاٹے“ وہ ہنسنے لگی کہ ساتھ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا۔
”تمہارا روم نہیں ہے مگر میرا موڑ ہے تمہیں اپنا روم دکھانے کا۔ میں تو کل تم سے یہ سن کر حیران رہ گئی کہ تم نے اتنے دنوں میں ابھی تک روم کی کوئی خاص جگہ نہیں دیکھی۔ میں جانتی ہوں یہ تمہاری روم من پال ڈیز نہیں ہیں ہم یہاں آپس کے کپڑے آتے ہو مگر آپس سے بچ جانے والے فارغ ٹائم میں تم یہاں ان دنوں کو چھٹیوں کی طرح انبوائے کر سکتے ہو۔ میں تمہاری دوست بن گئی ہوں نا اس میری بات مانو۔ آج روم کو ایک نرومن لڑکی کے ساتھ اس کی نظر سے دیکھو۔“ اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دینے کے لیے لیزا نے فون بند کر دیا تھا۔

”وہ اس لڑکی پر حیران تھا۔ آخر اسے اس میں اس درجہ دلچسپی کس وجہ سے تھی؟ اس نے سوچ لیا تھا وہ آج آپس ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی آپس سے الگ ہو جائے گا۔ اس کا لیزا کے ساتھ کہیں بھی گھومتے پھرنے کا قطعاً کوئی موڑ نہ تھا۔ کل اس سے اتنی ہمدردی کتنے کے بعد آج وہ اسے تو تیزی اور بے ہوشی سے منع نہیں کر سکا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ پہلے ہی اپنے ہوٹل روانہ ہو جائے مگر لیزا کو جیسے اس کے اس ارادے کی بھٹک پہلے ہی بڑھ گئی تھی وہ آپس ٹائم ختم ہونے سے پہلے اس کے آپس میں موجود تھا۔

اسے یہاں دفتری کاموں میں مداخلت کے لیے جو سیکرٹری فراہم کی گئی تھی وہ اسے ایک عجیبہ و غریب کرنے کے لیے رہا تھا جب ریسیٹنٹ نے اس کا پر اس کے لیے کسی لیزا محمود کے کہنے کی اطلاع دی

”کہاں گم ہو گئے؟ کیا یادداشت کھو گئی؟ میں لیزا ہوں۔“ وہ اس کی خاموشی پر جیسے حیران ہو کر بیٹھی تھی۔
”میں تمہیں پہچان گیا ہوں لیزا! میرے پاس تمہارا نمبر Save (محفوظ) ہے۔“ وہ قدرے تیزی سے بولا۔

”ممنون محفوظ ہے پہچان بھی گئے ہو۔ مگر لگتا ہے یہ بھول گئے ہو کہ کل جاری آخری بات یہ ہوئی تھی کہ ہم دونوں دوست بن گئے تھے۔“ لیکن اسے اسی خوشگوار دوستانہ انداز میں بول رہی تھی۔

”مجھے یہ بات بھی یاد ہے۔“ اس بار وہ ہلکا سا مسکرایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگال گئی۔

”شکر بھد شکو تمہیں میں بھی یاد ہوں، میری دوستی بھی یاد ہے۔“ وہ نہ تمہارے اچھی سے ”میلو“ سے تو میں بڑھ رہی تھی۔ خیر اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے قدرے جرانی سے اپنی خیریت بتائی۔ کیا اس نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟

کل آواز سے بات کرنے کے بعد وہ مست دھکی ہو گیا تھا۔ وہی سے پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد وہ پھر سے جیسے دکھ کے سمندر میں اتر گیا تھا۔ ایسا بہت کچھ یاد آ گیا تھا جس نے اس کی طبیعت کو پھر سے بوجھل کر دیا۔

”گواڑ سے تو بہت ٹھیک ابھی بھی نہیں لگ رہا۔“ وہ ستانہ سی مگر مندی کے ساتھ بولی۔

”میں نے ایک پروگرام دیا ہے۔ اس سے تمہارا موڈ اور تمہاری طبیعت دونوں اچھے ہو جائیں گے۔ تم آج شام ہی تو نہیں ہوتا؟“

لیزا کے سوال کے جواب میں وہ فوراً بولا۔ ”ہیں بڑی تو نہیں ہوں مگر مجھے۔“

”بڑی نہیں ہوتا اس پھر done ہو گیا۔ میں تمہارے آپس آف ہونے کے ٹائم پر تمہیں لینے آؤں گی۔ شام کے وقت روم میں سیاروں کے لیے جو خاص ادارے پرکشش مقامات ہیں وہ تو تمہیں

اسے لوگوں کے احسان لینے کی عادت نہ تھی اور اسے یہ بھی ہرگز نہیں پتا تھا کہ اگر آپ کسی سے احسان لے چکے ہوں تو پھر اس سے چھپا کس طرح چھڑاتے ہیں۔ وہ کہتی پرست اٹھ گیا تھا۔

”چلو!“ وہ اس کے دفتر سے لے آجکی تھی اس کے اسے Naples لے کر جانے اور واپس لانے کے احسان کے بدلے آئے اور کیا کیا کچھ اپنی مرضی کے خلاف برداشت کرنا تھا وہی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔ وزیر کے ساتھ دفتر سے نقل آیا۔ اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ بغیر اپنی مرضی اور خواہش کے اس کے ساتھ

Piazza di Spagna بار تھا۔

اس میں Barberini سے Spagna پہنچنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

قدیم آرکیٹیکچر والی بلاٹے ٹکڑے کے درمیان گھر ہے

Spannish Steps کے سامنے وہ دونوں کھڑے

تھے۔ شام کا وقت ہونے کے سبب وہاں ساحول کا رش

تھا۔ تاریخی اہمیت کی حامل میسرے میں شیف رکھنے

والوں کے لیے جاوٹی سناٹا تر رکھتی ہے جو ڈی اور کشادہ

سیڑھیاں بہت دور سے کھڑے ہو کر دیکھنے پر بھی نظر

آتی تھیں۔ خوب صورت انداز کی کشادہ میڑھیوں

کی تین میڑھیاں چڑھنے کے بعد اوپر خوب صورت

آرکیٹیکچر کا خالص دو ٹاور والا چرچ تھا جو فرانسیسی

حکومت نے اٹلی میں 18 ویں صدی میں بنوایا تھا۔

Steps کے بالکل سامنے مڑاک پر Bernini کا بنایا

مشہور Baraccia فونٹین (نوارہ) تھا، جو دیکھنے

میں ایک کشتی جیسا نظر آتا تھا۔ گویا میڑھیاں چڑھنے

سے پہلے بالکل سامنے کسی سے مشابہت رکھتا خوب

صورت نور آبرینی نوارہ تھا اور ڈھیر سارے steps

چڑھ کر بالکل اوپر پہنچ جائیں تو دو خوب صورت میناروں

والا چرچ دیکھنے والے کو اپنے آڑے ٹھکڑے سے بہت

کر دیا کرتا تھا۔ موسم بہار سے لے کر گرمیوں کے

موسم تک یہ جگہ ساحلوں کے ساتھ ساتھ روم کے

مقامی لوگوں کی بھی آماجگاہ بن جاتا کرتی تھی۔ ان

اس کے ماتھے پر سونے کی پٹی تھی۔
”میں اندر نہیں جاسکتی۔“ دفتر میں وہ اس کے علاوہ
اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

سیکرٹری اس کے آفس سے نکل رہی تھی جب وہ
بستی مسکرائی اندر داخل ہوئی۔

اس نے میروان نگر جاڑت کے پر تپنا دھیلے سے

بالاؤز کے ساتھ آٹھ واٹ ٹراؤزریمن رکھا تھا پیروں

میں اونچی اڑی والے آٹھ واٹ سینڈلز، بن گئے

ہوئے تھے جس طرح تمام اٹالین عورتیں اور لڑکیاں

جو وقت موقع اور موسم کے لحاظ سے میک اپ کیے

رکھتی تھیں اسی طرح اس نے بھی شام کے وقت کے

لٹاؤ سے لائٹ سا میک اپ کر رکھا تھا۔ خاتون پر نیل

پالش بھی لگی تھی اس کے ڈیرا فٹو گلاسز ہمیشہ کی طرح

اس کی شخصیت کے وقار کو بدھا رہے تھے۔

اس نے ایک نظر میں سر سے پاؤں تک اس لڑکی کو

اندردیکھا۔ اس میں ایسی کوئی کمی نہ تھی کہ اسے لوگوں

کے پیچھے بھاگنا پڑتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک مرد اس کی

نالت کی تمنا کر سکتا تھا۔ پھر اس لڑکی کے ساتھ مسئلہ

ناتھا؟

”چلو سینور سکندرا!“ وہ اس کی میز کے سامنے آتے

تے ہوئے۔

”چلو لیرا!“ وہ اخلاقا “مسکرایا تھا۔ ”میشو۔“

”میں جلدی آگئی۔ بس کاموں سے فارغ ہوئی

میں نے سوچا تمہارے آفس چلی جی ہوں۔ اگر ابھی

بہتر ہوئے تو میں تمہارا انتظار کر لوں گی۔ ویسے تم

ایک تو نہیں رہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اب وہ کیا بتا کہ اس سے پہلے کے لیے وہ آفس

اسنے کو پر تپنا ہی رہا تھا۔ لیرا کی نگاہیں اس کی میز پر

اس پر سڑت اس کے سامنے نہ کوئی فائن

ناتہات اور نہ ہی اس کا لپٹ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔

لیس کام ختم ہی ہو گیا تھا۔ وہ اندر سے سنجیدگی

سے بولی۔

”لیرا نے فوراً اس سے پوچھا۔

خواتین کی تحریکات نومبر 2011

میرا اور کورٹ میں یہاں پر اس اسید رینج ہوا کرتے تھے کہ شاید وہ کسی مشہور مصور کے اوائل کے طور پر منتخب کر لیے جاسیں۔

لیزا میٹرا اگر اسے اس جگہ کے متعلق تمام معلومات اس طرح فراہم کر رہی تھی جیسے کوئی گائیڈ کسی سیاح کو دوڑا ہوا "جیب رہا تھا۔"

"اب تمہارا کیا موڈ ہے؟" نے میڑھیوں چڑھ کر اوپر جانا ہے یا نہیں بیٹھنا ہے؟

میڑھیوں کے پاس آ کر گتے ہوئے لیڑا نے اس سے پوچھا۔ اس کا موڈ تو برے سے پہلے آنے ہی کا نہیں تھا مگر اس کے کوئی جواب دینے سے بل لیڑا مزید بولی۔

"ویسے اگر اتنی ساری میڑھیوں چڑھنے کا تمہارا سوڈ نہیں ہے مگر تم فریج دیکھنا چاہتے ہو تو اوپر جانے کے لیے لفٹ بھی ہے۔"

"جیسے بیٹھ جاتے ہیں۔" گھومنے پھرنے تاریخی جگہیں دیکھنے میں اسے قلعہ "ولجیسی نہیں تھی سوہ کوئی اور دنیا تھی کوئی نور زندگی تھی جس میں تاریخ سکندر شہزاد کو سمجھ کر کیا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے اپنے دوستوں کے ساتھ مصر گھومنے گیا تھا۔ وہ کہتا تھا اس نے قانون کا مضامین لکھ لیا۔

اب اسے جولیس سیزر کا اتلی بھی دیکھنا ہے پھر کسی فرصت میں وہ دونوں ملکوں کے اوپر ایک کتاب لکھ لگ۔

وہ دونوں چند میڑھیوں چڑھ کر قدرے اونچائی پر آ کر ایک میڑھی پر بیٹھ گئے۔

"آج میں نے تمہیں اسپینس اسپینس دیکھا دیکھا۔ کل سٹیڈی ہے تمہاری چھٹی ہوئی تھی؟"

نور کوئی تو ہوئی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مسکراتے ہوئے مزید بولی۔ "کل صبح میں تمہیں تمہارے ہوٹل سے پک کر لوں گی۔ پھر ہم کولونیم فورم اور پینتھون دیکھیں گے۔ پھر ویٹی کون کی میں تمہیں کسی اور دن لے کر چلوں گی۔"

میڑھیوں کے دوران ان میڑھیوں کو خوب صورت پھولوں سے سجائی دیا جاتا تھا۔

اس وقت بھی اسے میڑھیوں کے دائیں جانب پہلے زیپے سے لے کر اوپر تک جانے دھیر سارے خوش رنگ و خوب صورت پھول سے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے لوگ ان میڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ بہت سے سیاح فوٹو مشین کے ارد گرد کھڑے تصویریں کھینچ رہے تھے۔ کچھ میڑھیوں چڑھ کر اوپر چڑھ تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ بس وہاں کچھ مقامی آرٹسٹ بھی کھم کرتے نظر آ رہے تھے جو وہاں تفریح کے لیے آئے لوگوں کو ان کے پورٹریٹس بنا کر اسی وقت بیچ بھی رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے Piazza di spagna صندلیوں سے شاہروں اور بولے مصوروں نمونہ میدانوں اور آرٹسٹس کی پینٹنگ جگہ رہی ہے۔ بائرن شیلے آسکر وائلڈ جارج ایلینٹ ہنری جیمز میری شیلے برسی کیٹس کس کس کے نام یاد آ جاتے ہیں اس جگہ کے ساتھ۔ شام ہوئی دو رنگ کورز ختم ہو گئے ہیں ورنہ میں تمہیں وہ گھر بھی ضرور دکھانی جہاں کیٹس نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ اب اسے ایک میوزیم بنایا گیا ہے۔"

اس نے اپنا کوٹ لیڑا کی گاڑی میں چھوڑ دیا تھا۔ ٹائی کی ٹائٹ ڈھیلی کر دی تھی۔ وہ لیڑا کی بات سن رہا تھا۔ مگر اس کی ٹانگہاں بے شمار میڑھیوں اور اوپر درج سے نظر آتے چرچ پر تھیں۔

وہ دونوں میڑھیوں کے پاس پہنچے۔ وہاں پہلے steps پر بیٹھی ایک لڑکی ایک اٹالین آرٹسٹ سے اپنا پورٹریٹ تیار رہی تھی۔ وہاں چند اور آرٹسٹس بھی اسی طرح سیاحوں کے پورٹریٹس بناتے نظر آ رہے تھے۔ لیڑا نے بھی اس کے ساتھ اس آرٹسٹ اور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔

"مصوروں کا یہاں کھڑے ہو کر لوگوں کو ان کے پورٹریٹس بنا کر دینا ان جگہ کی تاریخ کا حصہ ہے۔ جتا ہے سکندر! انٹرویو سن حدی میں خوب صورت اٹالین

میں تم بے فکر ہو۔ مجھے تم میں اس طرح کی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے گھر پر ڈور لنڈاؤ میں کمرہ رہی تھی۔

وہ پھر نہیں پڑا تھا۔

”اصل میں سکندر راہبر ابھی زندگی میں بہت دور دور تک محبت اور شادی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں شادی اس سے کروا گئی جس سے مجھے محبت ہوگی اور جس سے مجھے محبت ہوگی وہ جب میری زندگی میں آئے گا تو مجھے پتا چل جائے گا میرے دل میں اسے دیکھتے ہی گھنٹیاں گنتے لگیں گی۔“

”اور مجھے دیکھ کر چونکہ تمہارے دل میں کوئی گھنٹیاں نہیں بجیں اس لیے مجھے یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی ہے۔“ وہ اس کی باتوں کو انجمنے کرنا نہیں کر پڑا تھا۔ وہ واقعی ٹھیک ٹھاک قسم کی ٹوٹ اسپو کن لڑکی تھی۔

”جس دن تم مجھے وہی بار Pizzeria میں لے گئے تھے بہت ہی ہنسنے لگے تھے۔ نہیں، نہیں، کوئی نہیں جی تھی۔“ سنجیدگی سے بولتے ہوئے اس نے لفظ ہنسنے کو بولنے کے ساتھ ہی فوراً حلفیہ انداز میں اسے یقین دلایا تھا۔

وہ پھر نہیں پڑا تھا۔ ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کرتی وہ خود بھی مسکراتی تھی۔

”اب میری بات کا کوئی اور مطلب مت نکالنا۔ مجھے تمہارا چہرہ ذرا عجیب طور پر تمہاری آنکھیں بہت عجیب لگتی ہیں۔ تم سے پہلی بار مل کر ہی میرا دل چاہا تھا کہ تمہارا چہرہ پیٹ کر لوں۔ میں تمہارا چہرہ پیٹ کرنا چاہتی ہوں سکندر! تمہاری اجازت سے۔“ اس بار وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کوئی اگر مجھے اچھا لگے اور میں اسے پیٹ کرنا چاہوں تو سیدھا سیدھا اس شخص سے جا کر پوچھ لیتی ہوں اور ابھی تک ہر کسی نے بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے مجھے خود کو پیٹ کرنے کی اجازت دی ہے مگر تم جیسے منع کرنے والے بازو بندے کے بارے میں کچھ نہیں

اس نے از خود ہی یہ نفس طرح فرض کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ روم کو نہ پھر پاتا ہوتا ہے۔ میں نہ مان میں تیرا مہمان۔ یکدم اس پر بڑبڑ سے پن اور فٹے کا حملہ ہوا۔

اس نے بے حد سنجیدہ نگاہوں سے لیزا کو دیکھا۔ اسے ایک روم ہی بہتر لگا کہ وہ اس سے براہ راست خود میں اس فیئر معمولی دلچسپی کی وجہ پوچھنے لگا ہے اسے برا ہی کیوں نہ لگ جائے۔ لیزا اس کی طرف لبخند دیکھ رہی تھی۔

”لیزا! ابھی تم سے ایک بات پوچھوں؟“

”نہیں، مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی ہے۔“ وہ جو سوال پوچھنے کے لیے اس کی طرف لبخند دیکھ رہا تھا لیزا کے اس بے ساختہ سننے پر کھانکا کہ کیا وہ مسکراتی ہوئی شرارتی لڑکیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم بھی پوچھنا چاہتے تھے نا؟“ وہ نہیں کر سکی۔ وہ حیرت کے گھٹنے سے باہر نکلا تو بے اختیار اس کے لبوں سے ایک قہقہہ نکلا۔ وہ لیزا کے اتنے آجائک اور اس قدر صاف گوشتے پر اپنا بے ساختہ قہقہہ روک نہ سکی تھیں پڑا تھا۔

اسنے Blunt انداز میں بد تمیزی کے ساتھ تو نہیں فرمایا تھا تو واقعی اس سے یہی پتا ہوا تھا۔

”نہیں۔“ وہ بھی روکتے ہوئے بولا۔

”عجیب تمہارے چہرے پر صاف صاف لکھا ہے کہ تم مجھ سے مشکوک ہو رہے ہو اور تمہارے جیسے ہنسنے بندے کے پیچھے کوئی لڑکی آئے تو تمہیں یہ پتا ہی چاہیے کہ وہ تم پر فدا ہو گئی ہے۔ اس میں ذرا کی شک نہیں کہ کوئی بھی لڑکی منٹوں میں تم پر عاشق بنی ہے۔“

باب مسکراتے ہوئے دلچسپی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا خراب موڈ اور بیزارمی جیسے یکساں نہیں غائب ہو چکی تھی۔

”کیوں اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ تم مجھے بھی اتنے بہت پیڑ سم لگتے ہو اور پھر سے تمہارا یہ غرور دہشتزدی بھی تم پر بہت جیتی ہے مگر میرے بارے

لگا تا مختص نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا قطعیت بھرا انداز
 دیکھ کر لیزا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر حسرت
 تھی۔ وہ جیسے سکندر کے بیوہ کی یوں اچانک تبدیلی کو
 سمجھ نہیں پاتی تھی۔

لیزا اسے ہونٹ چھوڑنے آئی تھی۔ ہونٹ تک
 آنے کا راستہ اس جسے خاموشی سے گزارا تھا۔ اس نے
 اپنے چہرے کو اتنا سنجیدہ اور سخت بنا رکھا تھا کہ لیزا جیسی
 باتوں لڑکی بھی اس سے بھر کوئی بات کرنے کی ہمت
 نہیں کر پاتی تھی۔

ہونٹ آنے پر گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے
 بڑکھٹ انداز میں ہنسنے لگا۔ اس کا شکر یہ ادا کیا۔
 "Spanish Steps" لیزا اٹھ کھڑی ہوئی۔
 دکھانے لے کر کہیں۔ "وہ حسب عادت جواباً"
 مسکرائی۔

"اور کل صبح میں تمہیں Forum اور
 Pantheon دکھانے لے کر چلیں گی۔"
 "میں شاید نہ جا سکوں۔" نیچھے آفس کا کچھ کام
 ہے۔"
 "آفس کا کام آفس میں کیا کروں۔"

روم میں چھٹی گاڑی تو Vacanze Romanice کی
 طرح گزاردی۔ کل پھر تم مجھے یہ بھی بتانا کہ تم مجھے اپنا
 پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے رہے ہو یا نہیں۔"
 اس کے انکار کے جواب میں مسکرا کر کوئی قسمی۔

اس نے Roman Holiday کے آغاز
 اٹالین میں ادا کیے تھے۔ وہ مزید بحث یا انکار کیے بغیر
 ہلا با سے غذا اٹھا کر کھانے لگا۔

اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا کہ لیزا کے ساتھ
 کبھی پر بھی جائے گا اور یہ انکار اسے کس طرح کرنا
 وہ سوچ چکا تھا۔

راستہ اپنے اسٹوڈیو میں تھی۔ وہ اپنی ایک ٹانگہ
 پیٹنگ مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے آواز

تھا کہ تم نے خوش تو کیا ہوتا ہے البتہ مجھے صاف جانب
 انکار کر دینا ہے۔

"تو اس لیے مجھ سے دوستی کی جا رہی تھی۔ میں
 بلاوجہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید تمہارے دل میں کوئی پہلی
 دلی بیج ماری ہے۔" وہ اپنی عادت اور مزاج کے برخلاف
 اس کے ساتھ اس قدر باتیں کیں کہ لیزا نے وہ خود
 چران تھا۔ اب اسے لیزا کی کمپنی میں لگ رہی
 تھی۔

ان کے پاس سے ساحلوں کا ایک گروپ پڑھیا
 چھتا اور چرچ کی جانب جا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے
 لیزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اتنا خوش کس بات پر ہے؟ آخر وہ اس کس بات
 پر رہا ہے؟ کیا سکندر شہنشاہ کو خوش ہونے اور بیٹے کا
 کوئی اختیار حاصل ہے؟ اس کے اندر خود سے شدید
 ترین نفرت میں مبتلا شخص نے یکدم یہی سوال کیا۔

مجھے بھروسہ اس کے لیون سے منکر ہٹ رخصت
 ہو گئی تھی۔ چہرے پر نرمی اور دوستانہ تاثر کی جگہ سختی
 اور تنجید کی آگئی۔ اس نے لیزا سے نظرس ہٹا کر سامنے
 Fountain کی طرف نگہ کی۔ وہ یہاں سے فوراً
 واپس چلے جانا چاہتا تھا۔ لیزا اس کے اندر کی شکست و
 رنجیت سے آجائان تھی۔ وہ اسی دوستانہ انداز میں
 اس سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ چلو جل کر کچھ کھاؤ
 ہیں۔ یہاں سیر میوون پر بیٹھ کر کھانے پینے کی بالکل
 اجازت نہیں ہے ورنہ یہاں بیٹھ کر کھانے میں اور مزا
 نہ ملے۔"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں لیزا۔" وہ ایک دم ہی
 سیر خفی پرستے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

لیزا بھی اتنی جلدی کیوں؟ ابھی تو میں تمہیں
 لیزا اسے حسرت سے دیکھتی کچھ کہنے لگی تھی گھر
 تنجید کی سے اس کی بات کٹ کر فوراً بھولا۔

"مجھے آفس کا کچھ ضروری کام ہے۔ میں اپنے
 ہونٹ جانا چاہتا ہوں۔"

لیزا نے اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھتا ہوا

خواتین ڈائجسٹ نومبر 2011

دھلی سی ٹی شہر ٹراؤزور کے ساتھ پین رکھی تھی۔
 ہاؤس کو کچھ چھوٹا لگتا ہوا تھا۔

کیونکہ پرنسنگ سمجھتے تھے اسے ایک دم ہی سکندر کا خیال آیا۔ وہ آج شام سے مسلسل اسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ ایسا کیوں تھا؟ وہ دوسرے لوگوں سے اتنا مختلف کیوں تھا؟ جیسے اندر ہی اندر کوئی غم اسے ختم کر رہا تھا، جیسے وہ خود سے ہی ناراض تھا۔

آج شام وہ اس کے ساتھ کتنے خوشگوار انداز میں باتیں کر رہا تھا، جیسے لگا کر رہا تھا پھر شہر شہر تک دم اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ جانتی تھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے ناگوار گزری ہو۔ وہ سکندر کے پل پل بدلتے ہوئے مودو کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ اس بہت مختلف سے شخص کے چہرے کو واقعی چپٹ کرنا چاہتی تھی۔ سکندر کی آنکھوں کی شگفتگی، سمیت ان کی گہرائی، ان کی اداسی، ان کا حزن اور ان کا سراسر اسے کیونٹ پر اتارنا تھا۔

جب رات وہ سویا ہی نہیں تھا تو صبح جاگنے کا کیا حال۔ وہ بیڈ پر لیٹا تھا اور اس نے ناشتہ کرنے ہی میں غور کر لیا تھا۔ اس وقت وہ غیر دلچسپی سے ٹیلیوین میں روزانہ کوئی خبریں دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے موبائل پر ایسا کی کل آئے تھے۔ بجائے اس کال کو اٹھوڑ کر دے اس نے اسے ریسیو کر لیا۔

”ہیلو“
 ”جی، سینور سکندر؟“ اس کے لیے میں شرارتی سی ناک تھی۔
 ”آجائو نیچے میں تمہارے ہوٹل کے باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“
 ”کیوں؟“ اس نے تعجباً حیرانی سے پوچھا جیسے کل کی بات یاد ہی نہ ہو۔
 ”ابا، مطلب؟ تم بھول گئے کیا؟ کل ہی تو طے ہوا کہ آج صبح ہم کولونیم چلیں گے اگر تیار نہیں ہو تو جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجائو میں تمہارا

”چلو کوئی بات نہیں۔ تم انجوائے کرو۔“ Pompeii بھی ہسٹری میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میں کھر جا کر اپنی کچھ اور سواری پیشکش کر رہی تھی۔ لیکن ہوں۔ کولونیم کا پروگرام پھر کسی دن رکھ لیں گے۔“ اس بار وہ خوش دلی سے بولی تھی۔

سکندر نے سکین کا ہاتھ لیا۔ اور بندے اٹھ کر ہاتھ دھو کر نکلا۔ مسلسل جاگ جاگ کر اس کی آنکھوں میں چلن ہونے لگی اور سر بھاری بھاری رہتا تھا۔ نہانے کے بعد وقتی طور پر اس کی طبیعت فریش ہو گئی تھی۔

ابھی وہ باہلوں میں برش کر رہی رہا تھا کہ اس کے پاس

خواتین ڈائجسٹ نومبر 2011

ایک ٹیوٹر جنٹل ہی دیکھ رہا تھا اور اس پر اس نے زور اور دمخ کے ریلوے اسٹیشن کی گولہ بنو دیکھیں۔ اگر زبان آتی ہوئی تو کم از کم یہ نہیں کالفاظ تو نہ نہ ہوں۔

”سمجھ تو مجھے آگیا تھا کہ تم میرے ساتھ کولونزم نہیں جانا چاہتے اس لیے جھوٹ بول رہے ہو، مگر دل چاہا کہ میں جھوٹے کو اس کے جھوٹ کے کھل جانے کا تجربہ کروا دوں۔“

وہ حقیقتاً ”بست شرمندہ“ ہوا تھا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا وہ اس کو صاف لفظوں میں جانے سے منع کرتا۔ ”تمہارے ساتھ جانے سے نہیں ہاں میرا کہیں پر بھی جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ وہ شرمندہ ہانکا سا مسکرا کر قدرے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”تو تم مجھے جج بھی بنا سکتے تھے۔ سہرا جج کچھ میں آگیا ہے کہ تم میرے ساتھ کہیں پر بھی جانے گئے میں بلکہ شاید میرے ساتھ دوستی کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے ہو تو اب میں تمہیں دستبردار کر دوں گی۔“ وہ یکدم ہی سنجیدگی سے بولتی ہوئی صوفے پر بیٹھی۔

”میں پلائی ہوئی سبائے۔“ وہ سنجیدہ انداز میں اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے جانے لگی۔

”لیزا! میں تمہارے ساتھ کولونزم جانا چاہتا ہوں۔“ وہ بے اختیار صوفے سے اٹھا تھا۔

لیزائے مزہ کرتے نہ کھلا۔ وہ ہنوز خاموش تھی۔

”میں آج روم کو ایک دو من لڑکی کے ساتھ اس فطرسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر لڑاہی کا ہوا دہرا رہا تھا۔

”جب تم کہیں پر بھی جانا نہیں چاہتے تو اسے جھوٹ پر شرمندگی فحش کرتے ہوئے زور دینا تمہیں کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اب بھی سنجیدہ تھی۔

”پلیز لیزا! میں تمہارے ساتھ کولونزم جانا چاہتا ہوں۔ وہ مزہ کرتے خال اور سفاک لوگ تھے میں جانتا ہوں۔“

وزت کرے اس کا مشاہدہ رہا چاہتا ہوں۔

ہوئی کے روسپی شین سے کال آئی کہ اس سے ملنے کوئی صاحب ہو کر کئی لمبائی میں آئے بیٹھے ہیں۔

اس نے نام پوچھا تو جواب میں ایک انٹالین نام لے لیا گیا۔ وہ اس نام کے کسی بھی شخص سے واقف نہیں تھا، مگر وہ انہی وقت میں سب لوگوں نے کہاں واقف تھا۔ وہ صرف یہاں متعلقہ ڈائریکٹ سے متعلق لوگوں سے ہی واقف تھا۔ یقیناً یہ ”آفس“ ہی سے کوئی شخص تھا اور یقیناً ”آفس“ ہی کے حوالے سے کوئی ضروری کام تھا۔

وہ فوراً ہی بذریعہ لفٹ نیچے آگیا۔ خوب صورت انٹیرور والی اس لمبائی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نرم و گہرا صوفے اور میزیں موجود تھیں۔ کچنے خوب صورت، ٹائلز، قیمتی فانوس اور دیواریں پر بے حسین نقش و نگار اس جگہ کو بہت آرتھسٹک لکھوتے رہے تھے۔

وہ وہاں کسی انٹالین مرد سے ملے آیا تھا مگر وہاں آتے ہی سامنے ہی ایک جھوٹے برائے فٹنی نظر آئی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے نہ دیکھنے کا تاثر دے ہی نہیں سکتا تھا۔

اپنے جھوٹ پر شرمندگی اور کیا ہیٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اس کے پاس آگیا۔ لیزا اسے گھور رہی تھی۔

”تو سینور سکندرو اس وقت Pompii جا رہے ہیں اور شرمین میں ہیں۔“

”آج سو ری لیزا! میں نے تم سے جھوٹ بولا۔“ بات کھل چکی تھی تو اب مزید جھوٹ نہیں بولا جاسکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہاری بات سننے کے بعد میں یہاں سے جانے ہی لگی تھی کہ اچانک مجھے پاؤ آگیا کہ آج تو روم سے باہر آئی کے دیگر تمام شہروں میں جانے والی ٹارل مینوز کی ٹرل ہے۔“

لیزائے گھور کرتے ہوئے طنزے انداز میں بولی۔

اس نے بے مزاحیہ اپنے سر ہاتھ مارا۔

وہ نہ اسے کہ نصیب نہ حلال نہ اس سے جا

خواتین ڈائجسٹ نومبر 2011

تمہیں یہاں لے آئی ورنہ تم سے تو کچھ بعید نہ تھا
کوئی نہ کہہ سکتا بغیر یہاں سے واپس چلے جاتے۔“
”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیزا محمود!“
اسی جیسی ٹون میں بولا۔

”تمہاری شکرگزاری کا اندازہ تو مجھے تمہارے آج
صبح کے جھوٹ سے ہی ہو گیا تھا۔ تمہیں قاتل کرنا
چاہتی ہوں تاکہ مجھ سے اپنا پورٹریٹ بنواؤں، ورنہ
تمہاری اس بد تمیزی پر مجھے بہت غصہ ہے۔ پتا ہے کل
تجسّس ڈولپ کرنے کے بعد میں نے اپنے سب کام
چھوڑ کر سب سے پہلے ہمارے آج کلونز مڈزٹ کرنے
کے لیے ٹن لائن ٹکنس خریدے تھے۔ اُسے یہاں
آجائیں تو معلوم ہے ٹکٹ خریدنے کے لیے کتنی لمبی
لائن میں لگنا پڑا ہے۔ اب ہم لائن میں لگنے کی رخصت
سے بچ جائیں گے۔“
لیزا نے اس کی صبح کی حرکت اسے دوبارہ جتائی
تھی۔

وہ اب گاڑی پارک کر رہی تھی۔ سکندر اور دو کچھ
رہا تھا۔ کلونزیم کے اندر داخل ہوتے اور اس کے بیرونی
حصے کے اطراف گھاس پر کھڑے ہو کر
تصویریں کھینچتے سیاح وہاں بے شمار تھے۔ جو لوگ
گھاس پر کھڑے ہو کر تصاویر بنوا رہے تھے وہ تصویر
میں اپنے عقب میں کلونزیم کو لانا چاہتے تھے۔
وہ گور لیزا گھاس کے اوپر چلے کلونزیم کے سامنے آ
گئے تھے۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہتا
تھا۔ اسے نہ اس لڑکی میں کوئی دلچسپی تھی نہ روم کی
تاریخ میں کچھ بھرپور تھی وہ اس وقت یہاں آکر خود کو
خوش محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس لڑکی کے ساتھ یہاں
آنا اچھا لگ رہا تھا۔

”اندرو چلیں؟“ اس نے لیزا کی طرف دیکھ کر خود
اندرو جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔
”چلو۔“ وہ جواباً مسکرا کر بولی تھی۔
وہ دونوں کلونزیم کے اندر آ گئے تھے۔ سیاحوں کے
ساتھ ریش کا حصہ بنے وہ بھی 72 آے ڈی میں سب
اس Amphitheatre کا نظارہ کر رہے تھے۔

مذہب خدائے انداز میں بھی وہ جان بوجھ کر اسے
اپس بھولا تھا۔ وہ جس طرح اپنے ملک کی ہر چیز
قید نے برحق تھی، جس طرح اپنے ملک کی ہر چیز
اللہ قدر کرتی تھی وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنی سفاک
ن کا کس طرح بوجھ کرے گی۔

”تھوڑے بہت نہیں آج اسے ٹھیک ٹھاک قسم
بہ تمیز آدمی ہو سکندر گھنارہ! اگر مجھے تمہارا
پورٹریٹ بنانے کا لالچ نہ ہوتا تو اب میں تمہارے
اتنے بھی بھی کہیں نہیں جاتی۔“ وہ اسے حوہرے
نے بولی تھی۔

وہ ہم سامسکرایا۔ ”چلیں؟“
”چلو۔“ لیزا جواباً اسی شکل بھرے انداز میں بولی۔
وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ لیزا کو شاید زیادہ دیر
رائس رہنا یا غصہ کرنا آتا ہی نہیں تھا تب ہی اب وہ
کے ساتھ نارمل انداز میں باتیں کر رہی تھی۔
گاڑی اب ایک اونچائی کی طرف جاتی سرنگ پر چل
رہی تھی۔

بہت دور سے ہی اس سرنگ پر کلونزیم نظر آنا شروع
ہوا تھا۔ رومیوں کے جادو جلال اور ان کی بربریت کی
نیزار سال پرانی داستانیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے
ایکے 7 عجائبات میں سے ایک عجوبہ اس کی نگاہوں
کے سامنے تھا۔ رومیوں کی انجینئرنگ اور آرکیٹیکچر
کی مہارت کا چہرہ جاکر شہوت۔ صدیوں سے شان و
نعت سے اپنی جگہ ابستاد۔ اس کی بیرونی دیوار کا
بہ حصہ اسے ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا جس طرح اس نے
شہر تعمیر اور عمودوں کو زونڈ کو مندر میں دیکھ رکھا تھا۔
”اگلی گئے والوں کے لیے کلونزیم دیکھنا تو لازمی
ہے۔ میں حیران ہوں۔ تم ابھی تک یہاں کیوں نہیں
گئے تھے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنا بغیر
آئے والا کوئی شخص یہاں سے واپس نہیں جاتا۔
ان کوئی بین الاقوامی سرودی ایسی نہیں ہو سکتی جس میں
کلونزیم کو نہ دکھایا گیا ہو۔“
سب لوگ اس میرا سر گزار ہوتا چاہتے تھے کہ میں

تمہارا یہاں کافی دنوں کا قیام باقی ہے، دیکھ لیتا ہوں
 تمہیں راضی کرنے میں کامیاب ہو ہی جاؤں گی۔
 وہ دونوں اب وہاں اس قدم آور کھینچو کے
 آہستہ آہستہ چلے اور گرد پیش کو دیکھتے ہوئے باقی
 کرتے رہے۔

وہ لڑکا کے پریشان ہے، انداز پر مبہم سا مسکرایا تھا
 کیونکہ وہ جانتا تھا ایسا بھی بھی ہوئے والا نہیں تھا۔
 اس کے ساتھ کہیں چلے جانا چھوٹے پھرے پر راضی
 ہو جانا الگ بات تھی مگر اس سے بہت کر وہ کسی بات
 کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔



”تم نے دیا میں ابھی تک Cheese (چیز) کھا
 کھا ہی نہیں ہے، اگر تم نے انگلیں چیز نہیں کھا
 ہے۔ اور تم نے دیا میں ابھی تک کافی نہیں پی ہے۔“
 تم نے انگلیں کافی نہیں پی ہے۔
 وہ دونوں طونم سے نزدیک ایک ریٹورنڈ میں
 کر رہے تھے، تب لڑکا اس سے بولی تھی۔ ریٹورنڈ
 کے باہر شید میں کئی میزوں میں سے ایک پر وہ دو آدمی
 بیٹھے ہوئے تھے۔

انگلیں پیر اور دونوں کے مزے دار وقت والا ہوا
 سے تیار کیا جاتا تھا، وہ دیر لڑکا بات دیکھی
 سن رہا تھا۔ وہ اپنی اس ٹوٹی کو برقرار رکھتے ہوئے آیا
 پل کا ڈرامائی وقفہ دینے کے بعد مزید بولی۔
 ”اور تم ابھی تک دیا میں کسی سچے آرٹسٹ
 نہیں ملے ہو، اگر تم لڑکا محمود سے نہیں ملے ہو۔“
 وہ بے ساختہ توجہ لگا کر فرمایا۔
 ”تم خود اپنی کتنی تقریریں کرتی ہو۔“
 ”ہاں تو ہوں تاہم تعریف کے قائل۔“ وہ اس
 بولی۔

”خیر اتم میلان ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارا
 والد مسلمان اور والدہ کرسچن ہیں۔“
 کچھ دیر کے بعد کھانا کھاتے کھاتے اس نے اپنی
 مگر میاں منہ سے نکلتے کے ساتھ ہی اسے اس

دور میں میں بہت بڑا کشادہ صحن مناجب اور اس
 کے اطراف سیرکیوں کی طرح اونچی اونچی پتھروں سے
 بنی نشیمنوں کی قطار میں جیسے کہ موجودہ دور کے فنٹائل
 اسٹیڈیمز نے اپنی تعمیر کا نیا دی نقش Colosseum
 سے چرایا تھا ایسا لگتا تھا۔ یہاں اس کھلے میدان میں
 انسانوں کا خونخوار ورنڈوں کے ساتھ مقابلہ کر دیا جاتا
 تھا۔ اور یہ غیر انسانی اور بربریت لیا۔ عمل Romans
 کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح تھا۔ پچاس ہزار افراد
 پتھر کی سیرکیوں پر بیٹھے نمایاں بجا بجا کر اس غیر انسانی
 عمل کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے
 سے پتھر کے سامنے کھڑے ہو کر بچے میدان کو دیکھ
 رہے تھے۔

loser who ever he may be”
 “Kill the

بے ساختہ Colosseum میں ان کھیلڈی ایئر
 لڑائیوں کے متعلق پڑھا گیا جہاں اس کے لبوں سے نکلا
 تھا۔ اگر خونخوار ورنڈوں کو جان سے مار دیا تو غلام اور
 مجرم آواز نہیں تو درد مندے کے ہاتھوں اس کی موت جو
 بارے گاؤں مرنے لگا۔

”تم لوگوں کی تاریخ علم اور سفاکی سے بھری ہوئی
 ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، رومن بادشاہ اپنے وقت
 کے ظالم ترین لوگ تھے۔“ وہ اس بار بغیر رمانے بولی تھی۔
 ”رومن اتنے بڑے بھی نہیں ہوتے، میں ایک
 رومن لڑکی کو جانتا ہوں اور وہ کافی اچھی ہے۔“
 اپنی شخصیت اور اپنے مزاج سے بہت مختلف جملہ
 بالکل نئے اعتبار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ لڑکا اس
 تفریحی جتنے پر خوش ہو کر مسکرائی تھی۔

”تو تم اس اچھی رومن لڑکی کو یہ اجازت دے رہے
 ہو کہ وہ تمہارے چہرے کے تمام نقوش، خاص طور پر
 تمہاری آنکھیں کان کے تمام تر ماترے کے ساتھ کینوس
 پر آدے؟“

”میں نے ایسا تو کچھ نہیں کیا۔“ وہ جواباً مسکرایا۔
 ”اس میں خوش ہو گئی تھی۔ لیکن خیر ابھی تو

”شکریہ بہت شکریہ۔ میں خاصا سنبھلا ہوں۔“

”نہ کھو آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہے، میری ماں تو چند ایک اہلین کا لیاں سیکھ لو۔ بوقت ضرورت تمہارے کام آئیں گی۔“

وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ بولنے سے ٹھک چکی تھی نہ ہنسنے سے۔

”تم اتنا کیسے بول سکتی ہو؟ میں پوری زندگی اتنا بول نہیں بولا ہوں گا، جتنا تمہارے ساتھ ان تین دنوں میں نہ بولا ہوں۔“

”میں زیادہ تو نہیں بولتی، لگتا ہے تم نے کبھی کوئی باتنی لڑکی پر کبھی نہیں ہے۔“

وہ اب اس کے ساتھ مسلسل اردو ہی میں بات کر رہی تھی۔ ہنس رہا۔

چل قدمی کرتے ہوئے اسے ایک ریڈیو ٹرنٹ کے پاس سے گزرتے اس کے شیشے کے دوازے میں اپنا عکس نظر آیا۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی نظر آتی۔ اپنے چہرے کی اس مسکراہٹ کو دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ فوراً رخصت ہو جاتی۔

مسکندو شہر کا کوئی حق کس نے دیا تھا کہ وہ زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کرے، مسکرائے، ہنسے، خوش ہوئے زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح گزارنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

”اب ہم Forum اور پھر Hill Palatine چلتے ہیں۔ شام تک گھومنے کے لیے۔“

وہ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”نارے پاس کافی ٹائم ہے۔“

لیزا اس کی سوجنوں اور موڈ کی تبدیلی سے انجان مسکرا کر بولی۔

”میرا کہیں اور جانے کا موڈ نہیں ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

اچانک وہ ٹھگ لہجے میں تنبیہ چہرے کے ساتھ بولا۔

”لیزا اس کے موڈ کی تبدیلی کو محسوس کر گئی تھی۔“

خواب گالیاں۔“ وہ لمبے لاطم سمجھ کر سنجیدگی سے انگریزی میں سمجھائے لگا۔ مگر اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لیزا کو ہراسہ لگتے میں ہلا کر رکھ کر لگا۔

”ہاں، سمجھتا ہے۔ پاپا نے تو ہمیں کبھی اردو نہیں سکھائی۔ مگر ہماری بچی بچپن میں مجھ سے اور میری بہن سے چونکہ اردو میں بات کرتی تھیں تو ہم دونوں ہی نے اردو سیکھ لی تھی۔“

میرا تلفظ اور لفظوں کی ادا کی صاف نہیں ہے مگر اردو بولنے پوری آتی ہے۔“

”تمہاری بچی تم لوگوں کو گالیاں سکھاتی تھیں؟“

”نہیں۔ یہ گالیاں تو میں نے نور سیم نے خود سے قربانی کر کے سیکھی تھیں۔ اسکول میں ہمیں کسی پر غصہ آتا یا لڑائی ہو جاتی تو ہم اسے یہ لفظ بول دیا کرتے تھے۔ ایک بار میرے ایک کلاس فیلو نے میری اور سیم کی لڑائی ہوئی تو اس سے بدلہ لینے کے لیے کچھ دنوں بعد ہم نے اسے جا کر بتایا کہ تم لوگ کچھ بے ہوش اس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ تم بہت جھنجھٹے اور ادا کرتے ہو۔ پتا ہے پھر ساری کلاس کے سامنے اپنی قابلیت جھماکنے کے لیے یہ جتانے کے لیے کہ اسے بہت ساری زبانیں آتی ہیں اس نے خود اپنے منہ سے پوری نکل کلاس کے سامنے میں لو کا پٹھا ہوں۔“

”گھاتھا۔“

تب مجھے اور سیم کو بہت مزا آیا تھا۔ بعد میں ہم دونوں خوب ہنسے تھے۔

وہ غصہ انداز میں دہرائی تھی۔

”مگر مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہو رہی کہ جو لڑکی تانہ تانہ میری دوست بنی ہے۔“

وہ ایک سو دو رک ڈرا سو دوں والی اردو Vocabulary (ذخیرہ لفظ) رکھتی ہے۔“

اس نے سے لے کر دیکھا۔

وہ لیزا والی سے شانے اچا کر ہنسی۔

”مگر تم سیکھنا چاہو تو میں تمہیں انہیں میں کچھ گالیاں سکھا سکتی ہوں۔ بوقت ضرورت تمہارے کام آئیں گی۔“

اس نے اپنی جذبات اسے پیش کیں۔

دونوں اب میز سے اٹھ رہے تھے۔ آج اس نے لیزا کو

سے سخت مزا ملتی جا رہی ہے۔
 ہنسی اور سکندر شہنشاہ کے لبوں پر؟
 خوشی اور سکندر شہنشاہ کی آنکھوں میں؟
 وہ خاموش لیٹا چھت پر لٹکے فالوس کو دیکھ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ بس میں تھکا ہوا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

لیزا چپ ہو گئی۔ وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔
 ”مجمہ سوری لیزا! اگر میری وجہ سے تمہارا دل خراب ہوا ہے تو تم اپنے بہت سے کام چھوڑ کر مجھے روم کے گارڈی سٹائلٹ دکھانے آئی تھیں۔ بس مجھے زیادہ بولنا یا تیس کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہیں اور کوئی محسوس کرنے لگتا ہوں۔“

لیزا نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ تب وہ اس سے سنجیدگی سے بولا تھا۔

”مجھے اندازہ ہے سکندر! اور تم کمرت کرو میرا دل ہرگز خراب نہیں ہوا۔ میرا عقیدہ تو منور سکندر پر ایسا اچھا تاثر قائم کرنا دوستی کرنا ہے تاکہ اس دوستی کے لحاظ میں وہ مجھے اپنی پیٹنگ سٹائٹ کی اجازت دے سکے۔“

وہ سنجیدگی سے بولی۔ نگاہوں کو شش کے پورے پورے مسکراہٹ رویہ کشیل پایا۔ اسے مسکراہٹ دیکھ کر لیزا بھی مسکرائی تھی۔ وہ اسے لگتے انداز میں رخصت کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک رسمی مسکراہٹ چہرے پر لے کر اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آ گیا تھا۔ اندر آتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے فینڈ کے لیے اگر مڑی تجویز کو فیلڈ لی اور اپنا موبائل فون آف کر دیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا وہ خود کو مزارنا چاہتا تھا۔ وہ اور ادا۔ اپنے ان دور اوتے خوابوں کو دیکھنے کے لیے سو رہا تھا۔ اچھا تھا جو اس کی طبیعت کو کئی دنوں تک بیڑھل رہا تھا۔

تین دن سے خوش ہونے اور تھکے لگا کر ہنسنے کی کہ جسے کم مزا بھی یہ خواب ہی ہو سکتے تھے۔ یہ وہ نہیں تھا تھا کہ وہ سوئے اور اسے دو ڈراؤنے خواب نظر نہ آئے۔
 سکندر شہنشاہ کو مزا ملتی جا رہی ہے۔ اسے کوئی سخت

”کہاں رہیں سارا دن؟“ مٹی رات کے لیے کھانا پکا رہی تھیں اور وہ میز پر چڑھ کر بیٹھی ناشپاتی کھا رہی تھی۔ اسے پھلوں میں ناشپاتی بہت پسند تھی۔
 ”ساروھے تین بجے تک تو جاگ رہی ہوگی مٹی! اس کے بعد۔“ سکندر اسے ملنے چلی گئی تھی۔ جب سے روم آئی ہوں اس سے مل ہی نہیں سکتی تھی۔
 ”کچھ پڑھو؟“ مٹی کو اس کے لالہ لالی بن سے پورے جلے میں زیادہ قابل توجہ گائیڈ والی بات لگی تھی۔

”جی گائیڈ۔ وہ سب چاروں سال نورسٹ نہیں ہے۔ آفس کے کام سے آیا ہوا ہے۔ مگر میں نورسٹ ہی اسے نورسٹ بنانے پر تکی ہوئی ہوں۔“ وہ اس کر رہی۔

”مٹی! اسے بغور دیکھا تھا۔“ وہ کون؟ وہ دیکھ کر کون؟
 ”کولیک کیا ہوا تھا تم نے اس کا؟“

”سکندر۔“ اس نے جھٹ اٹھیں نام چایا۔
 ”کیسا ہے؟“ مٹی نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے دیکھی سے پوچھا۔

”نرسٹانی پوچھ رہی ہیں یا مزاج؟“ اس نے ناشپاتی کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”ظاہری شخصیت کی بات کریں تو وہ بہت پسند سے۔“ لپٹو کا خیال آتا ہے اسے دیکھ کر۔

اور نیچر کی بات کریں تو وہ سڑے لوگوں سے بہت مختلف سا ہے۔ وہ۔۔۔ گھویا کھویا۔ اور اس سا خود سے خفا۔

خفا نہ۔ کبھی زندہ مٹی سے ہنساتے۔ کبھی بالکل سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ بات کرتے کرتے اپنا ایک ہی رنگ جاتا ہے۔

”متھے سے ایک دم ہی چپ ہو جاتا ہے۔“ وہ کچھ کھوکھلے کھوکھلے انداز میں جیسے تصور کر رہی۔

سکندر کو کہتے ہوئے بولی تھم۔
 ”شادی شدہ ہے کہ کوارا؟“ مٹی نے ایک دم ہی

پایا ہوں یا ہاشم اسد۔ سارے پاکستانی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بڑا فتنہ دو ٹیلے اور سنگ دل۔
وہ بے گنتی سے فوراً "بقی میز سے بچے اتاری اور کچن سے باہر چل گئی۔
نئی کے چہرے پر بھی کچھ برہمی تھی۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔



وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آکر خود کو پیٹنگ میں مصروف کر چکی تھی۔ جب اسے میز چلوں سے کسی کے اوپر چڑھنے کی آوازیں سنائی دیں۔

نئی اور اس کے پاس آئی تھیں۔ ان کے چہرے پر اب اس کے لیے حلق نہیں بلکہ مشاورت محبت تھی۔ ان کے پیار کے اظہار پر اب مزید اپنا موز خراب رکھ نہیں سکتی تھی۔

"آپ چلیں میں آ رہی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ وہ سگریٹ دھاتی واپس نیچے جا رہی تھیں۔ لہذا کام روک کر انہیں جہان آباد کھڑے رہی تھی۔ اس کی اصل گود اور اصل پیار تو اس نے پایا نہیں تھا بلکہ اس کے جیسے پیار کی جنگ اس نے نئی کے پیار میں دیکھی تھی۔

وہ جوانی میں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اولاد بھی نہیں۔ وہ اور لن کا خاندان اس کے دارا کے خاندان کے جدی پشتی ملازم تھے۔ اس کی وادی کو بننے کی اہلیں عورت سے شادی کے سبب اپنی پوتیوں کی تربیت اور پرورش سے متعلق تحکرات لاحق تھیں۔ پوتیوں کی اسلامی خطوط پر تربیت کے لیے انہوں نے اپنی قابل بھروسہ ملازمہ مرثیہ کو اٹلی بننے کے پاس بھیج دیا تھا۔ جب نئی چیتس مینٹس مل کی تھیں۔ پھر جب ان بہنوں کا گھر ٹونا ان کا ساتھ چھوٹا تھا۔ ان بہنوں کی زندگیوں میں نئی کی ضرورت بھی ختم ہو چکی تھی۔ جب گھر پر آ گیا تھا تو کسی آیا یا ملازمہ کی کیا ضرورت پائی رہ جاتی تھی۔ مگر جب پاکستان میں بھی نئی کا کون تھا وہاں جا کر بھی انہیں اس کی وادی کے گھر پر یا پھر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے گھر پر آیا ہی جاتا تھا تو پھر یہ ملک کیا برا

بے حد دلچسپی ظاہر کی۔ وہ سبزیوں کاٹی رک کر بخور اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"نئی! اس نے بے حد ناراضی سے انہیں دکھا۔
"اس کی اس قدر تعریف کر رہی ہوں تو مجھے لگا کر شاید۔"

"آپ کو بالکل غلط لگتا ہے۔" وہ نئی کا وضاحتی جملہ کاٹتے ہوئے قدرے ہنسی سے بولی۔

"وہ مجھے بس ایک دوست کی حیثیت میں اچھا لگا ہے۔ میں اسے پیٹ کرنا چاہتی ہوں اس لیے اچھا لگا ہے۔"

دلیکن کسی اور طرح بھی توفہ اچھا لگ سکتا ہے۔ جب وہ اتنا اچھا ہے تو پھر۔

"نہا ممکن۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی خافی اس کا پاکستان سے متعلق رکھنا ہے۔ ناممکن ہے کہ میں مدنی سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ اور سوچوں۔"

نئی کو اس کی بات بری لگی تھی۔ وہ پاکستان کی برائی سن کر ہمیشہ اسی طرح رد عمل ظاہر کیا کرتی تھیں۔
"پاکستانی ہونا کیا اعتبار ہے لیزا؟"

"ہاں میرے لیے برا ہے۔ میں کسی مسلمان آدمی سے شادی کریں گی۔ شکر وہ مسلمان آدمی پاکستان سے ہرگز متعلق نہیں رکھتا ہوگا اور آپ مجھے اس طرح ناراضی سے مت چھوڑیں۔ آپ خود کون سا نام پاکستانی ہیں۔" کڑشتہ چوٹیں سالوں سے آپ دھلیں ہیں۔

ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا۔ وہ برلا پاکستانی مردوں کو برا کرتی تھی اور نئی اس کے برائے پر ہر بار بول ہی بد مزہ ہو آگئی تھیں۔

"پاکستان کے خلاف یہ سناری فقرت سیم نے تمہارے اندر ڈال دی ہے لیزا۔" انہوں نے ہنسی سے کہہ کر دوبارہ سبزیوں کاٹنا شروع کر دی تھیں۔

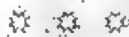
"پاکستان کے خلاف یہ ساری فقرت پلانے میرے اندر ڈال ہے نئی! انہوں نے کہتے عمل سے ثابت کر کے بتایا ہے کہ پاکستانی مرد کتنے برے ہوتے ہیں سو وہ



اسے تسخیر نہ نظروں سے دیکھتے اس کی بے بسی پر
قصہ لگا رہا تھا۔ خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا
تھا۔ مگر وہاں سے بھاگ بارہا تھا۔ ہی اس شخص
سے خود کو دور کر رہا تھا۔ زور زور سے چلاتے تھے کہ
ہی اس کی آنکھ کھلی کی تھی۔

چند سیکنڈوں بالکل کسی مزے کی طرح سناکت پیدا
پر بڑا رہا۔ اس کے جسم میں کوئی جھٹ نہیں تھی۔ کچھ
دیر بعد جب وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہوا تب
اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے چہرے پر گیا۔ اس کا چہرہ
آنسوؤں سے بھیا ہوا تھا۔ اسے پیوند آنے لگا۔ اس
کے جسم پر کیلیکٹ طاری ہو گئی تھی۔

اسے اپنے کمرے کے کھپ اندھیرے میں شدید
ترین ٹھن ہونے لگی۔ وہ اپنی ساری ہمت جمع کر کے
بستر سے اٹھا تھا۔ وہ کمرے کی تمام کھڑکیاں کھولنا چاہتا
تھا وہ کمرے کی تمام دریاں روشن کرنا چاہتا تھا۔



وہ لاس انجلس میں رہ رہا تھا اور کئی فوریا
یونیورسٹی میں اپنی انڈرگریجویٹ اسٹڈیز میں مصروف
تھا۔ اسے کھڑکی یا دبا کھل نہیں آتی تھی۔ اسے اگر کوئی
یاد آتا تھا تو وہ اس کی اموجین کھیں۔ بالی اسے اپنے گھر
کے نہ کسی فرد کی یاد آتی تھی نہ کسی اور چیز کی۔

اموجین سے اس کی فون پر خوب کئی گفتگو ہوتی
تھی۔ جبکہ شہیار خان اس سے فون پر انتہائی مشغولیت
کیا کرتے تھے۔ سرسری انداز میں اس کی تعلیم اور
تکلیف سے متعلق چند سوالات اور پھر مخصوص جملہ
کہ اسے میسوں یا کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔
وہ اس کا رزلٹ کیسا دیکھنا چاہتے ہیں آگے اس کے
بہ مستقبل کے لیے کیا کچھ سوچتے ہیں کچھ بھی نہیں۔ یہ
منہبہ دلچسپا سکندر سے کہتے ہوں گے۔

وہ اپنے گھر کے مقابلے میں خود کو لاس انجلس میں
فرانڈز سکون محسوس کرتا تھا۔ یہاں اسے ہر وقت کسی
کے ساتھ اپنا موزانہ نہیں کرتا ہوا تھا۔ وہ سکندر کو
کبھی بھولنے سے بھی فون نہیں کرتا تھا۔ سکندر وہی

بلی روم میں پاکستانی انجینئر کو اپنے بچوں کی
تربیت کے لیے پاکستانی آیا کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے
نسب والی ملازمہ تھیں، محمود خالد کے گھرانہ کی
مال کی آیا رہ چکی تھیں اس حوالے کی بنیاد پر انہیں
بلی روم میں ملازمت فوراً ہی مل گئی تھی۔ پھر
خالد کے بچوں میں وہ کسی نہ کسی پاکستانی مفاد
ایڈمنسٹریشن کے گھرانے کے بچوں کی آیا کے طور
پاں سکے بچوں کو قرقر پاک پڑھانے کا کام کرتی رہی
تک ان تمام برسوں میں لیزا کاغذ سے برابر رابطہ رہا

پانچ سال قبل جب اس نے روم میں اپنا ٹکٹ
بنے کا سوچا تب اس کے ذہن میں فوراً ہی یہ
ال آیا تھا کہ وہ اپنے ٹکٹ کی دیکھ بھال کے ذرا نقص
کے سپرد کر دے گی۔ اس نے اب بھی کو کس پر
ملازمت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ خود فیس سال
ب دو ماہ گزار آرتی لیکن بالی سارا اسٹیل ہاؤس کے
ت کا خیال نہیں رکھتی تھیں۔ وہ انہیں ان کے
اہلیت کے لیے ہندی سے جرمانہ اندن سے پیسے
بالتی تھی۔ اس کی پرورش اور تربیت میں ان کا
ہاتھ تھا۔ وہاں نہیں تھیں یہاں جیسی تو تھیں۔
باقی تھا اور اس کا فرض کہ اب جب وہ بوڑھی
ہی ہیں وہ ان کا خیال رکھے۔

وہ گھٹنا کھانے کے لیے نیچے آگئی تھی۔ کھانے اور
اسے بعد ان اس کدرات، بھر کام کرنے کا ہوا تھا۔



بہت امد میری جی ہیٹ تاک جگہ تھی۔ جیسے
نہار کوئی ٹرنگ وہاں روشنی کا نام و نشان نہ
اسے وہاں بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اسے اس
جیسے سے وحشت اور تنگ جگہ پر گھٹن ہو رہی
وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ دو کے لیے
اتھا۔ وہ چیخ چیخ کر رہ رہا تھا۔ کوئی تھا اور اس
نے میں چلتا اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا تھا۔ وہ

اس کے آنے کا انتظار کرتے کرتے کسے فون پر بلا۔
 بلائے آخر کار باپوس ہو کر جس روز بوسٹن واپس لوٹا
 وہ اس سے اگلے ہی دن واشنگٹن اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔
 ”میرا سوڈ نہیں ہے۔ میں چھٹیاں اپنے دوستوں
 کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

وہ خشک سے لہجے میں بولا تھا۔ اس کا لہجہ کسی بھی
 طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ لب بچہ نہیں
 تھا۔ براہ ہوجا تھا۔ اسے اب اپنے جذبات لوگوں سے
 چھپانا پڑ گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ سکندر کے لیے
 کچھ بھی محسوس کرنا، اس کا لفظوں میں اظہار بھی
 کرے۔ اس کا سرد اور خشک رویہ سکندر کو زین کی
 زندگی میں اس کی جگہ بنانے کے لیے کافی تھا۔

”پھر بھی تم کو خوش تو کو زین! دوستوں کے ساتھ
 بھرلے جانا۔ مجھے تم بہت یاد آتے ہو۔“
 سکندر کے لہجے کی محبت اسے بناوٹی محسوس ہوا
 تھی۔ وہ خود کو بہت اچھا ثابت کرنے کے لیے پورا
 کرنا تھا۔ اسے سکندر کی اس منہ بخت اور ادنیٰ
 شخصیت سے نفرت تھی۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے نامیں نہیں آسکوں
 پھر کسی اور چھٹیوں میں میرا آنے کا موڈ بنا تو
 چلاؤں گا۔“

وہ اسی خشک سے لہجے میں بولا تھا۔
 ”اچھا۔ چار جیسی تمہاری مرضی۔“ سکندر
 لہجے میں باپوسی دور آئی تھی۔

وہ سمجھتا تھا فور سے ہر چیز میں کٹر بھائی پروردہ
 کہتا ہے محبت ہرگز نہیں کرے۔
 اس نے سکندر کے لہجے کی باپوسی پر دھیان
 بغیر فون بند کر دیا تھا۔

اس نے اپنے پیادوں، مضمون کے طور پر آگیا
 منتخب کیا تھا۔ اپنی خواہش پر نہیں بلکہ اس کے
 اعزہ مگر بھوت ڈگری کے لیے سکندر کا بھی
 مضمون یہی تھا۔

ہر دس پندرہ دن میں اسے فون کیا کرتا اور وہ جان
 چھڑانے والے انداز میں چند منٹ کی بات کر کے سکندر
 سے پیچھا چھڑا لیا کرتا۔

باپ کے رویے اور ایک بے متعہ سی مقابلہ بازی
 اور اسی مقابلے بازی میں یہ درپے شکست نے اسے
 خاصا رخ اور منجیدہ پیدا کیا تھا۔ کمینس میں اس کی بہت
 زیادہ دوستیاں نہیں تھیں۔ تنہی کے چند ایک ہی
 دوست تھے جن کے ساتھ وہ اکثر نظر آتا تھا۔

جس طرح شہر ار خان نے سکندر کو بوسٹن میں رہائش
 کے لیے کر کے پر فلیٹ ولا رکھا تھا اسی طرح اسے بھی
 لاس اینجلس میں ظلیت مہا کیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا
 تھا کہ سکندر کے لیے رہائش کا انتظام کرنے وہ بوسٹن
 خود گئے تھے خود اس کی رہائش کے لیے جگہ منتخب کی
 تھی گھر کا سالن ڈالوا تھا جبکہ اس کے لیے یہ سارا کام
 لاس اینجلس میں اپنے ایک وائٹ کے ذریعے کروا دیا
 تھا۔ پیرے اس کے لیے بھی اتنی ہی خرچ کیا گیا تھا مگر اس
 پر اپنا وقت اور اپنی آوائیاں برباد نہیں کی تھی۔

اس روز رات میں سکندر کا اس کے پاس فون آیا
 تھا۔ وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر سکندر سے مست بد
 لے جا چکا تھا۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا اس سے
 بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سکندر کو سوچ کر اس سے
 بات کر کے اس سے مل کر سوائے اپنے بارے ہوئے
 ہوئے اور لاہری پوزیشن پر کھڑے ہونے کے اسے
 اور کوئی احساس نہیں ملا کرتا تھا۔

”کیسے ہو زین؟“ اس کے خشک سے ہیلو کے
 جواب میں سکندر گرم خوشی سے بولا تھا۔
 ”ٹھیک ہوں۔“ اس نے جوابا اس کی خیریت
 معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”اسرنگ بریک (چھٹیوں) میں میں گھر جا رہا ہوں!
 تم بھی آ جاؤ، کتنے مینے ہو گئے ہم دونوں ایک دوسرے
 سے ملے نہیں ہیں۔“

اس سے قبل وہ چھٹیوں میں جب گھر گیا تھا تب
 اس نے قصد اچانے میں دیر کر دی تھی کہ تک اسے پتا
 تھا کہ سکندر چھٹیاں گزار کر واپس جا چکا ہو گا۔ سکندر

خود اعتمادی سے آگاہ ہوا تھا اور یہ انداز ہوا تھا کہ وہ شاید
ایڑیا یا پاکستان سے ہے۔
بیتے میں تین چار بار یہ کلاس لینے اسے یہاں آتا
تھا۔

دوسری بار وہ وہاں کلاس لینے کے لیے آیا تو اتفاقاً
اسے اتم مریم کے برابر والی کرسی پر جگہ ملی۔ وہ خاموشی
سے بیٹھا۔ پھر سن رہا تھا۔

اس کے برابر بیٹھی وہ کچھ بھی اسی زبان کی طرح
مختلف سوالات پروفیسر سے کر رہی تھی۔ اور کہیں سے
بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر استاد کو پریشان
کرنے کے لیے اس طرح کے سوالات کر رہی ہے
بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے ذہن میں جو سوالات ابھر
رہے تھے وہ بظاہر دوسرے ان کا ذکر ہی تھی۔

کلاس ختم ہونے پر ایک ایک کر کے تمام
اسٹوڈنٹس کلاس سے جاتے گئے، مگر وہ وہیں بیٹھی
تھی۔ اسے Derivation میں ابھی بھی ایک
الجبرا تھی جسے پروفیسر سمجھانے سے قاصر رہے
تھے۔

وہ Maths میں شروع سے بہت اچھا تھا۔ اسے
اس Derivation میں کہیں کوئی کنفیوژن
نہیں تھی۔ اپنی علالت اور مزاج کے برخلاف وہ بے
ساختہ اس سے کلمہ بیٹھا۔

”اس Point پر آپ کنفیوژ ہیں؟“ لائسنس
میں سمجھاؤں۔ ”اس لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا اسے
یوں دیکھتے تھے جیسے ایسے جیسے ابھی تک وہ اس کی موجودگی
ہی سے لاعلم تھی۔

”ہاں ایسی کون سی غیر معمولی بات تھی۔ ذہنی شعور
میں کہ اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کا نوٹس لیا
جائے۔“ سکندر سے حد محسوس کرنے کرتے اب وہ
اس حد تک رخ سوچ کا حامل ہو گیا تھا کہ اپنے بارے
میں بھی بہت کم ہی کچھ اچھا سمجھتا تھا۔

”آپ کو یہ Derivation سمجھ میں آگئی
ہے؟“ اس لڑکی نے کچھ حیرت، کچھ خوشی سے کہا تھا۔
اس نے سسکراتے ہوئے سرابات میں ہلایا اور پھر اسی

اسے قانون پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر
اس نے بھی قانون پڑھنا تھا۔ رہائیں اس
بائنس مقابلے باڑی سے وہ کبھی باہر نکل بھی سکے گا
نہیں یا ساری زندگی سکندر جیسا بننے کی خواہش
رکھ کر رہ جائے گی۔ وہ خود کو اس جنون سے نکالنا چاہتا
ہو رہا تھا۔ اسے سکندر سے بالکل علیحدہ کر لینا چاہتا
تھا۔ لیکن اس کے اندر سکندر کو شکست دینے کی خواہش
آج بھی کہیں چھپی بیٹھی تھی۔

اسے مگر سب سے بڑا مسئلہ اس کے لیے اسے
Calculus کا اضافی کورس پڑھنا
اور یہ کورس پڑھنے کے لیے اسے سینتیس
نمبرت میں کلاسز لینا پڑے تھے۔

اس روز وہ اس سیمینکٹ کی پہلی کلاس لینے
Maths ڈیپارٹمنٹ آیا تھا۔ اور وہاں اسے وہ ملی

رہے اتم مریم۔
وہ اس دن کو ایک عام سادوں سمیٹ کر میسج آیا تھا۔
بانی نہیں تھا کہ آج اسے وہ ملے گی جس سے مل کر
کی زندگی سے تمام شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ اس
دوسرے تمام تجاویز ختم ہو جائیں گی۔ وہ اپنے
نمبرت سے ہٹا گاؤں تھا یہاں پہنچا تھا۔ اتم مریم کا
سیمینکٹ Maths تھا تو اس نے تو اس کلاس
پڑھائی تھا۔

وہ کلاس میں سچی گی اور خاموشی سے بیٹھا۔ پھر سن
تا۔ تب اس لڑکی نے مزہ فرما کر مسلسل زنجیر کرتے
والوں سے اسے جو نکلیا۔ وہ مختلف ذاموں
پر سے متعلق ایسے تکنیکی سوالات کر رہی
تھیں جن میں سے بعض کے جوابات پروفیسر کو بھی
میں تھے۔

ایک نہیں یقیناً وہ لڑکی بہت ذہین تھی۔ وہ
Calculus میں بہت
تھی۔ تب ہی اندر گریوٹ لیبیل پر اپنے پی ایچ
قابل پروفیسر کو تلف نامہ کر رہی تھی۔

اس کا اتم مریم سے پہلا تعارف تھا۔ جس میں وہ
اتم نہیں جان لگتا تھا۔ صرف اس کی قابلیت اور

کی نوٹ بک پر اسے Derivation شروع سے

آخر تک سمجھا دی۔

کل دس منٹ لگے تھے اسے سمجھانے میں۔

”اب کامیت شکر یہ۔“ ان مسکراتے ہوئے تشکر

آہستہ آہستہ بولی تھی۔

”یو آؤر ٹیچر۔“ وہ جواباً مسکراتے ہوئے کرسی

سے اٹھا تھا۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟“ وہ بھی اس کے

ساتھ ہی کرسی سے اٹھی تھی۔ اس وقت کلاس میں

صرف دو لڑکے تھے۔

”میں شہیار۔“

”میں ام مریم ہوں۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی زمین۔“ اس کے تعارف

کے جواب میں اس نے دوستانہ انداز میں اپنا تعارف

کروا دیا تھا۔ اس کا بے تکلف انداز اسے اچھا لگا تھا۔

”تم پاکستان سے ہو زمین؟“ وہ دونوں ساتھ چلتے

ہوئے کلاس سے نکل رہے تھے۔

اس نے نقشہ لفظوں میں اسے کہنے باہرے میں

بتایا۔ ان دنوں بھائیوں کی پیدائش امریکہ میں ہوئی

تھی۔ شہیار خان کی ملازمت کے سبب ان بھائیوں کی

اب تک کی ساری زندگی پاکستان سے باہر گزری تھی۔

اب گزشتہ کئی سالوں سے تو وہ لوگ سب ہی امریکہ

میں۔ ہاں چھوٹوں میں لان کا ہر سال پاکستان اپنے دادا

کے گھر چلے آئے اپنا خاندانی اور آبائی گھر لگا کر آتا تھا جانا

لازمی ہوا کرتا تھا۔ وہ امریکی شہری تھا جبکہ ام مریم

امریکی نہیں تھی۔ وہ یہاں پڑھنے کے لیے آئی تھی۔

اس مختصر رہی سے تعارف اور گفتگو کے بعد وہ دونوں

ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تھے۔

چند ہی دنوں کے اندر سے یہ بات بیا چل گئی کہ وہ

لڑکی صرف کلاس روم کے اندر ہی گھومنے کے دور لگ رہی

اپنی ذہانت ثابت نہیں کرتی بلکہ کلاس سے باہر اپنے

پورے ڈیڑھ منٹ میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا

منوا چکی ہے۔

Maths ڈیڑھ منٹ کا جو سہ ماہی میگزین نکلا

کرنا تھا اس کے ڈیڑھ پورے پورے میں شامل

ڈیڑھ منٹ کتب کی وہ دفعہ دوں گئی اپنے ڈیڑھ

کے علاوہ دیگر کئی سائنس ڈیڑھ سائنس کی

آؤر گناؤں اور کلبز کی وہ سرگرم ممبر تھی۔

وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمی

میں شہین دار کار کردگی اور ریڈیو گزرتے والی لڑکی

وہ امریکہ میں ایک امریکن یونیورسٹی میں امریکا

سہیت حاصل کر رہی تھی اور یہ کوئی معمولی کار

نہیں تھا۔

پہلے دن کی تعارفی گفتگو کے بعد اس نے ام

سے از خود گفتگو کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی

ہاں بیٹھے میں تین بار جب وہ کلاس

انڈیا کرنے آتا تب ام مریم بھی اس کے پاس آکر

کبھی دور رہی ہے اس سے سلام دعا کر لیا کرتی تھی۔

اپنے آپ میں تم رہنے والا سنجیدہ مزاج لڑکا تھا

میں ام مریم بالکل بھی اور لڑکی سے دوستی کا سہا

بدا نہیں ہوا تھا۔

ام مریم کا ڈیڑھ منٹ کتب روم جو لیتا بیٹھ کر

تہے جاتے جتنی باتیں اس کے کانوں میں پڑتی تھیں

اس سے اتنا واسطے بیا چل ہی چکا تھا کہ اس ڈیڑھ

اسکرپٹ ام مریم نے لکھا تھا ڈائریکشن بھی اسی کی

اور جو لیت کا کردار بھی وہی ادا کر رہی تھی۔

یہ ڈیڑھ منٹ لوگ کسی پیریڈ کے لیے کر رہے تھے

اس نے بھی خاموشی سے نکت خرید لیا تھا۔

آؤر وہ میں کچھ لکھتوں میں سے ایک پر بیٹھا

ام مریم اس پر قلم تو دیتی چہاں میں رہتی

رہی تھی۔ وہ بے جانتا حسین لک رہی تھی۔ وہ

جو لیت لک رہی تھی۔ اس کے آجانے کے بعد

پھر کسی اور کارکن جم نہیں پادیا تھا۔ ڈیڑھ منٹ

ہر فرد جو لیت کے حرم میں گرفتار ہو چکا تھا۔

وہ خوب صورت تھی مگر خوب صورت

لڑکیاں ہوتی ہیں جسے جو چیز دوسری لڑکیوں کا

سب سے نمایاں کرتی تھی وہ اس کی آنکھیں

چھلکتی ذہانت اس کی چھلکتی ذہانت تھی۔

خواہن ڈائجسٹ نومبر 2011

نہ تو بڑا خوشی محسوس کرتے اس نے بظاہر اسے چھوڑا تھا۔ کیا واقعی ام مریم نے کل اس کے نہ آنے کو محسوس کیا تھا۔

”کل پارٹی رنجی تھی تاہم میں نے اپنے گھر پر سب آئے تھے سوائے تمہارے۔“ وہ ناراضی سے کہتے گھور رہی تھی۔

”مگر تم نے مجھے بلایا کیا تھا؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”میں نے سناری کلاس کو انوائٹ کیا تھا اور مجھے اچھی طرح پتا ہے جب میں نے کلاس میں پارٹی کا اعلان کیا تھا تم بھی کلاس میں موجود تھے۔“

”میں اجتماعی دعوت دے جانے پر کہیں نہیں جاتا۔ مجھے جمع کا حصہ بننے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ اس بات پر سختی سے بولا تھا۔

”بڑے مغرور ہو تم زمین ٹھہراؤ! اگر مجھے پتا ہو آتم اس قدر مغرور اور خوب بند ہو تو تمہیں علیحدہ سے پارٹی کی دعوت دینی۔“ اس نے جولیا ام مریم پر یہ جاہلیت کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی کہ وہ مغرور اور خود پسند نہیں ہے۔ وہ خاموش رہا تھا کہ وہ کسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”Play والے دن بھی آئے مگر مجھ سے ملے نہیں۔ سب فحش سے ملنے، مجھے مبارک باد دینے آئے“ سوائے تمہارے۔ کل پارٹی پر میں نے تمہارا اس اندر انتظار کیا، مگر تم غائب۔ اس قدر مغرور بھی نہیں ہونا چاہیے انسان کو۔“

”تو اس نے اسے Play والے دن نہ کھا تھا؟ وہ ام مریم کی شخصیت کے محور میں گرتا رہے شمار انفرادی سے ایک فرد نہیں تھا۔ وہ اس کے ہونے اور نہ ہونے کو محسوس کیا کرتی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی وفات کے بارے میں اس نے اپنے اندر ایک نئی خوشی ابھرتی محسوس کی۔ اسے زندگی میں پہلی بار خود اپنے آپ پر یار آیا خود سے محبت کا احساس جاگنہ انا غیر اتم تھی ہمیں وہ اتنا عام

سہارا نہ کہ جس نے سوچا۔ اتنے لوگ ہمیں مبارک باد دے

وہ مہموت سا تنگی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ڈرامہ ختم ہونے پر وہ خاموشی سے آؤڈیو ریم سے اٹھ آیا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں کی طرح اس نے ام مریم سے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

ام مریم کو تو یہ پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ وہ بھی آیا تھا۔ اپنی بہت سی باتوں کے سچ اس نے تمنا حسین و زمین لڑکی کو زمین، شہیار کی باتیں سنائی دیں وہوں کی؟ وہ اپنے اندر ایک بے نام سی اداس محسوس کر رہا تھا۔

ام مریم اپنی کاسیابی کی خوشی میں تمام کلاس فیلوز کو پارٹی سے رہی تھی۔

اسے سہارے اسے پسند کرنے والے بہت تھے۔ زمین، شہیار تو کہیں بس منظر میں تھا۔ جو کم کا حصہ بننے کے لیے وہ اس کے گھر پارٹی میں جاتا؟ ظاہر ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

وہ پارٹی میں نہیں گیا تھا۔ پارٹی سے اسے گھر روز اس کی کلاس بھی نہیں تھی تو وہ بار ٹھنٹ بھی نہیں گیا۔ وہ اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھا اور لاہور پری کی طرف جا رہا تھا۔ جب اسے سامنے سے ام مریم آتی نظر آئی۔

وہاں وہ جتنی مہول تھی، جتنی اس کی دوستیاں تھیں یہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ دوست ضرور ہوں گے جن سے وہ ملنے لگی تھی۔ وہ اسے دیکھ لینے کے باوجود نہ دیکھنے کا اثر دے کر خاموشی سے گزر جانا چاہتا تھا۔

حکمرید دیکھ کر اسے اپنی جگہ پر روک جاتا ہوا کہ وہ اسی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سا خاموش کھڑا اسے اپنے پاس لے کر دیکھ رہا تھا۔

”کل کہاں تھے تم؟“ وہ آتے ہی بغیر سلام و دعا کے خنک سے بولی۔

”پہلی کل۔ اب یہ مت کہنا کہ تمہیں پتا نہیں ہے۔ کل کیا تھا۔“ وہ خفا خفا اسے دیکھ رہی تھی۔

”اس کی بات سنو۔“ وہ دیکھ رہی تھی۔

اسے بے نیاز خوشی کا احساس ہو رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے تنگ کر دے اور یہ کہ یہ اس کا ہی ہے۔
پارسی لڑکی نے اسی کے لیے کیا تھا۔
”بھیت اچھی لگ رہی ہو۔“ وہ اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”شکر! میں نے سوچا تم خاص طور پر میرے اعزاز میں مجھے یہ سچ دے رہے ہو تو مجھے بھی ذرا اچھی طرح بتا دو کہ آنا چاہیے۔“ وہ جواباً مسکرا کر بولی۔
ساتھ بچ کرتے ہوئے وہ دونوں دنیا دہانے کے تمام موضوعات پر باتیں کر رہے تھے۔ وہ لڑکی صرف حسن اور ذہانت میں ہی یکساں تھیں تھیں وہ ہر چیز کو درجہ اول میں منقسم تھیں۔

اس کا ذوق بہت ہی اعلیٰ تھا۔ کھانے پینے سے لے کر لباس، دلچسپوں، دوستوں اور زندگی گزارنے کے انداز تک ہیں۔

اس کی گفتگو کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ اس کا جی چاہتا رہتا تھا کہ وہ اس سے ملے اور وہ اسے متاثر کرے۔ اس روز بچ کر کے وہ دونوں ریلوے سٹیشن سے باہر نکلے تو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ چکے تھے۔ وہ لڑکی اس کے لیے بے حد اہم ہو چکی تھی۔

اب وہ کلاس لے کر آئے اور وہ دونوں کلاس میں ساتھ بیٹھتے۔ لائبریری میں ساتھ بیٹھ کر اپنے اساتذہ متنبہ بناتے لائبریری جم کئے میز، کمپیس کے آس پاس کی دیگر جگہیں ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی جہاں وہ ساتھ وقت نہیں گزارتے تھے۔

وہ کم گو تھا، اپنی ذات میں گم رہتا تھا۔ کچھ زیادہ سوشل بھی نہیں تھا کہ اب ام مریم کے ساتھ وہ بے گناہ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کمپیس میں جن کلچر کی سرگرمیوں میں وہ مصروف رہا کرتی تھی اسے بھی زیادہ سی ان میں شامل کرنے کی کوشش کرتی اور وہ صرف اور صرف اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی دھن میں ان سب میں شامل ہو کر جا رہا تھا۔

وہ پاکستان سے آئی تھی۔ اور یہاں اپنے چچا کے

رہے ہیں، سزا رہے ہیں، ان سب کے بچ میری سہارا بنائی شاید زمین ضرورت ہی نہ ہو۔
”تم نے بالکل غلط سوچا تھا زمین! میں نے تمہاری سہارا کا بہت انتظار کیا۔ میں نے کل پانی پر بھی تمہارا بہت انتظار کیا۔“

جھلجھلایا ہو گیا سوچ گیا۔ آج تمہاری اس خوشی اور کامیابی کو سیلیبریٹ کر لیتے ہیں۔ کہیں ساتھ بچ کر لیتے ہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

ام مریم کے چہرے پر پھلنے والی خوشی مری نے ساختہ تھی۔ کیا وہ اس لیے خوش تھی کہ اس کے ساتھ وقت گزارنے کی بات کر رہا تھا؟ کیا وہ زمین سہارا اس غیر معمولی لڑکی کے لیے کچھ غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا تھا؟ جو اسے نظر برہا تھا، جو ام مریم کی غلطیوں سے بڑی تھی اس سے سمجھ لینے کے باوجود بھی وہ سمجھنے سے ہٹا رہا تھا۔

بچپن سے خود کو نظر انداز ہوتے دیکھنے کا وہ احساس اس طرح اس کے اندر بیٹھ چکا تھا کہ اب یک دم ہی یہ مان لینا کہ وہ نظر انداز کی جانے والی شخصیت کا ایک نہیں ہے، مشکل ہو رہا تھا۔ ام مریم نے خوشی اس کی بچ کی دعوت قبول کر لی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ بچ کرنے جا رہا تھا۔ امریکہ جیسے ملک کا شہری ہوتے دیں لے کر پورے 19 سال کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود اس کی ابھی تک کوئی کرل فرینڈ نہیں تھی۔

وہ صرف اسے چاہی نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ اس کے لیے پھولیں، ایک گلہ، تہ اور چاکلیٹس کا ایک باکس بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کی کامیابی پر اسے سہارا کا ہونے کے لیے بطور تحفہ۔

ام مریم اس بچ کے لیے بطور خاص تیار ہو کر آئی تھی اس نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ سلیقے سے کیے میک اپ اور شلے سے کچھ نیچے تھے سلی بلی جو صبح کمپیس میں بیٹھیں نہ کھڑے ہوئے تھے اس وقت کھلے تھے۔ وہ اس کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔

فوتنا مختلف پروگرام کا اہتمام کرتا رہتی تھی تاکہ اس طرح ان ممالک کے طالب علموں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملتا رہے۔ ام مریم اس کی نمبر تھی اور اس کی خواہش پڑھ بھی اس کا کمپوزنگ تھا۔

اس روز اس تنظیم کی جانب سے بارلی کیو پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پارٹیوں میں جانے کا شوقین نہ ہونے کے باوجود وہ ام مریم کے ساتھ بعد شوق تمام پارٹیز میں جاتا۔ وہ اس ریت بھی اس کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

ساتھ اشبن ممالک سے تعلق رکھتے بہت سے اساتذہ کرام بھی اس پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے پروفیسرز اور لیچرز چاہے جتنے بھی سخت مزاج ہوں مگر کلاس روم سے باہر خصوصاً اس طرح کی تقریبات میں وہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ خوب کھل کھلا جاتے۔ آج بھی اس پارٹی کے لیے ان کے ایک پروفیسر نے اپنے گھر کا بیک یاڑو ان اوگول کو بخود آکر کیا تھا۔

ان کا گھر عموماً بڑا تھا اور بیک یاڑو میں اتنی جگہ تھی کہ وہاں بارلی کیو کیا جاسکے اور تمام افراد وہاں بیٹھ بھی سکیں۔ وہ maths ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر تھے۔ ان میں سال کے بالکل رنگ ایسوسی انٹ پروفیسر۔ غالباً والد امریکن تھیں اور والد انڈین۔ زمین لڑکوں کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور مریم اپنے پروفیسر اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ بارلی کیو کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

اسے پروفیسر کا اس سے اتنا کھانا ملنا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بلاوجہ ہر بات کے لیے اسی کو آواز دے رہے تھے۔ ام مریم سے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ اسے ان کی لڑکیوں میں ام مریم کے لیے پسندیدگی محسوس ہوتی تھی۔

ایک دم ہی اس کا موڈ آگ ہو گیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اسے ام مریم پر شدید غصہ اڑھا تھا۔ وہ اس سے کچھ ہی کے سے خیر وہاں

باس رہ رہی تھی۔ وہ بہت اچھی فیملی کی لڑکی تھی۔ جس بہت اس کے ساتھ ہوتی تھی تو اس کے ساتھ ہوتی ہی تھی مگر جب ساتھ نہ ہوتی تھی تب بھی ساتھ محسوس ہوا کرتی۔ وہ رات اسے سوچتا اس کی باتیں یاد کر کے مسکراتے ہوئے سو جاتا۔ اب اسے گھر کی رتی برابر بھی یاد نہیں آتی تھی۔

شہر یار خان اب بھی اس میں اور سکندر میں واضح فرق رکھتے مگر اسے اس سے بھی اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب وہ سکندر کو دوسرے سے سوچا جی نہیں کر رہا تھا۔ اسے زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔ اسے زندگی میں کوئی بار خوب اپنے آپ سے پیار ہو گیا تھا۔ اس کا خوش رہنے کو دل چاہتا اور وہ بے پناہ خوش رہتا بھی تھا۔

اس کے دل نے اس سے کہا وہ ام مریم کا ساتھ کچھ جھٹکوں کچھ مہینوں یا چند سالوں کے لیے نہیں بلکہ عمر بھر کے لیے چاہتا ہے۔ وہ اسے ام مریم سے محبت کرنے لگا۔ وہ لڑکی اس کے لیے گارنٹی ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے جو بھی جذبات رکھتے تھے مگر ابھی تک ایک دوسرے سے ان کا اظہار نہیں کیا تھا۔

یہ ایک ان گنی تھی جسے وہ نہیں سمجھتے تھے یہ محبت کا اظہار ابھی تک زبان سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک ڈر ایک چھپا ہٹ سی تھی اگرچہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے والہانہ پیار کرتی ہے مگر کیا وہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے؟

نجانے وہ ہو جانے کا کیا خوف تھا اس کے اندر جو وہ لاکھ کوشش کے باوجود اسے مہینوں بعد بھی ام مریم سے اقرار محبت نہیں کر رہا تھا۔

کچھ کولس کا پہلا کورس ختم کر کے واسطے سمسٹر میں جا چکا تھا۔ گراب انیسٹین ملنے کے لیے اس کلاس کی ضرورت بھی کہاں تھی وہ دونوں ہمہ وقت ساتھ ہوتے تھے۔ اشبن اسٹوڈنٹس کی ایک تھی جو

خواتین انجسٹ 2011

وہ ام مریم کے آنسوؤں پر بھی دھیان نہیں دے
پارہ تھا۔ وہ اس کے لفظوں میں موجود محبت کی شدت
پر سکت کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔

”مریم! دے اختیار اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس سے کیا کہے۔

”لوگ مجھے کتنا پسند کرتے ہیں یا نہیں کرتے مجھے
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں انھیں فرق پڑتا ہے تو
اس بات سے کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہ مجھ
سے محبت نہیں کرتا یا شاید محبت تو کرتا ہے مگر اس کا
اقرار نہیں کرنا چاہتا۔ شاید میں اس کے لیے اتنی اہم
ہوں ہی نہیں کہ وہ میرے ساتھ اپنی ساری زندگی
گزارنا چاہے۔“

ام مریم اس کا جواب سننے کے لیے وہاں رکی نہیں
تھی۔ وہ رو رہی تھی وہ اس کی جلی جلی تھی۔ وہ اس کے پیچھے
نہیں گیا تھا۔ چند منٹ وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ
وہاں سے واپس آ گیا۔ اسے ام مریم کے اظہار محبت
نے خوشی دی تھی۔ اسے اس کے آنسوؤں سے
تکلیف پہنچی تھی۔

اپنی خود ساختہ سوچوں اور احساس کمتری میں گھر گھر
اس لڑکی کو گھولنے چلا تھا؟ لڑکی ہونے کے بجائے
اظہار محبت میں بدل گئی اس کی جانب سے چاہتی تھی۔
اس کے اہل سے کسی خوبصورت اقرار کو سننے کی منتظر
رہی تھی اور وہ اسے یہ خوشی نہیں دے پایا تھا۔ اسے
خود پر شدید غصہ آیا۔

وہ اپنی اس زیادتی اور اس لطمی کا ازالہ اب کسی
پرست دست خوبصورت اور مغز انداز میں کرنا چاہتا تھا۔
اسے کیا اگر تھا؟ وہ سوچ چکا تھا۔

آگے والے چند دن اس نے بالکل خاموشی سے
گزارے۔ بظاہر ام مریم اس کے ساتھ پہلے والے
انداز ہی میں مل رہی تھی۔ وہ دونوں کمپس میں پہلے
تھی کی طرح ساتھ ہوتے تھے مگر وہ جانتا تھا ام مریم اس
سے سخت ناراض تھی۔ اتنی ناراض کہ اپنی ناراضی
کا اظہار کرنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

جے جانا چاہتا تھا مگر ام مریم نے شاید اسے ایک
دور سے جانتے دیکھ لیا تھا۔ کٹ سے باہر نکلتا رہا تھا۔
اس نے اپنے پیچھے ام مریم کی آواز سنی۔

”زین! کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے
انہیں کھٹا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ
اور ناراضی تھی۔

”میرے سر میں درد ہے مگر جا رہا ہوں۔“

”مجھے جائے بغیر۔“ میں تمہیں اٹھ کر آتا ہوں۔“
مجھے بتائے بغیر چلے جاتے۔ چاہے میں جتنا بھی
شان ہوئی رہتی؟ اس کے لیے میں واضح شکوہ تھا۔

”میں نے ضرورت محسوس نہیں کی نہیں چلنے
لی۔ تم ڈاکٹر خان کے ساتھ کافی مصروف تھیں۔“
اس کا لہجہ طنزیہ اور کچھ جھکنے والا تھا۔ ام مریم اسے
دیکھتی رہی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے تم یوں ہی چلے جاتے اور مجھے کچھ
فرق نہیں پڑتا؟“

”ہاں تمہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں چاہیے اور
راستے والے لوگ بے شمار ہیں۔ زین شہر بارہنٹے
کوں کے درمیان نظر کراں آتے ہیں۔“

وہ سخت بے مروتی سے بولا۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔

اس نے ام مریم کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھے تھے۔
”ٹھیک کہا تم۔ زین شہر بارہنٹے کیسے نظر آسکا
بہ اس کی میرے لیے اہمیت کیا ہو سکتی ہے سوائے

اس کے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ سوائے اس
کہ وہ میرے لیے ساری دنیا کے تمام لوگوں سے
اداہم ہے۔ سوائے اس کے کہ جس وقت وہ میرے

اتنے ہو جاتا ہے میں حیرت ہو جاتی ہوں۔ سوائے اس کے
کہ جب وہ اس پاس نظر نہیں آتا میرا دل اواں رہتا
ہے۔ سوائے اس کے کہ ساری دنیا میری تحریف

نے مگر زین شہر بارہنٹے غلط سمجھے تو اپنی ہر اچائی ہر
بے میرے لیے ہے۔ معنی ہو جاتی ہے۔“
اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

اپنے رویے اور اپنے لفظوں کی سختی پر شرمندہ ہونا

SHIP (جہاز) پر انوائٹ کیا تھا۔ اسے یہ نہیں بتایا تھا

کہ اس CRUISE پر صرف دو دونوں ہی ہوں گے بلکہ یہ کمانڈر والے دو مشینوں کے گروپ کے ساتھ CRUISE SHIP پر دونوں کے لیے جا رہا ہے۔

اس CRUISE SHIP نے لاس اینجلس سے کے کیرالینا کی لینڈ تک جانا تھا۔ وہ میان میں اور خوبصورت مقامات پر رکتا تھا۔ ایئر لائنی طور پر انکار کرنے کے بعد وہ اس کے اصرار پر مان گئی تھی۔ لاس اینجلس سے ان کی CRUISE SHIP نے روانگی کا آغاز کیا تب ام مریم اس سے تعجب سے پوچھنے لگی۔

”تمہارے دوست کہاں رہ گئے؟“
”میری دوست ام مریم میرے ساتھ ہے۔ مجھے اس کے علاوہ اور کسی کا ساتھ نہیں چاہیے۔“
وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے لفظوں میں کڑائی تھی۔ سچائی تھی۔ ام مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہاں پر انجوائے کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ میوزک، ٹیکس، ہمسرے کھانے اور بھی بہت کچھ۔ سارا دن وہ اس سب کو انجوائے کرتے رہے۔ رات میں وہ اسے اپنے ساتھ عرشے پر لے آیا تھا۔ وہ کھلے سینڈر کے تختوں پر خوبصورت جہاز کے DECK پر خوبصورت سرنگھانوں کے ساتھ لمبے پرواز کرتا چاہتا تھا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم! میں تمہارے ساتھ اپنی پوری عمر جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری محبت اور میرا ساتھ قبول ہے؟“

اس نے آہستگی سے بولتے ہوئے پھل اس کی طرف دیکھنے اور اپنا دسرا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”ہاں“ جیسے اس سے اس انداز سے اظہار محبت کی امید میں رکھتی تھی۔ وہ خوش بھی تھی اور وہ حیران بھی۔ ام مریم نے سبے اختیار اس کے ہاتھ سے پھل لے لیے اور اپنا ہاتھ زمین کے بڑھے ہاتھ میں دے دیا۔

”تم کبھی بھی لوہہ نہیں بھی کہتے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔“

پرواز کرنے کے لیے یہ خوبصورت جہاز اور یہ سینڈر منتخب کر کے تم نے ان لمحوں کو میرے لیے

بہت یادگار بنایا ہے زمین!۔

وہ خوشی سے ہنستا رہے جس پر اس نے ہنسی سے دھمکیاں دے کر کہے ہوئے والہانہ لفظوں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس نے وہ شدید محبت کرنا تھا۔

”بیٹا جی میں سنل کی عمر شادی کے لیے کچھ چھوٹی نہیں ہے؟“ اس کی امو جان چیخنے والے انداز میں اس سے فون پر کھڑی تھیں۔

جہاز سے واپس آکر اس نے اس رات ہی اپنی امو جان کو فون کیا۔ وہ انہیں ام مریم کے بارے میں بتاتا چاہتا تھا۔ اپنے گھر میں وہ صرف ماں ہی سے قریب تھا۔ کیہ باپ نے اسے بھی دور خوارا تھا سمجھائی نہ تھا۔

سو باپ سے وہ ام مریم کا کیا ذکر کرے۔ وہ گیا سکندر تو کہ وہ اس کا بھتیجا نہیں تھا کہ اپنی باقی ذاتی بات اس سے سن کر کہے اس نے شہزاد خان اور سکندر شہزاد یار دونوں کے متعلق سوچنا اور کڑھانا دونوں بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے سکندر کے ساتھ زکوٰۃ کی مثالہ کرنا ہے نہ موازنہ۔

”میں ابھی شادی کی بات نہیں کر رہا ابھی تو ہم دونوں بڑھ رہے ہیں۔ وہ بڑی ambitious لڑکی ہے۔ اگلے چار پانچ سال تو ہم دونوں ہی کاشتکاری کا گویا اور ان نہیں ہے۔“ سن مٹکی بالبتہ تو طے کی جا سکتی۔ اس دوران پلیر امو جان! ”آپ پلا سے بات کریں۔“

زندگی بھر اس نے اپنی ہر بات باپ تک پہنچانے کے لیے ہنر جان ہی کا سارا لبا تھا۔

”چھ! میں بات کرتی ہوں تمہارے بابا سے۔“ اس کے اصرار کے جواب میں امو جان نے محبت بھر انداز میں اسے امید دلائی۔

”تھیک ہے امو جان۔“ وہ ہر شہزاد سا ہو گیا۔

”یہ بلاؤڈ ہے کیسی؟“ انہوں نے اشتیاق سے کہا اور وہ انہیں ام مریم کی خوبصورتی سے آندھ لگا۔

ام مریم بہت خوبصورت ہے امو جان! وہ زمین ہے۔ وہ امت اچھی فیملی سے تعلق رکھتی

خواتین ڈائجسٹ نومبر 2011

صوفی نے ہنسنے لگا۔

”زمین ٹھیک تو ہے یا؟“ ماں کے سفیدہ چہرے کو دیکھ کر اسے فکر لاحق ہوئی تھی۔ اپنا چھوٹا بیٹا اسے کتنا پیار تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

”ہاں اور ٹھیک ہے سب خیریت ہے۔“ ابو جان نے ہلکی ہنسنے کے ساتھ لے لے کر کہا۔

”تمہارے چھوٹے بھائی صاحب کو یونیورسٹی میں کوئی لڑکی پسند آئی ہے۔“ انہوں نے اسے اصل بات سے آگاہ کیا۔

”اور تو یہ بات ہے۔“ وہ کھل کر ہنسنے لگا۔

جب ہی میں کھول... محترم چھٹیوں میں میرے اس قدر اصرار کے باوجود بھی گھر کے کام نہیں چلتے۔ لاس اینجلس میں ان کے اس قدر دل لگ جانے کی وجہ اب سمجھ میں آ رہی ہے۔ ابو جان نے کہا۔

”زمین میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ابو جان؟ ہمارا زمین بہت سمجھدار ہے۔ اس نے یقیناً ایک اچھی لڑکی ہی کو اپنے لیے چنا ہوگا۔ آپ یا اسے بات کر۔ اگر وہ لڑکی آپ کو اور پایا کو پسند آجاتی ہے تو منگنی کر دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں؟“

اس کی سمجھداری پر وہ مسکرائی تھیں۔

”مگے ہاتھوں تم بھی بتاؤ اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو؟“

”مگے میں تمہارے پیار سے ایک ہی وقت میں کم دو لوں، بھائیوں کی بات کر لوں، خود جواباً تمہارے لگا کر بنا تھا۔“

”خیر سکندر شہزادہ کو اچھی لگ جائے ایسی کوئی لڑکی ابھی تک تو ملی نہیں ہے۔ جس دن مل جائے گی سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا ابو جان۔“

اس نے شرارت سے انداز میں بولتے ہوئے ماں کے گلے میں ہاتھیں ڈال دی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

www.paksociety.com

کوئی اگر ڈھونڈنے کی کوشش کرے تب بھی کوئی معمولی سی برائی بھی اس میں نہیں نکال سکتا۔“

”تب تو میں ام مریم سے جلد از جلد ملنا چاہوں گی۔“

”ابو جان! ہنس کر بولیں۔“

ماں سے بات کر لینے کے بعد اس نے مطمئن ہو کر بان باند کر دیا تھا۔ ام مریم کو کون سا پسند کر سکتا تھا؟ اسے کین تھا وہ اس کے پایا کو ضرور پسند آئے گی۔ بلکہ وہ ان کے معیار سے بھی بہت زیادہ کرٹا ہوگی۔ اس لیے چوٹی اس کے لیے نہیں انہوں نے شاید اپنے شہزادے کو قدر شہزادہ کے لیے سوچ رکھی ہوگی۔ اور سکندر اس کا بار بار عمل ہو گا جب وہ ام مریم سے ملے گا؟

اس نے کسی کو شکست دینے کے لیے ام مریم کو نہیں چنا تھا مگر اس وقت ابو جان سے بات کرنے کے بعد جب اس نے اپنے پایا اور سکندر کو سوچنا شروع کیا تب بے اختیار یہ سوچ اس کے دل میں ابھری تھی کہ اندر خود اسے لے یا اس کے پایا ہے جتنی بھی ابھی ام مریم کے لیے ڈھونڈ لائیں مگر وہ ام مریم جیسی نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک عجیب سی غمازیت ایک عجیب سا سکون وہ سکندر پر اثر کر رہا تھا۔

سکندر لیونگ روم میں آیا تو ابو جان کو کسی گھڑی نہیں گھبراہ۔ وہ زمین سے فون پر بات کر سنے کے بعد پورے دل سے ہنسنے لگی۔ کسی گھڑی سوچ میں نہیں وہ اس کے مقابلے میں گھر چل دی جلدی آتا تھا۔ دوپہر میں ہی چھٹی آئی تو وہ دوڑا دوڑا کر آجایا کرتا تھا۔ اپنا گھر اپنی ابو جان اور اپنے پیارے سب سے زیادہ عزیز۔ یاد تو اسے زمین بھی بہت آتا تھا۔ مگر اسے لاس اینجلس اتنا پارا ہو گیا تھا کہ چھٹیوں پر بھی ہوشیار رہ کر آیا کرتا۔ اسے زمین کی یاد آتی تو وہ غور سے فون پر آتا تھا۔

”ایات ہے ابو جان! اس کا فون تھا؟“

”یہ ایات اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ تمہیں پتہ ہے۔“

ابو جان نے کہا تھا۔

”ابو جان! وہ کون سا ہے؟“

”وہ کون سا ہے؟“

”تو نے سفیدہ نہیں۔“

”سکندر ان کے پاس“

لیزا ایک منصوبہ ہے۔ سکندر کی مکمل مشابہت شخصیت اور اس کے چبکے مضمحل و نقش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ وہ اس کو چہیت کرتا جانتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کرتا ہے۔

ایک دو اضافی طاقتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہو جاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکھر مضمحل و انداز ہے۔ لیزا کا دوسرا چہیت ہے جو اس کے باپ نے اسے خیر کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ رہتی ہے۔ سکندر کو نیپلز میں ایک مشکبک اینڈ کرلی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی۔ لیزا اس کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیزا اس کو نیپلز لے کر جاتی ہے۔ لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بچی کے روپ میں رکھتا جانتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر سے وہ بیٹوں لیزا اور سم کی پیدائش بھی اس کو نہ دہل سکی۔

دوڑیا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سم نہایت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر لگی تھی۔ صورت اور زبانیت میں اور دو میناں درجہ کی تھی۔ والدین کی علیحدگی کے بعد عیال کے مصالحتیں سم کو دوڑیا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آئی تھی۔ دوڑیا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آئی اور ایک ارب پی بزنس من سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ سلطان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روم سے بھی بہت پار خانا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔ محمود خالد سم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے اس کے باوجود دوڑیا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ فحش کی حالت میں سم کے کمرے میں آ گیا۔ شراس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہو گئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہو سکی وہ اپنے والد کی کوئی بات منظور نہ کر کے کوتاہی تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کر دیا۔ باپوں کو وہ اپنی بیوی عاتقہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سم کی شادی اپنے ایک کاروباری، انجینئر باشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے نیپالی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے۔ باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے اہلیا زین شہرا کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ فصلاں اور غیر فصلاں دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار و کار بار رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہرا کو انیسویں نو اس نے ام مریم کو رو پوز کیا۔ ام مریم نے اس کا ہر نوزل بہت خوش دلی سے قبول کر لیا۔ زین شہرا نے اپنی والدہ کو فون کر کے بنا دیا سزین کو کہیں تھا کہ ام مریم جیسی لڑکی کو اس کے والد انکار کریں نہیں سکتے۔

تیسری قسط

مشتی کی یوری رات اور اتوار کا پورا دن اعتصابی دور میں گزار کر ہر کے روز وہ آفس میں موجود تھا۔ ابھی بھی اسے شدید درد تھا۔ اس کے کمرے میں دوا تھی۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے سے درد کی شدید لہر آتا تھا۔ اسے دوا بھی تھی اور وہ اس کے بازو تک پہنچا رہی تھی۔ ہنسنے کی وہ ہر لڑکے کے ساتھ جو اسے لگا

کہا تھا اس کے بعد سے آج میرے دل تک اس نے کچھ بھی نہیں کھلیا تھا۔ جو چیز اس کے حلق سے نیچے اتری تھی۔

وہ بے حساب چائے اور کافی کے کپس تھے باقیہر وہ سے نجات کے لیے لاکڑی تجویز کر رہا تھا۔ اس پر خود سے بھی اور زندگی سے بھی بڑا مری پوری طرح حاوی تھی۔ اپنی زندگی ختم کرنے کا ہی چاہ رہا تھا۔ مرنے میں اس نے کسی کو بھی نہ اپنی طبیعت کے متعلق کچھ بتائے تھا۔ نہ اپنا چہرہ اس اور بدمزاجی کسی پر ظاہر کی تھی۔ کام کی بات کے علاوہ یہاں کسی سے زیادہ بات نہیں کرنا تھا۔ جو کوئی کام کی بات سے آگے جا کر بچہ اور بات کہتا اور وہ جواب "کسی بدمزاجی کا مظاہرہ کرتا۔ ایک دور ہو تھا یہاں جس سے دوسروں کی نسبت اس کی زیادہ بات چیت ہو جاتا کرتی تھی مگر اسے بھی دوستی یا بے تکلفی کے ذریعے میں ہرگز شامل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اگر دور دوروں پر آہی چکا ہو تا تب بھی وہ کم بول اور اپنے کام سے کام رہتا اور اس پر اپنے مزاج کی کوئی تبدیلی آشکار نہ ہونے لگتی۔

یہاں تو وہ چند ہفتوں کے لیے آتا تھا۔ وہاں جہاں وہ اب مستقل رہا کرتا تھا وہاں اس نے کسی کو خود سے ایک حد سے زیادہ نزدیک نہیں آنے دیا تھا۔ اس کے کو لگ بہت تھے اس کے واقف بہت تھے اس کے لیے دانے بہت تھے مگر اس کا دوست کوئی نہ تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک لکیر کھینچ کر رکھتا تھا وہ اپنے اور اپنے سے واقف ہر شخص کے بیچ۔ اس حد فاصل سے آگے آنے کی اس نے کبھی کسی کو جرات نہیں دی تھی، سوائے اس لڑکی لیزا محمود کے جو بیرونی اس کے نزدیک آنے کی کوشش کر رہی تھی، زبردستی اس سے بے تکلف ہونے اور دوستی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتوار کا پورا دن اس نے اپنا موٹا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ لیزا محمود سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق کوئی واسطہ

نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی انہی کی اتنی کڑی مزاح اور کی انہی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے سوچا "وہاں لپڑا ہے، کبھی نہیں ملے گا نہ وہ اس سے ملے گا نہ ہی بچہ وہ بھی ہنسے گا نہ خوش ہو گا نہ ہنسنے لگائے گا اور نہ ہی پھر اسے خود کو یوں مرادینے کی ضرورت پڑے گی، مگر اسے پتا نہیں تھا وہ آج پھر اس کے آفس آؤ گئے والی ہے۔ وہ ڈائریکٹر فائلز کے آفس سے سنبھلے ہوئے اور انہی نوعیت کا دستکش کر کے باہر نکلا تو اسے لپڑا سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔



"سکندر!" اسے سکندر کسی آفس سے نکل کر کوریڈور میں آگے بڑھتا نظر آیا تو اس نے حسب عادت بے تکلفانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "یہنا" سکندر نے اسے دیکھا نہیں تھا، ورنہ وہ اپنے ہلو کرنے ضرور رہتا۔ یہاں تکبھی کے اس آفس کے لیے اس نے جو ہوشیار بنا کر دی تھی، انہیں کے حوالے سے آج اس کی کچھ کے چند سینئر ایگزیکٹو کے ساتھ دوبارہ میٹنگ تھی۔

اس کی یہاں گزشتہ میٹنگ خاصی کامیاب رہی تھی۔ چنانچہ اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھی۔ آج بینکنگ کا موضوع طے کرنا تھا، کچھ مختصر پر ان سب سے گزشتہ میٹنگ میں بہت چیت کی تھی کچھ پروپوزلز آج لائی تھی۔ آج موضوع طے کر لے جانے کے بعد اس نے اس پروپوزل پر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ آج یہاں لانے کے لیے کل سارا دن مختلف آؤٹ پاز پر کام کرتی رہی تھی، خاص مصروف رہی تھی مگر مصروفیت میں بھی اس نے دن میں دوبارہ سکندر کو کل کی تھی اور دونوں مرتبہ اس کا نمبر بند ملا تھا۔

ہفتے کے روز وہ اس کے ساتھ خانگوار موڈ میں رہا تھا۔ انہوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ سکندر نے اسے

خواتین ڈائجسٹ دسمبر 2011

تلف
آپ زبان سے بد تمیزی کا مظاہرہ نہ کریں، میں اپنا
رویہ بد تمیز بنائیں نہ ایسا ہی کہا کرتا تھا؟ ایسا ہی ابھی
بھی کر کے گیا تھا؟ سکندر پر جھنجھاپٹ اور کوشش
محسوس کرتی، مینٹک کے لیے جلی جاتی تھی۔



دھمکنے کی طویل مینٹک جس میں ہر چیز حتمی طور پر
طے کر لی جاتی تھی، مینٹک کے اختتام پر وہ مینٹک کی بد تمیزی کے
ساتھ ہی کانفرنس روم سے باہر نکلی تھی۔ ان دونوں
سے خوشگوار انداز میں رسمی نوعیت کے الوداعی جملوں
کے تبادلے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئی تھی
شام کے باجیج کر رہے تھے اور یہ انہیں غامض ختم ہو
جانے کا وقت تھا۔ اسے گتے جلتے مختلف لوگ
جلدی جلدی کالم سمیٹ کر گھر جانے کی فکر کرتے نظر آ
رہے تھے۔ وہ لفٹ کے پاس آکر کھڑی ہوئی تھی۔ اس
نے لفٹ کاٹن دبا دیا تھا۔

لفٹ آگئی اور وہ لفٹ جس داخل ہونے لگی تب
اس کے پیچھے کوئی اور بھی لفٹ میں داخل ہوا تھا۔
سیدھے دوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ
سکندر تھا۔ اس کا بلیک لیدر برنٹ کیس اس کے
واپس ہاتھ میں تھا اور لیپ جیب بلیک کیس کندھے پر
لٹکا تھا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس بار سکندر نے بھی
اسے ابھی ہی دیکھا تھا۔ لفٹ میں داخل ہو جانے سے
بعد کم از کم اتنا ہنس سکتی تھی کہ اس نے اسے ابھی ابھی
دیکھا ہے۔ سکندر کا دل دھمکنے لگی کاویہ اسے یاد تھا کہ
لے وہ مسکرائی تو نہیں، اس اغلا کا سنجیدگی سے پرہیز
لیا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

وہ بظاہر بالکل صحت مند اور نارمل لگ رہا تھا۔
بھی چاہے نہیں کیوں اس بار لفٹ میں اس کے
کھڑے ہو کر جب اس نے ان کی آنکھوں میں
وہاں بہت سادہ، لطیف اور مہربان سی نظر آئی۔

اپنی ماؤہ ماؤہی دوست قرار دیا تھا اور اس کی ٹی ٹی بی
دوست ٹرک ڈرائیوروں والی اردو زبان بولتی ہے اس
پر اظہارِ افسوس بھی لیا تھا۔ آخر میں آکر اس کا موڈ
شور زاپ مینٹ ہو گیا تھا کہ کچھ ڈسٹرب سا نظر آنے لگا
تھا۔ ورنہ اپنی نووہ سارا وقت بڑے اچھے اور دوستانہ موڈ
میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ ایسے میں وہ یہ تو ہرگز نہیں
سوچ سکتی تھی کہ سکندر نے اپنا موبائل اس کی وجہ
سے آف کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا تو بس یہی کہ
شاید وہ آرام کرنا چاہتا ہو گیا پھر شاید اسے اس کے
کاموں کی کوئی مصروفیت لاحق تھی اور وہ ڈسٹرب نہیں
ہونا چاہتا ہوگا۔ اس لیے مینٹ آف کر دیا ہو گا مگر اس
کے یہ تمام اندازے اور تمام خیالات اس وقت سکندر
کے سرد اور سیٹ سے چہرے کو دیکھ کر غلط ثابت ہو
گئے تھے۔

وہ اس کے آواز دینے پر رکا تھا۔ نگاہوں میں
اجنبیت نہیں تھی مگر ایک سرد سا ناثر سر جو تھا۔ جیسے
وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”چاو سینور سکندر!“ اس نے خوشگوار مسکراہٹ
کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کرنا
چاہا۔

”چاو۔“ بغیر مسکرائے سنجیدہ اور سیٹ سے انداز
میں اسے کتا وہ وہاں بالکل بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ جواباً
کیا کہنے کے لیے لب لبول رہی ہے نہ سننے کی زحمت
کیے بغیر وہ وہاں سے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔
اسے گوریڈور میں کھڑے کھڑے ہی نظر آ رہا تھا وہ
گوریڈور کے آخر تک جا کر واپس طرف نہ گیا تھا۔
اب وہ اسے نظر میں آ رہا تھا۔

اسے اپنے آپ میں بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔
وہ یہاں کیوں آئی ہے، کیسے آئی ہے، تو کسی سی ٹیرو
خالیت کچھ بھی پوچھنے بغیر وہ اس طرح اسے نظر انداز
کرنا ہوا چلا گیا تھا جیسے اس سے ہانے بیلو بھی نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوفت سی بھی ہو رہی تھی اور
سکندر کی سرد مہر اور خاموش بد تمیزی پر غصہ بھی آ رہا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

"ٹھیک ہے۔ چلو۔" وہ جواباً مسکرا کر بولی۔ اب وہ یہ بات یقین سے کہہ سکتی تھی کہ سکندر کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ شاید اسے پھر Cervical pain ہو رہا تھا۔ نیپلہ جاتے ہوئے بھی اس نے سکندر کی ہی کیفیت دیکھی تھی۔ وہ دونوں باہر آگئے تھے۔ سکندر اس کے برابر دلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ ایک وہ سیکنڈ خاموشی ہے، ڈراموں کو کرنے کے بعد اس نے سکندر کو دیکھا۔ "جہیں

cervical pain ہو رہا ہے؟" سکندر نے بے سزا نہ چونک کر اسے دیکھا۔ ایک بل اسے بغور دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر ہاں میں ہلا دیا۔

"تم کسی ایجنٹ یا ڈاکٹر سے کنسلٹ کرو ناں۔ اتنی سیگ ایجنٹ میں اس طرح کی تکلیف اور وہ بھی اتنی جلدی جلدی تو نہیں ہونی چاہیے۔" وہ دوستانہ انداز اور پر غلوں سے بچے میں بولی تھی۔

"تم مجھے کہاں ڈراپ کرو گی؟" اپنی صحت سے متعلق اس کے جملے پر غفلت بلکا سا سر ہلا کر سکندر نے فوراً ہی موضوع تبدیل کر دیا گویا اور مت ساری باتوں کے ساتھ وہ اپنی صحت کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "ام Villa borghese جارہے ہیں پورگ ہیز گورڈز کا تم نے نام تو حضور سن رکھا ہو گا؟" "ہم؟" اس نے سکندر کو حیرانی سے اپنی سمت دیکھتا پایا۔

"جی، ہم۔" حمیس وہاں چھوڑ کر آ جاؤں، ہم اکیلے اکیلے وہاں ایجنٹ کے کہو اور میں اپنے لیے تیار ہمنٹ جا کر بند ہو جاؤں۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں۔ تم سے سن کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے۔ کھلی کھلی سرسبز سی جگہ پر وقت گزارنے کا۔"

وہ علوتا مسکرا کر بولی تھی۔ اس بار اس نے سکندر کے لیے ہی برہم عمی مسکراہٹ آئی دیکھی۔

"لیجئے جناب پیچھے گئے ہم del Popolo del Piazza۔ ہمیں سے مین انٹریس ہے۔ دلا بور گیز کے اندر جانے کے لیے۔"

"ٹھیک ہے۔" سکندر کا جواب مختصر اور سنجیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی دیرانی، خاموشی اور درد نے اس کے غصے کو بل بھر میں نہیں ڈالنے جا چھوڑا۔ نجانے کیا وہ لاش تھا اسے جو وہ یوں اتنا عجیب اتنا مختلف سامراج رکھتا تھا۔ وہ سکندر پر اپنا غصہ قائم نہیں رکھ پائی تھی۔ وہ آرٹسٹ تھی اس لیے جس اس زیادہ تھی شاید اسی لیے وہ اس شخص کے لفظ اور رویے میں اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کے لفظوں اور رویوں میں سب سے بڑی گائی انہیت اور

بے مروتی ہوتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں؟ رویہ اور غم ہی غم اتنی لوہاسی اور اتنا دیرانی اس نے بھی کسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

"لنٹ گراؤنڈ فلور آئی تھی۔ وہ سکندر کو دیکھ رہی تھی اور وہ لنٹ کے فرش کو اس سے لاطن بنے نیاز" نے پروا نہ دی دونوں لنٹ سے باہر آگئے تھے۔

"میں تمہیں ڈراپ کروں سکندر؟"

"ہاں؟" اس نے ایک دم چونک کر بولی اسے دیکھا جیسے یہاں پر موجود ہی نہیں تھا۔ بہت اچھا اور بہت بھرپور الگ رہا تھا۔

"میں تمہیں تمہارے ہوٹل ڈراپ کروں۔ یہ پوچھ رہی تھی میں؟" اس نے ہلکی دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ سکندر نے اسے بغور دیکھا تھا یوں جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہے۔ ایک دم

ہی وہ اس سے ہلکا۔

"جہیں اس وقت کوئی اور کام تو نہیں ہے لڑا؟"

"نہیں نہیں؟" وہ اتنا غیر متعلقہ سا سوال سن کر جبران ہوئی تھی۔

"تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کرو جہاں سبز ہو، نازہ ہو، ہوا ہو۔ میں پچھو دہر کھلی آتب ہو اور ہریالی کے بیج پنا چاہتا ہوں۔"

اس نے بولتے ہوئے سمجھ کر یوں سانس لیا جیسے اس کی سانس گت رہی ہو مگر اس نے اس لیے ہی بہت کاہل سا ہوا۔

خواتین ڈائجسٹ دسمبر 2011

یہاں کے سبزے اور ہیرالی نے اس کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا تھا یا پھر اسے یہ بھولی ہوئی بات یاد آئی تھی کہ وہ لیزا سے دوستی کر چکا ہے جو اب بھی تھی ہمدردانہ اب وہ قدرے پرسکون اور مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت اور سناٹا بھی کچھ کم نظر آ رہا تھا۔

”ہم ایک گارڈن میں چل کر بیٹھیں؟“

اروگر ہر طرف سبز ہی سبز تھا۔ وہ دونوں اس وقت چیز اور صنوبر کے درختوں کے درمیان ایک خوب صورت زلزلے سے گزر رہے تھے۔

”یہ ایک نہیں دراصل کافی سارے گارڈنز کا مجموعہ ہے۔ ہر گارڈن کی اپنی اپنی الگ خوبی ہے۔ کہیں تھیں پھلوں کے درخت زیادہ ملیں گے، کہیں مشہور فنکاروں کے بنائے قدیم مجسمے اور فائوٹین اور کہیں کسی جنگل کا سا قدرتی تاثر دینے والے گارڈن۔ مجھے ذاتی طور پر ایک گارڈن زیادہ پسند ہے۔ وہاں جھیل میں کشتی چلاتی جائے یا جھیل کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا جائے، مجھے تو دونوں میں بہت مزا آتا ہے۔“

سکندر کے چہرے کی سوالیہ سی حیرانی دیکھ کر اس نے وضاحت کی تھی۔

”جو جگہ تمہیں ٹھیک لگے، وہی مناسب ہے۔ چھپیں فوراً یہاں کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ کبھی بہت کچھ روم کے متعلق کسی سفر نامے میں ضرور یہاں کے بارے میں پڑھا تھا مگر وہ بھی اب کچھ خاص یاد نہیں۔“

وہ اب مسکراتے ہوئے بالکل اسی طرح بائیں کروڑا تھا جیسے کوئی قدیم میں اس کے ساتھ کی تھیں۔

”یہاں کے بارے میں میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔“

خوب صورت درختوں اور سبزے سے بھرے راستے سے گزرتے وہ دونوں ایک گارڈن تک پہنچ گئے۔

اس نے سکندر کی طرف سے کھلا ہوا روگردانہ نگاہیں ڈالیں۔

”یہاں تو بہت کچھ ہے۔“

”ہے ناں یہ جگہ خوب صورت؟“ اس نے پوچھا۔

انداز میں یوں پوچھا گویا اس گارڈن کی تخلیق کر رہا ہے۔

چند منٹوں کے بعد کھڑکی، ایک دوسری سڑک پر موڑتے، دوسرے لہزے نے سکندر سے کہا۔

”Villa borghese gardens میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ مگر اندر جانے کے بعد میں وہاں موجود میوزیمز آرت گیلریز و ڈسٹ کرفی ہوں تو اس کے لیے ٹکٹ خریدنا لازمی تھا۔ آرت گیلریز اور میوزیمز میں جانے کے خواہش مند افراد وہاں طویل قطاریں لگائے نظر آ رہے تھے۔ چونکہ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا چنانچہ گارڈنز میں سبزے اور ہیرالی کو انجوائے کرنے کے لیے آئے والوں کی تعداد بھی کثیر تھی۔“

”مجھے پتا ہوا آج میں تمہارے ساتھ آنے والی ہوں تو آرت گیلریز میں جانے کے لیے آؤں گا۔ ٹکٹ خرید لیجئے۔ اب اس وقت اتنی لمبی قطار میں ملنے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔“ قدیم رومن آرکیٹیکچر والے داخلی ریسٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سکندر سے بولی تھی۔

”تمہیں آرت میں دلچسپی نہیں ورنہ ہم یہاں موجود خوب صورت اور بے مثال آرت کیکو کھن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے۔“

یہاں Raffaello Raphael Bernini ان سب کا بڑا اور کام موجود ہے۔ آرت کے شائقین کے لیے تو ناممکن ہے کہ وہ مدغم آئیں اور یہاں ڈسٹ کیے بغیر چلے جائیں۔ ”وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بول رہی تھی۔“

”تم تو ابھی بہت سارے ونوں تک روم میں موجود ہو۔ پھر کسی دن ٹکٹ خرید کر یہاں آجانا اور یہاں موجود تمام آرت گیلریز اور میوزیمز کی سرگردانی۔“

سکندر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ لیزا نے بغور اسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر تناؤ والی کیفیت چھپ چکی تھی۔ سرود سپاٹ ہائیر کی جگہ چہرے پر دوستانہ ہو کر وہ دونوں کئی دفعہ مل چکے ہیں بہت باتیں کر چکے ہیں اور بہت سارا وقت ساتھ گزار چکے ہیں۔ شاید

”تم تو یہاں کیسے آئے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ سکندر کو بخور دیکھتے ہوئے اس نے ہنسی
 سے جواب دیا۔ ان کے بالکل سامنے درختوں کے پاس
 سیاہوں کا ایک گروپ اگر کھڑا ہوا تھا اس میں وہ افراد
 اٹالین لگ رہے تھے جبکہ باقی تمام افراد امریکن تھے۔
 شاید وہ امریکن ان اٹالینز کے مہمان تھے۔ وہ
 سب جیسے کسی موضوع پر زور و شور سے گفتگو اور بحث
 مبادلہ کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ گروپ میں شامل
 ایک امریکن جوڑے نے وہاں تصویر کھینچوائی تھی۔ وہ
 لوگ اس لیے وہاں اس کے تھے وہ دونوں میاں بیوی تھے۔
 چاہتے تھے کہ تصویر میں ان کے عتب میں جھیل اس
 طرح آئی چاہیے کہ جھیل کے پتوں پر انیسویں بھی
 نظر آئے۔ سیاہوں کی توجہ کامر کر رہا تھا۔ جیسی دیر
 وہ میاں بیوی وہاں تصویر کھینچوا رہے تھے باقی افراد ہیں
 کھڑے باہم گفتگو کر رہے تھے۔

امریکن مہمانوں کی خاطر ان کے اٹالین میزبان
 بھی انگریزی ہی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی
 گفتگو کے چند جملوں ہی سے سمجھ میں آ گیا تھا کہ کیا
 موضوع ڈسکس کیا جا رہا ہے۔ کل رات میاں والا
 پور کیز کے باہر والی سڑک پر ایک ستر سالہ لڑکی کا رپ
 ہوا تھا۔ حال ”اوسمی رات سے بھی باور کا پتہ نہ تھا۔ آج
 سارا دن یہ خیر تمام بخیر چھٹل پر چلی رہی تھی۔

”نیزو چھٹل کے پاس جب اور کچھ خبر نہیں پہنچی تو
 وہ اس طرح کی خبریں چلا چلا کر لوگوں کی بی بی کی گواہی
 ہیں۔“ سیاہوں کا وہ گروپ تصویر کھینچنے کے بعد وہاں
 سے ابڑا اسی موضوع پر باتیں کر رہا ہوا تھا۔ تب وہ
 سکندر نے بی بی تھی۔ سکندر بھی ان لوگوں کی گفتگو سنتا
 رہا تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے بھی ہمدردی ہے اس لڑکی سے“
 اس کے ساتھ جو ہوا بہت برا ہوا ہے۔ مگر میں یہ
 پوچھتی ہوں رات کے وہ ڈھائی بجے وہ اگلی سڑکوں پر
 گیا کرنے کیا ہوئی تھی؟ ایک تھرا خوب صورت لڑکی
 اوسمی رات کو سڑک پر کسی بد فطرت و بد کردار کو
 ٹکراتے ہوئے وہ اسے چھوڑ دے گا؟ یاں۔ باپ سے لڑائی

سویس یا سوئیس صدی کی آرکھیکٹورہ خود ہی
 تھی۔ سکندر نے اس کی طرف فوراً دیکھا اور
 بے سادہ مسکرایا تھا۔

”تم جس طرح اپنے دوا اور دوا کی ہر چیز سے پیار
 کرتی ہو مجھے بہت اچھا لگتا ہے لہذا“
 وجوہ چھاؤں کا سنا مزاج رکھتا وہ فیض آب ہوں
 مسکرا رہا تھا۔ نوں دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا گویا
 آج اس کے آس میں لہڑا ہے سرو می سے پیش
 آنے والا شخص کوئی اور تھا۔

”میاں بیٹھ جاتے ہیں۔“ جھیل سے نزدیک گھاس
 پر درختوں کی چھاؤں میں ایک جگہ سکندر کو بیٹھنے کے
 لیے اچھی لگی تھی۔ وہ سر ہائی اس کے ساتھ وہاں بیٹھ
 گئی تھی۔ سکندر کی نظر سر ہائی کی طرف تھیں جبکہ وہ
 ان کی بی بی کو سوالیہ درختوں میں سے ایک درخت
 سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سکندر کی نگاہوں
 کے تعاقب میں جھیل کی طرف دیکھا تھا۔ بہت سے
 سیاح جانی میں بیچوں والی کشتی چلائے نظر آ رہے تھے۔
 جھیل ہر طرف سے سبزے میں گھری تھی۔ ان کے
 ہر کنارے پر درختوں کے جھنڈ تھے۔ ”بیلیں نہیں“
 پھلوں اور پھولوں سے لدی درختوں کے شاخیں

”پال پر سبزے اور پھولوں کا جو یہ شیدہ پڑا ہے کتنا
 خوب صورت لگ رہا ہے۔ ہاں سکندر؟“ وہ دھڑکھو قربانی
 سبز نظر آ رہا ہے وہاں دھڑکھو تو سرخ“ وہ دھڑکھو اور وہاں
 نیلا ایک ہی جھیل بیک وقت کتنے سادے رنگوں سے
 تھی ہے۔

وہ مسکرا کر سکندر سے کہہ رہی تھی۔ سکندر نے
 جواباً اس کی طرف دیکھا ضرور مگر بولا کچھ نہیں۔ اسے
 اس کی خاموشی ہی عجیب سی لگی۔

”تمہیں رنگ اچھے نہیں لگتے سکندر؟“
 ”چاہ نہیں“ مجھے رنگوں کو محسوس کرنا نہیں آتا۔“ وہ
 بے خیالی میں بول گیا مگر جیسے ہی اسے بے خیالی میں منہ
 سے نکلی بات کا دھیان آیا فوراً بات بدل کر اس سے
 پوچھنے لگا۔

اس نے اسے پیچھے سے غیلا کر آواز دی تھی۔
کیونکہ وہ جس تیز رفتاری سے جا رہا تھا اس کا ساتھ
دینے میں ناکام تھی۔ سکندر نے نہ مڑ کر اسے دیکھا نہ
کوئی جواب دیا نہ ہی رکا۔ اس نے اپنے قدموں کی
رفتار پر غور کیا اور بھی تیز کر لی تھی۔

اس نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ اور گھر
سے گزرتے لوگ اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

”سکندر پلیرز رک جاؤ۔“ تنک کی پوس سی ہوئی وہ
اپنی جگہ رک گئی تھی۔ بے جگم انداز میں بھاگنے کی
وجہ سے اس کی سانس پھول چکی تھی۔

وہ وہیں کھڑے ہو کر سانس بحال کرتے ہوئے
سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ اب اسے دلاور گیزرے باہر
جانا نظر آ رہا تھا۔

وہ چیز کے درخت سے تنک لگا کر کھڑی اسی طرف
دیکھ رہی تھی۔ یونہی بے مقصد گشتوارے لگاتار کرتے
طور پر منہ سے نکلتے اس کے وہ چند جملے سکندر کو اس
قد رونا گوار گزر جائیں گے وہ کبھی سنا بھی نہیں سکتی
تھی۔ وہ بار بار ذہن میں اپنے کے جملوں کو دہرا رہی
تھی۔ اسے ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی
کہ اس پر بول غصے سے بے قابو ہو جانا پائے۔

ایک واقعہ پر اس نے اپنی رائے دی تھی۔ وہ بھی
جواباً اس سے اختلاف کر گئی تھی۔ اسے سنا تھا
وہ حیران تھی، وہ بے حد ریشان تھی۔ اسے سکندر پر
غصہ نہیں آ رہا تھا اسے تعجب ہو رہا تھا۔ حیرت ہو رہی
تھی، حیرت میں گھری وہ سکندر کو جھٹنے سے قاصر بھی
تھی اور مست بھی بھی تھی۔

قرن اسے پھور دہرا رہا تھا وہ کچھ دقت کسی کھلی کھلی
سہ سہی جگہ پر گزارنا چاہتا تھا اور ان کی اس
بے موقع بات نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اس سے تو ایسے
بستر ہونا وہ سکندر کو دلاور گیزر چھوڑ کر خود باہر سے ہی
رہائیں چلی جاتی۔ وہ کچھ دور پہل کھلی ہوا میں سانس نہ
لے لیتا، وہ سہو، ہزانی، پھیل کالی، کالی برندنہ یہ
سب کچھ اس کی طبیعت کی اداسی اور پریشانی کو دور
بھی کر دیتے، کم تو کر دیتے۔

ہوتی تھی باہر سے فریڈ سے جھگڑا تب بھی اس طرح
آدھی رات کو سڑکوں پر پچھنے کی تنک کیا تھی؟“

اپنی دھن میں گمن ہوتے ہوئے اسے سکندر کے
تاثرات کا کچھ انداز ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے
کے بدلنے رنگوں پر اس کا دھیمان گیا تو نہ حیران پریشان
سی رہی۔ سکندر کے چہرے پر عجیب سا جنون اور
وحشت چھائی تھی۔ وہ انتہائی سخت نگاہوں سے اسے
دیکھتا ہوا ”نور!“ ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”سکندر؟ کیا ہوا؟“ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی
نور بالکل ہکا بکا سی اس کے ساتھ ہی ”نور!“ کھڑی ہوئی۔
”کیا ہوا سکندر؟“ اس نے بے حد حیران سے پوچھا۔

”کسی کے بارے میں کچھ بھی بول رہا، جو مرضی
تجسرو کر دیا بہت آسان ہوتا ہے لہذا محمود اکیا جانتی ہو
تم اس لڑکی کے بارے میں؟ جاناؤ کچھ؟“
وہ شدید غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اور انتہائی غیظ و
غضب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لہذا نے اس کی سرسری
اجنبیت، بے گامگی سب کچھ دیکھ رکھا تھا مگر یہ انداز
اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”نیزو چھٹلنے کے لیے بھی ابھر ہمارے لیے بھی
اندازے لگا لیتا اس لڑکی پر بصرے کر لیتا تنقید کر لیتا“
مذاق ڈالنا بہت آسان ہے۔ کیا تم نے سوچا اس کے
ساتھ ایسا کیا ہوا؟ جو وہ کوئی رات کو سڑکوں پر بھی
کیا گزری تھی اس پر جو وہ اپنے گھر سے نکل رہی؟
لہذا محمود زندگی بھر ہو گئی ہے اس لڑکی کی۔ کل
رات جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ اب زندگی بھر اس
خوف، بے بسی اور ذلت سے باہر نہیں نکل سکے گی۔“

سکندر کے لفظوں میں کتنی بھی بے پناہ غصہ اور
نفرت تھی سو ”نور!“ ہی وہاں سے جانے کے لیے لیٹ
گیا۔ ایک بل تو نور بالکل حیران پریشان، سناکت اپنی جگہ
پر کھڑی رہی، مگر جیسے ہی اسے اس بات کا احساس ہوا
کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے وہ فوراً اس کے پیچھے بھاگی۔
”سکندر! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اس طرح غلام
کیا؟“ وہ نے ہر بلیر کو گوسہی۔“

اپنے خواب پر غصہ آنے لگا تھا وہ سکندر کے اپنے گھر میں ہو رہی تھی وہ اس کے لیے اداس بھی ہو گئی تھی۔
بچانے کے لیے اس نے کہا کہ اسے لائق تھا اس کے ساتھ نہ اس دیکھ کو تم نہیں کیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا آج۔
بہت دل گرفتہ سی وہ اپنے لبار منٹ واپس آگئی تھی شکر تھا جتنی گھبر نہیں تھیں۔ وہ آج دوسرے اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ اس کا دل اتنا اداس تھا کہ اس وقت اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا نہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کی کوشش کی۔ اندر آکر خاموشی سے لیوٹنگ روم میں صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔
اب سے یہ فکر شروع ہو گئی کہ وہ اپنے بول بچ گیا ہو گا؟ وہ ٹھیک تو ہو گا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہوگی؟ وہ کیا بھی بھی غصے میں ہو گا؟ وہ کیا کر رہا ہو گا؟

روم میں ایک اور طویل شام کا اختتام ہوا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہکا بکا اندھیرا چیلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح صوفے پر اداس سی بیٹھی تھی۔ مٹی بھی کچھ ذرا چل گھر واپس آ چکی تھیں۔ غالباً مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اسے سکندر کی شدید فکر لاحق ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا صوفہ چل اٹھا کر سکندر کا نمبر ملا۔ وہ تلخی سے بات کرے گا یا اس سے بات ہی نہیں کرے گا؟ اس کا فون ہی نہیں اٹھائے گا وہ جو کچھ بھی کرے گا مگر وہ اب سکندر سے بات کیے بغیر وہ نہیں سکتی تھی۔ تیسری تیل پر اس کی کٹ ریسو کر لی گئی تھی۔ "ہیلو۔" اس نے سکندر کی آواز سنی۔ اس کے لیے اور آواز میں غصہ نہیں تھا ناراضی بھی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔

"تم ٹھیک ہو سکندر؟ اپنے بول بچ گئے تم؟"

اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ سوری میں اس طرح تھیں وہاں مجبور کر گیا۔"

اس کی معذرت بڑی پر تکلف تھی جیسے وہ خود کو بھر اپنے اسی غل میں بند کر چکا تھا جو آج کچھ بل کے لیے

وہ تمہاری طبیعت کیسی ہے سکندر؟ اس کی معذرت کے جواب میں اس نے بے اختیار فکر مندی سے بوجھا۔
"ٹھیک ہے۔" اس بار اس نے ایک دلی ہی کراہ کی آواز سنی تھی۔ اب نوہ ماں ہی نہیں سکتی تھی کہ سکندر ٹھیک ہے۔

"تم کمال ہو سکندر پلیز۔ مجھے بتاؤ؟ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ پلیز جتناؤ مجھ کمال پر وہ؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے ہنسان ہو کر قدرے بلند آواز میں پوچھا تھا وہ اب مزے توئی جھوٹ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"ایز ایم ای کسٹنڈنٹ جو گیا ہے۔ میں ہسپتال میں ہوں۔" وہ سانس کی سے بولا تھا۔

"وہ ماں کاؤ۔" وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھی تھی۔

"کس ہسپتال میں ہو تم مجھے نام بتاؤ۔" اس نے سینئر فیل سے اپنا ونڈ بیک اٹھا یا۔

"تم رخصت مت کرو لڑا میں ٹھیک۔"

"تم مجھے ہسپتال کا نام بتاؤ۔" اس نے غصے سے سکندر کی بات کاٹنے ہوئے کہا تھا۔ وہ تیزی سے جوتے پہنتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی تھی۔



تیز دروازے پر دست جلدی ہسپتال پہنچی

”کہاں چلیں؟ بیمار کی عیادت پھر انہوں کے ساتھ کی جاتی ہے تم میرے لیے پھول بھی نہیں لائیں۔ کہیں پھول لے کر آئی ہو؟“

اس کا وہ رخ مڑا اس کا بیزار اٹکایا ہوا انداز جیسے وہ ساری دنیا سے فٹا ہوا ایک دم ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کی بات کر کے اپنی چوڑوں کا ذکر کر کے حفظ اٹھا رہا تھا جیسے اسے برا مڑا رہا ہو گیا وہ اپنا ایکسیڈنٹ ہو جانے پر خوش تھا؟

یہ بہت سی عجیب سا خیال اس کے دل میں ابھرا تھا۔ ”میں وہ ایک نارمل انسان۔ جب وہ ایک پریشان ہونے والی فکر کرنے والی بات پر خوش کیونکر ہو سکتا ہے۔“

”ڈاکٹر کو بلا لے۔“

”ڈاکٹر کو گھر کیوں؟“ وہ سکندر کی بات نہ جانتا رہا دینے کے لیے وہاں دکی نہیں اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

دس بندر منت کے بعد ڈاکٹر کے ساتھ وہ دوبارہ وہاں موجود تھی۔ ڈاکٹر اسے مطمئن کرنے کے لیے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کر رہا تھا اگرچہ وہ اسے پہلے ہی یہ بتا چکا تھا کہ اس کے دوست کو فوری مہرقت اور بستر پر منت راجا چکا ہے۔ سکندر کی چوڑوں کے بارے میں ڈاکٹر نے اس کی تفصیلی بات کو ریڈور میں ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ چوٹ سکندر کے پیروں میں لگی تھی باقی چوٹیں فکر کرنے والی نہیں تھیں مگر ہر کی چوٹ کے لیے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو جانے کے بعد بھی اگلے ایک سے دو ہفتے بڑی احتیاط سے کام لیتا ہو گا۔ ڈاکٹر سکندر کا دوبارہ معائنہ کر رہا تھا اور وہ اس سے اور دوسری پوچھتی جا رہی تھی۔

”تمہارے اور تو کہیں کوئی چوٹ نہیں لگی؟“

”نہیں کسی اور جگہ تو درد نہیں ہو رہا؟“

اس طرح مسکرا ہوا مطمئن سا لہجہ تھا۔ ڈاکٹر معائنہ کر لینے کے بعد اسے اطمینان ملا وہاں سے جانے لگا۔ تب اس نے سکندر کی دواؤں اور احتیاط کے متعلق پتہ

پتہ سے معلومات لی اور فوراً ہی مطلوبہ کمرے تک پہنچی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اسے سکندر بیڈ پر لیٹا نظر آیا۔ اس کی رانیں پیر پٹیوں میں جکڑا تھا۔ ہاتھ پر بھی پٹی بندھی تھی اور ہاتھ بھی زخمی نظر آ رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”میں سب یہ کیسے واسکندر؟“ وہ اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ وہ فکر مندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا دل دکھا کر نکلا تھا ان بلاؤں پر جو چھٹا چلا تا بس قدرت نے اس بد قسمتی کی فوراً ہی سزا دے دی کہ جیسے سکندر شہید اب اس دیوار غیر میں جہاں لڑا محمود کے سوا کوئی آپ کی زبان مجھ سے والا نہیں بستر پر رہ جائے۔“

وہ دس کریوں بولا گویا خود اپنا مذاق اڑا رہا ہو وہ اس کے بیڈ کے پاس رکھی گئی پر بیڈ پر فکر مندی اور تشویش سے اسے بیڈوں میں جکڑا کر رکھ دی تھی۔

”خوب تمنا ہو رہا تھا ہسپتال میں ڈاکٹر، نرسیں سب میرے گرد جمع ہاتھیں میں میری چوڑوں کا احوال پوچھ رہے تھے اور میں انہیں انگریزی میں ”میرے کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔“ سمجھانے کے جن کر رہا تھا۔ آخر میں ہم نے اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے کو اپنا دعائے بھجایا تھا۔“

وہ بول بول رہا تھا جیسے کوئی بہت لطیف لہجہ والی بات بتا رہا ہو۔ جیسے اس کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ کوئی مزا لینے والا واقعہ تھا۔

”تنی ٹمکنیں شکل مت بناؤ لڑکی! میں ٹھیک ہوں۔“

وہ بالکل سنجیدہ چلی ہوئی تھی۔ سکندر کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ مذاق ہو سکتا تھا اس کے لیے نہیں نہ جانے اسے کہاں کہاں چوٹیں لگی تھیں۔ نہ جانے زبان کے مسئلہ کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کو اپنی چوڑوں کے بارے میں ٹھیک سے بتا بھی سکا تھا کہ نہیں۔ وہ ایک دم ہی کمرے سے گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو دوبارہ بلا کر لانا چاہتی تھی، تاکہ ڈاکٹر اس کے سامنے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کرے۔

بھی تھی اور پتھر میری لارہ لائی کی بجلی۔ اب ٹھیک سے یاد بھی نہیں آ رہا کہ ہوا کیا تھا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال بھی بہ چھڑی والا ہی لایا تھا۔“

”شکر ہے۔ زیادہ خوش نہیں آئیں۔ نہ مارے پیر کی چوٹ بھی بلدی ٹھیک ہو جائے گی ان شاء اللہ۔“

وہ بہت چٹائی اور ایسٹیت سے بولی تھی۔ جواب میں سکندر کی مسکرائی نظریں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے قدر سے پر اسٹے والے انداز میں پوچھا۔

”تمہاری افروغی انجوائے کر رہا ہوں۔ تمہارے اعلیٰ لیول کے لیے وہی اردو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“ وہ جواباً کھلکھو کر ہنس گئی۔

”میں اردو جس نئی کے ساتھ بولتی ہوں یا اپنے چچا اور ان کی ولایت کے ساتھ یا پھر کبھی کبھار سیم کے ساتھ اور اب تمہارے ساتھ بول رہی ہوں۔ دیکھو! میرے غلط لفظ اور لفظوں کی اداسگی پر غصہ مت۔“

میں گراؤ کم تمہاری زبان جاتی تو ہوں۔ تم تو میری زبان جانتے بھی نہیں ہو۔“

تجربہ سے کیا ہوا تھا وہ اتنے غصے میں کیوں آ گیا تھا اس نے تھا جا رہا نہ روئے عمل کیوں ظاہر کیا تھا وہ خود کو تکلیف اور اذیت میں مبتلا دیکھ کر خوش کیوں تھا؟ شدید خواہش کے باوجود بھی اس نے ان میں سے کوئی بات نہیں پریشی تھی۔

اسے سکندر سے یہ سوالات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا ف رہا تھا کہ وہ پھر ناراض ہو جائے گا اور وہ نہ تو اس کی خرابی کرنا چاہتی تھی نہ ہی اسے ناراض کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سوئٹ ہنس بھی کھلا چکی تھی۔

”نہیں نہیں لڑا! تم مجھے دیکھتے آئیں۔ چاہے تمہارے گنے سے میرا ہوا پھانسا ہو گیا ہے۔“

”تو ہرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے سینور سکندر کو میرا آنا پھانسا گیا ہے۔“ ان شرارت بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ سکندر نے اس کی مسکراہٹ کا

اور سوالات کئے۔
ڈاکٹر اس کے سوالوں کے قلبی بخش جوابات دے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

”ہو گئی تسلی؟“ صبح کہ رہا تھا ان کہ میں ٹھیک ہوں۔“

”تمہارے پیر میں کافی سیریس جوت گلی ہے سکندر! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ کافی وقت لگے گا تمہاری جوت ٹھیک ہونے میں۔ وہ بھی اگر تم احتیاط رکھو گے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرو گے تب۔“

وہ اس کے پس واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جواباً لارہ لائی سے سر ہلا کر مسکرایا تھا۔ اس کا ڈرائیوٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب اس کے لیے رے میں رات کا کھانا لایا گیا تھا۔

”کھانا کھالو سکندر۔“
”ہاں واقعی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے فوراً ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

”ابھی زیادہ دیر جاو نہیں کیس پھر لیڈنگ نہ شروع ہو جائے لیٹے رہو۔“

پھر اس نے پلیٹ ہاتھ میں اٹھائی اور چاول بھر کر چمچ اس کے منہ کی طرف بڑھایا تھا۔ سکندر اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا مگر بولا کچھ نہیں۔

”منہ کھولو کیا ہو گیا ہے؟“
اس نے قدرے غصے سے کہا وہ اس نے منہ کھولا۔

”فش بھی ہے۔ لوگ؟“
اس نے دوسری پلیٹ میں رکھے مچھلی کے پیس کی طرف اشارہ کیا۔ سکندر نے جواباً سراباٹ میں ہلا دیا تھا۔ وہ اسے کھانے سے فش بھی کھلانے لگی تھی۔ وہ خاموش رہنا ناولے جاتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا ایک سڈنٹ کیسے ہوا تھا سکندر؟“ چونچ اس کے منہ کی طرف رہتا ہے ہونے اسے بوجھا۔

”چاہے نہیں میں ہلا پور کیز سے باہر نکل کر بڑک پر تھوڑا سی آگے گیا ہوں تو ایک حیزر فائر گاڑی نے گھر مار دی۔ غلطی شاید کچھ ڈیڑی ہولے کی حیزر فائر کی

ساتھ دیا۔

”گوئی تم نہیں مانو گی۔“ وہ بار بار اسے انداز میں

بولتا۔

”ہاں میں نہیں مانوں گی۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، پھر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی مگر اس سے پہلے نہیں۔“ مغرور بندہ تیز اور خود پسند سکندر شہزاد کو دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے مجھے سب سے پہلے میں زخمی و بیمار پڑا سکندر شہزاد دیکھنے بالکل اچھا نہیں لگتا۔

”مصورہ اس جیلے میں آپ مجھ سے اپنی دوستی ظاہر کرنا چاہ رہی ہیں یا دوستی کی آڑ میں میری زبانیں مسمومانا چاہ رہی ہیں میں سمجھ نہیں سکتا۔“ وہ اسے غور کر دیکھتا ہوا مصنفی غار صحنی سے بولا تھا اور وہ جواباً کھٹکھٹا کر نہیں کہتی۔

”تمہارا جواب مل جائے“ سمجھ لو۔“ ترس سکندر کو دوا دینے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے سکندر کو دیکھا جانے والی دواؤں کے متعلق ترس سے سوالات کیے تھے۔ ان میں چند عین ٹکڑے اور ایک نیند لانے کے لیے دی جانے والی دوا تھی کیونکہ ڈاکٹر کا اندازہ یہ تھا کہ اگلی چند راتیں اور دن سکندر کے بہت تکلیف میں گزارنے پڑے اور وہ پُر سکون نیند سو سکے اس لیے اسے اودھ دی جا رہی تھی۔

”ترس دوا دے کر حل ہی تب اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کر دی۔“

”میرے کی کوشش کرو سکندر!“

”میں اس کو سوجاؤں گا مگر تم کیا ساری رات یہاں اسی طرح بیٹھی رہو گی؟“

سکندر نے بے چین ہو کر یہ بولا تھا۔ پھر بیچوں میں جکڑے ہوئے کے سبب وہ کوفٹ لینے سے قاصر تھا۔ شاید ایک ہی طرح لیٹے لیٹے اسے ابھرنے لگی تھی۔

”مجھے نیند آئے گی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔“
”تمہیں کوفٹ دلاؤں؟“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے بڑی ہنسی سے اسے کوفٹ لینے میں مدد دی تھی۔

”نہیں ہنس۔“ وہ بہت ہلکی آواز میں بولا تھا۔

”جانی رٹاؤ اور تمہارا کمرے؟“

”میں کتب اور کچھ بھی نہیں لوں گا۔ آرام کرنا چاہتا ہوں اب۔“ تم بھی میرا خیال ہے اب لینے کھر جاؤ۔ کلن در رہو گی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔
”نی الحال تو میں نہیں جا رہی ہوں۔ سینور سکندر!“ وہ اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر بھی نہیں پاسکتی تھی۔

کبارہ تکلیف کا جملہ اپنے دوست کو تنہا چھوڑ کر گھر چلی جاتی؟ اس کی دیکھ بھال کرنے والا یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ملک اور اس کی زبان سے استغیان تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر گھر جانی جاتی۔ وہ سکندر سے کچھ کہنے کے لیے لب و آکر رہی تھی کہ اسی وقت اس کے موبائل پر مبینہ کی کال آئے لگی۔

”بیلا مٹی مٹی“ وہ گھر سے مبینہ کو دوا لانے سے اس پر تپائی تھی کہ کس باہر جا رہی ہے سو گلاب کھر میں چلا ہو کر ان کا خون آٹا لڑی تھا۔
”گلاب کھر کو کی خبر؟“

”میں! امیرا دوست ہے میں سکندر اس کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں اس کے پاس باسپہل میں دل بہانے ہوئی گئی گھر آپ سوجاؤں۔“
اس نے سکندر کی اپنی جنب استغی نگاہیں دیکھیں جن سے وہ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں نہ رکے لیکن اسے نظر انداز کرتے ہوئے مبینہ کو جواب دیا۔ پھر غصہ اجاڑا کہ کرفن بند کیا۔

”لیز! تم گھر جاؤ بلینز۔ میں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ تم میری وجہ سے۔“
”جے آرام ہو۔“ وہ سنجیدہ برہم داری سے بولا۔

”میں آپ کے پاس یہاں رک رہی ہوں سینور سکندر! چاہے آپ کو اچھا لگے چاہے برا۔“ وہ دھونس جھانسنے والے انداز میں بولی تھی۔

”لیز! بلینز۔“

”سکندر! بلینز۔“ اس نے اسی کے انداز میں دہرایا۔

خواجہ قمر و انجمن

دسمبر 2011

تنبہ تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو گا۔

وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

”ہو کے گھر پر تم بھی صوفے پر لیٹ جاؤ۔“

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ اچھا تھا اسے نیند آگئی تھی۔ ورنہ اس کی رات بڑی تکلیف میں گزرتی۔ سونے میں وہ کئی بار تکلیف سے کرا رہا تھا یعنی باز بے چینی سے اس نے پہلو بدلا تھا اپنے پیر کو ہلانے کی کوشش یوں کی تھی جیسے شدید درد ہو رہا ہو۔ تکلیف سے ہی اسے بخار چڑھ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے کھلے اوڑھ لیا تھا۔

وہ ڈاکٹر کو بلا کر آئی تھی۔ ڈاکٹر کے اطمینان دلانے پر کہ ریشمال کی کوئی بات نہیں اور یہ کہ بخار کے لیے بھی سکندر کو دوا رات دی جا چکی ہے وہ دبا دہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی مگر تھوڑی دیر بعد وہ یہ ضرور چبک کر دی تھی کہ بخار تیز نہیں ہو گیا۔



اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ لیا لنگ رہا تھا جیسے حلق بالکل سوکھ گیا ہو۔ پیاس کے شدید احساس سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھ کر تو ایک اجنبی کمرے میں خود کو موجود کر جیڑا سا ہوا مگر اگلے ہی بل پیر سے اس کی دیکھنیوں نے اسے پاؤں لگا دیا کہ وہ کہاں پر ہے۔ اس نے پہلے سر سے پاؤں تک خود کو دیکھا۔ وہ جس گروت سوا تھا اس سے اٹھا نہیں تھا، وہ کچھ بھی اوڑھنے بغیر سوا تھا، مگر کھلے اوڑھ رکھا تھا۔ کمرے میں ہنوز اندھیرا تھا مگر کھڑکی سے باہر نظر ڈالنے پر اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک نابینا ظلمع ہوا ہی چاہتا ہے۔ لے لے لے کر ہر طرف نظر سرگھما رہا تھا۔ اس نے لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح رات کو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اس نے ساری رات اس طرح تکلیف میں

گزار رہی ہے اسے شرمندگی کا احساس ہوا۔ اس ساری زندگی کبھی کسی کا کوئی احسان نہیں لیا تھا اور اس وقت اس نے اپنے اندر شدید قسم کی بے چینی محسوس کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر اس کا وہیاں رکھتی رہی ہے۔ اسے گروت بدلائی رہی ہے۔ اسے سردی تو نہیں لگ رہی، ڈوبے آرام تو نہیں اس سب کا خیال رکھتی رہی ہے۔ ایسا کئی دوستانہ اور غیر معمولی سلوک اس نے لیزا کے ساتھ بھی روا نہ رکھا تھا کہ بدلے میں اس کے خلوص اور اپنا ہمت کی توقع رکھا مگر وہ تو ایسی ہی دوستانہ مزاح اور دوسروں کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ یہی بتاتا تھا بل رہ رہ کر اسے لیزا کے بارے میں۔ مگر وہ اپنا خلوص اپنی اچھائی بہت ہی غلط جگہ بہت ہی غلط شخص پر ضائع کر رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے نفرت سے سوچا۔

اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ لیزا اتنی جو کس تندرست نہ تھی کہ معمولی سی آواز سے بیدار ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھے ہوئے اس نے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا کچھ خراب ہے سکندر؟“

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

لیزا جلدی سے اٹھی، اس نے گلاس میں پانی ڈالا پھر اپنے ہاتھ سے ہی اسے لپیٹ لپیٹ پانی پلانے لگی۔ وہ اتنا پیاسا تھا کہ ہر گلاس وہ گھونٹ میں پی گیا تھا۔

”خود لاؤں؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

گلاس وہاں رکھ کر وہ پھر اس کے پاس آئی تھی۔

اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔

”شکر ہے ٹیپر بچہ کم ہو گیا۔“ وہ اس کے پاس سے ہٹتی تھی۔

”تھیں ٹھیک سے نیند آئی ٹاں سکندر؟“ وہ سوال

پوچھتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا رہی تھی۔

”نیند؟“ اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ اتنی

بے خبری والی لڑکی نیند سو گیا؟ اس نے سوتے میں وہ خواب

کیوں نہیں دیکھے تو وہ ناور بچہ ہوا بعد از کیوں نہیں

ہوا بلکہ انہوں نے کہیں پرے پرے ہٹا رہی تھی۔

”کھڑکی کھول دلاں؟ صبح ہو رہی ہے۔ ناز ہو کرے میں آئے کی تمہارا محسوس کر دے؟“

وہ کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کھڑکی کھلی۔ اس کی سوچوں سے انجان وہ گردن کھٹکا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہ، خابکہ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

لیزا اسے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ صبح کی تازہ ہوا کمرے کے اندر آنے لگی تھی سبھا ایک نیا دن غلطی ہو چکا تھا۔

اس کے لیے ناشتا اگلی تھا۔ اس بار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے بد نہیں مانگی تھی۔ وہ خود اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔

”آرام سے“ آہستہ آہستہ سکندر اٹھ رہا تھا بارے زخم ابھی بالکل تازہ ہیں۔“

اس نے سکندر کے شانوں کے گرد اپنے ہاتھ رکھ کر اسے پیٹنے میں مدد دی تھی۔ بیٹھا فوراً لیزا نے اس کی کمرے کے پیچھے غیے گا دیے تھے اس نے اس کے لیے سلاٹس پر تھن لگایا تھا۔

”تم ابھی ناشتہ کرو۔“ اس کے ہاتھ سے سلاٹس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

”یہ ناشتہ ہسپتال کے لیے ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”ہسپتال چاہتا ہے اس کی تیماردار بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرے اور ویسے بھی ہسپتال اتنا خوش خود آگ نہیں کہ یہ سب کھا جائے۔“ وہ اسی کے انداز میں جواباً ”مسکرا کر بولا تھا۔ لیزا نے اس کے ساتھ ناشتا شروع کر دیا تھا۔

”تم رات بھر سوئی نہیں ہوئیں؟“ اس نے اہستہ سے پوچھا۔ وہ بالکل مدہاش نظر لگاتے لگی۔

”تمہارے سامنے سو تو رہی تھی سینور سکندر! اتم ایلٹ تو لو۔“ وہ جیسے اپنی اچھالی کے بارے میں زیادہ

بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”لیزا! میں تم سے اپنے کل کے رویے کی معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے دس کام چھوڑ کر مجھے دلا ہو کر کھانے کے کمرے میں تھی۔ مجھے تمہارے ساتھ اس طرح بد تمیزی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔“

وہ ناشتہ روک کر سکندر ہی اس سے سنجیدگی سے بولا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر کی کڑواہٹیں دوسروں پر نکالتا پھرے اور دوسرے بھی کون...؟ لیزا محمودیہ جو غلطی اور محبت سے لبا لب بھری ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔

ایسے رویے کی بد صورتی پر وہ لیزا سے قصصاً شرمندہ تھا۔ لیزا نے بھی ناشتہ روک دیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”جہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے سکندر! میں نے تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مانا۔ میں بس یہ نہیں سمجھ سکی کہ تمہیں اچانک ہو کیا گیا تھا۔“

”میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا لیزا! بلکہ تمہارا مذمت کرتا۔“ وہ جواباً ”بہت اہستہ اور نرمی سے بولا تھا۔

وہ اب کبھی بھی اس سے غصے میں کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا احسان مند ہو گیا تھا اس لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ لیزا محمودیہ کے اندر کی اچھائیاں اور محبتیں ختم کرنے کا باعث کم از کم وہ ہرگز نہیں بنے۔ جلد یا بدیر زندگی لیزا محمودیہ سمجھا دے گی کہ نہ تو وہ دنیا اتنی اچھی جگہ ہے نہ ہی یہاں بیٹے والے لوگ۔ مگر اسے دنیا اور لوگوں سے بایں کر دینے والوں میں وہ کیوں شامل ہو۔ اگر وہ محبتیں باقی ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ وہ لڑکی بدلتی ہو محبتیں ہی تقسیم کرتی رہے۔ زندگی کا بد صورت چہرہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے۔

لیزا اثبات میں سہلا کر مسکرائی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ 2014

بہن نہیں جانا چاہتے، ٹھیک ہے۔ میں سنبالیں بڑا نہیں ماما۔ اب غم لیت جاؤ، کافی دیر سے بیٹھے ہوئے دو۔

وہ اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تو فوراً بولا۔

”میں خود لٹ جاؤں گا لیذا اتر بیٹھو۔“

لیذا نے اس کے انکار کی پروا کیے بغیر ایسے لیٹنے میں مدد دی۔ اس کے سر میں شدید تکلیف تھی۔ اٹھ کر بیٹھنے اور پھر واپس لیٹنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ بیکر کی تکلیف کے آگے بازوؤں اور سر پر لگی چوبیس انتہائی معمولی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان تکلیف کی طرف دھیان دی نہیں جا رہا تھا۔ بیکر میں جتنی شدید درد کی نہیں اٹھ رہی تھیں اتنا ہی زیادہ اسے اندر سکون اور اطمینان اترنا محسوس کر رہا تھا۔ خود کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر اسے ایک ان جانی سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

کل ایک سیکنڈ کے بعد جب وہ سرک پر زخمی پڑا تھا اس کے پیر بازوؤں اور سر سے خون بہہ رہا تھا تب بجائے پریشان ہونے کے، تکلیف اور درد محسوس کرنے کے وہ خوش ہو رہا تھا۔ اپنا خون ہٹا دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ ہاں وہ خون اتنا ہی اور اس تھا اسے یوں ہی بہہ جانا چاہیے تھا اس کا وجود اتنا ہی بے مصروف تھا اسے اسی طرح کسی اجنبی سر زمین پر غیول اور اجنبیوں کے بیچ دنیا سے ناٹھوڑ جانا چاہیے تھا۔

شعوری طور پر وہ یہ سمجھ بھی نہیں لے کر ماکہ یہ ایک سیکنڈ در حقیقت ہوا اس کی وجہ سے تھا مگر نا شعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ غلطی گاڑی والے کی نہیں اس کی تھی۔ خود کو انجان اور بے پروا بنا کر کرنا وہ اس تیز رفتار گاڑی کو اتار دیکھ کر بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہیں بائیں یا دائیں یا پیچھے نہ ہوا تھا۔ وہ گاڑی اسے ٹکرائی ہوئی مدد قدم آگے جا کر رک گئی۔ ڈرائیور نے فوراً ”بریک لگائے تھے ٹھہر گئے رکے تھے بھی گاڑی اسے ٹکرائی ہوئی تھی۔“

وہ سرک پر دوڑے مسرہ سرشاری سے مسکرایا تھا۔ وہ نہ درگے لیے چایا تھا نہ درد اور تکلیف سے کسی کو پکارا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈرائیور سے یہ درخواست بھی نہیں کی تھی کہ وہ اسے ہسپتال لے جائے۔ وہ سرک پر سکون سے رہا تھا۔ اگر گاڑی کا ڈرائیور اسے اٹھا کر ہسپتال نہ لانا تو اسی طرح سرک پر پڑا رہتا تو ٹھیک کوئی اور اس کی مدد کو آتا ہو کہ وہ چاہتا تھا کبھی بھی نہ آئے۔

بظاہر تو سکندر شہزاد دینی طور پر ایک نارمل اور صحت مند شخص تھا۔ باشعور، ختم و فراست رکھنے والا مرد۔ وہ خود کشی کی کوشش کیونکر کر سکتا تھا؟ خود اپنے آپ سے بھی وہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایک سیکنڈ اس کی بے دھیانی اور کار کے ڈرائیور کی تیز رفتاری کے سبب ہوا ہے۔

اس کے اندر خود سے نفرت میں جلتا شخص اس کے جھوٹ پر نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر اسے لیٹنے کے لیے آتا ساتھ میل نرس بھی تھا۔ ڈاکٹر اسے سکندر کے بازوؤں اور سر کی جینڈرنگ تبدیل کرنے سے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ وہ سکندر کے زخمی پیر کو مختلف انداز میں باؤ جڑا کر دیکھ رہا تھا۔ بیکر پشانی انوش نہیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ لیذا ڈاکٹر کے پاس کھڑی انگلیں میں جلدی جلدی ہوتی اس کی چونچوں کی کے متعلق ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ غالباً اس کی رات کی بے سکوئی اور تکلیف ڈاکٹر کو بتا رہی تھی۔

ڈاکٹر اور میل نرس وہاں سے چلے گئے تب اس نے لیذا سے اپنا سوا کل اٹھا کر دینے کو کہا۔ آئس ٹائم شروع ہو چکا تھا اسے آئس فون کر کے بتانا تھا کہ وہ توج نہیں آسکتا۔ اسے وہاں اپنے ہیڈ آفیس بھی فون کر کے اپنے ایک سیکنڈ کی اطلاع دینی تھی۔

وہ ہسپتال میں بیٹھ کر آئس کا کچھ ضروری کام کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اسے آئس سے کچھ معلومات اور چند فائبر و کارڈ تھیں۔ اسے یہ تمام چیزیں ای میل کی دی جائیں اس کو آئس فون کر کے یہ بھی بتانا تھا۔

صرف سکندر شہزاد کی نہیں بلکہ ہر کسی کی تکلیف پر دیرانی ہوگی۔ لیکن انور اسے دیکھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے مختصر جواب دیتا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے مختصر جواب دیتا تھا۔

”میل ٹرس آتا ہوگا“ تم اپنی بیٹی کی تبدیلی کر دو۔

اس نے خاموشی سے شخص سرانجام میں ہلایا تھا۔



اس نے آفس فون کر دیا تھا۔ دور ٹوکل رات ہی اپنی فیملی کے ساتھ گھوم پھر کر واپس آیا تھا۔ اس نے آفس سے ہی آفس جوائن کر لیا تھا۔ سکندر کی اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس کے ایک میلنڈ کا بن کر لکھ رہا تھا۔

وہ تھا۔ قصبات پوچھ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ وہ اس کے کاموں کے لیے فکر مند تھا۔ اس نے آفس سے دور بیٹھ کر آفس کا کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لکھ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے تمام کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیم گرمیابی سے ہاتھ

منہ اور جسم کا دیر ہی حصہ دھلتے سے وہ خود کو کافی ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا مزید کئی دنوں تک ایسی ان چوٹیوں کے ہزار اٹھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

وہ آج ہی ہاسپتال سے چھٹی کے لیے چڑھا جاتا تھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کل کا دن اپنے ہوٹل میں گزارے گا پھر برسوں سے آفس۔

لیزہ پوچھ رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے جواب دیا۔

”سوئی ہو گئی کی نیند لے لی، مانی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے جواب دیا۔

وہ اس سے کیا کہتا کہ تکلیف جتنی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اتنا ہی اچھا محسوس کرتا ہے۔ اس نے شخص سرانجام

سب سے پہلے۔ ہاتھ ہی اسے یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ کل دلاؤ رگیز جاتے رت اس کے ساتھ اس کا لپ ٹاپ بیک اور پریف کیس بھی تھا۔ اس کے یہاں تمام ضروری کاموں کی تفصیلات لپ ٹاپ میں موجود تھیں۔ اسے اپنا لپ ٹاپ پر کار تھا۔

”لیزہ! انیساری گاڑی میں میرا لپ ٹاپ بیک ہوگا۔ پلیر وہ مجھے لاؤ اور پلیر اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ ساری رات بے آرام رہی ہو۔ گھر جا کر ریسٹ کرو۔“ وہ نرم لہجے میں اس سے خطاب ہوا تھا۔

”تم نیند سے ہو سکندر شہزاد؟ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج آفس کا کوئی بھی کام کرنے کی۔ دو تین دن کام نہ کرنے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ لپ ٹاپ پر کام کرنے کے لیے مجھ سے ہار بار جسم کو ہلاؤ جلاؤ گے۔“ لکھ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے جواب دیا۔ اس نے جواب دیا۔

”بہت ضروری کام ہیں لیزہ!“ وہ بے بسی سے بولا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ لی لکھ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ کرنا نہیں سکتا تھا۔ ورنہ خود جا کر لیزہ کی گاڑی سے اپنا لپ ٹاپ لے آتا۔

”ہوں گے ضروری۔“ سکندر ضروری کام سکندر شہزاد کی صحت اور اس کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔

وہ بہت محبت اور اپنائیت سے بولی تھی۔ بہت پروا کرنے والا انداز تھا۔ مگر پھر کبھی اس کا نہیں کیوں دل نہیں کہیں صحت زور سے جا کر چھٹی تھی۔ اس کی بات۔

”سکندر شہزاد کی زندگی۔“ مانی سے بولا وہ یکدم آہیں چپ ہو گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سکندر شہزاد کی زندگی سے زیادہ بے مول اور بے وقعت اس دنیا میں

کسی کی بھی زندگی نہیں۔ شہزاد سکندر زور سے بہت دیر بے دلی صرف ایک ہستی ہے۔ جو اس کی موت پر روتے گی۔ اپنی دنیا میں کسی کو بھی اس کی زندگی یا اس کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس ہستی کے ساتھ شاید لیزہ سمجھو بھی چند آنسو اس کے لیے بہائے کہ یہ لکھ رہا تھا۔

”ہاں، کیا تھا۔ لیکن اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔
”تم نے کچھ کرایا؟“

”میں میڈکٹ سنو گئے؟ میں تمہارے لیے اپنا آئی
یوڈے آئی۔ میڈکٹ میں تمہاری پسند تو مجھے پتا نہیں
آئی میں انٹالین گلے بھی ہیں اور انگلش سوگلز بھی
ہیں۔“

اس نے بیک سے نکال کر اپنا آئی یوڈے دیا۔ وہ یہ
کہہ کر اس کے غلوں کی توہین نہیں کر سکتا تھا کہ
اسے میڈکٹ ”موریز“ کتابیں کسی بھی چیز میں دیتی برابر
بھی دیکھی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو زندہ لوگوں کے
لبے ہوتا ہے۔ بھول ہوئے اس نے خود کو زندہ لوگوں
میں شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”میں کچھ انگلش سبگرنز اور کتابیں بھی لائی ہوں،
مگر پھر وہی بات کہ تمہاری پسند مجھے پتا نہیں تھی۔ بس
جو مجھے پسند ہیں، وہ لے آئی۔“

وہ اس کے لیے سارا اہتمام یوں کر دیتی تھی جیسا
وہ یہاں کی دفتروں تک پڑا رہنے والا ہے۔ اسے سوچ کر
ہنسی آئی۔

”تم مسکرا کیوں رہے ہو؟“ اس نے اس کے لبوں
پر آتی مسکراہٹ فوراً دیکھ لی تھی۔
”کچھ نہیں دیکھتی۔“

”ویسے یہ سوچ اچھا نہیں ہے سینور سکندر! تم
زخمی ہو کر بیڈ پر پڑے ہو تمہارے کہیں پر بھی چلے
جانے بھاگ جانے کا کوئی خطرہ موجود نہیں ہے۔ اس
بہترین موقع سے فائدہ اٹھا کر میں تمہاری پیٹنگ کیوں
نہ بناؤں۔ تم جابے جتنا بھی نادراں ہو گے، منہ پھلاؤ
میں تمہاراٹھ کر جاؤ کہیں نہیں سکو گے۔“

”شرارت بھرے انداز میں بولی تھی اور وہ
بے اختیار تھکر لگا کر بٹاتا تھا۔

”مصورہ! میں نے تمہیں اپنی دوست سمجھا تھا۔
بڑے انسوس کی بات ہے کہ میری دوست میری
جبوری کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

انہی نے تیسف سے سر ہلا کر جیسے اسے شرمندہ

کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک انجینیئر میں ملے
چلے چلے پھرنے سے قاصر ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا
چاہے اسے اپنی صحت اور زندگی کی براداری بائیں
مگر ہر حال اسے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے دہا
اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنی تھی یہ ایک پریشان کن
صورت حال بھی اور وہ۔

وہ لیڈز کے ساتھ بڑے بلکے موڈ میں ہنسی مذاق کر رہا
تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ باتیں کرتے، اس
کے ساتھ وقت گزارنے کو انجوائے کر رہا تھا۔ شاید
نہیں بلکہ یقیناً ”یہ کمال اس لڑکی کا تھا اور نہ ایک عمر
گزری تو توہینے والی باتوں پر بھی جتنا بھول بیٹھا تھا۔

”میں سینور سکندر! میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت
ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پیٹنگ اس وقت

"Rough Sea"۔ اس نے اناہن میں شام اور رات کا سلام ان دونوں کو مشترکہ طور پر کیا تھا۔
 "یہ کیا کر لیا تم نے میرے پیچھے؟" وہ اس سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ "دوایا" مسکرایا تھا۔
 "بیمویدر نو" لیزا نے اپنی کرسی دہر نو کے لیے خالی کر دی تھی۔ دہر نو نے مسکرا کر لیزا کو دیکھا تھا۔
 "تم ہو سکندر کے پاس چلو یہ اچھا ہے۔ صبح جب سکندر نے مجھے اپنے ایکسپینڈنٹ کا بیٹا عین یہی سوچے جا رہا تھا کہ اناہن نے آنے کی وجہ سے اسے یہاں مشکل دوری ہوگی۔"
 "دوستی کی ہے سینور سکندر سے تو اپنے دوست کا خیال تو رکھو ان کی بات رو نہ تو!"
 وہ ہمارے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے دہر نو اور لیزا انگریزی ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ دہر نو اس بات پر ذرا سنا بھی حیران نہیں تھا کہ لیزا اس کے پاس ہسپتال میں کیوں ہے؟ ہاں وہ یونیورسٹی کے ساتھ نیکیاں اور اچھائیاں کیا کرتی تھی۔ دہر نو نے اسے لیزا کے بارے میں پوچھا تھا تھاں؟ جب دہر نو اسپین میں تھا تو لیزا اس کی پوری کوششیں کرتی تھی اس کے پاس یہاں رہی تھی۔ یہ اچھائیاں غیر معمولی سلوک و توجہ خصوصیت کے ساتھ اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ یہ اس لڑکی کے مزاج کا حصہ تھا یہ اس لڑکی کے واقف ہر شخص کے لیے تھا۔
 پھر آخر دہر نو حیران ہوا تھا یہ کیوں؟ اس کی بچپن کی دوست تھی جانتا تھا ان کی دوست کے مزاج کو۔
 "ہاں یہ بات تو ہے۔ تم سے اچھی دوستی نہ جانے والا کون ہو سکتا ہے لیزا؟" دہر نو نے مسکرا کر لیزا کی بات کا جواب دیا تھا۔ "میں نے سارے ڈاکٹرنس نہیں ای میل کر دیے تھے، مل گئے ناں تمہیں؟"
 "کہاں دیکھ پایا ہوں میں۔ میرا لپ ٹاپ لیزا کی گاڑی میں پڑا ہے یہ مجھے لاکر نہیں دے رہی۔ اور اپنے سواں پریش نے الہج منٹ بھولنے کی کوشش کی تو ساری الہج منٹ کھلی مین سکین۔"
 وہ دہر نو کی بات کے جواب میں قدرے غمزدگی

رکھ کر کہتی ہی چلتی ٹھیک پہنچاؤ گے۔ وہ مسکرا کر پر غلوص انداز میں بولی تھی۔
 "تمہارے لیے امنیکس اور کئی آئی تھی، تم سو رہے تھے تو میں نے واپس لوٹا دیا۔ اب بول کر آئی ہوں۔ ویسے تم کافی کی جگہ چائے تو نہیں لیتا چاہتے؟ اصل میں یہاں کئی کافیناں ہیں۔ لوگ چائے کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔"
 وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولی تھی۔
 "کافی ہی ٹھیک ہے بیک، تم اپنے لیے بھی لے کر آنا۔" وہ لیزا کو بولا تھا۔ لیزا سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔
 وہ مشرور اور پیر والا سنڈیج کھارہ تھا لیزا کو کیز کھا رہی تھی۔ کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے میں اس نے لیزا کی مدد لینے سے منع کرنا چاہا تھا اس نے پھر بھی اسے مدد دی تھی۔
 "لیزا ابھی ڈاکٹر آئے گا ناں تو تم اس سے کہنا مجھے ہسپتال سے چھٹی چاہیے۔"
 ڈاکٹر جب اپنا دماغ چمکانے کے لیے اسے لیزا کی ضرورت تھی مدد آج ہی ہسپتال سے چلا جانا چاہتا تھا۔
 "کیا مطلب؟" وہ بیکہ سی یوں اچھکی تھی تو یوں کوئی بہت ہی عجیب بات سن رہی ہو۔
 "کل شام تمہارا ایکسپینڈنٹ ہوا ہے ابھی تمہاری چوٹیں بالکل تازہ ہیں اور تم ہسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہتے ہو، خیریت ہے ناں؟" وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی تھی۔
 "لیزا ایڈیٹر لیٹ کر آرام ہی کرتا ہے ناں وہ میں اپنے ہو سک میں کر لوں گا۔ یہاں ہسپتال میں اس طرح پڑ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے جسے میں بالکل ہی معذور ہو گیا ہوں۔ تم اسے کچھ بھی کہو مگر ہسپتال کا روایتی ماحول مجھ پر نفسیاتی طور پر اتنا منفی اثر ڈال رہا ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو ٹھیک ہونے میں بہت دیر لگے گی۔"
 لیزا جواباً اس بات کی مخالفت میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر دہر نو اندر آیا۔ اس کے آنے میں پچھلے کا ایک گھنٹہ تھا۔

دیکھا مایوسہ نہیں ہے؟ لیزا نے اسے غصے سے دیکھا تھا۔

”لیزا ٹھیک کہہ رہی ہے سکندر اگر تمہیں لگتا ہے کہ ہسپتال کا ماحول تمہیں سوٹ نہیں کر رہا تو پھر تمہیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں تمہاری ریکہ بھال ہو سکے لیزا اگر تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہے تو یہ تو بہت اچھا ہے وہاں اس کی ٹینی ہیں وہ تمہارا خیال رکھ لیں گی تم سہولت سے رہ لو گے۔“

روز روئے اپنی رائے پیش کی تھی۔ وہ ہسپتال سے جانے کی بات بول کر بچتا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے اتنا زیر بار آچکا تھا مزید کوئی بھی احسان لینے کا وہ تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

”مجھے اصل میں علوت نہیں ہے اس طرح کسی کے بھی گھر پر رہنے کی۔ میں اپنی کل نہیں کروں گا۔“ اپنے سچے کو فرم رکھتے ہوئے اس نے لیزا کو انکار کیا۔

وہ اپنی علوت کے مطابق صاف ڈو لوک اور بے مروتی بھرا انکار اسے کر نہیں پا رہا تھا۔ ہائیس کیوں نہ کر اسے لب لیزا سے بات کرتے ہوئے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کا دل رکھے۔

”تم وہاں اچھا محسوس کرو گے یہ میری گمانی ہے سکندر! اور اگر تمہیں اچھا نہ لگا تو تم مجھے صاف صاف بتا دینا۔ میں خود تمہیں اسی وقت تمہارے ہوٹل بھجور آؤں گی یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ کے پاس پہنچی تھی۔ اور دوستانہ سنجے کو راپنا ہیٹ بھرے انداز میں بولی تھی۔

”ماں جاؤ سنو سکندر! تمہاری دوست لیزا تم کو گھر سے گھر کم از کم تمہارے ہوٹل سے تو زیادہ آرام دہ ہے“ وہ بے بس سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی اپنا ہیٹ! خلوص اور محبتوں کو بالے کا ذرا نا پسند تھا۔ اور نہیں تھا مگر وہ اس لڑکی کو انکار نہیں کر سکتا۔

اپنا ہیٹ بھرا اصرار کر رہی تھی۔ ”ماں! شہناز انداز میں

سے بولا تھا۔ اسے دفتر کے کمروں کی فکر تھی۔“

”ہاں تو بالکل ٹھیک کر رہی ہوں میں۔ باقی راتوں تمہارا لب ٹاپ اور پرنٹ کیس لب میری گاڑی میں نہیں بلکہ میں نے اپنے گھر لے جا کر حفاظت سے رکھ دیا ہے۔ باتیں سنو ذرا ان محترم کی رو پر ڈال مجھ سے فرما رہے ہیں میں ڈاکٹر سے کہہ کر انہیں ہسپتال سے ڈچارج کروا دوں۔ ذرا اس کی چوٹیں دیکھو اور پھر یہ بات سنو۔“

اس نے پہلے لے اور پھر روز نو کو ایک ہی وقت میں مخاطب کیا تھا۔

”مجھے ہسپتال کا ماحول سوٹ نہیں کرتا۔ طبیعت اچھی ہے روز نو ٹارگٹ کرتا ہے۔ باقاعدگی سے جینز جینز کرتا رہتا ہے تو یہ سب تو میں ہو کر جا کر بھی با آسانی کر سکتا ہوں۔ میرا یقین کریں آپ لوگ میں یہاں رہ کر اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہو سکیں گی جتنا جلدی یہاں سے جا کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

اس کے لیے روز نو اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ہسپتال سے چھٹی کروانے کی وجوہات سے آگاہ کرے۔ اس نے روز نو سمیت اپنے کسی بھی جاننے والے ملنے والے کو یہ حق نہیں دے رکھا تھا کہ وہ اس کی ذاتیات میں دخل دے مگر یہاں مسئلہ لیزا محمود کا تھا۔ وہ اسے لوک نہیں سکتا تھا اور نہ ہی خفا ہو کر اسے اس موضوع پر بولنے سے روک سکتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں روز نو موجود تھا بلکہ اس کے لیے کہ لب وہ لیزا کے ساتھ تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

”اگر یہ بات سے تم نے یہاں سے جانا ہے تو پھر تم میرے گھر چلو گے۔ ہوٹل تو میں تمہیں ہرگز نہیں بانے دوں گی۔“

لیزا اس کی بات کے جواب میں فوراً ”دوہولس بھرے انداز میں بولی تھی۔ اس کا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا تھا۔ وہ یہ کیا بات کہ نکال بیٹھی تھی۔ لب یہ ایک نئی مصیبت تھی۔

”یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے لیزا! وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔“

حق جناب رہی تھی اور اس اپنیت اور دوستانہ حق سے انکار کرنے کے لیے اسے لازماً بے مروتی اور سرد مری کا مظاہرہ کرنا پڑا جو وہ اس کے ساتھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ لیزا محمود کے گھر پر گز نہیں جاتا جاتا تھا مگر اخلاقی دباؤ میں یوں دھکیا تھا کہ اسے اس کے گھر جانا ہی پڑا تھا۔

دور تو آج یوں گھنٹہ بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے کچھ دن بعد ڈاکٹر نے دیکھنے آیا تھا۔ لیزا نے اس سے اس کی چھٹی کی بات کی تھی۔ کئی مشکلوں سے ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ بھی یہ کہہ کر مریض اپنی زہد واری پر جلدی ڈسچارج ہو رہا ہے۔ اس نے سکندر کو کل آکر دکھانے کی تاکید کی تھی۔

”آرام سے“ آستہ آستہ اتر دے۔“ اس کے اپارٹمنٹ آگیا تھا۔ لیزا نے گاڑی بیس منٹ میں لے جا کر روکی تھی۔ اب وہ اسے ہاتھ پیر کر باہر نکلنے میں مدد دے رہی تھی۔ اسے لیچ وائیں بلاؤں پر بالکل بھی زور نہیں ڈالنا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات پر وہ آستہ سے اتر کر کھڑی۔ خرید کر لائے تھے۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ کم از کم بھی وہ آٹھ ایک ہفتہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اگر جلدیانا گزیر ہو جی جائے تو پھر میسا جی کے سہارے اپنے دائیں پیر پر بالکل بھی وزن ڈالے بغیر چلے۔

وہ میسا جی کے سہارے لیزا سارا وزن بیس کھی اور بائیں پاؤں پر ڈالے دائیں پاؤں کو محض ٹھیک ہوا چل رہا تھا۔ لیزا اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ”تمہیں درد تو نہیں ہو رہا ناں سکندر! تم سے چلا جا رہا ہے میں؟“

میں درد اوزے سے اندر داخل ہوتے لفٹ میں جاتے باہر نکلے اس کے اپارٹمنٹ تک آتے آتے وہ یہ سوال نبھانے سعی بار و ہوا چکی تھی۔ اسے میسا جی تھی۔

”میسنر“ مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ صندے اتنے ہو کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر میسنر دہلیا ہے جبکہ ابھی دس دن تھیں ہسپتال میں رہنا چاہیے تھا۔“ اس کے بٹنے پر جڑ کر ناراضی سے بولی تھی۔ لیزا کے قتل جانے پر اپارٹمنٹ کا دروازہ ایک بری عمر کی خاتون نے کھولا تھا۔ وہ چونکہ غائبانہ تعارف حاصل کر چکا تھا چنانچہ جانتا تھا یہ لیزا کی بیوی ہیں۔ بچپن میں اس کی تاب تھیں اور اب روم میں لیزا کے ٹیلیٹ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے شلوار قمیض اور دوپٹہ پہن رکھا تھا۔ بالوں کا جوڑا بٹایا ہوا تھا۔ چہرے پر سبزی بور محبت بھرا اثر تھا۔

”السلام علیکم۔“ ساری زندگی کبھی اس طرح کبھی کے گھر منہ اٹھا کر نہیں گیا تھا۔ بہت عجیب عموں گزر رہا تھا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! آؤ اندر آؤ۔“ انہوں نے شفقت انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ ان کی اردو میں گفتگو سنتے ہی اسے لیزا کی گالیاں یاد آئیں۔ اپنی بیوی سے فراموش کر کے اس نے اردو میں گالیاں سیکھی تھیں ناں۔ اسے لیزا کی وہ خطرناک اردو یاد کر کے دل ہی دل میں میسا جی آئی تھی۔

”بیٹی! آپ نے اور میں نے مل کر سکندر کی بہت خیر کر رکھی ہے۔ تیار رہیے۔ ڈاکٹر ابھی اسے ڈسچارج نہیں کر رہا تھا۔ یہ ضد کر کے ہسپتال سے چھٹی لے کر آ رہا ہے۔“

وہ لیزا اور اس کی بیوی کے ساتھ چلا ایک کمرے میں آگیا تھا۔ لیزا کا اپارٹمنٹ خوب صورت تھا۔ آرٹسٹک لک ڈے رہا تھا۔ لگ رہا تھا یہ لیزا کا اس کے عزیز از جان رومیا میں اپنا ٹیلیٹ ہے جسے اس نے بڑی محبت سے سجا اور سنوار رکھا ہے۔

”بیٹا! تم بالکل تکلف مت کرنا۔ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوے جھجک مجھ سے کر دینا۔“

وہ میسا جی کو ٹائلاز پر مضبوطی سے بھا کر اس پر اپنا وزن ڈال کر پیڈ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب بی بی اس سے بولی تھیں۔ اسے بیٹھنے میں کچھ وقت کا سا نا

جہاں کہ تمہارے ساتھ رہا ہے۔
وہ بھی جو اب "سجیدگی" سے بولی تھی۔ وہ خاموش ہو
گیا تھا۔ لیرا کچھ بھی کہتی مہر حال سے اس طرح
یہاں آکر خاصی شرمندگی ہو رہی تھی۔ لیرا نے وہ اسے
بعد دو کر "اصرار کر کے اس کی مرضی کے خلاف
وہوئی اور حق جاکر لائی تھی تب بھی۔
"بہ تمہارا کمر ہے؟" اس نے خود ہی موضوع
تبدیل کر دیا تھا۔ آج رات کی بات ہے۔ وہ کل یہاں
سے چلا جائے گا۔

"ہاں! وہ جو اب" مسکرائی تھی۔ اس نے ایک ہار
بھری نگاہ اپنے کمرے میں ڈالی تھی۔ اس کی نگاہ سامنے
دیوار پر لگی ایک تصویر پر پڑ گئی تھی۔ لیرا نے اس کی
نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

"یہ میری اور میری بہن عسیم کی تصویر ہے۔"
تصویر میں لیرا اور اس کی بہن پانچ سال کی بچیاں
تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں بائیں
ڈال رکھی تھیں۔ دونوں بے تحاشا ہنس رہی تھیں اور
ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش لگ رہی تھیں۔
"رائٹ سائڈ والی تم ہو؟" اس نے
اسکرت بلاؤڈ میں لمبوس "بائیں کی دو بونیاں بیٹھے
خوب صورت اور خوب صحت مند سی بچی کی طرف
اشارہ کیا۔

"ہاں! میں ہوں۔ بہت مونی بھی میں بچپن میں۔"
وہ تصویر کو یاد بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسی تھی۔

"یہ عسیم کی ہر تھوڑے پارٹی والے دن کی تصویر ہے؟"

"عسیم تمہاری بہن کاٹک نیم ہے؟" اسے ایسا لگا
جیسے لیرا کو اپنی بہن کی باتیں کرنا اچھا لگ رہا ہے اس
لیے اس نے اخلا کا اس حوالے سے گفتگو برصالی۔
"ہاں! اس کا پورا نام سامتا ہے۔ دم نوگ بارے
اسے عسیم بلاتے ہیں۔" لیرا کے چہرے پر اس کی بہن
کی محبت کے لگ بھگ تھا۔
"نہاری بہن بھی اہلی میں رہتی ہے؟"

تھا اس لیے اس نے محض میراثیت میں یاد کیا۔ لیرا جو
اس کے بالکل بائیں کمری تھی اس نے اسے فوراً ہی
پٹھنے میں بند دی تھی۔

"چائے؟ کافی کچھ لاؤں تم لوگوں کے لیے؟" عینی
نے لیرا کو اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نہی، اگلے کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ ایسا
کریں؟ ذہنی کا انتظام کریں۔" لیرا اس کی جیسا بھی
بیڈ کی سائڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکا کر رکھ رہی تھی۔
"گھانا تو میں پہلے ہی تیار کر چکی ہوں۔"

وہ بیڈ کے اوپر اپنا ریاں پاؤں خود ہی اٹھا کر رکھ رہا تھا
مگر لیرا نے جلدی سے بیڈوں میں جکڑے اس کے
پاؤں کو ہڑی اٹھائی سے ایسے کہ اسے ذرا بھی تکلیف
نہ ہو اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ ساتھ وہ عینی کو جواب بھی دے
رہی تھی۔

"یہ آپ نے بہن اچھا کیا عینی! اس پھر اب تھوڑی
دیر میں آپ میرا اور سکندر کا کھانا ہمیں لے آئیے
گا۔"

"تھیک ہے بابا! عینی! میں سے چلی گئی تھیں۔
وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیرا نے اس کی کمر کے پیچھے
تک لنگھ کر بیٹھا۔

"تکلیف تو نہیں ہو رہی پاؤں میں؟ اتنا طے ہو۔"
وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھی۔
"لیرا! میں تمہارے اصرار پر آئی گئی ہوں مگر مجھے یہ
بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اس طرح تمہیں اور تمہاری
عینی کو اپنی وجہ سے پریشان کرنا۔"

وہ سجدگی سے اڑا تھا۔ پاؤں میں درد والے سوال کا
نئی میں جواب دینے کے بعد۔

"مجھے اور عینی کو کوئی تکلیف نہیں ہو رہی سکندر!
دوست آفر ہوئے کس لیے ہیں؟ کیا صرف عینی مذاق
کرنے اور اچھے وقت پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے
کے لیے؟ نہ ہارا ایک سید منت ہو گیا ہے، تم تکلیف
میں ہو اور اپنی نہارا ملک بھی نہیں ہے۔ تم نہ ہارا
کی زبان جانتے ہو نہ راستوں سے واقف ہو۔ اس
پریشانی میں بحیثیت لاہنت میں اپنی ذمہ داری سمجھتی

”مریم کی فیملی سے لیا جا رہے ہیں۔ مگر ام مریم اور اس کی فیملی انہیں پسند آتی تو انہیں اس کے ساتھ تمہارا رشتہ نہ کرتے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”تھینک یو اموجن تھینک یو سوچ۔ آپ نے مجھے بہت بڑی خوش خبری دی ہے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پلا کو یہ نہ لے کے کہ میں اپنی منگنی وغیرہ کی بات جلدی کر رہا ہوں۔ اکی عین ابھی تو میری اندر گرجوٹ اسٹریز بھی لمبل نہیں ہوئیں۔“ خوشی کا بے پایاں احساس تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

”میں بھی اسی خزانے سے تھوڑی گزرسد بھی زمین بھر تمہارے پیالے اس بات کو اتنے بڑے انداز میں لیا۔ یوں اہلکارے سے بچے امریکہ میں پیدا ہوئے اور پھیلے بڑھے ہیں۔ یہاں تیرہ چوبیس سال کی عمر کے لڑکے لڑکیاں ہوائے قریطہ کرل فریڈ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا بیٹا تو پھر بیس سال کا ہونے والا ہے اور ایک لڑکی پسند کرتے اور اس سے شادی کا سوچنے کے لیے درخت راستہ اپنا رہا ہے تو ہم اس کے لیے رگڑت کیوں نہیں؟“

زندگی میں پہلی بار اس کے باپ نے اس کے لیے سوچا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس کی آرزوئیں اور خواہوں کو روند ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اسے اس میں بے اختیار اپنے باپ پر یار کیا تھا۔ انہوں نے پیشہ اس کے دل کو اس کے جذبات کو نہیں پہنچائی تھی، پہلی مرتبہ اس کے دل کی خوشی کا انہوں نے خیال کر لیا تھا۔ وہ بے پناہ خوش تھا۔ اس کا سب سے بڑا خوف کہ پلا اس بات پر کیا رد عمل ظاہر کریں گے؟ ڈر ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ام مریم سے جی اس خوشی کو شیئر کیا تھا۔

”جذین۔۔۔ تم نے اپنے پیر تئیں سے بات بھی کر لی؟“ ام مریم نے خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”جی، ام مریم بھی۔ لڑکی اس کے لیے۔ کتنا ام تھا اس کا ساتھ۔ اس کے لیے۔ انہو جان سے ام مریم کے متعلق بات کرنے کے بعد اس نے ام مریم کو اس بات

”نہیں“ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ پاکستان میں رہتی ہے۔“ وہ اس بار کچھ دھکے بھرے انداز میں مسکراتی تھی۔ شاید وہ اپنی بہن کو بہت مس کرتی تھی۔ ولیدز کو بخور دیکھ رہا تھا۔

”مجھ میں اور ہم میں بہت پار ہے سکندر، ہم دونوں صرف ہمیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی سسٹ فرسٹڈ۔“ جی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب میں اور ہم ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔“ لیزا کی بات اس کے دل کو بڑی تیز کر چھی تھی۔ وہ پہلی زندگی کو کبھی بہت پیچھے چھوڑ کا تھا مگر پھر جی لیزا کا اس کی بہن کے لیے پار دیکھ کر اسے بھی کوئی پار آ گیا تھا۔

”جو بات بہن بھائیوں کی ہوتی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہوتی، اسلئے دیکھ لیتا ہے آپ کے بھائی یا بہن آپ کے چنے۔“ دست بان سکتے ہیں اٹنا اچھا دست اور کوئی نہیں سکا۔ ان کے سامنے آپ خود کو عیاں کرنے سے بچھکتے بھی نہیں ہیں۔ بھائی، بہن کا یہ قدرت نہ بڑا عمل بنایا ہے۔“ وہ اپنی دھن میں بڑے جذب سے بول رہی تھی۔

”بھائی! اس پر ایک وحشت سی طاری ہوئی تھی۔“ لیزا ابھی کچھ دیر آرام کر لوں؟“ اپنے اندر کی وحشت سے گھبرا کر اس نے لیزا سے کہا۔ وہ اس کی بدلتی کیفیتوں سے انجان مسکرا کر بولی۔

”ہاں تم کچھ دیر ریٹ کر لو۔ پھر ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔“

لیزا اس سے مسکرا کر بولتی کمرے سے چل گئی تھی۔ وہ وحشتوں میں گھبرا کر رے میں تھا بیٹھا تھا۔

اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی جب انہو جان نے اسے فون پر یہ خبر سنائی تھی کہ اس کے پلا کو اس کا خورہ اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کر لیا براہیں لگا ہے۔

”تمہارے پیالے میں بے بات کی ہے زمین اور

خواتین ڈائجسٹ



ام مرم کے پاپا اپنے انجیل کام سے امریکہ آنے والے تھے کام چاہے انہیں نیویارک میں تھا مگر ظاہر ہے انہوں نے اپنی بیٹی سے ملنے ٹولاس انجیاس آجی تھا۔ کچھ دنوں بعد ام مرم ملے اسے یہ اطلاع دی گئی۔ وہ فون پر اپنے پاپا کو اس کے متعلق سیکھی دیا تھا۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ اس کے پاپا ایک روشن خیالی تھی جس میں سچہ بیٹی کی شادی اس کی پسند کی جگہ پر ہی کرنا چاہیں گے۔ آجی اس کے پاپا کے آنے میں کافی دن باقی تھے اور وہ ابھی سے ہی پر توں سا تھا کچھ خوف کچھ اندیشے بھی تھے دل میں اور سب سے امیدیں آرنڈ میں اور خواب بھی دل میں کیسے تھے۔ دن رات مرن مرن کر انتظار کر رہا تھا۔

جیسے ہی ام مرم نے اپنے پاپا کے امریکہ آنے کی بات سن کر مرن مرن کی اس نے جھٹ گھر فون کر کے اموجان کو یہ بات بتائی۔

"ٹھیک ہے بیٹا، وہ یہاں پہنچ جائیں پھر میں اور تمہارے پاپا اسے فوراً مرم سے ملنے لاس انجیاس آجی اس کے۔"

اس کی اموجان محبت سے گندھے لہجے میں بولی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ام مرم ان کے بیٹے کی زندگی کی سب سے بڑی آرنڈ ہے اس کی زندگی کا پہلا خواب۔

ام مرم اپنے چچا کے گھر رہتی تھیں۔ اس کے پاپا کو بھی آکر وہیں ٹھہرنا تھا اور وہیں ان دنوں فیملی کی ملاقات ہوتی تھی۔ شہیار خان اور اس کی اموجان اس انجیاس آجی تھے۔ وہ دن دنوں کو ام مرم کے گھر لے آیا تھا۔

وہ بے حد خوش تھا۔ اگرچہ دل میں یہ فیصلہ راج تھا کہ ام مرم اس کے مخور اور خوب پسند آیا۔ بہت پسند آئے کہ کہ وہ ان کے اعلیٰ ترین سہیاد کے عین مطابق تھی۔ مگر اس کی فیملی اس کے پاپا کو دھاک رہا تھا۔ ام مرم کے پاپا اور اس کی فیملی شہیار خان کے پاپا پر

کچھ تباہ تھا۔ اندر ہی اندر ایک خوف تھا بچانے پاپا کا کس کس طرح کا رد عمل ظاہر کرے۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا؟ وہ ام مرم کو کسی بھی طرح کا کوئی دکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شہیار خان کا رد عمل مخالفت میں ہوتا تب وہ کیا کرتا؟ اس نے نہیں سوچا تھا اور اب جب سب کچھ بالکل ٹھیک ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا تب اسے ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت بھی کہاں رہی تھی۔ زندگی پہلی بار اس کے ساتھ سب کچھ ویسا کر رہی تھی جیسا وہ چاہتا تھا۔ اسے پہلی بار زندگی پر بار آورہ تھا۔

بغیر بے پاپا اور اموجان تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتے ہیں مرم، وہ اس کے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیں ہوا بولا تھا۔

"ٹھیک ہے ذرا میں نے ابھی تک اپنے گھر میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانا ہے۔ میں اپنے پاپا سے بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔"

"وہ مان چائیں گے ناں مرم؟" اسے ایک نیا خوف لاحق ہوا تھا۔

"میں نے اپنے لیے اتنا پنڈ سم ڈھن اور چار رنگ لڑکا ڈھنڈا ہے۔ وہ کیوں نہیں مانیں گے زمین؟"

مرم اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ جواباً نہیں پرا تھا۔

"میں ایسا کچھ خاص پنڈ سم ہوں نہ زمین۔ تمہیں لگتا ہوں۔"

"تم جو ہو مجھے ویسے ہی لگتے ہو زمین، میں سب سے پہلی تمہاری طرف اٹک رہی اس لیے ہوئی تھی۔"

کیونکہ تم مجھے بہت پنڈ سم اور چار رنگ لگتے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا

رہا تھا۔ یہ تعریف کرتی تھی تو سب اچھا لگتا تھا۔ اس کی تعریفیں سن کر اب بھی کبھی اسے خودی شک سا

ہونے لگتا کہ شاید اب تک کی زندگی میں سکندر کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کرنے کی دھن میں وہ خود کو اندر

اسٹیمیت (under estimate) کر رہا تھا اور نہ اتنا عام سا بھی نہیں تھا وہ۔

پوری اتر جائے۔

وہ میرے کونامیت دیتے تھے مگر ساتھ ہی وہ اعلا حسب نسب کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس کے لیے بے معنی تھیں مگر اس نے ان سب کے بارے میں جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ام مریم کے آباؤ اجداد انڈیا میں کہاں سے تھے اور اس کے دادا پرور کیا کیا کرتے تھے اس میں اسے دلچسپی نہ ہو۔ مگر اس کے پاس کوہوتی تھی۔

اور زندگی اس پر واقعی مہیاں ہو چکی تھی۔ ام مریم کے پاس اس کا اعلا حسب نسب سب کچھ شہزاد خان کے اتنی معیار کے مطابق تھا۔ وہ بڑوں کے بیچ میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ باتوں باتوں میں شہزاد خان نے ام مریم کے والد کا پورا شجرہ نسب معلوم کر ڈالا تھا اور لب نہ بنے مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے اپنے ہم پلہ خاندان کی لڑکی کو چاہا ہے۔ اس نے باپ کی نگاہوں میں پسندیدگی بھیج دی تھی۔ اس کی امواجان مسکرا دیا وہ دبی تھیں مگر دم روی تھیں۔ جہاں شہزاد خان بول رہے ہوتے تھے وہاں وہ خاموش ہی رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں شہزاد خان سے اجازت لی تھی پھر اس کے بعد ام مریم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تھوڑی سی دیر بعد ام مریم ڈراؤنگ دم میں آئی تھی۔ اس کے والدین سے ملنے کے لیے اس نے شلوار قمیض اور دوپٹے پر مشتمل خوب صورت لباس زیب تن کیا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کی کوشش نہیں چلا رہا تھا۔ اس نے اپنی امواجان اور شہزاد خان کے چہروں پر پسندیدگی محسوس کی۔

یہاں آجائو بیٹا! امواجان نے پر شفقت انداز میں اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تھا۔ وہ اس کی امواجان کے برابر میں اور اس کے پیچھے کے عین مقابل بیٹھی تھی۔ ”کیا پڑھ رہی ہیں بیٹا آپ؟“ شہزاد خان نے قدرے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ ام مریم کے بولنے کا وہی انداز تھا جس سے وہ دلوں

کو مسحور کر لیا کرتی تھی۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں اس کے شکلوں کے انداز میں شہزادوں جیسی آگن بان اور نزاکت تھی۔ وہ مقابلوں کو اپنی شخصیت کے بحر میں لحوں میں گرفتار کر لینے والی اہلیت کی مالک تھی۔ اسے ام مریم پر غور کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے شہزاد خان اس سے گفتگو کرتے جا رہے تھے ویسے ویسے ان کے چہرے پر ام مریم کے لیے پسندیدگی برپا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے شوقی مشاغل، مستقبل کے ارادے، شہزاد خان ان سب کے متعلق اس سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ بول پر وہی سی مسکراہٹ لیے انہیں حیران کر رہی تھی۔

اتنی سی عمر میں وہ جو جو کچھ پڑھ چکی تھی اور جو جو اس نے حاصل کر لیا تھا اس سے شہزاد خان واضح طور پر متاثر نظر آ رہے تھے۔ جیسے وہ ام مریم کے بحر میں گرفتار ہوا تھا ایسے ہی وہ اپنے باپ کو بھی اس کے بحر میں جکڑا رہا تھا۔ اس کے خوابوں کی اس شہزادی نے اس کے باپ کا بھی بل مودیا تھا۔

شہزاد خان کو ام مریم بطور اپنی ہونے والی ہو کے دل و جان سے پسند آئی تھی۔ وہ آج صرف ام مریم کے والد سے ملاقات کرنے آئے تھے، باقاعدہ رشتہ مانگنے کا کوئی ارادہ آج کے لیے نہیں تھا، مگر ام مریم انہیں اتنی پسند آئی تھی کہ وہ اس مذہبی باقاعدہ رشتہ مانگنے بغیر نہیں سکے تھے۔

ان کے رشتہ مانگنے پر وہ بھی حیران تھا، ام مریم بھی حیران تھی اور اس کی امواجان بھی۔ گورہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی امواجان کو بھی ام مریم بہت اچھی لگی ہے۔ ”آہا“ فانا، ”سب کچھ ملے ہو گیا تھا۔ کیا کسی کو اس کی محبت اتنی آسانی سے بھی مل سکتی ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دونوں طرف کی فیصلہ نے اس کے اور ام مریم کے رشتے کو قبول کر لیا تھا۔

شہزاد خان کی خواہش تھی کہ ان دونوں کی بات، معنی کر دی جائے۔ زندگی سے اس کے سارے کچھ شکوے لحد بھر میں دور ہو گئے تھے۔ بارے خوشی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ ایک،

وہ جامد کی سے سر قریٰ میں بار کر رہا تھا۔
 "نہیں خریم کے پاپ کی برسوں صبح کی فلاسٹ ہے۔
 مریم مجھے بتا رہی تھی اس کی باؤں کالی بہار ہیں اور اس
 کے کیا کو نور انسان کے پاس جاتا ہے۔"

مریم نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی
 دلوں بے شک بیمار تھیں مگر ایسا کچھ نہیں ہو گیا تھا کہ
 برسوں صبح اگر اس کے بار آور نہ نہ ہوتے تو کوئی قیامت
 آجاتی۔ اگر وہ مریم سے کہتا تو اس کے پاپا کے لیے ایسا
 کوئی مسئلہ نہ تھا وہ تین چار دن بعد کی اپنی سیٹ تک
 کروا لیتے مگر جب وہ ایسا چاہتا ہی نہیں تھا تو کہتا کیوں؟
 اموجان چاہتی تھیں کہ ان کے گھر کی پہلی خوشی میں
 ان کے سارے گھر والے موجود ہوں۔ وہ تو تو بھائی
 ہیں۔ ایک بھائی کی خوشی ہو اور دو سرا بھائی موجود نہ ہو،
 ایسا کس طرح ہو سکتا تھا؟

شہیار خان تو ظاہر ہے اپنے دل، عمد کی موجودگی
 صرف اسی تقریب میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر محفل
 میں چاہتے تھے اس کے ہاں 'باب سکندر کی کسی
 محسوس کر رہے تھے مگر اسے اپنے بھائی کی کسی دلچسپی
 محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے نہ آنے پر زیادہ
 خوش تھا۔ اگر سکندر آجاتا تو اس کی خوشی بد مزاجی ہو
 جاتی۔

سکندر نے اسے کچھ ہی دن بعد فون کیا تھا۔ وہ خوش
 بھی ہو رہا تھا اسے مبارک باد بھی دے رہا تھا اور اس
 سے یہ ضرور بھی کر رہا تھا کہ وہ منشی کی تعزیت دینا
 روز آگے بڑھالے تاکہ وہ بھی اس میں شریک ہو
 سکے۔ وہ صاف گفتگو میں اس سے یہ نہ کہہ سکا تھا کہ
 اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی میں اسے اس کی
 موجودگی فلتا۔ درکار نہیں ہے اس نے غیر جذباتی اور
 پاپاوت سے لے میں ام مریم کے والد کے امریکہ میں
 مزید نہ رکھ سکے تھے کا جو ان پیش کر رہا تھا۔

"بہتر بھی بار کو شش نو گرو۔ کیا پتا وہ اپنی سیٹ آگے
 کروالیں۔ آخر کو ان کے ہونے والے، والد کے
 اکلوتے بھائی کی منگی میں شرکت کا سوال ہے۔ کیا
 زمین شہیار کے بھائی کی اہلیت کو کہتے ہیں؟"

ہندو ایک ہیڈ تھا اور وہ دن منشی کے لیے طے کر لیا گیا
 تھا۔ مبارک سے تقریب منعقد کی جانی تھی۔ ام مریم
 کے چٹائی کے گھر۔

اگلے روز اس کی اموجان منشی کی انگوٹھی خرید لائی
 تھیں اور ساتھ ہی کسی پاکستانی یا انڈین بونڈک سے
 امریم کے لیے منشی کا جوڑا بھی۔ وہ اور شہیار خان اس
 کے آپریشن پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ منشی کے بعد
 اسی رات ان دونوں کی واشنگٹن روانگی تھی اور اس
 سے آٹھ مہینہ مریم کے پاپا کی امریکہ سے واپسی تھی۔
 اس نے سکندر کو اپنی منشی کی اطلاع دینی ضروری
 نہ سمجھی تھی مگر شہیار خان اور اس کی اموجان نے
 اسے فون کر دیا تھا۔ ان دونوں نے اس سے منگی پر
 آنے کے لیے کہا تھا۔ دوویں بیٹھا خوشی خوشی اموجان
 کا ام مریم کے لیے لایا منگی کا جوڑا اور انگوٹھی دیکھ رہا
 تھا۔ شہیار خان کو سکندر کو فون ملا تو کچھ کراس کے منہ
 کھڑا ٹھرا ہوا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی اس سب
 سے بڑی خوشی کے موقع پر سکندر کی بالکل بھی
 ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اپنی خوشی میں اس کی
 موجودگی اور اس کی شمولیت ہی نہیں چاہتا تھا۔
 "اوہ اتھارا چہرے۔ ہاں میں بالکل بھول گیا تھا
 نکل فونمدا باہر ہو گا۔"

اس نے شہیار خان کو فون پر پوچھ لیا۔ سکندر کے
 آئینہ مزاج سے تھے اس کا آٹا مشکل تھا۔ اس نے
 لڑائیت محسوس کی تھی۔
 "ڈسٹ آگے بڑھالیں؟ مشکل لگتا رہا ہے سکندر!
 اتھار میں پوچھتا ہوں۔"

شہیار خان نے فون پر ہنسکو ختم کی تو اموجان نے
 اس سے پوچھا تھا۔
 "کیا کہہ رہا ہے سکندر؟"

"کہہ رہا ہے منشی دو تین دن آگے بڑھالیں۔ کل
 ان کا پیپر ہے۔ فور پرسوں بھی کوئی
 Presentation دیوے۔"

"سکندر کے بغیر تو بالکل مزا نہیں آئے گا۔" ام
 جی بنیدگی سے بولی تھیں۔

آگے کر دیا ہی نہیں۔

وہ شخص جو شریر لہجے میں بولا تھا۔

”بہت مشکل ہے سکندر! انہیں فوری دوا نہیں چاہا ہے۔“
”متنقی کا دلنا آگے نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ

بے ہمت اور خشک سے لہجے میں بولا۔

”اچھا۔“ اس کے سپاہی اور دو نوک اڑکارنے سکندر کو بوس کیا تھا۔ اس کے آہستہ آواز میں بولے ”اچھا“ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے زین! میں موجود نہیں بھی ہوا نہیں بھی میری دعا میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ میری ہونے والی بہا بھی کو میرا سلام کہتا اور یہ بھی کہنا کہ مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے اور بہت جلد میں ان سے ملوں گا۔“

سکندر نے خوش سا ہو کر یوں بول رہا تھا جسے اس کی متنقی پر بہت خوش ہو۔ اسے سکندر کی خوشی مصنوعی اور بنائی ٹنگ رہی تھی۔ زندگی میں ہمیشہ ہر چیز اس نے پیلے حاصل کی تھی اور زین نے بعد میں۔ یہاں وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اس سے پیچھے رہ جانے پر خوش کیونکر ہو سکتا تھا؟ ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی اور اس کے بھائی کی متنقی ہوئے جا رہی تھی وہ بھی اتنی حسین اور بے مثال لڑکی کے ساتھ۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ سکندر دل سے اس کے لیے خوش ہوتا۔

اس کی متنقی کا دلنا اس کے اور ام مرم دونوں کے لیے بے حد یادگاروں تھا۔ ام مرم اس کی اموجان کا لایا جو ڈائری مشین لائڈر کی دامن کا روپ اپنانے کے لیے بنا۔ حسین لگ رہی تھی۔ وہ خود کو زمین پر نہیں اٹھیں آسمانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ام مرم کو اپنے ہاتھوں سے متنقی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے ہاتھ اور اموجان نے اسے راجہ کا پیش قیمت سیٹ چھ میں دیا تھا۔ اس کے لیے ہاتھ سے ہمارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ آج کے بعد اسے زندگی سے بھی کوئی شکایت ملنا نہ رہی تھی۔

اس کے پاپا اور اموجان پر وگرام کے مطابق اس کے بعد کسی رات وہ اشکین دانیس روانہ ہو گئے تھے۔ اگلی صبح ام مرم کے پاپا بھی واپس ملے گئے تھے۔ وہی زندگی تھی۔ وہی کہیں کی بھاگ دوڑ و نواز برصائی کی مصروفیت مگر پھر بھی لب سب کچھ بدلا ہوا لگتا تھا۔ وہ اور ام مرم اب پہلے سے بھی زیادہ وقت ساتھ گزارا کرتے تھے۔ اب ان کے رشتے کو ایک نام مل چکا تھا۔ بزرگوں کی دشمنی مل چکی تھی۔ اب کہیں کوئی خوف کوئی اندیشہ نہ تھے۔

کرسمس کی چٹیاں آنے والی تھیں۔ چٹیوں کے لیے کچھ خاص پلان نہیں کیا تھا اس نے۔ اس روز اموجان کا اس کے پاس فون آیا تھا۔

”تمہارے پاپا کا پیغام ہے تمہارے اور مرم کے لیے۔“ سلام دعا کے بعد انہوں نے کہتے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

”کیا اموجان؟“ اس نے محسوس کیا تھا ام مرم جیسی بے مثال اور شاندار لڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد سے وہ ہاپ کی لگا ہوں میں تھوڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ساری زندگی اسے نظر انداز کرتے رہنے کے بعد انہیں اب کہیں جا کر یہ یقین آیا ہے کہ وہ انہیں کا بیٹا ہے انہی کی طرح اعلیٰ مہار رکھنے والا انہی کی طرح بہتر نہیں بلکہ بہتر ان کا انتخاب کر لے والا۔

”انہوں نے مجھ سے کہا ہے میں کرسمس کی چٹیوں میں ام مرم کو گھر انوائٹ کروں تاکہ وہ جہاں آ کر ہمارے دین سمجھ سکیں اور طور طریقوں کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکیں۔ تم چٹیوں میں اسے لے کر آ جاؤ بیٹا!“

”واقعی بیٹا نے ایسا کہا ہے اموجان؟“ اسے حیرت سی حیرت تھی۔ اس کے مغرور پاپا اور کسی کو اس طرح الوائٹ کریں؟

”ہاں زین! ان کی خواہش ہے یہ چٹیاں منام۔“

خواتین ڈائجسٹ نومبر 2011

”ٹھیک ہے! مہربان! ہم دونوں ضرور آئیں گے“
بعد ازاں ہمارا کافی کامیاب سفر میں خود بخود گئی۔

لیزہ ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ جی کرے سے چل
گئی تھیں۔ لیزہ اس کے لیے پلیٹ میں کھانا ڈال رہی
تھی۔

”مینی نے پاکستانی کھانے بنائے ہیں تمہارے
لیے۔“

وہ اس کے لیے پلیٹ میں بخنی پلاؤ ڈالتے ہوئے
بولی تھی۔ وہ جواباً بالکل چپ رہا تھا۔ اس کی سوجھ بچھ
ابھی بھی ایک دھشت سی ظاہری تھی۔ اسے کچھ بھی
اجنبات نہیں لگ رہا تھا۔ لیزہ کا اپنی پروا کرنا خیال رکھنے
والا انداز بھی اس وقت اسے اجنبات نہیں لگ رہا تھا۔

”بس غور منٹ ڈالو۔“ سنجیدگی سے بولتے ہوئے
اس نے اسے اپنی پلیٹ میں مزید کوئی بھی چیز ڈالنے
سے روک دیا تھا۔

وہ خاموشی سے پلاؤ کھانے لگا تھا۔ کسی بھی طرح کا
ذائقہ اور خوشبو محسوس کیے اس نے تین چار منٹ
میں اپنی پلیٹ ختم کر دی تھی۔ وہ حالاً پلیٹ کے ایسے ٹرے
میں رکھ رہا تھا جتنے لیزہ نے تو ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”بس میں کھا چکا۔“

”کوئی وجہ تھی ساری پاکستانی ڈشز مینی نے بنائی ہیں
یہ کون کھائے گا؟“ وہ کچھ خشکی اور کچھ اصرار سے بولی
تھی۔

”تھوڑا سا تو رو لو ناں؟“

اس نے بغور لیزہ کی طرف دیکھا۔ ”تم اپنے سب
جاننے والوں کی بہت پروا کرتی ہو، ان کا بہت خیال
رکھتی ہو، ان کے ساتھ بڑی نیکیاں کرتی ہو، یہ تم پہلے
ہی مجھ پر ثابت کر چکی ہو لیزہ! مزید کچھ ثابت کرنے کی
ضرورت نہیں ہے۔“

وہ بری طرح زبرد کر رہا تھا۔ لیزہ کے ساتھ کبھی تلخ
نہیں ہو گا، کبھی کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کرے
گا وہ لمحہ بھر میں خود سے کیے سارے عہد و بیان بھول
گیا تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ نیکیاں کرتی ہے تو کرے
مگر اس پر ہلکا سا کیوں اپنے احسان رکھ رہی ہے۔

لیزہ کی نیکیاں نے ان دونوں کا کھانا انہیں کمرے میں
دبے دیا تھا۔

”اور کچھ تو نہیں چاہیے؟“ انہوں نے لیزہ سے
پوچھا تھا جو اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھی
تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔

”نہیں مینی! بس اب آپ آرام لیجئے۔ کھانے کے
بعد اکر ہمارا کافی کامیاب سفر میں خود بخود گئی۔

اس نے ام مریم سے پوچھنے پر ہی ہائی بھولی تھی۔
اس کی محبت پر ایسا بھروسہ اور یقین تھا تھا وہ اس
کی کسی بھی خواہش کو کبھی مدد نہیں کرے گی اور سارا تو
جانتا بھی اسے اپنی ہونے والی سسرال میں تھا۔ اپنی
سسرال تو وہ بعد خرق چاہتا ہے۔

اور اس کا یہ یقین سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔
ام مریم نے اس کی بات سنتے ہی بڑی خوشی اور گرم جوشی کا
اظہار کیا تھا۔

”ہاں! میں چلوں گی۔ انگل نے اتنے پیار سے بلایا
ہے میں کیوں نہیں جاؤں گی؟“

”وہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ اس کے گھر جانے کے لیے
بڑی بر جوش تھی۔

جیسے ہی چھپڑیاں شروع ہوئیں اس نے اسی روز
ام مریم کو ساتھ لے کر واشنگٹن کے لیے رخت سفر باندھا
وہ ام مریم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے وہ بے حد خوش
تھا۔ ام مریم بھی اپنی سسرال جانے پر بہت خوش تھی۔

اس کے ساس سسر نے اسے دل و جان سے ہوا ملٹ کیا
تھا وہ خوش کیوں نہ ہوتی؟

مگر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا
اس بار اپنے گھر جانے پر اس کی زندگی میں کیا قیامت
آجائے والی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کی عمر
بے حد مختصر تھی۔ وہ واشنگٹن اپنے گھر خوشیاں منانے
نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنی خوشیوں کو ختم ہوا، مگر تاورفتا
ہو جاتا دیکھنے کے لیے جا رہا تھا۔

لیزہ کی نیکیاں نے ان دونوں کا کھانا انہیں کمرے میں
دبے دیا تھا۔

”اور کچھ تو نہیں چاہیے؟“ انہوں نے لیزہ سے
پوچھا تھا جو اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھی
تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔

”نہیں مینی! بس اب آپ آرام لیجئے۔ کھانے کے
بعد اکر ہمارا کافی کامیاب سفر میں خود بخود گئی۔

اس نے ام مریم سے پوچھنے پر ہی ہائی بھولی تھی۔
اس کی محبت پر ایسا بھروسہ اور یقین تھا تھا وہ اس
کی کسی بھی خواہش کو کبھی مدد نہیں کرے گی اور سارا تو
جانتا بھی اسے اپنی ہونے والی سسرال میں تھا۔ اپنی
سسرال تو وہ بعد خرق چاہتا ہے۔

اور اس کا یہ یقین سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔
ام مریم نے اس کی بات سنتے ہی بڑی خوشی اور گرم جوشی کا
اظہار کیا تھا۔

”ہاں! میں چلوں گی۔ انگل نے اتنے پیار سے بلایا
ہے میں کیوں نہیں جاؤں گی؟“

”وہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ اس کے گھر جانے کے لیے
بڑی بر جوش تھی۔

جیسے ہی چھپڑیاں شروع ہوئیں اس نے اسی روز
ام مریم کو ساتھ لے کر واشنگٹن کے لیے رخت سفر باندھا
وہ ام مریم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے وہ بے حد خوش
تھا۔ ام مریم بھی اپنی سسرال جانے پر بہت خوش تھی۔

اس کے ساس سسر نے اسے دل و جان سے ہوا ملٹ کیا
تھا وہ خوش کیوں نہ ہوتی؟

خواتین ڈائجسٹ دسمبر 2011

یہ بچہ کون ہے؟ لفظی حملہ بول کر اسے جواب دے رہی تھی۔
 ”کہاں ہے تمہارا اسٹوڈیو؟“
 ”اوپر۔“
 ”مجھے دکھاؤ گی؟“
 ”دیکھ لیتا۔“
 ”کب؟“

”جب تمہارا دل چاہے۔“ وہ ایک کے بعد ایک سوال کر رہا تھا اور وہ آخر اس کے طرف دیکھنے سیٹ سے انداز میں جواب دے رہی تھی۔ گواہ اس سے بہت سنجیدگی سے تاراض تھی۔

”اور تم مجھے پیٹ کب کرو گی؟“ اس لڑکی کے چہرے پر اس کی ذہنی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھنے کی ایسی شدید خواہش ابھری تھی اس کے دل میں کہ بے اختیار وہ بوجھ بیٹھا تھا۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ اعلیٰ نے نیازی اور ناراضی کا اثر لمحہ بھر میں لیزا کے چہرے سے غائب ہوا تھا۔ ایک لمبے لمبے لیے تو اس نے اس حیران ہو کر دیکھا تھا کہ مسکرا رہا تھا اس کی طرف نرمی سے دلچسپ رہا تھا۔

”سکندر کی راتنی؟ کیا ترجیح میں۔“

اس کی یہ مخصوص مسکراہٹ اس کے لبوں پر واپس آچکی تھی۔ یہ خوشی اور حیرانی سے تھک چکا ہے۔
 ”اے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”کیا میرے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لیے تم ایسا کر رہے ہو؟“

وہ ایک دم ہی ہل کر فوری ہوئی تھی۔ اس نے یہ الفاظ بولے اور ایک سے گویا اسے سکندر کے ان انگلیوں سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔

”تمہارے خلوص اور تمہاری اپنائیت کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا لیزا! دیکھنا چاہتا بھی نہیں ہوں۔“

وہ بہت سنجائی سے بول رہا تھا۔ وہ اپنے دلی جذبات اور سوچیں کچھ بھی چھپانے کی کوشش کیے بغیر اس وقت اس سے بات کر رہا تھا۔

”اوتارنا خیال رکھنا چاہیے۔“
 ناراضی سے بولتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی ڈالا تھا۔ اب وہ میڈیٹ اور سید بول نکال رہی تھی۔
 ”اوتارنا؟“ اس کے ہاتھ پر دھری۔ اس نے بغیر کچھ کے اوتارنا سے گفتگو کی۔

”تم نے مزہم لگایا؟“ وہ بغیر اس کے بازوؤں کے زخم دیکھ رہی تھی۔ آج ہسپتال سے زچا جہ ہونے سے قبل ڈاکٹر نے اس کے بازوؤں پر سے جینڈین اتار دی تھی۔ اسے زخم پر لگانے کے لیے مزہم لگایا تھا۔

اس کے ایک بازو پر کئی سے لے کر کافی سکندرا زیادہ گہرا زخم تھا جبکہ دوسرے پر معمولی نوعیت کی جوت تھی۔ اس نے پھر میں سر ہلایا تھا۔ لیٹر اینڈ کے ساتھ رکھی اس کرسی پر فوراً بیٹھ گئی تھی جس پر بیٹھ کر کچھ دیر قبل وہ اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

اس نے بغیر کچھ کے مزہم کی شرب ہاتھ میں اٹھائی تھی۔ وہ اس کا بازو ہاتھ میں لے کر اس کے زخم پر بہت آہستگی اور نرمی سے مزہم لگا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی اس کے چہرے پر سنجیدگی اور تاراضی تھی۔ وہ بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم ابھی تک جاگ رہی تھیں؟“

لیزانا نے صرف سر ہلایا تھا۔

”کچھ پیٹ کر رہی تھیں؟“ اس نے پھر سر ہلایا تھا۔

”کیا؟“

”ایک لینڈ اسکیپ۔“ وہ اس کے سوالوں کے مختصر ترین اور نوویڈیو انٹ جواب دے رہی تھی۔ وہ ایک بازو پر مزہم لگا چکی تو اس نے خود ہی اپنا دوسرا بازو بھی اس کے آگے کر دیا۔

”تمہارا اسٹوڈیو کونسا تھو؟ اسٹوڈیو ہے؟ میں نے سنا ہے آرٹسٹ لوگ اپنے گھروں میں اپنا ایک پراپرٹم کا اسٹوڈیو ضرور رکھتے ہیں۔“

اس کے طویل سوال کے جواب میں لیزا نے محض سر ہلایا تھا۔ وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں ابالات کر رہا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سر ہلایا تھا۔

خواجہ زکریا

دل کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔
وہ بہت سنجیدگی اور آہستگی سے بول تھی۔ وہ اس
چپ رہا تھا۔ لیکن اس کے سے چلی گئی تھی۔



صبح ہو گئی تھی۔ اسے دالے کر بھی رات بھر نہ
نہیں آئی تھی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ اس
رات بھر میں کافی تکلیف بھی رہی تھی۔ وہ دروازہ
نظر انداز کر رہا تھا۔ ساری رات جاگ کر صبح ہوئے
انتظار کیا تھا۔ اسے ہسپتال میں اسی سکون تو دروازے
ساتھ رات میں اور پھر دہریس بھی اتنی گہری نیند کس
طرح آگئی تھی کل نیند آگئی تھی تو آج بھی کل چاہیے
تھی۔

وہ بیساکھی کے سہارے اٹھ کر ہاتھ دھو گیا تھا۔
بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوئے اور منہ ہاتھ
دھونے میں قدرے وقت کا سامنا تھا مگر اپنی جینوں
تکلیفوں اور زخموں کی اس نے پہلے پروا کب کی تھی جو
اب کر رہا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو لیزا اس کے سامنے
کھڑی تھی۔

"گڈ مرننگ!" وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ "آج
سوری ایس بغیر اجازت اندر آجی۔ دراصل میں کافی دیر
سے دروازہ ٹاک کر رہی تھی مگر نے کوئی جواب نہیں
دیا تو مجھے فکر ہوئی۔"

"تم سوئی نہیں؟" وہ بیساکھی کے سہارے والیں
ہینڈ کی طرف چلنے لگا۔ لیزا جلدی سے اسے سہارا
دینے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ وہ کل کے مقابلے میں
تیز قدم اٹھا کر ہینڈ تک اس کی ہینڈ کے بغیر ہی پہنچ گیا
تھا۔ لیزا نے اسے ہینڈ پر بیٹھنے میں مدد کی تھی۔ اسے
کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ منع کر کے اس کا ہاتھ نہیں
توڑنا چاہتا تھا۔ وہ ہینڈ پر ٹانگیں سیٹھی پھیلا کر بیٹھ گیا
تھا۔

"تھوڑی دیر سو گئی تھی۔ میرا سونا جاکر تو بس ایسا
ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ناشتہ کر کے پھر سے سو جاتی ہے۔
بیساکھی کل دن میں لیٹ جاتی ہوں۔" وہ مسکراتی رہا۔

"پھر؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"میری آرٹس دوست لیزا محمود کی اگر یہ خواہش
ہے کہ وہ میرا چروہینٹ کرے تو میں چاہتا ہوں وہ اسے
واپس جانے سے قبل اس کی یہ خواہش ضرور پوری کر
کے جاؤں۔"

وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا تھا۔ وہ اس کے
دوسرے ہاتھ پر بھی مہر لگا چکی تھی جب بے حد خوش
نظر آ رہی تھی۔

"توہ مانی ہوگا! مجھے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ اسکا
تم جیسا سہارا مجھے اپنا چروہینٹ کرنے کی اجازت دے
رہا ہے۔ میرے خدایا! ایس یہ خواب تو نہیں۔"

"لیزا محمود! میرے بارے میں اپنے یہ غیباں لسانی
الفاظ آپ والیں مجھے۔" وہ اس کی سی ٹون میں جھنجھکی
سے بولا۔

"سہارا کو سہارا ہی کہوں گی نا۔ سہارا بدترین
بد اخلاق ہے۔ موت سکندر شہزاد صاحب نے مجھے
اپنی ہینڈنگ بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ خدایا اگر
یہ خواب ہے تو میں اس سے جاؤں نہ۔"

وہ اپنے لیے اسے شاندار القاب سن کر تھوہر لگا کر
ہنس رہا تھا۔ لیزا بھی ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی دیکھ کر
اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ
تاراض تھی، ہنس نہیں رہی تھی تب ہاتھ اچھا نہیں
لگ رہا تھا۔

رات کافی ہو رہی تھی۔ وہ اسے سونے کا کتہہ پڑھاتی
وہاں سے اٹھ کر ہانے لگی تھی۔ اس نے لائٹ دوبارہ
بف کر دی تھی۔

"میں جاگ رہی ہوں سکندر! اسلو پو میں کام کر
رہی ہوں، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے بتا دیتا۔"
وہ وہاں سے جانے کے لیے پلٹی تھی۔ مگر پلٹے پلٹے
جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"نہ خیرے اپنی دوست سمجھتے ہو سکندر! میں اپنے
دوست سکندر شہزاد کا خیال رکھ رہی ہوں اس کی پروا
کر رہی ہوں غلوں اور اپنا حیثیت کے ساتھ۔ پھر سے
احسان اور نیکی کے لفظ میرے لیے مت بولنا سکندر!



بہنوں کا اپنا ہنسنا
لاہور

☆ ”کی جاناں میں کون؟“ کدوئل ریاض کا مکمل دہل،

☆ ”تم ہونے ہمسفر“ غلک ازم زاہد کا مکمل دہل،

☆ ”محبوب میں حساب کیسا“ وحیدہ تبسم

☆ ”نیری زاد طنب میر تقی“ لہذا عامر کا دہل،

☆ ”خوشی کے سارے حسین احمد صاحبہ کی رت لہر میں سنا مار

☆ ”وہ ستارہ صبح امید کا“ خوزیہ غزال کا میلے دار دہل،

☆ ”تم آخری جزیرہ ہو“ ام کلثوم کا میلے دار دہل،

☆ ”وہ ستارہ صبح امید کا“ خوزیہ غزال کا میلے دار دہل،

چاندنی کی باتیں ماہنامہ تابانہ اندرون شہر
کوہ نیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ جا
کے سہی سہی شاعریاں ہیں

”تجلی سے میں بول کر آئی ہوں۔ وہ ہلکتا رہا رہی
تجلی۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے لوڑی فی شرٹ
جنیز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں کو کچھ میں لپیٹا
ہوا تھا۔ وہ دھلتے ہوئے منہ کے ساتھ بھی اتنی ہی
یاری لگ رہی تھی جتنی میک اپ کے ساتھ لگا کر لی
تھی۔

”رات بھر میں تمہارا ارادہ بدلا تو نہیں تھا؟“ وہ
کس حوالے سے یہ سوال پوچھ رہی تھی وہ جانتا تھا۔
”نہیں۔“ وہ جواباً ”سٹر کیا تھا۔“ ”تم سے پیٹنگ

بنوائے بغیر میں رہا ہے واپس نہیں جاؤں گا۔ اس یہ جو
ایک سیٹ نہت کی وجہ سے تھوڑا میرا آفس کے کاسوں کا
خرج ہوا ہے، مجھے وہ کام نمٹا لینے دو، پھر ایک دن پورا
تمہارے نام ہوگا۔ تم تکی سے اپنی پیٹنگ بنانا۔“

وہ زندگی کے چند مختصر سے دن پہلے گزار کر واپس
چلا جائے گا۔ ایک بار یہاں سے گیا تو زندگی میں اس
لڑکی سے وہ بارہ کبھی ملے گا بھی نہیں ہو لہذا چاہے گا ہی
نہیں۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ زندگی کے یہ چند دن
اس لڑکی کے غلوں اور زندگی کا جواب غلوں اور
وہ کتنی ہی سے ہوتے۔

کچھ دنوں کے لیے ملی اس یاری لڑکی کا ساتھ
پر بیس میں اسے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ
اپنی دونوں ہنس بھی رہا ہے باتیں بھی کر رہا ہے کسی کسی
پل خود کو زندہ بھی محسوس کرتے لگتا ہے وہ بھی بغیر کسی
احساس جرم کے۔ اس نے لیزا کے حسین چہرے کی
طرف بغور دیکھا تھا۔ یہ لڑکی اس کے بارے میں کچھ
بھی نہیں جانتی تھی کیسے تو یہ اسے ملاستی لگا ہوں
سے دیکھتی ہے نہ مل میں یہ سوچتی ہے کہ سکتا ہو
شہر بار بڑا ڈھنڈ اور بے غیرت آدمی ہے۔ اسے کوئی
حق نہیں ہے زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے
کرنے کا، سٹر ان کے کاغذوں پر ہونے کا۔

یہ زندگی سے بھرپور لڑکی اس کے بارے میں کچھ
بھی نہیں جانتی اور اسے اس کا اپنے بارے میں کچھ

نوامین ڈائجسٹ 2011

”کچھ خاص دُش کھانے کا بل چاہ رہا ہے تو جلد۔
نئی کھانے بہت مزے کے ہائی ہیں چاہے وہ پاکستانی
ہوں چاہے انگلینڈ یا چین۔“

ابھی وہ جواب ”کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ اس کے
موبائل پر کل آنے لگی۔ موبائل اٹھانے کے لیے
اسے اپنی جگہ سے تھوڑا ہٹنا پڑا تاہم لڑنے فوراً ہی اسے
موبائل اٹھا کر دے دیا تھا۔ موبائل پر چلتے نام کو دیکھ کر
اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ وہ یہ کل لیزا کے
سامنے ریسیو سس کرنا چاہتا تھا۔

یہ ڈاکٹر آمنہ شہیار خان کی کل تھی اس کی امو
جان۔ مال سے بات کرتے ہوئے جس طرح کے
جذبات اس کے چہرے پر آجائے تھے وہ انہیں لیزا کے
سامنے عیاں کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا مگر لیزا
جیسے اس کے بغیر کے ہی یہ بات سمجھ گئی تھی کہ وہ اس
کل کو ریسیو کرنے کے لیے تھکی چاہتا ہے سو فوراً ہی
کر رہی رہے اٹھ گئی۔

”تم کل ریسیو کر۔ میں نئی کو کھانے کا کہہ دوں۔“

لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی نئی
ریسیو کی تھی۔

”السلام علیکم امو جان!“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا مگر
اس سنجیدگی میں بھی اس میں بہت سے جذبات شائ
تھے۔

”جو علیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر؟“ ہمیشہ کی طرح
ان کا لہجہ نرم اور مہربان تھا۔ وہ بیٹے کی جدائی سے باخبر
ہیں یہ تاثر کیا غم میں ڈوبا انداز تھا ان کا۔ اس کے
چہرے پر دکھ اور کرب ابھر آیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں امو جان!“ اپنے انکسپلر
کے متعلق انہیں کچھ بھی بتانے بغیر اس نے آنکھوں
سے اپنی فیرت سے متعلق اطمینان دلایا تھا۔

”ابھی دوسری میں ہو؟“

”جی امو جان!“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

”اب اس کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ کلمہ

بج رہے ہو کہ نہیں؟ ہر طرف تمہاری

نہی نہ باننا برا بھلا لوگ رہا تھا۔ پریسیوں سے ملنے کا یہی
توقاعہ ہوتا ہے۔ آپ ان سے جو کب نہیں ہیں تو دین
کر مل سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ اپنے بارے میں چھپا لیتا
چاہتے ہیں باآسانی بچھا لیتے ہیں۔“

اس نے سوچ لیا تھا۔ لیزا بھی کے مشورے پر عمل
کر رہا تھا۔ اپنے باقی دنوں کو دین بانی ڈیزیز
کی طرح یہ یاد رکھے بغیر گزارے گا کہ وہ
سکندر شہیار زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح جینے کا کوئی
حق نہیں رکھتا کہ وہ تو کب کام چکا ہے۔ سنگسار کیا جا چکا
ہے۔ مختصر اور پرچہ حیا جا چکا ہے۔



بٹشے کے بعد وہ بیڑی پر اپنا لپ ٹاپ لے کر بیٹھ
گیا تھا۔ وہ دروازہ تکلیف کو خاطر میں لائے بغیر آفس
کا کام کر رہا تھا۔ لیزا نے کہا تھا انہیں شام چار بجے
ہسپتال جانا تھا۔ وہاں ڈاکٹر کے تفصیلی معائنہ اور جیرکی
پینڈنگ ڈیو کی تبدیلی میں نچائے کتا وقت لگتا تھا اسی
لئے وہ چاہتا تھا آج آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے جو
زیادہ اہم اور فوری کیے جانے والے کام ہیں وہ نفا کر
واکھ منٹس آفس ہی میں کر دے۔ لیزا اتنے کے بعد
اسے یاد اور اس کا لپ ٹاپ دے کر کمرے سے چلی
گئی تھی۔ اسے دقتاً ”توقا“ باہر سے لیزا اور اس کی نئی
کے چہرے بچھنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی
تھیں۔

”لیزا رنج میں کیا باتیں؟“ اس نے نئی کی آواز سنی۔
جواب میں لیزا کی آواز آئی تھی۔

”میں سکندر سے پوچھ رہی ہوں نئی؟“ فوراً ہی
کمرے کا دروازہ ہلکے سے چھتیا کر لیزا اندر آئی تھی۔
”جو دُش نہیں پسند ہے وہی ہوا لوہ میں بھی وہی
کھائیں؟“

وہ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولا تھا۔ وہ بولا
”ابھی“

”نہی نہ باننا برا بھلا لوگ رہا تھا۔ پریسیوں سے ملنے کا یہی
توقاعہ ہوتا ہے۔ آپ ان سے جو کب نہیں ہیں تو دین
کر مل سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ اپنے بارے میں چھپا لیتا
چاہتے ہیں باآسانی بچھا لیتے ہیں۔“

”ابھی دوسری میں ہو؟“

”جی امو جان!“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

”اب اس کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ کلمہ
بج رہے ہو کہ نہیں؟ ہر طرف تمہاری

اپنی کونگولیوں سے بے تداوز و گرہ تھے۔ وہ دور کو دور اور تکلیف کی انتہاؤں پر محسوس کرتا بالکل خاموش تھا۔ اس کی اپنی ماں سے بیٹہ ایسی ہی بات ہوتی تھی۔ چند مغلوں کی مختصر سی بات، بس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے وہ بھی کبھی نہیں کہہ پاتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

”محب اپنا خیال تو رکھ رہی ہیں ٹاں اموجان!“

میٹھنسن کی چھوٹی تو نہیں تھی؟
”ہاں بیٹا میں اپنا خیال رکھ رہی ہوں۔ تم بھی اپنا خیال رکھ رہے ہو کہ نہیں؟“ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھیں۔ وہ اب اسی نرم اور محبت بھریے لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

”آپ میری بالکل فکر نہ کریں اموجان! میں اٹلی آ کر نو کچھ زیادہ ہی کھاتی رہا ہوں۔ خلی آفس کے بعد کا سارا ٹائم میں نے روم گھومتے ہوئے گزارا تھا۔ آج بھی آفس کے بعد کا ٹائم روم کی مسز میں تم ہو کر گھومتے پھرتے ہوئے گزاروں گا۔“

وہ ہنسنے مسکرا کر انداز میں جھوٹ پر تھوٹ بولنا بانی کو اپنی زندگی کے بہت ٹارڈل اور بہت خوشگوار ہونے کا یقین دلایا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔“

”محب بھی اپنا خیال رکھیے گا اموجان! اللہ حافظ۔“

اس نے مسکرا کر بولتے ہوئے فون بند کیا تھا۔ فون بند کرتے ہی اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کی سطح پر محسوس ہوتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو چھو اتو آنکھ سے گرنا آنسو اس کے ہاتھ پر ڈگر ٹھہر گیا تھا۔

(بالی آئینہ ماوان شاء اللہ)

ہسٹری بکھری ہو گئی۔ روم میں۔۔۔ وہ کھینچی سے بولی تھیں۔ وہ جواباً اڑھائی سے مسکرایا تھا۔ وہ انہیں یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ ہسٹری آرٹ لٹریچر اب اسے کوئی چیز محسوس نہیں کرتی۔ جس سکندر کو وہ جانتی تھیں وہ اسبند سکندر نہیں ہے۔

”جی اگلی گوم پھر رہا ہوں۔“ وہ کعبے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہا ہوا تھا۔

”پتا ہے سکندر! ٹیڈی کے وہ بارہ بعد میں اور تمہارے پیا اٹلی اسپین اور فرانس گھومنے گئے تھے۔ ہم روم ہی میں تھے جب مجھے یہ خوش خبری ملی تھی کہ میں وہ بیٹھنے والی ہوں۔ تم میری زندگی میں آنے والے ہو۔“

تھیا اس کا اپنے ماں باپ کی زندگی میں آنا خوش خبری تھا؟ اس کے دل میں ایک ہوبک سی اٹھی تھی۔ ”شاید اسی لیے وہ ان کے ساتھ فیمنیٹ کرنا ہے اسو جان!“

اپنے دل میں بکھرتے ورد کو نظر انداز کر کے وہ مسکرا کر بولا تھا۔ آئندہ جیسے عمروں میں، بسکی تھیں۔ اسے بہت سی چیزوں اور بہت سی باتوں کے لیے قصور وار ماننے کے باوجود کم کی بات نے اس سے محبت کرنا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے دل کے زخم جیسے بھرتے لگے ہو رہے تھے۔ وہ اپنے زخموں کو شعلوں کی لپیٹ میں پارہا تھا۔ ہوں لگ رہا تھا جیسے کانٹوں پر فسیلا جا رہا ہے۔

”چٹیاں ملیں تو کھر آؤ ٹاں بیٹا!“ ایک وہ بھڑکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری جیسے خود پر بھی نہیں بلکہ اپنی ماں کی بے بسی پر اسے ترس آیا ہو۔

”جی اموجان! امون ملو آؤں گا۔“ وہ کھل کر کہاں کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ وہ بھی جانتی ہیں کہ وہ وہاں بھی نہیں آئے گا اور وہ وعدہ کر لے والا بھی چاہتا ہے کہ اس نے وہاں کبھی نہیں جانا پھر لفظوں سے یہ بات کسی جانی دل دکھانا جانا ضروری تو نہیں؟ یہ اب میں آئندہ بالکل چپ ہو گئی تھیں۔ وہ کہہ بھی نہیں بولی تھیں۔ وہ ان کا بیٹا تھا ان کے وجود کا حصہ کیسے نہ جان پناہ بات کہ وہ اس وقت رورہی تھیں۔

خواتین ڈائجسٹ دسمبر 2011

لیزا ایک عورت ہے۔ سکندر کی مکمل مشابہت شخصیت اور اس کے جیسے معذور انتہی خوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ اس کو پتہ نہیں چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کر دیتا ہے۔

ایک دو ہفتہ قبل ملاقاتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہو جاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکثر معذور انداز ہے۔ لیزا کا رد میں اپنا ایسا رخصت ہے جو کہ اس کے باپ نے اسے خرید کر دیا ہے۔ جہاں وہ نئی کے ساتھ رہتی ہے۔ سکندر کو کنیز میں ایک میٹنگ ایڈیٹور کی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی تھیں کسی ہوئی کی بنا پر اسے مجبوراً لیزا کی نگاہ میں رہنا پڑتا ہے۔ لیزا اس کو کہتی ہے کہ لیزا اس سے اور واپس بھی ملاتی ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک معنی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اور تھے اور بیٹی لیزا اور سیم کی بدنامی بھی اس کو نہ بدل سکی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

لیزا اور لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ سیم زبانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین۔ اور بے حد ذہین۔ جبکہ لیزا اپنی ماں پر بھی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور دو مہینہ درجہ کی تھی۔ والدین کی طبیعت کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو لیزا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

آئی زین کی منگنی ام مریم کے ساتھ ہو گئی۔ ام مریم چھٹیاں گزارنے کے لیے زین کے ساتھ شہر پارخان کے گھر آئی۔ سکندر نے اس کے گھر تھا، جہاں لیزا اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی ایک رات وہ سوچاں کا فون آیا۔ سکندر ان سے بات کر کے مست و سرخ ہو گیا تھا۔

۴ چوتھی قسط

ہاتھوں میں لیے ہوئے کھڑا دیکھ کر اس کے لیے کھانے سے انکار شکل ہو رہا تھا۔ وہ اس کی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ کسی اور غلوں میں وہ پہلے ہی اس کے ساتھ اتنا زیادہ کر چکی تھی کہ اسے اچھی خاصی شرمندگی ہونے لگی تھی۔

"لگ رہا ہے تمہارا ابھی کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کھانا کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے لگا تب لیزا اسخندگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے کس انداز سے اسے یہ پتا چلا تھا؟ مجھے نہیں سکا تھا۔ اتنا تو وہ خود کو جانتا تھا کہ اسے پڑھنا اس کی سوچ کو جان لینا اس کے دل میں کیا ہے پتا چلا لینا کوئی ایسا سلا کام نہیں ہے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"ہیں یہ جھل گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے نرمے بیڑ پر رکھنے لگی۔

"دل نہیں چاہ رہا پھر بھی تمہوڑا سا کھاؤ۔ تمہیں میٹھن سن گئی ہے۔"

وہ نرم لہجے میں کہتے ہوئے بیڑ کے پاس رکھی کر سی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی کہنے لہجہ کھانا کھانے لگا۔

"اب تم تمہوڑی ریر ریرٹ کر لو پھر ہمیں ہسپتال جانا ہے۔ کافی تکلیف سے گزر رہا ہو گا تمہیں وہاں۔ تمہارے بچہ کی جینڈن پہنچ ہو گی۔"

اس نے تمہوڑا سا کھلایا تھا۔

"ہیں کھا کر؟"

"ہاں! تو اب لیزا کے اصرار سے ڈر رہا تھا مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہ بغیر اصرار کیے وہاں سے اٹھ

وہ بہت دیر تک صدم بیٹھا رہا تھا کام کرنے کی وقت پر کام مکمل کرنے کی تمام خواہش ایک دم ہی دم توڑ بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی بھی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ابھی بھی ہاں کی آنسوؤں بھری آواز گونج رہی تھی۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک تک سانسے زوراً کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اس طرح بیٹھے کئی دیر ہو گئی تھی وہ نہیں جانتا تھا ہاں وہ چونک کر اپنے محل میں واپس دروازے پر دستک کی آواز سے آیا تھا۔ بجائے کچھ بولنے کے وہ خالی الذہنی سے دروازے کو گھور رہا تھا۔ دروازے پر دروازے دستک ہوئی تھی پھر سہارہ یہ لیزا ہو گی یقیناً "اس کے لیے لچلائی ہو گی۔ عجیب الجھن تھی مجب اس کے ساتھ رڈ بھی نہیں ہونا چاہتا تھا مگر کھانا کھانے باقی کرنے بھی نہیں چیر کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے ٹیکے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ لیٹنے کے بعد اس نے لیزا کی حالت پر چیمٹی یا ساتویں دستک کا جواب دیا تھا۔

"آجائو لیزا! وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

"دیکھا ہوا سو گئے تھے کیا؟" اسے لینا دیکھ کر لور پھر دستک کا جواب اتنی دیر بعد بے جا نے پر اسے یقیناً ہی لگا تھا کہ سکندر کی آنکھ لگ گئی ہو گی۔

"ہاں شاید آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ یہ سوچ کر لینا تھا کہ لیزا سے نیند اور تھکاوٹ کا بہانہ بنا کر کھانا کھانے سے انکار کرے گا مگر اب اسے کھانے کی ٹرے

کئی تھی۔



”ہلیس“ روزانہ نیکھنے کے بعد ہلکا سا کھول کر لیڑے باہر سے کھڑے کھڑے اسی سے پوچھتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر آفس کا کام کرنے لگا تھا۔ وہ دن میں سوچیں اور دل میں تکلیف بہت تھی مگر یہ سب کب نہیں ہوتا تھا کام نہ سہر حال کرنا ہی تھا نا۔ کچھ کام مکمل کر کے وہ آفس ای میل کر چکا تھا کچھ ابھی نامکمل تھا۔

”چلو! الپ ٹاپ بند کر کے وہیلے سے اٹھنے لگا۔ اسے تکلیف تھی ابھی تھی مگر نہ وہ تکلیف کو سوچ رہا تھا نہ اسے اہمیت دے رہا تھا۔ لیڑے اسے دعوے اس کے نزدیک اتنی تھی۔ مگر وہ اس کی رو کے بغیر ہی اٹھ گیا تھا وہ جیسا کبھی کے سہارے چٹا کرے سے باہر آ گیا فلیٹ میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔

”مینی سوری ہیں۔“ لیڑے کے بعد روزانہ کچھ دیر ٹہر لیٹا اور۔ لیڑے اس کی روٹی تھی۔

وہ اسے لے کر بکن میں آگیا تھی چائے نہیں کیوں۔

”ہوا!“ اس سے کہہ کر وہ بکن میں داخل ہوئی تو نا

سمجھی کے سے عالم میں وہ بھی اندر آگیا۔

”بٹھو!“ وہ بکن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی اس کے

لیے کھینچ کر باہر نکال دی تھی وہاں میز پر ایک پلیٹ

میں سیلے سے کئی طرح کے پھل کٹے ہوئے تھے جو کور

فلڈوں میں کٹے مکھڑ فروٹ پلیٹ میں کاٹا بھی رکھا

تھا۔ وہ حیران سا کرسی پر بیٹھا۔ تب وہ اس سے نرمی

سے بولی۔

”ممنوع مت کرنا۔ تم نے کھانا بہت کم کھایا تھا۔

تھوڑے سے فروٹس کالے ہیں میں نے تمہارے

لیے دیکھو یہ بالکل بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ابھی بچوں کی

طرح خاموشی سے انہیں کھانا۔“

وہ انور اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”ابھی پر غصہ بعد میں کر لیا ابھی ہمیں دیر ہو رہی

ہے۔“

بارہ سال مگر بچے تھے اس کی عادت ختم۔

تجبی اٹھا خیال رکھوانے کی اپنی پروا کر دے کی۔

کیوں کر گئی تھی اتنی پروا؟ شاید اہم سوال یہ۔

چاہے تھے مگر اسے اپنی پروا کیا جانا کیوں اچھا نا۔

ہے؟ اہم سوال یہ ہی گیا تھا اس کے لیے۔

لیڑے اسے نظریں ہٹا کر خاموشی سے کانٹے۔

مکس فروٹ کھانے لگا تھا۔ ان میں بائرن ایلین بھی تھا

اسٹراڈی بھی سیب بھی ناشپاتی خوبانی اور انور بھی

بھی۔

”نہیں ناشپاتی پسند ہے؟“ اس نے بے تکلف

سے انداز میں اس کی پلیٹ میں سے ناشپاتی کا ایک

کیوب کھینچ لیا تھا۔

”ٹھیک لگتی ہے۔“ وہ ناشپاتی کا ٹکڑا منہ میں ڈال

دی تھی۔

”مجھے بہت پسند ہے۔“ چھوٹوں میں میرا فیورٹ پھل

ناشپاتی ہے۔“

اس نے اس وقت پر غصہ ڈب جس میں زیادہ تر سبز

ٹھٹھا اور جامنی رنگ شامل تھے مگر بے فکر کی کبیری کے

ساتھ بہن رکھا تھا۔ بالوں میں کچھ لگا تھا۔ چند بھونکی

ٹھٹھیں پیشانی اور کانوں کے پاس بڑی بھٹکیں۔ وہ بیکش کی

طرح بہت چاری لگ رہی تھی۔ لیڑے اسے نظریں ہٹا کر

اس نے دوبارہ پلیٹ پر نظریں مرکوز کیں۔

”تمہارا کتنا نام براب ہو رہا ہے میری وجہ سے۔ میرا

مطلب ہے بے شک تم یہاں چھٹیوں پر ہو مگر ان

فائدہ بھی نہیں ہو۔ تمہارے سولو شو کی تیاری ہے اور

پھر ہمارے آفس والا پروڈیکٹ بھی ہے۔“

”میرا کوئی وقت بڑھانے نہیں ہو رہا۔ رات میں کرنی

ہوں میں اپنا کام اب چلوں ہو رہی ہے۔“

وہ ایک دم ہی جلجت کاٹھڑی ہو کر کرسی پر سے

اٹھی تھی وہ اسے انور کو کھانا کرسی پر سے اٹھ گیا۔



انہیں ہسپتال میں کافی نام کا تھا وہاں اس کے



آفس والے کیا انسان نہیں ہیں؟ ایک شخص بری طرح زخمی ہو کر بستر پر رہا ہے، اٹھتے بیٹھتے، چلنے پھرنے میں اسے مشکل ہے تو آفس کیسے آسکتا ہے؟ لیکن میرے مددکنے سے تمہارے رکتا ہوئے نہیں سارے سینور سکندر دھڑکے کر چکے ہیں کہ کل آفس جاسم کے تو وہ لازماً "جاسم" تھے، لیکن وہ آفس لیزا محمود کے گھر سے جاسم کے سیدھے ملے گئے تھے۔

وہ دوستانہ دھولیں بھرے کیسے میں بولی۔
انکار کی خواہش رکھنے کے باوجود چپ ہو گیا۔
گزرے ماہ و سال کی ایسی بہت سی باتیں بہت سے حادثات یاد آنے لگے تھے جب وہ اس سے بھی زیادہ شدید زخمی اور بیمار ہو کر تنہا رہا تھا۔ خیال رکھنا اور پروا کرنا تو دور اسے ہو گیا ہے یہ تنگ پوچھنے کوئی نہیں آیا تھا اب جب دل میں یہ خواہش بھی ختم ہو گئی تھی کہ کوئی اسے پوچھے اس کا خیال رکھے تب یہ لڑکی نہ جانے کہاں سے زندگی میں آئی تھی۔ لیزا کا خیال رکھنا نہ اسے اچھا لگ رہا تھا نہ برا اچھا برا تو اس وقت لگا جب وہ اس دنیائے کو قبول کیا تھا ابھی تھوہ یہ ہی قبول

کی ہیڈنگ تبدیل کیے جانے کا عمل خامتا تکلیف دہ تھا۔ اگر وہ ایسا سخت چاہن نہ ہوتا تو شاید اتنی تکلیف سے گزرنے کے بعد رات تک بستر پر بحال ہی رہا رہتا۔

"ہیڈنگ! اگر تم اسٹنڈ نہ کرو تو کیا اب میں اپنے ہوٹل چلا جاؤں؟"

وہ اب اپنے ہوٹل واپس جانا چاہتا تھا، مگر لیزا کو ناراض بھی ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کس خوشی میں؟ تمہیں کیا میرے گھر پر کوئی تکلیف ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیزا دراصل میں نہ"

"دراصل تمہیں میرے گھر پر نامیرا احسان لگ رہا ہے اور مغرور و خود پسند سینور سکندر کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے۔ یہی بات سے پہلے؟"

لیزا عقل سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے ساتھ اسے لیزا کے چہرے پر ایک دکھ بھرا اثر بھی نظر آیا تھا۔

"سینور لیزا! اتنی اموشنل (جذباتی) بہت ہو ہوٹل جانے کی بات صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ کل سے میں آفس جانا چاہتا ہوں۔ اور آفس جانے کے لیے میرے کپڑے وغیرہ سب ہوٹل میں ہیں۔ تم لاکھ یقین دلائی رہو، مگر یہ میری دوسری ہالی وڈ نہیں تو نہیں تان؟ مہسورہ یلینیر، میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے دوپہ اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنا ہے پہلے ہی اس ایسکیمینٹ کی وجہ سے میرے کاموں کا خاصا خرچ ہو چکا ہے۔"

وہ نرمی اور افسوس کے ساتھ آنداز میں بولا۔
"مگر یہ بات ہے تو چلو ابھی تمہارے ہوٹل چلے ہیں۔ تم وہاں سے اپنے کپڑے لے لو۔ آج تمہارے اتنی تکلیف ہے میں تمہیں واپس ہوٹل تو ہرگز نہیں جانے دلاؤں گی۔ دیے تو کل سے آفس جانے کی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارے ہیڈ



پر بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی۔

لیزائے مسکراتے چہرے کو بغور دیکھتے وہ آہستہ بولا۔ لیزا! اس کی مینی کھانے کی مہرے خدشہ پیش کرتی تھیں تو اسے شرمندگی کا احساس نہ تھا۔ لہذا اس کے ڈانٹنگ ٹیبل پر ان لوگوں کے سامنے کر کھانا کھانے لگے یہ لیزا بہتر محسوس ہوا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آج بڑا بھر میں ٹیبل کھانا لگاتی ہوں۔“

وہ اس کی فرمائش پر خوش ہوئی تھی۔ وہ پانچ منٹ کے بعد اٹھ کر باہر آیا اسے لیزا اور بس کی مینی کی آوازیں چونکے لیکن اسے آگے نہیں ہٹا دیا۔

”آؤ سکندر! بیٹھو۔“ لیزا نے اسے دروازے پر رکھتے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ میز پر کوئی ڈش رکھ رہی تھی۔ اس کی مینی کو کنگسٹن کے پاس کھڑی تھیں۔ وہ دس میں سالن نکال رہی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر سہمنان نوازی سے بھرپور انداز میں مسکراتی تھیں۔

لیزائے جلدی سے اس کے لیے کرسی چننی۔ وہ بیٹھ گئی تو مقررہ مضبوطی سے جھا کر رہے اور تیز جیز قدم اٹھاتے ہوئے کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

”تیز مت چلو۔“

لیزائے فوراً اسے ٹوکا تھا۔ وہ اس کے زخمی پیر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ یہی بھی دس لے کر آگئی تھیں۔ دس میز پر رکھ کر انہوں نے لیزا کے برابر والی کرسی سنبھالی تھی۔

میز پر اطالوی اور پاکستانی دونوں طرح کی ڈشز نظر آ رہی تھیں۔ اس نے مشرومز واک اپنا اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔ لیزائے سلاوا کا پیالا اس کے سامنے کیا۔

بف کے کباب تھے وہ اس نے اس کے سامنے رکھے تھے۔

”ہمارے گھر ہمیں حلال گوشت ملے گا۔ بے فکر ہو کر کھانا کھاؤ۔“

لیزائے سرگراں سے لہجہ بولتی ہوئی سے صاحب

لیزائے! اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکنا تھا۔ اس نے اس کے ہونٹ کی بارنگ میں لاکر رکھی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گی۔ مگر وہ اس کے ساتھ اتر کر اندر چلی گئی تھی۔

”تم صوبے پر بیٹھ جاؤ۔ مجھے بتاتے رہو تمہارے کپڑے اور دیگر ضرورت کا سامان کمال ہے۔“ ہونٹ میں اس کے کمرے میں اس کے بعد وہ اس سے بولی تھی۔

”لیزائے! میں خود کر۔“ لیزائے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر صوبے پر بٹھا دیا تھا۔

”کس بیک میں چیزیں رکھنی ہیں اور کیا چیزیں رکھنی ہیں۔ جلدی بناؤ! ایک بار پھر اس سے بار بار کر دو اسے بنانے لگا تھا کہ اس کے کون کون سے کپڑے بیک میں رکھنے ہیں۔ وہ جلدی جلدی اس کا کوٹ پینٹ، ٹائی، شرٹ، ٹی شرٹ، میجنز وغیرہ بیک میں رکھ رہی تھی۔

”لیزائے! میں تمہارے غلوں اور دس کی دل سے قدر کر رہا ہوں۔ مگر لیزا میں صرف کل کا دن اور رات کا تمہارے گھر۔ کل کے بعد تم مجھ سے اپنے گھر پر رکنے کے لیے اصرار مت کرنا۔“

وہ دونوں اس کے ہونٹ کے روم سے باہر نکل رہے تھے جب وہ لیزا سے بولا تھا۔ بیک میں اس کا سامان رکھنے کے بعد وہ بیک کدھرے ہو کر بھی لیزائے رکھا تھا۔ باوجود اس کے شدید اصرار کے کہ وہ اسے خود پکڑنا چاہتا ہے۔

”کھانے کو سکندر۔“

کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر لیزائے باہر سے کھڑے کھڑے پوچھا۔ وہ اس کے بعد وہ بیڈ پر نیم بٹا رہا ہو گیا تھا۔ اسی شہمہ از انداز میں وہ لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کر رہا تھا۔

اس کے بعد اسے اور تمہاری مینی کے ساتھ باہر

آواز کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اسی وقت لیزا نے اسے
 میں آئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے اسے دیکھا اور اس کی
 چٹیں کر کے وہ نہایت ہی دلکش لگتی تھی۔ وہ اس کے
 صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر
 نینمی لیزا سے کہہ رہی تھیں۔

”ترجہ ساری رات کام ست کرتی رہنا۔ صبر نہ کرنا۔
 بھی نہیں لیتی ہو۔ تھوڑی دیر میں تو سوؤ“
 لیزا نے کافی ٹامک ختم کر دی تھی۔ اسے اور لیزا کو
 شب بھر کہہ کر وہ اسے کہہ رہی تھیں۔
 ”نہم بھی اب آرام کر لیں گے“

لیزا اس کی ہوا میں دھیرے لے کر آگئی تھی۔ اس نے
 دیا اور پانی اسے پکڑا۔ دیا کھالینے کے بعد وہ اس
 سے بولا تھا۔

”ابھی مجھے تھوڑی دیر کام کرنا ہے بھر سوئی گی“
 لیزا نے مرہم اس کے سانس سے رکھا تھا۔
 ”جیسے کل دیا کھانا اور مرہم لگنا بھول گئے تھے“ آج
 مت بھولنا۔ سوئے سے پہلے اسے دیا ہوا تھوں پر لگا
 لیتا۔ اگر تم کو تو میں دیکھا ہوں؟“

”نہیں میں لگا ہوں گا۔ تم اب اپنا کام کرو۔ میں
 تھوڑی دیر لی دی رکھنا چاہتا ہوں۔ نیند آئے گی تو
 سوئے چلا جاؤں گا۔“ وہ مسکرا کر یسین دلائے والے
 انداز میں بولا۔

”اوس کے! اگلا پتہ نہ“ وہ مسکراتے ہوئے لکڑی کے
 زینے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اور اپنے اسٹوڈیو میں
 جاری تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے مرہم نہیں لگایا تھا۔ جان بوجھ کر نہیں جس
 اسے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اپنے خربے اٹھانے کی
 عادت جو نہیں تھی۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ کوئی
 اٹالین اطالوی مودی تھی جو وہ دیکھ رہا تھا۔ تو اواز اس نے
 بالکل بند کر دی تھی۔ بس خاموش فلم دیکھ رہا تھا۔
 نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ
 نیند آجائے۔ وہ تین بار وہیں آنکھیں بند کر کے بھی
 لیزا تھا مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے یہ گڑبڑیں پر سے
 کسی کے اترنے کی تواز بکلی تھی۔ لیزا بچے آ رہی تھی

”پتا ہے نینمی ایمری اور سکندر کی دوستی کیسے ہوئی
 تھی؟“ وہ کھاتے ہوئے لیزا کو دیکھ رہا تھا۔ ”سکندر البرٹو
 نہ پیریا میں اپنے لیے پرا آواز کر رہا تھا۔ سبزیوں
 ”زبان کے منٹے کی وجہ سے سکندر کو آواز کرنے
 میں مشکل ہو رہی تھی۔“

”اور تب لیزا نے میری مدد کی تھی۔ مسکرا کر اس
 بات عمل کی۔“

”اس کی اسی طرح سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔
 اس دو منٹ گئے ہیں اسے کسی سے بھی دوستی کرنے
 میں۔“

نینمی مسکرا کر بولیں۔ ”انہوں نے مٹا بھری محبت
 دل نکالوں سے لیزا کو کھاتا تھا۔“

”کالی بوجے تان؟“ ان تینوں نے کھانا ختم کیا تب
 لیزا نے اس سے پوچھا۔

”تم بتاؤ گی؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”آف کورس! میں بتاؤں گی۔ نینمی آپ بھی دیکھیں
 کی تان؟“

نینمی نے بھی مسکرا کر سراباٹ میں ہلا دیا۔
 ”آجاؤ پیرا! ہم لہو چمک روم میں بیٹھے ہیں۔“

بر شفتت سے انداز میں نینمی اس سے بولی تھیں۔
 وہ انہی تک یہ نے نہیں کہا تھا کہ انہیں کہا ہے اس
 لیے محض ”جی“ کہتا ان کے ساتھ اٹھا تھا۔ لیزا کچن میں
 کافی بنا رہی تھی کہ وہ اور نینمی لہو چمک روم میں صوفوں پر
 آکر بیٹھ گئے تھے۔ نینمی نے لی دی آن کر دیا۔ لی دی
 کی تواز بکلی رکھ کر وہ اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔
 ان کی باتیں لیزا کے متعلق تھیں۔ اس کے بچپن کی
 باتیں وہ بچپن سے ہی ان کے کتنے قریب رہی ہے۔ یہ
 باتیں

”بھئی لگا ہی نہیں یہ میری سگی بیٹی نہیں ہے“ اسے
 میں نے جنم نہیں دیا جیسے پہلی نظر میں اس نے مجھے
 اپنی ماں اور میں نے اسے اپنی بیٹی مان لیا تھا۔“
 وہ ان کے چہرے پر مٹا کانور بکھرا دیا تھا۔ اسے
 میں کا چہرہ یاد آئے لگا تھا۔ میں کی آنکھوں میں ہنس

چکر دار بیڑھی پر چند زینے اترنے کے بعد لیزا کو لیونگ روم نظر آنے لگا تب اس کی سب سے پہلے اسی پر نظر پڑی تھی۔

”کیا بوائے گم سوئے نہیں؟“ میراں پریشان سی تیزی سے اتر کر بیچ اس کے پاس پہنچی تھی۔ وہ جواباً ”جیسے سے مسکرایا تھا۔“

”ہاں! نیند نہیں آ رہی۔“ لیزا کی نگاہیں وال کلاؤک پر جمی تھیں جو رات کے غن بج رہی تھیں۔

”لیکن تمہاری میڈیسنز میں نیند کی دوا شامل ہے۔“ وہ کھاکر تو تیندلی چاہیے تھی۔“

”مجھے نیند بہت مشکل سے آتی ہے لیزا اور اصل مجھے انسومینیا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بچ بولا تھا۔

”اورد ایچ آر ج تھریس ہسپتال میں ڈاکٹر کو یہ بات بتانی چاہیے تھی۔ وہ پھر تمہیں اس لحاظ سے کوئی اور میڈیسن دے گا۔“

”مجھے یہ تکلیف بارہ سال سے ہے لیزا اور کسی علاج کوور کسی دوا سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں عادی ہو گیا ہوں راتوں کو جاگنے کا۔ تم میری فکر مت کرو۔ جا کر آرام کرو۔“

اپنی یہ اتنی ذاتی بات اس نے کج تک کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی جو دوا وغیرہ میں ملنے والی اس ابھی لڑکی کو بتا رہا تھا۔ کوئی ضرورت نہیں تھی کچ بچائے جانے کی نہ کہہ سکتا تھا کہ ہاں! آج فیسٹ نہیں آ رہی تھوگر پھر بھی اس نے بچ بولا تھا۔ پتا نہیں کیوں کا بہت پریشان ہو کر کھانا نور کشن لیزا نے پہنچ کر صوفے کے اوپر ڈال دیا۔

”پتا ہے اس آگے تو کئی کیوں رہتے ہو سکندر؟“

”کہاؤ میں اس نے پوچھا تھا وہ اسے کیسے پتا ہے۔“

”میں کبھی دل سے ہنستے نہیں دیکھا۔“

”میں تمہاری آنکھیں تمہاری ہنسی دیکھتی ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آتا۔“

اس کا انداز چستنس لیے ہوئے نہیں تھا اس انداز میں دکھ تھا جیسے وہ اسے دیکھ کر دیکھ رہی تھی۔

”شاید اس لیے کہ میری زندگی میں خوشی کے لیے کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔“

دن کی روشنی میں وہ شاید یہ بات کبھی نہ کہہ پاتا۔ رات کی خاموشی اور تنہائی میں کہہ گیا تھا۔

”خوش ہونے کے لیے وجہ ڈھونڈو گے تو کبھی نہیں ہو سکو گے۔ میری زندگی میں بھی ایسا بہت کم ہے جیسے اگر میں ہر وقت سوچتا شروع کر دوں تو کیا مجھے کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی تھوگر پھر مجھے نہیں پتا۔“

”کتنا خوش رہتی ہوں۔“ اس نے سزا جات میں ہلایا۔

”ہاں اور میری دوا ہے تم ہمیشہ اسی طرح خوش رہو۔“

”ہنسی مسکراتی رہو۔“ نہیں دیکھ کر زندگی سے ہٹ کر نکل جائے لگتا ہے۔“

”تو کدو ماں زندگی سے پیار سکندر! زندگی بہت خوب صورت ہے۔ خوشی کو رنگوں کو اور زندگی کو اب اور محسوس تو کر کے دیکھو۔“ وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔

”کج جو فون آیا تھا تم اس سے دیکھ رہی ہو۔“

”ہاں! بہت۔“ جواب دیتے ہوئے اس نے لیزا سے نظریں ہٹائی تھیں۔ چرو سیدھا کر کے آنکھیں کر لیں وہ اپنی آنکھوں میں ابھرتے آنسو اس نے لیزا چاہتا تھا۔ اتنا سخت جان ہو جانے کے بعد یہ کیوں بچے آتے تھے آنکھوں میں۔ وہ آنکھیں کر کے لیزا پر۔

”تم نے آنسو نہ لگایا تھا؟“ اسے لیزا کی سناں دی تھی۔ وہ اسی طرح اس کے نزدیک آئی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے اسی طرح آنکھیں بند کر دیں۔

جواب دیا اسے اپنے نزدیک سے ابھری نوٹ۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میز پر سے مرہم کی بوتل لے کر ایک سیکنڈ بعد بغیر کچھ کہے اس نے لیزا پر پڑا تھا۔ وہ کتنی سے لے کر کلائی تک۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوئی میسر آئل

SOHN HAI OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتے ہے
- بالے بال اکڑتے ہے
- بالوں کو سفید واپس پھلکار دیتا ہے
- مردوں اور زنانہ بالوں کے لئے
- یکساں منید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

سوئی میسر آئل 12 بڑی بوتلیں ہر کمر بچے اور اس کی بیوی کے مہرل بہت مشکل ہیں لہذا یہ توڑی انداز میں تیار ہوتا ہے یہ ہر قسم کی ایک دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس کی ایک روپی کی قیمت صرف 100 روپے ہے دوسرے شہروں کے لئے آؤریج کردہ شہر ڈاکٹل سے منگوائیں اور جزئی سے منگوانے والے کو آؤریج صاحب سے بھجائیے

- 2 بوتلیں کے لئے = 250 روپے
- 3 بوتلیں کے لئے = 350 روپے
- نوٹ: اس شہر ڈاکٹل سے منگوانے والے کو آؤریج

منی آڈر بھجوانے کے لئے ہمارا ہند

بڑی بوتلیں 53 اور بڑی ڈاکٹل منگوانے والے شہروں کے لئے منی آڈر بھجوانے والے حضرات سوئی میسر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
 37 اور 32735021 فون نمبر
 کتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اور 32735021 فون نمبر

اس کے ہاتھ پر مرہم لگا رہی تھی وہ کہتا چاہتا تھا۔
 اٹھو میرے جسم پر نہیں میری مرض پر لگے ہیں۔
 اسی مرہم لگ سکتی ہو تو ان زخموں پر لگاؤ۔

وہ جب چاہ آ نکھیں بند کر کے لیٹا رہا وہ اس کی ٹیوں کو گھس لیتے ہاتھ پر محسوس کر رہا تھا۔ کب وہ لے ہاتھ پر مرہم لگا چکی تھی کب اس نے دوسرے ہاتھ پر مرہم لگا دیا تھا۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ کس وقت اس کی آنکھ کھلی تھی اسے پتا نہیں تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ صبح کے سات بارے تھے۔ وہ تین بجے سے سات بجے تک پورے رگڑنے اتنی بے خبری کی نیند سو گیا۔

اس نے صوفے پر گرٹ لیٹنے کی کوشش کی تو وہاں بالکی موجودگی کا احساس ہوا وہ صوفے پر اس کے ایک فلور کشن پر اسی طرح بیٹھی تھی اس کا سر دھرتے پر اس کے ہاتھ کے نزدیک بالکل کنارے پر لگا ہوا۔ وہ صوفے کے کنارے پر سر لگائے مگر نیند ورتی تھی۔ گویا وہ رات اس کے سو جانے کے بعد بھی اس کے پاس سے اٹھ کر نہیں گئی تھی۔

وہ چند سیکنڈ تک نکل نکلتی ہاتھ سے اسے دھتکار رہا وہ صوفے سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔ بغیر کوئی توجہ پیدا کیے اس نے منے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جو کس سی نیند سے بیدار ہوئی۔ فوراً سیدھی ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

دھکڑ مار نکھ سینورا لیزا۔ میری وجہ سے پوری رات بے آرام ہو کر گزار دی تھیں؟
 وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ مسکرا کر آنکھوں میں نرمی لائے دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ بالوں کو ہاتھوں سے لپیٹ کر جوڑنے کی سی شکل بنا رہی تھی۔

”اس طرح سونے کا کاروبار تو میں تھا پتا نہیں کیسے ہوئی۔“

”خمس نیند آئی تھی؟“

”ہاں بہت پر حوصلہ اور مگر نیند سو گیا ہوں۔“

”تمہاری اداسی کم ہوئی؟“

”ہاں۔“ مسکرا کر جواب دیا صوفے سے اٹھ گیا

جینیب کر رہی۔

”سچ کہہ رہا ہوں تمہارے دیکھنے اور فکر اور

اندازہ بالکل ہاں جیسا ہوتا ہے۔“

وہ اس کے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔

”اچھا! اب میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں سچ

تمہاری فکر کرتی ہوں۔“ وہ اس کے مسلسل مسکراہٹ

پر قدرے سخت بھرے انداز میں بولی۔

”مجھے پتا ہے۔ اس کی طرف دیکھ کر وہ ایک دم

سنجیدگی سے بولا۔

”محب تم ٹیٹ کر سو جاؤ۔ مجھے لینے آفس سے گاڑی

لے گئی۔“ چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے جب

اُس نے نگاہ اس سے بولا تھا۔

اسے معلوم تھا وہ اسے آفس چھوڑنے کے لیے

ہر حال میں جانے گی اس لیے اس نے تیار ہونے کے

دوران ہی فون کر کے آفس کی گاڑی بولی تھی۔

”تھیک ہے! لیکن شام میں میں تمہیں لینے آؤں

گی۔“

”ایسا نہ کرو تو ہر تر ہے۔ میرا آفس میں دیر تک

رکنے کا ارادہ ہے۔“

”تمہیں جب تک بھی رکنے سے روکو مگر لینے میں

ہی آؤں گی۔“ وہ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں بولی

تھی۔ اس نے قدرے بے چارگی سے مسکرا کر سر

اثبات میں ہلایا تھا۔



آفس میں جو اسے دیکھ رہا تھا ”خیریت پوچھ رہا تھا۔

سوائے اس کے کہ وہ میٹا سٹی کے سوارے چل رہا تھا

بالی اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

اسی رفتار سے اپنے کام بناتا رہا تھا جیسے متنبہ کیا کرنا تھا۔

چاکا اسے دوش نہ رہا تھا۔ وہ اتنے دنوں کے

سب کاموں کو مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ وہ شام

ساڑھے سات بجے تک آفس میں رہا تھا۔ لیڑانے

پر فون کر کے اس کی بیٹی کا نام پوچھا تھا۔

وہ باہر نکلا تو گاڑی میں بیٹی اس کا انتظار

لیڑا بھی اس کے ساتھ ہی فکور کشن سے انٹی

تھی۔

”میں تیار ہو چکیں؟ آفس تمہارا جلدی جانا چاہ رہا

ہوں۔“

لیڑانے سر اثبات میں ہلایا۔ ”وہ میٹا سٹی کا سارا

لے کر چلتے ہوئے کمرے میں آگیا۔ وہ تیار ہو کر باہر

نکلا تو کچن میں میز پر ناشتا لگائے لیڑا اس کا انتظار کر رہی

تھی۔

”دینی! صبح نماز کے بعد دوبارہ سو جاتی ہیں۔ صبح نہ

انہیں گھس جانا ہوتا ہے نہ مجھے اس لیے ہمارے

قلیت میں صبح ذرا دیر سے ہوتی ہے۔“ وہ ناشتا خود تیار

کرنے کی وجہ سے باری تھی۔

”متم نے کیوں زحمت کی لیڑا۔ میں ناشتا آفس جا کر

کر لیتا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں مسلسل میری وجہ

سے بے آرامی۔“

”یہ جذباتی جملے بعد میں بول لیتا۔ پہلے ناشتا کر لو۔

نوشتا ہو رہا ہے۔ چیز آلیٹ کھاؤ۔ تمہیں ضرور اچھا

لگے گا۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنایا

ہے۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بولی تھی۔ اس نے

چھری کاٹا اس کے سامنے کیے تھے۔

”کھاؤ؟“ وہ چیز آلیٹ کھانے لگا تھا۔ وہ کرسی پر اس

کے سامنے بیٹھی اسے کھاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دونوں

ہاتھ میز پر جمائے وہ اسے بار بھری نگہوں سے کھاتے

ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

”کھاؤ؟“

”کچھ نہیں۔ اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔

”پھر اسی طرح مسکرا کر اکیلے رہے۔ ہونے چاہئے؟“

بعد ہوئی تھی۔

”جس طرح تم مجھے کھاتے ہوئے پیار سے دیکھ

رہی ہو اس طرح پیار سے انہیں اپنے بچوں کو کھاتا ہوا

دیکھ رہی ہیں۔“

یوں کہ وہ قطعہ لگا کر کمرے پر اٹھا لیڑا قدرے

کر رہا تھا۔

وہ یونہی خوش اخلاقی کے اظہار کے طور پر بولا تھا۔
 ذرا نہ پاکستانی، یعنی جاپانی وہ کسی بھی طرح کے گمانوں کو
 نہ تو سوچتا تھا نہ یاد کر رہا تھا۔ وہ کھانا اس لیے کھانا تھا کہ
 کھانا ہو سکے، چل پھر سکے، اپنے تمام کام انجام دے
 سکے، کھانے کو ڈالنے اور مزے لے سکے، یہی کھانا
 جاتا ہے اسے بھول چکا تھا۔

”کیوں؟ تمہارے کمر میں تو بیٹے ہوں، یہ پاکستانی
 کھانے؟“

نہی نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً چوچا تھا اس کا
 چوہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مسکراہٹ چہرے پر
 سے چلی گئی تھی۔

”جی، اس نے ایک لفظی انتہائی مختصر ترین جواب
 دیا تھا۔ چپا نہیں کیوں فکر سے ایسا لگا جیسے لیزا کی نہی
 نے یہ بات جان بوجھ کر نکالی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ
 رہی تھیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ لیزا انہیں ناراضی
 سے دیکھتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں یہ سمجھانے کی
 کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس سے اس کی فیملی کے
 بارے میں کوئی بات نہ کریں مگر انہوں نے لیزا کے
 اشارے سے سر ہر نظر انداز کر کے اس سے مزید پوچھا
 تھا۔

”خیر سے شادی ہوئی بیٹا؟“

”نہیں۔“

”یعنی وغیرہ۔“

”جی، الحال تو وہ بھی نہیں ہوئی۔“ وہ زبردستی
 مسکرایا تھا۔

اسے ان کے سوالات سے شدید الجھن ہو رہی
 تھی وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا کی نہی اسے بغور دیکھ رہی
 ہیں۔ فیملی اس کے کہ وہ اس سے مزید کوئی ذاتی سوال
 کرے گا اس لیے لیزا نے جلدی سے ہنگامہ موعود تبدیل
 کیا تھا۔

”جی، باب سوٹ وٹش بھی سر کر دیں۔ میں نے
 شہس گلہلوں کے لالچ میں کھانا بھی کم کھا ہے۔“
 لیزا نے بے پروہہ خوراک سے اس پر ہنس ماری تھی۔

”نہیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا رہا؟“

”نہیں میں ابھی باج منٹ پہلے ہی پہنچی ہوں۔ تم
 بڑا طبیعت کیسی ہے؟ میری نصیحتوں کا کچھ اثر تو ہوا
 نہیں ہو گا تم پر۔ خوب خود کو تھکایا ہو گا انسان اتنا
 ضدی بھی نہ ہو۔ آس جانا ہے تو جانا ہے ورنہ تک
 رہ کرنا ہے نور کنا ہے۔“

وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کچھ خلگی سے بولی
 وہ اس کے آگے اتنی دیر تک رکنے پر ناراض

تھا جیسی میری پردا کرنے والی سینور لیزا اب اس
 آپ کو نصیحت دلا رہی ہوں کہ بالکل ٹھیک ہوں۔ کہیں
 درد تکلیف کچھ نہیں ہو رہا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
 ”تم سارا دن کیا کر رہی رہیں؟“

سڑک پر ٹنک اور لوگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے
 پوچھا تھا۔

”وہ سڑک سوئی رہی اس کے بعد شام تک
 بیٹنگ کر رہی۔ سچ میں سیم سے اور اپنی ایک
 دوست سے فون پر باتیں بھی کیں۔“ ٹنک جام میں
 پھنس کر انہیں گھر پہنچنے تک ایک ٹیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔
 ”تم فریش ہو جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں کھانا تیار ہوا کہ
 نہیں۔ کھانے کا کام ہو گیا ہے۔ ڈنر کرتے ہیں۔“

قلب میں آنے کے بعد لیزا اس سے بولی تھی وہ
 سر ہلا کر اسے میں چلا گیا تھا۔



”جہت مزے کی بڑائی بتائی ہے آپ نے۔“ نہی
 نے ڈنر میں بڑائی بتائی تھی۔ ساتھ رائیٹ مسلا اور پیچھے
 میں شاہی گلز۔ اسے کھانا پسند تو آ رہا ہے انہوں
 نے اس سے یہ پوچھا تھا وہ خوش اخلاقی سے تعریفی
 بول رہا تھا۔

”طیڑانے کھا تھا تمہارے لیے کوئی پاکستانی ڈش
 بناؤں۔“ وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

اس کے بعد لیڑنے اس طرح بغیر رُکے ایک کے بعد ایک غیر متعلقہ اور فضول قسم کی باتیں شریع کی تھیں کہ اسی کی بنیاد پر اس سے مزید کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھیں تب ہی انہیں اس کا موقع نہیں ملا تھا۔

اگر اسے اندازہ ہوتا مگر نئی کھانے کے دوران سکندر سے اس طرح کے نامناسب سوال کر سکی تو وہ سکندر کے ساتھ کمرے کی بیچ کر کھانا کھا سکتی۔ پتا نہیں نئی کو ہوا کیا تھا۔ وہ اچھی خاصی سمجھ دار خاتون تھیں ان کی سمجھ داری پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے انہیں بہ طور خاص یہ ناکہ کی کہ نئی نہیں تھی کہ خدارا سکندر سے اس کی بڑائی زندگی کے بارے میں کوئی بات نہ کیجئے گا۔ کاش وہ انہیں ناکہ نہ کرتی رہتی۔

سکندر اپنی ذاتی زندگی سے متعلق مشکوک و پابند کرتا تھا کہیں وہ نہ مل گیا ہو، کہیں اس کا موڈ نہ خراب ہو گیا ہو؟

کھانے کے بعد سکندر کے کسی کو لگ بھگ کاؤناتے فون آگیا تھا۔ وہ اس سے دفتر کی امور پر کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اسے لیونگ روم میں فون پر بات کرتا پھرد کر لیکن میں اپنے اور اس کے لیے گرین لی بنانے آئی تھی۔ اگر اسے خیر نہ آنے کی شکایت تھی تو پھر سونے سے پہلے کافی بیٹا چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن میں نئی بچا ہوا کھانا فریج میں رکھ رہی تھی۔

”کافی کا موڈ ہے؟ لاؤ میں بنا دوں؟“ اسے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

”گرین لی بنا رہی ہوں نئی میں بنا لوں گی۔ آپ اس کے بعد آرام کیجئے۔“

وہ کینٹ کھول کر گرین لی کے لی ہینڈ نکالنے لگی تھی۔ کام کرتے کرتے ہی اس نے انہیں مخاطب کیا

”آپ سے ایک بات کہنا۔“

”نئی! سکندر کو میں بھند ہو کر بہت اصرار کرنے میں لاتی ہوں۔ نہ ہوں تو اس سے یہاں آنے کے لیے

کسی بھی طرح راضی نہیں تھا۔ اب میں وہ یہاں کسی بھی طرح کی کوفت یا الجھن کرے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ذاتی زندگی فیملی کے بارے میں اس سے بات کی جائے۔ نہ جانے اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک حد سے زیادہ سے بے تکلف نہ ہوا جائے تو ہمیں اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے گھر پر نہیں ہے۔“

”کیا سکندر نے تم سے کچھ کہا ہے؟“ نئی نے

”نہیں! وہ کچھ نہیں بولا۔ پھر میں یہ بات پہلے جانتی ہوں۔“

”اے تو میرے خیال سے میں نے کوئی غلطی نہیں کی لیکن پھر بھی اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو آپ اس کی فیملی اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکتی۔“

”تھوہنکس نئی؟“ وہ مسکرا کر گرین لی بنانے لگی تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنا کام کرنے کے دوران نئی گاہک گاہے اسے بخیر دیکھ رہی ہیں جیسے اس کے چہرے پر کچھ براہمنی کی کوشش کر رہی ہوں۔

”گرین لی؟“ وہ ٹرے میں کپ رکھ کر لیونگ روم میں آئی تھی۔ سکندر کی فون پر بات ختم ہو چکی تھی۔

”تھوہنکس۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ٹرے میں سے کپ اٹھا لیا۔ اس کے مسکرانے پر اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی تھی اسے برا تو تھا مگر کچھ ٹھیک سمجھ رہا تھا۔ وہ ناراض تو نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے دال

دھونے پر اپنا کپ لے کر بیٹھ گئی

”تمہارا یہ لنگڑی کا زینہ مجھے بڑا خوبصورت لگا ہے۔ یہاں لیونگ روم کے ساتھ یہ بڑا آرٹسٹک لگا رہا ہے۔“

”نئی! سکندر کو میں بھند ہو کر بہت اصرار کرنے میں لاتی ہوں۔ نہ ہوں تو اس سے یہاں آنے کے لیے

کسی بھی طرح راضی نہیں تھا۔ اب میں وہ یہاں کسی بھی طرح کی کوفت یا الجھن کرے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ذاتی زندگی فیملی کے بارے میں اس سے بات کی جائے۔ نہ جانے اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک حد سے زیادہ سے بے تکلف نہ ہوا جائے تو ہمیں اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے گھر پر نہیں ہے۔“

”کیا سکندر نے تم سے کچھ کہا ہے؟“ نئی نے

”نہیں! وہ کچھ نہیں بولا۔ پھر میں یہ بات پہلے جانتی ہوں۔“

”اے تو میرے خیال سے میں نے کوئی غلطی نہیں کی لیکن پھر بھی اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو آپ اس کی فیملی اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکتی۔“

سے ہوا۔

”دیکھی؟“

”یعنی بہت سہنسٹو“ اپنے اندر کی دنیاؤں سے

چھپانے والی۔“

”بولنے کے دوران چلتا ہوا وہ ایک دوسری پیشنگ کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تھا جس میں اس نے روم کی ایک از اس شام نور ایک تھانہ کی کوینٹ کیا تھا۔“
”تھیں آرٹ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے پھر بھی تم تبصرہ اور تجزیہ تو ایسے کر رہے ہو میری پیشنگز پر جیسے بہت جانتے ہو۔“

”وہ اس کی بات کی تردید یا تصدیق کیے بغیر مسکرا دیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکیوں اور دروازے پر پڑنے محسوس ہونے لگی۔“

”جو! میری بالکونی بھی دیکھو۔“ اس نے شیشے کا سلائیڈ نگز پر رکھی کھول دیا تھا۔ کچھ دیر قبل بارش ہونا شروع ہوئی تھی موسم بے حد خوبصورت تھا۔

”جب بھی میں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو کافی کا کپ لے کر یہاں بیٹھ جاتی ہوں۔“ اس نے

بالکونی میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”صرف تمہارا لکڑی کا زینہ ہی نہیں بلکہ تمہارا اسٹوڈیو اور یہ جگہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ یہاں سے تمہارے دوا کا نظارہ بھی بہت خوبصورت ہے۔“

”وہ پیشنگ کے ساتھ کھڑا ہو کر سڑکوں اور بلندو تاریخی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی جواباً مسکراتی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے کھڑے برستی بارش کو دیکھ رہے تھے۔ روم کی سڑکوں اور عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔“

”کل تم اپنے ہوٹل واپس چلے جاؤ گے؟“

”ہاں کافی دن تمہارا مہمان بن گیا۔ کل صبح آفس جاؤں گا وہاں سے شام میں ہوٹل۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر ہوا۔

”ٹھیک ہے اب تم سے اب اور رکنے پر اصرار نہیں کر رہی۔ لیکن پلیز تم ہوٹل جا کر اپنا خیال رکھنا۔“

”میں اپنا خیال رکھوں گا مصروف آپ فکر نہ

”جانتا ہے یہ پارٹنرٹ میں نے اس فیمنہ ہی کی وجہ سے خرید لیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اس پر عاشق ہوئی۔ پرانی موزی میں ہوتے ہیں اس لیے گھر ایسے لڑکی کے گول زینے۔“

”ضرور اسی وجہ سے خرید لیا ہو گا۔ تم آرٹسٹ لوگ ہی طرح کے ہوتے ہو پسند آگئی تو کوئی معمولی سی چیز نہیں آگئی تو عالی شان سے عالی شان چیز بھی نظروں میں نہیں ساتی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بول رہا تھا۔ ایمیں سے اوپر جا کر رہے تھیں تمہارا اسٹوڈیو؟“

”ہاں! دیکھو گے تم؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل دیکھوں گا۔ میں نے تو تم سے برسوں رات ہی کہا تھا میں تمہارا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں اوپر چڑھ کر جانے میں کوئی مشکل تو نہیں ہوگی؟“ ان دونوں نے چائے کے کپ خالی کرنے والیں رکھے تب اس نے سکندر سے پوچھا۔ وہ جواباً

”مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ چلو لو کھاؤ مجھے اپنا اسٹوڈیو اپنی پیشنگز۔“

وہ دونوں اوپر آگئے تھے سکندر نے برسے آرام سے سیماکھی کے ساتھ میز چھایاں چڑھی تھیں۔ وہ اوپر

آکر چپ چاپ کھڑی سکندر کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ ویسے تو وہ ایک بار اسے چاہا تھا کہ اسے آرٹ میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر وہ آرٹسٹ تھی۔

اسے آرٹ کی قدر افزائی چاہتی تھی۔ سکندر نظرس کھانکر اور گرد مختلف جگہوں پر رکھی اس کی مکمل اور

بامکمل پیشنگز کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک پیشنگ کو بغور دیکھ رہا تھا جس پیشنگ پر وہ آج شام

نک کام کرتی رہی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا۔ اس پیشنگ میں اس نے خزاں کے موسم کی

دکائی کی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے اس اٹلی تھی۔

”ویسے تم بڑی ٹان سیرس ہی لگتی ہو۔ مگر تمہاری پیشنگز تمہیں ایک بہت سی مختلف انسان کے طور پر ظاہر کر رہی ہیں۔“ وہ پیشنگ پر نظرس مرکوز کیے اس

"ہم اب کب ملیں گے؟" میں نے معیدگی سے
سکندر کو دیکھا۔

"جب تم چاہو۔"

"میں قریب چاہوں گی کہ تم مجھ سے کبھی ملو۔"

سکندر بے ساختہ ہنسا۔

"تم سے پیٹنگ ہوائے بغیر میں کیس نہیں بٹا سکتی
ولاء! اکیمن رگوں مجھے چاہے روز ملنے کی بات اسی
لیے کی جارہی ہے کہ سینو رائیز کو میری دعوے کی
پاس داری پر شکوکہ شبہات ہیں۔"

"میں تمہاری شکل اور دست پونے بچنے میں تکلیف
ہوتی ہے۔"

وہ بے چارگی سے۔۔۔ بولی تھی گویا سکندر کے
پتے میں شامل کچھ الفاظ مجھ سے قاصر رہی تھی۔

کچھ دیر مزید وہاں کھڑے رہ کر اس کی
سڑکیں نور روم کی رات کو انہوں نے کرتے رہنے کے
بعد وہ دونوں بچے آگے تھے لیکن اس کے ساتھ کمرے

میں آئی تھی۔ وہ اسے دوا اور پال دے رہی تھی۔ ایک
ٹیلیٹ خود دل میں دبا رہے رہا تھا اس کی آج رات

اور کل صبح کے لیے ملا کر بس وہی ٹیلیٹس بچی
تھیں۔

"کل ڈرمیکھا سے یہ ٹیلیٹ یاد سے خرید
لیا۔" وہ کڑی برید سے نزدیک جھنجھی ہوئی تھی۔

"مے لیں گے۔" سکندر اسے جواب دیتے ہوئے
اس نے پانی سے دھو لگی تھی۔

"تم سو جاؤ اب جا کر۔ میں بھی سونے کی کوشش
کرتا ہوں۔"

"تم چاہو تو میں تمہاری دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر
باتیں کر سکتی ہوں۔ تم کیلئے لیٹ کر بیٹھ نہیں کیا کیا انا

سیدھا سو جیتے رہے ہو مگر بسٹہ ہوتے ہو اور پھر تمہیں
خند نہیں آتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"آج میں سینو رائیز محمود اور لن کی پیٹنگ کو
سوچتے ہوئے سوئی گئی۔" شرارت بھرے انداز میں
بولی۔

"اپنی خوبصورت چیزیں سوچنے کے تھک
خواب سکون آئے گی اور خواب بھی بڑے
آئیں گے۔"

وہ اس کے شرارتی انداز کا شرارت بھرتا
میں خواب دہی تو اب اس سے اٹھ گئی تھی۔



صبح وہ وقت پر اٹھ رہی تھی ابھی بھی اندھ
تھیں۔ انہیں پتا تھا آج سکندر لینے ہو لیں وہاں
جائے گا اور وہ یقیناً اپنی رات کی کئی بات کا ازالہ

چاہتی تھیں۔ اسے اپنی کی خود سے محبت پر بے
پار آیا تھا۔ وہ سکندر سے پوچھے اپنے سوالوں کو باقی

بچی غلط نہیں سمجھ رہی تھیں۔ مگر چونکہ وہ اسے
نہیں آئے تھے، سو اسے خوش کرنے کو وہ صبح

سکندر کے لیے خوب اہتمام سے ناشتا تیار کر رہی
تھیں۔

سکندر نے اور اس نے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا تھا۔
اپنی گرم گرم برائے تو اسے اندازاً رات دنوں کو

جیسے اور کوئی عجیبی کے ساتھ کھانے کے لیے لا کر
رہی تھیں۔

"آپ کو بہت زحمت ہوئی میری وجہ
سے۔" رخصت ہوتے وقت سکندر اپنی کا شکریہ ادا

کر رہا تھا۔ اس کا انداز مہذب اور پر تکلف تھا۔
"مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی ہے۔ میری بیٹی کے

دوست ہو نہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک روم میں
ہو، جب مل کر آجائے گا۔"

پر شفقت انداز میں بولتے ہوئے انہوں نے سکندر
کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سکندر نے آج بھی جانے کے

لیے اس کی گاڑی منگوائی ہوئی تھی۔
"تمہارا شکریہ نہیں ادا کر رہا ہوں۔" وہ روزانہ

تک اسے چھوڑنے آتی تھی۔ سکندر سنجیدگی سے اس
سے بولا تھا۔

"بہت اچھا کر رہے ہو، اگر کرتے تو مجھے بہت برا
لگتا۔"

ہوئی۔
 ہے؟

”شام تک ایک میٹنگ میں بڑی رندوں کا دورا ہے
 میں ایک نرمش جانا ہے۔“

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔
 اگر کوئی اور مصروفیت نہ ہوتی تو وہ اس سے ضرور ملا کر
 میٹنگ بھی ضروری تھی اور آفیشل ڈنر بھی یہ میٹنگ
 اس کے انکسپلنٹ کی وجہ سے ملتوی ہونے کے بعد
 آج ہونی چکی۔ اس کے بعد یہاں پہنچی کے ٹیکہ
 ایگزیکٹو کے گزرات میں ڈنر پر جانا تھا۔

”گویا آج ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے؟“ اسے لیرا
 کے لمبے میں مایوسی کی ہلکی سی جھٹک محسوس ہوئی۔

”ہاں! آج اور کل میں تھوڑا بڑی رندوں گے۔
 پرسوں کا کوئی پروگرام رکھ لیتے ہیں۔“

اب لیرا سے بات کرتے ہوئے اس کا جبہ ہمیشہ بے
 تکلف ہوا تھا۔ جس طرح باقی لوگوں سے وہ خود کو بہت
 فاصلے پر رکھ کر رہتا تھا، اس طرح اس سے نہیں مل پاتا
 تھا۔ اس کے ساتھ وہ بالکل اسی طرح ملتا تھا جیسا وہ
 تھا۔ اگر وہ خوش ہوا تھا تو اپنی خوشی اس پر ظاہر
 ہو جانے دیتا تھا، اگر اس کا موڈ خراب ہوتا تو اس اور
 دیکھی ہوتا تب بھی اپنی یہ کیفیات اس سے چھپا نہیں
 پاتا تھا۔

وہ کل رات بھی سو نہیں پایا تھا مگر لیرا سے مذاق میں
 کھی ہوئی بات پر عمل کرنا وہ اسے اور اس کی پیشہ جو
 کو سوچتا رہا تھا۔ فیملی سے بے شک نہیں اتنی خفیہ مگر
 وہ روزانہ کی طرح بے سکون اور مضطرب بھی نہیں رہا
 تھا۔ انکسپلنٹ کے بعد سے کبھی ڈاکٹر کی تجویز دینے
 وہ اسے فیلد آجاتی تھی اور کبھی نہیں وہ اس مسئلے کو
 سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ
 آج کل بازار پر سکون اور مطمئن کیسے ہے؟

وہ آفس میں تھا۔ لچ کاظم تھا تھوڑے لمحوں میں
 ہفت تھا۔ بغیر ناشتے کے لچ کا وہ صبح نہیں رہا کرتا تھا
 لچ جب کہ اس نے خاصا ٹھیک ٹھاک ناشتا کر رکھا
 لچ کا خیال بھی کیسے آتا۔ یہ ایک کانسٹرکٹ ڈرائیو
 کا صاحب اس کے موبائل پر لیرا کی کل آئی۔

”کیسی ہو مصور؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کل
 ہوئی تھی۔ نظریں لیرا سے ہٹا کر اس کی گالوں
 پر اسے ٹیک لگا کر اطمینان دینا چاہتا تھا، گوا فرصت
 نہ تھی شب کے لیے تیار ہو۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنا چارو طبیعت کیسی ہے؟
 زیادہ ٹھیک تو نہیں رہے خود کو؟ زیادہ چل پھر تو نہیں
 ہے؟ لچ کا؟“ میڈیسن خرید لی؟

وہ اس کے ایک سانس میں اپنی ساری باتیں بیک
 انت پوچھنے پر ہنس پڑا تھا۔

”یا خدا لیرا! تم تو واقعی بنی بنائی ماں ہو۔ میرے لاش
 نے کھانا کھایا اور ٹھیک تو نہیں۔ اس طرح کی فکر میں تو
 مرنا سہا ہی کرتی ہے۔“

”بات کو کھٹو نہیں۔ میرے سوالوں کا جواب
 دے۔“ وہ قدرے ناراضی سے بولی گویا اپنا مذاق اڑائے
 جانے پر رضا ہوئی ہو۔

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ پر انھوں والے
 اتنے دیوی ناشتے کے بعد لچ کون کر سکتا ہے لڑکی اور
 میڈیسن شام میں آفس سے جاتے ہوئے خرید لیں
 گا۔“

وہ میڈیسن ختم ہو گئی ہے اس بات کو سراسر بھول
 چکا تھا۔ اب لیرا کے یاد دلانے پر یاد آیا تھا۔

”ٹھیک ہے لیکن خرید لینا تو سب سے بڑا نہیں خود کو
 اس طرح انور کرنے کی عادت کیوں ہے تمہیں؟“

وہ سنجیدگی سے بولی۔ اس کے مسکراتے لب
 یک دم ہی سنجیدہ ہو گئے تھے چہرے پر درد سے بھرا
 ایک تار ابھر آیا تھا۔ خود کو مزید ذبح لائے جانے
 سے بچنے کے لیے اس نے فوراً پوچھا۔



وہ خلافِ ناولٹ مسکرا کر اور نرمی سے بولے۔

حیرت سی حیرت تھی اس نے اپنے باپ کو بہت سے شے اور مسکراتے دیکھا تھا۔ باہر دھڑکی حوالے لوگوں سے ملتے ہوں گے تو مسکرایا کرتے ہوں گے گھر کو تو بلا ضرورت انہیں مسکراتے اور بات کر رہی کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔

"آپ ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھیں گے نہیں ان لوگ دوسرے آئے ہوئے ہیں۔ آئی سے نو میری خوب باتیں ہو گئیں۔ میں سوچ رہی تھی آپ سے شام میں ملاقات ہوگی تب باتیں کرناں گی آپ سے بھی۔"

شہر مار خان ہونے والی ہو کے سب تکلفانہ انداز میں مسکراتے ہوئے نولٹ تھے۔

دھکائی بنا کر لے ہو پھر کر لیتے ہیں باتیں۔" لیونگ روم میں اس کے اور امون جان کے ساتھ آکر بیٹھ گئے تھے۔

ام مریم کافی بنا کر لے آئی تھی۔ امون جان کو اگر اس کے ہاتھ کی ہتھالی کافی پسند آئی تھی تو شہر مار خان اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے خوش نظر آ رہے تھے۔ کیپس میں جن حکیموں اور کلینز کی وہ نمبر تھی شہر مار خان اس سے ان کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ آگے کیا پرھنا چاہتی ہے، گیا کیا کچھ کرنا چاہتی ہے، وہ انہیں بتا رہی تھی۔ دیکھا کہ کافی بٹے ہوئے اسے جان کے ساتھ باتیں کرنا تھا مگر اس کے کان شہر مار خان اور ام مریم کی گفتگو پر گئے تھے۔

دھکائی ٹھیک ٹھاک طریقے سے امیر میں کر چکی ہیں آپ میرے ایرو گینٹ پیلاؤ۔" رات جب وہ ام مریم کو اس کے کمرے میں چھوڑنے جا رہا تھا تب مسکرا کر بولنا تھا۔

"اور ان کے بیٹے کو؟" ام مریم کا سوالیہ انداز شرارت سے لے ہوئے تھا۔

"بے چارہ تو آپ پر پورا کا پورا نثار اور ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔ "ام مریم کھانکھانہ نہیں پڑی تھی۔"

وہ پورا ام مریم اور اشکن میں تھے۔ شہر مار خان اور امون جان ان دونوں کی آمد سے بہت خوش تھے۔ سکندر چھیلوں کے آغاز میں اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں ٹھکونے چلا گیا تھا۔ اسے دو تین روز بعد آنا تھا۔

سکندر کے آنے یا نہ آنے سے اسے کوئی فرق نہ تھا۔ نہیں تھا اس لیے اس نے تو یہ پوچھا تک نہیں تھا کہ سکندر کہاں گیا ہے اور کب آئے گا۔ یہ معلومات امون جان نے اسے اور ام مریم کو اس کے پوتے بنی فرامہ کی شخصیت سے۔

ام مریم اس کے ماں باپ کے دل تو پیسے ہی جیت چکی تھی۔ اب یہاں ان کے گھر آکر ان لوگوں کے ساتھ رہ کر وہ ان دونوں سے مزید قریب ہو گئی تھی۔ خود اعتماد وہ بلا کی تھی اس لیے پہلی بار اپنی سسرال آنے پر فردوس تھی نہ شہر مار خان کی رعب دار شخصیت سے خائف۔

"آئی باتیں کافی بنا کر لاؤں؟"

رات کے کھانے کے بعد امون جان ان کے پاکستانی ملازم نگار کو کافی لانے کا کہنے لگیں تب وہ ان سے بولی تھی۔

امون جان اس کے خود کو گھر کا فرد سمجھنے کو پسند کرتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ شہر مار خان کھانے کی میز سے اٹھ کر جا رہے تھے۔

"انکل! آپ کافی نہیں پیئیں گے؟" باپ کا رعب اور دہرہ اس پر اتنا تھا کہ وہ ساری زندگی کبھی ان سے اس طرح بے تکلفی سے بات نہیں کر سکا تھا جیسے ام مریم کر رہی تھی۔

اس نے ام مریم کی خود اعتمادی کو بار سے دیکھا۔ وہ شہر مار خان کی شخصیت کے رعب میں نہیں آئی تھی وہ عزت اور احترام لیے بے تکلفی سے ان سے اسی طرح بات کر رہی تھی جیسے اپنے والد اور چچا سے کرتی تھی۔

"سیری کل اسٹڈی میں بھجوانے میری!"

کام ہڑی آسانی سے کر لیا ہے۔
 "میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم! اس کے
 لئے میں جذبات کی شدت تھی۔"

"میں جانتی ہوں اور میں بھی تم سے بہت محبت
 کرتی ہوں۔" وہ مرثا سا ہو کر مسکرایا تھا۔ پورا دن
 ساتھ کھوم پھر کر رات آتھ بچے کے قریب وہ دونوں گھر
 واپس آئے تھے شہیار خان اور اموجان لیونگ روم
 میں ساتھ بیٹھے تھے۔

"کھوم لیا واٹنگٹن؟" شہیار خان نے مسکرا کر مریم
 سے پوچھا تھا۔

"آپنی کہاں انکل! ابھی تو زمین نے ایک دو ہی
 جھپٹیں دکھائی ہیں۔ اب میرا دل چاہ رہا ہے ہم کہیں
 آؤنگ کے کچھ ایسا پروگرام بنائیں جس میں آپ اور
 آئی بھی ہوں۔ تب زیادہ مزا آئے گا۔" وہ سنے
 تکلفانہ سے انداز میں کہتے ہوئے شہیار خان کے
 سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"ہانکل بنانا چاہیے ایسا کوئی پروگرام ان فیکٹ
 میرے دل میں یہ خیال تھا جس میں سکندر کے آنے
 کا شکر ہوں۔ وہ بھی آجائے تب آؤنگ کے دو تین
 پروگرام بنالیتے ہیں۔"

شہیار خان ام مریم کے بے تکلف انداز کو
 مسکراتی پسند کرتی تھی ہولنا سے دیکھتے ہوئے پورے تھے
 جبکہ سکندر کے نام پر اس کے لبوں سے مسکراہٹ
 رخصت ہو گئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ذکر کے بغیر
 شہیار خان کی کوئی بھی بات مکمل کیوں نہیں ہوتی
 تھی۔

سکندر شاید کل یا پرنسوں آجائے گا۔ اموجان
 ابھی مسکرا کر یہ بات کہہ رہی تھیں کہ لیونگ روم کا
 دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا سکندر با توا بلند شوٹ
 و شہر سے اچھے میں بولا۔

"سکندر آچکا ہے اموجان! اس سمیت ان سب
 لوگوں نے گہروں گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔
 لائٹ براؤن ہیٹ ڈارک براؤن جیکٹ، منظر اور گلوڑ
 پے ہوئے اعرے باؤں اور یوں پر سیم کی

وہ جاننا تھا کہ اس کے پاپا کو اپنی ہونے والی ہول و
 بان سے پسند آئی تھی اور وہ اس کی ساتھ بیٹھ کر کالی
 بے کی خواہش رد نہیں کیا ہے تھے۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ہی وہ ام مریم کو لے کر
 گوبے نکل گیا تھا۔ شہیار خان اپنے آپس چلے گئے
 تھے۔ گھر اموجان تھیں۔ وہ دونوں سارا دن گھومتے
 رہے تھے۔

"تم پور تو نہیں ہو رہیں مریم؟ تمہیں میرے گھر
 آکر مڑا رہا ہے؟"

اس کا ہاتھ تمام کر مہرے پر چلنا بہت اچھا لگ رہا
 تھا۔ وہ دونوں بار کھوپ پلارک کے فلاور گارڈن میں
 لے ہوئے تھے۔

اور گروے شہر اور بے حساب پھول ہی پھول تھے
 وکٹس اور خوشنما پھول۔ رنگین خوشنما پھولوں
 اور محبوں کا احساس دلانے پھول۔ فلاور گارڈن کے
 بالکل درمیان میں وکٹس فوار اور اس کے چاروں
 اطراف پھولوں کا وسیع ام مریم چلتے چلتے رکی بھی وہ
 بھی رک گیا تھا۔

"تمہارا گھر؟" اس نے اسے فوراً "نوا" کا تھا۔

"میں نہہارے نہیں ہمارے گھر آئی ہوں زمین!
 میں نے آئی انکل کی دعوت قبول ہی اس لیے کی تھی
 کیونکہ میں میرا اور تمہارا یہ گھر دیکھنا چاہتی تھی۔" وہ
 مرثا سا ہو کر مسکرایا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے سب کچھ اک خواب جیسا لگتا
 ہے۔" وہ ام مریم کی انگلی میں بھی اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کو
 پراتر دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ
 رہی تھی۔

"میں نے تمہیں جانا اور اتنی آسانی سے تم مجھ ل
 بھی نہیں سچ مجھے اپنی خوش قسمتی پر خود بخود نہیں
 "آئی۔"

"یقین کر لو زمین شہیار ام مریم کے دل کو فتح
 کرچکے ہو۔" وہ شاہانہ سے انداز میں بول کر
 مکمل صلا کی تھی۔

نیت لیا آسانی میں تھا مریم کے لیے سب

مسکراہٹ کے ساتھ وہ بے حد پیٹھ سمٹ رہا تھا۔
وہ واقعی سکندر لگ رہا تھا۔ دل کو نڈر لگ رہا تھا۔
جیسے وہ ناکور کر سکتا ہے ہمیشہ کی طرح۔

سکندر کو دیکھ کر اس کے لبوں پر سے مسکراہٹ
نوراً رخصت ہو گئی تھی۔ ام مریم کے ساتھ ایسے گھر
پر یہ جیمیاں اب وہ اس طرح انکوائے نہیں کر سکے گا
جیسے کرتا چلا رہا تھا۔ یہ سن کر کہ سکندر اپنے دوستوں کے
ساتھ گھومنے پھرنے چلا گیا ہے اس نے دل میں
خواہش کی تھی کہ کاش کئی چھٹیوں میں سکندر گھر نہ
آئے مگر اس کی خواہش کہاں پوری ہوئی تھی۔ اس کی
چھٹیوں کا مزا خراب کرنے کے لیے وہ موجود تھا۔

سکندر کو دیکھ کر جو تاثر اس کے چہرے پر ابھر اٹھا
اس پر کسی کا بھی دھیان نہیں گیا تھا کیونکہ اسو
جانی مشہور خان اور ام مریم تینوں کے قیوں سکندر کی
جانب متوجہ تھے۔ اسو جان بے ساختہ صوفے سے
اٹھی تھیں۔

”آئیامیرا بیٹا۔ بس نمازی کی تھی گھر
میں۔“ انہوں نے سکندر کی بیٹائی پر بے اختیار ہار کیا
تھا۔ شہر پار خان بھی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔
”اس طرح اچانک؟ تمہاری ماں تو کہہ رہی تھیں
تم تو ایک دن بعد آؤ گے۔“ سکندر نے مسکراتی
نگاہیں ام مریم اور اس بیٹائی کیں۔

”بس بلائیے ہی مجھے بتا چلا زمین اور میری ہونے
والی بھابی خیر شریف لایچے ہیں میں نے اپنے بانی
سارے پروگرام کیسٹل کر دیے۔ پہلے ہی مجھے زمین کی
مشکلی میں شریک نہ کرنے کا ان افسوس ہے۔“
وہ مسکرا کر بولتے ہوئے صوفے پر اس کے برابر بیٹھ
جایا۔

”کیسے ہو زمین؟“
”میں ٹھیک ہوں۔“ ام مریم کا خیال کر کے وہ
قصداً مسکرا کر بولا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ام مریم اس کے اور سکندر
کے درمیان کسی قسم کی محسوس کرے۔ اس کے دل باپ کے
لیے یہ بدستغیب کی نہیں تھی کہ بیچن ہی سے وہ

دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت دور رہے۔
ام مریم اس بات پر حیران ہو سکتی تھی کہ زمین کی
اکھوتے بھائی سے کیوں بات چیت نہیں ہوئی۔ اور
وجوہات کو بیچن کی محرومیوں کو فی الحال ام مریم
سامنے لانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس سے خیریت پوچھنے کے بعد سکندر اب ام مریم
کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ لے سکرا کر دیکھ رہا تھا۔
”ہمت شوق تھا مجھے تم سے ملنے کا۔ میں نہیں
”تم“ کہہ سکتا ہوں میں؟“ دہشتے میں ان کو غصے بڑا ہوا۔
زمین کا بڑا بھائی جو ہوا۔“ وہ مسکرا کر خوش دل سے بولا
تھا۔

”بالکل کہہ سکتے ہو۔“ ام مریم سدا کی پراعتاد لڑکی
مسکرا کر بھرپور اعتقاد کے ساتھ بولی تھی۔

وہ سکندر کے چہرے کو انور دیکھ رہا تھا جو اس وقت
مکمل طور پر ام مریم کی جانب متوجہ تھا۔ وہ سکندر سے
بہت دنوں کے بعد مل رہا تھا۔ جب سے ام مریم اس کی
زندگی میں آئی تھی وہ سکندر سے نہیں ملا تھا۔ بالکل
ملنے وہ بے تحاشا حسین اور غیر معمولی لڑکی بیٹھی تھی
جسے اس کی زندگی کی سادھی بیٹا تھا۔ وہ سکندر کے
تاثرات کو انور دیکھ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار کچھ ایسا اچھا ہوا تھا جو اس کی
تک سکندر کی زندگی میں نہ ہوا تھا۔ اس نے سکندر
سے پہلے اپنی زندگی کی سادھی جن لی تھی اور جسے اس
نے چاہا تھا اس کی فکر کی لڑکی سکندر سادھی زندگی
م تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک عجیب
سی خوشی محسوس کی تھی۔

سکندر اس وقت بیکسے کھل کر اسے اذرا ام مریم
کو الگ الگ تھنے رہا تھا۔

”یہ میری طرف سے تم لوگوں کی مشکلی کا تحفہ۔“
سکندر سے وہ تحفہ قبول کرتے ہوئے سکندر کا
خوشی اور مسکراہٹ سے بھرپور انداز دیکھتے ہوئے۔
لگ رہا تھا کہ سکندر خوش ہونے کا شخص ڈرامہ کر رہا
ہے۔ وہ خود سے ہر معاملے میں کتر جھوٹے بھائی کو
سے آگے براعتا ام مریم جیسی حسین دے ملے۔

سید کے پاس پہنچا اور اس نے اسے دیکھا تو اس نے اسے
 "ہاں"۔ "میرے پاس زمین کی ایک ایکڑ ہے جس کا نام ہے
 "بنجارا چاہتا ہوں۔"

اسے ایسا لگا تھا کہ سکندر نے اسے اتراتی زمین سے
 لے کر دیکھ کر کہے گا۔ "میں نہیں دوسری زمین دے سکتا ہوں
 رہا ہے جو میں نے اپنے لیے منتخب کی ہے۔ یہ وہ زمین ہے
 میری اقل اور میری حرص میں بنجارا چاہتا ہے۔ میں
 نہیں دے سکتا ہوں کہ اسے۔"

سکندر نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا، مگر وہ ایک دم ہی
 عجیب سی الجھن اور بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔
 کہیں امیر میرم کو یہ نہ بتا چل جائے کہ وہ سکندر جیسا
 بے نیکی کو کشف کر رہا ہے۔

"مجھے جب آئی ہے بتایا کہ زمین کا ایک بھائی بھی
 ہے، تب میں اتنی حیران ہوئی تھی۔ زمین نے مجھ سے
 کہیں بھی تمہارا کوئی ذکر نہیں کیا۔" سکندر اپنی منہ
 والے دل سے بے جا چاکل زمین کا کوئی بھائی بھی ہے۔
 امیر میرم اس کی سوچوں سے انجان ہو کر انداز میں
 سکندر سے مخاطب تھی۔

اس نے سکندر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر
 دکھ اور حیرت بھر ایک تازہ بھڑک۔

"بس! میرے بھائی صاحب ایسے ہی
 ہیں۔" سکندر چہرے پر ابھرتا ہوا دکھ فوراً ہی چھپا کر
 منکرات ہوئے۔ "مجھے انداز میں بولا تھا کہ
 کوئی کاغذ لے لیتے ہوئے وہ بھی بدلتا منکرات ہو جاتا تھا۔
 "آئی نے بتایا تھا تمہارے انگریز امیر دور ہے تھے،
 اس لیے تم بھاری منکرات نہیں آتے تھے۔"

"ہاں! لانا شے کی بیروت اچھے کر دے تو بیرونک روم
 میں آکر بیٹھ گئے تھے۔"

امیر جان بکھن میں خاندان کو گھر کے متعلق ہدایات
 دے رہی تھیں۔ ان کے بچے بہت دلوں بعد کھڑے
 تھے۔ یہ ہر کھانے اور ہر ناشتے میں خاص اہتمام چاہتی

مانتا تھا تاکہ کرکے کرکے خوش ہو سکتا تھا؟

کم لطفی کی بات تھی، مگر وہ زبان کے اس بہتار کو
 بے وقوفی سے دیکھ کر اسے اپنے سید آئی یا انا زندگی ہے اس
 تمام پر خود سے مات کھاتے دیکھ کر غیب سی خوشی اور
 حماقت اپنے اندر اترتی محسوس کر رہا تھا۔

صبح ناشتہ کی میز پر امیر میرم اور سکندر ساتھ تھے۔
 امیر جان ان لوگوں کا ساتھ دینے بیٹھی تھیں وہ وہ
 ناشتا شہر یا دلوں کے ساتھ صبح کی گرجی تھیں۔ شہر باز
 نان و فخر چاہتے تھے۔

"جلی صبح کا اٹھا ہوا ہے۔ سکندر نہ کہہ رہا تھا میں ناشتا
 زمین اور میرم کے ساتھ کھوں گا۔" امیر جان اسے اور
 میرم کو تار رہی تھیں۔

"تم چیلر میں بھی صبح جلدی اٹھ جاتے ہو؟"
 میرم نے آیت کھاتے ہوئے سکندر سے پوچھا
 تھا۔ وہ اسی دوستانہ وہ شکلف انداز میں سکندر سے
 گفتگو کر رہی تھی جس طرح باقی سب سے کیا کرتی
 تھی۔

"ہاں! بس عادت ہے۔ شروع سے میری صبح جلدی
 اٹھنے کی۔" وہ اپنے لیے تو سب پر کھنکھار رہا تھا۔ میرم
 اب سکندر سے اس کی پڑھائی کے حوالے سے گفتگو
 کرنے لگی تھی۔ وہ کیا رہا ہے وہاں ہے جس لائبریری میں

رہا رہا ہے اور کیا کیا ناشتا میں رہ رہا ہے اسے چونکہ
 سکندر کے ساتھ بائیں کمرے میں تھا۔ کوئی دیکھی
 نہیں تھی اس لیے وہ اس گفتگو میں شامل ہونے کے
 بجائے اخبار کی سرشوں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے ناشتا

کرنے میں مگن تھا اس کے ساتھ بھی وہ نہیں چادر پاتا تھا
 کہ میرم سکندر کے ساتھ زیادہ خوش اخلاقی دکھائے
 مگر اس سے روکنے کے لیے اسے امیر میرم کو اپنے اور
 سکندر کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں بتانا پڑیں

وہ ابھی پاتا چادر نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے مقابلے
 میں خود کو کمتر سمجھتا ہے۔ خود اپنے بھائی سے ہمیشہ ہر
 بات میں پیچھے رہا ہے۔ اسے اپنے بھائی کے نظریات ہوا
 ہے سب زبان سے کہتا ہے وہ دوا لگ رہا تھا۔

"بس! کا مطلب ہوا تمہارے اور زمین کے

تھیں۔ وہ بیوی کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ام مریم اور سکندر باہم کر رہے تھے۔
 "میں کا مطلب ہے تم کافی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہو۔"

مریم نے سکندر کو اپنے مضامین، تعلیمی کارکردگی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے بتایا۔ وہ تعریفی انداز میں بولا تھا۔ جس طرح ہر کوئی ام مریم کی فائت اور اس کی خواہشات سے متاثر ہوتا ہے، اسی طرح سکندر بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

"مریم! کہیں باہر چلیں؟" وہ چٹھیلوں میں گھروس لیے تو نہیں آیا تھا کہ سکندر کے ساتھ بیٹھ کر اپنا خون جلانے۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تب وہ بیوی ریموٹ سے بند کر کے ام مریم سے بولا۔

"چلو اچلتے۔" سکندر ریموٹ بھی چلے۔ "مریم فوراً چلے برائے ہوئی تھی مگر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سکندر کو بھی چلنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ اوھر اس نے سکندر کا نام لیا "اوھر اس کا دل چاہا" وہ باہر جانے کا روبرو اس کی منزل سے منسوب کر دے۔ "نہیں! تم دونوں جاؤ۔ میں کچھ وقت اموجن کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

شکر تھا۔ اسے اتنی عقل تھی کہ وہ چلنے سے انکار کر دے۔ ان دونوں کے بیچ اس کی موندگی کی کوئی شک نہی نہیں تھی۔ وہ اور ام مریم گھونٹے پھرے نکل گئے تھے۔ انہوں نے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی تھی۔ لیکن بھی باہر کیا تھا اور بے مقصد سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ خوب ہنسے تھے اور بہت انجولے کیا تھا۔



رات میں شہیار خان ان سب لوگوں کو باہر دُور کرانے لے کر گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ یہ دُور بطور خاص ام مریم کے ہمارے ہیں۔ جو پہلی بار اپنی ہونے والی سہراں آئی ہے۔ اس کے اعزاز میں دُور تھا۔ اس مناسبت سے وہ خوب محل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہنا تھا اور اس سیاہ لباس میں وہ

بچپنا حسین لگ رہی تھی۔ سیاہ لباس کے اوپر اس کی سیاہ کشمیری شال اور حسن کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اس کی شان پر ہر کشمیری دھانکے کے کام بنا تھا۔ اس نے کاتوں میں بڑے آؤر بڑے پکین رنگے تھے اس پر سیٹھے تھے۔ میک اپ وہ دائمی کوئی ایسرا لگ رہی تھی۔ وہ پورے پچھپچھے زبان ان کے لیے میرے لیے تھی۔

شہیار خان اپنی ہوسنے والی ہو کو کسی معمولی بنا کر نہیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے اس دُور کے لیے شہر بہترین ہوئی کا انتخاب کیا تھا۔

وہ اموجن اور شہیار خان کے ساتھ والی کمری پر بیٹھ گیا تھا۔ سکندر ان کے سامنے والی کمری پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر والی کمری پر ام مریم بیٹھ گئی تھی۔

کھانے کے دوران تاریخ کو بے سیاست مناسبات ان تمام موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ ام مریم کی شہیار خان کے ساتھ۔ شہیار خان اس گفتگو میں اپنے لاڈلے کو بھی شامل کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر تاہم کیوں سکندر کچھ چپ چاپ تھا۔ وہ گفتگو میں شامل تو ہو رہا تھا مگر یوں جیسے کسی اور بات میں اس کا ذہن الجھا ہوا ہو۔ کچھ اور سوچ رہا ہو۔ اس نے چند ایک بار سکندر کی ام مریم کی جانب انٹھنی تنجید نگاہیں دیکھی تھیں۔ اس بے نیاز مسجید اور خاموشی کے ساتھ سکندر نے ام مریم کو کیوں دیکھا تھا۔ وہ کبھی سے قاصر تھا۔

ام مریم اسی طرح چمک رہی تھی وہ شہیار خان اور سکندر سے یونان یونانوں اور ان کی تہذیب پر باتیں کر رہی تھی۔ شہیار خان دلچسپی سے اپنی معلومات اور کے ساتھ شہر کر رہے تھے جبکہ سکندر سنجیدہ تھا۔ خاموش تھا وہ کھنکھن رہا تھا۔ پھر کبھی کبھی اٹھا مسکرا رہا تھا۔ سکندر کے اس عجیب و غریب انداز کو وہ قلعا سمجھ گیا تھا۔



چلتے۔ ام مریم مسکرا کر برقی صوفے پر بیٹھی تھی۔
ام مریم کو دیکھتا دیکھ کر اسے بھی بخوبرا وہاں بیٹھنا
پڑ گیا تھا۔ ام مریم نے سکندر کے ہاتھ میں صوفے اور برقی
فروٹ کی پلیٹ سے کاجو اٹھا کر کھایا۔

”کیا بورنگ ٹیم دیکھ رہے ہو؟“ بچو اور لگاؤ۔ ”او“
بنیں کاجو اور اٹھا کر کھاتے ہوئے ام مریم نے سکندر
کے ہاتھ سے صوفے لے کر چیل تبدیلی کروایا۔
سکندر راک ورمی صوفے پر سے اٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟“ اچھا
دیکھو یہ تم جو دیکھ رہے تھے۔“

ام مریم کا ہنستا مسکراتا بے تکلف انداز و سہمی تھا
جیسا وہ سب کے ساتھ رکھا کرتی تھی مگر سکندر کا
بر عمل بڑا عجیب تا سچ میں آئے والہ تھا۔

”تم لوگ لی بی۔“ ”کچھ“ ”وہ سخت اور بے باک ہے
بچے میں کہہ کر وہاں سے جانے لگا تھا۔“

”ہم آئے اور تم اٹھ کر جا رہے ہو کیا ہمارے
ساتھ بیٹھنا نہیں چاہ رہے تھے سکندر؟“

ام مریم کے اس سوال کے جواب میں سکندر کو
اخلاق اندیش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی مذہب بات کہہ دینی
چاہیے تھی مگر وہ بڑے صاف گو اور واضح انداز میں
بولا۔

”ہاں۔ میں اس وقت آ گیا، بیٹھنا چاہتا تھا۔“ ”مسیحیہ
انداز میں جواب دینے کے بعد وہ ہاں دے گا نہیں تھا۔ تیز
تیز قدم اٹھا تا سیر جھول کی طرف بڑھ گیا تھا۔“

”سکندر کو کیا ہوا زین! کیا یہ میرے چینل تبدیل
کر دینے سے ناراض ہو گیا ہے؟“

حیران پریشان سی ام مریم نے اسے دیکھا تھا۔ ام
مریم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر ناراض ہوا
جائے کر سخت ہوا کیا جائے۔ سکندر بلاوجہ بد مزہ
کر کے گیا تھا۔ اس کا خون کھول گیا تھا مگر وہ ضبط کر کے
چپ تھا۔ مگر حال وہ سکندر کے خلاف ام مریم سے کچھ
گستاخ نہیں چاہتا تھا۔

”بس اس کی عادت ہے اسی طرح کی تم پلیز مائنڈ
مت کرو۔“ ”سکندر پر اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے

سکندر صرف اسے رات ہی نہیں بلکہ صبح بھی کچھ
پپ چپ محسوس ہوا تھا۔ اور شاید کسی نے اس کی
ناوشکی کو بہت زیادہ محسوس بھی نہ کیا ہو مگر وہ سکندر
کے ہر اندازہ کو بغور دیکھتا اور محسوس کیا کرتا تھا۔
سکندر ناشتے کی میز پر کل صبح کی طرح چمک نہیں رہا
تھا۔

وہ ام مریم سے بھی کم کیمٹ کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ
لفگوا مو جلد اس سے ہو رہی تھی یا پھر کسی کسی وقت اس
کے سیٹ سے انداز کے بلا جواز اس سے بھی مخاطب
ہو رہا تھا مگر ام مریم سے وہ کم۔ مخاطب ہو رہا تھا کم بات
کر رہا تھا۔ اسے سکندر کا رویہ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔

”او سکندر! کاؤ ڈو کیلے ہیں۔“ ناشتے کی میز سے
اٹھتے ہوئے ام مریم نے اسے اس سے پوچھا کہ وہ لوگ
کوئی ٹیم کھیل نہیں لے رہے ہاں پھر ہی تو وہ سکندر سے
بولے۔

”سورسی مریم! تم لوگ کھیلو۔ مجھے ذرا۔۔۔ کام
چاہیے۔“

وہ سنجیدگی سے معذرت کرتا میز پر سے اٹھ گیا
تھا۔ ابھی وہ سکندر کے اس عجیب و غریب رویے پر ہی کو
بوج رہا تھا کہ شام میں اسے سکندر پر خچک ٹھاک قسم
فائدہ آ گیا۔ آج ان کے گھر پر کمرہ اور سرائے نو کے
بالے سے پارٹی تھی جس میں دانشمندان کے وہ تمام
ایسٹ اور اتر و سوخ رکھنے والے افراد تھے شہنشاہ خان
کے دوست تھے مدعو تھے ان افراد میں سیاست دان
بھی تھے مسیٹر ز بھی تھے کاروباری حضرات بھی علمی
فنکار کینیوں کے ایگزیکٹوز اور چیف ایگزیکٹوز بھی
تھے۔

گھر پر پارٹی تھی اس لیے وہ پورے دن کے لیے تو
بروم کو لے کر چھوٹے نہیں نکلا تھا بس یونی آس پاس
نوز بہت گھوم پھر کر وہ دونوں داہن آگئے تھے وہ
زرد داخل ہوئے تو داؤج میں سکندر آ گیا بیٹھا نظر آیا۔
اور ان کی فروٹس کھاتے ہوئے نیوی پرنٹ بال کا کوئی
نڈیہ رہا تھا۔

”معلوم یہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہو ہمارے ساتھ

وہ ام مریم سے تری اور پیار سے بولا تھا۔

رات پارٹی میں وہی تمام اہتمام تھا جو شہزاد خان کی پارٹی میں ہوا کرتا تھا۔ جس خوب صورت سنشن میں وہ رہتے تھے۔ اس کا ایک پڑا ہوا شمار ان کے گھر پر پارٹیز کے لیے مخصوص تھا۔ آج بھی پارٹی کا وہیں اہتمام تھا۔ شہزاد خان سکندر عوں کے تقریباً اسی نام پر عمران پارٹی میں موجود تھے۔ وہ جو اس کا خلاس لے کر ایک طرف کھڑا تھا۔

شہزاد خان سکندر کو ایک اپنے ایک نئے دوست جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے سی ای او تھے ان سے ملوا رہے تھے۔ سکندر ایک سوٹ میں بے حد شاندار لگ رہا تھا۔ شہزاد خان پارٹی میں سکندر کو اسی طرح اپنے خاص انٹرویو سونچ رکھنے والے دوستوں سے ملوایا۔ متعارف کروایا کرتے تھے گویا سکندر کے عملی زندگی میں قدم رکھنے کی تیاریاں انہوں نے ابھی سے شروع کر رکھی تھیں۔ وہ اس کے سطرے مستقبل کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے۔ اس کو غالباً کسی سے اس لیے نہیں ملوایا جاتا تھا کہ وہ سکندر کی طرح ان کے دوستوں اور ملنے جلنے والے اوسے میعار کے حامل لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال نہیں تھا۔ جن لوگوں سے وہ واقف تھا ان سے وہ اسلام کرچکا تھا۔ اب بالکل تھا کھڑا تھا۔

ام مریم پر انہیں تیار ہو کر ابھی تک کیوں نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنا ذہن سکندر اور شہزاد خان سے ہٹا کر چاہا تھا۔ نہیں اب ان باتوں پر اس کا دل نہیں دیکھتا کہ بالکل بھی وہی نہیں ہے۔ اب اس کے پاس اس کی زندگی میں ام مریم ہے۔

ام مریم کمرے میں داخل ہوئی دیکھائی دی تھیں اسے اس کے دیر سے آنے کی وجہ سے بچھ میں آئی۔ بہت اہتمام سے تیار ہو کر کئی کئی بجت دل سے منہ چھانے لے آئے تھے میں جو خوب صورت اور بیش قیمت جوڑا دیا تھا اس نے وہ پسینہ برکھا تھا۔ جیسے

سیاہ رنگ اس کے لیے چاہا اسے ابھی صبح رنگ اس کے لیے چاہا تھا۔ اس کے لیے ہی بنا تھا۔ ہر رنگ اس کے لیے چاہا تھا۔

پارٹی میں جتنی لڑکیاں جتنی خواتین شہزاد خان سے کوئی ایک بھی اس جتنی نہیں لگتی۔ اسے آنا دیکھ کر اس کی تمام کلفت دور ہو کر وہ مسکرا اٹھا۔ وہ بھی اسے دور سے دیکھ رہی تھی۔ شہزاد خان سکندر کو اپنے جن واقف نام سے جانتے تھے۔ وہ اسے جانتے تھے۔ سکندر اب وہاں سے اسے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ اسے دوسرے کمرے سے نظر آ رہا تھا کہ سکندر اور ام مریم کا آسانا سنا ہوا تھا۔ ام مریم مسکرا کر اس سے کچھ بولی تھی اس چہرے پر خوشی تھی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ سکندر نے سنجیدگی سے بغیر مسکراہٹ نہ جانے اس سے ایسا کیا کہ تھا کہ ام مریم کا چہرہ ایک ہی ہوا گیا تھا۔

آج ایک ہی دن میں سکندر نے دو خواتین پارٹی کے ساتھ ایسا کرکٹ رویہ اختیار کیا تھا۔ اس ام مریم سے جو کچھ بھی کہتا تھا وہ کہہ کر رکھتا تھا فوراً ہی وہی اسے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے تن میں اب ایک لگ بھگ تھی۔

سکندر ہوا کون تھا؟ ام مریم سے بد اخلاقی پر تمیزی سے جیسے آنے والا وہ اس گھر کی ہوسے شہزاد کی ہونے والی بیوی ہے۔ وہ مہمانوں کا تیار کر کے، منقہ کی نزاکت کا احساس کر کے خواتین گھونٹنے کرچ رہا تھا۔

شرمندہ شرمندہ ہی ام مریم وہاں اپنی طرح چاہ کھڑی تھی۔ وہ فوراً ہی اس کے پاس آگیا۔ "گناہوار مریم! اس کا خیال تھا وہ فوراً سکندر کے اندر ہی شکایت کرنے کی گھر وہ ام مریم تھی۔ اس ام مریم سے اتنی چھوٹی بات کہے کر کہتی تھی کہ اس نے بھائی کے خلاف اس سے کچھ کہی۔ وہ فوراً ہی اس کے منہ سے مسکرائی تھی۔

"کچھ نہیں میں تمہارے ہی پاس آ رہی تھی۔" "خوش ہو ناں مریم! تمہیں یہاں کوئی کام ہے؟"

تو اس نے کہا کہ وہ گھر آ رہی ہے۔ "پہلے گھر آ کر مجھے کچھ کہیں برا کہنا۔"

فودا" بعد اس کے ایگزائمز ہوتا تھا۔ اسے بہ سبب جھوٹ معام ہو رہا تھا۔

پچ تو یہ تھا کہ سکندر اسے اور ام مریم کو ایک ساتھ دیکھ نہیں پا رہا تھا، ہوش جیتنے کی ایسی عادت پڑی تھی اسے کہ زندگی میں پہلی بار زمین سے بار بار اس سے سنا نہیں پا رہا تھا، اپنی جان اور حسد جب کسی اور طرح نہیں ظاہر کرنا تھا تو ام مریم کے ساتھ سپاٹ لب و لہجہ اور کراخت انداز اپنا کر اس رشتے پر اپنی تابندگی کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ سکندر کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا ورنہ ام مریم سے بدتمیزی کے مظاہرے پر اسے کھڑی کھڑی سنا دیتا اس کی طبیعت صاف گہرینا۔ شام میں سکندر کمرے سے نکلا تھا۔

"بڑے بڑی ہو صبح سے۔ او بیٹو ہم لوگوں کے ساتھ۔"

وہ اور مریم شطرنج کھیل رہے تھے جب سکندر سیر حیدر سے اترتا نظر آیا۔ ام مریم اس کی نکل کی بد اخلاقی بھٹا کر مسکرا کر بولی۔

"تو فہرستس۔ میں ابھی بھی بڑی ہوں۔"

"چھیل میں اس طرح چڑھاؤ کون کرنا ہے؟ ہم مریم نے اس سے کہا۔

"میں کرنا ہوں۔" وہ سنجیدہ اور قدورے رویے سے انداز میں اسے جواب دینا چن میں جا گیا تھا۔

ام مریم شرمندہ سی ہو گئی تھی، اس کے چہرے پر خفت نظر آ رہی تھی وہ سکندر کے رویے پر ام مریم سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا کیا سوچ رہی ہوگی وہ بھی کہ دین کا اگلا تاجانی اتنا کراخت ہے اسے گھر آئے مہمان سے اخلاق برتا بھی نہیں آتا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا میں مریم ابھی سکندر کی عادت اسی طرح کی ہے۔ سوچی ہے بہت براست ماننا اس کی کسی بات کا۔"

اسے سکندر پر شدید غصہ آ رہا تھا مگر اپنے غصے کو سکندر کی طرف سے مسکرا کر ام مریم سے بہت بات کہنی پڑی تھی۔ وہ اسے کیسے جانتا کہ میرا اٹھنا بھاگنا مجھے اور

سے اتنا پیار کرتے ہیں آئی انکل اور سب سے بڑھ کر تو تم۔ تم نہ تھے ہونو خوش کیوں نہیں ہوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس نے سب سے اختیار ام مریم کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ام مریم نے سکندر کا نام نہیں لیا تھا، وہ اس فہرست میں شامل ہونے کے قابل تھا بھی نہیں۔ اس وقت اس بل جب وہ ام مریم کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اس کی اچانک ہی سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر کچھ فاصلے پر اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑا تھا اس کی نقابوں میں وہ دل میں ہی بر مرکز تھیں۔ اور اس بل سکندر کی نقابوں کا نام پڑنے میں وہ ہرگز ہرگز غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ سکندر کی نقابوں میں اسے ام مریم کو ساتھ کھڑا دیکھ کر پشیمندی تھی غصہ تھا۔

وہ اسے اور مریم کو ایک ساتھ دیکھ کر خوش نہیں تھا۔ سکندر کے جس رویے کو وہ ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا تھا ایک دہائی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ سکندر ام مریم کو اس کی زندگی میں دیکھ کر خوش نہیں تھا۔

"بس انا ساوصلہ ہے تم میں سکندر شہریار! میں ساری زندگی تمہاری برائی برداشت کرتا آیا ہوں اور تم سے آج میری ایک معمولی سی خوشی اور برتری برداشت نہیں! ورنہ؟ بس صرف ایک دن ڈھونگ رچا سکے میری خوشنہیں میں خوش ہونے کا؟ اب وہی کم ظفری دکھا رہے ہو۔ اسنے حاسد اور کم ظرف ہونم سکندر شہریار کہ بھائی کی خوشی نہیں دیکھی جا رہی تم سے؟ ام مریم جیسی شاندار، دھیمی اور غیر معمولی لڑکی تمہارے اس معمولی بھائی کو مل گئی ہے اس لیے حسد کرو رہے ہو مجھ سے؟"

اس نے سکندر کے لیے دل میں نفرت اور غصہ محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا۔

اگلے دن سکندر زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہا تھا بٹول امہ جان کے وہ پڑھائی کر رہا تھا کہ چھینوں گئے

اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ اور یہی
اور شہزاد خان کے سامنے یہ کہنا کہ وہ ام مریم
ساتھ جانا چاہتا ہے اسے چھپچھورپن محسوس ہوا تھا۔ ام
مریم ابھی تیار ہو کر نیچے نہیں آئی تھی جبکہ امو جان
تیار کھڑی تھیں۔

شہزاد خان نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں
امو جان کان کی ایک دوست اور ان کے بیٹے کو بٹھا
کر لے جائے۔ سب بیٹیں جمع تھیں اور کوئی کسی کی
گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور کوئی کسی کی تاکہ اپنے ہم
سراج افزو کے ساتھ پکنک اسپاٹ تک جانے کے
طویل اور خوب صورت راستے کو انجوائے کیا جاسکے۔

ام مریم کو تیزی میں وقت لگ رہا تھا۔ وہ بہت
اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ دل مسرتا ہے یہ بتا کر
کہ وہ امو جان ڈیو کو لے کر جا رہا ہے وہ گھر سے روانہ
ہو گیا تھا۔ ایک لمبے سفر کے بعد وہ لوگ پکنک اسپاٹ پر
پہنچ گئے تھے۔ آگے پیچھے سب ہی کی گاڑیاں وہاں پہنچنے
لگی تھیں۔ تھوڑی سی دیر میں سب وہاں پہنچ چکے تھے
سوائے ام مریم اور سکندر کے۔

سکندر کی دو کیوں فکر کرتا اسے ام مریم کی فکر ہوئی
تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب سے پوچھ لیا تھا۔
ام مریم کسی کی بھی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ شکر تھا
کہ جلد ہی ام مریم اسے آئی دکھائی دے گی تھی ورنہ
وہ پریشان ہونے لگا تھا۔ سکندر کے ساتھ اس کی
گاڑی میں آئی تھی۔ اس نے سکندر اور ام مریم کو
آگے پیچھے وہاں آتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ساتھ کہیں
چل رہے تھے۔ سکندر ام مریم سے بہت آگے تھا وہ
پیچھے تھی۔

سکندر کے چہرے پر غصہ نظر آ رہا تھا۔ مریم چپ
چپ سی لگ رہی تھی۔ اسے یک دم ہی فکر لاحق ہوئی
تھی۔ کیا سکندر نے پھرام مریم کے ساتھ بد تمیزی سے
بات کی تھی؟ اسے سمجھ کہہ دیا تھا۔ اسے وہ نہ کر خود پر
غصہ آ رہا تھا۔ آخر وہ مریم کو گھر پر چھوڑ کر کیوں گیا تھا۔
کسی اور کی نہیں ام مریم اس کی ذمہ داری بھی شہزاد
خان جو بھی کہہ رہے تھے اسے کہہ دینا چاہیے تھا وہ

انہیں مانتا دیکھ کر جیلس ہو رہا ہے، اس سے
پہلو ملے بھائی کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی۔ جو
ظرف مجھ میں ہے کہ بچپن سے اس کی کامیابیوں اس
کی جیت میں اس کی برتری کو قبول کرتا آتا ہوں وہ ظرف
خود میں کہاں سے لائے؟ تمہاری جگہ کوئی عام سی لڑکی
میری منتظر ہوتی تو اسے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اسے
تکلیف اسے معمولی بھائی کو ایک غیر معمولی لڑکی کے
ملنے پر ہے۔ کیا اسے یہ دُر بھی ہو کہ چاہے ساری دنیا
کی خاک بھی چھان لے مگر تم سے ہر تو کیا تمہارے
جیس بھی لڑکی اپنے لیے وہ خود ہمیں پائے گا۔
ام مریم اس کی سچوں سے انہیں مسکراتے ہوئے
اسے یقین دلا رہی تھی کہ اس نے سکندر کی کسی بات کا
برائ نہیں مانتا ہے۔

اگلے روز ان لوگوں کا پکنک کا پروگرام تھا۔
پروگرام شہزاد خان نے اپنے بچوں اور ہونے والی بہو
کے لیے بطور خاص بنایا تھا۔ شہزاد خان اور امو جان کی
جن چند فیملیز سے زیادہ قریبی دوستیاں تھیں وہ پہنچ
فیملیز بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔

کل ملا کر وہ تینس چھپس افزو تھے جو پکنک پر
جا رہے تھے۔ صبح سویرے ان لوگوں کی روٹ لگی تھی۔
ان کے فیملی فرینڈز میں وہ فیملیز پاکستانی تھیں ایک
انڈین اور دو امریکن۔ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں
جا رہے تھے۔ وہ لوگ میری لینڈ کے مشافعات میں
بہاؤوں کے دامن میں واقع خوب صورت اور قدرتی
حسن سے بالامال۔ پھیل کے پاس پکنک منانے جا رہے
تھے۔ وہاں خوب صورت پھیل کے ساتھ
سولمنٹ پونٹک اور فٹنگ کی سولیات موجود
تھیں۔ کیمپنگ کے لیے بھی وہ جگہ بڑی آئیڈل تھی
وہاں خوب صورت قدرتی آبشار بھی تھی۔ گھڑ سواری
کلی ہو یا کنگھ وہاں تمام سولیات موجود تھیں۔
اس کی خواہش تھی کہ وہ ام مریم ایک ساتھ گاڑی
میں پائلنگ کرنا جائے۔ مگر فیملی کے ساتھ پکنک میں وہ

اس نے سکندر اور اس کی بد تمیزی پر لعنت بھیج کر اس سے صرف نظر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سکندر شہیار اگر کم ظرف تھا تو وہ تو نہیں اس کے جتنا نیچے از سرگستا تھا۔

شروع میں تھوڑی سی درجہ چب رہنے کے بعد ام مریم بھڑکی جتنی بولتی ام مریم بن گئی تھی۔ وہ واقعی اس کی جی سائیسی اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوئی تو اس کے بھائی کی بد تمیزی پر اس کے سامنے رو ہو کر اسے بھائی سے جھگڑا کرنے لگتی تھی اس سے زبردستی نہ کر سکتی بلکہ ایک فاشا لگ جاتا۔ سب کی کینک کامرز خراب ہو جاتا۔

مریم نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا مگر تھوڑی سی دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ سکندر کا موڈ ہنوز خراب ہے۔ وہ بہت چب بھی ہے اور ایک دیباہ باغض بھی اس کے چہرے پر نظر آ رہا ہے۔ وہ ام مریم کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بد تمیزی کی حد تک وہ اور ام مریم ساتھ چلی کا شکار کر رہے تھے ان دونوں کے ساتھ ساتھ وہاں اس کے چہرے ایک انکل ابراہن کے بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے جب پچھلیوں کی کچھ تعداد جمع ہو جاتی تھیں ان کے ساتھ آئے ملازمین نے انہیں دھونا اور صاف کرنا تھا پھر پچھلیوں کو گرل کرنے کا کام اس کی امواجان اور انہوں نے انجام دیتا تھا۔

سکندر اور شہیار خان جھیل سے کچھ فاصلے پر گھاس کے اوپر باقاعدہ نیٹ باندھ کر ٹینس کھیل رہے تھے وہاں۔ پر موجود منہبوط اور طویل درختوں کے درمیان انہوں نے نیٹ باندھ رکھی تھی۔

”انکل ٹینس کتنا اچھا کھیل رہے ہیں۔“ ام مریم نے گردن کھما کر شہیار خان کو دیکھتے ہوئے دیکھ کر اس سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ بلیا باقاعدہ ایکسپریٹ اور سونمختی وغیرہ کرتے ہیں اسی لیے ان میں اس طرح کے کھیلوں کے لیے اچھٹنا ہے۔“ اس نے بھی گردن کھما کر اسی

ف کیسٹا تھا۔

”چلو۔۔۔ ہم بھی وہیں چلیں۔“ شہیار انکل کے ساتھ

ام مریم کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔

”کیا ہوا مریم! تمہیں دیر کیوں ہو گئی؟ ہم سکندر کے ساتھ آئی ہو؟“

”سکندر کا کیمرا نہیں مل رہا تھا، اس نے مجھ سے کہا، میں اس کے ساتھ مل کر اس کا کیمرا ہونے دوں۔ اس چکر میں ہائی سب گاڑیاں چلی گئیں۔“

”وہ مسکرا کر اسے بتانے لگی۔ ام مریم سے سیدھے مزید بات کرنا نہیں تھا اور کیمرا تلاش کرنے میں اس سے مدد مانگنی؟

اسے سکندر کے اس دغلے بن پر شدید غصہ آیا تھا مگر اس نے یہ ہرگز ہرگز نہیں سوچا تھا کہ سکندر نے ام مریم کو جہن بوجھ کر ہانہ بنا کر اپنے ساتھ روکا تھا۔ یہ بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔

اس کو تو بس سکندر کے دغلے بن پر غصہ آیا تھا اور پھر اس کے بعد یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ کیسے سکندر نے راستے میں اس طرح کی سی بد تمیزی اور بد چہرہ کا مظاہرہ ام مریم کے ساتھ نہ کر دیا ہو جس طرح آج کل کیا کر رہا تھا۔ براہ راست ان ہی لفظوں میں تو یہ بات اس سے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ہاں اس نے سمجھے کہ سرسری سنا کر ام سے انداز میں یہ ضرور پوچھا تھا کہ راستہ تو ٹھیک سے گزرا ہو گئی پر اب ہم کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

ام مریم نے مسکرا کر جواب دیا کہ راستہ بالکل سکون اور آرام سے گزرا اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ ام مریم کی غیر معمولی اچھائی ہی تھی کہ وہ اس کے بھائی کے خلاف اس سے کچھ کہہ نہیں رہی تھی ورنہ کینک اس بات پر پہنچنے کے فوراً بعد جو تاثر ام مریم کے چہرے پر تھا اسے دیکھ کر وہ جانتا تھا کہ سکندر نے راستے میں

مریم کے ساتھ اسی اچھے اور اسی بد تمیز انداز میں کوئی بات کی تھی جس کا وہ آج کل کافی مظاہرہ کیا کر رہا تھا۔ چند دنوں کی چھٹیاں گزار کر ان دونوں نے یہاں سے چلے جانا ہے، بھڑو باہر کون سا سکندر رہنے لے رہے ہوں گے پھر ملازمت بات پر صاف سے لگانہ کیا ہے۔

ہونے کی وجہ سے سکندر نے محض چار پانچ منٹ میں ان لوگوں کے ساتھ کھیلنا ہوگا پھر وہ ایک دم ہی شہر خان سے بولتا۔

شہریار خان نے اسے خبر سے دیکھ کر اس کا ہاتھ اگڑا دیا۔ یہاں بھی رہا قاتل بھی بہت واضح تھا کہ وہ اس کے اور ام مریم کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا وہ ان دونوں کے وہاں آجانے کی وجہ سے وہاں سے کھیل چھوڑ کر جا رہا تھا۔

”یہ تم تو پورا کر لو۔“ شہریار خان نے ایک نظر ام مریم اور اس پر ڈالنے کے بعد سکندر سے سنجیدگی سے کہا۔

”یہاں میرا سوڈو نہیں ہو رہا۔ میرا سوڈو ہارکنگ کا ہے۔“

سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے وہ اسی وقت کھیل چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں موجود ان تینوں افراد میں سے کسی کو بھی یہ بات سمجھائے جانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ زمین اور ام مریم کی وجہ سے وہاں سے گیا ہے۔

”چلو ہم لوگ کھیلتے ہیں۔ زمین اب تم کھڑے ہو کر نہ کھو۔ میرا اور مریم کا کھمبہ۔“

شہریار خان نے فوراً ہی ماحول کے تیز فوٹو کرنے کی کوشش کی تھی، مسکرا کر اس سے بولے تھے۔

شہریار خان اور ام مریم کھیل رہے تھے۔ اپنے جہن اور حسد میں سکندر تیز تہذیب سب بھول گیا تھا۔ اس کا سوڈو بپ سے بھی خراب ہو گیا تھا۔

یہاں دیکھ کر ان کا ڈالا پختہ دینا کر کے گیا تھا۔ اس لیے اسے سو فیصد یقین تھا کہ اسے بعد میں بھی کیلے میں بھی اس بات پر کچھ نہ کہیں گے، جبکہ اگر یہ ہی حرکت دکر کر کے گیا ہو تو آج کھڑا پس جانے کے ساتھ ہی اس کی ٹھک ٹھاک کا اس نے لیا جاتی، اسے تیز اور تہذیب سیکھتے اور مہینوں کا خیال رہنے کی ہدایت کی جاتی۔

چمک برائی سارا وقت اس کا سوڈو خراب رہا تھا۔ ام مریم کی خاطر بسا اور بولا تھا اور تہذیب اس کا

کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے، انکل اتنا اچھا کھیل رہے ہیں۔“

ایسا اپنے جیتنے کے ساتھ کھیل رہے تھے وہ وہاں جاتا نہیں جاتا تھا۔ مگر ام مریم کی خواہش اس سے رو نہیں کی جا سکتی تھی۔

”چلو۔“ وہ دونوں وہاں آگئے تھے۔

”انکل! آپ بہت اچھا کھیل رہے ہیں۔“ ام مریم ایک انٹرنیٹ میں اس سے پہلے ان لوگوں تک پہنچ گئی تھی سو اس سے چند قدم پیچھے تھا۔

”فلسفہ سنیں۔“ شہریار خان مسکرائے تھے۔ وہ بھی اب مریم کے ساتھ کھلا تھا۔ قصداً ”سکندر کو نظر انداز کر کے صرف باپ کو دیکھ رہا تھا۔“

”انکل! میں اور زمین بھی کھیلیں، آپ لوگوں کے ساتھ۔“

”بالکل کھیلو، آج دو تم دونوں بھی۔“ انہوں نے ام مریم کو مسکرا کر خوش دلی سے جواب دیا۔ وہاں سے ریٹائر ہو کر وہاں۔“

اس نے سکندر کے چہرے پر تپندہ رنگی ابھرتی دیکھی تھی، کیا سکندر ان دونوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا تھا؟

وہ سکندر کا ہر سربکھی بھی نہیں جانتا چاہتا تھا وہ شہریار خان کا پارٹنر نہیں گیا تھا اور ام مریم سکندر کی بات ایسا لگا تھا جیسے اس کا اور مریم کا وہاں آجنا اور ان کے کھیل میں شامل ہو جانا سکندر کو پسند نہیں آیا تھا۔ وہ شہریار خان کی طرف ان کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور ام مریم سکندر کے ساتھ۔

”انکل! میں بھی بہت اچھا کھیلتی ہوں، آپ کو ہرا دوں گا۔“

ام مریم کی شوق لہجے میں کی بات پر شہریار خان قہقہہ لگا کر رہے تھے۔ انہیں ہونے والی ہوس کی خود اعتمادی پسند آیا کرتی تھی۔

”ایہا! آپ لوگ کھیلیں، میں بھول گیا تھا۔ مجھے ضرور اور شاہان کے ساتھ ہارکنگ کے لے جانا ہے۔“

ان دونوں کے وہاں آجانے اور کھیل میں شامل

”جی اموجان! تھوڑا اونٹنگ کا موڈ ہے۔“
 ”سکندر! تم بھی چلو ہم لوگوں کے ساتھ۔“ ام مریم
 سکندر سے بولی تھیں۔

اسے ام مریم کے اس ضرورت سے زیادہ اچھا
 ہونے پر غصہ آیا تھا، بندے کو اتنا اچھا بھی نہیں ہوتا
 چاہے ایک شخص مسلسل آپ سے برائی کر رہا
 ہے۔ ”کیونکہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اس پر نگرہ اس کے اس
 رویے کے لیے ام مریم کو غلط بھی نہیں سمجھ رہا تھا وہ
 جانتا تھا مریم فطرتاً اور علاناً ”میں کچھ اور دوستانہ
 مزاج رکھنے والی لڑکی تھی۔“

وہ سکندر کو ذہن کا بار بھائی سمجھ کر مسلسل عزت
 دے رہی تھی۔ وہ اپنے سرسراہٹ میں اپنے ہونے والے
 ”سرسر“ اس اور چھ سب کے اور اپنا اچھا تاثر قائم
 کرنا چاہتی تھی، اپنی سرسراہٹ کے ان تینوں افراد کے
 ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا اپنی تھی۔

ام مریم کی خواہشات غلط نہیں تھیں، بس دیرپاری
 لڑکی یہ نہیں جانتی تھی کہ ذہن کا بار بھائی ایک حاسد اور
 کم ظرف انسان ہے۔ وہ بھائی کو کچھ کر خوش ہونے کا
 ظرف نہیں رکھتا، وہ اپنے چھوٹے بھائی سے حسد میں
 مبتلا ہے۔

”میرا موڈ نہیں، تم دونوں جاؤ۔“ سکندر نے ام
 مریم کو بے حد سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ وہ اعانہ
 دکھانے کو بھی نہیں منکر لیا تھا۔

”تم ہم لوگوں کے ساتھ کیسے پر بھی نہیں جاتے“
 ”جی تو چلو سکندر!“ ام مریم نے دوبارہ اصرار کیا۔
 ”میرا خیال ہے میں تمہیں منع کر چکا ہوں، میں
 نہیں جانا چاہتا۔“

اس بار سکندر کا انداز سخت اور کھردرا تھا۔ شہسوار
 خان اور اموجان نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ ام
 مریم اپنی انسلٹ پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

”چلو مریم! اور ہو رہی ہے۔“ غصے سے اس کا رباغ
 کھول گیا تھا اس نے فوراً ”جی ام مریم سے چلنے کے
 لیے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا غصہ بہت واضح
 تھا۔ وہ ام مریم کو ساتھ لے کر فوراً ہی لوگ رو منے

پونے کسی بھی چیز کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سکندر بھی
 پلنگ میں باقی سارا وقت ان دونوں سے بہت الگ
 تھلک رہا تھا۔ زبان جہاں پر بھی وہ اور ام مریم تھے
 وہاں پروہ اگر موجود ہو اتنا نہیں دیکھنے کے بعد یا تو وہاں
 سے کہیں اور چلا جاتا تھا یا پھر اسے اور مریم کو نظر انداز
 کر کے کسی نہ کسی لڑکے یا لڑکی کے ساتھ باہر میں
 مصروف ہو جاتا تھا۔

غصے کے ساتھ اسے حیرت بھی تھی، شدید حیرت۔
 بچپن سے لے کر آج تک، کبھی اسے یہ اندازہ نہیں ہوا
 تھا کہ سکندر اپنی حاسد فطرت کا مالک ہے۔ اسے جیسے
 کی ایسی بات نہ پہنچے ہے کہ اب کیسے پر بھی اپنا نمبر وہ
 ہوتا ہوا دوسرے نہیں سبک۔ سکندر کی موجودگی میں اپنے
 گھبر یہ چھٹیاں گزارنا اس کے لیے مشکل ہو جا رہا
 تھا۔ وہ دلنا مکت کن کر چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کر رہا
 تھا۔ پلنگ سے اگلے روز بھی چھٹی ہی کا دن تھا اتوار تھا۔
 شہسوار خان گھر پر تھے۔

ام مریم اپنے غم سے پہلے کافی دیر تسکین کے ساتھ
 ان کی اسٹڈی میں رہی تھی۔ ان کا کتابوں کا کلبکشن
 دیکھتی رہی تھی۔ انہوں نے اپنی پسند ایک کتاب اسے
 منا لینے کے لیے بھیج دی تھی، جو ان کی اپنی سو
 کے لیے پسندیدگی کا واضح اظہار تھی۔ ایسے ویسے کسی
 کو تو ان کی اسٹڈی میں داخل ہونے تک کی اجازت نہ
 تھی۔

”اب تھوڑا غم آپ میں بھی رہے گی۔“
 کمانے کے بعد اس نے مریم سے چھیڑنے والے
 انداز میں کہا تھا۔
 ”کیا یاد کرو گے دیا بولو کیا موڈ ہے؟“ وہ شاید سے
 انداز میں بولی تھی۔

”میں باہر چلتے ہیں۔“ وہ اسے چارے دیکھ کر بولا۔
 مریم فوراً ”جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ وہ دونوں
 جانے کے لیے تیار ہو کر لوگ روم میں آئے تو وہاں
 شہسوار خان اموجان اور سکندر بیٹھے تھے۔

”کیسے جا رہے ہو تم دونوں؟“ اموجان نے پوچھا
 تھا۔

طرح کھل کر مریم کے خلاف سازشیں اٹھ رہا تھا۔

غصے اور نفرت نے سکندر کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ چال اٹھانے کی وہاں سے لیٹ گیا تھا۔ اسوہ بنی اسے آواز بھی دی تھی، انہیں خدشہ ہوا تھا، ناراض ہو کر جا رہا ہے، مگر وہ اس طرح باہر نکل گیا تھا جیسے ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ ام مریم کو ساتھ لے بیٹل ہی باہر نکل گیا تھا۔

اس کے دل میں بہت غلہ جمع تھا بہت نفرت تھی۔ مختلف سرکوں پر بیٹل چلتے اس نے ام مریم کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ کیسے وہ پیشہ اپنے بھائی کے مقابلے میں نظر انداز کیا یا بسے کیسے اسے بہتہ سکندر سے کم تر سمجھا گیا۔ اب اس نے ام مریم کو صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اس کے اور سکندر کے درمیان کبھی بھی دوستانہ تعلقات نہیں رہے ہیں اور نہ ہی کوئی قائم ہو سکتے ہیں۔ اس نے ام مریم سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اسے سکندر کو اس کا بھائی سمجھ کر اس کے ساتھ خوش اخلاقی اور اہمیت ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

رات اسوہ چلنے سے اس کا دل سکندر کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بتا کر کہ سکندر کا وہ مطلب نہیں تھا جو اچانک اندر آنے پر اس نے بنا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے سکندر کو سمجھا دیا ہے اب، ایسی کوئی بات نہیں کرے گا جو اسے باہر مگر کو بری لگے۔

وہ ماں کے دل کو تسلی دینے کے لیے مسکرا بھی رہا تھا، نہیں یہ یقین بھی دینا تھا کہ اس نے کوئی بھی بات دل پر نہیں لی، مگر وہ حقیقت سکندر کی کوئی ایک بھی بات گور کوئی ایک بھی روئے اس کے دل سے نکلا نہیں تھا۔ اسوہ جان اور شہزادہ خٹنا اپنے لاڈلے بڑے بیٹے کے بدتمیز رویے پر حیران، دل تو بول، کم از کم ات کوئی حیرت نہیں تھی، کم ظرف اور حاسدہ شخص کم ظہنی اور حسد ہی ظاہر کر سکتا تھا اور کچھ بھی نہیں۔

اس نے سوچ لیا تھا وہ چھٹیوں کے نیچے بالی

باہر نکل گیا تھا۔

مریم ابھی بھی شرمندہ سی تھی، نفرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج ام مریم سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دے گا کہ وہ سکندر کو اپنا سرور سمجھ کر بوسے والا جیٹہ سمجھ کر زین کا بڑا بھائی سمجھ کر کسی بھی وجہ سے اہمیت دینا اور اسے منہ لگا چھوڑ دے۔ بٹاؤ میں سنی بھالی کی عزت۔ جب اس کے بھائی کو اپنی عزت اور دشتے میں پہلی کا خیال نہیں تو کب تک ام مریم کے سامنے اس کی حاسدہ نفرت کا پردہ رکھ سکتا ہے۔

وہ صاف لفظوں میں ام مریم سے یہ بہر حال پھر بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سکندر کی قسم بدتمیزی کرنے اور جنہیں آنور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم سے بری طرح متاثر ہے اور تم جیسی بے مثال اور غیر معمولی لڑکی اسے نہیں بلکہ مجھے مل گئی ہے، اس بات نے اسے جلن اور حسد میں مبتلا کر دیا ہے۔

وہ غصے میں باہر نکلا تھا گاڑی کی چابی سینئر نہیں لے لیا تھا بھول گیا تھا۔ ام مریم کو پورچ میں کھڑا جمہور گروہ چال اٹھانے اندر آیا تو اسے وہاں سکندر سے کہہ رہی تھیں۔

سکندر بڑا ہو گیا ہے تمہیں بلانا گھر آئے مہمان سے کوئی اس طرح بات کرتا ہے؟ اور مریم سرفراہ مہمان نہیں بلکہ اس گھر کی ہونے والی ہو ہے، انہیں نہیں جانا تھا، تم آ رہے ہو، کبھی منع کر سکتے تھے۔

شہزاد خان سمجھ رہے ہوئے خاموشی سے سکندر کو دیکھ رہے تھے جو کسی بات پر چراہوا نظر آ رہا تھا۔

ہوئے والی ہو؟ مجھے لگتا ہے اسوہ جان؟ آپ نے اور پاپا نے زین کی منگنی کا فیصلہ جلد بازی میں کر دیا ہے؟ کچھ ام مریم کچھ خاص پسند نہیں آتی ہے۔

اسوہ جان کچھ کہنے کے لیے کب کھول رہی تھیں مگر اس وقت ان کی اس پر نظر پڑی تھی۔ سکندر اور شہزاد خان نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سکندر کے چہرے پر گھبراہٹ آتی دیکھی تھی۔ غالباً وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ زین اور مریم گھر سے جا چکے ہیں تب ہی اس

میں بلایا جا رہا ہے۔

"تم چلے جاؤ زین!" وہ آہستہ آواز میں بولی تھی۔
"مگر کھیر اکیلے بور ہوگی، تم بھی چلو میرے ساتھ۔" فون پر آنے کی ہائی بھرے کے بعد اس نے ام مریم سے کہا۔

"دیکھو نیند آ رہی ہے زین! دوبارہ دیر بھر سے جاگا نہیں جائے گا۔ پائل میں پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔"

کئی رات ان دونوں نے دیر تک جاگ کر ایک مودی نہ کبھی تھی پھر کارڈز کھیلے تھے بہت دیر سے سوئے تھے وہ دونوں صبح نو دو بجے اٹھا تھا مگر مریم آج صبح بھی جلد بیدار ہوئی تھی بس اسے یقیناً نیند آ رہی ہوگی۔

"میں ٹھیک ہے" پھر تم لیٹ کر آرام کرو" میں چلا جاتا ہوں۔"

ام مریم نے مسکرا کر سرانٹ میں بلایا تھا۔ وہ پائل میں چلا گیا تھا۔ صوفیاں پر بھی اسے ام مریم ہی کا خیال تھا۔ ایس وہ اکیلے بورتہ ہو رہی ہو اس کے دوست لے لے اور بھی ہو لگتا جا رہے تھے۔ مگر وہ دیکھتے بعد ہی گھر واپس آگیا تھا۔ ام مریم کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔ گویا وہ سو چکی تھی۔ وہ بڑا بھری نگاہ اس کے کمرے پر ڈال کر اپنے کمرے میں جانے لگا۔ سکندر کے کمرے کی لائٹ بھی بند تھی۔ سکندر کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا تو اسے کمرے میں چلا گیا تھا۔

آج صبح 31 دسمبر کی صبح تھی۔ ام مریم کے کمرے کا دروازہ ابھی بھی بند تھا۔ وہ یقیناً ابھی سو رہی تھی۔ اور وہ اس کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے سو اچھوڑ کر خود ناشتے کے لیے نچے اٹھیا۔ وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے لگا تھا۔ گرو اگل ہوتے ہوئے ٹھنک کر روک گیا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے اسے ڈائننگ روم کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ صوفیاں موجود افراد سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل پر سکندر، اموجان اور شہیار خان بیٹھے تھے۔ وہ صبح کا ناشتہ کر رہے تھے۔ بلکہ یہ ان

سکندر کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اور ام مریم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گھومنے پھرنے میں گزار دے گا۔ وہ ام مریم کے دل سے سکندر کے دھنسنے کے سبب پیدا ہونے والی سب گفت اور کوفت دور کرونا چاہتا تھا۔

مریم اس کے کہنے پر اس کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی وہ چاہتا تھا یہاں سے واپس کے وقت ام مریم اس کے ساتھ گزارا کرے ان چھٹیوں کی بہت اچھی یادیں ساتھ لے کر جائے۔ مگر اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود ام مریم لب و لہجہ میں جپ سی رہنے لگی تھی۔

بظاہر وہ سب کے ساتھ جتنی باتیں کرتی تھی مگر اسے اس کے چہرے پر کبھی خوشی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ بٹھانے لے جاتا تو وہ جپ ہی جپ ہی محسوس ہوتی۔ یہ سب سکندر کے دھنسنے کے سبب تھا۔ وہ ام مریم کی جپ کو دیکھتا تو اسے سکندر پر مزیدیش پڑتا۔

سکندر سے اس کا اور ام مریم کا سامنا بہت کم ہو رہا تھا۔ سکندر دیر تو گھر ہی نہ ہوتا اگر گھر ہوتا تو زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہ کر تھا۔ پھر وہاں کا بلانہ بنا کر۔ وہ تین دو گھر کی رات بھی جب شہیار خان اور اموجان کبھی پائل میں گئے ہوتے تھے۔ سکندر وہاں سے اپنے کمرے میں تھا۔ بقول اس کے پڑھ رہا تھا۔ اس نے ڈنر بھی کمرے ہی میں کیا تھا۔ وہ اور ام مریم ٹیونگ روم میں کھانا کھاتے ہوئے ہی پر ام مریم کی پسند کی مودی دیکھ رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے بجائے لیونگ روم میں بیٹھ کر کھانے کی فرائض ام مریم ہی نے کی تھیں۔

کھانے کے دوران اس نے بچپن کے دوست ٹیبل کا فون اٹھا تھا۔ وہ ایک پاکستانی بزنس مین کا بیٹا تھا اور اس کے اسکول کے دنوں کا دوست تھا۔ اس نے اپنے گھر پر کوئی سربراہ نہیں رکھی تھی اور اس سے آنے پر اصرار کر رہا تھا۔

ٹھوڑی دیر وہ انکار کرتا رہا مگر جب فیصل باقاعدہ تار اس ہونے لگا تب اس نے بے چارگی سے ام مریم کو دیکھا۔ وہ ساتھ بیٹھی اس کے جوابات سن رہی تھی۔

چاہیے کہ شہر بارخان اور انبجہن تاشہ کر رہے تھے۔
سکندر چھو بھی نہیں کنار با تھا وہ بے حد سنجیدہ تھا وہ
بہت سنجیدگی سے شہر بارخان سے کہہ رہا تھا۔

”ایلا! آئیٹ کو نہیں لگتا آپ نے زمین کی سنگینی
کرتے ہیں جھڑی جلد بازی سے کام لیا ہے؟“
اس کے چہرے پر غائب آگیا تھا۔ وہ اس کا سا بھائی
کس قدر اس سے حسد کرتا تھا۔ اس کی خود سے ایک
معمولی سی بڑی اور خوشی بھی اس سے سہی نہیں
چاہی تھی۔

”کلیا مغایب؟ تم یہ بات دو تین روز پہلے بھی کہہ
رہے تھے کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

شہر بارخان سنجیدگی سے سکندر کو دیکھ رہے تھے
کہ وہ اس کے چہرے پر کچھ بچتا چاہتے ہوں یا سوچیں
بغیب سے سکندر کو دیکھ رہی تھیں۔

”ایلا! زمین ابھی چھوٹا ہے، نہیں سناں کی عمر میں
شاہی گاہا بڑا فیصلہ؟ اسے تھوڑا پیچور تو ہو جانے
وہ۔“

سکندر قدرے ہلکی کر آہستگی سے بولا تھا۔ اس کی
غصے سے بری حالت تھی۔ وہ خود پر ضبط کیے سکندر کی
کہو اس سن رہا تھا۔

”۳۲ صر کی معاشرے کے لحاظ سے بیس سال کی عمر
اس طرح کے فیصلوں کے لیے جھولی عمر نہیں ہے
سکندر ام بھی کوئی اچھی ٹیلی کی انکی اپنے لیے منتخب
کر لے مجھے تمہاری منتہی پر بھی کوئی اعتراض نہیں
ہو گا۔“ شہر بارخان چاہے گا گھوٹ لیتے ہوئے سنجیدگی
سے بولے۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے ایلا! پر یہ ام مرم مجھے زمین کے
لیے کچھ زیادہ پسند نہیں آتی ہے ہمارے زمین میں ابھی
تک ساہی اور بچیا ہے جبکہ ام مرم مجھے کافی تیزی
تھی ہے۔“

اس کا دل چاہا آگے بڑھے اور سکندر کے منہ پر ایک
تھپڑ مار دے۔ ایسی خاسد فطرت کا مالک تھا وہ؟ اس
سے چھوٹے بھائی کی زندگی کی ایک خوشی برداشت
نہیں ہو رہی تھی۔ بلا ہر اس کا بعد روٹا وہ شہر بارخان

سے ام مرم کے خلاف زیر انگ رہا تھا۔
بھائی کی محبت کے لہوے میں لپٹ کر وہ اس
کی زندگی کی واحد خوشی ام مرم کو نہیں لے سکتا تھا۔
”یہ تمہاری غلط فہمی اور وہم ہے سکندر۔“
کہنے سے پہلے بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ تم نے ان
مرم کے رشتے سے خوش نہیں ہو۔ اب تم نے ان
پسندیدگی کی وجہ بھی بتا دی ہے تو میں کم سے کم
انہوں کا کہ مرم کے متعلق تمہاری تیز رویشیں نا
ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت سچی ہوئی اور
سچی دار ہمارے گھر کی ہو بننے کے لائق۔“ شہر بارخان
آہستہ کو وہ منت پسند ہے۔“

شہر بارخان کا جواب بھی اس کے ہنر پر بھرت گشت
اور نفرت کو بچا نہیں سکا تھا۔ وہ اس وقت نوواں سے
لپٹ گیا تھا۔ مگر جب وہ لوگ تاشہ کی بیڑ سے اٹھ گئے
اور سکندر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا تب سیدھا
اس کے کمرے میں آگیا اس نے دروازہ پر دستک کی
رجعت نہیں کی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھا اور وہ دروازہ
سے کھول کر اور پھر اسے زور وار دھماکے سے دبا کر بند
کر کے اندر آگیا تھا۔

”زمین۔ آؤ زمین۔“

سکندر بیڈ پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اسے اندر
آنا دیکھ کر وہ نے اختیار بند سے اٹھا تھا۔ وہ کئی سالوں
بعد سکندر کے کمرے میں آتا تھا۔ سکندر اس سے
مصنوعی محبت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں
خوشی سے اس کے نزدیک آتا تھا جیسے اسے اپنے
کمرے میں دیکھ کر بے بنا خوش اور حیران ہوا ہو۔

”شکر خرم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے ف
سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑا ہے تم نے زمین؟“
بھائی الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں تو کیا ایک
دوسرے سے فون پر بھی بات نہیں کرتے؟“

اس نے سکندر کی اس جھولی محبت اور چاہت کو
نفرت سے دیکھا تھا۔

”مجھ سے جھولی محبت جتانے کے بجائے دو
ہمارے دل میں میرے لیے ہے۔“

سے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے۔ موافقوں سے شہر بار کی سلامتی کیلئے کوہاٹ میں انڈیا ٹروپیا تھا۔ سکندر کو کل شام اپنی پارٹی میں بلاتے۔ وہ وہاں پر کمر کا قیام یہ کہہ کر کہہ کر گھر پر اپنا رومیا اور حسرت مکمل کرنا تھا جو پیشیوں کے طور پر ابد اس کے لئے اپنے پرو فیسر کو جمع — سکندر کا تھا۔ ام مریم کہہ رانی تھی کہ وہ پارٹی میں جائے گی۔

”انکل نے آئے بار سے کہا ہے کہ مریم بھی پہلے گی۔ مریم بھی ہماری قیامی کا حصہ ہے۔ اگر میں نہیں گئی تو انکل کو اچھا نہیں لگے گا۔“

طبیعت کی ہما سازی کے باوجود وہ اس کے باپ کی خاطر پارٹی میں جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے اموجان سے بھی یہ ہی کہا تھا کہ وہ پارٹی میں جا رہی ہے۔ حالانکہ اس کا چہرہ دیکھ کر بتی چاہی رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے پارٹی میں بیٹھا نہیں جائے گا۔

”بیٹا! تم گھر پر آرام کر۔ پارٹی میں جا کر ٹھوڑے ٹھوڑے طبیعت کہیں وہاں خراب نہ ہو جائے۔“ اموجان نے مریم سے کہا وہ اسے ڈانٹ کر کوکھا کر لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے انہیں روکنے کے لیے دوادے دی تھی۔

وہ خود بھی اب پارٹی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ مریم کو اموجان نے اس کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ بیماری میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مریم پروری تھی۔

شہر بار خان کے جرمن دوست نے ان کے تمام فیملی ممبرز کو دعوت دی تھی۔ اگر شہر بار خان کے بچوں میں سے کوئی بھی ساتھ نہ جاتا تو یقیناً وہ رہا مانتے۔ وہ مریم کو دوادے کر اسے آرام کرنے کی ہائیکر کر کے شہر بار خان اور اموجان کے ساتھ گھر سے روانہ ہوا تھا۔ مریم کو لیونگ روم میں صوفے پر کشنوز وغیرہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے اور ان کی پرکھتا چھوڑ گیا تھا۔

جرمن انجینیئر ڈاکٹر ان کے گھر سے کافی دور تھا۔ وہ لوگ راستے میں تھے اور اپنے گھر سے کچھ دور آچکے تھے۔ جب اموجان کو اچانک ہی جائز میں ان کے سامنے اس کے سامنے وہ وہ انجینیئر ڈاکٹر کے گھر سے

اور غیر معمولی ذہن لوگ کا ساتھ مجھے کیوں مل رہا ہے؟ اسی بات کی تکلیف ہے نا تمہیں؟“ وہ نفرت سے چٹکارا سکندر کو دیا۔ ”نور!“ یہی رسائی سے بولا تھا۔ ”تمہارا انتخاب درست نہیں ہے زین! کیسے سمجھاؤں تمہیں، مریم کسی بھی طرح شمارے کے مناسب نہیں ہے۔“

”میرے لیے کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب اس کا فیصلہ میں خود کروں گا تم نہیں۔“ وہ نفرت اور فحش سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔ ”میری ہمدردی کی آڑ میں آتھو اگر تم نے بابا یا اموجان سے مریم اور میرے رشتے کے خلاف کچھ کہا تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔“

اس نے انکی انکار اور تنگ دینے والے انداز میں سکندر سے کہا۔ سکندر جواب میں بالکل چپ کھڑا تھا۔ وہ نفرت اور غصے سے اسے دیکھتا چہرہ نکالتا اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔ سکندر کو وارننگ دیے۔ اس کی طبیعت صاف کرنے کے بعد بھی اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ آخر اس کی جرات کیسے ہوئی ام مریم کے خلاف بابا اور اموجان کے ذہنوں میں زہر اندیڑنے کی ان کا بریں واٹس کرنے کی۔

ام مریم سو کر اٹھ جاتی تھی۔ اس کی خاطر اس نے زبردستی اپنا موڈ ٹھیک کیا تھا۔ خود کو ہنسا مسکرا رہا اور خوش باش ظاہر کیا تھا۔ مگر ام مریم کو یہ نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ بہت چپ تھی۔ اسے فکر ہوئی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہے۔ یہ بتا رہی تھی کہ رات میں اسے بخار بھی چڑھ گیا۔ انکیاں بھی ہوئی تھیں۔ اس نے ٹانٹے سے پیانی انکار کر دیا تھا۔ اس کے اصرار پر صرف چائے لے لی تھی۔

ام مریم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب اس کا ترج پارٹی میں جانا تو بہت مشکل لگ رہا تھا۔ آج اسے اور ام مریم کو شہر بار خان اور اموجان کے ساتھ تیلو ایر کے حوالے سے ایک پارٹی میں جانا تھا۔ یہ پارٹی جرمن

تھے

وہاں جو مناظر اس نے دیکھا کاش اسے نہیں پہلے یہ مر گیا ہوتا۔ کاش وہ مر گیا ہوتا۔ چاہیے کہ اسے خود کو بچانی ام سرگرم کاریت پر سکندر کی گردن میں لٹکی۔ وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر رو رہی تھی وہ چار دیواری میں۔

”چھوڑو مجھے خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں سکندر! مجھے چھوڑ دو۔“

وہ خود کو سکندر کے مضبوط وجود سے جکڑنے سے چھوڑنے کے لیے اپنی مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ چیخ کر رہی تھی۔

سینڈویچ

وہ سینڈویچ فزولس اور کافی پر حصار کرتی کل شام سے اسٹوڈیو میں تھی۔ بیٹ کر کے لیے اس کے اندر کے آؤٹس کی ترب پوری طرح بے دار تھی۔ بغیر کسی وقفے کے کام کر رہی تھی۔ مٹی پر نہ کہ اس کی طرح کی کیفینٹوں سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ آکر یہ تو کہہ رہی تھیں کہ وہ رات کا کھانا پیچھے آکر کھالے ہاتھ کر لے۔

جب وہ منع کرتی تو کھانا ہاتھ کیوں سے نظریں اٹھائے بغیر اور ہی پھرتا جانے کی بات ہوتی، جب وہ کیوں سے انگریز اٹھائے بغیر اس سے انکار کرتی تب وہ اس کے لیے سینڈویچ ہاتھ پائی اور پھر کافی بنا کر اوپر ہی لے آتیں۔ وہ ملی شرت اور ٹریک سوٹ کے ٹراؤزر میں لمبوس تھی بالوں کو لیٹ کر کچھو میں جکڑ رکھا تھا۔

مجھے کیا رہے تلور فزولس کی آرٹ گیلری جس میں اس کی تصویروں کی نمائش ہوتا تھی۔ اس کے ڈائریکٹر کا فون آگیا یہ پوچھنے کے لیے کہ اس کی کتنی تصاویر مکمل ہو چکی ہیں۔ انہیں یہ اطمینان ملا کہ مقررہ وقت تک وہ اپنا کام پورا کر کے گئی، اس نے چھوڑ دی جساں کے تیار لے کے بعد فون پر جھٹکوا حتم کی تھی۔

بار ہے تھو نہ امیر کے حوالے سے کلیک چاکلیٹس، پھول، ایک مشہور مصور کی پائی مینی ٹیٹنگ جو اموجان نے خوب صورتی سے بیک کر دیا رکھی تھی۔ امیسیبلہ کی سیکرٹری کی شوقین تھیں تو کمرسل کے خوب صورت گل دان کا ایک سیٹ بھی تحفوں میں شامل تھا۔

تمام تحفے انہوں نے گھڑار سے گاڑی میں رکھنے کے لیے کہا تھا۔ مگر شاید وہ تحفے رکھنا بھول گیا تھا۔

شہیار خان اس لاپرواہی پر بیوی کے اوپر براہم ہو رہے تھے۔ ایسی بھی کیا لاپرواہی کہ سب کچھ فوٹوں کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔ سر محل اب تحفے لیے بغیر خالی ہاتھ تو وہ لوگ پارٹی میں نہیں جاسکتے تھے غصہ کرنے کے باوجود بھی لامحالہ شہیار خان نے ڈرائیور سے گاڑی موڑنے کو کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ گھر واپس پہنچ گئے تھے۔ ان کی گاڑی پورچ میں رکھی تھی۔

شہیار خان اور اموجان گاڑی ہی میں بیٹھے تھے۔ شہیار خان نے اس سے اندر سے تحفے اٹھا کر لانے کو کہا تھا۔ وہ گاڑی سے اترنے لگا تب ہی اندر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی اور کچھ گھبرنے اور نوٹنے کی آوازیں ان لوگوں کو پورچ میں سنائی دیں۔ اموجان نے گھبرا کر بیٹھے رہا تب رکھا تھا۔

”یا اللہ خیر“ گھبرا کر صرف وہی نہیں شہیار خان اور اموجان بھی گاڑی سے اترے تھے۔ وہ اندھا دھند اندر کی طرف بھاگا۔ اموجان اور شہیار خان اس کے پیچھے اندر کی طرف دوڑے تھے۔ ”بھاؤ، بھاؤ کوئی ہے مجھے بھاؤ“ چھوڑو مجھے۔“ چلائی ہوئی یہ آوازیں کراس کے قدموں تلے سے زمین نکلتی تھیں یہ ام سرگرم کی آواز تھیں۔ اس کی حالت ایک بل میں غیر ہو چکی تھی۔ ایک سیکنڈ کے اندر وہ گھر کے داخلی دروازے تک پہنچا تھا۔ یہ دروازہ ان کے لیونگ روم ہی میں کھلتا تھا۔ اس نے خوف غریبانی اور شدید گھبراہٹ کے عالم میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ لیونگ روم میں داخل ہونے والا سب سے پہلا شخص وہ تھا اس کے پیچھے شہیار خان اور اموجان بھی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khwateendigest.com



سرگوشی راجگاری

داسی

قولاد

رشتہ خور

شہ مات

قبضہ کا سفر

دس رینڈاں

آشنا نا آشنا

کال ختم کرتے ہی اسے سکندر کا خیال کیا تھا۔ اس نے اپنی دکان کی مصروفیات بتائی تھیں اور یہ کہا تھا کہ آگے واپس کے دن اس کے ساتھ یہاں وہ کبے جانے کے لیے تیار ہے۔ اس نے فوراً ہی سکندر کو کال مائی کی۔

”ہیلو لیزا!“ اس نے فون پر سکندر کی مسکراتی ہوتی آواز سنی۔ اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کی تھی۔

”کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟“ سکندر نے دوستانہ سے لہجے میں ساتھ ہی مزید پوچھا۔

”میں ٹیوی میں ہوں۔ پیٹ کر رہی ہوں۔ میں نے تم سے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ کیا ہم کل مل رہے ہیں اور کیا یہ دو والی کل ہے جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک پورا دن میرے لیے ہو گا؟“

”مسکرا کر پوچھتی دو روزہ کھول کر باہر انگلی میں نکل آئی۔ بالوں کی چمے کے اطراف بکھری لٹوں کو اس نے ہاتھوں سے پیچھے کیا تھا۔ سکندر اس کی بات کے جواب میں دھیر سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، کل ہی والی کل ہے جس میں تم نے مجھے پیٹ کرنا ہے۔ تم یہ بتاؤ بچلنا کہاں ہے؟ تم پیٹنگ کمال دانا چاہتی ہو؟“

”جگہ تو وہ اس وقت سے سوچے بیٹھی تھی جب سکندر نے اپنی پیٹنگ خوانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

”Tivoli“ چلے ہیں۔

”Tivoli“۔ اچھا ٹیکہ ہے، چلنا کب ہے؟“

”سکندر نے فوراً ہی اس کی بتائی جگہ کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

”کل صبح“ میں تمہیں تمہارے ہوٹل سے پک کر لوں گی۔“

”لو کے مصورہ اکل میں آپ کے فوہول پر ہوں گا جو جگہ آپ طے کریں جو وقت آپ مقرر کریں۔“

”سکندر کی قدر سے شراہتی سے انداز میں کئی بات کے جواب میں وہ کھکھلا کر ہنسی۔

”اے تھے فرماں بردار بیٹے ہوئے ہو خیر تو ہے؟“

”وعدہ بھارا ہوں جو میں نے اپنی دو من فریڈ سے

پہلے لڑائی کال آگئی۔
 "میں نے سوچا کہ نہیں بتاؤں میں گھر سے نکل گئی
 ہوں تو دس منٹ میں تمہارے ہوئی ہوں گی۔" اس
 نے بتایا تھا۔
 "ہوئی سے ذرا سا آگے چلی آنا۔" اس نے کافی کا
 گھونٹ لیتے ہوئے اس سے کہا۔
 "کیا مطلب؟"
 "مطلب یہ کہ شہ۔"

"جسب تم روم میں ہو تو رومیوں کی طرح رہو۔"
 "کے حق کے پر عمل کرتے ہوئے تم روزمرہ کی طرح
 بار میں بیٹھ کر ناشا کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر خوش دلی
 سے بولا۔

"دوسری انٹرننگ۔" لیزا نے خوش ہو کر کہا۔
 "میں نے خواب دیکھے تھے ناشا آؤں گا وہ بھی، بالکل
 میں۔ کیا تمہیں یقین آ رہا ہے؟"

خود کو شاباشی دینے کے بعد جیسے اسے اب لیزا سے
 بھی اس کا رٹے پر پرفیکٹ وصول کرنا تھا۔
 "مکمل جملے نہیں بول سکتا۔ مگر لوٹے پھوٹے
 لفظوں میں میں نے بارٹینڈر کو اپنی بات سمجھا دی
 دی۔" وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

"یہ تو واقعی قابل تحریف بات ہے۔ میں آپ کی
 اس دیانت پر آپ سے بری طرح امیر ہوں ہوئی ہوں۔
 سینور سکندر۔" لیزا جیسے اس کی بات کا لطف لیتے
 ہوئے ہنسی لگتی۔
 "اے۔۔۔ تم اپنا ناشا ختم کرو اتنی دیر میں میں بیچ
 رہی ہوں۔"

بہت سکون سے بیٹھ کر اس نے کافی اور ڈونٹ کو
 انچوائے کیا۔ اس کے بعد وہ بار کے دروازے سے باہر
 آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے لیزا کی گاڑی آئی دیکھائی دی تو اس
 نے دوسرے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔
 لیزا نے گاڑی اس کے پاس لا کر رکھ دی۔
 اس نے براؤن سفاری پیشہ کے ساتھ گرین کلر کا
 ڈیڑھا ڈھال ڈب پہن کر کھڑا تھا۔ بالوں کی پونی بنا رکھی
 تھی۔ وہ پیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔
 ناسٹائش لگ رہی تھی، رومن لگ رہی تھی، آج اس
 نے بھی اپنے حلیے پر ذرا نفاذ وحیان دیا تھا کہ آج لیزا
 نے اسے پیٹ کر بچا تھا، ورنہ آج کون سا آفس جانا ہے
 سوچ کر شاید اس نے شیو بھی نہیں کرنا تھا۔ لیزا اسے
 بغیر میسا کی کے دیکھ کر کچھ حیرت اور کچھ غصے سے
 جھلی جھکی۔
 "تمہاری۔۔۔ میسا کبھی کہاں ہے؟" وہ غصے
 اور فکر مند کی سے لڑائی سے اتر آئی اور اس کے
 سامنے آکر کھڑی ہوئی تھی۔
 "لیزا! میسی جوت باکل فمک ہو گئی ہے، پھر
 سہ کار میں اسے لے کر چلنے کا کیا فائدہ تھا؟ اس سے مجھے
 اب محسوس ہو رہی تھی۔"
 وہ اس کے غصے اور فحش سے ذکر قدر نے بدانتظام
 انداز میں بولا۔
 "تو کچھ آؤں گا مجھے اپنی جوت۔ ذرا مجھے بھی تو بتا چلے
 تمہاری جوت کتنی فمک ہو گئی ہے۔"
 وہ دونوں ہاتھ گریہ کر کے کرپٹی لڑا کا عورتوں والے
 انداز میں بولے۔
 "مگر اس طرح سے لڑائی، جوت چلاؤ گی تو میں
 بیننگ نہیں ہوا رہا۔" اس کی سوتی ایک ہی جگہ پر
 آئی دیکھ کر اس نے جھٹ دھکی دی تھی۔
 "ہوئی چل کر اسے لو سکندر پلیز۔ تمہیں چلنے
 پھرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔"
 وہ اس بار نرمی سے اور بدستار انداز میں بولی تھی۔
 "میں نہیں لے رہا۔ تم نے چلنا ہے تو ایسے ہی
 چلو۔ سرت خربے اٹھا لے میں نے اپنی جوتوں کے۔"
 وہ لاپرواہی سے بولتا گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی
 میں بیٹھ گیا۔ لیزا باہر کھڑی اسے کھور کر دیکھ رہی تھی۔
 "اب چلو گی مصو۔ اچھے کھور نے کا شوق تو رہا ہے
 میں بھی پورا کبا جا سکتا ہے۔"
 اسے خود احساس ہوا تھا کہ اس کے بولنے کا لاپرواہ

”بہت تیز ہو تم مینور سکندر“
 ”او کیوں کو کس طرح خوش کیا جاسکتا ہے۔“
 ”جواب“ مسکرایا تھا۔

”و فیروز خوب صورت تو ہیں ہوں یہ جنت پناہ۔“
 ”اور ابھی مشورہ نہ ہے انداز میں بولی تھی۔“
 ”شکر تھا اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔“
 ”موضوع گفتگو اس کی چوٹیں، دانتیں اور میاں کی
 رہی تھیں۔“

”ہم Tivoli کیوں جارہے ہیں؟“ کچھ دیر کے بعد
 اس نے تیز رفتاری سے ڈرائیو کر لی لیزا کی طرف کی
 کر پوچھا۔

”آگیا ہو گیا ہے مینور سکندر تمہاری پینٹنگ
 بنانے اور کس لیے؟“ وہ جیسے اس کے سوال پر حیران
 ہوئی تھی۔

”وہ تو مجھے بتائے میرا مطلب ہے Tivoli ہی
 کیوں جارہے ہیں، ایس اور کیوں نہیں؟“

”سوال اچھا ہے۔“ وہ اس کے سوال پر مسکرا کر بولی
 ”ایک بل رگ کرچے اس نے اپنی سوچوں کو سچا کیا۔“
 ”میرا دل چاہ رہا تھا میں Villa d este کے
 کسی خوب صورت سے فوارے کے سامنے تمہیں
 بٹھا کر وہاں تمہاری پینٹنگ ہانڈل میری پینٹنگ کا
 مرکز تم ہو اور تمہارے بیک گراؤنڈ میں سواہریں
 صدی کا کوئی بے مثال آرکیٹیکچر رکھتا ہوں اور اس
 سے گریباں ہو پانی میں جیسی گہرائی، جیسی طاقت اور
 جیسا سرا ہو نا ہے مجھے وہی گہرائی، وہی طاقت اور وہی
 براہ راست تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتی ہے۔
 مجھے سوچتے ہی سے یہ منظر بہت انسپائر کرتا ہے۔“
 ”ہیسی ٹیٹ کرنا ہے۔“

”ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سچائی
 سے بول رہی تھی۔“

”مجھے تمہاری آنکھوں میں اتنے سارے تاثرات نظر
 آتے ہیں۔ اوائس، دو، کرب، طاقت، گہرائی،
 براہ راست جیسے یہ آنکھیں اپنے اندر نہ جانتے۔“

”انداز اس کی ٹون اس کے الفاظ بہت حد تک لیزا جیسے
 تھے، اتنے دنوں سے ہر روز اس کے ساتھ ملنے اور
 وقت گزارنے کے بعد وہ شاید کچھ کچھ اس کے جیسا
 ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کے گھصے سے
 بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا بارش کی گاڑی میں آکر
 بیٹھ گئی۔“

”بہت خمدی ہو تم جو سوچ لیتے ہو کرتے رہی ہو
 چاہے تمہیں جتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کر لی
 جائے۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے وہ حلقی سے بولی۔

”میری امید ہے مجھے تم ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں
 گئے ہو گے اور میڈیسن نہ لائی ہو ضروری ہوگی۔“
 ”یہ تو یہ ایکسیڈنٹ ایکسیڈنٹ بہت ہو گیا ہے
 اسب میں پور ہو گیا ہوں اسی ایک ٹاپک سے بلیر کوئی
 گوربات کرنا۔“

”لیزائے اسے گھوڑا۔ وہ جواب“ چپ ہو گئی تھی۔ وہ
 اب خاموشی سے ڈرائیو کر رہی تھی۔

”تمہیں بتائے میں نے کئی اٹالین سیکے ہیں؟“
 اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے
 مسکرا کر پوچھا۔ وہ اسے بولنے اور بٹھنے پر اکسارہا تھا۔
 لیزا نے صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ
 نہیں۔

”اب میں نے سوچا بھی اٹالین میں شروع کر دیا
 ہے۔ ابھی بارے پاس جب تم چڑی لا کر دوک رہی
 تھیں تب تمہیں ریت کے ساتھ میں نے بتا ہے
 اٹالین میں کیا لفظ سوچا تھا؟“

”لیزائے زبان سے کہا، کیا سوچا تھا؟“ اب بھی نہیں
 پوچھا تھا۔ صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی
 تھی۔

”bella“ وہ کوشش کر کے اٹالین لہجے میں بولا
 تھا۔ bella اٹالین میں خوب صورت اور حسین کو
 کہتے ہیں۔ اتنا تو وہ سیکھ ہی چکا تھا اس کے اندازے
 کے عین مطابق وہ کھکھکا کر نرس پڑی تھی۔

راز چھپائے بیٹھی ہیں میں بانی کو تمہاری آنکھوں کے ساتھ ایک سہل کے طور پر دکھانا چاہتی ہوں۔ دونوں میں گہرائی، دونوں میں سرسراہٹ۔

”اس طرح بولتے ہوئے تم کی پکی منصوبہ نگاری ہو۔ تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے میں مرعوب ہو رہا ہوں سینورینا۔“

لیزا کی سنجیدگی کے جواب میں وہ ہنس لیزا نے اسے ان نظروں سے دیکھا تھا جیسے اس نے براہ راست کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر اس نے سکندر کی آنکھوں کا وہ تعبیریں تاثر فوراً ”بڑھ لیا تھا کہ وہ اسی سے اس کی ذات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھتے۔ وہ چسپ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے تھے۔“

”تمہاری بیٹی کسی ہیں؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے گفتگو کے لیے موضوع تلاش کیا تھا۔

”جھک ہیں، شہس دنا یا رکھا دیا ہے انہوں نے“

اور یہ بھی کہا ہے کہ تم بول دو ایس جاتے کے بعد سے ہمارے گھر آئے کیوں نہیں ہو اور ہوا آج جانے کا مقصد گو کہ تمہاری پینٹنگ بنانا ہے مگر نئی نے ہمیں اس میں جھک کا مڑا فراہم کرنے کے لیے بڑی فیر دست چھک باسکٹ تیار کر کے دی ہے۔

Tivoli میں جب بچ کرین گئے غیب تم کو کھانا پکائیے بے گنتی مزے مزے کی چیزیں ہمارے کھانے کے لیے تیار کر کے بیٹھی ہیں۔“

اس نے سکندر کے کسی رویے کی وجہ سے کچھ محسوس کیا ہے یہ تاثر دے بغیر وہ مسکرا کر بولی۔ باتیں کرتے ہوئے آواز میں میوزک سنتے لیزا کی فاسٹ ڈرائیونگ کے سبب وہ دوم سے باہر اس خوب صورت اور پرفیکٹ ٹاؤن ہلڈیج کے تھے۔

پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب ٹائیپولی کا موسم وہاں کی آب و ہوا دوم سے زیادہ خوش گو اور پرفیضا تھی۔ یوں ہی تو انہیں ٹائیپولی سو لوہیں صدی سے دوموں کی پسندیدہ ریزورٹ رہی۔ بروکس یا شاہوں کے تجلات کے ساتھ بنائے گئے یہ گارڈنز پورے اسی میں سب

سے خوب صورت اور سب سے منفرد گارڈنز بنائے جاتے تھے۔ ہنرمندی، کاریگری، مہارت، خوب صورتی اور حسن کا شاہکار آرکیٹیکٹس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت یہ باتوں اور پانچ سو فوٹ پرے رکھنے والوں کو بینہوت کر دیا کرتے تھے۔ ان فوٹوں کی تخلیق میں سو لوہیں صدی کے آرکیٹیکٹس سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں کی بے مثال مہارت اور ہنرمندی چھلکتی تھی۔ دوم میں سیاحوں کے شور، ہنگامے، گدماہی اور رش سے لادیر ایک خاموش اور پرفیکٹ ٹاؤن ہلڈیج۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر رہے تھے۔ لیزا گاڑی کی پیچلی سیٹ سے سامان نکالتے گئی۔ اس نے جھک باسکٹ نکال کر اسے پکڑا لی تھی۔ اب وہ اپنا کینوس، ایبل اور رنگ وغیرہ نکال رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

کلیسیکل ڈیزائن کے لیے

750/-

250/-

800/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

اس کو یقین کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کر دیتا ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اور تھے وہ بیٹوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

دوئیرا لیزا کی ماں کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور عقل و بصورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر کئی شکریہ صورت اور ذہانت میں اور درمیان وزج کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو دوئیرا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔ دوئیرا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی برٹش مین سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ میلان بھی رہی۔

لیزا اپنی مکن سیم سے بہت قریب تھی اس لیے وہ اسے بھی بہت سیار تھا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔ محمود خالد سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے اس کے باوجود دوئیرا کا شہر ہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشتر کی حالت میں سیم کے کمرے میں آیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے اراووں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

برواقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہو گئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوئٹی ماں کے بھی قریب تھیں۔ وہ سبکی دوا اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اپنے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کر دیا۔ ابوس ہو کر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف باشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے عید ملی ماں، ہونے کے باوجود خود مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مہربوں کو اتنا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بچپن کی زمین شہر یاہ کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم تھاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شاندار کارکردگی رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زمین شہر یاہ کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پروا نہ کیا۔ ام مریم نے اس کا پروا نہ کیا بلکہ خوش دلی سے قبول کر لیا۔ زمین شہر یاہ نے اپنی والدہ کو فون کر کے بتا دیا۔

لیزا نے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ سکندر پاکستان میں ہے اور اس کا ایک سیکیورٹ منت بچہ ہے۔ لیزا فوراً اسی اسپتال پہنچی۔ سکندر کے پیٹرنل چوٹ آئی تھی لیزا دونوں اس کے ساتھ اسپتال میں رہی۔ ڈیپارچ ہونے پر لیزا سکندر کو اپنے گھر لے گئی۔

زمین کے والد کو تب زمین کی ام مریم سے وابستگی کا پتا چلا تو انہوں نے ام مریم کے والدین اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ شہر یاہ خان ام مریم کے والدین سے ملے تو انہیں ام مریم اپنی بہنوئی کی حیثیت سے بہت پسند تھی زمین کی منگی ام مریم کے ساتھ ہو گئی۔ ام مریم شہر یاہ کو گزرنے کے لیے زمین کے ساتھ شہر یاہ خان کے گھر آئی۔ سکندر کو جب لیزا کے گھر پر کراپے ہوئے لایا۔ نئی کو سکندر بہت پسند آیا تھا اور انہوں نے بھی اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

ام مریم اور زمین واقفگیں میں آمنہ اور شہر یاہ کے ساتھ بہت خوش ہوتے ہیں۔ شہر یاہ خان کو اپنی ہونے والی برہوام مریم بہت پسند آتی ہے۔ ان دونوں سکندر بھی واقفگیں آجاتا ہے۔ ام مریم اور سکندر کی ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بدتمیزی کی حد تک بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ام مریم سکندر کی برہم فیزیکی کو نظر انداز کرتی رہتی ہے۔ زمین ان دونوں کے مابین اس سرور سے لے کر محسوس ہوتا ہے اور اس سکندر وہ رخصت آتا ہے۔

سکندر لیزا کو دیکھ کر رشتہ بنانے کی اپنا ذمہ داری سمجھتا ہے۔ لیزا بہت خوش ہوتی ہے۔ سکندر شہزاد خان سے کہتا ہے کہ اس کو بھی لڑکی نہیں ہے۔ اس کی ذہن سے منگنی تو زبردستی۔ ذہن سن لیتا ہے اور مزید رشتہ ہو جاتا ہے۔ وہ سکندر سے رشتہ کا اظہار کرتا ہے۔

شہزاد خان کے جرمین اومپ ہندو دوست کے گھر گئے سال کی دعوت میں شہزاد خان اور ان کی پوری فیملی نے شرکت کی ہے۔ تمام مہم طبیعت خراب ہونے اور سکندر ضروری اسائنمنٹ مکمل کرنے کی وجہ سے نہیں جا سکتے۔ "بجورا" ذہن کو جانا پڑتا ہے۔ وہ پارٹی میں لے جانے کے لیے گفٹس بھرا جاتے ہیں۔ کورسے راستے میں پلٹ کر واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لوگ روم میں سکندر ام مہم پر بھرا ناٹھ مکر رہا ہے۔ ام مہم روئے ہوئے خود کو خطرے کی گھنٹی بجھاتے ہیں۔

۵

پانچویں سیریز

پچھلے کیم سے اور وہ بھی آؤٹ ڈور بیننگ بناتا۔ "اور وہ بھی آؤٹ ڈور بیننگ بندے کی۔ تمہاری آنکھوں کے تمام ٹائر میں کیونسی برا آکر پائی تو سمجھو گی" میں ایک کلباٹ آؤٹ ڈور بیننگ ہوں۔ اس کی بات کاٹ کر لیزا نے فوراً "کلز اجوڑا تھا" وہ دھیمے سے مسکرایا۔

"تمہیں پتا ہے سینہور سکندر! تم بہت پیٹھ سم ہو۔ معلوم نہیں کیوں تمہارے ہاتھ دیکھ کر پالو کا خیال آتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی مگر وہ بے اختیار ہنسی ہنسی کر رہی تھی۔

"یہ جواں لڑکھن اس لیے ہو رہی ہے کہ ابھی راتے میں آتے ہوئے میں نے تمہارے لیے لفظ bella (خوبصورت) بولا تھا؟"

"نہیں" میں سچے دل سے تمہاری تعریف کر رہی ہوں تو زیادہ بدست۔ تمہیں یہ بات خود بھی بہت اچھی طرح چاہیے۔ صبح سے شام تک کتنی غور میں اور لڑکیاں تمہاری تعریف کرتی ہوں گی، تم پر خدا ہوتی ہوں گی۔ کیا تمہیں پتا نہیں چلتا؟

"نہیں" مجھے یہ بات ابھی ابھی لیزا محمود نے کہی تھی۔ "یہ سب بات کہہ کر آتا ہے۔"

بہت دھیمے لہجے میں لیزا سکندر کی اس بات میں سچائی تھی جذب تھا۔

اس کا ایل اور لیزا نے دوسرے سب کچھ پور پیمبل تھا رنگ بر شہزاد کے دوسرے بیننگ میں استعمال کی جانے والی تمام چیزیں بڑی آسانی سے فولڈ ہو کر اس کے ایل کے مختلف خانوں میں سما جاتی تھیں۔ ایک ہی جگہ کافی ان تمام چیزوں کو آسانی کے لیے چلا جاسکتا تھا۔ یہ سارا سامان وہ اپنے ساتھ آؤٹ ڈور بیننگ کے لیے رکھتا تھا۔ بیننگ بنانے کے بعد اس کی رگوں سے عملی بیننگ کو محفوظ رکھنے کے لیے پرا محفوظ خانہ جس کا ایل میں موجود تھا۔

"اس وقت سے لے کر شام تک جتنا کام ہو سکے گا کروں گی" میری کوشش یہ ہے کہ بیننگ کے اندر خان آؤٹ ڈور میں واضح کر لوں" اپنی پھر بیننگ کا کام تو سونپو میں بھی ہو سکتا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہوئے وہ اس سے بولی تھی۔ "صبح سے شام تک بنگ کر بھی بیننگ مکمل نہیں ہوئی؟"

وہ بنگ باسکٹ اور ایک دوسرا بنگ جس میں لیزا نے اپنا کیمرا رکھا رکھا تھا۔ "میں نے کچل کر رکھا ہے لیزا۔" لہذا میں اپنا پور پیمبل ایل تھا اور کندھے پر بنگ تھا۔

"میں نے کچل کر رکھا ہے لیزا۔" لہذا میں اپنا پور پیمبل ایل تھا اور کندھے پر بنگ تھا۔

"اوکے" اس کے سوری یہ ایک انتہائی مشکل اور

اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”تمہارے رویا کی طرح تمہارا Fivoli بھی۔“
خوب صورت ہے لیزا اس قدر سبز اور اس قدر ہرہاں۔
جس طرف نگاہ اٹھاؤ سبز اور گردور دور رنگ گھٹا۔
سر سبز پھاڑ نظر آ رہے ہیں اور اپنے اطراف نگاہیں
دوڑاؤ تو درمیان آ کر کھینچے۔ کاشا پتھر یہ باغات
نوارے اور آبشار ایسا لگ رہا ہے ہم بندہ ہویں
سوا سو صدی کے درمیان میں چلے گئے ہیں۔“
”جتنے بھی یہاں آ کر عیشہ بیک لگتا ہے کہ میں
یہ درمیان میں چلی گئی ہوں۔“

وہ دونوں مضبوط پتھروں سے بنے اونچے نیچے راستے
پر جو کہیں کسی ڈھلان میں انزنا لگ رہا تھا چل رہے
تھے وہاں ارد گرد نظریں دوڑانے پر باغات ان میں
بنے نوارے آبشار خوب صورت باغیچے راستوں
والے غار کہیں ڈھلان کی طرف جاتے نظر آ رہے
تھے اور کہیں چرخی کی طرف۔ گویا کہیں آب کو ایسا
لگے گا کہ آب ڈھلان کی طرف جا رہے ہیں اور کبھی
اوپر چرخی کی طرف۔

وہ ایک آرٹسٹ کی نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی
اسی مناسب ترین جگہ کی تلاش میں تھی جسے اس کی
پینٹنگ کا ہیک گراؤ نہ نہاتا۔

”ہم راستے میں اتنے سارے خوب صورت
نوارے چھوڑ آئے ہیں۔ تم نے ان میں سے کسی کو
بھی سلیکٹ نہیں کیا کیا کسی خاص جگہ کی تلاش ہے
تمہیں؟“

”نوارے تو مجھے بھی بہت سارے اچھے لگے ہیں مگر
وہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ جہاں زیادہ لوگ آ جاتے
ہوتے ہیں وہاں سکون سے پینٹنگ کرنا مشکل ہو جاتا
ہے۔ لوگ بلاوجہ جھانک کر دیکھتے ہیں کہ آپ کیا کر
رہے ہیں کیا بنا رہے ہیں اور پھر اس بارے میں کمنٹس
دینے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ایک لیزا اسکیپ آرٹسٹ
کے طور پر یہ چیزیں بہت مرتبہ نہیں کر چکی ہوں۔ اس
دیں انداز میں خواہ وہ وقت صاف ہو جائے۔“

اس نے سکندر کی آنکھوں میں دیکھا اسے اس کی
آنکھیں سچی بولتی ہوئی لگیں جیسے وہ اندر ہر خاطر اور
چھپی ہر بات ان آنکھوں کی بڑھ سکتی ہے ایسا لگا۔ لمحہ
بھر کے لیے ان آنکھوں میں آیا وہ اثر لگے بھر میں ہی
کہیں پھر سے چھپا لیا گیا تھا۔ وہ اپنے لہجے کی سچائی اور
سچیدگی کو فوراً ہی غیر سچیدگی اور مزاح کے رنگ میں
ڈھال رہا تھا۔

”میں پینڈ سم اور خوب صورت ہوں۔ تب ہی تو
مشہور مصور لیزا محمود کے باڈل اسکے طور پر منتخب کیا گیا
ہوں۔ ایسوں کیوں کو تو وہ پینٹ کرتی بھی نہیں ہوں
گی۔“

وہ جواب دہولے سے مسکرا کر چپ رہی۔
جیسے کیسے لگ رہے ہیں Villa d'Este کے
یہ باغات نوارے اور آبشار۔

انداز آنے کے بعد دونوں پتھروں سے بنے ایک
خوب صورت راستے پر چل رہے تھے جس کے ایک
طرف سبزہ ای سبزہ اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے
سو نوارے تھے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اوپر
نیچے تین قطاروں میں بنے نواروں کے درمیان میں
بہمی سبزہ تھا اور اس سبزے کے ساتھ تھوڑے
تھوڑے فاصلے پر لہجز اور عقاب کی اشکال
آرکیٹیکٹس نے پتھروں سے تراش کر بنائی تھیں۔

ان جانوروں اور پتھروں کے منہ سے پانی بڑے خوب
صورت انداز میں گر رہا تھا۔ اوپر والی قطار سے پانی نیچے
والی قطار میں لگے نواروں پر گر رہا تھا پھر اس سے نیچے
والی قطار میں اور پھر وہاں سے یہ سارا پانی ایک خوب
صورت ٹے ٹانے میں جا کر گر رہا تھا۔ بہت سے سیاح
وہاں کھڑے ہو کر اوپر مختلف انداز میں بینہ کر تصویریں
لکھ رہے تھے۔

ان کے بیچ خاموشی جب زبان طویل ہونے لگی تو
اس نے سکندر کو مخاطب کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتا
ان کے بائیں طرف موجود ان سو نواروں اور وہاں
سیاحوں کی وجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پاکستان اور اس کا بگ سکندر نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ بڑی ہنارت اور تیز رفتاری سے اس نے اپنا پور ٹیبل ٹیبل کھولا، اس پر کیوس کو سیٹ کیا، رنگوں اور برشنگ کا خانہ کھول کر فولڈ ہوئی پلیٹ باہر نکالی۔ چند منٹوں میں اس کام سے فارغ ہوئے کے بعد رنگوں کے نکس کرنے سے پہلے اس نے بیگ میں سے اپنا نیبرا باج نکالا۔ بروٹش فولڈ کر افروز دلا جدید ماڈل کا نیبرا جو کوئی بھی لینڈ اسکیپ بناتے وقت ہمیشہ اس کے ساتھ رکھتا تھا۔

"اس پینٹنگ پر جب اسٹوڈیو میں کام کروں گی تب مجھے اس نچلے بار کولار کے لیے ان تصویروں کی ضرورت پڑے گی۔ مجھے صبح کی اس روشنی میں تہمداری پینٹنگ بنانی ہے، میری پینٹنگ میں لائٹ میرے بیجنگٹ اور بیک گراؤنڈ میں کہاں کس جگہ اور کس طرف سے پانی چاہیے اس کے لیے مجھے صبح کے وقت کچھ بھی ان تصویروں سے مدد کرنی پڑے گی۔ ابھی پچھلے ہفتے دوپہر اور شام ہوگی تو پھر روشنی کم پڑے گی اور بیک گراؤنڈ پر کسی اور انداز میں پڑنے لگے گی جبکہ مجھے اپنی پینٹنگ میں سن لائٹ ایسی ہی دکھانی ہے جیسی ابھی ہے۔"

"مجھے نوے باتیں سمجھ میں آتی نہیں ہیں مصورہ! جو تم مناسب سمجھو۔" وہ جواباً "مسکرا کر بولا۔ وہ پہلے بیک گراؤنڈ کی تصویریں کھینچ رہی تھیں۔ اس نے کئی تصاویر پر ہر زاویے سے فوٹو لیں اور اس پاس کی جگہوں کی کھینچ لیں۔

"اب مجھے تہمداری تصویریں کھینچنی ہیں۔ بس ایسے سیدھے بیٹھ جاؤ۔ میری طرف مت دیکھو۔ تھوڑا سا دائیں طرف جیسے کسی سوچ میں کھوئے ہو اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہو۔"

تصویر کھینچنے کے لیے کمر ہاتھ میں لے لی سکندر کو ہدایات دے رہی تھی ہاتھوں کے استعمال کے ساتھ سکندر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا مگر مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

پھر اسے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ مصورہ سکندر بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں۔ وہ بارہ تو یہ سوچ نہیں لے گا مجھے ہے ناں؟ اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے بنوایہ لگا لیا تھا کہ سکندر کو دیکھا۔

وہ اگر آج شہر کا کام پورا نہ ہو سکا تو ہم دوبارہ بھی آجائیں گے۔ سینور نا! دو وعدہ کیا ہے کہ آج بھانا تو ہے۔"

وہ لیزر کی سولہ لگا ہوں کے جواب میں مسکرا کر بولا تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے بہت دور آچکے تھے۔ کئی دھلائی راستوں سے گزرتے کئی چڑھاؤں پر سے چڑھتے وہ دونوں اب بلخات میں ایسی جگہ پر تھے جہاں فی الحال ان دونوں کے سوا اور وہ۔۔۔ تک کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں خاموشی اور سکون تھا اور اس خاموشی اور سکون کو صرف سامنے نظر آتے بلند و خوب صورت فوارے سے گرتے پانی کی آواز توڑ رہی تھی۔ ان کے بالکل سامنے ایک بڑی شکل کا فوارہ تھا۔ اس کے پیچھے پراز اور سبزہ نظر آ رہا تھا۔ بڑی شکل کے اس فوارے کا پانی بہت اوپر تک جا رہا تھا اتنا اوپر جانے کے بعد جب یہ پانی نیچے گر رہا تھا تو ایک ہتھار کی سی شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ اس کی پینٹنگ بنانے کے لیے کیسٹل جگہ تھی۔ جس کی اسے تلاش تھی۔

"یہ جگہ پرفیکٹ ہے۔ ہم یہاں پینٹنگ بنا سکیں گے۔" وہ رک گئی تھی۔ اسے رکتا دیکھ کر سکندر بھی رک گیا تھا۔ وہ واقعی اپنے اپنے کے لفظوں کے مطابق خود کو اس کی بلخات چھوڑے ہوئے تھا۔

"تم یہاں بیٹھ جاؤ سکندر! مجھے یہاں پانی کی وہ برائیت اور طاقت نظر آ رہی ہے جو مجھے اپنی پینٹنگ میں پیش کرنی ہے۔" اس نے پیل کے آگے اپنی چوڑی سی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

"جو آپ کا حکم مصورہ!" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے فوراً ہی سامنے دیوار پر جا کر بیٹھ گیا۔ پول کی دیوار اتنی دیوار تھی کہ وہ آرام سے اس پر بیٹھ سکے۔ کچل

”تصویریں کچھ مصور، کچھ تم سے ابھی بنیں۔“
بھی بنائی ہے۔ بائیں کرنے میں تمہاری یہ سن
دوستی جو ہمیں چاہیے، کھست ہو جائے گی۔“

اسے پتا تھا سکندر نے پھر سے خود پر لا پڑی اور
بے نیازی کا خول چڑھایا ہے، جیسے وہ اس پر اور ساری دنیا
پر ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اس
کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس نے پتا کچھ کے
سر اثبات میں پایا اور قریب سے اور دور سے ہر جہ
زائے سے سکندر کی تصویریں کھینچنے لگی۔ کئی تصاویر
کھینچنے کے بعد وہ ازل کے سامنے آگئی تھی۔

”جب تم بیٹھے بیٹھے تھکے لگو تو مجھے بتا دو سولے
میرا ارادہ ہے کہ ہم ہر ایک ٹھکانے بعد پندرہ منٹ کا
بریک لیں گے تاکہ تم کمر سیدھی کر سکو۔“ کام کرنے
کے دوران اس نے خاموش بیٹھے سکندر سے کہا۔

”میں نہیں تھک رہا، تم آرام سے اپنا کام کرو۔“
اس نے اسے اطمینان دلایا۔

”جیسے ایک ٹھکانے کے انہوں نے پہلا وقفہ ڈھال
ٹھکانوں بعد لیا تھا۔ وہ بھی اس نے کہا تھا کہ اب بریک
لیتے ہیں تب سکندر تو کسی تھکاوٹ کا اظہار نہ کر رہی
تھیں رہا تھا۔

”بس اب بریک لے لیتے ہیں۔ ڈھائی ٹھکانے ایک
ہی طرح بیٹھے بیٹھے تمہاری کمر آگڑی ہوگی۔“ وہ پلیٹ
اور برش کھلے خانے میں رکھتے ہوئے بولی۔
”میں نہیں تھکا لیرا! تمہیں کام کرنا ہے تو اور کر
لو۔“

”تمہارا تھی جیسے نہیں ہو گیا؟“ وہ حیرانی سے بولی اور
ذرا دیر سکندر کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

وہ جواباً یوں مسکرایا تھا، جیسے اتنی معمول چیزوں
سے وہ تھک نہیں سکتا۔ وہ حائر نگاہوں سے اسے
دیکھنے لگی۔

”پتا ہے سکندر! تم مجھے بہت اذرا لگتے تھے۔“
لگتے کیا ہو؟ تم ہو بہت ہمدرد، جتنا سیریس تمہارا
ایک سائنٹ ہوا تھا، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو

”تو تیار ہوا میں طرف کر رہا تھا۔“ اس نے سکندر کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ
کر اس کے چہرے کو ہلکا سا دائیں جانب کیا چہرے کو
ٹھوڑا سا نیچے کیا اس کے ایک ہاتھ کو دو بار پر رکھا اور
دوسرے ہاتھ کو پکڑ کر سوچنے لگی کہ اسے کس طرح
رکھا ہوتا چاہیے کہ خوب حضور متھکے ہوئے ایک دم ہی
اسے اس میں ہوا سکندر اسے بے حد خاموشی سے بغور
دیکھ رہا ہے۔

”کر ہوا؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ جیسے اسے
دیکھتا ہوا کسی گہری سوچ میں کھویا تھا اس کے سوال پر
چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے ایک دم کسی خیال سے جاگا
ہو۔

”کیونکہ نہیں۔“ ایک گہری سانس لے کر وہ سنجیدگی
سے بولا۔

”پھر بھی بتاؤ ناں!“ وہ پھر سے بولی۔
”حیران ہو رہا ہوں اپنے آپ پر حیرانی کی اس صبح میں
میرا Tivoli میں ایک دو من آرٹسٹ سے اپنی
تصویر بنوا رہا ہوں وہ بھی اپنی خوش اور اپنی مرضی سے
جیسے زندگی میں اس سے اہم اور اس سے سنجیدہ کام کوئی
ہو ہی نہیں سکتا؟“ اس کے لیے میں واقعی حیران تھی
جیسے اسے خود پر یقین نہ آ رہا ہو سکندر کا ہاتھ ابھی بھی
اس کے ہاتھ میں تھا۔

”جی پوچھو تو حیران میں بھی ہوں۔ تمہارے وعدہ کر
لینے کے باوجود مجھے لگ رہا تھا تم لاسٹ منومنٹس پر
بے نیازی اور خود پسندی کا اثر لیا کوئی بھی بہانہ بنا کر
مجھے انکار کر دو گے۔“

وہ سنجیدگی سے اپنے دل کی بات زبان پر لائی اور
سکندر خواب میں تھکے لگا کر میں برا تھا۔

”باقول باتوں میں تم میری برائی کرنے کا کوئی موقع
ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔“

ایک پاؤں اتار کر قریب لگتا تھا جیسے میں اب اس پر
کھنک جائے گا اور اگلے بل پھر اتار ہی دور آتانی ناقابل
رسائی۔

میں کھائی ایسے تھے صرف اس کے ساتھ ساتھ وہ تھے، ان کی خود سے محبت پر سرگرمی تھی۔ ایک بار اس نے مشورہ دیا تھا ایک شہر بھاب میں جی جی کے ایک میں چیزیں دینا ایک میں جی کا خود بیک کیا فروٹ ایک اور براؤنر ساتھ میں جی کے کین اور تھرموس میں چائے اس نے پیچھے بیٹ سکندر کے ہاتھ میں کھائی تھی۔

"مرا گھیا یہ تو اتنی چٹک ہو گئی۔" سکندر اپنی پیٹ نہر پاساؤں کے لئے بولا تھا۔

"میں اس کی زیادہ جگہ میں heritage sites World (عالمی مندرجہ) قرار دی جا چکی ہیں۔ اس لیے آج یہاں بینک بنائے گئے اور اس طرح بیٹھ کر کھانے پینے کے لیے ہیں بعض طور پر اجازت نامہ لے کر تھی ہوں کہ کہیں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو جائے یہاں تو بسٹوں کی سہولت قرار دی جاتی ہے" اس لیے مجھے صرف ایک دن نہیں بلکہ پورے ایک ہفتے کے لیے اجازت مل گئی ہے کہ یہاں جہاں دل چاہے بینک بنائوں۔" اس نے اپنی پیٹ میں جی جی کے لپکے والے تھے ہوئے سکندر کو دیکھا۔

"یہ جگہ اتنی گہری لگ رہی ہے لیکن کتنا سکون ہے یہاں۔"

"ہاں ہے، ہمسے جاتے جاتے کتنی دیر آگے ہیں؟ سمجھو ہم Vaid este سے ابھر آ چکے ہیں۔ یہی یہاں ہمیں نورسٹ فرمیں آ رہی ہیں۔"

سکندر کی بات کے جواب میں وہ بولی۔ ساتھ ہی اس کی ہیکر پیٹ میں چکن لپکے کھا تھا۔

اُس نے بعد وہ دونوں سب سمیٹ کر واپس اپنی بینک بنائے جگہ پر تھے۔ "اب تم وغیرہ کے مین چار گھنٹے کام کرو۔ میں کوئی ٹھیک وگ نہیں رہا۔ اپنی جلدی جلدی کر رہا ہوں۔ یہ تو سکندر کا کام پورا نہیں ہو سکے گا۔"

وہ پیٹ پر برش ہاتھ میں انٹاری تھی تب سکندر اس سے یہاں اس نے سراباٹ میں بلایا تھا۔

لیجرا گیا ہوتا تھا کہ تم جس سے تم سے زیادہ پریشان تو میں تھی۔ ایک بھر پور مرد کا جو تصور ہوتا ہے ناں۔ عذر بہادر ڈیڑھ سب تم ہو۔ میں نے پانی کو اپنے بیک ٹراؤنڈ کے طور پر لیا ہی اس لیے ہے کہ پانی میں تھماری جیسی برسرارت تو ہے ہی ساتھ ہی پانی طاقت کا سہل بھی ہے نا۔"

اس کی شہیدگی اور سچائی نے کی بات کے جواب میں سکندر ہنسا تھا۔

"بہادر اور دوسرے جاتے وہ لفظ سخت جہاں اور اہمیت بھی ہوتے ہیں۔" اس نے لڑکھارے اور پورے اٹھا تھا وہ حیرت سے دیکھی اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر کی اس کی طرف بشت تھی۔ وہ دونوں ہاتھ دایں بائیں پھینکا کر اپنے جسم کا تھوڑا کم کر رہا تھا۔ کیا وہ خود سے ناراض تھا؟ کیا وہ خود کو سزا دیا کرتا تھا؟ وہ خود سے ناراض تھا یا دنیا سے؟ کیا زندگی نے اسے اتنے دکھ دیے تھے کہ وہ زندگی ہی سے نفرت میں مبتلا ہو گیا تھا؟ سکندر نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"بریک لیا ہی ہے تو مجھے کچھ کھلا پانی دے۔" ہاسک تھماری نیکی نے تینینا۔ سجانے کے لیے تو ہرگز نہیں دی ہوگی۔" وہ ان کو بولا۔

وہ خاموشی سے سر ہلا کر پورے اٹھی تھی۔ اس نے بیک میں سے فولد ہوا نالیچہ خانا ہر نکالا۔ وہ فولد کرنے کے بعد ایک پنڈ بیک جیسا بن جانا تھا۔ سامنے کی طرف بن تھا۔ اس نے بن کھول کر ہمیں کھولیں اور سامنے گھاس پر دو ختوں کی چھاؤں میں بچھنے کے لیے آگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے سکندر بھی ہاسک انٹاکر وہاں آگیا تھا۔ وہاں ان کی بھی صرف وہ دونوں ہی تھے اور دوسری اور سیاح نظر نہیں آ رہا تھا۔ سکندر نے نالیچہ خانا نہ دے گا وہ سزا کو پکڑ کر اس کے ساتھ اسے پیچھا وہاں وہ اس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی وہاں بیٹھ کر ہاسک کھولنے لگی تھی۔ کچھ چرس مینی نے رات میں بنائی تھیں۔ کچھ انہوں نے صبح اٹھ کر تباہ کی تھیں باوجود اس کے منع کرنے کے کہ وہ لوگ کسی بھی ریسٹورنٹ

”یہاں تو مذاق مت اڑاؤ۔ تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ پینٹ کرنے کا کام میں بہت دل سے کر رہی ہوں۔ اپنی اس تصویر سے میں بہت مطمئن ہوں ابھی تک ان شاء اللہ ایکریڈیشن میں یہ میری سب سے بہتر تصویر ہوگی۔“ وہ تصویر پر نظر پڑا جسے بول رہی تھی۔ اس نے برش سے وہ ایک جگہ پھر اسٹروکس لگائے تھے۔ سکندر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اور جو اس کی بہت اچھی قیمت دے گا۔ تم اسے بیچ دو گی؟“

”میرا ایسا تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سکندر! میں اس پر بہت دل سے کام کر رہی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہے کہ اسے بیچنے کے لیے۔“ اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔

”یہ پھر تمہیں مجھے ایسا طور تحفہ دے دینا۔“ وہ اس کرولا۔

”تمہیں تحفے میں دے دوں گی تو اپنے مولو شوٹیں کیا اسے نہیں رکھوں گی؟ کہتے تو مجھے لازمی دیاں رکھنا ہے۔ تم تو گے میرے شوٹیں؟“

”وہ تو کس سے انداز میں تصویر دینے سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔“

”میں۔۔۔ تمہارا اسو شوٹو ابھی آگے آ رہے ہیں؟ تب تک تو میں دبا داپس جا چکا ہوں گا۔ اگر اٹلی میں ہوتا ضرور آجاتا۔“

وہ معذرت خواہانہ سے انداز میں بولا۔ ہاں تب تک تو وہ جا چکا ہو گا۔ اسے کیوں یاد نہیں رہی تھی بات کہ چند دنوں کے لیے لایہ شخص چند دنوں باہر بنٹوں میں واپس چلا جائے گا۔ پتا نہیں اس کا دل یا رمدی یا راسبول کی لیبٹ میں کیوں آگیا تھا۔ وہ جواب دہ کی بول رہی تھی کہ اس کا مطلب ”سکر اسکی تھی۔“

”کیا ہوا؟“ سکندر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا تھا اس کی سوچوں سے کیمرہ علم اور لا تعلقی۔

”کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ بریک کی جو کسوٹی پر بیٹھتی ہیں مگر میرے ہاتھ تو گم۔“

وہ تصاویر بناتے وقت جتنا کام برش اور اپنی اس سے لیتی تھی اتنا ہی بے دریغ استعمال اپنے ہاتھوں سے

ان ہی کی طرح کا خاموشی اور سکون کا منتظر ایک جوڑا وہاں سے گزرا۔ چلتے چلتے وہ دونوں اس کے پاس آ کر رک گئے تھے۔ وہ اس کی پینٹنگ کو شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ شوہر اٹلی میں اس سے اس کی پینٹنگ کی تعریف کر رہا تھا اور بیوی اسے لور اپنے میاں کو نظر انداز کیے بغیر مانتے بیٹھے سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ دونوں میاں بیوی وہاں سے آگے بڑھ گئے تب سکندر نے اس سے پوچھا۔

”کیا فرما رہے تھے صاحب؟“

”میرے آرٹ کو سراہ رہے تھے۔ ویسے ان کی سسر میری پینٹنگ کو نہیں بلکہ میرے باڈل کو سراہ رہی تھیں۔“

وہ کہتے ہوئے کھکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ سکندر جواب دہ ہم سا مسکرایا۔

”ایک اتنی حسین عورت اپنے میاں کی بے نیل میں کھڑی تھیں سارا ہی بھی تم پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ کم از کم تجھ کو تو خوش ہو لو۔“

”میرے خوش ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مجھے پینٹ کرنے کے لیے بطور اپنا ماڈل مشورہ و معروف مصور لیزا محمود نے منتخب کیا ہے۔ جو صرف اٹلی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور کی تعریف سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“

وہ اس سے بات کرنے کے دوران بھی اپنی بیٹھنے کی پوزیشن اور اپنے چہرے کا رخ ویسے ہی رکھے ہوئے تھا جیسا پینٹنگ بنانے کے لیے اس نے سکندر کا گہرایا تھا۔ اس بار بغیر کسی وقفے کے اس نے شام کے چار بجے تک کام کیا تھا۔ اب اس کی تصویر کے ضدوخال واضح تھے اس نے سکندر سے بریک لینے کے لیے کہا تو وہ اچھ کر اس کے پاس آگیا۔

”مالی گا لیزا! تم نے تو واقعی مجھے بہت خوب صورت پینٹ کیا ہے۔ حق یہ کہ میں ہوں؟“ وہ مزاح لے لے لہذا اس میں ہل رہا تھا۔

ایک ایک دوسرے کے پاس اس جھپی کی طرف اچھلیا کرتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پر لن لوگوں کے بہروں کے پاس جا کر گر رہا تھا۔

سکندر نے جیسے اس کی آواز سنی وہی نہ ہو اس نے ایک جھپی کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر زور سے مڑا دیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے پیٹ میں بہت زور سے لات ماری تھی۔ جھپی درد سے چلاؤ میں پر گرا تھا چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے عین اسی وقت پیٹ سے سکندر پر چاقو سے وار کیا تھا۔ کئی سے اوپر کی جگہ سکندر کے بازو میں چاقو لگا تھا۔

سکندر ہڑپ ہڑپ رفتاری سے فوراً کھڑا ہوا اور اس نے اسی طرح ایک زوردار لات اس دو سرے جھپی لڑکے کے بھی پیٹ پر ماری تھی۔ سکندر کے بازو سے خون ٹپکاؤ کی طرح رو رہی تھی۔

"سکندر پلیر! تمہیں چھوڑ دو پلیر یہ جو ٹانگہ رہے ہیں انہیں بٹ دو۔"

سکندر کا اس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اسے خوف اور ہشت میں مبتلا کر گیا تھا۔

مگر سکندر کو جیسے اس کا چٹنا دیکھا اور دیکھا کچھ بھی سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جنون اور خون سا لہر اڑا ہوا تھا۔ اس کی جوت کی ٹانگہ جو ابھی بھی پوری طرح خنک نہیں ہوئی تھی نہ وہ اسے ان بد معاشوں سے لڑنے سے روک رہی تھی نہ اس کے بازو سے بہتا خون۔ اسے سکندر تارلی نہیں لگ رہا تھا۔

وہ ایک ہی وقت میں ان دونوں سے مقابلہ کر رہا تھا ان دونوں پر وار کر رہا تھا اور ان کے ہر وار سے ہونے مہارت سے خود کو بچا رہا تھا جیسے زندگی کے تمام برسوں میں یہی کام کرنا آتا ہو۔ سکندر اس بل ایک پر دھا لکھا لار ایک لمبی جھنڈی میں کھینچ لیا اور انہیں لگ رہا تھا بلکہ انہیں جیسوں کی طرح مڑا رہے تھے بڑھنے والا ایک غنڈہ اور بد معاش لگ رہا تھا۔

ان دونوں کے چاقو کب کے ان کے ہاتھوں نکل چکے تھے اب وہ دونوں چاقو سکندر کے ہاتھوں

پر وہب میں اپنی سے لایا ہوا بڑا چھب کترے کھینچ نہیں ہوتے اور عموماً وہ گروپ کی شکل میں ہوتے ہیں۔ واریات میں ایک یا دو افراد حصہ لیتے ہیں جبکہ بقیہ ساچی آس پاس ہی نہیں ہوتے ہیں۔

سکندر انگریزی میں خوش اخلاقی سے اس لڑکے سے کہہ رہا تھا، "کوئی بات نہیں" وہ ان وقت پکڑنی کی کچھل سیٹ پر ہاسٹ رکھ کر سیدھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ سکندر کو خبردار کیا جاتا۔ پیچھے سے ایک اور جھپی لڑکا آتا اور اس نے جھپٹ کر اس کے کندھے پر سے اس کا زوردار ٹیک کھینچا۔ بے اختیار اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ سکندر نے محسوس کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک لے کر وہ دونوں چور مخالف سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔

"سکندر پلیر! تمہیں چھوڑ دو پلیر۔"

اس نے چلا کر اسے دیکھا چلا تھا۔ مگر اس نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ خود بھی بھاگی تھی تاکہ اسے روک سکے۔ تب تک سکندر اس تیز رفتاری سے بھاگے جیسے لڑکے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ بھاگنے میں اس لڑکے سے کہیں زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا تھا۔ وہ لڑکا مڑاؤ سکندر نے اس کے منہ پر ایک بھر پور پٹ مارا تھا۔ سکندر کے زوردار پٹ سے وہ لڑکا سنبھل نہیں سکا تھا۔ سکندر نے اس سے بیک چین کر اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بیک فوراً اٹھا لیا تھا۔

"سکندر!" وہ بے اختیار خوف کے عالم میں چلائی تھی جب اس نے اس جھپی لڑکے کو جیب سے چاقو نکالنے دیکھا۔ سکندر کے پیچ سے اس کے ہاتھوں سے خون نکل آ رہا تھا وہ انتہائی تیز دھار چاقو بڑی مہارت سے تھامے سکندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا دوسری سمت بڑا سا جھپی بھی اسی وقت اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ ان کے ہاتھ میں بھی جھنڈا ایک چاقو تھا۔

"سکندر پلیر! انہیں بیک کر لو اس کے دے دو اور بھی

انہیں ہار دے دو۔"

بالکل نکلے ہوں گے سامنے تھا۔
 "سکندر! انتظار کیا تھا۔" وہ ابھی تک خوف کے
 حصار میں تھی عبور اجملہ بول نہیں دیتی تھی۔

"اتھ۔۔۔ اوبلاں۔۔۔ تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟"
 اس کے کہنے پر جیسے اسے اپنے ہاتھ کا وحیان آیا تھا
 وہ انتہائی لاپرواہی سے اپنا خون ہٹا دیکھ کر بولا۔ یوں
 جیسے اسے کوئی درد اور تکلیف ہو ہی نہ رہی ہو۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی سکندر! ان سے لڑنے کی؟
 ایک بیگ ہی تھا ان کے ہاتھ میں۔ وہ دیکھ کر انہیں چند
 سوچو رو تمہاری جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہو سکتے۔"

"وہ غصے میں دوسرے ہوئے چلا آئی تھی۔
 "میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن اب مجھے کچھ نہیں ہوا
 ہے۔ کیوں بے کار میں روئے جا رہی ہو۔ چلو دیرو۔

رہی ہے۔ نہیں ہوا پس بھی پہنچا ہے۔"
 ٹھیک اور بردباری سے کہتا اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے
 گاڑی کے پاس لے آیا۔ وہ گاڑی کی آگنی نشست کا
 دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ سکندر کا
 انتظار سکون اور مطمئن سا انداز دیکھ کر وہ باہر نکل گئی۔

"تم اس وقت کافی دیر تک لگ رہی ہو اگر مانتا ہے
 تم کو تو میں پورا شوک کر لوں گا؟"

وہ اسے کوئی جواب دے بغیر خود ہی آگے بڑھی
 تھی۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھ کر دیش بورڈ سے فرسٹ
 ایئر بائس باہر نکل رہی تھی۔ سکندر وہ لاپرواہی سیٹ پر آ
 کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کا بازو پکڑا۔ وہ
 سکندر کے بازو پر ہینڈ بیج کرنا چاہتی تھی 'خون کو مزید
 بننے سے روکنا چاہتی تھی۔

"ابھی تو خون بہنا رک گیا ہے۔ راستے میں جہاں
 کہیں کوئی اسپتال نظر آئے، وہاں سے تمہارے ہاتھ
 کی برابر ہینڈ بیج کر دے گا۔" وہ اس کے ہاتھ کی
 ہینڈ بیج کرتے ہوئے بولی تھی۔

سکندر بے اختیار ہنسا تھا۔ اس کے ہنسنے کا انداز ایسا
 تھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی بڑا نکتہ بتا کر دیا تھا۔
 اور وہ اس پر اپنی ہنسی روک نہیں رہا تھا۔ اس نے غصے

نہ اس نے چاہا تو اسے ان پر وار نہیں کیا تھا۔ وہ
 صرف ٹانگوں کا استعمال کر کے ہی ان دونوں کو بندھال
 کر زمین پر گر جانے پر مجبور کر چکا تھا۔

وہ دونوں زمین پر نہ مڑی بڑے گرا رہے تھے۔
 "بس کرو۔ سکندر! پلیز بس کرو۔" وہ روتے ہوئے
 اس کے پاس آئی 'جو بے در پے ان دونوں کو لائیں مار
 رہا تھا اور وہ دونوں تکلیف سے چلا رہے تھے۔ سکندر
 جیسے اب اس کی آواز پر چونکا تھا۔

"باسفر۔" اسے ہونٹوں کے پاس سے خون صاف
 کرتے ہوئے سکندر نے انہیں گالی دی اور پھر ان
 دونوں کے پاس سے پیچھے ہٹا۔ یہ وہ سکندر شمار نہیں
 ہوتا جسے وہ جانتی تھی۔ یہ ایک دوسرا شخص تھا جس سے وہ
 ابھی ابھی متعارف ہوئی تھی۔ یہ سب حد جنٹی 'طاقت ور
 اور غصے میں آجی جان کی بھی پروا نہ کرنے والا۔ 'تکلیف
 اور درد سے چلائے ہوئے وہ دونوں شدید زخمی چچی
 سکندر کو پیچھے ہٹا دیکھ کر اپنی جان بچانے کے لیے وہاں
 سے اندھا دھند بھاگے گئے۔

"بلڈی باسفر۔" سکندر نے انہیں بھاگتا دیکھ کر
 دوبارہ گالی دی تھی۔ چند سیکنڈ ان دونوں کو دیکھتے رہے
 کے بعد اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ اسے سکندر کی
 آنکھوں میں ابھی بھی خون سا نظر آ رہا تھا۔ اسے اس
 کی آنکھوں سے ڈر لگا تھا۔ بے اختیار اس نے اسے
 پکارا تھا۔

"سکندر! وہ جیسے اتنی دیر کے بعد اب اس کی پکار
 نہ کیا تھا۔ وہ واپس اپنے حواسوں میں آیا اور اس نے
 باور اسے دیکھا تھا۔

"تم مدد کیوں نہ ہو؟" وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑا
 تھا۔ اس نے لیزا کی آنکھوں سے گرتے آنسو لپٹے
 زخمی ہاتھ سے صاف کیے تھے۔ اور اس کا پس اسے
 اٹا کر دیا۔

"یہ لو۔" اس کی نظریں سکندر کے چہرے پر نہیں
 نہیں آ رہی تھیں۔ اسے شولڈر ٹیک پر اس کی نظریں سکندر
 کے بازو سے پٹے خون پر تھیں۔ اس کی کی شرت کی
 اندھنی تو جی ہوئے کے سبب بازو سے خون بہتا

سے سکندر کو دیکھا۔

”تمہارے لیے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ تمہارے لیے کیا بات ہے؟“ سکندر جواباً لب بلیغ کر کے ایک سو ہی خاموش ہو گیا تھا۔

اسے سکندر کی آنکھوں میں درد پھیلنا نظر آیا تھا۔ قصہ کرتا بھول کر خود بھی بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اس نے سکندر کے ساتھ کی بیڑی پر خاموشی سے مکمل کردی، پھر کان پر ہوا لگا کر سکندر کے ہونٹ کے پاس جہاں سے خون بہہ رہا تھا، اس پر رکھی اس جگہ پر ہاتھ سے ہلکا سا دباؤ ڈالا تاکہ خون بہنا روک جائے۔ سکندر نے بے اختیار اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ تکلیف زدہ ہو رہی ہے کیا؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔ اس نے جواباً ”سرہاں میں ہلایا تھا۔“ ”بس ایک دو منٹ کی تکلیف اور جلن ہے، برداشت کر لو۔“

وہ چند منٹ اس کے ہونٹ کے پاس یوں ہی ہاتھ سے دباؤ ڈال کر بیٹھی رہی۔ اس کا زخمی بازو بھی اس نے دسرے ہاتھ میں قدرے اوپر کر کے پکڑا ہوا تھا تاکہ خون بہنا دوبارہ شروع نہ ہو جائے۔

”سیرنی بیڈرن ہوئی ہے“ اب کیا ہم طیس؟“ وہ سنجیدگی سے بال رہا تھا ”جہ نری لیا ہوا اللہ و ستانہ سا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کسے سرانبات میں ہلا کر گاڑی اشارت کر دی تھی۔

”دیسے اگر تم مجھے ذرا سیونگ کرنے دیتیں تو اچھا تھا۔ تمہاری جتنی ڈسٹ ذرا سیونگ تو نہیں کرنا کر میں بھی نہیں دوا جلدی ہی پٹینا رہتا۔“ وہ اس کے اس سے بولا۔ یوں جیسے کچھ دیر پہلے کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا وہ اب بالکل بے زل اور کمزور سا بیٹھا تھا۔ وہ جواباً ”چپ رہی تھی۔“ سکندر نے راستے میں دو ایک بار خوشگوار موسم وہاں کے مضافات کو موضوع گفتگو بنا کر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس گفتگو میں اس کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔

جوابات وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی وہ سکندر نے بتائی نہیں تھی اور باقی کسی موضوع پر گفتگو اس کا دل

نہیں چاہ رہا تھا۔ ان کا بانی سارا راستہ بالکل خاموشی سے گنا تھا۔ اس نے گاڑی اس کے ہونٹ پر لا کر روکی وہ فوراً ہی گاڑی سے اتر گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اندر جا رہا ہے مگر وہ کھوم کر اس کی طرف دانی کھڑکی پر آیا اور کھڑکی پر بازو لگا کر کھڑ ہوا۔

”پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگتا ہے جیسے میں نے تھیں ناراض کر دیا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”میں ناراض نہیں ہوں سکندر! مگر تمہارے جذباتی پن پر مجھے غصہ ہے۔ ایک بیگس ہی تھا ناں میرا اس کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا؟ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا یا پھر اگر ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوتے وہ بھی وہاں تہا جاتے؟“ وہ ناراض لہجے میں جھمر جھری سی لے کر بولی تھی۔

”میں دراصل اپنی دو من آرٹسٹ لاسٹ مر“ جو مجھے پانی کے ساتھ طاقت کے سمبل کے طور پر دکھانا چاہتی ہے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی بہت بہادر ہوں۔“

وہ ہنس کر لاہروائی سے بولا۔ خود پر لاہروائی کا طبع چڑھائے وہ اپنے اس جنونی غصے کی عجیب عجیب توجہات پیش کر رہا تھا۔ وہ جواباً ”سنجیدہ لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری زندگی اتنی بے وقعت اور بے مول نہیں ہے سکندر! کسی اور کو فرق پڑے نہ پڑے لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گا تو مجھے بہت تکلیف ہوگی۔“

وہ بہت آہستہ آواز میں بولی تھی۔ مسکرا کر اس کی طرف دیکھا سکندر یک دم ہی اس کی گاڑی کی کھڑکی پر ہٹا۔ ایک دم ہی اس کا چہرہ سنجیدہ اور سب سے بڑا ہو گیا تھا بہت سخت سا ہو گیا تھا۔

”چاڈ لیز۔“ اس نے فوراً ہی اسے ہاتھ پر ہاتھ حافظہ کیا اور اس کے گاڑی اشارت کرنے سے اندر چلا گیا۔ وہ وہیں رہی اسے اندر جاتے ہوئے رہی تھی۔ کیا وہ اس شخص کو آخری بار دیکھ رہی تھی اسے خود سے رشتہ سے، محبوب سے؟

اس قدر شہر کر چکا تھا؟

بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

وہ بھی گویا جھٹکا پکچا تھی۔ وہ مسکند کے بیٹے کیوں آتی ہے اس کا جواب دیتے ہوئے وہ مسکند کو جھٹکا پکچا بھی کہنے لگے مختلف اعمال کی مختلف وجوہات تلاش کر کر کے خود کو مسلسل جھٹلائی رہی تھی مگر اس بل مسکند کی تکلیف پر روکتے ہوئے وہ خود کو ہرگز جھٹلا نہیں پاری تھی۔ اس کا دل چاہا ہاتھ وہ مسکند کو فون کر کے بتائے میں پہلی بار بریبا میں تمہارے پاس اس لیے آئی تھی کہ تجھ میں کچھ کر میرے دل میں کہیں بہت اندر بہت خوب صورت گھنٹیاں لگی تھیں۔

”جس سے مجھے محبت ہوگی وہ جب میری زندگی میں آئے گا تو مجھے نور“ یا چل جائے گا، میرے دل میں اسے دیکھتے ہی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔“

ایسا پر خزاں انداز میں کیا وہ ہلکے یاد کر کے اس بل پر روکتے روکتے ہنس پڑی تھی۔ وہ اسے خوب صورت لگتا ہے اس لیے وہ اسے پھٹ کرنا چاہتی ہے وہ اسے اچھا لگتا ہے اس لیے وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔ سختی و جرات اور توازن وہ خود اپنے آپ کو مسکند کے اہکھٹ منٹ سے پہلے تک پیش کرتی رہی تھی اور اس کے اہکھٹ منٹ کے بعد جب وہ بھاگتی بدلتی اس کے پاس ہسپتال پہنچی تھی اس کے بعد اس نے اپنے اندر سے ابھرتے ہر مول کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے پاس ہسپتال میں مسلسل کیوں ہے؟ وہ اسے اپنے گھر لانے پر بند کیوں ہے؟ اسے اس کی دہ اور خوراک کی اس قدر پروا کیوں ہے؟ وہ خورے لاسروانی برتا ہے تو اسے کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ وہ اس کے گھر سے جا رہا ہے تو اسے یہ فکر کیوں ہے کہ وہاں جا کر وہ اپنا خیال ٹھیک سے رکھے گا کبھی کہ نہیں؟ آج کل کو یہ بات یاد کر کے کہیں ناقابلِ چون تکلیف پہنچی تھی کہ وہ چند دنوں یا چند غزنی میں واپس چلا جائے گا۔

وہ اسی ایک قصے کو سوچتے نہ لے اور بے ہوش ہوئے سوئی تھی اور صبح بیدار ہوئے ہی جو پہلا خیال اس کے دل میں آیا تھا وہ اسی تھا جو مسلمان ہوں سے بھاگا۔ وہ اسی کا تھا جو سڑ چھو تصویریں آیا تھا وہ اسی کا تھا۔

کاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ مسکند کو سوچ رہی تھی اور یہاں نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ مسکند شہر اور وہ نہیں جو پچھلے بہت سارے دنوں سے اسے رہا میں مختلف جگہوں پر مل رہا ہے بلکہ اصل مسکند شہر اور وہ ہے جو اسے Tivoli کی سڑک پر فینڈوں کے ساتھ انہی کی زبان میں بات کرتا نظر آیا تھا، جنہی سا غصہ اور باگھل پن لیا ہوا۔



وہ گھر آتے ہی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے یا شاور لینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ ابھی تک اسی خوف ناک واقعہ کے حصار میں تھی۔ وہ مسلسل مسکند کے اس جنہی انداز کو سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے جسم سے ہنسے خون کو اتارنے سکون سے کس طرح جو کچھ سکنا تھا؟ کیا وہ خود کو سزاوارا کرتا تھا؟ آج اس کے صرف ایک بیگ کی خاطر اس نے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالا تھا جبکہ بیگ تو وہ اس لڑکے سے نورا ہی حاصل کر چکا تھا۔ وہ ان دنوں خانہ بدوشوں کو چند منٹوں میں دھیر کر چکا تھا۔ پھر انہیں مار مار کر اڑھ بھا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کیا جنون اور کیسی رشت تھی جو اس بل اس پر سوار ہوئی تھی؟ آخر زندگی نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا تھا جو وہ خود کو اپنی زندگی کو اتار ڈال اور بے مول سمجھنے لگتا تھا؟

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ مسکند کو تین دلائے کہ اس کا جو اس دنیا کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس کا ہونا اس زندگی کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس کی موجودگی لہذا محمود کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے لہذا محمود کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ اہکھٹ منٹ کے بعد ہسپتال میں زخمی پڑا تھا تو لہذا محمود کا دل اس کے لیے پریشان تھا۔ وہ آج اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا تھا تو لہذا محمود کا دل سوکھے سٹکی ہانڈا لڑ رہا تھا۔

اسے وہ خوب یاد رہا ہے۔ اسے یہ یاد ہے کہ اس نے اسے کوئی تکلیف ہو رہی تھی یا نہیں مگر لہذا محمود کو

کہ غنی اس بل اسے اور سکندر کی تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان سے لگاؤ میں جڑا کر جان بوجھ کر خود کو کام میں مصروف ظاہر کرنے لگی تھیں۔

”ناشناختہ ہیں لا دیتی ہوں تمہیں۔“ ایک بل اسے خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ ناشتا لانے کا کہتی نیچے اتارنے لگیں۔

”تھنک یو نی! اپنا بھی لے آئیے گا۔ بالکل نی میں ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔“ اس نے قدرے بلند آواز میں ان سے کہا تھا۔



اس نے سکندر کو فون میں کہا تھا۔ وہ خود کو سکندر کی تصویر میں مصروف دیکھتے ہوئی بھی مگر میز پر پڑے اپنے موبائل پر گھوم بھر کر اس کی نگاہیں بار بار چارٹش تھیں۔ کام پر دھیان رکھتے ہوئے بھی اس کا سارا دھیان فون کی طرف تھا۔ نیچے بھی فون کی بیل بج رہی تھی تو وہ چونک رہی تھی۔ اس کے کان فون کی فٹنیوں پر لگے تھے۔

اگر اس نے اسے فون نہیں کیا تو سکندر کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اسے فون کر لے؟

وہ دل ہی دل میں سکندر سے غفاری۔ شام ہو چکی تھی اور اب وہ خود کو مزید روک نہیں پاری تھی۔ ایک بے اختیار پری کیفیت میں بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے اس کا موبائل نمبر لایا تھا۔

”کیسی ہو مصوہ؟“ وہ اس کی کواڈمن کر خوش مزاجی سے بولا تھا۔

”تم کہاں ہو؟“ اسے کیوں غصہ آ رہا ہے وہ سمجھ نہیں پاری تھی مگر اس کا دلچسپی سے بھرا تھا۔

”میرے ہاتھ میں موجود نقشہ کے مطابق میں اس وقت Via del Corso پر ہوں۔“ اس نے کہا۔

سوچا اب تک Trevi Fountain میں دیکھا سوار اسے چل قدمی کرتے ہوئے وہاں جانے لگیں۔

”اے ای خوش مزاج انداز میں بولا تھا مسکرا رہے تھے۔“

چند دن پہلے اس نے نئی کو سکندر کی سب سے بڑی ٹامی اس کا پاکستانی ہونا بتا کر ان کی ہر سوچ کی نفی کر دی تھی اور آج اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ پاکستانی ہے یا دنیا کے کسی بھی اور ملک کا رہنے والا۔ وہ جو بھی ہے وہ جیسا بھی ہے وہ جس بھی جگہ سے ہے میں بہت اہم ہے۔

وہ اپنی سوجوں اور اپنے جذبات کی شدت سے خود ہراساں ہی ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اس وقت وہ سکندر کے سامنے تھی تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ایک بل میں جان جائے گا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اس کی خیمہ پت پوچھنے کی شدید چاہ رکھنے کے باوجود اس سے اسے فون نہیں کیا جاسکا تھا۔ اس کا چہرہ سامنے نہیں بھی ہو گا تب بھی اس کا دلچسپی سے سب کچھ جادے گا۔ اس کے دل کا ہر بھید اس پر کھول دے گا۔ وہ بغیر کچھ کھائے اور اپنے اسٹوڈیو میں آگئی اور سکندر کی تصویر مکمل کرنے لگی۔ جو تصویریں اس نے کمرے سے کھینچی تھیں اسے ان کی طرف ایک نظر بھی دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آرہی تھی۔ اس کے ہاں فوڈ کے سامنے بیٹھ ہوئے کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی اس کی آنکھوں کے تاثر اس کے لبوں کی بندھن سی مسکراہٹ، دو بار پر رکھے اس کے ہاتھ کی انگلیاں یہ سب یاد رکھنا تو شاید بہت عام سی بات تھی اسے تو یہ تک یاد تھا کہ یوں بیٹھنے سے اس کی شرٹ اور پینٹ پر کہاں کہاں شکلیں پڑ رہی تھیں، ہوائے اگر اس کے بال اڑنے سے تو کیسے لگے تھے، اسے ہر بات یاد تھی اس منظر کی کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جسے پھر سے دیکھنے کے لیے اسے اپنے سامنے تصویریں رکھنی پڑتیں۔

”بہت اسیے بغیر اور آٹھس لیزا؟“ نئی کو پراگتی تھیں۔ اس سے ناشتہ کے بارے میں پوچھتے پوچھتے ان کی نظر سکندر کی پینٹنگ پر پڑ گئی۔ ”میں بھی سکندر کی تصویر پہلی رات تو تم آتے ہی سوئے جلی گئیں۔ تم سے بات ہی نہیں ہو سکی۔“

”جی نہیں! میں وہ میں تھک گئی تھی۔“ وہ جانتی تھی

”تم Trevi Fountain چاہتے ہو؟“

”تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟ کیا اس سے پہلے وہاں کی ہر جگہ میں نے نہیں دیکھی؟“

”مجھے دکھانے کا نکل میری دوسری دوست مجھ سے خطا ہو گئی تھی اس لیے آج کیسے کی ہمت نہیں ہوئی ورنہ ظاہر ہے میں تم سے ہی ہمت لے جاتے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بالکل اسی انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس سے کیا کرنا تھا۔ ہاں اس کے لمحے میں دور دورہ پچھلی ایک جہان کی سی تھی جیسے وہ اس کی جتنی اور غصے کی وجہ سمجھ نہ پا رہا ہو۔

”اچھا تم جہاں ہو وہیں ٹھہرو“ میں آ رہی ہوں۔ اس پر اس کوئی کہنے کا بار ہے تو وہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں بس دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچتی ہوں۔“

تیز رفتاری سے میرا حیاں اترتے ہوئے اس نے حکم دیا، انداز میں سکندر سے کہا اور پھر اس کا جواب سے بغیر ہی فون بند کر دیا۔

اس نے شاید لینے اور تیار ہونے میں۔ اس نے گھائی اور کاسنی رنگوں کے استرلج والی فرینڈل شرت کاسنی رنگ کے کوزہ اور کوزے کے ساتھ پینٹ تھی۔ تھکے بالوں کو

یونہی کھینچا جو کمر سینڈل پر پہن میں نے اپنی وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر نیچے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی اس جگہ پہنچی اور سکندر کو فون کیا تب سکندر نے اسے اس نیچے کا نام بتایا جہاں

بیٹھا وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گاڑی اس کیسے تک لائی تو سکندر وہ دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”گاڑی کسی جگہ پارک کر دو میں اس وقت وہاں کی سڑکوں پر سیدل چٹا چاہتا ہوں۔“

وہ اس سے مسکرا کر بولا۔ اس نے گاڑی پارک کر دی۔ اب وہ دونوں پتھروں سے بنی اس کئی سو سال پرانی سڑک پر چلا اور پل رستے تھے جو اسٹریٹ Trevi Fountain کی طرف لے کر جا رہی تھی۔

”تمہاری چوٹ کیسی ہے؟“ اس کا اشارہ سکندر

”کیا تمہاری طرف تھا۔“

”اٹھک ہوں اور تمہاری ڈانٹ سے بچنے کے لیے میں نے ڈاکٹر سے پراپر قسم کی بینڈج کر رکھی ہے اور پین کلرز بھی لے رہا ہوں۔“ اس نے اپنا کٹ اور ٹائی

اس کی گاڑی میں اندر کر کے دیے تھے۔ شرت کا پوری بلن کھولا ہوا تھا اور اسٹین کھنی سے ڈرائیو تک فولڈ کر رکھی تھیں۔ وہ اسے اپنا ہاتھ دکھا کر مسکراتا رہا تھا۔ اس کی کریم کلر کی فیس کی آستین کے اندر اسے

اس کے بازو پر پٹی بندھی نظر آرہی تھی۔ وہاں عمیری باتوں کا جیسے تم پر بڑا اثر ہوتا ہے۔“ وہ قدرے برامان کر رہی تھی۔

چند سیکنڈ وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے تھے۔ اس خاموشی میں جب اسے اپنے دل کی پوسٹوں کا شور زیادہ تیز سنائی دینے لگا تب اس شور سے گھبرا کر اس نے اسے مخاطب کیا۔

”تم سیدل کیوں چٹنا جا رہے تھے؟“ وہ سکندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے ایک چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر مار کر اس کی طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے سوال پر سکندر نے

نظر س اٹھا کر اسے دکھا تھا۔

”بس یونہی میرا دل چاہ رہا تھا۔ کل میرا یہاں آخری دن ہے۔ میری ساری چیزیں فلائٹ سے میں لے کر جاؤں گا۔“

جہاں تک پتھر کبھی تمہارے رہا کی ان سڑکوں پر چٹنا نصیب ہو کہ نہ ہو اس لیے میں نے سوچا کہ لیڈا کے رہا کی سڑکوں پر سیدل چٹا جائے۔“

اس کا دل دھک سے دو گیا تھا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ کل آخری دن؟ ہر سول جی کی فلائٹ؟

”کل آخری دن؟ اس طرح اتنی جاک؟“ تم نے فو کہتا تھا تم یہاں دو سٹین ہتھوں کے لیے آئے ہو؟“

اس کے دل میں یکدم ہی یامیت اور کراسی باز آئی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ سکندر سے لڑے پوچھتے کہ وہ واپس جانے بات کیوں کر رہا ہے۔ مگر وہ بڑے شکستہ سے اسے اس کے ہاتھ میں لے کر دیکھ رہی تھی۔ تو اس نے یہ کہہ اس کی کینڈیا سے انجیان مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں تو ٹھیک کہا تھا!ں مصور وہ بنتے ہو تو گئے مجھے یہاں پر اور میرا کام جس کے لیے میں یہاں آیا تھا آج مکمل ہو گیا ہے۔ کل بس ایک مینٹگ اینڈ کرنی ہے" پھر میں فارغ۔

وہ جیسے اپنی داہلی پرست خوش تھا۔ ہاں وہ خوش کیوں نہیں ہوتا وہ اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ روم اس کا گھر نہیں تھا۔ وہ کیوں محو لگتی تھی یہ بات کہ سکندر شہر بارہاں مہمان ہے، پر دیکھی ہے، اچھی ہے۔ اس کا گھر اس کا شہر اس کی زندگی میں اور ہے۔ اسے ایک نئے ایک دن یہاں سے چلے جانا ہے پھر کبھی بھی یہاں نہ آنے کے لیے۔

ایک دم ہی اس کا دل چاہا تھا وہ جھپٹیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔ اس کے اندر آنسو جگہ مورے تھے وہ اگر اس بل کچھ بولتی تو یقیناً "مرد بانی" اس لیے بجائے کچھ بولنے کے سر جھٹکا کر خاموشی سے چلنے لگی تھی وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔ خود کو دہانے سے روک رہی تھی۔ خود کو سمجھاتے ہوئے وہ سکندر کو روم کی اس قدیم ترین سڑکوں میں سے ایک سڑک پر لے آئی تھی جس پر Trevi Fountain موجود تھا۔

ان کی نگاہوں کے سامنے کچھ دور "تھوڑے فاصلے پر صرف اسی ہی میں تھیں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ترین Trevi Fountain" نظر آ رہا تھا۔

"بہت شوق تھا مجھے Trevi Fountain دیکھنے کا۔ تم انٹالین لوگ اسے De Trevi Fontana کہتے ہو یاں؟"

زوی فاؤنٹین کے نزدیک جاتے ہوئے سکندر نے اس سے پوچھا تھا۔ بیشہ جہاں بھی وہ دونوں جاتے تھے وہاں کی تاریخ وہاں کے آرکیٹیکچر کی تفصیلات وہ اسے بتاتا کرتی تھی چاہے سکندر دلچسپی سے سن بھی رہا ہو یا نہیں مگر آج وہ خاموش تھی۔ سکندر کی بات کے جواب میں وہ سر ہلا کر وقت مسکرائی تھی۔

"اپنے مین اینج کے دنوں میں میں نے Vita La Dolce وستی تھی تب سے ہی مجھے شوق تھا Trevi فاونٹین دیکھنے کا۔ موی میں اسے اسی

خوبصورتی سے دکھایا تھا۔"

وہ پھر ٹھیک سے انداز میں مسکرائی تھی۔ "Trevi فاؤنٹین ایسا ہی نظر آ رہا تھا جیسے وہ اسے اپنے بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ اس سڑک پر وہ طرف میں کئی کئی سو سال پرانی تاریخی عمارتیں اسی طرح ایسٹرنڈا تھیں جیسا اس نے انہیں، بیشہ، دکھا تھا۔ بیشہ ہی کی طرح وہاں پر سیاہوں کا جہنم تھا۔

اس جہنم میں گھس کر وہ دونوں بھی فاؤنٹین کے سامنے آ گئے تھے۔

"ایسا ہی دکھا تھا میں نے اسے موی میں یہ آرکیٹیکٹس کا بچا یا خوب صورت مکمل اس کے بیروں منظر پر یہ پتھروں کو تراش کر مجسمہ سازوں کے بنائے گئے رومن گاڈ (Roman God) Neptune اور سمندر کی گھوڑوں کے جیسے اور ان مجسموں اور پتھروں کے اوپر سے گرتا بہت بلندی تک جانا اور پھر نیچے اس خوب صورت بڑے سے تالاب میں گرنا یہ بلنگوں والی۔" وہ دونوں اس بڑے سے تالاب کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے بہت سے سیاہیوں تالاب میں سکے اچھا رہے تھے۔

سکندر اس کی سوجوں سے انجان Trevi فاؤنٹین کی خوب صورتی کو سراہنے میں مصروف تھا۔ وہ مکمل اس کے کلبس "رومن گاڈ اور گھوڑوں کے مجسموں اور ان کے عین نیچے پانی کے بہت بڑے اور بہت گہرے تالاب کی دلکشی اور خوب صورتی کو جیسے مہسوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ آج جب اسے روم کی خوب صورتی اسے متاثر نہیں کر رہی تھی تب پہلی مرتبہ وہ اس سے متاثر ہوا نظر آ رہا تھا۔

سکندر اپنے موباکل سے فاؤنٹین کی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچنے لگا۔ اس نے تالاب میں سکے اچھالتے سیاہوں کو دیکھی سے دیکھا۔

"اگر Trevi Fountain میں Coins اچھا لیں گے تو زندگی میں کبھی نہ کبھی روم بارہا ضرور آئیں گے" اسے میں لیزا؟ "ان لوگوں کے بالکل سا ایک تری تالاب میں سکے اچھاں رہی تھی اور اس

ہوئے فریڈرکسک اچھا لے وقت اس کی تصویر سمجھ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے چیخ کر اپنی گرل فریڈرکسک کہا تھا۔

"Make a wish" (کوئی خواہش کرو)

لڑکی کی فائونٹین کی طرف بیٹھ گئی "اس نے اپنے سیدھے ہاتھ میں سکہ پکڑ رکھا تھا وہ اسے اپنے کندھے سے اُپر لے جا کر بغیر پیچھے مڑ کر دیکھ Pond میں اچھالنے لگی "ساتھ ہی اس نے جیسے آنکھیں بند کر کے بڑی شدت سے کوئی دعا مانگی پھر آنکھیں کھولیں اور سکہ پانی میں اچھال دیا "میں اس کے سکہ اچھالنے لے" اس کے ہوائے فریڈرکسک اس کی ایک ساتھ تین چار تصاویر کھینچی تھیں۔

"ہاں! صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی روایتوں کے مطابق کسا تو یہی جاتا ہے کہ رونا ورت کرنے والا کوئی بھی شخص اگر Trevi فائونٹین میں Coin اچھالے گا تو وہ زندگی میں کبھی نہ کبھی Eternal Eternal یعنی ضرور آئے گا۔" خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے سکنڈر کو مسکرا کر بتایا تھا۔

اسے سامنے دو بارہ تھوڑی خالی جگہ نظر تھی وہ اس پر بیٹھ گئی۔ اسے جیسے دیکھ کر سکنڈر بھی اس کے ساتھ ہی آکر چہنچہا گیا تھا۔ "اؤں! اب میں یا میں بلایا وہ خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سکنڈر کو اس کی لڑائی کسی بھی قیمت پر پتا نہیں چلتی چاہے۔ وہ سکنڈر پر سے نظریں ہٹائے خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کی بھرپور شعوری کوشش کرتے ہوئے فائونٹین میں سکہ اچھالنے لگا۔

صحیح طریقہ کیا یہی ہوتا ہے فائونٹین میں سکہ اچھالنے کا؟" سکنڈر نے ایک سیار مز کو فائونٹین میں سکہ اچھالنے دیکھ کر اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں! آپ کی بہن فائونٹین کی طرف ہوتی چاہے سکہ آپ کے سیدھے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور پھر فائونٹین کی طرف ہر گھما کر دیکھے آپ نے کندھے کے اوپر سے Coin پالی میں اچھالنا ہوتا ہے روایت ہے کہ اگر ایک سکہ اچھالیں گے تو دوبارہ روا آئیں گے

اور اگر دو سکہ اچھالیں گے تو دوبارہ روا آئیں گے اور کسی دوسرے سے آپ کو محبت بھی ہو جائے گی۔" اگر تین سکہ اچھالیں گے تو جس سے آپ کو محبت ہو گی اس سے آپ کی شادی بھی ہو جائے گی۔

وہ سکنڈر کی طرف دیکھ کر قہقہہ کر رہی تھی۔ "تم تین سکہ کتنی ہو اس بات پر؟" سکنڈر نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میں ہم کرتے ہو؟"

"میں بھی ہاں! میں نہیں۔" وہ دونوں قہقہہ کرتے ہوئے گویا فائونٹین میں سکہ اچھالنا ان دونوں کے لیے ایک مذاق اور تفریح سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔

"اس طلب میں اب تک کتنے سکہ جمع ہو چکے ہوں گے۔" ایلین گور سنسٹ لک کر کہتی کیا ہے؟ "سکنڈر نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔ "رونا کے غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں یہ میرے۔" کم از کم بھی ہر دن یہاں تین چار روپے دو پانی میں جمع ہوتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر سکنڈر کو جواب دیا تھا۔

"اچھا تم یہاں میز کی جگہ رکھ کر بیٹھو میں ابھی آیا ہوں۔" وہ ایک دم اپنی کچھ سوچ کر رہا ہوا اس کے پاس سے اٹھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ کیا Coin اچھالنے؟" اس کے شرارت بھرے سوالیہ انداز کے جواب میں سکنڈر ہنسنے لگا تھا۔

"اتنا پاگل نہیں ہوا ابھی۔" کسی اور کام سے جا رہا ہوں۔" اس ابھی آیا۔ "تم میری جگہ رکھنا۔"

جس کر پورٹا تیری سے چلا گیا اور جس رفتار سے وہ گیا تھا۔ اسی رفتار سے چار پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو آکس کریم کونز تھیں۔

"گیا اونیوینورنا۔" اس نے کون اس کی طرف بڑھائی تھی۔

"اچھا تو یہ لے گئے تھے؟" مسکرا کر کون ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

"ہاں! میں نے سوچا اٹنے والوں میں اٹنی کی کافی

پیر بھی بجے ایر پورٹ کے لیے نکلوں گا۔ صبح سنا رہے تھیں بچے کی میری فلائٹ ہے۔“
وہ اپنے جانے کی بات آتے سکون سے کر رہا تھا۔
ذرا سا افسوس، ذرا سا دکھ بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہا تھا، بلکہ وہ بہت مطمئن لگ رہا تھا جیسے کہ واپس اپنے گھر جانے پر خوش ہو۔
”تم اتنے خوش کیسے ہو سکتے ہو سکندر شہزاد! تم مجھ سے دور جانے پر مجھ سے جدا ہونے پر اتنے خوش کیسے ہو سکتے ہو؟“

اس کا دل چاہا تھا وہ اسے جھنجھوڑ کر پوچھے چند دنوں کے لیے ملاوٹ شخص اتنی خوشی اس سے جدا ہونے کی بات کر رہا تھا۔ کیا اتنے دنوں میں کبھی ایک بل کے لیے بھی اس نے اس کے لیے وہ نہیں سوچا تھا، ہوں اس کے لیے سوچا کرتی تھی؟
”تم کل رات کا کھانا میرے گھر میرے اور نینی کے ساتھ کھاؤ۔“ بچہ اتنا اس نے اسے دعوت دی جیسے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ایک وجہ تلاش کی ہو۔

”دُعا لیکن لیزا۔“ وہ شاید اس سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے اس بات پوری نہیں کرنے دی تھی اس نے بہت اصرار کر کے کہا تھا۔

”لیزا سکندر! انکار مت کرو، مجھے افسوس ہو گا۔ تمہاری پینٹنگ میں مکمل کر چکی ہوں، میں تمہیں وہ دکھانا چاہتی ہوں، تم کل آؤ گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔“

سکندر نے ایک بل کے لیے اس کے چہرے کی طرف بھور دیکھا تھا، وہ اسے بہت گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک گہری سانس سے کہہ رہا تھا۔

”بہت دفعہ تمہارا اور تمہاری نینی کا مہمان بن رہا ہوں بہت یار تمہارے گھر پر کھانا بھی کھا چکا ہوں۔ لیکن اگر تمہارا اصرار ہے موصوفہ تو میں کل پھر آتا ہوں گا۔“

وہ ایک دم ہی مسکرا دی تھی۔ سکندر بھی ا مسکراتے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

مشہور جگہیں بھی دیکھ لیں، میلان کے منورے بازار کھلے بھی کھا لیے، اگر نہیں کھائی نو سواری دنیا میں مشہور اٹالین آئس کریم نہیں کھائی۔“
”میں آرڈر کر دیتی، تمہیں مشکل تو نہیں ہوئی؟“
”جواب کیا سمجھ رہا ہے آپ نے مجھے؟ خاصا ذہین آدمی ہوں میں گزارے لائن اٹالین لفظ سیکھ لیے ہیں میں نے۔“ وہ آئس کریم کھاتے ہوئے ہنس کر بولا۔

”اٹالین آئس کریم میں Fats بھی کم ہوتے ہیں اور اس کا ذائقہ بھی دوسری آئس کریم کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھا ہوتا ہے۔“

وہ اتنے آرام سے اس سے مختلف موضوعات پر کس طرح بات کر رہی ہے اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اندر سے بہت اواں تھی بہت پریشان تھی۔
”چلیں؟“ وہ دونوں کون کھا چکے تھے سکندر نے اس سے پوچھا۔ اس نے مرابطت میں ہلایا تھا اور یہ یوار پر ہے اٹھ گئی تھی۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے ایک دم ہی پھر اس کا دل راداسیوں میں گھرنے لگا تھا۔ کیا وہ دونوں اس طرح پھر کبھی ایک ساتھ میاں Trevi ٹاؤن میں کے سامنے بیٹھ پائیں گے؟ اس کا دل چاہا وہ سکندر سے کہے۔

”تم پانی میں سکہ اچھا لو تم چاہتے ہو یا نہیں مگر میں چاہتی ہوں تم روادو بارہ آؤ اور اب کی بار تم میری خاطر رہا آؤ۔“

وہ اس کی کیفیات سے انجان وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے پیدل واپس جا رہے تھے سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے وہ بہت مطمئن سا لگ رہا تھا۔

”تمہارا کل کا کیا پروگرام ہے؟“ اس نے آہستگی سے اس سے پوچھا۔

”ہنس آفس ہی جاتا ہے اور تو کچھ خاص نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کل آفس میں ایک مینٹگ ہے وہ پیر دو تین بجے تک مینٹگ ختم ہوگی۔ اس کے بعد کل باکرہ اپنی پینٹنگ، غیرہ کر دیں گا۔ کل رات ایک“

گھرنے لگتا پھر اچانک ہی پراسیدو مارا، نے لڑائی کے ساتھ مل کر وہ ایک بہت اچھی اور شہر اور ان دعوت کا اہتمام کر رہی تھی جس میں پاکستانی کھیلے بھی تھے لوہا لائیں بھی پاکستانی کھانے پانے ات نہیں آتے تھے مگر کھائی خوش سے تھی۔

پاکستانی ڈشز غنیمتی بنا رہی تھیں۔ اٹالین ڈشز دوتار کر رہی تھی۔ اسٹیک ٹیل پر اس نے گلڈان میں تازہ پنول سجا دیے تھے۔ مینز فہرکنز، ہلٹنس، چھری کالنے سب کچھ سلیتے اور خوش بہت سے رکھ دیا تھا۔ وہ خود بھی ٹخنوں تک آنا کھاسیادہ اسکرٹ اور گلابی سان شرٹ پہن کر تیار ہو چکی تھی۔

تیل کی آلودہ ہونے ہی اس کا چوکھل اٹھا تھا۔ کیا جانا لگے کہا باورہ کج اس سے وہ کہہ دے لیکن اس کے لبوں سے سنا جاتا ہے۔ اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ سکندر کے لیے کھولتے ہوئے دیا جانی تھی کہ اس کا چوک خوش سے جگمگا رہا ہے۔

”جیو سینورنا“، جینز اور لی شرٹ پہنے مسکراتا ہوا وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خوب صورت پھولوں کا گلہز تھا اور دوسرے میں وہ خوب صورت اور فنیسی شاپنگ کتو۔ ایک الگ سے شاپر اور بھی تھا۔

”چاؤ“ وہ مسکراتے ہوئے سامنے سے اپنی گور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

”یہ تمہارے لیے“ وہ دروازہ بند کر کے مڑی تو سکندر نے پھول اور ایک شاپنگ بگ اسے پکڑ لیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اپنی دامن دوست کے لیے ایک جھوٹا سا تحفہ۔ ”وہ مسکرا کر بولا۔ وہ پھولوں کی خوشبو سونگھنے لگی تھی۔ وہ دونوں لوگ دلم میں آکر موصوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ لیزا سکندر کے کلائے کھینچنے لگی تھی۔ وہ اس کے لیے فائن آرٹس۔ پر ایک بہت مہنگی اور تاباب کتاب تحفے میں لایا تھا۔ بہت قیمتی ٹکڑی سے جا ایک پور ٹیبل ایبل کا سیٹ بھی تھا جس میں ہینٹس ہر شہر اور پلیٹ وغیرہ کو رکھنے کے لیے خوب صورت

”میں تمہیں کل شام میں تمہارے ہونے سے ایک کر لیں گی۔“ وہ دونوں چلتے ہوئے وہاں تک آگئے تھے جہاں اس نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔

”وہ نہیں“ غلط بات ہے میری دعوت بھی کرو اور مجھے لینے بھی آؤ؟ میں اس کی گاڑی سے آجاؤں گا؟ تمہارے گھر کا پتا مجھے یاد ہے سینورنا۔“ اس نے جملے کا آخری حصہ ادا کرتے وقت وہ جیسے سے مسکرایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سکندر کو اس کے ہوش اٹارنے کے بعد وہ اپنے ٹیلیٹ واپس جا رہی تھی تو اس کی آنکھیں غم ہونے لگی تھیں۔ اس نے خود کو روکنے سے روکا خود کو سڑفٹس کی وہ کل آو رہا ہے وہ کل اس سے ملے تو رہا ہے ابھی وہ جد تو نہیں ہو گیا کیا پتا کیا وہ کچھ ایسا کہہ دے کہ پھر اس کا جملے جانا پھڑ جاتا ہے ہی نہیں۔ وہ سکندر کو اس کے ہوش چھوڑ دینے کے بعد سے ہی کل کی شام کا انتظار کرنے لگی تھی۔

کل کی شام اپنے ساتھ اس کے لیے بہت ماری خوشیاں لائے گی اس کی محبت ایک طرف نہیں ہے۔ وہ خود کو یقین دلارہی تھی کہ سکندر نے اس کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال لی تھی اس نے اس کے لیے اپنا خون بہا تھا اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

کیسے مان لے کہ وہ سب فریب تھا؟ اس کے بچے اور بہت انمول جذبے اتنے بے وقت نہیں ہو سکتے تھے کہ سکندر انہیں سمجھے بغیر اس سے کچھ بھی کہے بغیر واپس چلا جائے۔

کل وہ اس سے کچھ نہ کچھ سن چلا ضرور کہہ کر جائے گا۔ سکندر فہر پار کوئی آس کوئی امید کوئی وعدہ اس کی جھولی میں بالے بغیر یہاں سے چلائی نہیں سکا۔



وہ ایک آس اور فراس میں گہری سکندر کی دعوت کی تیاری کر رہی تھی دل اچانک ہی ادا سیدوں میں

اسے اور سکندر کو صوفے پر ساتھ بیٹھا بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔
"مینی! آپ اور سکندر باہمی کریم میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ صوفے پر اسے لٹے لگی تھیں۔

پتا نہیں کیوں اسے دینا آنے لگا تھا اسے سنانے رکھے سکندر کے لائے تھے الوداعی تھے لگت رہتے تھے۔ جیسے وہ اس سے ٹھنڈے سے پہلے اسے الوداع کہنے سے پہلے اپنی کچھ خوب صورت باتیں ان تحفوں کی صورت میں اس کے پاس چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں اسی طرح باتیں کر رہا تھا جس طرح کیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس کے بیٹھے کا انداز و رواج ہونے والا لگ رہا تھا۔

"مگر دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کھانا میں لگاتی ہوں۔" مینی اسے کہتے رہا تھا رکھ کر واپس بٹھاتے ہوئے بولیں۔ اور کچن میں چلی گئیں۔
"کھانا کھو گئیں؟" اسے کم مہم سا بیٹھا دیکھ کر سکندر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ زبردستی ہلکا سا مسکرائی۔

"چپ چپ سی لگ رہی ہو آج تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے جیسے ایک دوستانہ سی فکر مندی ظاہر کی تھی۔ وہ اس کی طرف بنو دیکھ رہا تھا۔
"کیا تمہیں سنا پتا نہیں چل رہا کہ میں کیوں چپ ہوں؟ میں کیوں اداں ہوں؟ اس کا دل چاہا تھا وہ سکندر سے چی کر پوچھے اسے جھنجھوڑے۔

"اے آج صبح سے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" وہ لول مسکی تو مسکرا کر حش اتاری۔

"تو سینورنا! تمہیں اس ڈر کو ہٹا دینا چاہیے تھا۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تو آرام کر تیں۔" وہ اتنے اطمینان سے اسے یہ حل بتا رہا تھا کیا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ آج رات سے چلا جائے گا۔

"صبح میں طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اب بالکل ٹھیک ہے، آج میں تمہیں تمہارا دینٹنگ دکھاؤں۔"

خانے بنے ہوئے تھے۔ وہ عدد قیمتی ریڈیو مڑتے ایک مرگسا میں کاسیٹ تھا اور ساتھ میں چاکلیٹیں کالیکٹ کر رہا تھا۔

"یہ ایک تحفہ ہے؟" وہ ابھی اس کے لائے تحفوں کو دیکھ رہی تھی کہ کچن سے مینی بھی وہیں آ گئیں۔
"اے کھانا کھاؤ؟"
"اسلام علیکم۔" سکندر انہیں دیکھ کر احرا! کھڑا ہوا تھا۔

"و علیکم السلام" جیتے رہو۔" مینی نے دعا دے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ بچھا رہا تھا۔ آج کے اس ڈنر کی تیاری میں مینی نے اس کا ساتھ اتنی ہی خوشی سے دیا تھا جتنی خوش وہ تھی۔ اسے کئی بار شک سا ہوا تھا کہ شاید مینی اس کی کیفیت کو سمجھ رہی ہیں۔ انہوں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر ڈنر کی تیاری انہوں نے جس جوش و خروش سے کی اور ابھی سکندر کو دیکھ کر جو خوشی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی، اس سے اس شک میں جھٹکا کر رہا تھا کہ مینی کو کچھ نہ سمجھ کر انداز ہے اس کی سوچوں کا۔

وہ سر اٹھا کر ایک بیک سکندر نے مینی کو دیا تھا۔ وہ ان کے لیے بھی ریڈیو اور گھر میں سہانے کے لیے چند ڈیکوریٹیشن ہیں لایا تھا۔ تیسرا اشارہ جو سکندر نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس میں ناشپاتیاں تھیں۔ اسے اس کی پسند و ناپسند تھی۔ وہ اس کے لیے اس کی پسند کا پھل لے کر آیا تھا۔

"خیر سے آج رات رو اگلی ہے بیٹا؟"
"جی آئی! صبح ہی ہو جائے گی۔" مینی نے تحفہ لیتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھے سکندر سے پوچھا۔
سکندر بڑے اخلاق سے انہیں جواب دے رہا تھا۔ جتنی دیر مینی اس سے بات کر رہی تھیں، وہ کھن کی طرف متوجہ تھا وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بہت سادہ اور غام سے انداز میں مسکرا کر بول رہا تھا۔ اتنے مینی کے دیکھنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ

زینے کے نیچے سے گھسٹ کر گزری۔ اس نے اسے دیکھا اور
آواز دی تھی۔ سکندر کی ہانپیں بلند ہوئی تھیں۔
تھیں وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ نیکی کی آواز اس
جیسی سنائی تھی۔

”کیا تم نے میری آنکھوں کے وہ زام نام نہان بات
کر لیے جو کرنا چاہتی تھیں؟“ پینٹنگ سے نکالیں
اٹھا کر اس نے اس سے پوچھا۔

”میرے خیال سے تو کر لیے ہیں خیر جھوٹا ہے
چلو چھپتے ہیں، نیکی کھانے کے لیے بلارہی ہیں۔“ وہ
پینٹنگ سے انداز میں مسکرا کر بولی تھی۔ سکندر نے سر
کھات میں ہلایا۔

”چار“ وہ دونوں کھانا کھانے کے لیے نیچے آئے
تھے۔

”آپ لوگوں نے تو واقعی میری دعوت گزری“ اسے
زادہ تکلف کی کوئی غورورت تھی تو نہیں۔ میں خود کو
یہاں مہمان سمجھ کر بالکل نہیں آیا تھا۔“
سکندر کھانے کی میز پر چلتے الزام و اقسام کے
کھانوں کو دیکھ کر بولا تھا۔ ”نیکی اس کی خاطر تو اس طرح بڑے
دل سے کر رہی تھیں۔ انہوں نے سکندر کی چکن کا
ایک ٹیبل کٹ کر اس کی پلیٹ میں رکھا۔

”ہم کبھی تمہیں مہمان نہیں سمجھتے۔ ہمارا جب
بھی دینا آؤ اس گھر کو اپنی گھر سمجھ کر آنا۔“
نیکی نے اس سے مسکرا کر کہا تھا۔ ہر تکلف کھانے
کے بعد نیکی نے پوچھا۔

”اب کیا چلے گا کافی باگرس لی؟“ وہ کھانے کے
دوران زیادہ وقت خاموش رہی تھی مگر اس کی خاموشی
بھی زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی کہ نیکی سکندر سے
باتیں کر رہی تھیں۔ وہ صرف خاموشی سے مسکرا رہی
تھی جیسے ان دونوں کی گفتگو میں بھرپور دلچسپی لے رہی
ہو۔

”کچھ بھی نہیں آئی! میں بس اب جاؤں گا۔ میری
پینٹنگ تھوڑی دیر رہتی ہے۔ اسے چھوٹی باتوں سے
لیٹ آیا تھا میری پینٹنگ یورپی نہیں ہو سکتی۔“

وہ ایک دم ہی صوفے سے اٹھی تھی۔ سکندر اس کے
پچھے اٹھا۔ چکر ڈر زینے پر چڑھ کر وہ دونوں لوہر آگے
بچھے۔ وہ سکندر کی تصویر کی نوک ٹپک بھی سنوار چکی
تھی اب وہ ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ کسی اور حوالے
سے بھی یہ پینٹنگ اس کے دل کے بہت قریب تھی
مگر ایک آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے بھی وہ جانتی
تھی یہ اس کی ایگزیشن میں رکھی جانے والی تصاویر
میں سب سے بہترین اور بے مثالی تصویر ہوگی۔ کام تو
وہ ہر تصویر پر ہی دل سے کیا کرتی تھی مگر یہاں شاید دل
کی دھڑکنیں بھی اس تصویر کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی
تھیں۔

”واؤ! اگر یہ کیا میں اتنا خوب صورت ہوں
لیرا؟“ وہ تصویر کی تعریف کرتے کرتے شرارتی انداز
میں بولا تھا۔

”نہیں! میں نے تمہیں خوب صورت پینٹ کیا
ہے اس لیے خوب صورت لگ رہے ہو۔“ وہ اس کی
شرارت کا شرارت بھرے ہی انداز میں جواب دیتے
ہوئے بولی تھی۔

”متم واقعی کمال کی آرٹسٹ ہو لیرا! صرف میں ہی
نہیں بلکہ ڈائنٹین اور اس سے گرا پالی سب کچھ جیسے
زندہ ہو کر پھر سے سامنے آگیا ہے جیسے میں کسی
پینٹنگ کے سامنے نہیں بلکہ حقیقت میں Trevi
میں اس ڈائنٹین کے سامنے بیٹھا خود کو دیکھ رہا ہوں۔“
وہ سچے دل سے اس کے آرٹ کی توصیف کر رہا
تھا۔ اپنا آرٹ اس بل اسے بالکل بے معنی اور حقیر لگ
رہا تھا۔ اپنی کوئی خوبی اس بل خوبی نہیں لگ رہی تھی۔
اگر وہ اتنی ہی اچھی ہوتی، اگر وہ اتنی ہی خوبوں کی مالک

ہوتی تو کیا اسے اچھی نہ لگ جاتی؟ تب کیا وہ اسے
پروٹس میں لی چمک مددہ ایک دوست سمجھ کر یوں
آواز دے گا؟

”لیرا! سکندر آج بڑا کھانا لگا گیا ہے۔“
شاید اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں جب

وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے امارٹمنٹ کی پارکنگ میں آگئے جہاں سکندر کے آفس کی گاڑی کھڑی تھی۔

”اوکے۔ سینورنا لیزا! میں چاہوں؟“ گاڑی کے پاس آکر رکے ہوئے وہ اس سے بولا۔

”جاؤ سینور سکندر۔“ اس نے خود کو ہماروی اور بہت کے تمام بھولے ہوئے سبق یاد دلا کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

سکندر نے ہنسی کرم جو شی اور خلوص سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”کیا میں تمہارا شکریہ ادا کروں؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”نہیں۔“ وہ اندر ہی اندر دودی تھی مگر اوپر سے ہماروی مسکرا رہی تھی۔

”لیزا! تمہارا دوا واقعی بہت خوب صورت ہے، بہت اچھا ہے، میں نے یہاں اپنی زندگی کے چند بہت ہی یادگار دن گزارے ہیں۔ روم کی ہسٹری، آرٹ، آرکیٹیکچر، فوڈ، موسم اور لیزا۔ سب بہت بہت اچھے ہیں۔“

وہ ابوں بڑھ چکی تھی مسکراہٹ لگا کر کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک سکندر کے ہاتھ میں تھا۔

”میں نے Trevi میں Coin نہیں اچھالا تھا، پھر بھی میری خواہش ہے میں زندگی میں دوبارہ روم حاضر آؤں اور لیزا سے بھی ملوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں اس سے الوداعی شیلے کہہ رہا تھا۔

”خبر مسک نہیں بھی اچھالا، تب بھی کیا ہوا؟ تم قسمت پر بہت یقین رکھتی ہو گی یا قسمت ہمیں پھر ملواری؟ کسی کام سے تم دوبا آجاؤ یا کسی کام سے میرا رومبا لندن آتا ہو جائے اور یوں اتفاقہ ہمارے پھر ملاقات ہو جائے۔“

وہ ہنس کر بولا تھا۔

سکندر اپنی کے استحضار پر مسکرا کر بولا تھا۔ میںوں میرے اٹھ گئے تھے۔

”میں نے آپ نے مجھے کھانا کھلایا ہے کہ اب فلائٹ پر بھی کچھ نہیں لوں گا۔ کل دوسرے پہلے تو کب میرا کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہے گا۔“ وہ اپنی سے خوش گو اور با اخلاق سے انداز میں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

”جیسے رو پیلا۔ لہذا خیریت سے تمہیں تمہارے گھر پہنچائے۔“ اپنی نے پُر شفقت انداز میں اسے دعا کی۔

”تم کیسے جاؤ گے سکندر! میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔“

لیزا ٹمنٹ کے ویدانے تک اپنی اپنی دونوں کے ساتھ ہی آتی تھیں۔

”اس کی ضرورت نہیں لیزا۔ آج آفس کی گاڑی مجھے ملی ہوئی ہے۔ نیچے آفس کلاؤر ایڈور میرا انتظار کر رہا ہے۔ سوئی مجھے ایر پورٹ بھی چھوڑے گا۔“

وہ جیسے اسے پہلے ہی سے بتا رہا تھا کہ اس کی ایر پورٹ روانگی کا بھی بندوبست ہو چکا ہے، ہمارا وہ چلنے کو کہہ دے۔ اپنی نے سکندر کو وہیں سے ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا، جبکہ وہ اس کے ساتھ نیچے جا رہی تھی۔

سکندر پریسکون، مطمئن اور بہت خوش سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی سوچوں سے انجان اسے اپنے گھر اپنے شہر اور اپنے ملک جانے کی جلدی تھی، خوشی تھی۔ وہ آنسوؤں کو اپنے دل پر گرنا محسوس کر رہی تھی۔ وہ جو بہت پیارا ہو اس سے پھر بڑا گیا ہو تا ہے۔

وہ یہ دیکھ کر بار تو نہیں سہہ رہی۔ زندگی میں درد تو اسے پہلے بھی دے چکی ہے۔ اس سے اس کا بار اگھر چھینا تھا، اس سے اس کی بہت پیاری بہن چھڑی تھی۔ تقدیر نے اس کی زندگی میں بار بار یہ درد سہا کھا ہے۔

پھر وہ آج کہوں ٹوٹ رہی ہے؟ آنسوؤں کو پتہ ہوئے وہ اپنے دو مصلوں کو مضبوط کر رہی تھی۔



یہ نون کا اپنا نام تھا

لاہور

فروری 2012ء

”نہم گوین“ نرید و شیر کے ورتن پر سدرہ بسم عمران

کے ہم سے نکلے کیوں گوارا

”شجر تما کی خبر لانا“ سیمنا انصار کا نکل دہل

”کوئی راز“ عنیقہ ملک کا نکل دہل

”گلاب“ امینہ ناز کا نکل دہل

”انسان شناسی“ صدیق احمد کا نکل دہل

”محبوبہ میں حساب کوسا“ محبوبہ لطیف

کا نکل دہل

”اس کے ساتھ“ نرید و شیر کا نکل دہل

”میں نے اپنے آپ کو“

”تم آخری چیز ہو“ ارم صلیحہ کا نکل دہل

”وہ سنارہ صبح امید کا“ فوزیہ غزل کا نکل دہل

”جس نے“ کی باتیں، افکار، تاثرات، شروع و ختم

کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ

سچی سچی کہانیاں

”بس یہی؟ تم اور کچھ بھی نہیں کہو گے؟ یوں ہی چلے جاؤ گے؟“

اس کی آنکھوں کی سطح پر ہونے لگی تھی۔ وہ کمال ہمت سے مسکراتی تھی کہ اپنا بھرم اسے بہت عزیز تھا۔ جب اس ریل میں اس کی محبت میں تھی تو کچھ کہہ کر اپنا بھرم اپنی عزت کو اٹھانے سے ہرگز منظور نہ تھا۔

”مگر کبھی دباؤ تو تھ سے ضرور ملتا لیڑا“ سکندر نے اس کا ہاتھ چھو دیا تھا۔

”ہاں ضرور۔“ اس نے مسکراتے سر میں اس کا ہاتھ

دبا دیا مگر اس سے کہاں ملے گی؟ کس سے چہ پر ملے گی؟ یہ جانے کی زحمت گوارا کے بغیر وہ اسے دبا آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھرتی تھی۔ سکندر گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ ذرا نیورنے گاڑی اشارت کی۔ سکندر نے اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا تھا۔

”کیا یہ شخص اب مجھے زندگی بھر کبھی نظر نہیں آئے گا؟ کبھی نہیں ملے گا؟“ وہ اسے ہاتھ ہلا کر جوابی خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی گاڑی کو اپنے پار ٹھٹھ سے لٹکا ہوا دیکھ رہی تھی۔

جیسے ہی سکندر کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوئی آنکھوں میں کب سے ر کے آنسو نیک دم ہی بہہ نکلے وہ اپنا کوئی بھی اتار پاتا نشان چھوڑے بغیر اس سے رخصت ہو گیا تھا وہ اس سے اس انداز میں رخصت ہو کر گیا تھا جیسے اب زندگی بھر وہ وہاں شاید ہی کبھی ایک دو سرے سے دوبارہ مل جائیں گے اور وہ دوبارہ بھی اگر کبھی آئی تو لگا تھا ”آئے گی کہ نہ خود اس سے بھر ملنے کی کوئی چاہ نہیں رہے تھے۔“

وہ شکستہ قدموں سے واپس اور آگئی تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اس وقت بالکل تھکا رہا تھا۔ بالکل کم مضم کہ جیسے ہاری ہوئی

دو بڑی تھی۔

”جب سکندر یہاں پہنچا ہوا تھا اور تم نے ساری رات اس کے پاس لوگ روم میں فلور کشن پر بچہ کر گزار دی تھی اس صبح جب میں بچہ کے لیے اٹھی۔ میں وضو کر کے باہر نکلی تو تھیں فلور کشن پر بے آراہی سے بیٹھے موصوفے ر سکندر کے نزدیک مرزا کر سوتے دیکھ کر میرے دل کو کامل یقین مل چکا تھا کہ تمہاری سکندر کے لیے توجہ کو الٹا دینی نہیں بلکہ بہت گہری بہت تھیں میرا اس سے یہ پوچھتا ہوں کہ تمہاری میں نے اس کی شادی اور مثنیٰ کی بات کیوں پوچھی ہے مگر لڑا میں نے وہ سوال تمہارے لیے تمہاری ہاں بن کر سکندر سے پوچھتے تھے تم اس سے محبت کر رہی تھیں اور تمہیں اس کی ذاتی زندگی کی کوئی ایک بھی بات پتا نہیں تھی۔“

وہ سب اختیار مثنیٰ کے کندھے پر سر رکھ کر دارو فطار دو بڑی تھی۔

”ہاں مجھے اس سے محبت ہوئی تھی مثنیٰ! وہ میرے لیے بہت اہم بن گیا تھا مگر جو میں نے اس کے لیے سوچا وہ اس نے میرے لیے کبھی بھی نہیں سوچا۔ اگر سوچا ہوتا تو یوں خاموشی سے چلا نہ جانا؟ بنا کچھ کہے؟“ وہ مثنیٰ کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”تو تم کہہ دیتیں لیرا! اس کے کچھ کہنے کا انتظار کیوں کرتی رہیں؟ تم بول دیتیں اپنے دل کی بات اس سے۔“

”نور اگر جواب میں وہ نہیں پڑتا یہ کہہ دیتا کہ لیرا محمود! میں تمہیں اتنا اچھے طور پر نہیں سمجھتا تھا کہ شخص چند دنوں کی ملاقاتوں کو محبت سمجھنے لگوں! ایک وقتی تعلق کو عمر بھر کا رشتہ سمجھنے لگوں! پھر مثنیٰ میں کیا کہتی؟ میں تو اچھی ہی نظروں میں گر جاتی اور اگر وہ کہہ دیتا کہ اس نے مجھے ایک چند دنوں اور وقتی دوست سمجھا تھا جس سے میری سے جا کر اس کا کوئی رابطہ رکھنے کا بھی ارادہ نہیں ہے؟“

وہ بچوں کی طرح روتی تھی۔

مثنیٰ تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے چند لمحوں کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مثنیٰ اندر آئی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں نہیں دیکھا تھا۔

”چلا گیا سکندر؟“ اس کے پاس بیٹھ کر انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

”جی۔“ اس نے آنکھوں سے گرتے آنسو بڑی سرعت سے صاف کیے۔

”اچھی اور کہتے ہوئے چاہیں کس چیز سے ٹھوکر لگ گئی بڑی زور سے چوٹ لگی ہے مثنیٰ!“ بھر لائی آواز میں اس نے جیسے انہیں اپنے آنسوؤں کی توجہ دینا چاہی۔

”تم نے اس سے کچھ کیوں نہیں کہا لیرا؟ جو تمہارے دل میں تھا! ایک بار ہمت کر کے بولی تو دیتیں پتا۔“

مثنیٰ اسے دیکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”مثنیٰ؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

”تمہیں نومینے اپنی کوکھ میں نہیں رکھا، تمہیں پیدا نہیں کیا، مگر والا تو میں بن کر رہی ہے لیرا! ماں ہوں تمہاری۔ کیا میں اپنی بیٹی کے دل کا حائل بھی نہیں جانے لگی؟ میں نوبہ بات اس وقت بھی جانتی تھی جب تم مثنیٰ تھیں سکندر کی سب سے بڑی

disqualification (خرابی) اس کا پاکستان سے تعلق ہونا ہے۔ بڑی ہنسنے، ٹیلنے اور وہ ستیاں رکھنے والی ہے میری بیٹی مگر پھر بھی میں نے اسے پہلے کبھی کسی انجوائن شخص کے لیے تو جی رات کو رہا سے فیصلہ جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی چند روز نہ ملے ہوئے کسی شخص کے ایک میل منٹ کے ہونے پر یوں بلکے ہوئے نہ دیکھا تھا اس کی خاطر اپنے دن رات اپنا سوا چاگنا آوا مہم سب کچھ بھول جاتے تھیں دیکھا تھا اسے اپنے گھر لاکر ٹھہراتے تھیں دیکھا تھا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو اسے کوئی بات بری نہ لگ جائے اس فکرسے بھلا نہ دیکھا تھا۔“

وہ مثنیٰ کے نرم لب لباب میں کئی باتیں سن کر کبکبہ مہی

ایک آواز ایک بدعا ہے۔ لگ بھگ اس آواز پر
چھین اور سکون زندگی بھر کے لیے چھین پڑتی ہے۔
وہ چاہتی تھی اس کا ہندی دل اس رخ پائی کو مان
کے کہ سکندر شہزاد اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ اسے
دینا کی بھینٹیں اب دوبارہ کبھی نہیں لے گا۔ یہ لگہ وہ
اس سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا نہیں ہے۔



وہ جائے نماز پر تھیں۔ بوجھ کی طرح ان کے
سجھنے کی طرح تھے اور دعا میں محض آنسو۔ وہ دعا مانگتے
تھے لیے جیسے ہی ہاتھ اٹھاتیں۔ لیوں سے کوئی لفظ ادا نہ
ہو یا آواز نہ آسے جو تھارور تھارور کے طے
جائے اگر شدت غم سے بھی کوئی لفظ نہ کہے بھی تھے تو
صرف "اللہ" اور "میرا بچہ۔"

وہ کب یاد نہیں آتا تھا وہ کب ان کے ساتھ نہیں
ہو تا تھا۔ کوئی اسے یاد نہ کرتے، سب اسے بھول
چکے تھے۔ مگر وہ اپنے بچے کو نہیں بھول سکتیں۔ ماں کے
لئے تو اس کا دنیا آخر عمل بھی کر کے آجائے تب بھی اس
کا بیٹا ہی رہتا ہے۔ اس کی یاد کی تڑپ نہیں راتوں کو
گھبراہٹ نہیں دے دیتا کہ کبھی بھی اس کی یاد اس میں
بہتے رہا اور کرتی تھی۔

دن بھر میں نہانے کوئی مرتبہ اسے یاد کر کے سب
سے چھپ کر رو دیا کرتی تھیں۔ نہانے دینا کی بھینٹیں
کھانے تک نہاتھا ان کا بچہ ان کی جان ان کا سکندر۔
کسی کسی لمحے ایسی تڑپ تھی ان کی کہ منہ کا دل چاہتا تھا
گھر سے نکل جائیں اپنے بچے کو آسمانوں سے
کوہنے لے لے جائے تو اسے پہنچ کر اپنے بچے سے
لگائیں اس کا بھائی گود میں رکھ لیں بالکل اس طرح
جیسے اسے بچپن میں اپنی گود میں بھر لیا کرتی تھیں۔
انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ ان کی
آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

اللہ امیر ہے بچے کی حفاظت فرما۔ ات اپنی ماں
میں رکھ۔"

روئے ہوئے لوٹ لوٹ کر دیکھ ان کے بچوں سے آواز

"میں ہر گز نہیں ہار گئی۔ محبت کب کی لیر کا
نصیب نہیں۔ میرا گھر ہمیں اور اب سکندر۔ ایک ایک
کر کے میں نے اپنی ہر محبت کھو دی ہے۔ مٹی۔"



اور زندگی میں وہی بار بار اپنے دل کی گلیاں اسے اچھی
نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا
تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا ہونے وہ اس کی گود میں تھی۔ وہ
وہاں اور ہر سے آواز اس کی پھر تھی۔ اسے وہاں اپنے
گھر و اس کی آواز سنائی دے تھیں۔

"رومن لے کر بے بھی نہیں ہوتے۔ میں ایک
رومن لڑکی کو جانتا ہوں اور وہ کافی اچھی ہے۔"
گود میں سے نزدیک اس ریسٹورنٹ میں اگلی تھی جہاں
انہوں نے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھا تھا۔

"مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہو رہی کہ جو لڑکی تازہ تازہ
میرنی دوست بنی ہے۔ وہ ٹرک ڈرائیوروں والی اور وہ
بولتی ہے۔" وہ ہر جگہ مہمان تک کہ وہ اس کی پہچان بھی
دوبارہ دہائی تھی۔ پتا نہیں کس چیز کی کھوج میں کس
چیز کی تلاش میں۔ مگر جو اس نے کھو دیا تھا وہ اس کو
کبھی نہیں مل رہا تھا۔ وہ دن بھر میں جتنی بار آئینہ
دیکھتی اس کے کانوں میں سرگوشی ہوتی۔

"Bella (خوبصورت)۔" وہ جتنی بار اپنے آسمانوں پر
میں جاتی اس کی پیشنگ پر نظر پڑتی اسے اس کی آواز
اپنے بالکل نزدیک سنائی دیتی تھی۔

"اور تم مجھے پتہ کب کرو گی؟" وہ اس پیشنگ کو
دیکھتے ہوئے رو پڑتی۔ نہ گھر کے اندر نہ گھر سے باہر
اسے کسی بھی جگہ چھین نہیں مل رہا تھا۔

محبت کیا ایسی ہی دل دکھانے والی چیز ہوتی ہے؟
کیا اس کے لیے دنیا کے تمام شاعروں نے اس قدر
خوبصورت شعر کہے ہیں؟

مصوروں نے لاجواب شاہکار تخلیق کیے ہیں
موسیقاروں نے بے مثال دھنیں بنائی ہیں اور ناول
لکھنے والے اور کہنے والے اپنے ہر کلمے میں
محبت خوشی کب ہے؟ محبت تو فقط آنسو ہے جیسے

”وعلیکم السلام“ سنا کر بھری نگاہوں سے انہوں
نے اپنے چہرے پر بے پرواہی کے ساتھ ان کے لبوں پر
مکراہت بھی۔ جیسے چھوٹا بیٹا ان کی نگاہوں کے
سامنے رہتا ہے، اسی طرح ان کا بڑا بیٹا کیوں نہیں رہتا؟
”جلدی واپس آگئے میلا۔“ دل میں درد سا جاگا تھا۔
زین یہاں ہے یہ وہ کیوں نہیں؟ انہوں نے بیٹے کی
پیشانی چومی۔

”جی اموجان! اس وہ علی کی طبیعت کا سن کر مجھ سے
مزید رکائیں جلد۔“
اور آہستہ شہیار خان اپنے بیٹے کو دیکھتی رہ گئی
تھیں۔ ان کا بیٹا اپنے بیٹے کے موٹی نزلے زکام کا سن
کر اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ بھاگا بھاگا سنگ پور سے
واپس آگیا تھا۔

ان کا آہستہ شہیار خان کا بیٹا بھی تو بیمار تھا ان کا بیٹا تو
برسوں سے تھا تھا زین سے چار دن بیٹے کی جدائی
برداشت نہیں ہوئی تھی۔ انہیں تو زمانے نہایت گئے
تھے اسے گلے سے لگائے ہوئے اسے چار کے ہوئے
اسے جی بھر کر دیکھے ہوئے ان کی خاموش نگاہوں
میں اس بل ایک شورور تھا تھا۔

”علی لیے علی نے؟“ انہوں نے ایک گہری سانس
لے کر موضوع تبدیل کیا۔

”جی آتے ہی سب سے پہلے علی سے ملا ہوں اور
پھر سدا اکب کے پاس آیا ہوں سیلا کہاں ہیں؟“ زین
مسکرا کر بولا۔

”انڈی میں ہیں۔“ انہوں نے نماز کے لیے
بندھا وہ چہرہ کھولتے ہوئے اسے بتایا۔

”آجھا! میں آیا سے بھی مل لوں۔“ وہ ان کے
چہرے کو پیار سے دیکھ کر کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا
تھا۔

انہوں نے سرد آہ بھر کر زین کو جاتے ہوئے کہا۔
ایک بیٹا نگاہوں کے سامنے ہے اور ایک نگاہوں سے
آتا دور آتا دور تھیں جیسے وہ کبھی ان کی زندگیوں کا
تھا ہی نہیں؟

دور ہے تھے۔
وہ فون پر کہہ رہا تھا: ”میں ٹھیک ہوں، میں خوب
گھوم پھر رہا ہوں، میں آئیں گے بعد سارا عظیم سیر
تفریح میں گزارا ہوں۔“

گمراہی جانتی تھی کہ اس کا بیٹا بھوت بول رہا ہے
بھٹس اس کا دل خوش کرنے کے لیے وہ جس بل اپنے
خوش اور مطمئن ہونے کی خواہشیں دے رہا تھا انہیں
اس کی آواز تکلف اور دیر سے بھری لگ رہی تھی۔

اس دوران کا دل بہت گھبرا رہا تھا تب ہی انہوں نے
اسے فون کیا تھا ورنہ بہت جلدی جلدی ان کی سکندرو
سے فون پر بات نہیں ہوتی تھی کہ اس سے بات
ہونے پر خود کو مہیا تھا اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا
بیش ان کے لیے بے حد کھن ہو کر تھا تھا۔

وہ اٹلی میں تھا اور اپنے آئیں کے کام سے روم گیا
ہوا تھا گمراہ وہاں ٹھیک نہیں تھا۔ ان کی متانت نہیں بتا
رہی تھی۔ کچھ ہوا تھا ان کے بیٹے کو اس کی آواز میں
تکلیف وہ کیوں کر محسوس نہیں کر سکتی تھیں؟ لاکھ وہ
اسے نہیں اور خوشگواریت کے رے میں پھیلائے کی
کو شش کرتا۔ کس چوٹ تھی ان کے بیٹے کو یا وہ
بیمار تھا۔ وہ روتے ہوئے بے آواز اس کی صحت
تندرستی، لمبی عمر اور خوشیوں کے لیے دعا میں الجھ
رہی تھیں۔ اب ان کے سکندرو کو بھی خوشیوں ملی
چاہیے تھیں۔

اور کتنی سزا کاٹے گا وہ؟ مقررہ مدت زندان میں
گمراہ نے کے بعد تو بڑے سے بڑے جرم بھی معاف
کر دیے جاتے ہیں ان کے بیٹے کی سزا کب ختم ہوگی؟
ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکیا گیا تھا۔ انہوں نے
گھبرا کر جلدی سے آئیں صاف کیے۔ وہ جائے نماز
لیٹتے ہوئے اٹھی تھیں۔

”آج!۔“ انہوں نے بھونکی مسکراہٹ اپنے
لبوں پر سجائی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر زین اندر
آیا۔

”ایک ایک اموجان!“ وہ مسکراتے ہوئے ان

کمزور ہی تھی اس کا سر سے سے اس سے دل ہی اجاڑ
ہو گیا تھا۔ اسے اپنی تھار پر اپنی غماش پہن تک کہ
اپنا کمرٹ بھی سب کچھ کے معنی اور بے کار لگ رہا
تھا۔ اگر اس کا دلوشہ کا نام ہو گیا تو بھی کیا فرق پڑے گا؟
اور اگر کامیاب ہو گیا تب بھی زندگی میں کیا تبدیلی رونما
ہو جائے گی؟ نہ کامیاب ہونے سے نہ ناکام ہونے
سے کوئی فرق نہیں ملے گا۔

کئی دنوں سے اس کی سیم سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ قنولیت اور ڈپریشن اس پر ایسا طاری تھا کہ کچھ دنوں سے اس نے اپنا میل مہرے سے آف رکھا تھا۔ اس کے میل پر کئی بار رٹائی کرنے کے بعد سیم نے گھر کے نمبر پر کال کی تو وہ گھر پر موجود نہیں تھی۔ وہ سینڈرا کے ساتھ ایڈراویکھنے گئی ہوئی تھی اس خیال سے کہ شاید یونہی اس کا بل بھل جائے۔ وہ واپس آتی تو یونہی سے اسے سیم کے فون کا پتہ پتا تھا۔ اپنے ڈپریشن میں وہ سیم کو بھول ہی گئی تھی۔ سیم یقیناً اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوگی۔ اس نے اسی وقت سیم کا نمبر لایا تھا۔

”کہاں ہو لیزا؟ میں کتنا پریشان ہو رہی تھی
تمہارے لیے۔ تمہارا ایل کیوں آف تھا؟“
اس کی آواز سننے ہی وہ بے چینی سے بولی۔
”میں ٹھیک ہوں سم! وہ مختصر گفتگوں میں بس اتنا
ہی کہہ سکی۔“

بچپن سے اپنی ہر بات اس سے شیئر کرنے کی ایسی عادت تھی کہ اس وقت جب یہ سوچا بیٹھتا تھا کہ اس بے کار قفسے کا نیم سے ذکر نہیں کرے گی! اخلاخوہ وادہ بیٹھی سیم اس کے لیے پریشان ہو جانے کی شب اس کی نو آواز سننے ہی لگا کہ زندہ کس تھا۔

”نظر کیا ہوا ہے سوئٹ ہارٹ احم رو رہی ہو؟“
سبے قرار ی سے بولی۔
”سیم! وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”سیم مجھ سے
پینٹ نہیں کیا جا رہا۔ میری ایگزیشن لکایا ہوگا؟“
”کم دن رو گئے ہیں۔“

اسے رونا کھسی اور بات پر آہا تھا اور روکھی اور پتہ نہ

وہ کھانے کی میز پر بھی خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کا شوہر، بیٹا، بہو، پوتا سب کھانے کی میز پر موجود ہیں۔ سو اپنے شوہر کو رو اپنے بچوں کے ساتھ ہیں پھر آخر وہ خوش کیوں نہیں ہیں؟ اس لیے کہ اس میز پر وہ موجود نہیں ہے۔ وہ بھی یہاں بیٹھا ہوتا تو یہ منظر کتنا مکمل ہوتا۔

ساری فزنگی شوہر کی اطاعت عزرا کی تھی۔
خاموشی سر جھکانے کی تھی۔ اس لیے لب بھی ان
کی خاموشی کسی کو زیادہ محسوس نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ
تو بڑوں سے مرید لب تھیں۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔
”راوی جان! اچھا میرے لیے اتنی بڑی اسپورٹس کار
لائے ہیں۔“ ان کے ڈھائی سال کے پوتے نے ماں
کے ہاتھوں سے چاول کھاتے ہوئے بڑے جوش سے
اس پر بتایا۔

وہ اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکراتی تھیں۔
اب صرف ایک وہی تھا جسے دیکھ کر جس کی تو کئی زبان
میں اس کی چٹختی میٹھی باتیں سن کر دل خوش ہوا کرتا
تھا۔ تھا۔ تھا بھی وہ بلا کا ذہن۔ وہاں سال کی عمر میں جاوے
پانچ سال کے بچے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنے نانا اور
نانا کی ذہانت اس سے فوراً آش میں لے لے تھی۔

”واہ! کبھی وہ مرنے آگئے میرے بیٹے کب“ وہ
 ہنس کر بولتا تھیں۔
 ”دادا! جان! آپ ویسے ہی گئے میری اسپورٹس
 کھڑے“

دنمگر علی رکھائے گا تو ہم ضرور دیکھیں جسے ہم نے
خان کا تخت بے چنگ اور سزا انداز بھی پوٹے کو دیکھ
کر مسکرائوں میں بدل چلایا کرتا تھا۔ بے شوخ کو مسکرا کر
پوٹے سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ یوں
مسکراتے ہوئے بھی دل کے اندر کہیں ماتم ہوا
تھا۔ آسو بہہ لگنے کو بے قرار تھے خوشی کے گول میں
بھی ان سے خوش ہوا نہیں جاتا تھا۔

• • •

اپنی جس نمائندگی پر جوش تیار رہی ہے اس بار وہاں

اور تم ایک پاکستانی مرد کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو؟ میں بیباک کے خلاف کچھ کتنا جانتی ہوں اور نہ ہی ہاشم کے خلاف۔ مگر لڑائی ہم دونوں نے اپنی زندگیوں میں اپنے پاکستانی مرد بھگت میں لے کر ہم یہ سمجھ سکیں یہ لوگ فطرتاً ہی کس قدر خود غرض اور بے حس ہوتے ہیں؟

سیمہ مت دکھ اور بے یقینی سے بول رہی تھی۔ اسے جیسے اس سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

"سیمہ! میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا کہ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی سیمہ! مجھے یاد ہے تمہاری شادی کے وقت میں نے کہا تھا میں بیباک کو یہ خوشی کبھی نہیں دوں گی کہ ان کی خواہش کے مطابق کسی پاکستانی مرد سے شادی کر لوں۔ مجھے اپنی سب باتیں یاد ہیں سیمہ! مگر محبت کر لینے سے وہ کوئی مجھے مل نہ نہیں گیا؟ وہ تو مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر جا چکا میری زندگی سے نکل چکا۔ پھر سب اس بات سے کیا فرق پڑا ہے کہ وہ پاکستانی تھا یا کسی اور ملک سے؟ یہ تو میں صرف تم سے شکر کر رہی ہوں بیباک تو یہ بات بھی پتا بھی نہیں چلے گی۔"

ہاں محبت کر لینے سے وہ کون سا سے مل گیا تھا کون سا وہ اس سے محبت کرتا تھا کون سا اس کے کوئی رابطہ رکھنے کی امید تھی جودہ سیمہ کو سمجھانے اور اس بات پر تامل کرنے کی کوشش کرنی کہ تمہارا پاکستانی مرد بڑے نہیں ہوتے۔

اگر ان ہنسی کا گھر اور سیمہ کی زندگی پاکستانی مردوں کی وجہ سے برباد ہوئی تھیں تب بھی یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ تمام پاکستانی مرد ہاشم اسد اور محمود خالد جیسے ہوتے ہیں۔ سیمہ کو قاتل کرنا بے معنی تھا کہ جس کے لیے وہ اسے قاتل کرنا جانتی وہ تو کسی روز ہونے والی تھی۔

"وہ میری زندگی سے جا چکا ہے سیمہ وہ میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود کو بہت دور لے جا چکا ہے۔" وہ میرے جیسے ہوئے اس کے دن بد

نام لڑ کر رہی تھی۔
"میں کیا ہوا ہے؟ تمہارے کیوں رہی ہو؟ پچھلے کئی دنوں سے تم سے بات کر رہی تھی تو تم نے اتنی خوش لگ رہی تھیں۔ مجھ سے شکر نہیں کر رہی تھیں۔ مگر تمہاری سب کچھ کی کھانگ اور تمہاری بے وجہ ہنسی مجھے بتا رہی تھی کہ کچھ ایسا ہوا ہے تمہاری زندگی میں جو تمہیں خوش کر رہا ہے یا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی ایسا ہے میری بس کی زندگی میں کوئی ہے جو میری بس کو اچھا لگے گا۔"

"مگر اسے اچھی نہیں لگتی سیمہ" وہ دہرائی اسے بتا تھا کہ وہ پچکانہ حرکت کر رہی ہے مگر بہن کے سامنے بھی نہ روئی تو پھر اور کہاں جا کر روئی؟ سیمہ جواباً ایک لمبے لمبے بالکل چپ ہو گئی تھی یوں جیسے سوچ رہی ہو کہ اس انکشاف پر خوش ہو یا بہن کے رونے پر دکھی؟

"میں گوارہ کون ہے؟" ایک لمبے لمبے خاموشی کے بعد اس نے بہت آہستہ آواز میں پوچھا۔

"وہ اپنے آپ کے کام سے یہاں رہا تھا۔ میں اس سے پہلے بارہلی نو مریہ لڑل خود بخود ہی اس کی طرف کھینچے لگا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی مگر وہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ ان فیکٹ میں اب بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی مگر اسے بھولنا میرے لیے ناممکن ہے سیمہ حالانکہ وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔"

اس کے تصور میں سکندر کا چروا رہا تھا، مسکرا کر اس سے بات کرتا، کبھی اس کی کبھی قہقہہ لگا کر ہنستا۔ اس کے چہرے کو تصور میں دیکھتے وہ ہوتا بھول گئی تھی۔ وہ سکندر کے چہرے کو تصور میں دیکھتی سیمہ کو مزید بنا رہی تھی۔

"والا! تم اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔" "وہ پاکستانی ہے؟" سیمہ اس کی بات کاٹ کر قدرے بے اعتباری سے بولی۔ جیسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں۔"

دور تک بھرے لیے میں بولی تھی۔ مینی نے پرانا منہ بنا کر یوں خاموشی اختیار کی تھی جیسے اس کی کسی بھی بات سے اتفاق نہیں کرتیں۔

”بغیر ہم اس موضوع پر بہت بات کر چکے ہیں جھوڑیں اس ٹاپک کو یہ بتائیں مجھے کافی ملے گی؟“

اس معاملے میں اس کی اور مینی کی سوچ میں اتنا فرق تھا کہ ذرا سی دیر اور اس موضوع پر بات ہوئی اور ان دونوں ہی کا مودِ خراب ہو جاتا۔ وہ سیم کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور مینی جو اس پر دلالت چاہتیں پھلور کیا کرتی تھیں اس کے لیے بالکل ماں جیسی مثال بنا کر مینی تھیں سیم کے لیے پانسیس کیوں

لن کا دل اتنا ہی سخت ہو جاتا تھا۔

بچپن میں جس طرح اس نے مینی کو پہلی ہی نظر میں اپنی آیا سے بڑھ کر اپنی ماں مان لیا تھا۔

سیم ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بچپن میں مینی کو بہت تنگ کیا تھا۔ شاید لڑا بہت دوسری بچی تھی اس لیے مینی کی حفاظت میں آجانے پر خوش ہوئی تھی جبکہ

سیم اس کے برخلاف شرارتی اور نٹ کھٹ تھی سو وہ مینی کو سختی کا ناچ نہ چاہے رکھتی۔ وہ فرماں برداری سے

مینی کے احکامات مان لیا کرتی تھی جبکہ سیم ان کے گھر کی Rebellious Princess (سرکش) تھی۔ مینی

کے احکامات کو تو کیا خاطر میں لاتی۔ سیم الٹا مینی حرکتیں کر جاتی کہ مینی کو اکثر و بیشتر خاص مینی سے

ڈانٹ بڑھاتی تھی۔

سیم نے بچپن میں مینی کو بہت تنگ کیا تھا انہیں محمود خالد سے بہت بار ڈانٹیں بڑوائی تھیں۔ ان بہنوں کا وہ بچپن کب کا گزر چکا تھا مگر مینی نے جیسے سیم کو اس کی شرارتوں اور حکم عدولوں کے لیے کبھی معاف نہ

کیا تھا۔ اسے مینی کے سیم سے اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ

پتا تھیں اس لیے اس وقت بھی اس نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”کیا کھا لیا تم نے؟“ مینی اس کے کھانے کی فکر

ہوئی۔

”جی مینی! سینڈرا کے ساتھ ہی کھلایا۔ اب بس

کھینا تھا۔ وہ فیلان بند کرنے کے بعد بہت ادا اس اور خاموش بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا لیزا؟ کیا کہہ رہی تھی سیم؟“ مینی بچن کے کاموں سے فانس ہونے کے بعد سیدھی اس کے پاس آئی تھیں۔

”وہ غما ہو رہی تھی اس بات پر کہ میں نے کسی

پاکستانی موضوع سے ایک طرف محبت بھی کیوں کی۔“ وہ ہچکچی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

”دلخُراب ہے اس کی کیا۔“

”سیم! اگرچہ یہ محبت بالکل بے کار ہے جس کے لیے یہ

بحث ہو رہی ہے وہ تو کب کا جا بھی چکا۔ پھر بھی سیم کی زندگی جس طرح بریاد کی گئی ہے اس کے بعد وہ کسے

کسی پاکستانی مرد کو اچھا سمجھ سکتی ہے وہ تو یہ چاہے گی کہ میں کسی پاکستانی کے پیچھے اس کی محبت میں ٹپک

طریقہ طور پر بھی جلتا ہو کر اس ہو کر لیا ایک کھو بھی

ضائع نہ کر دوں۔“ وہ اس لمحے میں بولی تھی۔

”کیا بریاد ہوئی ہے سیم کی زندگی لیزا؟ ماشاء اللہ میسے

میں کھیل رہی ہے۔ دولت کو کر چاکر ٹیش و آرام میاں عمر میں کچھ براب ہے تو کیا ہوا اسے چاہتا تو

ہے اس کے بازو اٹھا ہے۔“

مینی ایک دم ہی خشکی سے بولی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی پچھندگی اور نا ارضی جھلک رہی تھی جیسے لیزا

کی بات سے اتفاق کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔

”کچھ بڑے نہیں ہاٹم اسد سیم سے پورے پندرہ

سال بڑے ہیں مینی! ایک پیوی کو فارغ کر گئے ہیں

تین بچوں کے باپ ہیں۔ دولت سے خوشی نہیں ملتی

مینی! سیم کی ان کے ساتھ کوئی مطابقت ہی نہیں ہے۔ کہاں سیم اور کہاں وہ شادی شدہ مرد۔ سیم لاکھ خود کو خوش ظاہر کرتی رہے آپ چاہے لیکن گلس اس کی

جھولی ہنسی کا گھر میں اس کی بہن ہوں۔ میں جانتی ہوں اس نے پاپا کے لیے خود کو قربان کر دیا ہے اپنی

نواہات اور آرزوؤں 10 ہفتہ دیا ہے۔ وہ ایک سمجھوتہ کی زندگی گزار رہی ہے مینی!“

ختم میری خاطر اپنی ہشتکنز کہلاہٹ کرو۔ میں ہاں ہوں تمہارا شوہر بہت کامیاب رہے۔ آؤ میں کے نظارہ تمہارے کام کو خوب سراہوں، آؤ اس کے قدردان تمہاری ہشتکنز خریدنے کے لیے بہ قرار ہو جائیں، آؤت کیلنڈر تمہارا کام اپنے پاس لگانے کے لیے تمہاری منتیں کریں، تمہیں تمہارا منہ مانگا معلومہ دیں۔ میں تمہیں بہت کامیاب رکھنا چاہتی ہوں لڑا، بہن کی والدینانہ محبت اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آئی تھی۔ اس نے سیم سے وعدہ کیا تھا وہ بھر سے اپنے شو کی تیار کی شروع کرے گی۔ وہ کامیاب ہوگی، وہ سیم کو یاس نہیں کرے گی۔ اس کے آرٹس ہونے پر سیم نے ہمیشہ فخر کیا کہ وہ سیم ہی تھی جس کے بہت دلانے اور جو صلہ بندھانے کے سبب وہ فائن آرٹس رہا پائی تھی، مصوری کو بطور پروفیشن اختیار کر پائی تھی ورنہ محمود خاندان دوسرے اس کی خواہشات کے برخلاف بزنس ایڈمنسٹریشن کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے۔

باتشے کے فوراً بعد وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آئی تھی۔



جی جی کر روتی ام مریم اور اسے اپنی گزشت میں جکڑے سکندر دذول نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے قدیم زمین میں یوں گڑ گئے تھے جیسے وہ اب انہیں زندگی بھر بھی اٹھا نہیں پائے گا۔

سکندر نوراً "ام مریم کے اوپر سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کے تمام بٹن آگے سے کھلے تھے۔ اس کی ناک اور ہونٹوں کے پاس سے خون بہہ رہا تھا، اس کے چہرے اور گردن پر ام مریم کے ناخنوں کے نشان تھے جو اس نے خود کو بچانے ہوئے مزاحمت کے دوران سکندر پر ڈالے تھے۔

ان کے خوبصورت لوگوں کو دم میں رکھے کئی خوبصورت مردان اور دیگر آرائشی اشیاء بال ٹوپی پہنی تھیں جیسے یہاں لڑخود کو سکندر سے بچنے سے

آپ کافی بلا دیں۔" نئی سرملائی اس کے پاس اٹھ گئی تھیں۔



اگلے روز صبح صبح ہی سیم کا فون آیا تھا وہ جانتی تھی سیم اس کے لیے پریشان ہے، وہ اس کے لیے بہت نگرہ مند ہے۔

"کل سے تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہوں لڑا تمہاری روتی ہوئی آواز نے مجھے رات میں ایک بل کے لیے بھی سوئے نہیں دیا۔" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں سیم۔" وہ بیڑ پر یعنی تھی سیم کے فون سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"مگر ٹھیک ہو تو پھر مجھے میری بہن کی آواز ہمیشہ کی طرح ہنستی اور مسکراتی ہوئی کیوں نہیں لگ رہی ہے؟"

وہ جواباً "جی رہی تھی۔"

"لڑا پلین خود کو منجھا لو۔ جو چاہتا ہے اسے بھولی جاؤ۔ زندگی ختم نہیں ہوئی۔ دیکھنا تمہاری زندگی میں اتنی ساری خوشیاں اور اتنی خوبصورتی جتنی آپس کی کہ تم انہیں سمجھتے سمجھتے ٹھیک بناؤ گی۔"

"میں خود کو سمجھا رہی ہوں سیم۔ مجھے تھوڑے دنوں لگیں گے مگر میں خود کو سمجھا لوں گی کہ وہ چند دنوں کے لیے مجھے ملا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔"

"میں شاید زندگی میں اب کبھی دوبارہ اس سے مل بھی نہیں پاؤں گی۔ شاید مجھے خواب میں ملا تھا۔ آنکھ کھلی ہے تو وہ کیس نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی آگئی، وہ ہمیشہ تو اس بہت دھچکے لمحے میں بولی تھی۔

"ہاں، تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا لڑا اور تمہیں ایسے شو کی اسی طرح تیار کرانی ہوگی جس طرح پہلے کر رہی تھیں۔ تمہیں پتا ہے بال لڑا میں تمہارے آرٹس کے لیے بہت کامیاب رہی۔" اس نے کہا کہ کامیاب اور مشہور وہ ہے جس میں ہر ایک کو تحریہ جاتی ہوں۔

تو اس نے لڑکی جھوٹ بولی وہی ہے جو اس نے کہی ہے۔ یہ مکار لڑکی ذرا مہم کروہی ہے۔ ”اسی جراثیم بھی ابھی بھی سکندر شہر میں کہ اس کے سامنے کھڑا ہوئے؟ اس کے کانوں میں مریم کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اسے وہ شال میں اپنی برقی چھپائی نظر آ رہی تھی۔ اگر اس وقت اس کے پاس ویو لور ہو نا وہ اس کی تمام گولیاں سکندو کے سینے میں مار دیتا۔ اس نے دوسرا تیسرا ویو لور پھر چڑھا پھر چڑھا پھر اٹھا سکندر کے منہ پر۔ اس پر خون سوار تھا وہ سکندو پر چڑھا پڑا تھا۔ وہ اسے لاشیں گھونسنے کے باور تھا۔

”بے غیرت انسان! ام مریم پر گند کی نظر ڈالنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟“ سکندر خود کو اس سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ خود اس کے اوپر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایسی گھناؤنی حرکت کرتے ہوئے رنٹے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد وہ اس پر ہاتھ اٹھا بھی کیسے سکتا تھا؟ امو جان شرم غیرت اوو صدے سے چڑو ام مریم کو سینے کے لگائے کڑی تھیں جبکہ شہر یار خان اپنے دل میں عداوت سے شہزادے کا اسکی دادو گھناؤنا روپ دیکھ کر بالکل گم سم اوو سارکت کھڑے تھے۔

وہ سکندو کو کبری طرح اور ہاتھ ان اس بے غیرت انسان کو لو لہان کر چکا تھا مگر اسے لو لہان کرنے کے بعد بھی اس کا جنون ختم نہیں رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سکندر کے گلے گلے کر ڈالے۔

”بیبا! اس کو سمجھائیں۔ اس سے کہیں میرا تھیں کرے۔ یہ لڑکی جھوٹ بولی وہی ہے مکار کی کروہی ہے۔ یہ بہت مٹا بہت خطرناک لڑکی ہے بیبا۔“ وہاں فحش خود کو بچانے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سکندو کے منہ پر تھوکر دے۔

”تو اس کو۔“ مشہر یار خان جیسے یک دم ہی اس کی کیفیت سے باہر نکلے تھے وہ ان کے روکنے پر اسے نہیں روکا تھا۔

”بیبا! میں کہتا تو اس کی جان لے لوں گا۔“ وہی نے اسے روکا۔ میں اس وکیل بے غیرت کو زندہ نہ

بچاتی مریم ان چیزوں سے بگڑاتی تھی۔ زوقی ہوئی بالکل پابھیل مریم نے بھال سی لڑکھائی ہوئی قالین پر سے اٹھی تھی۔ اس کے چہرے بازوؤں اور گردن پر سکندر کی دست دواڑی اور اس کی ہوس کے نشان و لم تھے۔ جیسے وقت ام مریم کو چیز کے اوپر جس خوبصورت Top میں وہ کچھ کر گیا تھا اس کا Top جگہ جگہ سے چٹا ہو تھا وہ سیم برہنہ حالت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کا شرم کو غیرت سے زمین میں گر جانے کو بل چاہا۔ ام مریم دوڑ کر اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ وہ اس کے گلے لگ کر وہاں سے باور مار کر رو رہی تھی۔

”جیسے اس دوندے سے بچا لوں؟“ ایہ میری عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔ مجھے چھپا لوں؟ اس دوندے سے۔“

”تو بچ۔“ وہوئوں سے خون صاف کرتے ہوئے سکندر نے ام مریم کو گلے دی تھی۔ وہ فوراً ہی اس کے پاس آ رہا تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا زین! یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ایک بد کردار لڑکی ہے زین۔“

سکندر کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کے پاؤں جنہیں وہ ہلا نہیں پا رہا تھا ان میں ایک دم ہی جان آگئی تھی۔ اس نے اپنے گلے لگی ام مریم کو خود سے دور ہٹایا تھا اوو فل کر دینے کے اووے سے سکندر کی طرف بھاگا۔

وہی ہوئی ام مریم کے پاس امو جان آگئی تھیں۔ وہ جیسے شرم و غیرت سے گڑی مریم کو مزید اس سیم برہنہ حالت میں دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی شال اوو کر مریم کے اوپر ڈال دی تھی۔ مریم یک دم ہی ان کے گلے لگ گئی تھی۔

”اسی۔“ وہ امو جان کی شال میں لپٹی ان کے گلے لگ کر زائد تھو روہی تھی۔ شہر یار خان اپنی جگہ بالکل منہ کھڑے تھے۔ اس نے سکندو کے منہ پر پھینچ لیا۔

جھوٹوں کا۔

چھپاتی مریم اسو جان کے گلے لگے لگے زار و قابو رہی تھی۔ عزت بھی ماسی کی خراب کرنے کی کوشش کی تھی اور ستان بھی ماسی پر باندھا جا رہا تھا۔

”آئی! میں آپ کے گھر پر جس دن سے سکندر سے ملی ہوں یہ مجھ سے کہہ رہا ہے میں یزین سے ملتی تو ذرا دل میرے انکار پر اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ یہ مجھے زین کے نوکیلا کسی کے بھی قابل نہیں جھوٹے لگا۔“

یہ کہا کرتا تھا اس کا سنا بھائی اس کی سنگیت سے؟ اس کا بلی چلا تھا وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لے اب زندگی میں بھی رشتوں پر اعتبار کس طرح کر سکے گا وہ؟

”You bloody bitch“ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پایا میں جان سے ماروں گا اس ناگوار کو۔ ”اچھی کمزور اور گھٹاؤنی شکل سب پر عیاں ہوئی پر کچھ کر لو گلا تا سکندر غصے میں آئے سے باہر ہو کر فوراً ہی ام مریم کی طرف لپکا تھا۔ مگر شہر مار خان نے اس کے سامنے آکر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

”میں نے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اور کتنا بچے مگر وہ سکندر؟“ وہ اسے غیظ و غضب سے دیکھ رہے تھے۔

”پاپا! آپ اس مکار لڑکی کو سچا اور مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں؟ میں۔“ کس قدر ڈھٹائی تھی اس نے غیرت انسان میں اس کا گناہ سب لوگ دیکھ چکے ہیں یہ خانے کے باوجود جھوٹ پر جھوٹ پورے جا رہا تھا۔ مگر شہر مار خان نے اسے آگے کچھ اور بولنے نہیں دیا تھا۔

”میں نے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہے ہو؟ ذرا حالت دیکھو اپنی بھی اور اس کی بھی۔ میرا سر نہ است سے جھکا دیا ہے سکندر! تم نے۔ میرا بیٹا اتنا عیاشی اور بدکردار کیسے ہو سکتا ہے؟ است رشتوں کی عزت کا بھی پاس نہیں؟ یہ میرا بیٹا ہے جس سے میں نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں؟ یہ میرا بیٹا ہے جسے میرا جانشین بننا تھا میرے بعد میری جگہ سب جی۔ یہ یہ رشتوں کی ریت۔ یہ یہ

پاپا! آپ زین کو سمجھاؤں۔ یہ مجھے بالکل غلط سمجھ رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے پاپا۔ یہ سب اس ناگوار کا مجھ سے انتقام ہے۔“ سکندر نے پھر شہر مار خان کو لپکا تھا۔ اس نے پھر ام مریم پر الزام تراشی کی کہ شہر مار خان کی تھی۔ شہر مار خان لڑکوں کے قریب آگئے تھے۔ وہ اسے اور سکندر کو چھڑا رہے تھے۔ چند منٹوں کی کوششوں کے بعد وہ اسے سکندر کے پاس سے دھکیلے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پھوپھی سانسوں اور نفرت بھری نگاہوں سے بری طرح زخمی ہوئے سکندر کو اب دور ہٹ کر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان اب شہر مار خان کھڑے تھے۔

”پاپا! زین کو سمجھاؤں یہ لڑکی۔“ سکندر پھر ام مریم کے اوپر کوئی بہتان تراشی کرنا چاہتا تھا مگر شہر مار خان کے زوردار پھیرنے اسے کسے بات پوری نہیں کر سکتی تھی۔

”پاپا؟“ سکندر منہ پر ہاتھ رکھ کر پاپا کو دیکھ رہا تھا۔ شہر مار خان سکندر کو شدید غصے میں دیکھ رہے تھے۔ ”شرم آ رہی ہے مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہو۔ یہ لڑکی تمہاری ہونے والی بھانج ہے تمہارے بھائی کی سنگیت ہے کیا اس لیے آج صبح اس رشتے کے خلاف بول رہے تھے کہ تم خود اپنے بھائی کی سنگیت پر غیظ نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔“ شہر مار خان سکندر پر بہت زور سے دھاڑے تھے۔

”بے غیرت اور بدکردار میں نہیں یہ لڑکی ہے پاپا۔ مجھے کہتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ اس نے خود اس نے خود میرے پیچھے پڑی ہے۔“

She tried to seduce me.
She is an adulteress Papa!

ام مریم کے لیے سکندر کے ان گستاخ ترین الفاظ پر اس کا دل چلا وہ اس کو ہمیں کھڑے کھڑے جان سے مار ڈالنے اس کی بیویوں پر نشانہ بنی۔ یہی ہے ماسی

والا؟

کہہ رہے ہیں۔

اس نے مظلومیت کے ڈرا سے کرتے سکندر کو
اوجھان کو رو کر بکارتے سنا۔ وہ اب رو کر خود کو مظلوم اور
بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مہریم کو
کھلے لگائے اوجھان خود بھی مسلسل رو رہی تھیں۔
شہنشاہ خان سکندر کی طرف شدید غصے کے عالم میں
بڑھے تھے۔ ان کی حاکیمت، ان کا اپنے فیصلے منوانا ان
سب سے بہت دیکھا تھا مگر ان کا یہ جھٹلنا اور یہ غصہ وہ
منہ ہلے بارود کی طرح دے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خون
اور چہرے پر ہمت تھی۔

”سنا نہیں تم نے؟ میں تم سے میرا سے بیغ
ہو جائے تو کہہ رہا ہوں۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر سکندر کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ
اسے لوہنگہ روم سے باہر لے جا رہے تھے۔ بہت دور
سے جپ کھڑی اوجھان نے ایک دم ہی بدلتے ہوئے
شہنشاہ خان کو کارا تھا۔

”شہنشاہ یا پھر اس طرح مت کریں۔ وہ کہاں جائے
گیا۔“

شہنشاہ خان نے غیظ و غضب سے انہیں دیکھا۔
ان کے غصے میں ایک خونی سی کیفیت نمایاں تھی۔

”تم سچ میں مت بولنا کہہ۔ اگر نہیں اس
Adullerer سے زیادہ ہمدردی ہو رہی ہے تو میں

تمہیں ابھی طلاق کے تین بول بول کر فارغ کرنا
ہوں۔ تم بھی اس کے ساتھ ہی میرا گھر چھوڑ کر جا سکتی

ہو۔ ایک ذاتی میراث نہیں ہو سکتا اور اس کی حمایت
کرنے والے سے بھی مجھے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ یہ

گناہ تو میں اپنے باپ کا بھی معاف نہ کر سکتی۔“

شہنشاہ خان کا اپنا غصہ، گناہ خون میں سب میں سے
مکس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا غصہ دیکھ کر وہ

بھی ساکت سا کہہ اٹھا، ”ان کی دھڑاتی آواز سن کر
اوجھان کی اب مجال نہ تھی کہ کچھ بول یا کہیں۔ وہ سکندر

کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے ہونے لوہنگہ روم سے باہر
جائز سے تھکے وہ خاموش تماشا بنی کی طرح اس سارے

منظر کو دیکھ رہا تھا۔

اوجھان نے کرب اور صدمہ سے بے خبر جانی۔

”ایسا آپ بھی دین کی طرح مجھ ہی کو قصور وار سمجھ

رہے ہیں؟ ایسا آپ۔“ خود کو مظلوم اور بے قصور

ثابت کرنے کی دیکھاری کرتا دیکھتا رہا اور شخص نبھانے اور

کیا کہتا چاہتا تھا مگر شہنشاہ خان نے اسے اس کی بات

مکمل نہیں کر سکتی تھی۔

”مست ہو مجھے ایسا تم آج سے یہ حق پیشہ کے لیے
کو جکے ہو۔ اپنے غصے کا غلام کہتے ہیں مگر کی عزت پر

ڈاکہ ڈالنے والا میرا بیٹا کبھی نہیں ہو سکتا۔“

شہنشاہ خان کی چیخ نے ان کے گھر کے دروازے کو ہلایا۔
”ایسا آپ مجھ سے بچاؤ میں بغیر مجھے کیسے مجرم قرار

دے سکتے ہیں۔ میری بات تو آپ کو سننی چاہیے۔ ایسا۔“

جھوٹ پر جھوٹ بولنا سکندر بیتا نہیں شہنشاہ خان
سے کیا گیا کہہ رہا تھا اور شہنشاہ خان جواب میں اسے کیا

کہہ رہے تھے کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے

اگر کچھ سنائی دے رہا تھا تو ام مہریم کی سسکیاں، اگر کچھ
دکھائی دے رہا تھا تو سیاہ شل میں اپنی برنگی چھپائی

ام مہریم جو اوجھان کے کھلے سے لگی ہوئی خوف سے
ابھی تک کاتب رہی تھی۔ ام مہریم کا سیاہ شل میں چھپا

وجود دیکھ کر اس پر پھر خون سوار ہونے لگا تھا کہ یک دم
یہی شہنشاہ خان نے بہت زور سے پیچھے سے دو جوتے کر

انہیں دیکھنے پر مجبور ہوا تھا وہ سکندر کی کسی بات کے
جواب میں بہت زور سے دھاکے دے تھے۔

”اس سکندر ابس۔ ایک Rapist میرا بیٹا کبھی
بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنے

گھر سے نکل جانے کا حکم دیتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے
گھر اپنی دولت اپنی جائیداد اور اپنی زندگی سے

بے دخل کرتا ہوں۔ لو میں وصیت کرنا ہوں کہ میرے
مرنے پر بھی تمہیں میرے گھر میں قدم نہ رکھنے کی

اجازت نہ دی جائے۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر
سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد زندگی بھر مجھے اپنی خاموش

شکل کبھی مت دکھانا۔“ شہنشاہ خان کا انداز بہت
بے لگب اور فیصلہ کن تھا۔

”اوجھان! آپ سمجھا میں ایسا کہہ دیکھیں ایسا مجھے کیا

ایسی آگائیں بزرگ کر لی تھیں یہ وہ زار و بظاہر بد رشتی تھیں۔

ام مریم اسی طرح جان کے گھٹے سے گلی سبک دہی تھی۔ شہزاد خان سکندر کو سمجھتے ہوئے لوگک دوم سے باہر لے گئے تھے۔ وہ وہاں پر اسی طرح بت کی مانند سہاگت کھڑا تھا۔ محض چند گھنٹوں کے اندر اس کی خوشیوں کا جہاں اجڑ چکا تھا۔ اس کا ہر خواب بکھر چکا تھا۔

وہ ام مریم سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا پاس بھائی اس کی عزت اور ناموس کی رنجیاں بکھیر گیا تھا۔ اسے باہر سے شہزاد خان کے چلانے سکندر کو گھر سے نکلنے اور سکندر کی منتوں اور اس کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر سسکتی ہوئی ام مریم اور آگائیں بند کر کے چھوٹ پھوٹ کر روئی انہو جن پر ڈائی جھین۔ اس کے اندر دن دونوں میں سے کسی کو بھی چپ کرانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ہنر محفل سے قدموں سے چلا لوگک دوم سے جانے لگا تھا۔ اسے اپنے گھر کا گھٹ بہت زور سے ٹکھولے جانے اور پھر بند کیے جانے کی آوازیں آتی تھیں۔ ان کے گھر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس لیے ہر آواز اور ہر آہٹ واضح سنائی دوسے رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

وحشت کے عالم میں وہ کمرے کی دیواروں سے سر مار مار کر دو رہا تھا وہ زمین شہزاد زار و بظاہر دو رہا تھا۔ وہ اسے ام مریم کا سامنا کیسے کیا ہے گا؟ وہ اس سے کیا کہے گا؟ کیسے کہے گا؟ کیا وہ اس سے یہ کہہ پائے گا کہ جو کچھ بھی ہوا آگت سے بھولی جائے؟ اس کی زندگی کا پہلا خواب پہلی امید اور پہلی محبت اس کے اپنے سگے بھائی نے کس طرح بھائی کی تھی۔ کس طرح اس نے اس سے اس کی خوشیوں جیمنی تھیں۔

اس پوری رات ان کے گھر پر موت کا سناٹا طاری رہا تھا۔ وہیں سے کہیں سے بد رشتیوں کی ٹہریاں خانانے خود کو اپنی امیڑی میں بند کر لیا تھا اور ام مریم وہ اپنے کمرے میں تھی۔ یوں لگ رہا تھا وہ تمام افراد ایک ہی صورت کے سامنا کرنے کے لیے کھڑے ہیں۔

وہ تمام افراد ایک دوسرے سے ڈھانپ لائے۔ اسے اس سے ہیں۔ باہر سے سال کا جشن منایا جا رہا تھا اور ان کے گھر میں رشتوں اور اعتبار کی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ جانا ہوا سال اس سے اس کی زندگی کی پہلی خوشی پہلی کسی اور اس کی زندگی جیمنی کر لے گیا تھا۔ صبح ہو چکی تھی مگر اس میں سکت نہ تھی اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی ام مریم کا سامنا کرنے کی سائے نام کی آگوتھی اسے پہنا کر اس نے زندگی بھر کے لیے اس کی حفاظت اور خوشیوں کی پابندی کی قبول کی تھی اور وہ اپنے ہی گھر پر اسے محفوظ فرما کر رہا تھا۔ اس کی عزت اور آبرو کی برکھولی نہ کر سکا تھا۔

وہ شاید پورا دن یوں ہی کمرے میں بیٹھ کر گزار دیتا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دھک دے کرام مریم اندر آگئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر اس نے شرم اور محبت سے فوراً اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔ اس سے کیا کہے؟ کیسے کہے؟ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آگئی اور اس کے پیار میں لے کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی بالکل خاموش تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں نہ کر سکتے تھے۔

چند گھنٹوں کی خاموشی کے بعد اسے احساس ہوا کہ ام مریم بد رشتی ہے۔ اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مریم“ در اور کرب کی شدت نے اسے مزید کچھ بولنے نہیں دیا تھا۔

”سکندر نے میرے ساتھ ایسا کیا کہ کیا زمین؟ میں تو بالکل شفاف تھی بالکل ان چھوٹی تھی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”تم ابھی بھی شفاف ہو تم مریم ہو۔ تم کب کب ہو تم شفاف ہو۔“ اس نے تڑپ کر کہا تھا۔ اس پر کربدار شخص نے جو میرا بھائی تھا مجھے کچھ کہنے کے لائق نہیں سمجھتا۔ میں نہ کہیں کیسے معافی مانگوں مریم؟“

اس کا شمار بندہ کیا تھا۔

(بالی اسٹوردا ان شاء اللہ)

وہیلا ڈھالا ڈب پہن رکھا تھا۔ بالوں کی یونی بنار کھی
تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔
نسلانکھ لگ رہی تھی، رو من لگ رہی تھی، آج اس
نے بھی اپنے حلیے پر ذرا نفاذ وحیان دیا تھا کہ آج لبراز
نے اسے پیٹ کر ہاتھ دوند آج کون سا آفس جانا ہے
سوچ کر شاید اس نے شیو بھی نہیں کرنا تھا۔ لبراز اسے
بغیر میا بھی کے دیکھ کر کچھ حیرت اور کچھ غصے سے
چلائی تھی۔

”تمہاری۔۔۔۔۔ میا کبھی کہاں ہے؟“ وہ غصے
اور فکر مند کی سے ناٹری سے اتر آئی اور اس کے
سامنے آکر کھڑی ہوئی تھی۔

”لبراز! میری چوٹ بائیں ٹھک ہو گئی ہے، پھر
سے کار میں اسے لے کر چلنے کا کیا فائدہ تھا؟ اس سے مجھے
ابھمن ہی دور ہی تھی۔“

وہ اس کے غصے اور خفگی سے ذکر قدرت نے بدانتہا
انداز میں بولا۔

”تو کدھ اوڑا مجھے اپنی چوٹ۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے
تمہاری چوٹ کتنی ٹھک ہو چکی ہے۔“

وہ دونوں ہاتھ گریہ رکھ کر پی لڑا کا عورتوں والے
انداز میں بولی۔

”مگر اس طرح سے لاٹھی، چوڑا چلاؤ گی تو میں
ہیننگ نہیں ہوا رہا۔“ اس کی سوتی ایک ہی جگہ پر
آئی دیکھ کر اس نے جھٹ دھمکی دی تھی۔

”ہوئی چل کر لے لو سکندر پلیز۔ تمہیں چلنے
پھرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔“

وہ اس بار نرمی سے اور بدستار انداز میں بولی تھی۔

”میں نہیں لے رہا۔ تم نے چلنا ہے تو ایسے ہی
چلو۔ سرت خربے اٹھا لے میں نے اپنی چوٹوں کے۔“

وہ لاہروانی سے بولتا گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی
میں بیٹھ گیا۔ لبراز باہر کھڑی اسے کھور کر دیکھ رہی تھی۔

”اب چلو، مگر موصوہ! مجھے کھورنے کا شوق تو رہا ہے
میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔“

اسے خود احساس ہوا تھا کہ اس کے بولنے کا لاہروا

پر لڑائی کال آگئی۔
”میں نے سوچا نہیں بتاؤں میں گھر سے نکل گئی
ہوں تو دس منٹ میں تمہارے ہوئی ہوں گی۔“ اس
نے بتایا تھا۔

”ہوئی سے ذرا سا آگے چلی آنا۔“ اس نے کافی کا
گھونٹ لیتے ہوئے اس سے کہا۔

”کبھی مطلب؟“
”مطلب یہ کہ شے۔“

”جب تم روم میں ہو تو رومیوں کی طرح رہو۔“
”کے حقوے پر عمل کرتے ہوئے تم روزمرہ کی طرح
ہاں میں بیٹھ کر ناشا کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر خوش دلی
سے بولا۔

”دیری آفسنگنگ۔“ لبراز نے خوش ہو کر کہا۔
”میں نے خوابے لے کر ناشا آؤں کیا وہ بھی، بالین
میں۔ کیا تمہیں پتہ نہیں آ رہا ہے؟“

خود کو شاباشی دینے کے بعد جیسے اسے اب لبراز سے
بھی اس کا رٹے پر پرفیو وصول کرنا تھی۔

”مکمل جملے نہیں بول سکتا۔ مگر لوٹے پھوٹے
لفظوں میں میں نے بارہینڈز کو اپنی بات سمجھا دی
دی۔“ وہ غصے کرنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

”یہ تو واقعی قابل تحریف بات ہے۔ میں آپ کی
اس دیانت پر آپ سے بری طرح امیر لیں ہو گئی ہوں۔“

سینور سکندر۔“ لبراز جیسے اس کی بات کا لطف لیتے
ہوئے ہنسی تھی۔

”اے۔۔۔۔۔ تم اپنا ناشا ختم کرو اتنی دیر میں میں بیچ
دیتی ہوں۔“

”ہست سکون سے بیٹھ کر اس نے کافی اور ڈونٹ کو
انچوائے کیا۔ اس کے بعد وہ بار کے دروازے سے باہر
آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے لبراز کی گاڑی آئی دیکھائی دی تو اس
نے در سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔

لبراز نے گاڑی اس کے پاس لا کر رکھ دی تھی۔
اس نے براؤن سفاری بیٹھ کے ساتھ گریں کلر کا

”بہت تیز ہو تم مہینہ سکنڈرا“
 ”او کیوں کو کس طرح خوش کیا جاسکتا ہے۔“
 ”جواب“ مسکرایا تھا۔

”وہ غیر خوب صورت تو ہیں ہوں یہ جنت پرانی۔“
 فوراً ہی مشورہ نہ لے لہذا میں بولی تھی۔
 ”شکر تھا اس کی کوشش کامیاب رہی تھی۔“
 موضوع گفتگو اس کی چوٹیں، دانتیں اور میاں کی
 رہی تھیں۔

”ہم Tivoli کیوں جا رہے ہیں؟“ کچھ دیر کے بعد
 اس نے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی لیزا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”آئیسا ہو گیا ہے مہینہ سکنڈرا تمہاری پیشنگ
 بتانے اور کس لیے؟“ وہ جیسے اس کے سوال پر حیران
 ہوئی تھی۔
 ”وہ تو مجھے بتائے میرا مطلب ہے Tivoli ہی
 کیوں جا رہے ہیں، ایس اور کیوں نہیں؟“

”سوال اچھا ہے۔“ وہ اس کے سوال پر مسکرا کر بولی۔
 ”ایک بل رگ کر جیسے اس نے اپنی سوچوں کو سچا کیا۔“
 ”میرا دل چاہ رہا تھا میں Villa d este کے
 کسی خوب صورت سے فوارے کے سامنے تمہیں
 بٹھا کر وہاں تمہاری پیشنگ، ہاؤس، میری پیشنگ کا
 مرکز تم ہو اور تمہارے بیک گراؤنڈ میں سواہریں
 صدی کا کوئی بے مثال آرکیٹیکچر رکھتا ہوا اور اس
 سے گرا ہوا ہو۔ پانی میں جیسی گہرائی، جیسی طاقت اور
 جیسا سرا ہو تا ہے مجھے وہی گہرائی، وہی طاقت اور وہی
 براہ راست تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتی ہے۔
 مجھے سوچتے ہی سے یہ منظر بہت افسانہ کرنا ہے۔“
 ”ہیسی ٹیٹ کرنا ہے۔“

”ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سچائی
 سے بول رہی تھی۔“
 ”مجھے تمہاری آنکھوں میں اتنے سارے تاثرات نظر
 آتے ہیں۔ اوائس، دوڑ، کرب، طاقت، گہرائی،
 براہ راست جیسے یہ آنکھیں اپنے اندر دے جاتے۔“

”لیزا اس کی ٹون اس کے الفاظ بہت حد تک لیزا جیسے
 تھے۔ اتنے دنوں سے ہر روز اس کے ساتھ ملنے اور
 وقت گزارنے کے بعد وہ شاید کچھ کچھ اس کے جیسا
 ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کے غصے سے
 بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا بارش کی گاڑی میں آکر
 بیٹھ گئی۔“

”بہت خمدی ہو تم جو سوچ لیتے ہو کرتے رہی ہو
 چاہے تمہیں جتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کر لی
 جائے۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے وہ حلقی سے بولی۔

”میری امید ہے مجھے تم ڈانکر کے پاس بھی نہیں
 گئے ہو گے اور میڈیسن لینا بھی محفوظ رہی ہوگی۔“
 ”لیزا یہ ایکسیڈنٹ ایکسیڈنٹ بہت ہو گیا ہے
 اسب میں پور ہو گیا ہوں اسی ایک ٹاپک سے بلیر کوئی
 گوربات کرنا۔“

”لیزا نے اسے گھوڑا۔ وہ جواب“ چپ ہو گئی تھی۔ وہ
 اب خاموشی سے ڈرائیو کر رہی تھی۔
 ”تمہیں بتانے میں نے کئی اٹالین سیکے ہیں؟“
 اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے
 مسکرا کر پوچھا۔ وہ اسے بولنے اور بٹھنے پر اکسارہا تھا۔
 لیزا نے صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ
 نہیں۔

”اب میں نے سوچا بھی اٹالین میں شروع کر دیا
 ہے۔ ابھی بارے پاس جب تم چڑی لا کر دوک رہی
 تھیں تب تمہیں ریت کے ساتھ میں نے بتا ہے
 اٹالین میں کیا لفظ سوچا تھا؟“
 لیزا نے زبان سے کہا ”کیا سوچا تھا؟“ اب بھی نہیں
 پوچھا تھا۔ صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی
 تھی۔

”bella“ وہ کوشش کر کے اٹالین لہجے میں بولا
 تھا۔ bella اٹالین میں خوب صورت اور حسین کو
 کہتے ہیں۔ اتنا تو وہ سیکھ ہی چکا تھا اس کے اندازے
 کے عین مطابق وہ کھکھکا کر نرس پڑی تھی۔

راز چھپائے بیٹھی ہیں میں بانی کو تمہاری آنکھوں کے ساتھ ایک سہل کے طور پر دکھانا چاہتی ہوں۔ دونوں میں گہرائی، دونوں میں مسرار۔

”اس طرح بولتے ہوئے تم کی پکی منصوبہ نگاری ہو۔ تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے میں مرعوب ہو رہا ہوں سینورینا۔“

لیزا کی سنجیدگی کے جواب میں وہ ہنس لیزا نے اسے ان نظروں سے دیکھا تھا جیسے اس نے برابر اسے کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر اس نے سکندر کی آنکھوں کا وہ تعبیریں تاثر فوراً ”بڑھ لیا تھا کہ وہ اسی سے اس کی ذات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھ رہا ہو۔“

”کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے۔“

”تمہاری بیٹی کسی ہیں؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے گفتگو کے لیے موضوع تلاش کیا تھا۔

”جھک ہیں، شہس دنا یا رکھا دیا ہے انہوں نے“

”اور یہ بھی کہا ہے کہ تم بول دو ایس جانتے کے بعد سے ہمارے گھر آئے کیوں نہیں ہو اور ہوا آج جانے کا مقصد ہو کہ تمہاری پینٹنگ سنانا ہے مگر نئی نے ہمیں اس میں ٹھیک کا مزا فراہم کرنے کے لیے بڑی فیر دست چھک باسکٹ تیار کر کے دی ہے۔“

Tivoli میں جب بچ کر گئیں گے غیب تم کو کھانا پنی بنے کتنی مزے مزے کی چیزیں ہمارے کھانے کے لیے تیار کر کے بیٹھی ہیں۔“

اس نے سکندر کے کسی رویے کی وجہ سے کچھ محسوس کیا ہے یہ تاثر دینے بغیر وہ مسکرا کر بولی۔ باتیں کرتے ہوئے آواز میں میوزک سنتے لیزا کی فاسٹ ڈرائیونگ کے سبب وہ دوم سے باہر اس خوب صورت اور پرفیکٹ ٹاؤن ہلڈیج کے تھے۔

پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب ٹائیپولی کا موسم وہاں کی آب و ہوا دوم سے زیادہ خوش گو اور پرفیضا تھی۔ یوں ہی تو انہیں ٹائیپولی سو لوہیں صدی سے دوموں کی پسندیدہ ریزورٹ رہی۔ بروکس یا شاہوں کے تجلات کے ساتھ بنائے گئے یہ گارڈنز پورے اسی میں سب

سے خوب صورت اور سب سے منفرد گارڈنز بنائے جاتے تھے۔ ہنرمندی، کاریگری، مہارت، خوب صورتی اور حسن کا شاہکار آرکیٹیکٹس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت یہ باتوں اور پانچ سو فوٹ پر رکھنے والوں کو بینہوت کر دیا کرتے تھے۔ ان فوٹوں کی تخلیق میں سو لوہیں صدی کے آرکیٹیکٹس سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں کی بے مثال مہارت اور ہنرمندی چھلکتی تھی۔ دوم میں سیاحوں کے شور، ہنگامے، ڈراما، اسی اور رش سے دور یہ ایک خاموش اور پرفیکٹ ٹاؤن تھا۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر رہے تھے۔ لیزا گاڑی کی پیچلی سیٹ سے سامنے نکلتے گئی۔ اس نے چھک باسکٹ نکال کر اسے پکڑا لی تھی۔ اب وہ اپنا کینوس، ایبل اور رنگ وغیرہ نکال رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

کلیسیکل ڈیزائن کے لیے

750/-

250/-

800/-

مکتبہ عمر ان ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اس کو بینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

زین کی زندگی میں زین اور حسین ام مریم تھی ہے۔ زین اسے پرہیز کرتا ہے۔ شہزاد خان بھی راضی ہے۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ سکندر سے شکایت ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر ان کی مخالفت کرتا ہے۔ اس بات پر زین سکندر سے مزید برکشت ہو جاتا ہے۔ ساسی و دران گھروالوں کا ہندو سکندر ام مریم پر بھڑانہ حملہ کرنا ہے مگر وقت زین اور شہزاد خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر بھڑانہ حملہ کرنے پر شہزاد سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں۔ آمدہ شہزاد سکندر کو لون کھتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا مل گیا ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا اور رشتہ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ بنانے کے دوران وہ مقامی لڑکے ان دونوں کو لڑنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں ہار دیتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ٹیڈ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار لیزا نے دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نئی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی کشتی میں گرفت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا اسم کو لون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتاتی ہے۔

سچی قیظ

سے منگنی کی انگوٹھی اتار دی تھی۔

"تم میری پہلی اور آخری محبت ہو زین! میں ساری زندگی تم سے محبت کرتی رہوں گی مگر کل شام ہو، اس کے بعد اب میں خود میں اپنا جو صلہ تمہیں پائی کہ اس رشتے کو برقرار رکھ سکوں، اس گھرانے کی جوہر سکول۔ مجھے عطف کر دنا زین! اگر میں تمہارے ساتھ اپنے رشتے کو قائم نہیں کر سکوں گی۔" ام مریم نے دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے انگوٹھی بند پران دونوں کے درمیان خالی جگہ پر رکھ دی تھی۔ وہ صدمے سے اسے چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ غلط نہیں کر رہی تھی۔ اسے سب کچھ ہو جائے۔ کوئی عزت دار لڑکی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنی نیکل کا حصہ ہے جہاں کوئی اس پر بری نظر نہ پڑے۔

"مریم! مجھے معاف کر دو۔ میں اسے نہیں سمجھتا تھا۔" بھرائی آواز میں بولا۔

"تم خود کو کوئی الزام مت دو زین! میں اسے

"تمہارا کوئی قصور نہیں ہے زین! تم مجھ سے معافی مت مانگو۔" مریم کی دندھی آواز اس نے سر جھکائے ہوئے ہی سنی۔ چند سیکنڈ کے لیے ان کے درمیان بچہ خاصوشی حاصل ہوئی تھی۔

"میں آج واپس جا رہی ہوں زین!" مریم کے اس جملے نے اسے بے اختیار نظرس انحصار پر مجبور کیا تھا۔ مریم کے چہرے پر بکھرے آنسو دیکھ کر اس کا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ یہ آنسو اس لڑکی کو زین شہزاد کے گھر پر زین شہزاد کے بھائی بنے دیے تھے وہ کس منہ سے ان آنسوؤں کو صاف کر پاتا؟

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں مریم!" ایک بل اس کے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ اسکی سے بولا۔

"نہیں زین! میں تمہارے ساتھ نہیں جا پاؤں گی۔" ام مریم کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

"کیوں مریم؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔ مریم نے دکھ بھری نظروں اس پر سے ہٹائی تھیں۔ وہ اپنی انگلی

ورثہ میں اس طرح فلول کی کہ پھر زندگی بھر خود کو دوڑ
 نہیں پاؤں گی۔ وہ بھرائی آواز میں جیسے شدید تکلیف
 سے لیل رہی تھی۔ وہ بالکل بے دم سا ہو گیا تھا۔ چند
 سیکنڈز اس کے گلے لگ کر دوڑتے رہنے کے بعد ام
 مریم اس سے الگ ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آسو
 خشک کیے تھے، جیسے کو شش کر کے خود کو مضبوط بنا
 رہی تھی۔ پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مضبوط تھا، لیکن
 تھا لیکن کم تھا۔

”مگر تم بھی مجھ سے اسی طرح عجی محبت کرتے ہو
 زین! جس طرح میں تم سے کرتی ہوں تو مجھے مت روکو
 مجھے جانے دو یہ فیصلہ آسان فیصلہ نہیں ہے زین!۔
 پلیز اس جدائی کو میرے لیے مزید ٹکھن مت بناؤ۔“
 ”اگر یہ ہے اپنے لب کھاتی اسے اور خود کو جدائی
 کی مسانداری تھی۔

دو دروازے سے نہ چلائی دیکھا نہ گیا تھا اور بے آواز
 آسو برقی ام مریم اس کے کمرے چلی گئی تھی اس کی
 زندگی سے چلی گئی تھی۔ اپنے کمرے کی بالکونی سے
 اس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سخت سردی
 میں بالکونی میں کھڑا تھا اسے وہاں اسی طرح ساکت
 کھڑے کی کھٹے گزر چکے تھے۔ اس کی پتھرائی ہوئی
 نظریں اپنے گیٹ پر اسی جگہ جمی تھیں جہاں سے باہر
 نکلے اس نے ام مریم کو آخری بار دیکھا تھا۔

کل شام کے بعد سے اس نے اپنے ماں اور باپ کو
 نہیں دیکھا تھا۔ کل شام سے اموجان اپنے کمرے میں
 اور شہوار خان اپنی اسٹڈی میں بند تھے۔ وہ تو یہ بھی
 نہیں جانتا تھا کہ ام مریم نے ان دونوں سے جا کر جب
 اپنے جانے کا کہا ہو گا تو انہوں نے اسے روکنے کی
 کوشش کرتے ہوئے کیا کیا ہو گیا وہ دونوں بھی اس کی
 طرح کچھ بھی کہہ نہیں پاتے ہوں گے؟

شاید سہ پہر ہو چکی تھی جب اس نے اپنے ملازم
 کو بھاگ کر تے گیٹ کھولتے ہوئے دیکھا۔ گیٹ
 سے اندر داخل ہوئے والے کو دیکھتے ہی اس کی
 آنکھوں میں خون اتر گیا تھا۔

وہ سکندر تھا۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لینے

”نہیں یہ تمہارے ہوتے ہو زین! میں تم سے
 انی محبت کرتی ہوں کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا
 سکتے۔“

”جب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے تو
 مجھے بھروسہ کر کے کل جا رہی ہو مریم؟ میں تمہارے بغیر
 نہیں رہا ہوں۔ گج کیا اب کیسپس میں بھی اجنبیوں کی
 طرح مٹا کر دوں؟“

دکھ اور صدمے سے اس کی آواز قدرے بلند ہوئی
 ”ام مریم نے دکھ سے بھری ایک مگر سانس لی
 تھی۔ وہ اپنے کانوں پر پھرے آسو صاف کر رہی
 تھی۔

”میں اس اجلاس میں جا رہی۔ میں اپنے ملاکے
 پاس واپس جا رہی ہوں۔ میں ٹوٹ گئی ہوں زین! ابھی
 بہت عرصہ لگے گا مجھے خود کو سمجھانے میں۔ میرے
 ذہن اب بکھر چکے ہیں۔ پتا نہیں میں اپنی اسٹڈی پر پھر سے
 کبھی شروع کر سکی یا نہیں۔“

وہ اس اجلاس میں جا رہی تھی وہ تو ہمیشہ کے
 لیے جدا ہونے کی بات کر رہی تھی۔ خدا یاد دلائے کیسے
 روکے؟ کیا کسے؟

ام مریم اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ ”آئی لوو
 زین!“ سرگوشی کی طرح اس کی یہ آواز اس کی سماعتوں
 سے ٹکرانی تھی۔

”مت جاؤ مریم! پلیز مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں
 تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔“

وہ یک دم ہی اٹھا تھا اس نے اس کے دونوں ہاتھ
 قلم لیے تھے خود پر سے اختیار کھوئی ام مریم اس کے
 گلے لگ کر رو پڑی تھی۔

”زین! ہماری قسمت میں جدائی لکھی ہے۔ میں یہ
 کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ تم میری خاطر اپنے ماں
 باپ اور بھائی کو چھوڑ دو اور میری مجبوری یہ ہے زین کہ
 میں اب تمہاری فیملی کا حصہ نہیں بن پاؤں گی۔ میں
 اس گھر کی ہو نہیں سکتی جہاں میری عزت۔“ وہ
 اب پیچھے گر چپ ہوئی۔

”پلیز مجھے مت روکو۔ پلیز مجھے چھوڑ کر مت کرو۔“

”میں بے گناہ ہوں یا اب اس لڑکی کا گھر پر آگیا۔“
 جھوٹا ہے۔ وہ ایک بدکردار لڑکی ہے۔ وہ میرے
 بڑی سچی۔ میں نے اس کو شکر ادا کیا۔ اس بات
 نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ میں ایک سچ لڑکی کو اپنی
 زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا۔“

”اب تو وہ چلی بھی گئی ہے سکندر شہر مارا۔ اب تو
 جھوٹ ہو گا اس معصوم پریشان باندھنا چھوڑو۔“
 اپنی صفائی دینے پہل دی تک نہیں۔ اب کیوں کر
 رہے ہو اس کے خلاف یہ گنگنا الزام تراشی؟ ہماری
 ایسے ہوتے ہیں؟ مجھے تو ہماری گے نام سے اس رشتے
 ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس کے اندر کسکی محبت
 شدت سے وہ بڑی سچی۔ وہ شاید ترین نفرت کے عالم
 میں سکندر کو جھوٹ پر جھوٹ اور بگو اس پر بگو اس
 کرتے سن رہا تھا۔

”کہہ دیجئے تم؟“ شہر مار خان نے سخت اور بے چارے
 لمحے میں اس سے پوچھا۔
 ان کے چہرے کی سختی سے اسے یہ اطمینان ملا تھا کہ
 وہ اپنے کل کے فیصلے پر قائم ہیں۔

”میرا فیصلہ آج پھر وہی ہے جو کل شام تھا۔ بہت
 امیدیں وابستہ کی تھیں میں نے تم سے بہت خواہش
 دیکھے تھے تمہارے لیے۔ مگر اپنی ہونے والی بچاؤ کی
 عزت پر اکتفا ڈال کر تم میری نظموں سے ہمیشہ ہمیشہ کے
 لیے گر چکے ہو سکندر! میرے دل اور میرے گھر میں
 اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ
 چکا ہوں۔ اب تمہارا اہل دل چاہتا ہے جوتو۔“ سچی بات
 چاہتا ہے عیاں کیا کرو۔ مگر اپنے پیسے سے، اپنے طرز
 بوتے پر میں نے ساری زندگی اصولوں کی بات کی۔
 اور میرے اصول یہ کہتے ہیں کہ میں ایک capitalist
 رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والے کو اپنے گھر میں جا
 نہ دوں۔ میرے اصول، میری خاندانی عزت، میرا
 مجھے اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتی کہ میں
 جیسے بدکردار اور عیاش کو اپنے گھر کی بنیاد بنوں
 دوں۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو، تو اسی سچی
 میں باقی پائی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی

سکے بعد وہ پھر یہاں موجود تھا؟ ایسے ملازم اور سکندر کی
 آواز میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ملازم اسے وہیں
 برکتے کا کہہ کر اندر بھیجتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شہر مار
 خان کو بلائے گیا ہے۔ شاید انہوں نے ملازمین کو کوئی
 ہدایت کر رکھی تھی کہ سکندر کو گھر میں داخل نہ ہونے
 دیا جائے۔ مگر کیا جو شہر مار خان نے کل کہا تھا وہ آج بھی
 اس پر کار بند رہیں گے؟ یا تو آج اپنے جیتے بڑے کو ان
 بکھرے حالات میں دیکھ کر ان کی پیدل نہ شفقت جوش
 مارے گی اور وہ سکندر کے تمام گناہ معاف کر کے اسے
 پھر گلے سے لگا لیں گے؟ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔
 اس بے غیرت انسان کی ہمت کیسے ہوئی تھی غیرت
 یہاں آنے کی؟ اسی کی وجہ سے ام میرم اس کو چھوڑ کر
 چلی گئی تھی۔ وہ ام میرم کو یہ یقین نہیں دلا سکا تھا کہ
 جس گھر میں وہ اور میرم رہیں گے۔ وہاں سکندر شہر مار کا
 وجود تو کیا اس کا نام و نشان تک نہ ہو گا۔ مگر اپنے باپ
 سے وہ یہ یقین مانگنا چاہتا تھا۔

وہ بغیر کسی ڈر اور ہچکچاہٹ کے نیچے جا رہا تھا۔ اگر
 اس کا باپ سکندر کو گھر میں داخل ہونے دے گا تو باپ
 سے لاد بویات کرنے میں اس سے یہ کہنے کہ سکندر کے
 لیے ان کا غصہ بس ایک دن کے لیے تھا؟ اتنی آسانی
 سے انہوں نے اپنے ولی عہد کو بیٹے کے ہاتھوں بھجوا دیا
 کرواپس گھر میں داخلے کی اجازت دے دی؟ ساری
 زندگی انہوں نے اس میں اور سکندر میں فرق رکھا ہے
 اور آج بھی اسی فرق ہے۔ اگر انہوں نے سکندر کو گھر
 واپس آنے دیا تو وہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے
 گا۔ شہر مار خان فیصلہ کر لیں کہ ان کے لیے ان کا کون
 سا میٹا یا بہن اہم ہے۔ وہ جس کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے
 یا وہ جو گناہ چھوڑے۔

وہ لوگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس سے
 پہلے شہر مار خان نے اسے کچھ کہے تھے۔ وہ سکندر کے بالکل
 سامنے کھڑے تھے۔ وہ پیچھے ہی رک گیا تھا۔
 ”کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیا کل میری بات
 تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی؟“ اس نے اپنے باپ
 کو چلائے بنا۔

بھی مت دکھانا۔

شہیار خان حش کے بل پوری قوت سے کرج رہے تھے سکندر کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا باپ وہ کہہ رہا تھا جو سنتا چاہتا تھا اس نے اپنے پیچھے لوٹ کر موم کا دروازہ کھینچنے کی کواڑ سنی تھی۔

اس نے گردن گھما کر نہ کھا۔ بقیہ گرم شال اور بغیر سلیپر کے اسوجان اندر سے نکالتی ہوئی باہر نکلی تھیں۔ شاید شہیار خان کے چلانے کی آواز انہیں کمرے تک سنائی دے گئی تھی۔ تڑپ کر وہ قوی وہ اسے نظر انداز کر کے شہیار خان اور سکندر کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہ پیچھے اسی طرح الگ تھنک کھڑا تھا۔

”سنا نہیں تم نے؟“ فوج ہو جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ میرے کمرے۔“ شہیار خان سکندر کو وہیں کھڑا دیکھ کر غصے سے جھڑپے تھے۔

”شہیار پلے، ایسا مت کریں۔“ سکندر کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔ پلے میرے پیچھے کو کمرے مت نکالیں۔“

اسوجان نے دوسرے دوائے التجا کی تھی شہیار خان سے اس کے آنسوؤں سے اسے تکلیف پہنچی تھی مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف اس کے منہ سے نکلے سکندر کی حمایت لیے جھلسے پیچھے تھے۔ جو غلط تھا غمناک گار تھا اس کی بال اس کی طرف داری کر رہی تھی لڑاؤ زار و قطار رو رہی تھیں۔

شہیار خان نے انہیں غصے سے غصہ نہ گھور تھا ”کوئی ضرورت نہیں ہے ایک زانی کے لیے رونے اور اس کی طرف سے راری کرنے کی۔“ خوار جو میرے کمرے میں اس Rapist کے لیے ایک آنسو بھی بہایا گیا یا اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی بولا گیا۔“

انکی اٹھا کر وہ سکندر کی طرف نفرت اور حقارت سے اشارہ کر رہے تھے اسے ہنسی میں چکی بار لپٹا۔ باپ کی اصول بندی اچھی لگی تھی۔ ”تھیک ہے“ اس سے غلطی ہو گئی ہے شہیار باہر انکی بچہ ہے۔ آپ اس سے بات نہ پرت بند کریں اس

”قصہ کشان اور پتول“ کرنا کی اس کے سر پر دیکھو شہیار

نکلتا ہے روم

”لاکار“ ”مہر علی ایڑہ“ سے تیرے شہر کی دولت

”ادکار“ ”لوہا بھ“ ”وگے پرانے کے راجہ“

”آوار کی نینامے“ ”اسماء لہو“ ”کا اقمہ“

”قاریوں کی عنایت“ ”نمراد“ ”لجبتہ بیڑا“ ”تیرے کے“

”میں جو ملے“ ”میں“ ”میں“ ”میں“ ”میں“ ”میں“ ”میں“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“ ”نورانی“

بھی دیا کرتا ہے وہ بھی اتنی کم عمری میں؟
کیا اس ایک غلطی کو ایک بھول، ایک غلط
معاذ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔“

امو جان دوتے ہوئے شہیار خان سے لڑائی
ان کی قوتِ اندر سے بلند ہوئی تھی وہ سخت بااثر
برہم نظر آ رہی تھیں۔

”آپ کب لور کے گمناموں کی سزا میرے
کیوں دے رہے ہیں؟ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا
بہت معصوم ہے۔ اپنے باپ کے گمناموں کی
میرے بیٹے کو مت دیں شہیار۔ جو آپ کے باپ
کیا۔“

”زبان بند کرو ذلیل عورت!“ شہیار خان غصے میں
بالکل بے قابو ہوتے امو جان کی طرف بڑھتے
انہوں نے امو جان کو ان کی بات پوری نہیں کرنے دی
تھی انہوں نے کھینچ کر ایک چھپر امو جان کے منہ پر
مارا تھا۔ ان کے دونوں بیٹے وہاں موجود ہیں اس بات
کی پروا کیسے بغیر انہوں نے بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔
بالکل پاگل اور خونی سے لگ رہے تھے۔

وہ امو جان کو دوسرا چھپر مارنے آگے بڑھتے تھے
ان کے اور امو جان کے بیچ سکندر آگیا تھا وہ چھپر
شہیار خان امو جان کو مارنے والے تھے سکندر کے منہ
پر جا کر لگا تھا۔ غصے میں پھرے شہیار خان نے سکندر کو
غیظ و غضب سے سوکھا تھا۔

”امو جان کو کچھ مت کہیں یا لیز میری ماں پر ہاتھ
مت اٹھا میں میں جا رہا ہوں یہاں سے۔“

اس نے نوکھکا کہ سکندر کی آنکھوں میں آنسو تھے
وہ بھرائے لہجے میں یہ بات کہہ کر ماں اور باپ کے
درمیان سے ہٹ گیا تھا۔

وہ سر جھکائے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ امو جان
شہیار خان کا چھپر کھانے کے بعد بالکل ساکت کہانی
تھیں۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سکندر کو گیٹ سے باہر
رہی تھیں۔ شہیار خان امو جان اور سکندر کو
مارنے کے بعد بھی اسی طرح پھرے ہوئے تھے۔
نے اپنے گھر میں بچپن سے باپ کی سخت مزاحمت

رہتی تھیں اسے ماریں پٹیں پھر آسٹریس لور جو
سمولت اس سے واپس لے لیں طرے لڑتے بول گھر
سے نہ نکلیں۔“ امو جان نے دوتے ہوئے سکندر کو
اپنے ساتھ لگایا تھا وہ شہیار خان سے التجا کر رہی
تھیں۔

”آہستہ! میں تمہاری یکواں بہت برداشت کر رہا
ہوں۔ ہوا اس بے غیرت کے پاس سے کوئی تمنہ
جیت کر نہیں لایا ہے یہ ہمارے لیے جو اسے گلے
لگائے کھڑی ہو۔“ شہیار خان ان کے اوپر دھاڑے
تھے۔

”شہیار! ایسا مت کریں۔ پلیز رستے اندر آئے ہیں۔“

”اب تم مجھے جاؤ گی کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ بیوی ہو
بیوی بن کر اپنی اوقات میں رہو۔“ شہیار خان کی
آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ شدید ترین
اشتعال میں تھے۔

”بیوی کے ساتھ ماں بھی تو ہوں۔ میرا بچہ جتا نہیں
کل سارا دن کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے۔ زرا حالت
دیکھیں اس کی شہیار! اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا
نہیں ہے۔ جتا نہیں اس سے کل سے کچھ کھا یا بھی
ہے کہ نہیں؟ جتا نہیں میرا بچہ کل رات ٹھنڈ میں کہاں
سویا ہو گا؟ ابھی یہ بہت چھوٹا ہے شہیار! بیس سال اور
گھبراہ مار کی عمر اتنی سخت سزا دی جائے والی عمر تو نہیں
ہوتی ہے۔ پلیز رستے اندر آئے ہیں۔ اس کی غلطی
معاف کر دیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

امو جان نے زار و قطار دوتے ہوئے شہیار خان
کے سامنے چھپتا اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”یہ اس گھر میں میرے جتنے ہی واپس نہیں آئے
گا۔ جب میں مرنے والوں میں تم اسے شوق سے واپس بلا
لینا۔“ شہیار خان خست اور بے لگ انداز میں بولے
تھے۔ وہ غصے سے امو جان اور سکندر کو دیکھ رہے تھے۔
”کیسے باپ ہیں آپ شہیار! کیسے باپ ہیں آپ؟
اتنی سبک دلی؟ اتنی خست؟ کوئی اپنی اولاد کو اتنی سخت سزا

ہمیشہ اپنے گھر میں اس طرح لیے جاتے سنا تھا جیسے وہ کوئی آسانی مخلوق تھے شہسار خان ان دونوں بھائیوں کو ان کے دادا کی غیر معمولی اچھائیاں اور خوبیاں ہمیشہ بہت فخر و انداز میں سنایا کرتے تھے پھر آج اموجان نے راوا جی کے متعلق اس طرح کیوں کہا تھا اور شہسار خان اس پر اس طرح کیوں بھڑکے تھے؟ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پاتا تھا۔

شہسار خان وہاں سے پھر بچنے شدید غصے کے عالم میں چلے گئے تھے وہ بھی وہاں سے بالکل خاموشی سے لوٹ گیا تھا۔ وہاں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا انہیں یہ بتا کر کہ ان کی تذلیل ہوتے ہوئے اس نے بھی دیکھی ہے۔ اگرچہ کہ اس کی ماں اس بد نظرت اور بد کردار کی حمایت نہیں کرتے ہوئے اس کے باپ کے ہاتھوں بے عزت ہوئی تھی جس سے وہ مرتے دم تک نفرت کرتا رہے گا مگر پھر بھی ماں کی اس تحقیر اس بے عزتی پر اسے شدید تکلیف ہوئی تھی بہت رنج ہوا تھا۔

ماں پر ہاتھ اٹھاتے اور چلاتے وقت اسے اپنا باپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد نہیں بلکہ ایک جاہل آدمی لگا تھا۔ بیوی کی تحقیر کرنا اپنا باپ اسے بہت گھٹیا آدمی لگا تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگا تھا کہ اس کا باپ ہارورڈ کا فارغ التحصیل ہے، وہاں سے گولڈ میڈلسٹن اور ورلڈ بینک میں بہت اونچے مرتبے پر فائز شخص ہے ایسا لگا تھا اس کا باپ۔ ایک بہت ہی رواں جاتی جاہل مرد ہے جو بیوی کو میر کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔



اور اس روز کے بعد اس نے اپنی ماں کو کبھی سکندر کا نام لے کر اپنے باپ سے منت یا فریاد کرتے نہ دیکھا تھا۔ ان دونوں کی اکیلے میں اس موضوع پر بات ہوئی ہو تو ہوئی ہو اس کے سامنے پھر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگلے ہی روز واپس اس انگلیس چلا گیا تھا۔ وہی کیسپس تھا وہی وہاں کا احوال وہی دوست وہی سرگرمیاں مگر پھر بھی اب زمین شہسار کے لیے نہ تو

اہم دیکھی تھی۔ ماں کو سر جھکانے ان کے احکامات کی تعمیل کرتے دیکھا تھا مگر باپ کو کبھی ماں پر ہاتھ نہاتے یا گالیاں دیتے نہیں دیکھا تھا۔

دو ہفتہ ایک ہفتہ حکموں، فکروں پر ڈالتے اور وہ ان کے حکم کی تعمیل کر دیتیں۔ آج انہوں نے زندگی اس پہلی بار اموجان پر ہاتھ اٹھایا تھا کہ نہیں گالیاں دی تھی ان بے غیرت انسان کی وجہ سے۔ بھائی کی زندگی برباد کر دی، ماں کو ذلیل اور سب سے عزت کر دیا، باپ نے ماں پر ہاتھ تک اٹھالیا۔ آخر یہ شخص چاہتا کیا تھا؟ کیا یہ سکندر شہسار ان سب کو تباہ و برباد کر کے ہی ان کی جان بچوٹے گا؟ باپ کے جاوہر جلال اور شدید ترین اشتعال نے اس کے پیروں کو منجمد کر دیا تھا وہ ہنسنے کھانے کے بعد روئی ہوئی ماں کو سہارا دیتے گن گنے پاس جانے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ بہت سہاواہ اس طرح پیچھے کھڑا تھا۔ اموجان اب بالکل خاموش تھیں بے آواز آنسو گر رہے تھے ان کی آنکھوں سے شہسار خان ان کے اوپر چٹکھا رہے تھے بلند آواز میں چلا رہے تھے۔

”آج تم نے میرے سامنے آواز اونچی کی ہے اور میں نے برداشت کیا ہے۔ آج کے بعد میرے آگے زبان کھولنے کی کو شش کی تو اسی وقت طلاق دے کر گھر سے نکل دوں گا۔ اگر اس گھر میں میری بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہتی ہو تو اپنی اوقات پہچان کر رہو۔ اس گھر میں کیا ہو گا اور کون کہاں رہے گا یہ فیصلہ میں کروں گا۔ تمہارا کام میرے فیصلوں کی تعمیل کرنا ہے۔ اگر یہ کام مشکل لگ رہا ہے تو عشق سے اپنے باپ کے کھرواپس چلی جاؤ۔ طلاق نامہ میں تمہیں وہیں بھجوا دوں گا۔“

آخری چلے آ کر تے وقت ان کا لہجہ بہت سرد اور سخت ہو گیا تھا۔ اموجان منہ پر ہاتھ رکھے ایک ٹکٹ ٹوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا کیا باہل موجود ہے اس بات سے شہسار خان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اسے ایسا لگا تھا جیسے اموجان کا دادا جی کا نام لینا شہسار خان کو اس قدر بھڑکایا تھا کہ دادا جی کا نام اس نے

شروع سے تھی۔ باب کے سخت اور بے رحم
سے اتنا نہیں اسے ہوتا تھا کہ وہ سندھ کو بھی
نہیں کریں گے۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اس نے اس
چھینے والے اس بد کردار شخص کو جو بیلا
ایک بد فطرت تھا، کبھی بھی معافی نہیں
تھی۔



وہاں اندھرا بہت تھا۔ بہت ناک ستا بہت تھا
اسے اس اندھیرے سے ڈو لگ رہا تھا۔ اس کا
زہا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔
اندھیری جگہ بڑی بہت ناک تھی جیسے کوئی غار
محرک و وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اس
ہاتھ پاؤں بلائے نہیں جا رہے تھے۔ وہ مدد کے
چاہنے لگا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر لو آجائے اس کی
کے لیے۔ کہیں سے کوئی تو آجائے اچانک ہی اس
کے رونے اور چلانے کی آوازوں میں کسی کے قدموں
کی آوازیں شامل ہو گئی تھیں۔ اس پر قہقہے لگا کر
وہ شخص اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کی شکل
ڈراؤنی تھی۔ خوف کے مارے اس کی چیخیں نکلتی
تھیں۔ وہ شخص اسے مستحضرانہ نظروں سے دیکھتا
تھیں۔

”بھائو، بھائو۔ ہیلپ، ہیلپ۔ کوئی مجھے بچاؤ یا
وہ روتے ہوئے چلا چلا کر کسی کوہر کے لیے بھاگ
لگا تھا۔ مگر اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔
خونناک شکل والا شخص اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔
وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس جیسے خوف
مشکلوں والے تین آدمی اور بھی تھے۔
”ایا، ایجھے، بھائیں۔ ایلا ایجھے ان لوگوں سے
لگ رہا ہے۔ تلیز یا! تجھے آکر بچالیں۔“
ہوئے پاپ کو آوازوں سے رہا تھا۔

”ایک rapist میرا بیٹا بھی
میرے گھر میں تم جیسے بد کردار اور بد
کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم میرے لیے
میرے گھر میں۔“

کبھی کبھی فوریا پور میں پہلے جیسی ہو سکتی تھی اور نہ
ہی لاس انجلس۔

کیمپس کے ہر گوشے میں ام مریم کی یادیں بکھری
تھیں۔ لاس انجلس کے چبے چبے پر اس کے ساتھ
گزارے انہوں نے نشان رہ گئے تھے اس کا کتنی بار دل
چاہتا تھا وہ اسے ڈھونڈے۔ اسے کھوے ہوئے مگر پھر اس
سے کیا وعدہ یاد آجاتا۔ وہ روک جاتا۔ وہ رات کی
تھنوں میں پہنچتا۔ ہو کر اسے یاد کرتا ہوا تھا۔ بیٹھتا
تھا۔ کیلی فورنیا سے انڈیانا کی طرف اس نے مکمل
کر لیں تو شہر بارخانے لاء پڑنے کے لیے اس کا
داخلہ بارڈر لاء اسکول میں کروانا چاہا۔ جو کبھی اس کی
زندگی کا سب سے برا خواب تھا۔ وہ اب جب اس سے
خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیے تھے مجبور ہو گیا تھا۔

اس کا داخلہ بارڈر لاء اسکول میں ہو گیا تھا۔ اب
خوشی کی باتوں پر بھی دل خوشی محسوس نہیں کر پاتا تھا۔
اس لیے وہ خاموشی سے لاس انجلس سے اپنا سامان
سمیٹ کر بارڈر لاء اسکول کی طرف گھوم رہا تھا۔
لاس انجلس میں رہ رہا تھا تو ام مریم کی باتوں کے حصار
سے نکلنا بہت مشکل لگتا تھا۔ جگہ جگہ لاس انجلس میں بدلا
شہر بدلتا تو کم از کم اتنا ضرور ہو گیا کہ وہ خود کو وقت کے
ساتھ ساتھ زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب
ہو گیا۔

ام مریم کی باتوں کی محبت تو اس کے دل سے کبھی
نکل ہی نہیں سکتی تھی مگر اب اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ
زندگی کو پھر سے جیتنے لگا تھا۔ زندگی لوگوں کی طرح اپنے
ہم عمر لوگوں کی طرح۔ پتا نہیں ام مریم کہاں بھی؟ وہ
کیسی تھی؟ اس نے اپنی اسٹڈیز پھر سے شروع کی
تھیں کہ نہیں؟ اگر وہ آج اس کی زندگی میں ہوتی تو
اسے بارڈر لاء اسکول میں پڑھتا دیکھ کر کس قدر خوش
ہوتی۔ بارڈر میں پڑھنے کے دوران وہ ہر چھٹیوں میں
گھر آتا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی اور موت کی سی
خاموشی رہا کرتی تھی اب اس کے گھر میں۔ اس کے
باب کا حاکمانہ مزاج و سماجی تھا جیسے وہ اپنے بچپن سے
دیکھا تھا۔ اس کی باتوں کی خاموشی وہی تھی جیسی

گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ اس نے خود کو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔ اس کے نہ کہیں سے خون بہہ رہا تھا نہ کہیں جوت ٹپکی نکلی تھی۔ پھر بھی اسے اپنے پیروں سے جسم میں درد کی ٹھیس اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ نڈھال سے انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اپنے قدموں کو گھسیٹتا نہ کمرے سے نکلا تھا۔ وہ لیٹن میں آیا تھا۔ بغیر کے اس نے چادر گلاس بانی کے پیسے تھے۔ اس کا وہاں اپنے کمرے میں جلنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں جانے سے اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے لیوٹنگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بہت تیز آواز میں پی دی آن کر لیا تھا۔

جس روز سے اٹلی سے آیا تھا، ایک رات بھی سو نہیں پایا تھا۔ اتنی راتوں تک غنڈہ آنے نے اسے بہت مختل کر دیا تھا۔ وہ اپنے دلنری کاموں کی انجام دہی میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔ خشک آنکر کل رات اس نے نیند لانے کے لیے ڈالٹری کی تجویز کردہ گولیوں لے لی تھیں۔ وہ گولیاں نیند لائی تھیں مگر وحشی طرح اس کے ڈراؤنے خواب بھی ساتھ لائی تھیں۔ اسے یہ گولیاں لیے اور یہ ڈراؤنا خواب دیکھے اسنے دلنا گزر گئے تھے کہ ایک خوش فہمی سی دل میں پیدا ہوئی تھی کہ شاید اس کے ان ڈراؤنے خوابوں نے آخر کار اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔

آخری بار اس نے یہ خواب روم میں تب دیکھا تھا جب خود کو خوش ہونے اور ہنسنے پر سزا دینے کے لیے اس نے از خود یہ خواب دیکھنا چاہا تھا۔ کمونیم سے وہاں آنے کے بعد اپنے ہونٹ روم میں جاتے ہی اس نے یہی گولیاں لی تھیں اور خود کو سزا دینے کے لیے سونے لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ روم میں جب جب سویا قدرتی نیند سوتا تھا اور یہ خواب تو لوں آنکھوں سے دور ہوا تھا جیسے اسے بارہ سالوں سے ڈراوی نہیں رہا تھا۔ پھر کج کیوں؟ پھر آج کیوں؟ پی دی کی تیز آواز بھی اس کے اندر کے سنائیوں کو توڑ نہیں پا رہی تھی۔

”کیا ہوا“ تم سوئے نہیں؟ بہت فکرمند یہ آواز

اسے اس غار میں بہت دور اپنے بیا نظر آئے تھے۔ نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اسے اس اندھیرے غار میں وہاں تنہا نمودار کر چلے گئے تھے خوف کے مارے اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں پانے کی کوشش کرنا خود اپنے آپ کو ان خوفناک لوگوں کے شکنجے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بکروم ہی ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھتے اس کے پانی مساکھی بھی زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اس کی سانس گھٹ رہی تھی اس کا دم گھٹ رہا تھا اب نہ وہ چلا سکتا تھا نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ وہ اپنے جسم سے خون بہتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا خون بہہ جائے گا نہ وہ مر جائے گا۔

وہ سینے میں شرابور تھا۔ وہ سوتے میں بچاؤ بچاؤ چلا رہا تھا اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کا گھونٹا جا رہا ہو اور وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ یکدم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے سی کی ٹھنڈک کے باوجود سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کئی سیکنڈ وہ آنکھیں کھولے بیڈ پر یوں لیٹا رہا جیسے اسے ابھی بھی یہ بتانہ چاہا ہو کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اسے جیسے اپنے کمرے کے اندھیرے سے شدید وحشت ہوئی تھی اس نے لپٹے لپٹے ہی ہاتھ بڑھا کر لمپ بدخون کیا۔ لمپ روشن کرتے اس کے ہاتھ باقاعدہ تپ زبہ تھے وہ کچھ کچھ کرسٹل کر سانس لے رہا تھا۔ ممکن اور اندھیرے سے جبراً کہہ فوراً ”بیڈ سے اٹھا“

اس نے اپنے کمرے کی تمام لامپس آن کر دی تھیں۔ برے ہٹا کر تمام گھڑیاں کھول دی تھیں۔ اسے بار آ گیا تھا کہ وہ اس وقت امریکہ کی کسی سڑک پر ٹانہ ہی کسی کے گھر سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ وہاں رات بھر اپنے نلیٹ میں تھا۔ کچھ کچھ کرسٹل لپٹے اس نے

آئیں گے۔

او آٹھ گھنٹیں بند رکھیے کیسے مسکرائیں؟

بھی نہیں آئی تھی مگر اس کی بے بسی اور

تھکن گنا تھا۔ رات کا وہ خواب اپنے اڑا رہا تھا۔

اس کے لیے پھر cervical pain

میں وہ آٹس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور

سگروں کے بجائے جسے میں وہی مخصوص درد

گروں سے اٹھتا ہانڈوں تک پھیل جایا کرتا تھا۔

سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس کے

شدید درد ہو رہا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے

پروہ پتھر بھری نظر میں ڈال پایا تھا جو تپک

سالموں سے ڈالتا آیا تھا۔

”تم مجھے بہت چند سمجھتے ہو۔ اوپر سے تمہارا

غور اور خود پسندی بھی تم بہت جتنی ہے۔ مجھے تمہارا

چہرہ خاص طور پر تمہاری آنکھیں بہت پرکشش

تھیں۔“

وہ اپنے چہرے کی نقوش کو آئینے میں بغور دیکھنے

تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

”جتنی جتنا ہے سینور سکندر! تم بہت چند سمجھو۔

پتا نہیں مگر ہمارے ہمیں دیکھ کر پالو کا خیال دل میں آ

ہے۔“

اپنے چہرے کے نقوش شے میں دیکھتے اسے آئینے

میں وہ نظر آنے لگی تھی۔ لبوں پر شرارت بھری

مسکراہٹ لپو لپو اسے دیکھ رہی تھی۔

”bella۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ

آئینے میں اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کو بوجھ سے

دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آگیا تھا۔ وہ عادی

بغیر ہاتھ کے گھر سے نکل رہا تھا۔ خود کو نظر انداز کر

اور سزاوے کی اپنی عادت کے پیش نظر۔

”دل نہیں چاہ رہا پھر بھی تھوڑا سا کھانو۔“

پاس سے آئی اس آواز پر اس کے قدم خشک کر

گئے تھے۔

”معت مت کرنا۔ تم نے کھانا بہت کم کھایا تھا۔“

اس کے عقب میں گونجی تھی۔ اس نے سر جھکا کر

دیکھا۔ وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔

”تم چاہو تو میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر

باتیں کر سکتی ہوں۔“

وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس کے بالکل

مزید یک پہل نہیں آوازوں گونج رہی تھی جیسے وہ

میں بالکل پاس ہی بیٹھی تھی۔

”زندگی بہت خوب صورت ہے۔ خوشی کو اور غم

کو اور زندگی کو اپنے اندر محسوس نہ کر کے دیکھو۔“

صوفے پر وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ نرم لہجے

میں بول رہی تھی۔

”خوش ہونے کے لیے وہ دعوے نہ کرے تو کبھی خوش

نہیں ہو سکو گے۔ میری زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ

ہے جسے اگر میں ہر وقت سوچنا شروع کر دوں تو ایک

لحظے کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی مگر تم دیکھتے ہو

میں کتنا خوش رہتی ہوں۔“

اس کا نرم لہجہ اتنا دل نشیں تھا کہ نے ساخت اس

نے سر اٹکات میں ہلایا تھا۔ ریوٹ سے ٹی وی آن

کر کے وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اسے وہ تصور میں

نقد و تشن اپنے صوفے کے پاس لا کر رکھتی نظر آرہی

تھی۔

”زندگی بہت خوب صورت ہے سکندر!“ وہ

صوفے پر لیٹا تھا اور اسے گار پٹ پر وہ اپنے صوفے

سے بالکل مزید یک بیٹھی نظر آرہی تھی۔ اس کا نرمی

خلوص اور محبت لیا لہجہ اس کی تکلیف کو کم کر رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے جس طرح وہ سانس نکلتی محسوس کر رہا

تھا۔ اب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کاتوں

میں خود اس کی اپنی آواز گونجی تھی۔

”آج میں سینور رالیز محمود اور ان کی بیٹی سحر کو

سوچتے ہوئے سوؤں گا۔“ اسے اپنے ہاتھ کے نو پر اس

کاٹس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر مرہم لگا

رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”اتنی خوب صورت چیزیں سوچو گے تب تو نیند بھی

خوب پر سکون آئے گی اور خواب بھی بڑے حسین نظر

مزید انہیں سمجھا کرتے تھے ایک سیلف میڈ انسٹی
جو اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر یہاں تک پہنچ آیا
تھا۔

سبزیوں کی طرف جاتے جاتے اس کی پھلوں کی
طرف نظر پڑی تھی وہاں دیگر کئی نازد پھلوں کے
ساتھ ناشپائیاں بھی رکھی تھیں۔ اس کا پھل لینے کا
کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اب وہ اپنی زراعت میں سبزیوں سے
بھی پہلے ناشپائیاں رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے بہت
ساری ناشپائیاں خریدی تھیں۔ اس کے ذہن کا مسر
حل ہو گیا تھا۔ وہ ناشپائیوں کو زراعت میں رکتے ہوئے
مسکرایا تھا۔

اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں ڈانگنگ ٹیبل کچن
ہی میں موجود تھی۔ وہ اس آکر نہانے اور لباس تبدیل
کرنے کے بعد وہ کچن میں آ گیا تھا۔ اس نے پلیٹ بھر
کر ناشپائیاں اپنے لیے کالی تھیں۔ اس کے چوکور چوکور
پہیں۔ پلیٹ میں فور کب لگا کر وہ میز پر بیٹھ گیا تھا۔

اسے کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا یہ پھل اسے مزے کا
ہوتا ہے۔ بچپن سے اسے اس پھل سے کوئی خاص
رغبت نہیں رہی تھی، آج وہ اسے اتنے مزے کا لگ
رہا تھا۔ اس نے ناشپائیوں کو انجوائے کرتے ہوئے
سوچا کہ کل وہ دفتر جا کر اپنی سیکرٹری سے کہے گا کہ جس
طرح اس نے یہ یاد کر لیا ہے کہ اس کا لباس بلیک کنی
پسند کرتا ہے، اسی طرح اب بیچ میں روز ناشپائیاں کھانا
پسند کرے گا یہ بھی یاد کر لے۔

وہ دوا لیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔
اپنے لیے کافی بنا کر وہ لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔
اس نے لی وی کن کر لیا تھا۔ میریپس سے چھیل
تبدیل کرتے اس کے ہاتھ یکدم ہی ایک چھیل پر آکر
رکے تھے۔ وہ اسکے اوپر ڈاکومنٹری آرہی تھی۔ وہاں
کے تاریخی مقامات ان کی تاریخی اہمیت۔ اس کی غیر
دلچسپی فوراً ہی دلچسپی میں تبدیل ہوئی تھی۔ وہ غلطی
بانڈھے کو زیم فورم دی کی کن سی "امپینش اسٹیمپسز
کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اب Trevi ٹاؤن میں دکھارے
ہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ الرٹ ہو کر بیٹھا۔ سیاحوں

سے کمر Trevi ٹاؤن میں سیاحوں کو یہاں پہنچانے
اچھالتے دکھایا جا رہا تھا۔ ساتھ لی وی کی
ناظرین کو ان کے اچھالنے کا پس منظر بھی دکھایا جا رہا تھا۔

Respond has it you will
return to Rome if you
throw a coin into
the water

(کہا جاتا ہے آپ روم دوبارہ آنا چاہتے ہیں تو یہاں
پالی میں سکے اچھالیں۔)
لی وی پر سے ابھرتی یہ آواز سن کر اس کے دل میں
ایک جھلپ سی پیدا ہوئی۔

وہاں میں سکے کیوں اچھال کر نہیں آتا تھا؟ وہ یقین
کرتا تھا یا نہیں مگر اسے پالی میں سکے اچھال دینا چاہیے
تھا۔

I didn't toss a coin
into the fountain but
i still want to go
back to Rome

(میں نے وہاں نواریں میں سکے نہیں اچھالا لیکن
میں روم واپس جانا چاہتا ہوں)

وہ خود کلامی کرتے ہوئے نجانے کس سے مخاطب
تھا۔ وہ خود سے روم کبھی نہیں جائے گا وہ وہاں نہیں
جانا چاہتا مگر کچھ ایسا ہو تو سکتا ہے ہاں کہ اسے پھر کسی
دفتری کام سے وہاں بھیجا جائے۔ تب تو اسے خوب
لڑنا بھی نہیں پڑے گا کہ وہ روم میں اپنی زندگی سے
خوش ہوتا کہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے خود کیا
پھر اس لڑکی کو؟ وہ جس جگہ سے سب چھوڑ جاتا تھا
"فانا" بھاگ آتا تھا وہ وہاں پھر جانا چاہتا تھا۔ پھر وہاں
جائے کہ اس کے آفس والے اسے پھر سے جانا
دیں۔ وہ La citta eterna پھر سے جانا چاہتا تھا۔
تھا۔ خود سے وہ وہاں نہیں جاتا تھا۔ خوب
اس کے اندر سے ابھرتی آوازیں اس سے کہتی تھیں
اسی طرح جیسے Tivoli سے آنے کے لیے

گیا تھا۔ وہ بے اختیار کھل کر ہنسا تھا، وہ ہنسنے لگا کر ہنسا تھا۔

”نہیں مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی ہے۔“ اس لڑکی کی یاد ہی اتنی خوب صورت تھی کہ اسے اپنے اوصالی دور کا احساس تک نہیں رہا تھا۔ ڈاکو میٹرونی ختم ہوئی تو لیوی بند کر کے اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

غیر اسے ابھی آنی نہیں تھی۔ دوا لینے سے وہ کترا رہا تھا اور ویسے بھی وہ اس وقت قابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے شوق اور دلچسپی سے کوئی مودی دیکھے اسے برسوں ہو چلے تھے مگر اس وقت وہ اپنے لیپ ٹاپ پر Roman Holidays ڈائون لوڈ کر رہا تھا۔

یہ مودی اس نے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ آج دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ مودی دیکھ رہا تھا لیکن ہوا۔ مودی میں مردم کی مختلف جگہوں کو دیکھتے اسے ان جگہوں پر مودی کے مرکزی کردار نہیں بلکہ وہ خود اور لبرل چلنے پھرنے نظر آنے لگے تھے۔

”غیر۔ خوب صورت تو میں ہوں۔“

ہاں۔ خوب صورت تو وہ بہت ہے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت ہے۔

”میں زیادہ تو نہیں بولتی۔ لگتا ہے تم نے کبھی کوئی بات لی لڑکی دیکھی نہیں ہے۔“

وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر مودی میں ان اداکاروں کو نہیں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دہم میں رات کے دو بج چلے تھے مودی دیکھتے دیکھتے کس وقت اس کی آنکھ گھٹی اسے پتا نہیں چلا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ سو گیا بغیر کسی ذرا کے۔ اس نے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا۔ یہ اعجاز اس لڑکی کا تھا جو اپنی موجودگی سے تو اس کے پاس سے ان خوفناک خوابوں کو دور دھکیلی گئی تھی۔ کل رات اسے تصور سے بھی ان خوابوں کو اس کے پاس سے ہٹانے تک نہ دیا۔

شاید اس لیے کہ کل رات اس نے خود کو شش نہ کی

اور موجودہ بہت تر اور زندگی سے نفرت میں مبتلا شخص اس سے لڑا تھا۔

اس نے اس سے سوال کیا تھا کہ آخر کس حق سے اپنی زندگی کی تاریکیوں، سیاہیوں اور دلتوں میں اس لڑکی کو شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو سلا محبت ہے جو سلا خوشی ہے جو سلا ہنسی ہے جو سلا زندگی ہے۔ یہ ہنسی یہ خوشی اور یہ زندگی لیرا محمود کے پاس پیشہ رہتی چلی۔ لیرا نے اندر سے ابھری ان آوازوں ہی کے سبب وہ اُٹلی سے تنہا ”فانا“ واپس آ گیا تھا اس لڑکی کی زندگی سے ایک دم ہی باہر نکل آیا تھا۔ اگر وہ خوشیاں بانٹنے والی اس بہت سی لڑکی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اسے اپنی زندگی کی بدگیاہیوں اور تاریکیوں میں حصہ دلا کر مٹائے۔

ایک بچکانہ سی دعا تھی جو وہ کر رہا تھا۔ اس کے افسانے اسے زبردستی روم بھیج دے۔ وہ منح بھی کرنا رہے تب بھی کسی بھی اہم کام کا کہہ کر اسے وہاں پر زبردستی بھیجا جائے اس کی مرضی کے خلاف جبراً حکم دے کر۔ تب تو اس کے اندر کوئی اس سے لڑ نہیں سکے گا۔

وہ خود کو بے بسی اور مجبور بنا کر کرتے گا کہ یہ اس کی نوکری کی مجبوری ہے جو وہ اُٹلی و بارہ جا رہا ہے۔

اس نے وہ ڈاکو منزی پوری دیکھی تھی۔ اسے جانی نہیں چلا تھا وہ اس شہر سے محبت میں مبتلا ہو گیا تھا اسے روم سے محبت ہو گئی تھی وہ اس شہر میں بھر جانا چاہتا تھا۔ جو جگہیں تب نہیں دیکھ لیا اب دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے نہیں کسی کے ساتھ۔ وہ ان تمام تاریکی جگہوں کی بہت سی تصاویر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے نہیں کسی کے ساتھ کسی اور کو بھی ہونا چاہیے تھا ان تصاویر میں اس کے ساتھ اپنے لیوی دی پر steps spunnesh پر دیکھتے ہوئے وہاں وہ اور لیرا دیکھتے نظر آ رہے تھے۔

”نہیں نہیں گھٹی کوئی نہیں گئی تھی۔“

علانیہ انداز میں بول کر ہمیں دیکھ کر اسے یقین دلایا

تھی جو اٹلی سے آنے کے بعد جان بوجھ کر پوری شعور کی کوشش کر کے کر رہا تھا۔ لیزا محمود کو بھول جانے کی کوشش۔ اسے بالکل بھی باز نہ کرنے کی کوشش، اسے ذرا بھی نہ سوچنے کی کوشش۔ کل رات اس نے بڑے اہتمام سے ٹیبلے سے ٹیبلے محبت سے اسے باو کیا تھا۔ وہ باو ایس آنے کے بعد نیلی بار۔

گو یہ ایک بے انتہاری کیفیت میں ہوا تھا مگر اس بل جب وہ خود کو بہت ترقی مانہ محسوس کرتا تھا اسے اٹھ رہا تھا۔ تب اس نے خود سے کہا تھا اس میں کیا خرچ ہے اگر وہ لیزا محمود کو یاد کر لے اس میں کیا خرچ ہے اگر وہ اسے سوچ لے؟ اس سے کسی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔ اس لڑکی کو تو یہ بتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ اسے یاد کیا کرنا ہے۔ وہ اس کی یادوں میں اپنے لیے سکون تلاش کرنا ہے، وہ اسے تصور میں لا کر اپنے اندر کی تلخیوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آگیا ہے اس کی زندگی سے دور۔ وہ اب اس سے زندگی میں بھی نہیں ملے گا۔ وہ لیزا کی زندگی اور اس کی خوشیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔ وہ صرف اس کی یادوں اور اس کے تصور سے زندگی کو اپنے لیے آسان بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کوئی فاضل گرفت گناہ تو نہیں۔

اس نے اپنا موبائل اٹھا کر اس میں Trevi فونٹین کی وہ تصویر کھینچی تھی جس میں لیزا اپنی موجود تھی۔ تب وہاں Trevi فونٹین کی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچنے لگا۔ یہ تصویریں کھینچی تھیں جیسے اس جگہ کو کسی خاص انداز سے تصویر میں لانا چاہتا تھا۔ لیزا کو اس نے بنایا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

وہ تصویر تب اس نے خود سے بھی جھوٹ بولنے یوں کھینچی تھی جیسے لیزا کا ساڈا پوز تھا۔ اس تصویر میں لیزا تھا اور حقیقت تو وہ اس جگہ کی تصویر لیتا چاہتا تھا۔ مگر آج وہ جانتا تھا اور خود سے اعتراف بھی کر رہا تھا کہ یہ تصویر اس نے جان کر کھینچی تھی کہ وہ جانتا تھا اگلے روز اس نے روم سے واپس چلے جانا تھا، پھر اس

نے لیزا محمود سے زندگی بھر نہیں ملے گا۔ کر چکا تھا تو کیا واپس جانے سے کیا اسے بھی باز نہ کرنے کی کوشش؟ اس نے اس میں وہ اس تھیں۔ وہ اس طرح مسکرا رہی تھی جیسے ہر وقت مسکرایا کرتی تھی اس میں اسے نہیں آ رہی تھی جیسے ہمیشہ خوش رہا کرتی تھی اسے اس کا سبب وہ جانتا تھا۔ یہ اوامیاں اسے وہی اس نے کھیں۔ مگر وہ ٹوٹا، بکھرا، ناکام انسان اسے اس ساتھ کی کوئی خوشی بھی تو نہیں دے سکتا تھا۔ یہ اسے اس کے زیادہ ستر لگا تھا۔

وہ تو اتنی اچھی ہے، اتنی پیاری ہے اسے اس شایان شان کوئی بہت کامیاب بہت باوقار اور اس سے بہت محبت کرنے والا شخص ملے گا۔ وہ اسے اتنی محبت کرے گا کہ وہ اپنے روم میں چند دنوں کے لیے آئے اس ناکام انسان کو بھول ہی جائے گی۔ اس کی دعا تھی، بہت سچے دل سے مانتی دعا کہ لیزا اسے بھول جائے۔ اسے کسی اور سے محبت ہو جائے۔ ایسے شخص سے جو اس بہت پیاری لڑکی کی بہت قدر کرے اس سے بہت محبت کرے مسکندہ شہر پار کھی اس کے خوابوں اور خیالوں تک میں نہ آئے ایسی محبت مل جائے۔

”تم میرے لیے نہیں ہو جانتا ہوں۔ مگر جسے غم لگے وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی ہو گا۔“

وہ اس کی تصویر سے بولا تھا۔ اس سے رخصت ہوتے ہی اس کی ان ہنسی، اس آنکھوں کو یاد نہیں رکھنا چاہتا تھا جن میں بہت تنگوائی تھی بہت شکایتیں تھیں۔ وہ رو دینے کو کھنسی وہ جانتا تھا۔ تب ہی تورو آتا تھا۔ وہاں سے بھاگا تھا۔ وہ کسی ایسے جذباتی لڑکے کی زندگی میں آئے سے ڈرتا تھا جن میں وہ اس لڑکی کے آسودہ یا اس کی محبتوں کے سبب کمزور ہو جائے۔ اس کی کھالی کمزوری اس لڑکی کی زندگی کو کائناتوں پر گھٹا کر لے جائے گی۔

”لیزا کو ہمیشہ بہت خوش رہنا چاہیے۔“ اس نے Tivoli سے آنے کے بعد اس رات سوچا تھا۔

کنفرم کر لی تھی۔

وہ اگلے روز صبح ساڑھے چھ بجے آفس پہنچ گیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا وہ آج اور کل کا پورا دن لگا کر اپنا باقی بچا تمام دفتری کام مکمل کر لے گا۔ اس نے قصداً سارا دن لیزا کو قید نہیں کیا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنا وقت اوجھڑا کر نہیں بھی گزارنے کے لیے وہ شام میں دفتر سے نکلا جب لیزا کی کل آئی تھی۔ یک دم ہی اس کا دل چاہا تھا وہ روم کی گلیوں میں آخری بار اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔

اس نے اسی وقت کھڑے کھڑے Trevi ٹاور نشین جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آج اس سے آخری بار مل رہا تھا۔ خود کو بہت خوش بہت لاپرواہا کر کے اس نے اسے اپنی واپسی کا بتایا تھا۔ اس کی لواسی اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر اس کا دل بہت دکھایا۔ مگر یہ دکھ اس رکھ سے بہت کم تھا جو لیزا کو اس کے اقرار محبت کے بعد اس سے ملتا۔ وہ اسے وے کیا سکتا ہے۔ ناکامیاں، ناپوساں، تنگناں، رسوائیاں، ذلتیں وہ ایک زندہ لاش سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ اسے کچھ بھی نہیں وے سکتا۔ وہ اسے اصرار کر کے اپنے گھر واپس بھی لے چاہا کہ بھی اسے انکار نہیں کر پایا تھا۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری بار پھر اس کے بعد تو صرف خوابوں اور خیالوں میں ملنا تھا۔ وہ اس آخری دن بھی صبح سے شام تک آفس میں اپنے بنانا کام نمٹانا رہا تھا۔ لیزا سے صرف ایک میٹنگ ہے کہہ کر اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اسے یہ تاثر برگر نہیں دینا چاہتا تھا کہ واپسی کا یہ فیصلہ اس نے ایک دم اچانک اور آنا "ناہ" کیا ہے۔ وہ پاگل لڑکی اس سے اظہار محبت مننا چاہتی تھی۔ اس نے مسکندہ شہریار سے جس کے پاس اسے ویٹے کے لیے کچھ بھی بھیج دیا تھا۔ وہ اسے کیا وے سکتا تھا؟ اس کا وجود زخم زخم تھا، اس کی مدد مرچکی تھی، ایک بے جان لاش کے ساتھ اس لڑکی کو کیا مل سکتا تھا؟ وہ خود اپنے آپ سے آخری لمحوں تک بہت ڈر رہا تھا۔

بہت خوش رہنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنا بندھا اور بندھا اور بندھا اور بندھا اس سے بہت دور لے جائے۔ کہیں اس کی زندگی کی بد نمائیاں اور ذلتیں اس لڑکی کی زندگی سے بھی خوشیوں کو ختم نہ کر دیں۔ محبت کس لمحہ ہوئی وہ نہیں جانتا تھا، دن، وقت، موقع اسے بنا نہیں تھا۔ وہ تو بس لیزا کے روم میں اپنا کتا ہی اس کے ساتھ مل کر رہا تھا اور زندگی کو پھر سے محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور مل کھول کر رہنے اور بے تحاشا بولنے والی لڑکی اپنی باتوں سے اسے جیسا کہتی تو ہنستے ہنستے وہ حیرت سے چپ سا ہو جاتا تھا۔ وہ لیزا کے ساتھ اس کے روم میں جیسے نئے سرے سے پیدا ہوا تھا جیسے وہ نئے سرے سے زندہ ہوا تھا۔ وہ کھل کھلا کر ہنسی اور وہ مہربانی اس کے چہرے کو دکھا کر تا۔ وہ اگلے دن اس کے ساتھ اردو میں بائیں کرتی تو اس کا دل چاہتا، وہ بولتی رہے اور وہ اسے ناسیات سناتا رہے۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس اسے ابھی بھی اپنے ہاتھوں اور ٹہلوں پر یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ابھی ابھی وہ اس کے زخموں پر مرہم لگا کر گئی ہو۔

وہ کس طرح اس کی فکر کرتی تھی وہ کس قدر اس کا خیال رکھتی تھی۔ Tivoli میں پانی بار اس کے دل نے ضدی انداز میں جھل جھل کر کھٹکنا تھا وہ چاہتا ہے یہ لڑکی ساری زندگی یونسی اس کی فکر کرے یونسی اس کا خیال رکھے وہ چاہے اسے مایوس کرنے چاہے اسے ناراض کرنے گھر وہ لڑکی یونسی اپنی محبت اس پر بھجوا کر کرتی رہے۔

وہ اپنے اندر کی ان آوازوں، اس شور سے گھبرایا تھا۔ تاسو میں اس نے کیوں لیزا کے آئینہ صاف کیے تھے۔ اس کا اس میں یہ دل کیوں چاہتا تھا کہ وہ اسے بھیج کر اپنے سینے سے لگا لے۔ اس سے کہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں بد رہی ہو۔ میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف گئی نقصان نہیں پہنچے ہوں گا۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہیں ہر نقصان سے بچاؤں گا۔ اپنے اندر سے ابھرتے اس شور نے اسے اتار دیا تھا کہ اس رات ہو مل جاتے ہی اس نے اپنی واپسی کی سیٹ

اس کی طرف جس طرح اس کا دل کھینچا تھا۔ اسے بہت خوف آیا تھا اس لمحے سے کہ جس میں لیزا کے آنسوؤں سے یا اپنے دل کے ہاتھوں کمزور زمانہ اس سے کچھ کہہ نہ سکتے۔ اظہارِ محبت نہیں بھی ڈکائی ایسی میٹھی دل نشیں بات جو وہ اس سے سنا چاہتی تھی۔ جس میں کوئی وعدہ کوئی امید نہ بھی ہو۔ بہت سی بات اس کا لیزا کی جانب التفات اور جھکاؤ ظاہر کرتی ہو۔ وہ اسے بھی نہیں بھول پائے گا یہ جانتی ہو۔ اس کی زندگی کی چٹائیاں اتنی کرفی اتنی بدمصورت تھیں کہ ان میں وہ کسی اور کو حصے دار نہیں بنانا چاہتا تھا تو لیزا محمود کو کیسے بتا رہا تھا؟ لیزا محمود جس نے اسے زندگی کو پھر سے محسوس کرنا سکھا تھا لیزا محمود جس کے رہنا میں وہ اس کے ساتھ پھر سے خوش ہونا سیکھ کر آیا تھا جس سے وہ ہجرت ہنسنا سیکھ کر آیا تھا۔

آج اس کی یادوں کے ساتھ سو کر جب وہ بیدار ہوا تھا تو اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے اندر زندگی کے لیے وہ نفرت نہیں جیسی وہ زندگی سے بارہ سالوں سے کرتا آیا ہے۔ جیسے اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ لیا ہے جسے سوچ کر چند لمحوں ہی کے لیے سہی غمزہ خوش ہو سکتا ہے۔ مسکرا سکتا ہے۔

وہ اپنی سیکرٹری کو ایک کانٹریکٹ ٹائپ کرنے کے لیے دے رہا تھا۔ اس کی صبح عموماً بہت جلدی ہو جاتا کرتی تھی۔ وہ روزانہ صبح آٹھ اور ساڑھے 7 کے درمیان آفس میں موجود ہوتا تھا۔ اس کی سیکرٹری اس کے اس معمول کے ساتھ خوب کو لڈ جھٹکتی رہتی تھی وہ بھی صبح جلدی۔ اسے کسی کو شش کیا کرتی تھی۔

اس کے موبائل پر کل آرہی تھی۔ سیکرٹری کو ہدایات پہنچنے کے دوران اس نے موبائل کو دیکھا یہ اس کے امریکن کو لیگ ٹکس کی گاڑی تھی۔ وہ اسے سے قبل امریکہ میں جس لاء فرم میں وہ جاب کرتا تھا ٹکس وال اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے سینئر کیل تھا۔ جس وقت زمانے کی ٹکس کریں کھانے کے بعد آخر کار وہ لاء کا امتحان پاس کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا

تب تک لوں ایک کامیاب وکیل کے طور پر نہ تھا۔ اپنا کیریئر چکا تھا۔ وہ اس کا ہم عمری تھا۔ وہ بڑے دنوں کا ایک اچھا سا سہی تھا۔ وہ سنی تو نہ تھی مگر ایک اہمیت بھرا حلق نہ تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو ٹکس۔"

"سکندر کیسے ہو؟"

"فرٹ نکلاس۔ تم سناؤ؟"

زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔ ایک کیس کے سلسلے میں دبا آیا ہوں۔ یہاں سے آج مجھے ایک میٹنگ کرنا ہے۔ ابوظہبی جانا تھا۔ ایر پورٹ پہنچنے میں مجھے ہرجائی۔ میری فلائٹ مس ہو گئی۔ میٹنگ شام سات بجے ہے۔ فلائٹس پر اتنا رش ہے۔ اب آگلی جس فلائٹ میں مجھے سیٹ مل رہی ہے وہ ہے ہی شام پہ بجے۔ اب میں کیا کروں؟"

ٹکس بے چارہ اپنی پریشانی بتا رہا تھا محمود بے اختیار مسکرایا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کرسی سے نکل کر آگئی تھی۔

"کیا تم بھی میری طرح سوچتے تھے؟" وہ غصے سے کہتا تھا۔ ٹکس اتنی پریشانی میں تھا کہ "میری طرح" اور "بھئی" کے لفظوں پر دھیں دیے بغیر سنجیدگی سے بولا تھا۔

"جیسے سکندر! بس یہ یہاں کلائنٹ کے سامنے میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔ بس ایر پورٹ کے لیے دیر سے نکلا۔ اب ایر پورٹ پہنچا ہوں تو کیٹ چکا ہوں۔ تم مجھے مشورہ دو میں اب کیا کروں؟"

"ہائے روڈ۔ تمہیں ہائے روڈ جانا چاہیے اور اگر ذرا سہو مجھ جیسا ہوا تھیں ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی دوڑا کر لے کر ہاؤس میں پہنچ جاؤ گے۔" وہ غصے سے کہتا تھا۔

میں اسے اپنے آفس سے نکل رہا ہوں۔

مرات اب اس نہیں ہو۔ تم رات کو سو جاؤ گے۔
رکتے تھے کہ میری بہت نہیں ہوتی تھی
بے تحاشا خجیدگی کی وجہ پوچھ سکوں۔

”ہاں ہنس، شاید وہاں کی آب و ہوا نیک رہا ہو۔
اسے وہاں کی نہیں لیس اور کی آب و ہوا اس
آئی تھی اسے خوش رہنا ہوا ہے نہیں وہاں کی لیا
سکھایا تھا۔ اس کے پاس سے ایک گاڑی اسے بہت
اور خطرناک طریقے سے اندر ٹیک کرتے ہوئے
تھی۔ بے اختیار اس کے لیوں سے اس گاڑی کے
ڈرائیور نے لے کھلی تھی۔

”لو کاٹھا،“ بولتے کے ساتھ ہی وہ خود اسے آب
حیران ہوا تھا پھر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ ٹکولس
حیران سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کس بات پر ہنس رہے ہو مجھے بھی بتاؤ؟“ ظاہر
ہے وہ لیا ہوا تھا ٹکولس سمجھ نہیں پایا تھا۔
”ابھی زبان میں گھلی ویسے کا مزا آگ ہو رہی ہے
ٹکولس! میں نے اس گاڑی والے کو اپنی زبان میں گلی
دی تھی اور وہ میرا ہنسنے چاہا ہے کہ انگریزی میں چل
دیتے ہیں مزا نہیں آتا دل کو وہ تسلی اور تسکینی نہیں
ہوتی جو کسی کو اپنی زبان میں گلی بولے کر ہوتی ہے۔“
ٹکولس بھی اس کے ساتھ جس پر ہنسا تھا۔ وہ ٹکولس
کے ساتھ مل کر قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔

”تم نے کبھی اصلی امالین پر لکھا یا ہے؟“
ٹکولس نے صحیح وقت پر پہنچ کر اپنی میسجنگ ٹینڈو کر لی
تب اس کے بعد وہ دونوں ابو ظہبی ہی میں ایک پرا
کوٹ لیٹ پر رات کا کھانا کھاتے آئے۔ پرا کھاتے
ہوئے اس نے ٹکولس سے پوچھا تھا۔

”ہاں دست باو۔“

”نہیں۔ میرا مطلب کسی امالین کے ہاتھ کا ہونا
جو تم نے روم کے کسی Pizzeria میں بیٹھ کر کھایا۔“
”اُس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔“
”نہیں سوہ تو نہیں کھایا۔ اب تک کبھی امالین

نوں ہند کر کے وہ جلدی جلدی سیکڑی کر لیا ہے
جائے کبابانے کے بعد وہاں پر نہیں آیا ایسا ظلم نہ ہوتا ہے
اس سے متعلق ہدایات دینے لگا تھا۔

وہ ٹکولس کو اس کی میسجنگ کے لیے وقت پر پہنچانے
اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا تھا۔
”تمہارا بہت شکریہ سکندر! میں وہ پرفارمنس ٹائم آیا
ہوں اگر تم بدو نہ کرتے تو ج میں میری سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا اب کیا کروں۔“ وہ ہائی وے پر ڈرائیور کرتے
ہوئے مسکرایا تھا۔ ہائی وے کے سب دونوں طرف
بھرا تھا، کہیں کہیں خانہ بدوش اور بدو لوگوں اور
بکریوں کے ربوڑ کے ساتھ نظر آ رہے تھے وہ انتہائی
تیز رفتاری سے گاڑی چلا نہیں پا رہا تھا بالکل لیڈر کی
طرح۔

”تم بہت زیادہ تیز نہیں چلا رہے گا ڈری؟“ ٹکولس
کو جیسے کسی ایک سیکنڈ کے کاٹور لاحق ہوا تھا وہ قدرے
خائف سے انداز میں بولا تھا۔ اسے خوفزدہ دیکھ کر وہ ہنسا
تھا۔

”میری یہ ڈرائیونگ ہی تمہیں ٹھیک وقت پر
تمہاری منزل پر پہنچانے کی سیٹور ٹکولس۔“ لیڈر کا جملہ
اس کے انداز میں بولنے میں اسے بہت مزا آیا تھا۔
گاڑی ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھی۔

”سینور۔“ ٹکولس نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”حیران مت ہو۔ میں ابھی ہندوستان سے اٹلی سے
آیا ہوں۔ وہاں کے اثرات ہیں۔“ وہ ہنس کر بولا۔
ٹکولس گریزون ہلا کر مسکرایا تھا۔ اب چونکہ وہ اسے
وقت پر پہنچانے کی غرض سے جا رہا تھا۔ اس لیے ٹکولس قدرے
مطمئن اور پرسکون تھا۔ اس نے سکندر کو بغور دیکھا
تھا۔

”میں تمہیں آج پہلی بار ہنسنے دیکھ رہا ہوں۔ جب
ہم ساتھ کام کیا کرتے تھے تب میں اکثر سوچا کرتا تھا، تم
اسے سنجیدہ لیول پر رہتے ہو؟ اتنی چھٹی عمر میں تم نے
خود پر اتنی سنجیدگی کیوں طاری کر رکھی ہے۔ تم ہنسنے“

کاموں میں ملا۔ ”کولس نے پھری کانٹے کی بندرت سے بڑا کھاتے ہوئے کہا۔

”پھر میرا مشورہ ہے، ”تم زندگی میں ایک بار دوا ضرور جاؤ۔ وہاں کا فوڈ بالی گاڑیس اور وہاں کی بہتری اور آرمیکس کے چارے اس شہر میں۔ تمہیں خود بخود ہی روتا سے محبت ہو جائے گی۔ تمہارا دل چاہے گا، تم یہاں بار بار آؤ۔“

وہ ایک گہری سوچ میں گم ہو کر بولا تھا۔ یوں جیسے وہ اس وقت یہاں پر تھا ہی نہیں، وہ بڑا کے روتا میں تھا وہ وہاں کی کسی کچی میں بچہ رہا تھا، اس کے ساتھ اس کا ہاتھ تھا۔

”سب خیر تو ہے، ناں سکندر، اتم روم کی کچھ زیادہ ہی تعریفیں کر رہے ہو۔ کہیں کسی رومن لڑکی سے محبت تو نہیں ہو چکی تھیں؟“ کولس نے مسکرا کر کہنے اسے اس کے خیالوں سے نکالا تھا۔ وہ زور سے ہنسا تھا۔

”نہیں، مجھی۔ میں نے سنا ہے جب کسی سے محبت ہوتی ہے دل میں بہت زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میرے دل میں تو اب تک کوئی گھنٹی نہیں بجی ہے۔“

”کولس اس کے پر مزاج انداز میں بولے جلاؤں پر اس کے ساتھ مل کر ہنس پڑا تھا۔ یوں بیٹھے ہوئے اس کا دل ایک گھٹن ہی رنجیدہ ہونے لگا تھا۔ اس کا دل اس ہونے لگا تھا۔

”جسے کھووا اسے یاد کر کے بھی کوئی مسکرا سکتا ہے؟“

اس کے دل نے اس سے شکوہ کیا۔

”ہاں کہی کی یاد اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے کہ اس کی یاد کے سارے بھی مسکرایا جاسکتا ہے خوش ہوا جاسکتا ہے۔ وہ کیوں نہ خوش ہو کر اسے یاد کرنے، وہ کیوں نہ اس کی باتیں دہرائے ہوا مسکرا سکے لیکن محمود اس کی زندگی کی سب سے خوب صورت سب سے قیمتی یاد ہے۔ وہ یاد جسے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے ساتھ ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے زندگی میں کبھی ملنا نہیں چاہتا مگر اس سے بھی بڑا کچھ ہے کہ

وہ اسے بھی بھولنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے، آخری بل، آخری سانس تک اسے یاد رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ یادیں بہت قیمتی ہیں بہت اہم ہیں۔ وہ ان یادوں کو اپنی سب سے قیمتی متاع جان کر ماری عمر بھر بھی اس کی باتیں دہراتے ہوئے گزرارہے گا۔

محمود خالد لاؤنج میں داخل ہوئے تو وہاں عائشہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ وہ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی اسے پتہ چلا تھا۔

”فرش ہو گئے آپ؟ چائے بنواؤں؟“

”بالکل بلاؤ چائے اگر خود مانو تو کیا ہی بات ہے۔ میں اب تک کاکٹوم کو فون کر رہی ہوں۔“

وہ عائشہ کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ پہلی شادی کی ناکامی کے بعد انہوں نے دو مہری شادی ماں کے اصرار پر مجبور ہو کر بہت ڈرتے ڈرتے کی تھی۔ مگر عائشہ کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرنے کے بعد انہیں فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود اپنے لیے ایک اچھی بیوی اور اپنی بچیوں کے لیے اچھی ماں بن چکی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی ماں نے ایک بہت سلیبی بیوی، نرم مزاج اور دقا شعار عورت بن کر اپنی زندگی کی ساری باتیں یاد کی ہیں۔ عائشہ کے ساتھ نے ان کی ابھی پھری زندگی کو سنبھال لیا تھا۔ عائشہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان سے محبت کے سبب ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی بہت عزیز رکھتی تھیں۔

مہینہ یہاں آئی تو عائشہ اس کی اور ہاشم کی تواضع میں کوئی کمی نہ چھوڑا کرتی تھیں۔ عید، تہوار اور دوسرے موقعوں پر وہ ہمیشہ کو پیش قیمت تھانک اس طرح بھجوا کر دیتی تھیں جیسے ہاشم بیٹیوں کے سرال بھجوا کرتی ہیں۔ وہ کاکٹوم سے بھی نزدیک ہونے کی کوشش کرتی تھیں مگر وہ باب کو اپنے نزدیک نہ آنے دیتی تھی تو سبکی ماں کو کتنا آنے دیتی؟

”آج کاکٹوم کی سالگرہ ہے۔“ عائشہ کی سوال۔

ان کے لئے میں ایک باپ بنے گا۔

اور توبہ موجود تھی مگر یہ شدت اور یہ تک پہنچ نہیں یاد رہی تھی۔

”توبہ کس پایا! آپ کو یاد رہی تھی؟“

اس کا جواب پھر وہی غیر جذباتی اور سیات تھا۔ اس اجرام تو ہمیشہ شامل ہوا کرتا تھا مگر محبت ہی انہی ہوتی تھی۔ اس نے ان کے لیے اپنے جذبات کو قربان ہونے سے روک لیا تھا۔ اس کا یہ سرد اور یہ سیات انہی زندگی کے پچھلے کئی برسوں سے سہمہ رہا تھا۔

وہ غلط نہیں تھی۔ کل جنبہ وہ چھوٹی تھی اس کی ضرورت تھی تب انہوں نے اس کو نظر انداز کیا تھا۔ ماں تو اپنی بیٹیوں کے لیے بری چچی ہی تھی باپ بھی اچھے نہ بن سکے تھے۔ پھر آج جب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں انہیں اس کی یاد ستاتی ہے تب وہ ان کے پاس

کیوں آئے؟ جو کل انہوں نے اسے برا تھا وہ آج وہی تو انہیں لوٹا رہی ہے۔ وہ پانچ سالوں سے اس سے نہیں ملے تھے اس لیے کہ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی۔ جسے چاہے اپنی زندگی گزارتی۔ وہ ان کے پاس مستقل رہنے کے لیے تو کیا ملنے کے لیے بھی پاکستان آئے تو کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ وہ اس سے ملنے انجان جاسکتے تھے مگر نہیں جاتے تھے کیونکہ ان کی بیٹی نہیں چاہتی تھی وہ اس سے ملنے آئیں۔

رٹائرمنٹ کے بعد جب وہ پاکستان واپس آ رہے تھے تب انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے مگر اسی نے اس سرز اور سیات سے انداز میں انہیں صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اب اپنے وطن اپنی مٹی سے مزید دور رہنا نہیں چاہتے تھے سو یہی کو لے کر پاکستان چلے آئے تھے۔ دل میں یہ شدید خواہش اور یہ امید رکھتے کہ ایک نیا ایک نیا کلثوم بھی ان کے پاس پاکستان آجائے گی۔

وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بہت سی جانب اپنا نشان دار کیر بران کی خاطر چھوڑ دے۔ اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ کلثوم ان کے پاس نہ آئے۔

”جی ہاں۔ جلدی سے فون لیں۔ میری

ایک سیات پر تھوڑے دوش کھینچے گا۔“

کلثوم کے سرد اور فاصلہ لیے انداز سے حفاظت ہو کر

عائشہ نے خود اس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی عائشہ کے ساتھ بد تمیزی نہیں کی تھی بالکل اسی طرح جسے اس نے بھی ان کے ساتھ بد تمیزی نہیں کی تھی۔ مگر اس کا سرد اور بے تاثر انداز ان کی طرح عائشہ کو بھی یہ یاد کرادیا کرتا تھا کہ وہ ان دونوں سے بات چیت نہیں کرنا چاہتی۔

اسی لیے عائشہ اس سے گفتگو میں ہمیشہ حفاظت رہی تھیں۔

”میں آپ کے لیے چاہے بنا کر لاتی ہوں۔“

وہ فون مانتے لگائے تھے۔ عائشہ ان کے پاس سے اٹھ کر بکن میں چلی گئی تھیں۔ انہوں نے کلثوم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ کل ل ل گئی تھی۔ کال ریسیو بھی کر لی گئی تھی۔

”السلام علیکم یا۔“ سیات سے انداز میں اس نے انہیں سلام کیا تھا۔ وہ عادی ہو چلے تھے اس انداز کے۔ سو گرجا شہی اور مسکراتے ہوئے کچھ میں بولے۔

”وٹیکم السلام۔ کیسی ہے میری آؤٹسٹ بیٹی؟“

”میں ٹھیک ہوں یا۔ آپ کیسے ہیں؟“

اس کے یہ چند مخصوص پہلے جو وہ ان سے فون پر

گفتگو کے دوران بولا کرتی تھی انہیں رٹ گئے تھے۔

کبھی تو اس سے ہٹ کر بھی کچھ بول دیا کرتا تھا۔

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

اپنی موجودگی کا احساس دلانا نہیں آتا تھا اور وہ اسے بے
خس باپ تھے کہ خود سے اس کی موجودگی کا انہوں نے
کبھی احساس ہی نہ کیا تھا۔

”عائشہ بھی نہیں سالگرہ کی بہت مبارکباد دے
رہی ہے بیٹا۔“ ایک گہری سانس لے کر وہ بولے تھے۔
”انہیں میرا شکریہ کہہ دینا۔“ وہ خود سے نہ ان
کی بات کاٹ کر یہ کہتی تھی کہ اسے کہیں کام سے جانا
ہے نہ خون بند کرنے کے لیے کوئی اور جواز تلاش کرنی
تھی مگر اس کا گفتگو کا سیٹ انداز تو اب اسٹوڈنٹ ہو گیا تھا
کہ چند منٹوں بعد ہی وہ بارمان جایا کرتے تھے۔ جو وہ
پوچھ رہے ہیں وہ مختصر جواب دے رہی ہے اور پھر
چپ ہو جاتی ہے۔ گویا وہ اس گفتگو کے ختم ہو جانے کا
تمذیب اور اخلاق کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔

”تمہاری ایگریجیشن میں کم دن وہ گئے ہوں گے
اب؟“

”جی ہاں۔“ تھر سڈے کو شو کا پہلا دن ہے۔ میں
ٹیوڈے کو فلورنس چلی جاؤں گی۔“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا! میری تمام دعاؤں
تمہارے ساتھ ہیں۔ میری بیٹی کامیاب ہوگی تو میں
سمجھوں گا۔ میں کامیاب ہو گیا اور تمہارے ساتھ میں
بھی کامیاب ہو تو رہا ہوں۔ جہاں جہاں لیزا ہوتی
ہے وہاں وہاں اس کے ساتھ محمود بھی تو ہوتا ہے۔
جب بھی کہیں کسی میگزین میں با انٹرویو پر تمہارا نام
دکھتا ہوں تو ایک سرخوشی سی طاری ہوتی ہے لیزا محمود
پڑھ کر۔“

”اس نے ان کے رکھے نام کو ترک کر کے اپنی ماں کا
اپنے لیے رکھا نام اپنے لیے یہ سو سال کی عمر میں لندن جا
کر اختیار کر لیا تھا۔ بغیر ان سے اجازت لیے۔ وہ بہت
براہم ہوئے تھے بہت خفا ہوئے تھے مگر وہ اسے روک
نہیں پائے تھے کہ اس آزاد معاشرے اور مغربی
سرمزمن کو جہاں اولاد خود مختار ہوتی ہے۔ ان کی سیٹیوں
بے اپنے لیے منتخب نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ان کے
لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔“

آج اس کی سالگرہ کے دن محض آٹھ خوش کرنے

اپنا گھر مان لے۔ دوسری مستقل نہ رہے مگر چھپوں
میں تو یہاں آ جا کر اسے بالکل ایسی طرح جیسے لوگ
چھٹیوں میں اپنے گھر جایا کرتے ہیں۔

ان کی یہ بیٹی بہت حساس بہت ہانک تھی۔ وہ ان
سے بہت خفا تھی۔ اتنی خفا کہ انہیں یہ حق دینے کو بھی
تیار نہ تھی کہ وہ اسے مناسکیں اس کی سب شکایتیں
دور کر سکیں اسے گلے سے لگا کر پیار کر سکیں اس سے
معافی مانگ سکیں اپنی سب زیادتیوں کی۔ اسے یہ جتا
سکیں کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس کی زندگی
کے تیرہ سالوں تک انہوں نے اسے اس طرح نظر
انداز کیا تھا کہ آج خواہش رکھنے پر بھی ان تیرہ سالوں
کے فاصلوں کو منسا نہیں سکتے تھے۔

دوبارہ اسے لڑائی جھگڑوں نے انہیں اتار تلخ اور اپنے
گھر سے اتار دور کر دیا تھا کہ انہیں یہ تک یاد نہ رہا تھا کہ
وہ صرف گھر اور وی کو نہیں اپنی بیٹیوں کو بھی نظر انداز
کر رہے ہیں۔ خاص طور پر کلثوم کو۔ جو زیادتیوں
انہوں نے اپنی اس بیٹی کے ساتھ اس کے بچپن میں کی
تھیں وہ آج انہیں رلاتی تھیں۔ وہ ان کا انزال کرنا
چاہتے تھے مگر کس طرح؟ وہ انہیں اپنے قریب آنے
ہی نہیں دیتی۔

اس کی نسبت مریم کے ساتھ بچپن میں انہوں نے
کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ ایک تو انہیں خود ہی مریم سے
پیار زیادہ تھا۔ وہ جتنی جو انہیں کی طرح تھی جبکہ کلثوم
گئے نقوش جو نکلے اپنی اٹالوی ماں جیسے تھے تو انہیں خود
بخود ہی اس میں دوڑا نظر آئے لگتی تھیں۔ وہ اسے نظر
انداز کر دیا کرتے تھے۔ دوسرے مریم کو ان کی توجہ اور
یار حاصل کرنا آتا تھا۔ وہ دفتر سے گھر آتے تو مریم ان
کے گھر آتے ہی ان کے کمرے میں گھس آتی ان کے
کندھے پر ٹپک جاتی، غنڈیں اور قربانیتیں کرتی۔ اپنی
ذہانت اور خود اعتمادی سے ان کا دل مہلایا کرتی جبکہ ان
کی وہ کم بولنے والی اور بہت چھپکنے والی چھوٹی بیٹی دوڑ
دور سے انہیں دیکھتی رہتی۔

وہ مریم کی طرح اعتماد سے ان کے کندھے پر چھو
نہ پاتی تھی غنڈیں نہ کپاتی تھی۔ اسے مریم کی طرح

تھے۔

”کبھی نہ کبھی اسے آپ ہی پر
آئے گا محو۔ لہذا دل کی بہت اچھی
خلاف دل ہے جس کا۔ وہ بیش آپ
رو سکے گی۔“ عائشہ نے نرم لہجے میں اس کی بات
تھا، آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر
کے دل کو دیر بھر چاہا تھا۔

”ہاں۔ بہت سادہ اور شفاف دل ہے میری اس بچی
کا۔ اسی لیے ڈرتا ہوں عائشہ! اسی لیے بہت ازار
ہوتا ہے۔“

انہوں نے قرب سے لب پہنچے تھے۔ جو وہ اس بار
سوچ رہے تھے وہ بچی نے شیر نہیں کر سکتے تھے وہ وہ
بات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ مگر وہ بات
انہیں ڈراتی بہت تھی۔ کاش ان کے سب پر غلام
ثابت ہو جائیں، ان کی اس چاری میٹھی کی زندگی میں
سب کچھ بہت اچھا ہو جائے۔ ان کی ضد میں وہ خود کو
مزید کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

باشم میرس نے کھڑا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔
مریم ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔ وہ کئی بار اسے کال
کر چکا تھا۔ وہ اس کا فون پیک نہیں کر رہی تھی۔ کراچی
کے حالات اکیلی لڑکی کے لیے اتنے بھی اچھے نہ تھے کہ
راست گئے تک گھر سے باہر وقت گزار دیا جائے۔ اس
نے چونک کر گویٹ کھولتے دیکھا تو اس کی جان میں
جان آئی۔

مریم کو گاڑی اندر لاتے دیکھ کر جہاں اس نے سکون
کا سانس لیا وہیں اتنی رات گئے تک اس کی گھر سے غیر
موجودگی پر اس کا غصہ بھی پھر عود آیا۔ کالی دیر سے مریم
کی فکر اور پریشانی میں وہ اپنے غصے کو بھول گیا تھا۔ اب
جب وہ بحفاظت گھر پہنچی تھی تب اس کا سو خراب
ہوا۔

وہ میرس سے اپنے کمرے میں آیا۔ چند ہی
میں کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مریم اندر داخل

کے لیے وہ اسے یہ بتا رہے تھے کہ اس کے عبرانی نام
سے جو اس نے ان کی ضد میں اختیار کر رکھا ہے
انہیں پیار ہے اور سچ بھی یہی تھا۔ وہ لیزا تھی یا کثوم
انہیں بہت پیاری تھی، ساری دنیا میں سب سے
پیاری۔ انہوں نے کس دعا میں سوچے ہوئے فون بند
کیا تھا۔ وہ اب جب چپ اور بہت کم اس کی باتیں تھے۔
”ہو گئی بات؟“ عائشہ چاہتے تھے کہ اسے آتی تھیں۔
”ہاں۔“ انہوں نے دکھ سے بھری دیکھ ٹھنڈی
سانس لی۔

”کیا ہوا محمود! سب خیر تو ہے ناں؟“
”ہاں سب خیر تو ہے۔“ عائشہ کے ہاتھ سے
چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ دکھ بھرے انداز میں
سکرائے۔

”کیا کوئی بات ہو گئی لیزا کے ساتھ؟ کچھ کہہ رہی
تھی کیا؟“ وہ خود کو جس نام سے بلایا جاتا پسند کیا کرتی
تھی عائشہ نے بھی اسے شروع سے اسی نام سے ہی
مخاطب کیا تھا۔ وہ باادبہ مسائل کھڑے کرنے والی
عورت نہ تھیں۔

وہ لندن میں جب بھی اس بات پر دیکھی ہوتے تھے
کہ ان کی بیٹی نے ان کے رکھے نام کو ترک کر کے ماں
کے رکھے نام کو اختیار کر لیا ہے تب عائشہ انہیں
سمجھایا کرتی تھیں کہ وہ خود کو جس نام سے کھلوایا جانا
پسند کرتی ہے اسے حق حاصل ہے اس نام سے خود کو
کھلوانے کا اور ویسے بھی لیزا نام مسلمانوں میں بھی
ہوتا ہے کوئی فرق نہیں پڑا کہ لیزا کا یہ نام اس کی
اخلاقی اور کریمین ماں نے رکھا تھا۔

”وہ کچھ کتنی ہی تو نہیں ہے عائشہ! سارا کوکہ ہی اس
بات کا ہے۔ وہ کچھ کتنی نہیں ہے۔“ وہ اداسی سے
بولے تھے۔ ”وہ خود کو مجھ سے اتنا دور لے چکی ہے کہ
اب میں لاکھ چاہوں گے اسے اپنے نزدیک نہیں کر پاؤں۔
وہ مجھ سے ایک بار جھگڑا ہی کر کے میری زیادتیاں ہی
مجھے گوارا دے۔ اس کا یہ سرد اور غیر جذباتی انداز دل کو
بہت تکلیف دیتا ہے عائشہ!“
وہ دکھ سے بھرے لیے میں بیٹے بی بی سے بول رہے

میں نے کئی کتابیں پڑھیں اور میں نے سوچا کہ اگر
ہر ایک میں انسانی افعال کی مثالیں دیں تو یہ کیا ہوگا؟
dominate اور subordinate کے مقابلے میں
صاحب کو اس سے متکین ملتی ہے اور اس کا
dominance کو قبول کریں۔

مہریم نے سینڈل لڑنا مگروالے فرش پر زور سے پٹے
ٹھکے دو غصے میں جواں سے فوراً ایسا کھینکھی۔

”میرا یہ مطلب تو نہیں تھا مریم! بس میں تمہارے لیے فکر مند ہو رہا تھا۔“ اسے خفا ہوتا دیکھ کر نورؔ

وفا حتیٰ انداز میں بولا تھا مگر مریم اس کی بات ان سنی کر کے لباس تبدیل کرنے اور رنگ رو میں چلی گئی تھی۔

و جب چاہو کر بیٹھ کر آکر لیٹ لیا تھا وہ
 ضدی شخص وہ غصے کی چیز تھی مگر وہ اس سے بہت محبت

کرتا تھا۔ اسے ناراض کرنے کا وہ قصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سے چھوٹی بھی تو بہت ہے۔ کیا اس کی

عمر میں دو صدی اور غصے کا تیز نہیں تھا؟
میرم کی بدتمیزی پر تھوڑی دیر کے لیے ہی کبیرہ

اس سے پہلے کہ اس کے دل نے اس سے پوچھا۔ وہ
اس سے بھی زمانہ خمدی اور غم نے کا تیر تھا۔ اس نے خود

جی۔ اس کی بے تحاشا حسین اور لم عمر یوی جس سے
اے عشق تھا۔ جس کے عشق میں جسے اپنا بنانے کی
جاد میں اس نے اپنے یوی بچوں تک کی پروانہ کی
تھی۔

اب تک جانے ہوئے؟ سوئے نہیں؟ حضرت
سے کہتے کہ وہ انارمنی صوفیہ مراعاتی بیڈریٹ

”تم کہاں تھیں؟ وہ وقت ہے تمہارے گھر

”اے کائنات! میں نے تجھے پیدا کیا ہے۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ اس نے کہا۔
 ”تو نے کہا؟“ اس نے خنجر اٹھا رکھی سے اس نے کہا۔
 ”واٹ تو بولیں؟ کہاں؟“ اس نے کہا۔

جایا تھا۔ کچھ مجھے ایک حیرتی شے مل گئی تھی۔

”رات کے ”عج تک“؟“ ناشر رہے، سے ہوا۔

”ہاں تو شور ویر سے شروع ہوا میں کیا کرتی۔ کوئی تفریح نہیں کر رہا تھا۔ اس زمانہ میں کاسار ایسے

کیفیر کے مرض میں مبتلا غریب بچوں کو ڈیوٹیٹ کیا

ایک سوشل ورکر ہے۔ سوشائٹی کے جو depeived

ہے۔

تاراضی سے دیکھ راسی تھی۔

تھی مجھے پتا ہو چاہیے تھا۔ اس طرح کے پردہ کرنا
میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے ہاتھ کے پوہ لپٹا
ہاتھ رکھ کر اسے منانے والے انداز میں بولا۔

”نوں دیکھی تھی تم نے اپنی؟“ مریم نے ناراضی
سے اسے دیکھا۔

”احسانا یار! اسم سوری۔ معافی مانگتا رہا ہوں۔
عظمتی ہو گئی مجھ سے۔“

”نہاری زندگی مجھ سے اس طرح کسی نے تیز آواز
میں بات نہیں کی ہے باشم! مجھے اونچی نواز میں بات

سننے کی عادت نہیں ہے۔ تمہارے گل کے بی بیویر
سے میں دست ہٹ ہوتی ہوں۔“

”اسم سوری یار۔ پلیز غصہ ختم کرو۔ چلو دیکھ لیندہ کا
کوئی پروگرام رکھ لیتے ہیں۔“

وہ بڑے دل سے اسے منارہا تھا۔ یہ ناز یہ خیرے
اس پر تھے تھے اور وہ اس کے ناز پر خیرے اٹھانے میں

بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔
”کیسا پروگرام؟“ شکر تھا، بڑی دیر کے بعد وہ ہلکا سا

مسکرائی تھی۔
”وہی چلتے ہیں۔ میں اس دیکھ لیندہ اپنی جیتی مسز

کو دینی میں دل، بھر کر شاپنگ کرانا چاہتا ہوں۔“
”بس وہ دن کے لیے جاؤں گے باشم! منڈے کو

میری بہت اسپورنٹ مشنگ ہے۔ ایک نیا اسکول
کھول رہے ہیں ہم لوگ کراچی کی ایک کچی آبادی

میں۔ اس سلسلے میں سب ڈیپنڈنٹ طے کی جاتی ہیں۔“
وہ جانے کے لیے بھی تھوڑا غراؤ کھانسی تیار ہوئی

تھی۔ وہ مسکرا کر سرشات میں باہر اڑا تھا۔ اس کا ارادہ
تھا وہ وہی میں مریم کو اپنی منگی شاپنگ کرائے گا کہ اس

کا دل خوش ہو جائے گا۔ جس چیز پر وہ ہاتھ رکھے گی وہ
اسے دلائے گا۔



”واوی جان یہ توں ہیں؟“

علی اپنی شیشی نو تو قلمی زبان میں اموجان تہا۔
رہا تھا۔ وہ اس کے بال باب کو واوی جان اور لاہور

لے کسی بھی چیز میں کوئی نہیں رکھتا تھا۔

اس کی شدید خواہش تھی کہ مریم اس کے بچے کی
پاس بٹف وڈ پٹا ہو یا پٹی اسے کوئی فریق میں پڑا تھا۔

بس وہ مریم کے جیسا ہو۔ اس کی اور مریم کی اولاد اسے
سوچ کر ہی اتنی خوشی ملتی تھی اس بات کو۔ مگر مریم ابھی

اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کبھی تھی ابھی وہ اس
چہنچھٹ میں پڑا نہیں چاہتی۔ بچے کے بعد اس کا

فکرو خراب ہو جائے گا۔ اس کی لائف ڈسٹرپ ہو
جائے گی۔

جب وہ زیادہ اصرار کرتا تو وہ کہتی ہے کس بات کی
فکر ہے۔ اس کے پاس تو پہلے ہی تین تین بچے ہیں

جن کا وہ باقاعدگی سے خرچا بھی ان کی ماں کو بھیجا کرتا
ہے۔ آخر ایک اور بچے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ

اس ضدی لڑکی کو کیسے سمجھاتا وہ بچہ ان کا ہو گا۔ اس کا
اور مریم کا ہو گا۔ اس بچے کی بات ہی الگ ہوگی۔

آخری بار ان کی بچے کے موضوع پر بات ہوئی تو
مریم نے کہا تھا وہ تین سال بعد سوچے گی اس بارے

میں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ کوئی اس کی عمر نہیں
گزری جا رہی جو آنا فنا وہ اس بچے کا فیصلہ کر لے

یہ سوچ کر کہ اس کے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ چلو
تین سالوں ہی کی تو بات ہے اس نے خود کو مزید تین

سال انتظار کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔
☆ ☆ ☆

اس کی توقع کے مطابق صبح مریم اس سے خفا تھی۔
وہ ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ موجود ضرور تھی مگر اس

سے بات بالکل بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ کسے نظر
انداز دے جس کے بھونٹ لپٹی ہوئی اخبار کی ویڈیو لاسنر

دیکھ رہی تھی۔
”اب یہ ڈانڈنگ اس بھی کرو مریم کچھ نہیں ہوا

ہے تمہارے فکرو۔ اپنی حسین اور اسارٹ میری
بیوی کو کسی ڈانڈنگ ڈانڈنگ کی کوئی ضرورت نہیں

ہے۔
”یار! اب غصہ ختم بھی کرو۔ اس کے میری عظمتی



قصص کی یاد میں بیمار بڑی سی بیمار لڑکی کی ہوا۔
 بہت سمجھنے لگا تھا۔ اس نے اپنی ہر بات پر غور کیا۔
 سے وہ جانتا تھا۔ اگرچہ یہ توں کا بڑا دوست تھا۔
 تہائی میں کی جاتی تھیں مگر اس کے اوپر بیمار لڑکی
 علم میں تھیں۔

اس کی بیمار ماں اگر اس شخص سے ملنے کی ہوا تو
 اظہار کرتی سب بھی وہاں کی مٹا کو حق بجانب سمجھتا۔
 جب سے وہ بیمار بڑی تھیں شہر مار خان نے اپنے دوست
 اور بے چنگ انداز کو تھوڑا سا تبدیلی کر لیا تھا۔ وہ کیا وہ
 تودہ تو اس شخص سے زندگی کے آخری لمحے تک
 نفرت کر رہا ہے۔ وہ دعا کرے گا کبھی اس کی شکل
 دیکھنے کی ادب نہ آئے مگر اس کی ماں اگر اس شخص
 سے بات کرنا اور ملنا چاہتی تھی تو یہ اس کا حق تھا۔
 ”لو کی جان لیو توں ہیں؟“ اس کا ذہن بیٹا تصویر
 میں موجود جوتے فرسکے بارے میں جانا چاہتا تھا۔ اس
 نے نظریں علی ”ابو جان اور اپنے باپ سے ہٹا کر لیوی
 کی جانب کر لی تھیں یوں جیسے نہ تو اس نے کچھ سنا تھا
 اور نہ کچھ دیکھا تھا۔

”یہ تمہارے بابا کے بھائی ہیں علی“

امروا جان نے آہستہ آہستہ سے کہا تھا۔ اس کی مٹھیاں
 بھیج بھی تھیں بھائی کے لفظ پر۔ وہ بیمار ماں اور اپنے
 بہت معصوم اور چھوٹے سے بیٹے کا خیال کر کے چپ
 تھا۔

”بابا کے بھائی۔۔۔ زادی جان ان کا نام؟“ اس نے لیوی
 کی آواز تیز کر دی تھی۔ وہ خود کو مکمل طور پر لیوی
 میں گم کر رہا تھا۔

”ان کا نام سکندر ہے۔“ اس کے کانوں میں ماں کی
 بھرائی ہوئی آواز آئی۔ انہوں نے الیم کا صفحہ جلدی سے
 پوچھ لیا تھا جیسے علی کے مزید کسی بھی پچکانہ سوال کی
 تکمیل نہیں ہو سکتی تھیں۔

”علی! اچلو تمہارے سونے کا نام پوچھا ہے۔“
 فوریہ بڑی سمجھ دار لڑکی تھی۔ علی کی ہر بات پر
 اس کی ہر بات پر اس نے اسے وہاں سے اٹھا لیا تھا۔
 ”اما! اچھی نہیں ہیں۔“ علی نے منہ سے کہا۔

بڑے چلتے لمبے میں بولا کہ اتنا مڑا اچھا نہ بھی ہو تو بھی
 خود بخود ہی مسکرا کر لبوں پر آجائے۔ مگر اس میں وہ
 الیم میں جس تصویر کے اوپر ہاتھ رکھ کر یہ بات بوجھ رہا
 تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بیٹے کی مٹھی آواز سن کر بھی مسکرائے
 سکا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ تمام افراد لاؤنج میں
 ساتھ بیٹھے تھے۔

فوریہ سب کے لیے کافی بنا کر لے آئی تھی۔ لیوی
 بھی چل رہا تھا۔ شہر مار خان کی آواز میں کرٹ افیروز کا
 کوئی پردہ گرام دیکھ رہے تھے۔ بے تحاشا شرارتی اور
 اوپر کو حریف چیزوں میں گھسنے کا شوقین علی بچانے
 کہاں سے ایک پرالی الیم اٹھایا تھا۔

”واوا جان! آپ بھی دیکھیں۔“ علی نے لیوی
 دیکھتے واوا کو متوجہ کیا۔ اپنے وقت کے بڑے رعب و
 دیدے والے اس کے پیچھے غلی کی کوئی بات نہیں ٹالا
 کرتے تھے۔

وہ زمین شہر مار خاں سے کبھی اپنی کوئی ضد نہ منوا
 رہا تھا۔ اسے بیٹے کو منوا تو کچھ کر مسکرایا کرتا تھا۔

”دکھاؤ مجھے علی کون سی پچھڑ ہیں۔“ فوریہ ”متوجہ
 ہوئے۔“

”یہ ولی۔“ علی نے تصویروں پر انگلی رکھ کر بتایا۔
 شہر مار خان مسکرا رہے تھے۔ ابو جان علی کے سوالوں
 کے جواب دے رہی تھیں۔ وہ پوچھتا جا رہا تھا یہ کون
 ہے اور وہ کون ہے۔

”یہ تمہارے واوا جان ہیں۔ یہ میں ہوں۔ یہ
 تمہارے بابا ہیں اور یہ۔“

وہ تصویر میں موجود اگلے فرد کا تعارف نہیں کر پائی
 تھیں۔ یہ اس کے بچپن کے دنوں کی ایک گروپ فوٹو
 تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اس کو دیکھا۔ ان کی آواز
 رنڈہ جی تھی۔ وہ ایک دم ہی بالکل چپ ہو گئی تھیں۔
 اس نے ہنس پر سے فوراً ہی نظریں ہٹا لی تھیں۔

ماں ”ان ہوتی“ د اس کی بھی ماں تھی اور اس شخص کی
 بھی۔ جس طرح اس شخص کے لیے بھی وہ اپنا دل
 نہیں بندل سکتا اسے معاف نہیں کر سکتا ایسے ہی اس
 کی ماں بھی اپنا دل نہیں بندل سکتی۔ جب سے ماں اس

اموجان کے پاس لٹا کر آئی ہوں۔ نیند گہری ہو جائے تو یہاں لے آؤں گی۔“

اس نے سرانبات میں ہلایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس چیز سے ڈسٹرب ہوا ہے، اس لیے اس کی غیر معمولی خاموشی کی وجہ سے نہیں پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو بغور دیکھنے لگی۔

”آپ کے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں زمین؟“
”اچھا۔“ وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ ”میں تو میں پورا کا پورا ہی بہت خوب صورت لگتا ہوں۔“ وہ غلط فہمی سے والے انداز میں بولا تھا۔

نورہ ساڑھے تین سال قبل اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ شہیار خان کے ایک دوست کی بیٹی تھی مگر اس کا انتخاب اموجان نے کیا تھا اور اس کی شادی کے لیے اصرار اموجان اور شہیار خان دونوں ہی نے کیا تھا۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ اس کی شادی ہو جائے تاکہ ان کے گھر کا سنا ٹاور دور ہو سکے۔

شادی کبھی نہ کبھی تو کبھی ہی تھی تو اس کی خواہش پر کیوں نہیں، ماں کی پسند سے کیوں نہیں؟ اس نے اپنے لیے لڑکی کا انتخاب اموجان پر چھوڑ دیا تھا۔

نورہ اموجان کی پسند تھی اور انہوں نے خفیہ میں اس کے لیے ایک بہت ہی اچھی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ٹھنڈی سے گندھی، نرم خور اور سب کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ نورہ اور پھر علی کے آجانے کے بعد ان کے گھر کا سنا ٹاور ٹھیک رہا تھا۔ یہاں پھر سے رونق آگئی تھی۔

نورہ اس کے لیے بہت اچھی ہوئی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے والدین کے لیے بہت اچھی ہو اور اس کے بیٹے کی بہت اچھی ماں۔ سارے سال قبل اس گھر کے میں کیا طوفان آیا تھا ایسی کون سی آمد ہی آئی تھی جو اپنے ساتھ صحت کچھ بھرا کر لے گئی تھی۔ نورہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ اور اس نے کبھی بتایا نہیں تھا۔

وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس گھر میں سکندر شہیار کا

”بچے ویر تک نہیں جا رہے علی! چلو شایاں ابھی ہمیں بہت اچھی اسٹوری بھی تو سننی ہے۔“
وہ علی کو گود میں اٹھا کر اس سے سونے سے پہلے اور سو کر اٹھنے کے بعد کیا کریں گے والے اس کی پسند کے وعدے کرتی اسے وہاں سے لے جا رہی تھی۔ ماں کے خیال سے وہ غلط کر رہا تھا مگر نورہ نے اس کی فیملی کو سمجھ لیا تھا اور وہ علی کو ہی وہاں سے لے گئی تھی۔

اس نے قصداً ”نظر میں لی وی پر رکھیں۔ سناں کی طرف دیکھنا۔ باپ کی طرف۔ وہ وہاں مزید چند منٹ بیٹھا چاہتا تھا تاکہ اس کے ایک دم اٹھ جانے پر اس کا دل رنجیدہ نہ ہو۔ اس شخص سے نفرت اپنی جگہ مگر ماں کا دل دکھایا جانا ضروری تو تھا۔ بغیر ماں باپ کی طرف دیکھے بھی وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی ماں اپنے آنسو ہی رہی ہوگی اور شہیار خان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر ہو گیا، ایسا کہ ان کے اندر کی کوئی ایک بھی سوچ چھپ رہی نہ جاسکے۔

یہاں اس کے گھر میں صرف شہیار خان ہی ایسے نہ تھے جو اپنی سوچیں اور اپنے جذبات اپنے ہی تک رکھتے تھے بلکہ آمنہ شہیار خان اور وہ خود بھی تو ایسا ہی کرتے تھے۔ اس شخص کے ان کی زندگیوں سے نکلنے کے بعد سے ان باپ کے تین افراد کے مابین بھی ایک دیوار اور ایک کبھی نہ مٹنے والی تلخ جید ہو گئی تھی۔

وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی الگ دنیاؤں میں رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بے دل کا حال چھپائے ہوئے، ایک دوسرے سے اپنے غم چھپائے ہوئے۔

وہ بیڑ پر لیٹا سوئے کی کوشش کر رہا تھا۔ نورہ بیڑ پر اس کے برابر آکر لیٹی تھی۔

”علی سو گیا؟“
”ہاں۔“ وہ جواباً ”مسکرائی تھی۔“

”خدا کر رہا تھا آج رات ہی جان کے پاس سوؤں گا۔“

یاد رہتا ہے آپ نے آخری بار تھا۔
پیداؤں کے دان بولا تھا۔
وہ شرارتی سے انداز میں بولی۔

پڑا۔

”وہ حال سال گزر گئے یہ تو بہت بڑی دیر ہو گئی۔
خیر طرف سے آگے تو مسرور ہیں۔
آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اکی لویہ۔“

یہ اس کی طرف جھٹک کر بولا وہ اس کے لیے بہت
اہم تھی اس کے لیے یہ بھی تھی۔ وہ اس کی بہت برا
کر رہا تھا۔ وہ پورا کالورا فورہ کا تھا۔ سو فیصد اس کے
ساتھ مخلص، وفادار مگر اسے دل پر اس کی گرفت نہ
تھی۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں آج بھی وہی
لڑکی بسی تھی۔ جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔
جس نے اسے محبت کیا ہوتی ہے۔ بڑا تھا۔

وہ ام مہم بن گیا تھا۔ آج کہاں ہوگی۔ کیسی ہوگی۔
اس نے سزا دی کی ہوگی یا نہیں وہ خوش ہوگی اپنی زندگی
میں کہ نہیں؟ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے یاد بھی
نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا مگر
بارہ سال بعد بھی وہ اسے بھلا نہیں سکتا تھا۔ کبھی محبت تو
زندگی میں ایک بار ہوتی ہے، صرف ایک بار۔ وہ جہاں
کہیں بھی تھی، جیسے بھی زندگی گزار رہی تھی مگر اسے
یقین تھا وہ اسے بھول نہیں پائی ہوگی، وہ اسے یاد کرتی
ہوگی۔ جس طرح اس کے دل سے اس کی محبت نہیں
نکل سکی، اس طرح اس کے دل سے بھی اس کی محبت
نکل نہیں سکی ہوگی۔



وہ ایک کلائنٹ کے ساتھ لڑکے کے باہر نکلا تھا۔
افیشل نوعیت کے اس لڑکے میں پروفیشنل جھگڑائی رہی
تھی۔ کلائنٹ نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کر کے دو
اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کئی طرح کے دفتری
کاموں میں اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ابھی اسے
ہی اسے ایک سینک اینڈ کرنی تھی۔ پھر اپنی سیکرٹری
سے ایک اہم کانٹریکٹ ٹاپ کرنا تھا۔ ایک اہم

نام نہیں لیا جاتا اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ سو ایک اچھی
بڑی اور بڑے ہونے کے ناتے وہ اس پابندی کا احترام
کرتی تھی۔

بہت حسین، محبت کرنے والی، دانشور، بڑی بہار
سا جیٹا کامیاب کیریئر اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو
ایک کامیاب اور زندگی سے خوش شخص کے پاس ہونا
چاہیے۔ بطور لاز اس کا کیریئر شاندار تھا۔ اس کی لاء
فرم اپنی بہت اونچی ریویشن بن چکی تھی اور پاکستان کی
 نمایاں فرمز میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی فرم کے
کرایجی کے ساتھ ساتھ اسلام آباد اور کراچی میں
بھی دفاتر تھے۔ یو کے اور چائنا میں بھی اس کی فرم کی
نمایاں فرمز کے ساتھ مل کر تھیں اہم کیسز پر کام کر رہی
تھی۔ شہر دار خان ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے خاندانی
برزس کو سنبھال رہے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ
کاہرہ میں شال ہونے کے بجائے اپنی لاء فرم
اسٹیبلس کی تھی۔ شہر دار خان اور امویان اس سے
بہت ہی امریکہ سے پاکستان واپس آ گئے تھے۔ وہ اپنی لاء
کی ڈگری مکمل کر گئے ان کے پاس پاکستان چلا آیا تھا۔
جہاں اس کے ابا باپ رہنا چاہتے تھے وہ بھی وہیں
رہنا چاہتا تھا۔

ساری زندگی امریکہ میں گزارنے کے باوجود امریکہ
اس کے لیے اہم نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ دم جگہ
نہیں جہاں اس کے ابا باپ رہنا چاہتے تھے۔ وہ ایک
کامیاب انسان تھا، اسے زندگی سے خوش ہونا چاہیے
تھا مگر نجانے وہ پورے دل سے خوش کیوں نہیں ہو پاتا
تھا۔

”آپ کو بھی میں خوب صورت لگتی ہوں یا نہیں
لگتی؟“ تو وہ اسے خیالوں سے کھینچ کر لایا۔ اس کا ہاتھ
ابھی بھی فورہ کے ہاتھ میں تھا۔
”تم مجھے بہت خوب صورت لگتی ہو۔ لگتی کیا ہو تم
ہوئی، بہت خوب صورت۔“

”بہت دنوں کے بعد میری تعریف کر رہے ہیں تو یہ
بھی کہہ دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کالی
عرصہ ہو گیا آپ کو یہ بات کہنے ہوئے۔ جہاں تک مجھے

اس کی غلط فہمی سمجھ گئی ہو۔

وہ لے کر گیا تھا اس کے پاس سے ہٹ آیا تھا۔ وہ یورپین تھی، شاید اسپیشل یا بحریہ اسپیشل اسٹیشنڈ انداز میں تیار تھی اس کے شانوں تک آتے سنگی بال سرخی مائل براؤن کمر کے ہی تھے۔ وہ سرخی مائل براؤن بالوں کو دیکھ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا کیا ہر یورپین لڑکی جس کے سنگی بالی شانوں تک آتے ہوں گے، سرخی مائل براؤن کمر کے ہوں گے وہ اس کے پیچھے یونہی وہ ڈانڈا لپٹے گا؟

اپنی حماقت پر اسے غصے آیا تھا یہ ایک انتہائی احمقانہ اور بھگانہ حرکت تھی۔ وہ شائنگ مال سے واپس نکل آیا تھا۔ گھر وہ لیزا کیوں نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

”جاؤ سینور سنڈرز۔“ اس کے نزدیک سے آواز آئی۔ وہ اختیار گھوا۔

”لیزا۔“ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پچھلے کافی مارے دونوں سے اس کی باتوں اور اس کی یادوں کے ساتھ بہت خوش تھا مگر آج اس، سرخی مائل براؤن بالوں والی یورپین لڑکی کو دیکھ کر وہ بہت بے چین اور بے قرار ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی لیزا کیوں نہیں تھی؟ وہ کوئی اور کیوں تھی؟ وہ لیزا بھی تو ہو سکتی تھی۔

جب لیزا محمود روم لندن، ٹکڑوں پر جگہ گھوم پھر نکلتی تھی۔ تو وہ بھی تو آسکتی تھی۔

وہ لیزا کیوں نہیں تھی؟ لیزا محمود روم کیوں نہیں آئی تھی؟

کمپنی کے ان کی کمپنی کے ساتھ Merger کا معاہدہ تھا جسے وہ ڈرائنگ کمر کے اپنی میز پر چھوڑ آیا تھا۔ ان تمام اسٹیشنڈ باتوں کو سوچتے ہوئے وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا جب اس کے نزدیک سے سرخی مائل براؤن بالوں والی ایک لڑکی گزری۔

”لیزا۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے مدھم آواز میں نکلا تھا۔ لڑکی اس کے نزدیک سے بہت تیزی سے گزرتی ہوئی گئی تھی وہ ٹھیک سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ گھر وہ لیزا ہی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ لیزا تھی۔ اس کے بال سرخی مائل براؤن تھے، سنگی تھے وہ لیزا تھی۔ وہ وہاں کیا کر رہی ہے؟ یہ وہ بعد میں اس سے پوچھنے کا میلہ اس سے مل لوے۔

”لیزا!“ اس نے اسے پکارا مگر جب تک وہ لڑکی بہت تیزی سے اس کے سامنے نظر آئے شائنگ مال میں داخل ہو چکی تھی اس نے اس کی پکار نہیں سنی تھی۔

وہ بے ساختہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ شائنگ مال کے اندر داخل ہوا تو بلیک ٹکڑی گھیر کر ریڈ کمر کے اسٹیشنڈ ٹاپ کے ساتھ ہنسنے والے ایک سیٹ پر اوپر جاتی نظر آئی۔ اتنی دور سے چلا کر آواز دیا مناسب نہیں تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا ایک سیٹ پر بڑھا تھا وہ مال کی پہلی منزل پر اتر آؤ وہ اسے سامنے ایک زنانہ لمبوسا کی شاپ میں داخل ہوئی نظر آئی۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار انتہائی تیز کر دی تھی۔

”ہائے لیزا!“ وہ نیل پالش سے سینے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے پیچھے میں نیگے مختلف لمبوسا کو آگے پیچھے کر کے دیکھ رہی تھی جب اس کے قریب پہنچ کر وہ بولا۔ لڑکی نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ وہ انگریزی میں بولی۔ اس پر شدید ترین ایوٹی اور پھر شرمندگی کا حملہ ہوا وہ تو کوئی اور تھی۔

”آتم سواری۔“ میں کمپ کو کوئی اور سمجھا تھا۔ آتم ایک مشہور ملی سواری۔

”اس اوکے“ ”غلاف“ ”اگسا مسکرائی تھی جیسے

باتی ایڈو شائینگ

باقی ہے یہ ایک۔ مقرر ہے۔ وہ جس ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی خدمت میں۔ جب بعد ازاں کوئی ہے اور اس کو بیٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر پرانکار کر رہا ہے۔

میں نے دیکھی کہ اس ملازمت اور خدمت میں ام مریم تھیں۔ وہ اس سے پرہیز کرتا ہے۔ خدیجہ خان بی بی راضی ہو جاتی ہیں۔ یہ ملازمت ان کی سبھی ہو جاتی ہے۔ سبھی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندرو سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے براؤا کی مانند براؤا کرتا ہے۔ اس بات پر زین سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران مگر والدین کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر بھاری حملہ کرتا ہے کہ وہ وقت زین کو ہر خیال خان کی خدمت میں ام مریم کو بھائی ہے۔

ام مریم پر بھاری حملہ کرنے پر خدیجہ خان سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتی ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتی ہیں مگر کبھی کبھی خدیجہ خان سکندر کو دیکھ کر کہتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پور ٹریٹ کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ قصور یہ ہے کہ وہ دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لٹے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بیٹھا ہے۔ لیزا بہت آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر وہ اس سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نبی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مرزاں سے نفرت کرنے کے بارے میں لیزا سکندر سے محبت کر رہی ہے۔ لیزا اس کو بول کر کہتی ہے کہ اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

امام مہریم مرزبان سے سچائی ختم کرنے کے لئے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ کمر آتا ہے مگر شہر بار خان اسے روک دیتے ہیں۔ اس بار خان رو کر دیکھتا کہ کون سی ہے۔ سکندر کو حائف کر دیں وہ مستہ چہرہ ہے مگر شہر بار خان ان کی بات کو نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاف کر کے، ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زمین فیس سے کٹ کر لے لیا جاتا ہے۔

مستند روایا چلا جاتا ہے لیکن انکو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سکندر دیا چاہا جاتا ہے کہ اس کو بہت بات پر یاد رکھنا ہے۔
 سیم یعنی نام مریم اور نیز اہل بیت کثیم محمود و علیہ السلام ہیں۔ ام مریم بنتین سے ہی امت شہیدی اور بد تغیر تھی۔ لہذا شوہر
 ہاشم سے بھی اسی کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے مٹانے کے ہر وقت بین کرنا ہوتا ہے۔ سکندر کو وہ ہاشم ایک لڑکی پر لہذا
 دُشمنانِ حضور ہے۔ لہذا انہیں ہونی ہے۔ اسے خود بہ حیرت ہونے لگتی ہے۔

سازون قیڑپ

وہ کہہ بیٹھے دل سے فلورنس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فلورنس میں اپنی چار روزہ انگلیمینشن کے بعد اسے لندن واپس چلے جانا تھا۔ اس کی چٹھیاں اس کے پاس ہو جاتی تھیں پھر لندن میں واپس اس کی روٹین لائف شروع ہو جانا سب سے کالج، فلیٹ، پریسنگز، مصروف زندگی، فف ٹیڈل۔ مگر اس کے واپس جانے پر ہوش کی طرح بہت دیر گزرتی تھی۔ چشموں کے آثار پر جب وہ یہاں آتی تھی تو وہ کھل جاتی تھیں، جیسے جیسے

خواجگان و اجساد و ابرین ۲ انا ۲ ابرین

انہیں نصیب دلایا۔ وہ باقی بچی کو چاہتی ہیں کہ وہ سکندر کو تنہا کر دے۔ شادی شروع کرے۔ مگر اس کی تعلیمات ہیں۔ اور اس کی اور اجنبی ہی کہہ سکتا ہے۔ کاش جھلکاؤں کا آسمان نہ اڑا کرتا۔

”میں اب اسے اپنا سامان لے آؤں۔“ مسکراتی بچی کو اپنے بہت مضبوط ہونے کا یقین دلایا وہ کہنے سے نکلی تھی۔ لونگ روم میں رکھے فون کی کھنٹی بجی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ وہ سیم تھی۔

”کیسی ہو لڑکی؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنا سامان کیا تم فلورنس آ رہی ہو؟“ بہن کی آواز میں کمرل خوش ہوا تھا وہ مسکراتی تھی۔

”میرا پورا اراہ تھا فلورنس آئے گا۔ مگر ہاشم کے کزن کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے وہی میں۔ میں ہاشم کے ساتھ وہ شادی لینڈ کرنے دینی جا رہی ہوں۔ حالانکہ میں نے تین مہینوں سے ہاشم سے کہہ رکھا تھا کہ میں نے آگست میں اٹلی جانا ہے۔ لڑکا سولہ سو ہے وہ بھی فلورنس میں۔ اس وقت ”ہاں ہاں چلی چلا“ ہوا رہتا تھا اور اب چیب میں تمہارے پاس آئے گا سارا پروگرام بنا چکی تھی تو آؤ اور دیا گیا میرے خاندان کی بہت قریبی اور اہم شادی ہے۔ ہمیں دینی جانا ہے۔ سیدھا سیدھا حکم سنایا گیا۔ میں کیا چاہتی ہوں، میری کیا مرضی ہے؟ وہ اہم ہے۔ میں نہیں ناں۔ لڑکی سیم سے سچ کہتی ہوں زندگی میں کبھی بھول کر بھی کسی پاکستانی مرد سے شادی مت کرنا۔ یہ بیوی کو ڈی گریڈ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ میں اپنی بہن کے پاس اتنی خوش خوشی جانے کی کیوں تیار رہی کر رہی ہوں، میری ذرا سی خوشی برداشت نہیں ہوئی ہاشم سے، صرف مجھے تمہارے پاس جانے سے روکنے کے لیے دینی جانے کا پروگرام تھا ”فانا“ یا لیا گیا۔“

سیم کاغذ سے بھر الجھ کر دیکھ لے ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس نہ آسکے کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ سیم کا جب

لڑکی کو ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ آں تک اس سے کبھی ملنے نہیں تھی۔ سیم کی زندگی برباد کرنے والے اس شخص سے وہ اپنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

”لو لڑکی بات نہیں سیم! تم آؤ لڑکی اس سے کیا فرق پڑے گا۔ سب سے بڑی بات تو تمہاری رعایتیں ہیں اور وہ اس باقی دن ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔“

اس قابل سیم کے اور ہونے والے اس جبر پر بہت دیکھا تھا۔ وہ اپنا ہر دستا کر رہی تھی۔ جتنی بھی ہوئی تھی۔ سیم کی شادی ہو چکی تھی۔ سیم اپنی شادی کو بھانا چاہتی تھی۔ جب وہ فیملی شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اس کا مطلب ہی یہی تھا کہ سیم نے ہاشم کے ساتھ اپنے رشتے کو زندگی بھر کے لیے قبول کر لیا ہے۔ ہاشم تو پہلے ہی تین بچوں کا باپ تھا۔ اسے مزید بچوں کی کیا خواہش ہو سکتی تھی مگر سیم اس سے جھگڑنے کے دوران بار بار یہ ذکر کرتی تھی کہ وہ اب ماں بننا چاہتی ہے۔ مگر ہاشم اپنا نہیں سہب۔ وہ مزید بچے نہیں چاہتا۔

”ہاں دعائیں تو ہیں مگر لڑا میری خواہش تھی میں بھی تمہارے ساتھ وہاں ہوتی۔ ہمارے اٹالیہ میں ہو رہی ہے اس بار تمہاری انگریز بہن۔“

سیم نے دکھ سے بھری ایک سانس لی پھر فوراً سچی لہجے کو بکھیر کر بولی۔

”خیر چھوڑو لڑکی بات کو تم مجھے یہ بتاؤ۔ تمہارا کام تو پورا ہو گیا ناں؟ جانے کی تیاری کر لی؟“

”میری سب بینٹھن کھیلٹ ہو گئی ہیں سیم! جانے کی تیاری بھی پوری ہے۔“

”بھوہ سے فون پر کھیلٹ کٹ میں رہنا لڑا میرا دل تمہاری انگریز بہن ہی میں لگا رہے گا۔“

”آف کورس سیم! یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔“

— 2 —

۲۱-۲۲

اس کے چٹوڑوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ یہاں بیٹھے بیٹھے خاموشی کے جلافت میں اس فوراً سے اس کے سامنے پہنچ گیا تھا جہاں بیٹھا کڑا اس نے اس کی پینٹنگ بنائی تھی۔

”تمہیں مجھے بطور تحفہ دے دیا۔“

”تمہیں خفیہ میں دے دوں گی تو اپنے سولو شو میں کیا اسے نہیں رکھوں گی؟ اسے تو مجھے لازمی وہاں رکھنا ہے۔ تم آؤ گے میرے شو میں؟“ اسے یاد تھا یہ بات پوچھتے ہوئے وہ بڑی آس اور بڑی امید سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سولو شو۔ فلوربس میں اس کا سولو شو۔

ایک دم ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے پلیٹ میز پر رکھی۔ سامنے والے دو سرے صوفے پر اس کا لپ ٹاپ بڑا تھا۔ ایک بے اختیاری کیفیت میں وہ اٹھ گشت کی کس تاریخ کو تھا اس کا سولو شو، اس سے یہ پوچھنے کی اس نے کبھی رحمت ہی نہیں کی تھی۔ کیس اس کا شو ہونا چکا ہو۔ اسے انکی سے واپس آئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ کیا پالیز کی انجینیشن ہو بھی چکی ہو۔ کچھ دیر قبل اسے شدید بھوک لگ رہی تھی وہ اپنا گرم گرم پائٹا انجوائے کر رہا تھا اب سب کچھ بھلا کر اس نے لپ ٹاپ گود میں رکھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اسے خود معلوم نہیں تھا۔ وہ فلورنس گوگل کی آرٹ گیلریز میں اس ماہ ہونے والے سولو شو کو سرچ کرنے لگا تھا۔ ایک دو مراعات کھول کر اس نے لیزا محمود کا فلورنس میں سولو شو لکھ کر بھی گوگل پر سرچ کرنا شروع کیا تھا۔ بڑی عجیب سی افتخار حرکت تھی۔ وہ ایک فن بل کر کے بھی لیزا سے پوچھ سکتا تھا کہ تمہاری انجینیشن جو گئی کہ نہیں مگر اسے گوگل پر سرچ کر رہا تھا۔ اسے بڑی خوشی اور بہت فخر کا احساس ہوا تھا۔ وہ جانی کر کہ وہ اتنی مشہور ہے کہ شخص ایک سیکنڈ میں گوگل نے لیزا محمود کی بائیو گرافی سے لے کر اس کی گزشتہ اور آئندہ سال ہونے والی تمام نمائشوں

[illegible]

وہ پلٹ میں پاشا لے کر ننگے روم میں ہیں آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پاشا کو بتوائے کہ رہا تھا۔ یہ سمجھ کر اس نے فی دی بھی آکر لیا تھا۔ ہسٹری میں لکھا تھا۔ وہاں اس وقت دنیا کی چند مشہور اور تاریخی اہمیت کی حامل آرٹ گیلریز کے لوہے کے ڈاکو مغربی آزادی تھیں۔

وہ شوق اور دلچسپی سے اس پروگرام کو دیکھنے لگا تھا۔
ان مشہور گیلریز میں اب فلورنس کو دکھایا جا رہا تھا۔
وہاں کی مشہور آرٹ گیلری کا ذکر ہو رہا تھا۔ اب اس
میں اس مشہور آرٹ گیلری کو دکھایا جا رہا تھا جس
لیونارڈو دا وینچی سمیت کئی اور نامور مصوروں کا کام
موجود تھا۔

”تھکے منہ تھوڑے میں میری پینٹنگز کا
 سولو شو ہے۔“ کہنا اُکھائے اس کا ہاتھ روک گئے تھے۔
 ”انگلیش میں یہ میرا سب سے بہترین پینٹنگ

خوابیں ڈالیں

تنگ کی قہرلیاں اسے فراہم کر رہی تھیں۔ اس کے
کس آرٹ گیلری میں اور کب لیزا تو دو ہی ہفت روزہ
نمائش ہونے والی تھی اسے پتا چل چکا تھا۔

خاص طور پر وہ ہفت اور انوار کے انباروں
کی تفریق کر رہا تھا۔ اس کے شو کی تقریبی تاریخ
نے کی جا رہی تھی۔

ڈائریکٹر اور Curator ایک کامیاب شو کے لیے
برآمد اور پریشان تھے۔ مسکرا رہی تھی۔ خوشی کا
اظہار کر رہی تھی مگر اسے اپنے اندر وہ ایکساٹمنٹ
محسوس نہیں ہو رہی تھی جو ان کی انجینئرنگ سے قبل
ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ اس بار کامیاب یا ناکامی اسے
دونوں ہی سے کوئی فرق نہیں پڑے والا تھا۔

یہ اس کے شو کا اوپننگ ڈے تھا۔ اس نے
شیفون کے سفید رنگ کے الونگ گاؤن کے ساتھ
ایمر ایڈورس کی ہوئی سفید ہی رنگ کی خوب صورت
چیٹک پیرر رکھی تھی۔ پیرر میں سفید رنگ کے ہائی
ٹیل والے ٹازک سینڈلز تھے، سوتیلی کانپکلس اور
ایمرنگز بنے تھے، شانوں سے چھپے آتے رہشی بالوں کو

آرٹ گیلری اور کیمکچر کے لیے مشہور اٹلی کے
خوب صورت اور تاریخی شہر فلورنس میں وہ آنچکی
تھی۔ کل اس کے شو کی اوپننگ بھی اب آج شو کی
اوپننگ کے حوالے سے اس کی آرٹ گیلری کے
منتظم کے ساتھ میٹنگ تھی۔

وہ میٹنگ کے لیے وہیں پہنچی تو اس کا بے حد
رجوش استقبال کیا گیا تھا۔ اب تو وہ ایک کامیاب
آرٹسٹ کے طور پر اپنا نام بنا چکی تھی۔ شروع شروع
میں جب وہ فائن آرٹس میں مریجویشن کر کے کانٹے سے
فائدہ ہوتی تھی اور زیادہ تر گریڈ انجینئرنگ میں اس
کا کام ڈھیلے ہوا تھا۔ تب اچھی آرٹ گیلری تک
رسائی اور اس فیلڈ میں قدم جانے کے لیے پریکٹس
بار کیاں سکھنے میں سیکرے اسے بہت مدد اور تعاون
فراہم کیا تھا۔ سیم کی بدولت ہی ایسا ہوا تھا کہ ابتدائی
سے اس کا کام اچھی آرٹ گیلری کی ذمہ دت بنا تھا اور
ایک آرٹسٹ کے طور پر اس کی CV مضبوط ہوتی چلی
گئی تھی۔ اس نے منتظم کے ساتھ مل کر آرٹ گیلری
کے اس ہال کا ایک تفصیلی دورہ کیا جہاں گیلری کے
اشاف ممبرز منتظم کی دی ہدایات کے مطابق اس کی
پینٹ محز کو دیواروں پر بڑے آرٹسٹک انداز میں
تورنڈاں کر رہے تھے۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی اب یہ کام
منتظم کا تھا کہ وہ اس کے کام کو کتنے خوب صورت انداز
میں ڈھیلے کرے گا۔

وال کا تفصیلی جائزہ لینے اور مطمئن ہونے کے بعد
وہ منتظم کے ساتھ اس کے آفس میں گئی تھی۔ جو واحد
تصور اس انجینئرنگ میں فروخت نہیں کی جانی اس
کے متعلق وہ منتظم کو بتا رہی تھی جب آرٹ گیلری کا
ڈائریکٹر بھی اس سے اپنے ہیلو کرنے والی آگیاں ان

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

قارہ اختر کے 4 خوبصورت ناول

ناول نمکوانے کے لیے کتاب ڈاک فرم 45/- روپے

37

3279522

”مسکندر آخرت اور بے یقینی کے سبب اس کے لیے اسے بچے اور نہیں نکل سکا تھا۔“

”دیکھو تقدیر نے ہمیں پھر ملا دیا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ وہ حیرت سے لنگ پیک لنگ اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”تم نے بتایا تھا انکورس میں تمہارا اسوار شو ہوگا۔ میں نے سوچا۔ اگر وہ کھولے اپنے مشہور آرٹسٹ ہونے کا جو رعب جماتی ہو، اس میں کچھ سچائی بھی ہے یا صرف باتیں بناتی ہو۔“

وہ اب بھی حسیب چاپ اس کے چہرے کو بے یقینی سے دیکھے جارہی تھی۔ اسے تو نگاہوں سے کھینچنے اور اس سے پھر جاکے کتب عمر بھر وہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔ مگر زندگی اتنی بھی سبک دلی دکھور نہیں تھی۔

دیکھا ہوا لیرا کیا تم مجھے یہاں دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے؟

اس کی مسلسل خاموشی کو دیکھ کر مسکندر نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

خوش؟ خوشی تو بہت جیوتنا بہت معمولی سا لفظ تھا اس کی اولیٰ کیفیات کا اظہار کرنے کے لیے۔

”خوشی تو تو ابھی میں نے محسوس کرنا شروع بھی نہیں کیا۔ ابھی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا۔ ایسا لگ رہا ہے، میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور تم یہاں نہیں ہو گے۔ پہلے مجھے یہ یقین آجائے کہ تم حقیقت میں میرے سامنے ہو پھر خوشی کو سوچوں گی۔“

وہ بے اختیار اپنے دل کی بات کہہ بیٹھی تھی۔ اسے اس بل خود پر اپنی زندگی پر بے چارہ پار آ رہا تھا۔ جسے کھو رہا تھا زندگی نے اسے پھر اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا بل چاہ رہا تھا۔ وہ ابھی مایوسی وقت مئی کو فون کرے، سیم کو فون کرے، ان دونوں کو بتائے کہ وہ اس وقت کیسا محسوس کر رہی ہے۔ مسکندر شہزاد اس کے سامنے کھڑا ہے، اس کے اٹنے نزدیک کھڑا ہے کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر بچھو سکتی ہے۔

خوشی اور بے یقینی نے کھل مل کر اس کی آنکھوں

اس نے کھلا جھوٹا ہوا تھا۔ سبب سے ہوا ایک اب اس کے اٹانہن نقوش کو اور نکھار رہا تھا۔ وہ بہت باوقار اور خوب صورت لنگ رہی تھی۔ شام چار بجے شوکی اوپننگ ہوئی تھی اور اس وقت سے ہی لوگوں کی خاصی تعداد آنا شروع ہو گئی تھی۔ چونکہ فلورس بھی اٹلی کا دوسری کی طرح کا وہ شہر ہے جہاں ساحل خاصی تعداد میں آتے ہیں سو اس کی انگریزیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں میں ان ساحلوں کی بھی کافی تعداد تھی جو آرٹ کے شائقین تھے۔

وہ اپنی ایک ہینڈبگ کے بازے میں ایک برٹش سپر کے پوچھنے گئے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی ٹوٹ کے شدید لڑتی تھیں اور اس پینڈیٹنگ میں اس کے رتھوں کے انتخاب اور اس نے آئل فلورس کیوں استعمال کیے جیسے سوالات پوچھ کر آرٹ میں اپنی ناک اور دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ خوش اخلاقی سے مسکرا رہے تھے۔ ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی تب ہی بے خیالی میں اس کی نگاہ سامنے آنے لگی تھی۔

اسے بہت دور ہال کے داخلی دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوا نظر آیا تھا۔ کمرے سوٹ میں اپنی چھاپا بنے والی شخصیت کے ساتھ۔

نہیں وہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اس کو اب ہمہ ہے یہ کوئی اور شخص ہے۔ شاید اس نے اسے سچا مانا شروع کر دیا ہے کہ اب اسے جانی آنکھوں سے بھی اسی کے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔

وہ معذرت کرتی ہیں برٹش سپر کے پاس سے جہی اس نے پھر سامنے دیکھا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں پھر کھولیں تاکہ اس خواب سے جاگ جائے مگر آنکھیں کھولنے پر بھی سامنے وہی آنا نظر آ رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ وہ بالکل سادگی کھڑی اسے اپنے نزدیک آنا دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آچکا تھا۔

”Bella۔“ وہ مسکرا کر بولا تھا۔

میں آنسو جمع کر لے۔ تجھ وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔
یہاں اس وقت اس جگہ کھڑے ہو کر وہ کوئی بھی
جذباتی حرکت ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا گلا بندھ
سارے ہاتھ۔ وہ سکندر سے مارل سے انداز میں کچھ کہنا
چاہ رہی تھی۔ کوئی بھی ایسی بات جس سے یہ ظاہر ہو کہ
وہ اسے دیکھ کر خوش ہے۔ سکندر بغور اسے دیکھ رہا
تھا۔

ابھی وہ بولنے کے لئے کوئی مناسب مبالغہ ترتیب
دے رہی رہی تھی کہ متاعی آرٹ اسکول کے کچھ
نوجوان مصوروں کا ایک گروپ اس کے پاس آگیا۔ ان
میں سے چند ایک کو تو صرف اس کا آؤگراف چاہیے
تھا جبکہ باقیوں کو کچھ پینٹنگز کے بارے میں اس
سے چند سوالات کرنے تھے۔ اس نے پریشان سا ہو کر
سکندر کو دیکھا۔

وہ یہاں سے ہٹ کر اور وہ چلا گیا تو پھر اس بار وہ اسے
کہو دینے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی
ایگزیبیشن، آرٹ گیلری اور یہاں آئے آرٹ کے
تدوین اسے یک دم ہی سب کچھ برا لگنے لگا۔ اپنے
اور اس شخص کے بیچ حاصل ہوتی دہرائے لگے۔ وہ
جانتی تھی کہ اس یل اس کے چہرے پر الجھن اور
پریشانی صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ سکندر اسے گھٹکٹھک
میں مبتلا دیکھ کر دسمائیت سے بولا۔

”تم جاؤ لیزا“ وہ اس سے اردو میں مخاطب ہوا تھا۔
اس نے بھی جواب اردو ہی میں دیا تھا۔
”مگر تم“ وہ کسی بھی قیمت پر اس کے پاس سے
ہٹا نہیں چاہتی تھی۔

ایک بار کو کر وہ اسے پھر مل گیا۔ اس کی خوش
منشی ہے۔ اب کی بار کو کر وہاں گیا پتا پھر بھی ملے بھی کہ

”تم اطمینان سے سب سے ملو بات چیت کرو۔
میں تمہاری پینٹنگز کو دیکھ رہا ہوں۔ میں یقین ہوں۔“
”جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
وہ جیسے بادل غماز اس کے پاس سے جا رہی تھی۔



وہ آہستہ قدموں سے چلا ہوا لیزا کی تمام پینٹنگز
دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ آئیٹ اسکول کے
نوجوان مصوروں کے گروپ سے پینٹنگز کے دوران بھی
لیزا مزے کر رہی تھی۔ اسے اس بات فار
میل، (خودست کے لیے نہیں) کے ٹیک کے ساتھ
اپنی پینٹنگ نظر آتی تھی۔ وہ چلا ہوا سیدھا اس کے
سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے لیول پر مدھم سی
مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے اور لیزا نے اس پینٹنگ
کے بیچ کے دوران جو باتیں کی تھیں اسے وہ سب
یاد آ رہی تھیں۔ اسے Livoli یاد آ رہا تھا۔

”اچھی لگ رہی ہے تمہاری پینٹنگ؟“ اسے
پچھ لے کر آکر کھڑا ہونا محسوس ہوا تھا۔

”ہاں بہت“ وہ تصویر سے نظریں ہٹائے بولا۔
”چلو ابیں باہر چلتے ہیں۔“ وہ اس سے بولی تھی۔
اس بار اسے گردن گھما کر اسے دیکھنا تھا۔
”گھر بھی آگیا بیٹھن کاغذ ختم نہیں ہوا۔“ اس
نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کیوریر کو انفارم کر دیتی
ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔“
اس لڑکی کے لیے اپنی تصاویر کی نمائش جس کی
شجائے وہ کب سے تیار کیا کر رہی تھی، جس کے لیے
اپنی شجائے تھی راتوں کا سکون اور نیند اس نے قربان
کی تھی بغیر اہم ہو چکی تھی۔ اگر کچھ اہم تھا تو سکندر
شمار۔

”دو چند لمحے بھٹکی باندھے لیزا کے چہرے کو دیکھا رہا۔
وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”میں تمہارے شو کا لوہنگ ڈے ہے۔ بہت سے
لوگ تم سے ملے آ رہے ہیں۔ تمہارا اس طرح
ایگزیبیشن سے چلے جانا مناسب نہیں۔ تم اطمینان
سے یہاں سب سے طومب کو وقت دو۔ ابھی تو اگلا
ایک ایڑہ گھنٹہ میں تمہاری پینٹنگ کو دیکھ رہا ہوں۔
اتنا ہی آرٹ کا تاقدار نہیں۔ میں اپنی دوست لیزا احمد
کے آرٹ کو دیکھنا اور سربا ہوا ہوا ہوں۔ اس کے بعد
بھی اگر آج کا شو ختم ہونے میں کچھ وقت باقی پاتا تو میں

تعداد میں لوگ اس کی تصاویر کو دیکھنے اس کے آرٹ کو سراہنے کے لیے آ رہے تھے۔

اس نے خود آرٹ گیلری کے کیوریر کو کسی سے بہت خوشی سے یہ کہتے سنا تھا کہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر لوگ نمائش دیکھنے آ رہے ہیں۔ آرٹ کے نقاد صحافی اور آرٹ کے قدردان لیزا کو سراہ رہے تھے۔ لوگ اس کی بیسٹ کنزرتے مانگے دام پر خریدنے کو بے قرار تھے۔ وہ اس خاص دن اور خاص موقع کو لیزا کے لیے بہت خاص رہنے دیتا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی وہ اپنی کامیابی کو پوری طرح انجوائے کرے۔ اس کا مسکراہٹ چہرہ پر گہرے خوشی سے مرشار سا دیکھ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

اسے کیا ہار لگا، جیسے وہ اپنے کامیاب سولو شو پر نہیں بلکہ سٹندز شو پر اسے اس شو میں آجائے پر خوش ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر نہیں، بلکہ اس کے آجائے پر خوش تھی۔ اوجھڑ گئی نے تو بجائے کوھر لیزا سب چھوڑ پھاڑ سیدھی اس کے پاس آ گئی۔

”جلیس؟“

”جلیس اگر کچھ دیر اور دکان سے تو رک جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر لوں گا۔“ وہ مسکرا کر وسائیت سے بولا۔

”نہیں۔ مجھے اور نہیں رکنا۔ ڈنر کے لیے میں کیوریر سے پہلے ہی معذرت کر چکی ہوں۔ میں انہیں کالی دیر پہلے جتا چکی ہوں کہ میرے ایک بہت خاص گیٹ آؤٹ ہیں مجھے ڈنر ان کے ساتھ کرنا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر لولی تھی۔

”چلو بچہ۔“ ان دونوں نے باہر جانے کے لیے ایک ساتھ قدم بڑھائے تھے۔ وہ دونوں آرٹ گیلری سے باہر نکلی آئے تھے۔ فلورنس میں بھی اسے سیاح اسی طرح نظر آ رہے تھے جیسے روم میں نظر آتے تھے۔ آرٹ گیلری کے آفس پاس گئی تو بجلی ٹارنیں جرج لورڈ کے دو خوب صورت ڈائمنڈین منجور تھے۔

”تم نے مجھے جیالا ہی نہیں تھا کہ تم بھی اگلے ہفتہ فلورنس آؤ گے۔“

آرٹ گیلری کے کیفے میں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔“ وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا فوراً اس نے اختلاف کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں وہ پھر سے واپس نہ چلا جائے۔

”میں تم سے ملے بغیر تم سے باتیں کیے بغیر تم سے کچھ نہ کیا کرنا چاہتی ہو یہ تم سے بغیر میں سے نہیں جاؤں گا۔ شو کا ٹائم ختم ہو تو تم کیفے میں آ جانا۔“

اس بار جیسے لیزا کو اس کی چٹائی کا یقین آ گیا تھا۔ وہ بٹکا سا مسکرائی تھی۔ وہ اتنی ہی باریک نگاہی تھی جتنی پیشہ لگا کرتی تھی۔ وہ صرف اس کو ہی اتنی باریک نگاہی تھی یا ہر کسی کو پونہی اس لڑکی سے محبت ہو جاتی ہوگی وہ جانتا نہیں تھا۔

”سی۔ سینور سکندر۔“ وہ مسکرا کر لولی ہوئی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ بڑی تسلی سے لیزا کی ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ گگے۔ گگے۔ وہ لیزا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو کبھی کسی سے گفتگو کرتی نظر آتی تو کبھی کسی سے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں تھی۔ کبھی کسی کو آؤ گراف دیتی نظر آ رہی تھی تو کبھی کسی کے ساتھ تصویر کھینچواتی تھی کسی کے سوالوں کے جواب دیتی ان کی نگاہیں باتیں دو تھوڑے دنوں میں نرم سا اثر لیے اسے دیکھ کر مسکرا کر آیا۔ لیزا اسے یوں دیکھتی جیسے ابھی تک بے یقینی کا شکار تھی اس کی یہاں موجودگی پر۔

وہ لوگوں کی تعریفوں، ستائشوں کو سنتے رہنے سے زیادہ اس کے پاس آنے کے لیے بے چین نظر آ رہی تھی۔ فوجی شو کا ٹائم ختم ہونا تھا اور وہ صرف لیزا کی ریشالی اور انجمن کا خیال کر کے وہاں فوجی شو کا رکارڈ بنا تھا۔ وہ کئی بار ہجوم میں لیزا کی ہر چیز کو تقریباً حفظ کر چکا تھا۔ اس نے لیزا سے کیفے میں جا کر بیٹھنے کی بات کی تھی اور لیزا نے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے لگا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا تو وہ شو کے ختم ہونے کے وقت تک یہاں فضا میں رہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے گی۔ لیزا محمود کا دن تھا۔ اس کی نجائے گئے میٹھی کی محبت کا تھر آج اسے مل رہا تھا اس صورت میں کہ ایک بڑی



ہوں کا اپنا ہنامہ

ایبوری

ایرین 2012 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

☆ "سلیبہ ہاشمی" سے کاشف گوہر جہ کی ملاقات

☆ "ہواغ راہ" صبا احمد کی مکمل دہلی

☆ "ستم گریدہ" سندھ صبر و حذر ان کے قلم سے نقل

ایک دل کھراخوری

☆ "تینارو راہ طلب میں" ہما عاصم کی مکمل دہلی

☆ "ویلا کا ناٹھ" حبیب احمد کی مکمل دہلی

☆ "تیرن راہ طلب میں" ہما عاصم کی مکمل دہلی

☆ اس کے علاوہ دیگر اعلیٰ درجہ کے افسانہ ساز ناول، نثر، کہانی

اور نثر کے مجموعے کے افسانے

☆ "تم آخری جزیرہ ہو" ام کلثوم کا سلیبہ دہلی

☆ "وہ ستارہ صبح امید کا" فوزیہ غزل کا

سلیبہ دہلی

یہ سب نثر کی باتیں ہیں انشاء اللہ ہمارے قاریوں کو

یاد دلائی کہ یہ سب معلومات کے علاوہ

کئی اور معلومات سلیبہ دہلی میں

اسے خود دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ اٹھیں
نہیں دلائے۔ وہ ایک ریٹورنٹ کے پاس آکر روک
گیا تھا۔ ریٹورنٹ کے باہر بھی میز پر تھی۔ انہیں
جو لوگ اور گروہ کھڑی تھی۔ تاج اور فلورس کی
نویسوریوں کو سہاگتے ہوئے کھانا کھانا چاہتے ہیں وہ
ایسا کر سکیں۔

"کیا خیال ہے میری بیٹی کھانا کھائیں؟"

بجائے لیزا کے سوال کا جواب دینے کے انہیں

کھانے کی بات چھوڑی۔

لیزا نے خوش خوشی مسکراتے ہوئے سر نہات میں

ایسا تھا۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔ وہاں سے

اس پاس کی تاریکی عمارتیں اور فوارے بولنے

خوبصورت لگ رہے تھے۔

"تمہارے شو کی اوپننگ تو بڑی کامیاب رہی

ہے۔"

اسے لیزا نے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا

چیز شوق سے کھاتی ہے۔ اس کی پسند کی چیز اسے اور

بہتر اور وہ انہیں آکر ڈر کر چکا تھا۔

"ہاں۔" وہ شو کی کامیابی پر مسرتانہ خوش تھی کہ

"ہاں" کہہ رہا ہے اسے کافی لگا تھا۔ اس کی اصل دلچسپی

اس بات میں تھی کہ سکندر شہزادہ یاں کیسے آگیا

ہے۔

"تمہارے بچا نہیں تمہارا فلورس آگیا ہے ہوا؟"

اور سکندر شہزادہ لیزا انڈوز کے حسین چہرے کو اپنی

دھڑکی کی گرفت میں لے کر خود اپنے آپ سے یہ سوال

پر مانتا کہ وہ آج پہلی فلورس میں کیا رہا ہے؟

"کیا آفس کے کسی کام سے یہاں آئے ہو؟" اسے

خوش و کچھ کر لیزا نے مزید پوچھا۔ ان کے سامنے ان

انسانوں کو کیا چاہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ لیزا سے

جانت بول دے کہ "ہاں" میں یہاں کسی میٹنگ یا

فلورس میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔ مرننگ میں جو

ایک اعلیٰ سیار شہ ایک عجیب محبت اسے اس وقت ملی

تھی۔ جب وہ مرننگ اور محبت ہی سے نامید ہو بیٹھا تھا

اس سے جھوٹ بولا جاسکتا تھا؟

ایرین 2012 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے



وہ تو اس لڑکی سے زندگی بھر نہ ملنے کے ارادے
باندھے بیٹھا تھا۔

لیرزا کے خوشی سے سرشار چہرے کو دیکھتے ہوئے
اپنے آپ سے اچھ رہا تھا اسے یہاں نہیں آنا چاہیے
تھا۔ اسے لیرزا سے دوبارہ نہیں ملنا چاہیے تھا۔ دوبارہ
ملنے کا مطلب ہے اسے کوئی اس کوئی لغو دہانا اسے
اپنی محبت کا یقین دلانا۔ وہ لیرزا کو اپنی وجہ سے کوئی بھی
دیکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ
اسے اپنا سامنے اور اپنی محبت نہیں دے سکتا تو اسے یہ
حق بھی نہیں کہ وہ اس کی زندگی میں بار بار آکر پھیل
یو کرے۔

”تم آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ اس کے سوال
کا جواب دینے بغیر اس نے محض لفظ کا موضوع ہی تبدیل
کر دیا۔
”واٹ فکر غم بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

اس نے اپنی پلٹ میں پلٹا ڈالا لہذا وہ لیرزا کے
آگے بھی ڈنٹ رہی۔ لیرزا خاموشی سے اسے دیکھ رہی
تھی۔

”شروع کرو بھی۔“ اس نے خود ہی لیرزا کی پلٹ
میں بھی پلٹا ڈالا۔

اس نے کھانا شروع کر دیا مگر وہ اسے دیکھ رہی
تھی، اسی طرح سنجیدگی اور خاموشی سے۔ اس کی
آنکھوں میں بہت سے سوال تھے، یہ آنکھیں اس سے
سوال کر رہی تھیں، اپنے ہر سوال کا جواب ہانگ رہی
تھیں۔

”تمہاری بھنی کیسی ہیں؟“

وہ جان کر انجان بن رہا تھا۔ اسے لیرزا کی آنکھوں
میں موجود سوالوں سے ڈر لگ رہا تھا اس کا یہاں۔
بہانگ جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ آخر یہاں کیوں آیا
ہے؟ اس کے دل نے یہ اسے کس مشکل میں ڈال دیا
تھے۔

”ٹھیک ہیں۔“ لیرزا نے اس کے کہنے پر کھانا
ایک ذائقہ لیا تھا۔ وہ سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی
تھی۔ جبکہ وہ اس کی نگاہوں میں چھپے سوالوں۔

کیا وہ لیرزا کو دوسرے جھوٹ بول سکتا ہے؟
اس کی زندگی میں کبھی خوشی، کبھی محبت بلکہ
زندگی ہی کو وہاں لاسے والی اس لڑکی سے وہ مرتے دم
تک جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیا وہ اس سے محض اس
لیے جھوٹ بول دے کہ بچ بول کر خود کو اس پر عیاں
نہیں کرنا چاہتا؟
”نہیں۔“ وہ لیرزا کے ساتھ اپنے رشتے کی سچائی اور
خوبصورتی کو صرف خود کو عیاں کرنے کے خوف سے کم
نہیں کر سکتا۔

”میں یہاں آؤں گے کام سے نہیں آیا۔“
وہ آہستہ اور سنجیدگی سے بولا۔ ابھی ان دونوں نے
کھانا کھانا شروع نہیں کیا تھا۔
”بس، ٹکوریں خاص طور پر تمہاری وجہ سے آیا
ہوں۔ تمہارا سواؤ بنو دیکھنے اور غم سے ملنے۔ تمہیں
مبارک باد دینے۔“

اس نے لیرزا کے چہرے پر پہلے حیرانی پھر خوشی اور پھر
خوشی سے سرشار مسکان بکھری رکھی۔
”خیر، کچھ رہے ہو؟“

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں یہاں صرف ابر
صرف لیرزا کو دوسرے ملنے آیا ہوں۔ میں نے گوشت پر
تمہارے اس شو کی جگہ اور آج صبح میری کبھی میں
نے وہاں پہلے بالکل آنا، ڈانا اور اچانک ٹکوریں
آنے کا پروگرام بنایا ہے۔“ وہ اس کی خوشی اور بے یقینی
محسوس کرنے کے مسکرا کر بولا۔

”کیوں؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں
جھانک رہی تھی۔

اب وہ اسے کیا بتانا کہ وہ ایک جانور ہی تو ہے
زیر اثر یہاں چلا آیا ہے۔ بغیر کسی ارادے اور کسی
سوچ کے اس کا دل اسے یہاں اٹھالایا تھا۔ اس کے دل
نے اسے سوچنے اور سمجھنے کی مہلت تک نہیں دی
تھی۔ اگر اس نے ذرا بھی سوچ سمجھ لیا ہو تو کیا آج
یہاں لیرزا کو دوسرے کے سامنے بٹھا، اس مشکل سوال کا
سامنا کر دیا، ورنہ اس سے ملنے آیا ہے مگر کیوں؟
کس لیے؟

پتا۔ میں یہاں فلورٹس میں کیا کر رہا ہوں، کیوں بیٹھا ہوں یہاں مجھے تو یہ بھی نہیں پتا۔“
وہ جیسے خود اپنے اوپر ہنسا مگر اس ہنسی میں ایک بے بسی پن تھا۔ لیزا اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس کی آنکھوں میں بھانک رہی ہے۔

”کیسے دل سے بوجھ کو کیا پتا وہ تمہیں بتا دے۔“
لیزا اس کی طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ بولی۔

وہ جواباً ”چپ رہا۔ وہ جیسے کچھ بھی کہتے ہوئے محتاط تھا۔ مگر اس کے لبوں سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو اس پادری لڑکی کو وعدے کی کسی ذرہ سے باندھ دے۔ وہ اپنی زندگی کے اندھیروں میں اسے کیوں حصہ دار بنائے۔ وہ اگر اسے کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو اسے کوئی دکھ دے گا بھی اسے کچھ حق نہیں۔“

”اچھا فلورٹس کی سڑکوں پر گھومیں۔ تمہارے دوا کی طرح یہاں بھی تو ہر گئی پر سڑک پر ہسٹری کھڑی پڑی ہے۔“

وہ کھانا چھوڑ کر یک دم ہی میز سے اٹھا تھا۔ اس ادا کرنے کے لیے اس نے ویٹر کو اشارے سے بلایا تھا۔ لیزا اسے دیکھتے ہوئے اٹھ نہ سکی تھی۔

وہ دونوں آہستہ قدموں سے چلتے کیفے سے دور آگئے تھے۔ لیزا خاموش تھی۔ اس نے لیزا کے خاموش چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب خوشی نہیں دکھ اور خاموشی تھی۔

”تمہی چپ کیوں ہو لیزا لیزا کوئی بات کرو۔“ لیزا نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا سرور۔ بولی کچھ نہیں۔

”کیا میں نے یہاں آکر تمہیں دکھی کیا ہے؟ پتا ہے لیزا تمہارا بہت بولنا اور بے تحاشا ہنسنا مجھے بہت پسند ہے۔“

لیزا چلتے چلتے یک دم ہی روکی تھی۔ وہ دونوں اس وقت ڈوارے کے بالکل نزدیک کھڑے تھے۔ لیزا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”جب تمہیں میں پسند ہوں، میری ہر بات بھی تم

نکالیں چرا آکھانا کھانے میں یوں مگن تھا گویا آج اس وقت ان دنوں کے درمیان سب سے اہم بات ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہی تھی۔

”تم کج ہی کیسے ہو؟“

”ہاں اور ایر پورٹ سے سیدھا تمہارے پاس تمہاری ایگزیکشن میں چلا آیا۔“

جو سوچ رہا تھا وہ اس سے بولا نہیں جاسکتا تھا۔
”ہاں آج ہی آیا ہوں اور کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔“

وہ لیزا کو دیکھ کر دستاں انداز میں مسکرا رہا تھا۔
”تمہاری ایگزیکشن تو میں دیکھ آیا ہوں بہت اچھی جا رہی ہے۔ یہ پتا دوسلو شو کے استے کامیاب آغاز پر کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”تم مجھ سے وہ کیوں نہیں کہتے سکندر! جو کھانا چاہتے ہو؟ جو میں تمہارے لبوں سے سننا چاہتی ہوں۔ تم اپنے سب کام ساری مصروفیات چھوڑ کر میری خاطر دوباے فلورٹس آسکتے ہو تو اپنے دل کی بات کیوں نہیں کہہ سکتے؟“

لیزا کی آنکھیں اس سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔
وہ اس کے لبوں سے ایک اظہار سننے کی منتھی تھی۔

”میں نے اس ایک مینے میں تمہیں بہت یاد کیا ہے سکندر!“

وہ چند لمحوں تک اس کے کچھ کہنے کی منتظر رہی۔ پھر جنب دیکھا کہ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تب آہستگی سے بولی۔

”تم مجھے فون کر لیتیں۔ تمہارے پاس میرا سیل نمبر تو تھا۔“

”تم جس انداز سے مجھ سے گدہ بٹے کر کے آئے تھے، کیا اس کے بعد میں ایسا کر سکتی تھی؟ تمہارا مجھ سے رخصت ہونے کا انداز مجھے واضح طور پر بتا گیا تھا کہ تم اس چند روزہ ملاقات کو عمر بھر کی دوستی میں تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔“ وہ شکوہ کنال ڈا ہوں سے اسے دیکھ کر جیسی آواز میں بولی۔

”میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں چاہتا مجھے خود نہیں

لیا۔ اس کا ہاتھ تھامتے تھامتے نہ جانے اسے کیا ہوا؟
اس نے اس کی ہتھیلی اپنی انگلیوں کے سامنے کر لی۔ وہ
بغور اس کی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔

سخت کاموں اور بے تحاشا محنت اور مشقت نے
اس کے ہاتھوں کو کسی راج مزدور، کسی پلیمبر، کسی
کاروبار خیز کے ہاتھوں جیسا سخت اور کھرا بنا دیا تھا۔
برسوں کی مشقتیں اس کے ہاتھوں سے واضح تھیں۔
لیزا نے شاید اس چیز کو پہلے بھی کبھی محسوس کر رکھا تھا
تب ہی بجائے کچھ پوچھنے کے اس نے آہستگی سے
بے حد نرمی سے اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلیاں پھیری
تھیں۔

”تمہیں زندگی نے بہت دکھ دیے ہیں نا سکندرا
اسی لیے اب تم زندگی سے خفا ہو۔ تم خوش نہیں ہو نا
چاہتے، تم ہنسنا نہیں چاہتے تم زندگی سے خوشیوں
سے متہ مزوڑ لیتا چاہتے ہو؟“ اس نے بے اختیار
نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”تم جانتی ہو اپنا کمال؟ تمہارے ساتھ تمہارے
دو ماہ میں میں پورے بارہ سال بعد ہنسنا تھا۔ مجھے رنگ
اچھے لگنے لگے تھے۔ مجھے زندگی اچھی لگنے لگی تھی۔
میرا خوش ہونے کو جی چاہئے لگا تھا۔ تمہاری سگت
میں پورے بارہ سال بعد میں خوش ہوا تھا ہنسنا تھا۔ کوئی
جادو ہے تم میں جو مجھے تمہارے پیچھے تلور نس تک
بھیج لایا ہے۔“ وہ کہہ بہارہ نہیں پایا۔

وہ اتنی نرمی سے اس کی سخت اور کھردری ہتھیلی پر
اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی جیسے اس کے زخموں سے چور
چور وجود کا ہر ذرہ سمیٹ لیا جاتا ہی تھی۔

”جب تمہیں میرے ساتھ خوشی ملتی ہے تو پھر
مشکل کیا ہے سکندرا؟ پلیمبر میرے اور اس نے یہ زندگی کو
مزید مشکل مت بناؤ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں
گی۔“

”پلیمبر لیزا اس طرح کی باتیں مت کرو۔ میں ایک
تھکا ہوا اور ناکام انسان ہوں۔ میرے اندر زندگی کی
اننگ ختم ہو چکی ہے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے
لیے مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”تو پھر الجھن کیا ہے سکندرا؟“

لیزا نے یہ کہہ ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ چاہتے
ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال نہیں پایا۔
اس نے لیزا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے اس کی
آنکھوں میں ایک ٹھنک کن سی کیفیت نظر آئی۔ اس
کا آنکھیں ارادوں کی مضبوطی کے ساتھ یہ بتا رہی
تھیں کہ اس بار وہ اسے اپنی زندگی سے نکلے نہیں دے
گی اسے روک دے گی۔ اس نے ایک گہری سانس لی
جس میں اک عمر کی جھٹکا شامل تھی۔

”میری زندگی میں الجھنیں ہی الجھنیں ہیں لیزا!
میری زندگی تمہاری زندگی جیسی خوشگوار اور ہموار
نہیں۔ تم مجھ نہیں جانتیں۔“

آہستگی سے بولتے ہوئے اس نے لیزا کے ہاتھ سے
اپنا ہاتھ نکالا اور نوادے کے اطراف لگی میچ پر بندھال
سے انداز میں بندھ گیا۔ وہ لیزا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
وہ سر جھکائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے لیزا کا اپنے
برابر بیٹھنا محسوس کیا تھا۔

”تمہیں بیٹھا جانا میرے لیے ضروری تھا، میں
تمہیں اتنا جانتی ہوں سکندرا! میں جانتی ہوں کہ میرے
ساتھ بیٹھا یہ شخص ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ یہ
ساتھ ہو گا تو مجھے زندگی سے اپنے لیے اور کچھ بھی نہیں
چاہیے ہو گا۔ یہ میری حفاظت کرے گا یہ میری بہت
پر دال کرے گا یہ مجھ سے بہت محبت کرے گا۔“

”اس کے بارے میں کچھ بھی جاننے والا نہ بھروسا؟
اتنا بھروسا تو اس کے بہت اپنوں نے بھی اس پر نہ کیا
تھا۔“ اس نے مٹی سے سوچا۔

”تم مجھے اتنا اچھا مت سمجھو لیزا! میری چھائی وہ
نہیں جو تمہیں دکھتی ہے۔ میں اتنا اچھا ہرگز نہیں جانتا
تم مجھتی ہو۔ بہت سیاہ بہت داغ دار ہے میرا وجود۔
میرے قریب آؤ گی تو میرے وجود کی سیاہی تمہیں بھی
اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔“

اس نے اب بھی نظریں اٹھا کر لیزا کو نہیں دیکھا
تھا۔ وہ اسی طرح زمین کو دیکھتا کہستہ آواز میں بولا تھا۔
”لیزا! اس کے ہاتھ کو لیزا نے اپنے ہاتھ میں لے

دلخ دارغ ہے۔ میرا ماضی برا بھلا کچھ ہے۔ برسوں ہوئے میری لڑائی جتنے ڈس اینڈ کریڈٹ ہے۔ مولائے میری ماں کے جو بھی کبھی مجھ سے غور پر بات کر لیتی ہیں، میرے گھر کا کوئی فرد میری شکل و کھانا ملک گوارا نہیں کر رہا۔ میں بیس سال کی عمر میں چارلیک Gay امریکنز کے انجیلوں sexually abuse کیا جا چکا ہوں۔ میں اندر سے اتنا کھوکھلا، ابتادارغ وار ہوں کہ میرے نزدیک آنے سے تمہاری اصل شفاف صورت مجھ بدنام ہو جائے گی۔“ وہ ایک دم ہی جیسے پھٹ پڑا تھا۔ لیزا حیرت اور دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں ولایہ تھیں پر اس لڑکی کے لیے اتنے جنونی انداز میں میں نے اس لیے ری بائیٹ کیا تھا کہ میں خود ایک rape victim ہوں۔ جب ہمیں یہ سب بتا ہی رہا ہوں تو یہ بھی بتا دیں انارڈ ایکسیڈنٹ میں نے خود کروایا تھا۔ میں خود ایک گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ اس لیے کہ میں مر جانا چاہتا تھا۔ یہ ذلت بھری زندگی دیتے جیتے میں تنگ دکا ہوں۔“

وہ بہت دور سے چلایا تھا۔ آس پاس سے گزرتے چند لوگوں نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ اس کی زبان سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر جانتا تو سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہاں یہاں پتھروں سے سر مار کر رونا شروع کر دے۔ پھر کسی گاڑی کے آگے آجاسکے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ اس کا خود کو مٹاؤ لے کوئی چاہ رہا تھا۔

وہ لیزا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا، یہاں سے اٹھ کر کہیں بہت دور بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ زندگی میں دوبارہ لیزا سے کبھی سامنا نہ ہو سکے۔ اپنی آنی بھلا کچھ سوچائی آج تک اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ لیزا کو کتنا کراہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا تھا۔ جملے یوں بانگ سن سا بیٹھے اسے کئی دیر ہوئی ہوگی جب اسے ایک دم ہی اپنی

پاس یہاں نہیں آتا یا ہے تھا۔ تمہاری بر سکونی زندگی کو برباد کرنے کا شے کئی حق نہیں۔ اگر میں نہیں کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو دکھ بھی نہیں دے چاہیے۔“ وہ بہت تکلیف سے بول رہا تھا۔ ”دکھم نے آج یہاں اگر مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔ سکندر! امیری محبت ایک طرف نہیں، مجھے یہ اطمینان دیا ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے۔ وہ میری خاطر میری محبت میں اسنے سب کام چھوڑ کر دیاتے فلورنس آ گیا ہے۔ میں خوشی سے سانس نہ ہو رہی ہوں اور تم کہتے ہو تم نے مجھے دکھ دیا ہے؟ مجھے ڈر شرب کیا ہے؟“

وہ لیزا کے منہ سے محبت کا لفظ سن کر پریشان ہو گیا۔ ”اس لفظ کو ہمارے درمیان بہت بڑا فیرا پھر جب میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا تو یہ لفظ کسی دوسرے شخص کا ساتھ قبول کرنا تمہارے لیے بہت مشکل بن جائے گا۔“ اس کا لہجہ ایک بارے ہوئے، ”تا کہ تمہیں کالچہ تھا۔ جو زندگی کے ہر لمحہ پر پہلے ہی شکست تسلیم کر چکا تھا۔“ ”تم مجھے کیوں چھوڑ جاؤ گے؟“ اس سے یہ سوال پوچھتے وقت لیزا کا لہجہ بھر رہا تھا۔

”اس لیے کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“ ”تم ہوتا۔ میرے لیے تمہارا ہونا ہی سب کچھ ہے۔“

وہ ایک لمبی اسے کھو دینے کے خوف سے پریشان بننے لگی تو اگلے بل یوں لگا وہ برقیں ہے کہ وہ اسے روک لے گی۔ وہ اس لڑکی کی ان محبتوں کا حقدار نہیں کیسے سمجھائے اسے۔

”جانتی باتیں مت کرو لیزا! مجھے کسی کو شش کرو۔ جو تم سوچ رہی ہو وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں قدموں سے ہٹتی سے بولا۔ ”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ لیزا کا اس کی جھنجھلاہٹ کے جواب میں پرسکون انداز تھا۔ ”اس لیے کہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میرے نامہری وجود اور میری موجودہ زندگی پر شہ جاؤ۔ میرا باطن

ڈیوٹ بھی کوئی ہوتا ہے کہ اسے سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی انسان جیٹا چلا جائے وہ غلوئس کیوں آیا تھا اسے لیوا کیوں اچھی لگتی تھی؟ اس کا لیوا سے پھرے ملنے کو کیوں جی چاہا تھا؟ اس کا دل چاہا وہ خود کو سزا دے۔ اسے نہ تو خوش ہونے کا کوئی حق حاصل ہے نہ ہنسنے کا اور نہ محبت کرنے کا۔ اپنے اس داغ دار وجود کو لے کر اسے برسوں پہلے مر جانا چاہیے تھا۔



”مگر واقعی میرا خون ہو ذرا بھی غیرت تم میں یہی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔“
 ”بے غیرت انسان! ام مریم پر ہندی نظر ڈالنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟“
 ”مجھے اس درد سے بچاؤ زین! یہ میری عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔“
 ”ام مریم کو ٹھکرانے کی ساری زندگی کوئی اہمیت نہیں کر رہا ہے۔“

”Ray! leave the baby.“

”It's my turn“

اپنے بال نوچتا ہار سال پہلے کے سکندر شہزاد کی طرح ہی رو رہا تھا۔ اس کے گرد آوازیں ہی تو اڑیں تھیں۔ شور ہی شور تھا۔ وہ چارستہ اور وہ اکیلا تھا۔ وہ کیم تخیم طالت دوست تھے اور وہ ان کے آگے بیس سال کا ایک کمزور اور بے بس لڑکا۔

”پلیز ٹیوی۔“ وہ رو رہا ان کی منت کر رہا تھا۔ وہ چاروں اس کی بے بسی پر قہقہے لگا رہے تھے۔
 وہ ”ایا ایا“ لگا رہا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دو قامت کالے امریکی قہقہہ لگا کر اس پر ہنس رہے تھے۔

ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بے انجم انداز میں اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں۔ شراب کے گھونٹ لے کر وہ بوتل ایک کر دے سرے کو ڈے رہے تھے۔

ہتلی پر نمی کا احساس ہوا۔ اس نے سبے اختیار سر اٹھا کر لیوا کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی ہتھیلی پر گر رہے تھے۔ اس نے لیوا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور ایک دم ہی بچ کر سے اٹھا بغیر لیوا کی طرف دیکھے وہ آہستگی سے بولا۔

”میں کل صبح تم سے مل کر واپس چلا جاؤں گا۔“
 اسے خود اپنی آواز اچھی لگی تھی۔
 ”تم کہاں جا رہے ہو سکندر؟“

وہ رو رہے رو رہے پیچھے سے اٹھی تھی۔ اسے روکنا چاہتی تھی مگر وہ اسے بال مزید ایک پل نہیں رک سکنا تھا۔

”لیوا پلیز نہیں اس وقت اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے غل بات کروں گا۔“

اپنی پالی غصے سارے دکھ اسے پھر سے یاد آنے لگے۔ وہ اس وقت کسی اور کا تو کیا خود اپنا سانس بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عجیب سی ایک نفرت، غصہ اور وحشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ لیوا کو دیکھیں چھوڑ کر اپنے ہوٹل جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔



وہ اپنے ہوٹل روم میں تھا۔ خود کشی کرنے کا خیال اس پر بوری طرح حاوی تھا۔ وہ کیوں زندہ ہے؟ اسے مر جانا چاہیے۔ اسے بارہ سال پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ ایک وحشت تھی، یو لکھ بہ لکھ بروحتی جا رہی تھی۔

اسی نو عمر سکندر شہزاد کی طرح جس سے اس کی شخصیت کی آن پان اور وہ قار ایک لڑکی نے چھین لیا تھا۔ چند کالے امریکیوں نے چھین لیا تھا۔ اس کے اپنے غمی رشتوں نے چھین لیا تھا۔

ام مریم وہ چار gay امریکن شہزاد خان زین شہزاد۔ ان سب میں سکندر شہزاد کا قاتل کون تھا؟
 اسے تو آج ان سب میں سے کسی کا بھی خیال نہیں آتا تھا۔ کس سے بھی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی اگر وہ کسی سے نفرت کرتا تھا تو اپنے آپ سے اتنا

کھڑی ہوئی تھیں۔ صفائی کا کوئی بھی موقع ملے بغیر اس پر فوجی مہمندانہ کیٹی گری تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ناقابل اعتبار اور گناہگار قرار دیا جا چکا تھا۔

روٹی ہوئی۔ نس کی ماں کی مجال نہ تھی کہ بیٹے کی حمایت کر پائی۔ بے عزت سے اسے دیکھا ہوا اس کا بھائی اسے گھر سے قید کر جاتے دیکھ کر مطمئن تھا اور اسے دھکے مار کر گھر سے لٹا ہوا اس کا لپٹا ہنس کی کوئی بھی بات سننے کا روادار نہ تھا۔

قدیم گزراں اپنی قابل اعتبار تھی مگر وہ ان سب کا خون من کے لیے ناقابل اعتبار تھا۔ اس کا گناہ کیا تھا؟ شاید اس کا گناہ سپہا رخاں کا بیٹا ہونا، زین شہر وار کا بھائی ہونا تھا شاید اس کا گناہ اس گھر میں پیدا ہونا تھا۔

وہ گھر چلا گیا۔ کچھ بھی نارمل نہ تھا۔ وہ گھر جہاں اس کے پیپ کی انٹاؤں کو چھوٹی تخت مزاجی اور اصول پسندی تھی۔ اس کی ماں کی خدمت گزار کی اور خاموشی۔ اسے اس گھر میں اس نے بچپن ہی سے بڑا عجیب و غریب راز محسوس کیا تھا۔

وہ ایک اونٹن گھرانے کو بچے خاندان کا چشمہ چراغ ہے، اس کی زندگی میں ہر چیز پر ٹکٹ ہونا چاہیے۔ اسے زندگی میں ہر وہ کام کرنا ہے جو اس کے پیپ اس سے کہیں۔ ہر وہ چیز حاصل کرنا ہے جو اس کے پیپ چاہتے ہیں۔ اسے وہی سنبھالنے ہی اتنے پیٹھے اس کے باپ نے سنبھالیا تھا۔

اس کے پیپ کی اس سے توقعات بہت اونچی تھیں۔ کہیں کوئی کمی اوہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ان کی توقعات کے مطابق خود کو ثابت کرنے میں کبھی کبھی تھکنے لگتا تھا۔ وہ اب کو خوش رہنے کا ہر حق کرنا تھا۔ جو وہ اس سے توقع رکھتے تھے۔ وہ اس مبارک کارکردگی کو دکھانا جو وہ اسے حکم دیتے۔ مگر بھر بھی اس کی آواز کی آگہور جاتی تو وہ اس سے ناخوش ہو جاتے تھے۔

اسے کیا پتا ہے کیا کرنا ہے، جس لوگوں سے ملنا ہے، کن سے دوستی کرنا ہے، بڑے ہو کر کیا بننا ہے،

اس نے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہا کہ اس کی طرف بڑھتے ایک کالے نے ایسا زوردار مٹکا اس کے منہ پر مارا کہ وہ اوندھے منہ سر پر گر گیا تھا۔ اس کی ہانک اور دانتوں سے خون نکل آیا تھا۔ اس کالے نے اس کے بال منگی میں دبوچ کر اس کا سر زمین پر زور سے مارا تھا۔ اس کا سر بچھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

”ایا اچھے بچا لیں، یا اچھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ یا اچھے بچے مارنا ہیں گے۔ یا اچھے بچا لیں۔“ وہ روتے ہوئے بات کو پکارتا تھا۔

”ایک Rapist میرا بھائی بھی نہیں ہو سکتا۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد زندگی بھر مجھے اپنی منوس شکل مت دکھانا۔“ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے ہوش و دم میں بیٹھ کر بیٹھا تھا اپنے اندر کی وحشتوں سے سکون پانے کے لیے اس نے پلوں کے کمرے کی کوشش کی تھی۔

پس آج کی رات، صرف آج کی رات۔ کس صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ یہ لڑاتے وہاں کبھی نہیں ملے گا۔ پلوں کے سارے بھی اسے کچھ ہی دیر کے لیے نیند آئی تھی۔

وہ آدھے نئے بعد ہی روتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنے لوپر پھر وہی سانپ کی طرح دیکھتے ہاتھ منوس ہو رہے تھے۔ وہ ہاتھ روم آگ تھا۔ شاور سے اپنی پوری رفتار سے بہہ رہا تھا اور وہ شاور کے نیچے کرا اپنے وجود پر مگی پر غلاظت صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپنی تھلیل، اپنی عزت نفس کی پالی سے رلا رہی تھی۔ اپنی کے نیچے کرا ہانکوں کی طرح رو رہا تھا۔ ”سکندر شہر وار بہت تمہیں، سکندر شہر وار تو خود اب رہا ہے۔“

اپنے بال منسیوں میں جکڑ کر وہ اپنی عزت، اپنے بہادر و قار کی پالی پر چلا کر رو رہا۔



ابہ سٹاپلے کی وہ شام پھر اس کے سامنے آئی۔

لگنے لگتی۔

کسی ایک آدھ بات میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں اسے اپنے پیارا کاروبار اور مل لگا کر تھا۔ وہ ایک انتہائی سخت مزاج، حاکمانہ طبیعت کے شخص تھے۔ ان کی حکمرانہ طبیعت کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اموجان ان کے آگے مڑتے، سر جھکا کر رہا کرتی تھیں۔ اس کے پیارا اموجان کی شادی اگر بھی تھی تو اس میں سارا کامیاب اکمل اس کی اموجان کے مہر ہوا۔ اور خاموشی کا تھا۔ ان کی ماں، ان کے باپ کے آگے بیٹی رہتی تھی اور وہ دونوں بھائی باپ سے اپنے اپنے طور پر خوف زدہ رہتے تھے۔

زین تو شہریار خان کے آگے کچھ بولتا ہی نہیں تھا۔ اس سے چونکہ وہ خود بہت زیادہ بات کرتے تھے، اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے تو وہ ان سے سر جھکا کر ہی بولتا تھا۔

اس سب کے باوجود ہر حال اسے اپنے پیار سے ہمارا تھا۔ اسے اپنی اموجان سے عشق تھا اور وہ اس کا پیارا سا چھوٹا سا بھائی تھا۔ اس میں فو اس کی جان تھی۔ وہ اس سے صرف دس ماہ چھوٹا تھا مگر اسے یوں لگتا جیسے وہ اس سے بہت چھوٹا ہے۔

اپنی ساری محبت، ساری محبت اس کا زین پر بھجوا کر دینے کو مل چاہتا تھا۔ وہ اس کی بہت پروا کرتا تھا۔ بہت خیال رکھتا تھا وہ اپنے سب کھلنے والی ہر چیز زین کے ساتھ نہیں کرنا تھا مگر اس کی خیر خواہی جواب زین نے ہمیشہ ملتی ہی سے دیا تھا۔

وہ کبھی بھی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ آخر زین کو اس سے شکایت کیا تھی؟ وہ کیوں اتنا اکڑا اکڑا اور خفا رہتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے وہ زین کے اس رویے کا عادی ہو جاتا گیا۔

یہاں تک کہ زین کا اس کے ساتھ صرف لائقانی اور بے لگائی والا رشتہ ہی باقی رہ گیا۔ وہ بتا زین سے قریب ہونے کے جتن کرنا وہ لائقانی اس سے دور بھاگتا تھا۔

وہ لاشعور میں ابھرتی اس خوفناک بات کو کبھی شعور

سب کچھ اس کے لیے شہریار خان نے سوچا تھا۔ اس کی پسند اور مرضی کا کہیں کوئی دخل نہ تھا۔ انہوں نے اسے بچپن میں بھی دوسرے بچوں کی طرح لالچائی، شرارتی اور لاپرواہ نہ رہنے دیا تھا۔

وہ شہریار خان کا بڑا بیٹا ہے۔ اسے شہریار خان کا نام اونچا کرنا ہے۔ بچپن کا بے فکر اور بھی اس نے دوسریوں اور نیکوئی کو خود پر مسلط کر کے گھٹا دیا تھا۔ وہ نہ دوسرے بچوں کی طرح اپنی مرضی کے کھیل کھیل سکتا تھا نہ اپنی مرضی سے سوار چاک سکتا تھا۔ جو کھیل پیلا کہیں گے وہ صرف وہی کھیلے گا وہ باپ سے ڈرتا تھا وہ ناراض ہوتے تھے تو ان کی آنکھوں کی تختی اسے بہت ڈراتی تھی۔ وہ چیخنے چلاتے نہیں تھے ان کی سرکارتی پوری نکالیں ہی اسے سہانے کے لیے کالی ہوا کرتی تھیں۔

دوسرے لوگوں کو شاید وہ باپ کا ڈلا نظر آتا ہو گا کہ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے مگر وہ جانتا تھا اس کی اموجان جانتی تھیں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ سکندر کی تعریفیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ وہ اپنی خوشی، اپنی مرضی اور اپنے بچپن سے دستبردار ہو کر باپ کی تابع داری کیا کرتا تھا۔ اپنے بچپن، اپنی نوعمری اور نوجوانی کے ہر کھیل کو وہ فخر اور انجوائے منت کی قربانی دے کر وہ باپ کو خوش کر دیتا تھا۔

زین براب کی طرف سے اس طرح کے کوئی پریشہ نہ تھا۔ اسے کبھی بھی زین پر شک آیا کرتا۔

پھر یہ سوچ کر خوش ہو جاتا کہ چلو باپ کی جانب سے تمام پریشہ اور سختی وہ خود جھیل کر زین کو اس پریشہ سے ہمارا ہے تو اچھا ہی ہے۔ ان دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک تو ہر وقت کے اس دباؤ سے خود کو بچالے۔ وہ بار بار محسوس کر دیتا کہ ان کے معیار پر پورا اترنے کے دباؤ سے آزاد ہو کر وہ زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

کبھی وہ باپ کی نصیحتوں، واوچی اور ان جیسا بننے کی باتیں سنتے سنتے لگتا تو اسے اپنی ذہانت بری

تھیں ڈائجسٹ 2012

اس نے زمین سے فون پر بات کی کہ منگنی ہو، تمہیں ملے
آگے یہ کہ منگنی کی خبر کی دوزخ سے خوش تھا مگر زمین کے
شک اور حسد سے انکار نے اسے بالکل کم صم سا کر دیا
تھا۔

زمین کے لیے اس کا ہونا یا نہ ہونا بالکل بھی اہم
نہیں تھا بلکہ اسے زمین کے لیے کی بے موتی سے یہ
احساس ہوا تھا جیسے زمین چاہتا ہے کہ وہ اس کی منگنی
میں شریک نہ ہو۔

وہ کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا تو زمین اور ام مریم
کے لیے الگ الگ تحائف لایا۔ وہ بھائی سے بہت
دقوں بعد مل رہا تھا اپنی ہونے والی بھانج سے بھی وہ
پہلی بار مل رہا تھا۔ اس لیے بہت خوش تھا۔ اس کی
فرمائش پر امو جان نے اسے زمین کی منگنی کی تصویر
بجھتی تھیں اور ان میں اسے اپنی بھانجی سے بہت اچھی لگی
تھی۔ اس کے بھائی کو ایسی ہی پیاری سی لڑکی ملنی
چاہیے تھی، مگر جب وہ اسے گھر آیا تو زمین اس سے
اسی انداز میں ملا جیسے بیٹہ ملا کر تھا ہے گا لگی اور بے
رحمی بولتا انداز۔ اور ام مریم؟

وہ اس سے زندگی میں پہلی بار مل رہا تھا وہ اس کے
بھائی کی منگنی اور ہونے والی بیوی ہے اس کی بھانجی
ہے وہ اس سے اسی انداز میں ملا تھا جو اس رشتے کا
تھا تھا مگر سب کے درمیان بیٹھے پتا نہیں کیوں اسے
ایسا لگ رہا تھا جیسے ام مریم اسے بہت غور سے دیکھ رہی
ہے۔ وہ اس کی طرف نہ دیکھتا تو وہ نگاہیں اڑھرا دتر کرتی
وہ نگاہیں جتنا تو وہ پھر اسے دیکھنے لگتی۔ شاید وہ اس سے
پہلی بار مل رہی تھی اس لیے اسے اس طرح دیکھ رہی
تھی۔

وہ اگلی صبح بھی گرم خوشی اور محبت سے ام مریم سے
باتیں کرتا تھا۔ زمین کو تو دوسری گفتگو میں شریک کرنے
کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ ام مریم
اس کے بارو میں پڑھنے سے متاثر ہو رہی تھی چنانچہ
نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کی شخصیت
سے متاثر ہو رہی تھی مگر اس نے اس بات کو بہت
مثبت انداز میں لیا تھا۔

کی سطح پر قصد نہیں لایا تھا کہ زمین اس سے نفرت
کرنا ہے۔ زمین بس مزید تلخ ہے۔ فاطمہ اپنے
انکڑے بھائی سے نفرت کیوں کر سکتا ہے؟ وہ اسے
پاپند کیوں کر سکتا ہے؟

یونیورسٹی جا کر تو زمین اس سے اتنا دور ہو گیا تھا کہ
مہینوں بعد ہی اس کی شکل دیکھ پاتا تھا۔ اسے اس
ایجنٹس فون کرتا تو وہ اس کی فون کل جیسے محال
مجبوری سن لیتا اکھڑے لمحے میں اس کے سوانہوں کے
جواب دیتا۔ چند منٹوں کی بات کے بعد ہی وہ اپنی کسی
مصروفیت کا پتہ کر مکتو جسم کر دیتا تھا۔

زمین کا اکثر مزاج اس کی بے گانگی کو چاہے جتنا
بھی دلگھاتی مگر وہ زمین سے بھی کچھ نہ کھا کر نہ ہی کبھی
زمین کی بے گانگی کی اس سے شکایت کیا کرتا۔ البتہ وہ
دقوں اس رنج میں مبتلا رہتا کہ اس بھائی فون پر اس
کی آواز سننا تاکہ گوارا نہیں کرتا۔ زمین کے کسی بھی
دوسے کو نہ اس نے کبھی اس سے ٹکس کیا تھا نہ ہی
باپ سے۔ وہ بھائی کے خلاف ماں باپ سے کچھ نہ
نہیں چاہتا تھا۔

زمین نے اپنے لیے کسی لڑکی کو پسند کر لیا اسے یہ
بات امو جان سے پتا چلی تو اسے حقیقتاً بھائی کے لیے
بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیا یہاں اب اس لڑکی کے آجانے
کی وجہ سے اس کے بھائی کے مزاج کی کمی اور گروا میں
کم ہو جائے۔ زمین نے اسے اس قہر میں سمجھا کہ
اپنی زندگی میں اتنی اس خوشگوار تبدیلی کو اس سے شہر
گرتا اس بات پر وہ محسوس کرنے سے پہلے ہی وہ بھائی
کی خوشی کا سوچ کر ہی خوش ہونے لگا تھا۔

اسے زمین اور ام مریم کے رشتے کی ساری
تفصیلات امو جان سے پتا چلا کرتی تھیں۔ اس کی
ہونے والی بھانجی کا نام ام مریم تھا۔ امو جان نے اسے
دیکھا نہیں تھا مگر بغیر دیکھے بھی اسے پتا تھا جیسے اس
کے بھائی نے چنا ہے، وہ بہت پیاری لڑکی۔

وہ دل و جان سے زمین کی منگنی میں شرکت کرنا چاہتا
تھا۔ مگر زمین کے لیے اس کی شرکت پر گراہم نہیں
تھی۔

احساس دلدار بنا جاتا تھا۔

یہ بات ایسی تھی کہ نہ اسے کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سب کو ام مریم کی کم عمری، نادانی اور بچکانہی سمجھ رہا تھا۔ اپنے دوستوں کو اس نے بے شک سرور و خشک بنالیا تھا مگر وہ اسے کوئی بری بڑی ہیز کر نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر وہ لڑکی ہر اچھے کلمے سے یہ بتا رہی تھی کہ وہ نادان نہیں ہے وہ بچی نہیں ہے۔ وہ ڈرائی فوٹس کھاتی دی دیکھ رہا تھا تب ذہن کے سامنے اس کی موجودگی میں وہ اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ اس کی پلینٹ سے ڈرائی فوٹس کھاتے اور اس کے ہاتھ سے ریموٹ لیتے ام مریم نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ بدلتی حالت سے اسے جواب دینا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اسی رات ان کے گھر ہونے والی پارٹی میں وہ بطور خاص اس کے پاس آئی تھی۔

”بہت چنڈ سم لگ رہے ہو تم سکندر! آج اس پورٹی پارٹی میں تمہارا سیکسیسا کوئی ایک فرد بھی نہیں لگا رہا۔“

اسے اندر ہی اندر بہت دکھ بھی ہوا تھا اور ام مریم کے اوپر غصہ بھی آیا تھا۔ وہ پوری طرح تکی، غمور کی اس کی تعریف کرتی اسے اپنی جانب سٹائل کرنے کی کوئی چھٹی کو شش نہیں کر رہی تھی۔ وہ اپنی نگاہوں سے اسے پسندیدگی کا دھواں پھینک رہی تھی۔

”تھینکس۔۔۔ ویسے مریم امیرا خیال ہے میں تم سے عمر میں زیادہ بڑا نہ سہی مگر رشتے میں تو بڑا ہوں۔ تم مجھے سکندر بھائی بولا کر تو زیادہ بہتر ہے۔“

بغیر مسکرائے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں یہ تنبیہ موجود تھی کہ ام مریم ان کے رشتوں کا احترام یاد رکھے۔

”اسی حسین لڑکی تعریف کرے تو کیا یہ قبول سا جواب دیا کرتے ہیں؟“ وہ مسکرا کر بولی تھی۔

”ہونے والی بھائی تعریف کرنے پر بالکل چھوٹی ہوں جیسی لگتی ہو تو یہی جواب دیا جاتا ہے۔“

وہ بات مکمل کرتے ہی وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

ذہن وہیں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور وہ لڑکی ذہن کی

اس نے تو اس بات پر بھی ہرگز کچھ نہیں سوچا تھا کہ ام مریم اپنی شخصیت کی خوبیاں، غیر معمولی ذہانت اور خود اعتمادی، تصداق اس کے سامنے نمایاں کھل کر رہی تھی۔ اگر اس کی جتنی حس اسے کچھ بتا بھی رہی تھیں تو وہ اسے جان بوجھ کر اپنی سوجھ بوجھ میں آئے نہیں دے رہا تھا۔ وہ ام مریم کی خوب پر غیر معمولی توجہ کو اپنا دھم سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر اسے اپنا دھم سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اسی شام جب وہ سب ڈنر کرتے تھے تب ام مریم نے زمین کے برابر بیٹھنے کے بجائے اس کے برابر والی کرسی بیٹھنے کے لیے تخت کی تو مسمیٰ اور نے اس بات کو محسوس کیا، وہ یانیں اس نے ضرور محسوس کیا۔ ام مریم کھانے کے دوران زمین کو نظر انداز کر کے سارا وقت اس کی جانب متوجہ رہتی تھی۔ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

اسے حیرت بھی، دلکشی بھی اور وہ کبھی نہ ام مریم ایسا کیوں کر رہی تھی۔ کیا اس سے یہ اچھالنے میں ہر دبا تھا، سناہ اور نادان تھی، یا وہ جان کر زمین کے بجائے اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وجہ جو بھی تھی اس کے دل کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔

وہ تصداق سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ام مریم کے ساتھ اب بے تکلفانہ بات چیت نہیں کرے گا۔ مگر اسے اس ڈنر کے دوران بھی اس ڈنر کے بعد بھی گھر آکر بھی اچھی صبح بھی ام مریم اپنے ہر انداز سے اسے یہ یاد دہانی تھی کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہے۔ وہ اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔

وہ بڑے خاص انداز سے اسے دیکھ کر مسکراتی۔ اسے یہ مشکل دے رہی تھی کہ وہ اسے پسند کر رہی ہے اور وہ اس کی ان نگاہوں کو یوں نظر انداز کر رہا تھا جیسے ام مریم کی توجہ کے معنی سمجھ ہی نہ رہا ہو۔ شاید کم عمری کی وجہ سے ام مریم اس طرح کی حرکت کر رہی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ اپنا دھم سرور و خشک سا بنالیا تھا۔ وہ اپنے رویے سے اسے اس کی غلطی کا

دو دنوں گاڑی میں ساتھ جا رہے تھے۔ وہ قصداً "سجیدہ" اور لیا سا تھا۔

ام مہریم اپنی بہن اور اوصاف کے عام موضوعات پر بات کر رہی تھی اور وہ سجیدہ کی سے ایک بڑے بھائی کا سالانہ زنا باس کی باتوں کے جواب دے رہا تھا۔

"تمہاری معلومات کتنی زبردست ہیں سکندر! تمہارا مطالعہ کس قدر قابل رشک ہے۔ ہادیو میں بڑھ رہے ہو تو بائبل ٹیک بڑھ رہے ہو۔ تم وزیر درگاہ کرتے ہو وہاں پڑھنا بہت خیر معمولی ہو تمہاری پرستاشی بہت گریز جنک اور شاندار ہے" باتیں کرتے کرتے وہ ایک مہی بولی تھی۔

"توہ جنکس مہریم!" اس نے قصداً "خاموشی" کیے بڑے پن کے ساتھ ہلکی مسکراہٹ چہرے پر لاکر اسے یوں جواب دیا جیسے اس کی تعریف میں چھپی کوئی بات اس نے محسوس نہیں کی ہے۔

"زمین تمہارے جیسا غیر معمولی زمین اور شاندار نہیں ہے۔ پتوں بولوں تو مجھے تم دونوں کے بھائی ہی نہیں لگتے ہو۔ کمال تمہاری اس قدر شاندار پرستاشی اور ذہانت کہاں زمین جیسا میڈیا کر (اوسط) درجے کا بہت ہے اس میں تم جیسی کوئی ایک بھی بات نہیں ہے۔ تم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے آگے تو زمین بائبل ہی معمولی سا لگتا ہے۔"

اسے مہریم نے زمین کی برائی کرنا بہت برا لگا تھا۔ "میرے بھائی کی برائی میرے منہ پر کرتے ہوئے تمہیں یہ سوچ لینا چاہیے مہریم کہ میں آپ بھائی کے خلاف ایک لفظ بدواشت نہیں کر سکتا۔" اس نے خفا سی نگاہوں سے ام مہریم کو دیکھا تھا۔

"میں برائی نہیں کر رہی۔ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ تم راہ چلتے کسی اجنبی شخص سے بھی زمین کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے پوچھ لو کہ تم دونوں میں سے کون زیادہ اچھا لگتا ہے تو وہ تمہاری سے کہہ رہی ہوں۔"

"زمین بہت قریب لڑکا ہے مہریم! اس میں ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جو تمہیں میں نہیں۔ تم خوش قسمت ہو جو

آنکھوں میں دخول چھوٹ رہی تھی۔ اس روز اسے اپنی پار زمین کے انتخاب پر افسوس ہوا تھا۔ وہ جو اپنی شخصیت کی تمام تر خوبیوں اور خصوصیات کا بھرپور استیصال کر کے زمین کے بھائی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کیا کرے؟ وہ کس سے کہے یہ بات؟ کیسے کہے یہ بات؟ وہ بری نہیں ہو گیا تھا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ام مہریم اور زمین دونوں کی کو نظر انداز کر کے پرستاشی اور انتخابات کا ہمانہ بنا کر زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جلد انو جلد مرثیہ واپس چلا جائے۔ شہر شہر خان کی مرضی اور اجازت کے بغیر وہ واپس جانا نہیں سکتا تھا۔ اور انہوں نے اس کے لیے کسی پروگرام طے کیا تھا کہ وہ چٹیاں ختم ہوئے تک نہیں پر رہے۔ لہذا چٹیاں کے دوران شہر خان اسے اپنے مختلف دوستوں اور واقف کاروں سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اس کے عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے انتہائی ضروری تھا کہ اسے شہر خان کے بااثر ملے جانے والوں میں رہنا پڑا اور باقاعدہ تعارف حاصل ہو سکے۔

سب بینک پر جا رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گھر پر رک جائے مگر وہ اپنے منہ نہ جانے کی کیا توجہ پیش کرتا؟ شہر خان نے یہ پروگرام اپنے دونوں بیٹوں اور ہوسے والی ہو کی خاطر ہی بنایا تھا۔ سب گھر سے نکل رہے تھے۔ بالکل آخری لمحوں میں اپنا کمرانہ لٹنے کا ہمانہ بنا کر ام مہریم نے ایسی صورت حال پیدا کی کہ گھر سے نکلنے والے آخری دو افراد وہ دونوں رہ گئے تھے۔ وہ اس کا کمرہ چھوڑتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس لڑکی کا کیا ایک ڈراما ہے یا گدیہ چنگ اسپاٹ تھا۔ سکندر کے ساتھ اس کی گاڑی میں جا سکے۔

اسے ام مہریم کی خود پر توجہ سمجھ میں آچکی تھی مگر ابھی تک اس لڑکی کے شاطرنہ دماغ تک وہ پہنچ نہیں آتا تھا۔ وہ اسے ایک نادان اور جذباتی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی۔ وہ

مجھ جیسی لڑکی تمہیں رضا میں کوئی اور نہیں ملے گی۔
اپنے دل سے پوچھو کیا تمہارا دل میرا ساتھ نہیں
چاہتا؟ کیا تمہارے دل کی یہ آرزو نہیں کہ تمہیں مجھ
جیسی لڑکی کا ساتھ ملے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے
بنے ہیں سکندر! ہمارا ملنا بے شک بہت عجیب حالات
میں ہوا ہے، تمہارے لیے یہ نہ تھامی آگورڈی پروجیکشن
ہے، میں تمہارے بھائی کی منگیت ہوں، میں تمہاری
انجمن سمجھ سکتی ہوں، مگر پینڈاؤن کامت سوچو، لوگوں
کامت سوچو۔ اپنا سوچو۔ میں تمہاری خاطر آج اور
ابھی زمین سے منگتی توڑنے کے لیے تیار ہوں، میں تم
سے محبت کرتی ہوں سکندر! میں اپنی ساری زندگی
تمہارے نام کر رہا تھا ہوں۔“

اس کے اسٹیرنگ پر زور دے گا، اس کے اوپر ام مریم نے
اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے ایک منگیت سے اس کا ہاتھ
پرے رکھ لیا تھا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔ وہ تیز آواز میں
چلایا تھا۔

”سٹ ایب ام مریم! جسٹ سٹ ایب! کس طرح
کی لڑکی ہو تم؟ تمہارے اندر رشتوں کی کچھ عزت ہے
کہ نہیں؟“

اپنا اشتعال قابو کرنا وہ شدید برہمی سے ام مریم کو
دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ وہ بالکل خاموش رہا تھا۔ پھر جب
اس نے اپنے غصے پر کچھ قابو پالیا تب انتہائی سخت لب
لہجے میں اس سے پوچھا۔

”اس طرح کی گھٹیا بات مجھ سے بھرت کھانا مریم!
تم سے میرا صرف اور صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ
تمہارا زمین کی منگیت ہونا ہے۔ یہ گھٹیا باتیں کر کے
میرے دل سے اپنی عزت ختم نہ کرو۔“

اس نے سخت لب و لہجے میں اسے ڈانٹنے کے بعد وہ
سمجھ رہا تھا کہ ام مریم کی آج کے بعد دوبارہ ایسی بات
کرنے کی جرأت نہیں ہوگی، مگر وہ غلط تھا۔ وہ پینڈاؤن
سے زراہ شدت سے اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔ وہ پینڈاؤن
کے دوران سارا وقت اس کے آگے پاس رہنے کی
کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کا قصد اور نیت یہ تھی کہ
اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ

تمہیں زمین کا ساتھ ملا ہے۔“ اس کے لیے میں سختی
منجی تھی۔

”ہاں! زمین اچھا ہے، پر تم جیسا نہیں ہے۔ میں اگر
تم سے پہلے مل چکی ہوتی تو زمین میرا انتخاب نہ
ہوتا۔ مجھے ایکسٹرا آؤڈری (خیر معمولی) آؤڈین اور لیڈر
شب کی صلاحیت رکھنے والے مری پینڈاؤن ہیں۔ خود مجھ
میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ کائنات زمین سے منگتی
کرنے سے کل میں تم سے مل لیتی ہوتی۔ تمہیں یہاں
پہلی نظر دیکھ کر ہی میں وہ کہہ گئی تھی سکندر! تم ہو سو
میرا آؤڈین ہو۔ میرا آؤڈین مل جیو مجھے لگتا تھا کہ میں وجود
نہیں رکھتا۔ تب ہی تو میں زمین سے پیٹ لیا کر کے ساتھ
سمجھو! اگر پینڈاؤن تھی۔ تمہیں نہیں لگتا سکندر! میں اور
تم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں؟ ہم میں بہت
Compatibility (مطابقت) ہے۔“

وہ بہت دلنشین لہجے میں یہ باتیں کر رہی تھی۔ اگر
اس کی جگہ کوئی اور میں ایسی سال کا لڑکا ہوتا تو اتنی
حسین لڑکی کے لیے اسے اپنی عمر میں سن کر خوشی سے
سرا توں آسمان پر پہنچ جاتا، جھوم جھوم جھوم جھوم جھوم سکندر
شہسوار۔ اتنا چ اور گھٹیا نہیں تھا۔ اسے ام مریم کی
باتیں سن کر غصہ لگنا تھا۔ اس نے شدید غصے اور
ناراضی سے ام مریم کو دیکھا تھا۔

”میں اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہیے مریم!
تم میرے بھائی کی منگیت ہو، میں تمہاری بہت عزت
کرتا ہوں۔ پینڈاؤن رشتوں کا احترام کرنا سیکھو۔“

اس کا لہجہ جیسے ہی تھا۔ اسے خود اپنے آپ میں
بڑی شرم آ رہی تھی۔ وہ کہہ بھی ہو رہا تھا کہ اس کے بھائی
کی منگیت تان سے بہن کی طرح کی باتیں کر رہی تھی۔
اسے کئی طرح غار ہو جانے، ہر منٹے والے انداز میں
دیکھ رہی تھی۔

”ابھی میری زمین سے شادی نہیں ہوئی ہے سکندر!
صرف منگنی ہوئی ہے جو توڑی بھی جاسکتی ہے۔ مجھ
سے اگر ایک غلط فیصلہ ہو گیا ہے تو ابھی میں اسے ٹھیک
کر سکتی ہوں۔ صرف ایک انگوٹھی ہی تو ہے میں زمین
کو لوٹاؤں گی۔ تم زمین کامت سوچو سکندر! اپنا سوچو۔“

سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ نہ شہسار خان اور نہ ہی انہو جان سے اس کی بات پر توجہ دی تھی۔ انٹازین اس سے خفا ہو گیا تھا کہ اس نے مریم سے بدظلمانی سے بات کی تھی۔

فہانت سے کام نہ چل دیکھ کر ام مریم نے اسے راضی کرنے کے لئے اپنی خوبصورتی کو استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے قصداً بہت تیار ہو کر آتی۔ اپنی بے تحاشا خوبصورتی اس پر ظاہر کرتی۔ اس طرح کہ کوئی کم عمر لڑکا تو کیا کوئی بڑی عمر کا مرد ہو تو وہ بھی ہلک جاتے اس نے ام مریم کو خطرناک انداز کرنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔

اس نے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ پھیلیاں ختم ہونے پر جب زین اور ام مریم یہاں سے چلے جائیں گے تب

سب کے سامنے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اسے مریم کے ساتھ باتیں کرنے، ہنسنے، ہنسنے، ہنسنے کسی بھی چیز میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

زین کو ام مریم پر غار پوتا دکھ کر اسے زین پر بہت افسوس ہوا تھا۔ شریفہ رنج ہو رہا تھا۔ اس کا ایک باز نہیں لگی بارہل چاہا تھا وہ زین کو اکیلے میں اپنے پاس بلا کر یہ بات چاہے کہ جس لڑکی پر وہ نوازہ دار اپنی چاہتیں اور محبتیں نثار کر رہا ہے وہ آج ہلک پڑا کرتے ہوئے سہارا زراست زین کا مذاق دلاتی آئی ہے۔ وہ زین سے کہنا چاہتا تھا کہ زین یہ لڑکی تمہاری چاہت اور محبت اور زور نہیں کرتی۔ وہ لڑکی تجھ ہی محبتیں دیتا کر اس کے بھائی کو بے وفاء بنا رہی تھی۔

وہ زین کو ام مریم کی ایک نایک بات یاد دہا رہا تھا۔ مگر کیا زین اس کی کوئی بات سنے گا؟ زین اس سے جتنا بے زور و تدبیر اور خفا رہتا تھا۔ جتنا وہ اس کی بات سننے سے پہلے ہی اٹھ جاتا۔

وہ لڑکی زین کی آنکھوں کے سامنے اسے اپنی محبت سے بے وقوف بناتی اس کے تعلقات پر دھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا ہنس نہیں چل رہا تھا وہ زین کو کسی بھی طرح جہ بات بتا دے۔ مگر زین کا اپنے ساتھ مرد اور خنک رویہ اسے کچھ کہنے ہی نہیں دے رہا تھا وہ بہت گرا۔ پھر زین کی نگاہوں کی بے گنجی اور نفرت۔ کسکو بہت ٹوٹ سی جاتی۔

اسے ام مریم بہت بری لگ رہی تھی۔ وہ ملوہ اور ناراض نہیں بہت چلاک لڑکی تھی۔ اسے زین کی مصیبت اور سزاؤں پر غصہ آ رہا تھا۔ زین اس طرح اندھا اندھ کیوں کر آتا اس لڑکی پر؟ زین کو اس لڑکی کے ارادوں کی خبر کون نہیں ہو رہی تھی؟ مگر زین تو انہی چھوٹا سا لڑکا لڑکی کے تو اس کے پاپا تک کو اپنے ہمارے میں سے رکھا تھا۔ شہسار خان ام مریم کو اپنی بے وفائی کے طور پر دل و جان سے قبول کر چکے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔

اس نے بے لطفوں میں انہیں ام مریم کے متعلق ان کی کوشش کی تو انہوں نے اس کی بات کو سہ سے



وہ اس کے بالکل نزدیک آگئی تھی۔ اس نے اپنی
یا نہیں اس کے گلے میں ڈالی تھیں۔ وہ اس کے اس
قدر نزدیک تھی کہ وہ اس کی ہانسیں اپنے چہرے پر
محسوس کر رہا تھا۔

”جسٹس ماں سے۔۔۔ اس نے اسے دھکیل کر خود سے
دور ہٹانا چاہا تھا مگر وہ اپنی نہیں تھکی۔ وہ دعوت گزار دینی
خود کو اس پر بھجوا کر رہی تھی۔

”فرشتہ بننے کی کوشش منت کرو سکندر! تم ایک
لڑکے ہو تمہارے سامنے ایک حسین لڑکی کھڑی
ہے۔ جو تم پر مرث جلی ہے۔ اپنا آپ تمہارے
قدموں میں بھجوا کر چکی ہے۔ تم رنج و گدہ ہو تمہارا
دل تم سے کہہ رہا ہے۔“

”اس نے ایک زود دار طمانچہ اس نے غیرت لڑکی
کے منہ پر مارا تھا۔ وہ جو اس کے گلے میں بائیس ڈالے
خود سیرگی کے عالم میں کھڑی تھی اس پھرتے کے لیے
ہرگز تیار نہیں تھی۔ اوندھے منہ پیچھے گری تھی۔ اس
نے ام مریم کے پاس زمین پر تھوکا تھا۔

”ہمت خلیا! ہمت بچ لڑکی ہو تو ہمت میں خود تو کیا۔ اب
میں زمین کو بھی تم سے شادی نہیں کرنے دیں گا۔ ایسی
بد کردار لڑکی میں اپنے بھائی کی زندگی میں بھی نہیں
آسے۔“

ام مریم فرش پر بہت دایس اٹھی تھی۔ یہ کسی ناگس
کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ بھکاری تھی۔

”ام مریم کو ٹھکرانے کی ساری زندگی کوئی ہمت
نہیں کر سکا ہے۔ سکندر شہزادہ لوگ ام مریم کے پیچھے
آتے ہیں۔ تم پہلے شخص تھے جس کے پیچھے ام مریم
آئی تھی۔ جس پر ام مریم حقیقت میں مڑی تھی۔
مجھے پتہ چلا کہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے سکندر۔ تم نے
اپنے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا سکندر۔“

وہ نفرت سے بھنکارتی دھمکی آمیز نیچے میں اپنی
ہات پوری کرتے ہوئے اس کے کمرے سے جلی اپنی
تھی۔ وہ شرم اور غیرت سے لٹی دوزخ تک ٹھٹھکیاں
کھڑا رہا تھا۔ وہ ہرگز ہرگز اس کے بھائی کے قابل نہیں

وہ اپنا بڑا ایک دہانہ لے گا۔ اور کوشش کرنے کے لیے
ہات امو جان کو تو ضرور تیار کر جائے گا۔ وہ سارا سارا دن
اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔ وہ صرف کھانے اور ناشتے
کے لیے کمرے سے نکلا کرتا تھا۔ وہ اس کا سامنا ہی
نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ لڑکی اپنی کوششوں میں ضرور
تھک رہی تھی نہ ہی بار بار دہی تھی۔

وہ تیس دسبر کرات تھی جب وہ اپنے کمرے میں
تھا۔ وہ خود کو نصیحت پر بھائی میں مصروف کیے ہوئے
تھا۔ یہ اس کے غم میں تھا کہ شہزادہ خان اور امو جان
کسی پابلی میں گئے ہوئے ہیں مگر زمین کہاں چلا گیا تھا
اسے پتا نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر کتاب لے کر بیٹھا تھا تب
اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر
دیکھا تو وہ ام مریم تھی۔

اس سے پہلے تک وہ جو کچھ کرتی رہی تھی وہ اس پر
جبران ہوا تھا۔ نشان ہوا تھا۔ گھبراہٹ تھا۔ وہ کچھ میں مبتلا ہوا
تھا۔ مگر تین دن جس طرح اس کے کمرے میں آئی گئی
دیکھ کر وہ شرم سے پالی پالی ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت
قیامت کے روپ میں اس کے سامنے بڑی اواسے
کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی انتہائی مختصر سی ٹانگی
پیرس رچی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ خوبصورت منگ
اپ کیا ہوا تھا۔ خوشبوؤں میں مسکتی وہ ایک زندہ
قیامت بنی کسی بھی ذہن ہوش مرد کی پار سائی کا کڑا
انتخاب بن سکتی تھی۔

اسے اس روپ میں دیکھ کر کوئی گنتا بھی پار سا ہو،
ہنگ سکتا تھا۔ پیدا احساس شرم اور غیرت کا تھا جو اس
کے اندر پیدا ہوا تھا اور اگلا شدید ترین اشتعال لگ۔ وہ
ایک دم ہی شدید فتنے کے عالم میں ہیڈ سے اٹھا تھا۔
”نہ کیا بد تمیزی ہے مریم!“ وہ اس کی طرف دیکھ
نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر تھیں۔
ام مریم اسے خود سے نظریں گھڑا تو کہہ کر کھل کھلا
کر ہنسنے لگی۔ اس کے پاس آگئی تھی۔
”تمہاری طرف دیکھنے سے کیوں ڈر رہے ہو سکندر!
کیا اپنے ہنگ جانے کا ڈر ہے؟“

تھا۔ زمین اس سے ختم نہیں رہتا تھا وہ اس سے بد گمان نہیں رہتا تھا وہ مزاجاً ہی نہیں تھا وہ اس سے نفرت کرتا تھا شدید نفرت۔ وہ اسے اپنا دشمن سمجھتا تھا اپنا سب سے بڑا دشمن۔ پہلی بار لا شعور سے نکل کر یہ بات اس کے شعور میں آگئی اسے ہمارے بھی کہ اس کا چھوٹا بھائی اس سے نفرت کرتا ہے، شدید ترین نفرت۔

وہ کہہ دوڑ صدمے سے گنگ کھڑا تھا۔ زمین اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی خوشیوں سے حسد کر رہا ہے اس لیے ام مریم کے خلاف بول رہا ہے۔ اس نے زمین کو سچائی بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہاں نفرتوں کی آہیں دھند چھائی تھیں وہاں زمین اس کی کوئی بھی بات کیسے سمجھتا۔ وہ اس بد کردار اور مکار لڑکی کے سحر میں بری طرح گرفتار تھا۔

زمین اپنی نفرت کا سارا زہر نکل کر اس کے کمرے سے چلا گیا۔ وہ کتنی دیر باہر میں سرائی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ مجھ دیر کے بعد جب وہ خود کو اس کیفیت سے باہر نکال کر باہر بیویوں میں گھر کے اس نے سوچا کہ کیا وہ زمین کی نفرت کے آگے تھکنا ڈال رہا ہے، بار بار رہا ہے؟ اسے بھائی کی زندگی تباہ ہونے سے رہا ہے؟ نہیں وہ زمین کی نفرتوں اور الزام تراشیوں سے ہار نہیں رہے تھے۔

وہ آج ہی شہرار خان کو ساری بات بتائے گا۔ ایک ایک بہت ام مریم کی ساری سچائی۔ وہ شہرار خان کو ام مریم کا اصل چہرہ دکھا کر ہی دم لے گا۔ وہ اپنے بھائی کی زندگی تباہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ زمین کا ام مریم کے ساتھ رشتہ ختم کروا کر ہی دم لے گا۔ وہ شہرار خان کو ام مریم کی حقیقت اس کی گناہوں کی سچائی بتانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

تھی۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا چاہے کچھ ہو جائے وہ زمین کو اس بد کردار لڑکی سے شادی نہیں کرنے دے گا۔ وہ شہرار خان اور اپنی ام جان کو تو ساری بات بتا کر ہی دم لے گا۔ مگر اعلیٰ قیامت کی میز پر جب اس نے یہ بات شہرار خان اور ام جان کو بتانے کی کوشش کی تو بارے شرم اور غیرت کے بات مکمل طور پر اس کے لبوں سے اواہی نہیں ہو پائی۔

بہت کوشش کے باوجود وہ بچ بول نہیں پایا۔ اس کی زبان ٹکڑا گئی تھی۔ شرم اور غیرت نے اس کی نگاہوں کو جھکا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہرار خان جیسے ذہن شخص اس کے نامکمل جملوں ہی سے بات کی تھم کر لئی تھمک پیچ چاس کے مگر اس بد کردار چالاک لڑکی میں بھانے کیا ایجاد تھا کہ وہ جو لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پھپھان لیا کرتے تھے اس کے بتا دینے پر بھی بات کی سچائی اور سچائی کو سمجھ نہ سکے۔

زمین میں بچنا اور مصیبت تھی وہ اس لڑکی کی اصل فطرت کو نہیں جان پایا تھا مگر شہرار خان جیسے جہاں دیدہ شخص بھی اسے پہچان نہیں پاسکے تھے وہ اور ام جان ہم مریم کو ایک بہت اچھی اٹھا خاندان کی پاکر لڑکی سمجھتے تھے وہ اس کی بات کو اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

وہ جھوٹا کراشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ شہرار کی میز پر اس کی کسی باتیں زمین نے بھی سن لی ہیں۔ وہ ابھی اپنے کمرے میں بیٹھا آج ہی رہا تھا کہ سچائی کس طرح اپنے باپ باپ تک پہنچ جائے کہ زمین اس کے کمرے میں آ گیا۔ وہ زمین کو اپنے کمرے میں آنا دیکھ کر خوشی سے اٹھا تھا کہ برسوں بعد زمین نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زمین اس سے لڑنے آیا ہے، مگر وہ اس کے پاس آیا تو تھا ناکی ہے ختم ہو کر ہی تھی، مگر زمین اس سے لڑنے یا خانا ہونے نہیں آیا تھا۔

وہ اس پر اپنی نفرت ظاہر کرنے آیا تھا۔ وہ زمین کے زہر میں نیچے نفرت میں ڈوبے لاشوں پر مراکت کھڑا

زین کی زندگی میں زین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرہیز کرنا ہے۔ شہیار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی سنگینی ہو جاتی ہے۔ سنگینی کے بعد زین ام مریم کو سسٹے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنا ہے اس بات پر زین سکندر سے مزید برکتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھروالوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر بھڑانہ حملہ کرتا ہے مگر وقت زین اور شہیار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر بھڑانہ حملہ کرنے پر شہیار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہیار سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا ملے ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوستنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بیٹھا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر دوسرے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نئی کو ان کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے بارے میں سکندر سے محبت کرنے کی سبب لیزا ایم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا رہی ہے۔

ام مریم زین سے سنگینی ختم کر کے راپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہیار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں اسوجان دو کو لڑکا لگا کر لیتی ہیں کہ سکندر کو معاف کریں وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہیار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے بہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا رہتا ہے۔

سکندر دوبارہ چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

ایم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی لکھنؤ محمود خالد کی بیاہیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد مزیز تھی۔ اپنے شوہر شمس سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاں شمس ان کے ہر وقت جھگڑ کر رہتا ہے۔ سکندر کو وہاں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ نہیں دیتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوبارہ آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فکرس میں لیزا کی غنائش پر پہنچتا ہے لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیکٹو بیسین کا پیلاؤ ان گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت بھڑو ہو کر اسے اپنے نامی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ نہ امانت محسوس کرنا ہے اور نہ ہی چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا نامی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی تنگدست ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے اسے رجمانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انسانی گھبراہٹ ام لگا کر اسے اپنے گھروالوں کی نظروں میں ڈیل کر دیا۔

آکھڑی قلم

شہیار خان کو تلاش کرنا وہ اسٹڈی میں آگیا تھا۔ وہ وہاں موجود تھے مگر تنہا نہیں تھے۔ ان کے تین چار خاص ہم رجب دوست بیٹھے تھے۔ ان کے دوستوں سے سلام دعا کر کے وہ واپس پلٹ آیا تھا۔ وہ اب ان کے دوستوں کی دیوایی کا انتظار کر رہا تھا۔

امو جان چونکہ زین اور ام مریم کے ساتھ لوٹنگ روم میں تھیں اس لیے امو جان کے پاس جانے کی تو وہ کوشش ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس گھنیا لڑکی کی شکل تک دیکھنے کا دروازہ نہ تھا۔ پڑھائی کا بیانیہ ہٹا کر۔ وہ اپنے کمرے بند تھا۔

حساب سے وہ گھر پر تھا تھا۔ تب ہی جب اسے لوگک
روم میں کچھ کرنے کی آواز آئی تو وہ بری طرح چونکا۔ وہ
فوراً اپنے کمرے سے نکل کر بیچے آیا تھا۔

دوسرے دن ام مریم کو لوگک روم میں کھڑے دیکھ کر
حیران بھی ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نفرت بھی ابھر
آئی تھی۔ کل رات کی اس کی بے ہودہ حرکت کے بعد
اسے اس لڑکی کے لئے سوائے حقارت اور نفرت کے
کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

ام مریم پر سکون اور مطمئن کھڑی تھی۔ سینئر نیبل
کے پاس کرشنل کا گھڑان ٹوٹا ہوا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر
یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ گھڑان اسے متوجہ کرنے اور
یہاں بلانے کے لیے ہی لٹھا کر زور سے پھینکا اور توڑا گیا
تھا۔

وہاں چند اور بھی آرائشی اشیاء فرش پر گر گئی اور ٹوٹی
پڑی تھیں۔ وہ ذرا سا بھی اس لڑکی کی نسبت اور اس
کے ارادوں کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔

وہ وہاں ٹوٹی پڑی ان اشیاء پر نہ تو دھیان دے سکا تھا اور نہ
ہی ان کے گرائے جانے کی وجوہات سوچا تھا کیونکہ
مرٹنے والی نظروں سے اسے دیکھتی ام مریم اس کے
بالکل سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”ہاں میں۔“ وہ خمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہی
تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے قمیص کا
گرہ بان بڑی سہولت سے کھولا تھا۔ گردن سے بہت
نیچے تک پھر چنڑی جب سے اس نے ایک بلینڈ نکالا
تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی آواز سے اپنے

نایب پر کسی جگہ سے کٹ لگا رہی تھی وہ مسلسل اسے
دیکھ رہی تھی خود پسندی والے لہجہ میں ہمک جانے پر
گماہ کرنے والے انداز میں۔

”کنا مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ بھی نہیں ہوتا سکندر؟“
وہ نشیے کچھ میں بولتی ہوں کے بالکل نزدیک آگئی تھی۔
وہ اسے گمان کی ترغیب دے رہی ہے۔ وہ سوچ سکا
تھا تو اسے انداز ہے۔ وہ اس کے ارادوں کی محک بھی نہ پاسکا
تھا۔

اسو جان زن اور مریم کے ساتھ مستقل کیوں
نہیں۔ یہ جاننے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔
باب فیصلہ کے تمام اختیار شہیار خان کے پاس تھے تو پھر
یہ بات انہیں سے کی جانی چاہیے تھی۔ ان کے
اوست سارا دن ان کے ساتھ گزار کر شام میں اس
وقت گئے تھے جب ان کے اپنے جرم دوست کے
ہاں پارٹی میں جانے کا وقت ہونے لگا تھا۔ وہ ان کے
دوستوں کے چلے جانے کا سن کر فوراً کمرے سے نکلا
تھا۔ شہیار خان اپنے کمرے میں جا رہے تھے سکندر
نے انہیں پیچھے سے آواز دی تھی۔
”ابا! شہیار خان نے منہ کر کے دیکھا تھا۔“
”جیسے آپ سے بات کر رہی ہے۔“

”میں واپس آ جاؤں پھر رات میں بات کر لیتا۔ یہ
لوگ اتنی دیر سے اٹھے ہیں۔ میں پارٹی میں جانے کے
لیے لیٹ ہو گیا ہوں۔“

کھائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے اور اس کی مزید
کوئی بات سے بغیر شہیار خان اپنے کمرے میں چلے گئے
تھے۔

وہ ماوسی سے اپنے کمرے میں واپس آگیا تھا۔ اتنا تو
اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سے بغیر سو میں گئے
نہیں۔

اسے پتا نہیں تھا کہ یہ چند گھنٹوں کا انتظار کبھی نہ ختم
ہونے والے انتظار میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس کی
بات اب مرتے دم تک نہیں سنی جائے گی۔ وہ آج کی
پارٹی میں جانے کے لیے کل شام ہی منع کر چکا تھا۔ کل
شام تک ام مریم کا اصلی اور گھانا ڈاؤپ اس کے
سامنے نہیں آیا تھا۔

اس کے علم میں یہی تھا کہ گھر کے تمام افراد پارٹی
میں جا چکے ہیں اور وہ گھر پر اکیلا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا
کہ پیاری کاٹھونگ رہا کہ وہ بد کردار لڑکی بھی گھر پر کی
ہوئی تھی۔ نئے سال کا جشن منانے کے لیے شہیار
خان نے آج شام سے لے کر کل صبح تک کے لیے گھر
کے تمام ملازمین کو بھی چھٹی دے دی تھی۔ اپنے

وہ اس کے اوپر تھی۔ سکندر نے اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے اوپر سے ہٹا دیا تھا۔ وہ اس ناگہانی صورت حال میں گاڑی کی آواز بھی نہیں سن سکا مگر گاڑی سے تحائف جس نے جان بوجھ کر گھر والوں کو واپس بلانے کے لیے نکالے تھے اور جو گھر والوں کی دایس کی ہینڈلر تھی اسے گاڑی کی آواز کیوں نہ آتی۔

وہ یکدم ہی مسکرائی تھی۔ اس نے مریم کے چہرے پر ایک چمک آتی دیکھی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑے غمور انداز میں جھکی مگر ایک دم اس نے سکندر کے منہ پر تھوکر مارا۔ وہ اسے اشتعل دلانا چاہتی تھی اور وہ فوراً ہی اشتعل میں آ گیا۔ اس نے بہت غصے سے مریم کو بال پکڑ کر دھکادے کر ہٹایا تھا۔ ملتے جلتے بھی مریم نے چہرہ کر کارپٹ پر رکھا بڑا سا گلہ ان گرا دیا تھا جس کے گرنے سے بہت شور مچا ہوا تھا۔ مریم نے اپنے ناخن اس کی گردن میں پھوست کر رکھے تھے۔ اپنے ایک ہاتھ سے وہ مریم کے ہاتھ اپنی گردن پر ہلانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے تھے تاکہ وہ اس کی گردن پر سے اپنے ہاتھ ہٹا دے۔ ام مریم زہریلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اور پھر یکدم ہی اس نے ”ہیو، ہیو“ کی آوازیں نکالنی شروع کر دی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ اس باختم ساہوکار سے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

اور جب تک وہ سمجھ نہ سکا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ زین اشہار خان اور اموجین اندر آ چکے تھے۔ اپنے روکے جانے، ٹھکرانے جانے کا بدلہ دے اس کے گھر والوں کی نظروں سے گرا کر لیتا چاہتی تھی۔ اس نے غیرت لڑکی کی اپنی تو کوئی عزت تھی ہی نہیں چنانچہ خود کو اس پستی میں اتار لیتا اس کے لیے ذرا بھی دشوار نہ ہوا تھا۔

مریم دوتے ہوئے زین کے گلے لگی اور اس پر اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا الزام لگا دیا تب غصے سے بالکل

جس نظروں کو وہ غمور، لاشی اور دعوت مناد دینی نظریں سمجھ رہا تھا ان میں جیسی انتہام کی ایک پہچان ہی نہ سکا تھا۔ گھر کا اس روم لاہری کی آواز کتابوں سے نکل کر دنیا کو ابھی اس نے ٹھیک سے سمجھا نہیں تھا۔ وہ ساہ معصوم اور بے وقوف و نادان زیادہ تھا یا وہ ناگن صفت لڑکی چالاک، مکار اور شاطر زیادہ تھی جو اس کے گھر کے لوگ روم میں اپنی مرضی کا ماحول اور صورت حال پیدا کر رہی تھی۔

”جو تھوڑا بہت لباس تمہارے جسم پر پالی ہوا ہے تم اسے بھی اتار کر پھینک دو۔ میں جب بھی تمہارے اوپر تھوکر مارا تک پسند نہیں کروں گا۔“

وہ نفرت اور حقارت سے اسے جواب دیتا وہ اس سے واپس ہٹ جانا چاہتا تھا کہ ام مریم نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچ کر روک لیا۔

”گناہ غور کس بات پر ہے تمہیں سکندر شہیدار!“ یوں پوری طاقت سے گریبان کھینچے جانے سے اس کی قمیص کے کئی بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس کی قمیص کا گریبان پھٹ گیا تھا۔ وہ دھکار کر اسے پیچھے ہٹا چاہتا تھا کہ ام مریم نے زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔

وہ لوہان لڑکا تھا اس لڑکی کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور۔ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے جواب میں بھرپور طاقت کے ساتھ ام مریم کو دھکے پھیر مارے تھے۔ اس کی انگلیوں کے نشان اس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے۔ وہ فرش پر گری ہو کر گرے۔ مگر اس نے سکندر کی اسٹین پوری قوت سے پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ اس حرکت کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا اس لیے بے وقوف طریقے سے ام مریم کے ساتھ وہ بھی فرش پر گر پڑا۔ اس نے دھنک طریقے سے گرنے سے دونوں کو چوٹیں آئیں۔ مگر وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرانے لگی۔

”کیا ابھی بھی مجھے اسے پاس دیکھ کر تمہیں کچھ نہیں ہو رہا سکندر!“ اس کے گریبان سے اسے اپنے

اور اس کی اموجان، انہیں تو اس سے کس قدر محبت ہے۔ جان بچھا کر گرتی ہیں وہ اس پر۔

اس نے امید سے ماں کی طرف دیکھا۔ زار و قطار روتی ہوئی اس ناگن کو سینے سے لگائے وہ بالکل خاموش تھیں۔ اس کی حمایت میں 'زین' کو اس پر ہاتھ اٹھانے سے روکنے کے لیے ان کے لبوں سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ میں ماں ہی نہیں سکتی کہ میرا سکندر ایسا کر سکتا ہے۔" وہ ہنسنے لگی تھیں اس نے انہیں دیکھا رہا مگر اس کی اموجان کے لب باہم پوہست رہے۔

"زین! بس کرو۔" اپنے پیلا کے لبوں سے یہ لفظ سننے ہی پر خوشی سے سرشار سا ہو گیا تھا۔ اس کے پیلا کو اس پر یقین ہے۔ وہ اس کا انتخاب کر رہے ہیں۔ مگر اس کی یہ خوشی بلی بھر میں ہی باپ کے تھپڑنے مٹا کر رکھ دی تھی۔ ان کے مارے گئے تھپڑنے اس کے اندر اتنے جوش، جنون اور غصے کو ایک بلی میں سرور کر دیا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ساکت اور بے جان سا کھڑا باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والا تھا، وہ بھائی کی منگیتر غلیظ نظریں رکھنے والا تھا، وہ نفس کا غلام تھا، وہ گھر کی عزت تباہ کرنے والا تھا۔ وہ بالکل مرن سا گھر تھا۔

ام مریم مسلسل دوا دلا کر کر کے رد رہی تھی۔ اسے مکاری سے روتا دیکھ کر اس پر پھر جوش، جنون اور اشتیاق سوار ہوا تھا۔ اس نے باپ کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"آئی! میں آپ کے گھر پر جس دن سے سکندر سے ملی ہوں یہ اسی دن سے مجھ سے کہہ رہا ہے میں زین سے ملتی تو زردوں۔ اس نے مجھے دھکی دیا تھی کہ یہ مجھے زین کے تو کیا کسی کے بھی قابل نہیں چھوڑے گا۔"

طوائفوں کی خصلت رکھتی نگاہ پر وہ شریف لڑکی روتے ہوئے بلی توہ غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ شدید

ہوتا وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ ام مریم کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ زین اسے شدید غصے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ زین کو غصے میں آتا دیکھ کر ام مریم پر اپنے شدید ترین اشتیاق کو کنٹرول کرتے ہوئے اس نے زین کو سچائی دینے کی کوشش کی۔

زین غصے اور جنون میں مبتلا اسے بچانے کیا کیا بول رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ غصے میں آپے سے باہر ہوتا وہ اسے جان سے مار ڈالنے کے ورے تھا۔ زین اس کی ایک بھی بات سننے کو آمادہ نہیں تھا۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی اس پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ وہ جواب میں اسے وضاحتیں دیتا خود کو صرف اس کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ زین سے کہیں زیادہ مضبوط جسم اور طاقت کا مالک تھا۔ چاہتا تو چند منٹوں میں زین کو زیر کر سکتا تھا۔ مگر وہ چھوٹے بھائی کو چوٹ کیسے پہنچا سکتا تھا۔

ام مریم دھاڑیں مار مار کر روتی اس پر اپنی عزت برباد کرنے کا الزام لگا رہی تھی۔ اس کے گرد اور اس کی عزت پر داغ لگا رہی تھی۔

"زین! یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ بہت مکار بہت خطرناک لڑکی ہے۔ طوائفوں کا بھی شاید کوئی کردار ہوتا ہو گا۔ یہ تو ان سے بھی زیادہ بد کردار ہے۔" وہ زین کے خوب رہتے کھول اور کھولوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا مسلسل اسے سچائی جانا چاہ رہا تھا۔ مگر زین پر ایک جنون سوار تھا۔ وہ اسے اپنے ہی گھر کی عزت پر غلیظ نظریں رکھنے والا بد کردار شخص سمجھ رہا تھا۔ زین کی نظروں سے ہار ماں کر اب وہ اپنے باپ کو رماں سے بد کا طالب تھا۔

زین نفرت میں اندھا ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو اسے جانتے ہیں۔ اس کا بچپن، اس کی نوعمری اور اس کی لوجوانی سب ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ انہوں نے جانتے ہیں ان کا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ اس کے باپا جتنے بھی سخت مزاج ہیں پر اس پر بہت غصہ کرتے ہیں اس نے ہمیشہ ان کو لمانا ہے ان کی امیدوں پر پورا اترتا ہے۔

ترن اشتعال میں اسے گالی دیتا وہ خیریتاً اس سے قتل کر ڈالنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھا تھا۔
 "اے گناہ پروردہ ڈالنے کے لیے اور کتنا نیچے گرو گئے شہنشاہ! اس کے فوراً مرمیم کے درمیان اس کے پایا آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

"پاپا! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اس مکار لڑکی کا یقین کر رہے ہیں اور میرا نہیں؟ آپ کو پتا ہے میں نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس سے آپ کا سر جھکے بیٹا! یہ لڑکی آج صبح سے نہیں جس دن سے میں گھر آیا ہوں میرے پیچھے بڑی ہے یہ کل رات بھی میرے کمرے میں جس غیلے میں آئی تھی۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں آج صبح سے آپ کو قتل جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس لیے یہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔ یہ مجھے آپ لوگوں کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے پاپا!"

اب وہ غصے اور اشتعال میں نہیں بے بسی اور خوف کے ساتھ اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں بول رہا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر دوب رہا تھا۔ کوئی اس کی بات سن رہا تھا نہ یقین کر رہا تھا۔

"اے گناہ پروردہ ڈالنے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہے ہو۔ ذرا حالت دیکھو اپنی بھی اور اس کی بھی۔ میرا سر زناست سے جھکا رہا ہے سکندر تم نے۔" باب کی بات سن کر اس نے نفرت سے ام مرمیم کی طرف دیکھا تھا جو ہنوز اموجان کے گھٹے گلی روئے کا ڈراما کر رہی تھی نہ اسے بے شک چیل ہو جائے پچاس کی سزا مل جائے مگر وہ اس لڑکی کو قتل کر ڈالے گا۔

"پاپا! اس کی جس حالت کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں یہ میں نے نہیں اس نے خود کی ہے اس لڑکی کے راج بن کی حد آپ سوچ بھی نہیں سکتے پاپا!"

باب کی آنکھوں میں غصہ، لڑکی کی آنکھوں میں بے اعتباری اور بھائی کی آنکھوں میں نفرت دیکھ کر وہ

چلتے چلتے ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ اس کا گہرا رندھنے لگا تھا۔ اسے اپنی بے بسی کا شوق نہ تھا احساس ہو رہا تھا۔
 "صفت کو سمجھ لیا۔ تم آج سے یہ حق ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہو۔"

"پاپا! اب جس کی کہیں میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ یہ لڑکی جھوٹی ہے۔ ہمارے گھر کی خوشیوں کو آگ لگا رہا جاتی ہے۔" اس بار وہ رو پڑا تھا۔ مگر اس کے آنسو اس کی فریاد اس کی بے بسی نہیں کی سچائی نہ اس کے باپ پر اثر کر رہی تھی نہ بھائی پر۔ اس کے پاپا اسے گھر سے نکل جانے کا حکم سن رہے تھے وہ باپ کا انتظار جاتا ظالمانہ حکم سن کر سناٹ کھڑا رہ گیا تھا اس کی بات نے بغیر اسے تختہ دار پر لٹکا جا رہا تھا۔

اس نے سبب اختیار کر کے لیے ان کو پکارا تھا اس کی بائی ماں سے نکلا ہیں میں تو اسے یہ کرب ناک سچائی پتا چلی کہ وہ بھی اسے گناہ گار سمجھ رہی ہیں مگر مٹا کے باہوں مجبور ہو کر رو بیٹھے کی حمایت میں بولی تھیں۔ انہوں نے روتے ہوئے شہریار خان سے سکندر کے لیے رحم کی درخواست کی تھی۔ شہریار خان اموجان کے اس کی حمایت پر مزید غصے میں آ گئے تھے۔

انہوں نے اس کی اموجان کو اپنے بیٹان اور اس پرانی لڑکی کے سامنے طلاق کی دھمکی دی تھی انہوں نے اس کے لیے ذالی کے الفاظ استعمال کیے۔ وہ اس پر نہیں مگر ماں کی تذلیل پر رو پڑا تھا۔ اس بے حیا ہے بغیر لڑکی کے سامنے اس نے باب نے اس کی ماں کو بے عزت کر کے رکھ دیا تھا وہ بغیر کسی مزاحمت کے شہریار خان کے ساتھ کھینچا لوگ دوم سے باہر جانے لگا۔ ماں کی بند آنکھوں سے گرے آنسو دکھائی پچاس کی نفرت دیکھتا۔

شہریار خان اسے پورج میں ٹھیسٹ کر گیت تک لے آئے تھے۔ وہاں آکر انہوں نے اس کا ہاتھ چھو لیا تھا ان کی آنکھیں غصے اور جنون سے بھری ہوئی

تھا۔

وہ بری طرح رو رہا تھا۔ باپ کے ظلم پر ماں کی بے بسی پر بھائی کی نفرت پر اپنی ذلت اور صوفائی پر۔ کیا عزت صرف عورت کی ہوتی ہے مرد کی نہیں؟ کیا اگر ایک لڑکا اور لڑکی عثمانی میں اس حال میں پائے جائیں کہ لڑکی بے لباس ہو تو یہ لازم ہے کہ اسے بے لباس لڑکے ہی نے کیا ہوگا؟ کیا لڑکی گناہ کار اور بد کردار نہیں ہو سکتی؟ وہ چار دن کی ششماڑ کی اتنی قابل اعتبار تھی تھی اس کے والدین کو رہائی کو کہ اس کی زندگی کے صاف اور شفاف تیس سالوں کی ہر اچھائی بل بھر میں بھلائی؟

کوئی ایک تو ہو تا جو یہ کہتا کہ سکندر نہیں یہ لڑکی بھی تو جھوٹی ہو سکتی ہے۔

نئے سال کی پہلی صبح طلوع ہوئی تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ صرف یہ چٹکی ہوئی صبح ہی نہیں بلکہ آئندہ زندگی کی کوئی بھی صبح کل شام کی سیاہیوں کو نہیں مٹا سکے گی۔

صبح سے دوپہر ہوئی۔ بھوک پیاس کا احساس نہیں تھا مگر ٹھنڈا ناقابل برداشت تھی۔ اسے اپنے پیاسے بات کرنی چاہیے۔ کل شام وہ بہت غصے میں آگئے تھے آج وہ اس کی بات ضرور سنیں گے۔

اس کے پیلا بہت ذہین آدمی ہیں۔ جب وہ ریل کے ساتھ بات کرے گا تو وہ اپنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ لوگ روم کا وہ سارا احشاس بے حیا لڑکی نے کیا تھا۔ اس کا حلیہ اس لڑکی کا حلیہ لوگ روم میں لڑکی چیزیں اور پیلا کا عین اسی وقت گھر واپس آجائے جب وہ ساری کڑیاں ملائیں گے تو ان جیسا ذہین شخص فوراً سمجھ جائے گا کہ قصور وار سکندر نہیں عام مریم ہے۔

وہ یکدم ہی گھر جانے کے لیے اٹھا اور سیدھا اندر جانا چاہتا تھا کہ اس کی خوش فہمیاں اسی لمحے کمزور پڑنے لگی تھیں جب ان کا لازم اسے وہیں رکنے کی تاکید کرنا شہرا راخان کو ملا۔ لہذا چلایا گیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر ہی روک دیا گیا تھا۔ اندر داخلے کے

تھیں۔ ان کے چہرے پر سختی اور فیصلہ کر لینے کے بعد والی اصل کیفیت تھی۔ وہ گٹ کھول کر کھڑے تھے۔

”تم میرے گھر سے جا سکتے ہو۔ میرے گھر اور میری زندگی میں تم جیسے مفسدیت اور عیاش شخص کی کوئی جگہ نہیں ہے۔“ کیا زمین کی طرح پیلا بھی اس سے نفرت کرنے لگے؟ وہ ایک دم ہی رو پڑا تھا۔

”پیلا! میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ پیلا! میرا یقین کرتے۔“ وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر وہ باپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم جاوے ہو یا میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکالوں؟ جوانی کا جڑوں بہت سرخڑ کر بول رہا ہے تو جاؤ انگو باہر۔ کرو عیاشیاں گمراہے خربے پر خود پیسے نکا کر میرا پیسہ تم جیسے بد کردار کی عیاشیوں کے لیے نہیں ہے۔ دو دوسرے باپ ہوتے ہوں گے جو غلط کاموں پر اپنے بیٹوں کی پشت پناہی کرتے ہوں گے۔ میں ان باپوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آج کے بعد مرتے دم تک تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔ رشتوں کی دھجیاں اڑا کر سمجھ رہے ہو، میں تمہیں معاف کردوں گا؟ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے۔ آج کے بعد سمجھوں گے میرا ایک ہی بیٹا ہے۔“

وہ سسکی سسکی نظروں سے باپ کو خود پر گرجتے اور نفرت کا اظہار کرتے دیکھ رہا تھا۔ اُن وہ کمزور تھا وہ گھر سے باہر نکالے جانے سے بری طرح ڈر گیا تھا۔ وہ اس بات سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ وہ گھر سے نکلا جا رہا تھا۔ دنیا کی بھیر میں دھکیلا جا رہا ہے۔ شہر مار خان نے اسے ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے باہر نکالا۔ فوراً گیٹ بند کر دیا تھا۔

وہ اسی پٹی ہوئی تھیں میں تھا بغیر سوٹر جیکٹ اور کسی بھی گرم چیز کے۔ باہر سخت ترین سردی میں۔ 31 دسمبر کی شام کی سخت ترین اجسم کو کٹا لانے والی ٹھنڈ میں باہر کھڑا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ روتے ہوئے وہ گھر کے پاس بنے ایک بارک میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ دنیا سال نو کے جشن میں مصروف تھی اور وہ پارک میں تھا

لیے اسے اجازت دے کر رکھیں۔

”کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیا کل میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تھی؟“

وہ جھوٹا سا ہنسے ہوئے لہجہ لگ رہی تھی اس کے باپ کو اس پر ذرا سا بھی زحمت نہیں آیا تھا اس کی تمام تر خوش نصیبی اپنی موت آپ مر گئی تھیں۔ ان کے پیچھے ذہن بھی کوئی روم کے دروازے کے پاس کھڑا اسے نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

”میرے دل اور میرے گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں غلط کر چکا ہوں۔ میرے اصول یہ تھے کہ میں ایک ریہنسٹ اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرے والے کو اسے گھر میں جگہ نہ دوں۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو، ذرا سی بھی غیرت تم میں باقی ہونی چاہیے تو آج کے بعد مجھے اپنی منجوس شکل بھی مت دکھانا۔“

اس نے پیچھے کھڑے ذہن کے چہرے پر بھیلا اطمینان دیکھا پھر خلق کے بل جلاتے اپنے باپ کو۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، ہوش و حواس میں کہہ رہے ہیں، کھل اتیس دسمبر کو اسے گھر سے بے دخل کرنے کا ان کا اعلان کوئی جذباتی یا دینی فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اعلیٰ فیصلہ تھا۔ سرد اکاہوں سے اسے دیکھتے وہ اپنے ہر فیصلے پر قائم تھے۔

اسی بل اس کی اموجان باہر آئی تھیں۔ وہ دروازے پر تھیں۔ انہوں نے روٹے ہوئے اسے گھٹک لگایا تھا۔ وہ اس کی حمایت کر رہی تھیں، وہ اس کی طرف داری میں اس کے باپ سے لڑ رہی تھیں، وہ اس کی طرف سے اس کے باپ سے معافی مانگ رہی تھیں۔

”اس سے غلطی ہو گئی ہے شہیار! اگر یہ ابھی چھپ رہا ہے۔ آپ اس پر سختی کریں، اسے ماریں، تختیں ہر آہٹ اور سہولت اس سے واپس لے لیں مگر پلیز اسے یوں گھر سے نہ نکالیں۔“

اور اس کا دل چاہا تھا وہ اسے مار مار کر روڑے۔ اس سمیت ساری کائنات میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اسے بے گناہ سمجھتا ہو۔ اس کے حمایت

لیے جہلوں نے اس کی عزت اس کے ساتھ اس کے ہندار کو مزید تختیں پہنچائی تھیں۔ اس نے گناہ گار بیٹے کے لیے رحم اور معافی کی درخواست کر دی تھی۔ وہ ٹکڑ ٹکڑ ہاتھوں کی حمایت میں باپ سے بولنے اور باپ کو جواباً ”آگ بگولہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اموجان زیادہ زور سے روٹے ہوئے چیخ کر بولیں۔

”آپ کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں دے رہے ہیں؟ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہیار! جو آپ کے باپ نے کیا۔“

اس کے باپ نے آگے بڑھ کر دیکھا دیتے ہوئے اس کی اموجان کو پھیر مارا تھا۔ وہ انکس من سارہ گیا تھا۔ کیا اس کے لیے اس کی ماں پر ہاتھ اٹھا سکتے تھے؟

اس نے دیکھا وہ اموجان کو دوسرا پھیرا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے، وہ اس پر ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ فوراً ”آگے آگیا تھا۔ اس کی طرف اٹھا، طمانچہ اس نے اپنے گل پر کھالیا تھا۔ اس کی یہ تذلیل اس لیے کی جارہی تھی کہ وہ اس کی حمایت میں بولی تھیں۔ اگر اس کی موجودگی اس کی ذلت کا باعث بن رہی ہے تو وہ خود کو ابھی اور اسی وقت یہاں سے نہیں دھکیلے جائے گا۔ اس کی ماں ان دونوں ہاتھوں کے سامنے شوہر کے ہاتھوں ہوئی اس تذلیل پر گنگ کھڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کرب اور اذیت سے آنسو آگے تھکاس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”اموجان کو کچھ مت کہیں، جاپا! پلیز میری ماں پر ہاتھ مت اٹھا، میں یہاں جا رہی ہوں۔“

وہ فوراً ”ہی رہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اگر اس کا چلے جانا تمام مسائل کا حل ہے تو ٹھیک ہے، وہ چلا جاتا ہے۔ اس کا باپ اس کی ماں پر ہاتھ اٹھائے کہے گا، لیاں دے یہ وہ ہرگز نہیں سہ سکتا۔ وہ ذہن کی طرح نہیں کہہ سکتا کہ کچھ چاہیے، چاہیے تھا، رہے ماں کو بے عزت ہونا دیکھا رہے۔ اگر اس کے چلے جائے تو اس کے باپ کو سکون مل رہا ہے تو نکل جائے وہ ان لوگوں کی زندگیوں سے۔“

وہ بوٹمن واپس جانے کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک وقت کا کھانا کھانے تک کے پیسے نہیں تھے۔ کہہ کر بوٹمن میں اپنے کسی دوست کو فون کر سکے اتنے پیسے بھی نہیں ہیں۔ وہ وہاں کیسے جائے گا؟ اور ان پچھلے کپڑوں میں بھکاریوں کی طرح؟ جان پہچان کے لوگوں کے پاس جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اس کے نہیں بلکہ شریار خان، اموجان اور زین سب کے ان کی ساری فیملی کے جاننے والے تھے۔ اصل بات کیا ہے یہ تو وہ اپنے قریبی دوستوں تک کو نہیں بتائے گا۔ اگر مجبوراً ”بوٹمن جاکر کچھ بنانا ہی پڑا تو اتنا کہہ دے گا کہ وہ اپنے باپ کا گھر چھوڑ آیا ہے۔ اس کال کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گیا۔ بوٹمن نے اس کے پاس واشنگٹن میں کسی بھی جان پہچان والے کے پاس جا کر نہ وہ خود شرمندہ ہونا چاہتا تھا نہ اپنے پیارے کو کرواتا چاہتا تھا۔

تمام دن چلتے چلتے وہ اس وقت شہر کے اس علاقے میں آ گیا تھا جہاں کم آمدنی والے اور زیادہ تر سیاہ فام لوگ رہا کرتے تھے۔ کیسے لطف کی بات تھی ذرا بھر میں طاقات کا مرکز سمجھے جانے والے اس شہر میں ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں غریب بھی تھے، بے روزگار بھی تھے، بے گھر بھی تھے۔ وہ سڑک کے کنارے جہاں بیٹھا تھا وہاں سارے ہی ایک چرچ تھا۔ وہ وہاں ہر عمر کے افراد جاتا دیکھ رہا تھا جو اپنے جلیوں سے ضرورت مند لگ رہے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ساتھ لیے، بوڑھے مرد، عورتیں، جوان، نوجوان۔ اسے سمجھ آ گیا تھا یہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ چرچ کی بلڈنگ اور اندر جاتے لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا چاہتا تھا۔ مگر اسے پتا نہیں تھا بھوک ایسی ظالم چیز ہوتی ہے انسان سے وہ سب کچھ بھی کر دیتی ہے جو عام حالات میں کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ کیا حرج ہے اگر وہ بھی نہ اگر وہ بھی اندر چلا جائے۔ اب اس سے اور بھوکا نہیں رہا جا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے خود کو اٹھنے اور چرچ میں جانے پر مجبور پایا۔

وہ خود سے بھی نظرس چرا تا چرچ کے اس ڈاننگ

وہ وقت دور نہیں جب اس کے اما کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوگا۔ انہیں اس کی سچائی کا یقین آئے گا۔ بہت شرمندہ ہوں گے وہ اسے گھرواپس لانا چاہیں گے تب وہ گھرواپس نہیں آئے گا۔ وہ سکندر شریار ہے۔ بارہوی میں زیر تعلیم۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے چند بہت سی مکمل طالب علموں میں شامل۔ وہ اپنی زندگی آپ سنوارے گا وہ اپنی دنیا آپ بنائے گا بغیر شریار خان کی مدد کے۔ وہ اب اگر اسے بلائیں گے بھی وہ تب بھی پلیٹ کر لین کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کے اندر جوش مارتا تو جوان خون باقی ہو رہا تھا۔ وہ مساجو سٹس واپس چلا جائے گا۔ بوٹمن اور کیمپس میں اس کے بہت سارے جانے والے رہتے ہیں۔ فوری طور پر وہ اپنے کسی بھی جاننے والے، اپنے کسی بھی دوست کے ساتھ اس کالینڈر شیئر کر لے گا۔ جانے کے ساتھ ہی وہ کیمپس جاکر ڈین کے آفس میں ان سے بھی مل لے گا۔ وہ اپنی آگے کی تعلیم کے لیے اسکالرشپ کے لیے اپلائی کرے گا۔

وہ اپنے استاد کا چیتا اتار لیا اسنوڈنٹ ہے، کیوں نہیں اس کی یونیورسٹی اسے اسکالرشپ دے گی؟ وہ خیالوں ہی خیالوں میں خود کو بارہوی سے اپنی اندر گریجویٹ ڈگری پوری کرتے دیکھ چکا تھا، بارہوی لاء اسکول سے خود کو ڈگری پاتا دیکھ چکا تھا، باپ کو خود کو منا کر گھرواپس بلاتا دیکھ چکا تھا جب بھوک اور پیاس کے شدید احساس سے وہ سڑک کے کنارے چکر کھا کر گر گیا۔ چند لمحوں میں اس کی آنکھوں کے آگے بالکل اندھیرا سا چھایا رہا تھا۔ اسے بغیر کچھ کھانے پیے وہ دن ہو گئے تھے۔ وہ بھوک اور پیاس سے بالکل مدھال تھا۔ اپنے ان پچھلے کپڑوں میں اسے سخت سردی لگ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے ٹھنڈ سے بخار چڑھ گیا ہے۔ اپنی زندگی کے بیس سال اس نے باپ کے گھر پر اتنے محفوظ گزارے تھے کہ اب سڑک پر ناکر پھینکا گیا تو اسے بھوک، پیاس اور ٹھنڈ سب کچھ برداشت کرنا اپنی ہمت اور برداشت سے بہت زیادہ

کا۔

دوسرے رضا کار کے ساتھ ہوئے والی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی میز پر کی کھڑکی سے بہت نزدیک تھی۔ پیٹ میں غذا کئی تھی آداب سب کچھ دکھائی بھی دے رہا تھا اور سنائی بھی۔ وہ دونوں رضا کار دیکھ بیٹھ بیٹھ میں سینڈو جوتیار کر کے کھانے مارنے موجود میز پر کھتے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک سائٹ انجینئر تھا۔ کوئی بلڈنگ بن رہی تھی وہ اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ دوڑے فکر مند لہجے میں یہ بتا رہا تھا کہ کل رات کھائی اور لڑائی ہو جانے پر اس کا کوئی اہم ورکر کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک بھٹے بعد آرکیٹیکٹ اور کلائنٹ نے اگر سائٹ دھڑکتی تھی اور وہ فکر مند تھا کہ اس اہم ورکر کے ملے جانے سے کام کی رفتار پر فرق پڑے گا۔ اسے ایک تختی اور چابی لگا کر کام کرنے والے دور کی فوری ضرورت تھی۔ سکندر فوراً اٹھ کر اس رضا کار کے پاس گیا۔ اس نے اس سے کام مانگا اور یقین دلایا تھا کہ وہ محنت کرے گا سائٹ انجینئر سے اس کا رھا لکھا ہوا اور اچھے خاندان سے تعلق چھپانے رہا تھا۔ اس نے اس سے یہی بات پوچھی بھی تھی۔ جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ اس نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ بوسن میں اپنی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز کر رہا ہے۔ کسی پریشالی کا شکار ہو جانے کے بعد اب اس کے پاس واپس بوسن جانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اسے پیسے دو کار ہیں۔ سائٹ انجینئر اپنے اس ورکر کی جگہ اسے کام دینے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس شرط پر کہ وہ اس پورے ہفتے اس کے ساتھ کام کرے۔ جتنا معاوضہ ملے پائے تھا اس میں وہ واپس جانے کے کرائے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے ایک آدھ سستی سی پیٹ شرٹ بھی خرید سکتا تھا۔ کوئی شکر کر کے کچھ پیسے بچا بھی سکتا تھا۔ اسے پیر سے لے کر مینے کی شام تک کنسرکشن سائٹ پر کام کرنا تھا۔ بھٹے کی شام اسے اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔ یہ اس سے سائٹ انجینئر نے وعدہ کیا تھا۔

وہ رات بھی اس نے سڑکوں پر اور ایک پارک میں سوئے جا گئے گزار دی تھی۔ اگلی صبح وہ شہر کے مضافات

ہال میں آگیا تھا جہاں ہر اتار با تالیدگی سے بھوک اور افلاس کے شکار لوگوں کو دھپ اور رات کا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ خدمت غلطی کے طور پر انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر۔ وہاں میز پر لگی ہوئی تھیں ان کے اطراف گریساں موجود تھیں۔ بہت سے لوگ ان کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھوک سے پریشان تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں بہت سے رضا کار کام کر رہے تھے، چرچ کے ساتھ اس کا خیر میں بطور رضا کار شریک ایک شخص اس کے پاس آیا اور مسکرا کر اس کا کھانا اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سوپ، سینڈوچ اور کافی۔

خیرات کا کھانا دیکھ کر اسے روٹا آگیا تھا۔ بہت ذلت اور بے عزتی محسوس کرنا کھانے کے نوالے لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسے اپنا گھر اپنے دل باپ اپنی زندگی سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ بارہوا کا گریجویٹ بننے بننے وہ یہ کہاں آگیا تھا؟ نہیں۔ اسے خود کو مضبوط کرنا ہو گا۔ وہ امت نہیں بارے گا۔ اسے فوری طور پر بوسن جانے کے لیے پیسے جمع کرنے ہی ہوں گے۔ ایک بار بوسن چلا گیا پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہاں اس کے بہت دوست ہیں اور پالا سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے ملے گا۔

وہ بارہوڑے اپنی ڈگری پوری کرے گا۔ پھر وہ اس ٹاکن سے اپنا انتظام لے گا۔ وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ وہ اپنے گوارہ پر ٹالک ملنے والی اسے اس کے والدین کی نظروں سے گرانے والی اس لڑکی کو جان سے مار ڈالے گا۔ اور ایک دن ایک دن آئے گا جب اس کے پالا اس کی بے گناہی تسلیم کر لیں گے۔ وہ اسے منائے اس کے پاس بوسن آئیں گے تب وہ ان کے ساتھ نہیں آئے گا۔ وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ ان کے سارے کے بغیر بھی خود کو سنبھال سکتا ہے۔

وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں سے کچن نظر آ رہا تھا۔ انسانی ہمدردی سے سرشار بہت رضا کار مرد و عورتیں وہاں کام کرنے نظر آ رہے تھے۔ اسے ایک رضا کار کی

میں بھی لوگوں کی زیادہ آمدورفت نہیں رہا کرتی تھی۔
اور گرد کا علاقہ قدرے ویران ہی تھا۔ رات میں تو بالکل
ای سا ناوا ہو جاتا تھا۔ اندھیرا خاصوشی اور دیرانی۔ مگر اس
پر دن بھر کی بے تحاشا محنت مشقت کی تسکین ایسی
طاری ہوئی تھی کہ نہ اسے نہانے اور اندھیرے سے
خوف آتا تھا اور نہ ہی اوپچی نیچی زمین پر لیٹ کر تکلیف
اور بے آرامی کا احساس ہو تھا۔

وہ ہفتے کا دن تھا جب سائٹ انجینئر شام ڈھلے کام
ختم کر کے جانے سے قبل وعدے کے مطابق اسے
اس کا ملے کر وہ معاوضہ دے کر گیا تھا۔ اس کے اضافی
کام کرنے سے خوش ہو کر اس نے لٹے کچھ پیسے الگ
سے بھی لے لیے تھے۔ اپنی محنت کے لیے اپنے ہاتھوں
میں لیے وہ کتنے دنوں بعد خوش ہوا تھا، مسکرایا تھا۔
اس وقت رات ہو چکی تھی۔ کل صبح صبح سے پہلے
اپنے لیے نئی پینٹ شرٹ خریدے گا اور پھر وہ مشین
جانے کے لیے نکلتا۔

وہ اپنے شہر واپس چلا جائے گا۔ کنسٹرکشن سائٹ کی
اوپچی نیچی زمین پر لینا وہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس ترجیح
کی رات اور ہے۔ کل وہ اپنے دوستوں اور جاننے
بھانپنے والوں کے بیچ اپنے شہر میں ہو گا۔ یہ تو اسے
پورا یقین تھا اسے اس کا رشک مل جائے گی لیکن اگر
اس سب میں کچھ وقت لگایا تو بڑی مشکل ہوئی تو کوئی
فرق نہیں پڑتا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس
دوران وہ چھوٹی چھوٹی جاب کر کے پیسے جمع کر لے گا۔

وہ لینا سوچ رہا تھا اپنے ہاتھوں کے زحم و کدہ رہا تھا۔
اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ بھوک سے
دھیان ہٹا رہا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ ٹائٹ اور رات کے
کھانے کو چھوڑ کر صرف دوسرے کا کھا رہا تھا۔ پر اسے تو
اس کے پاس پیسے ہیں۔ مین روڈ پر جو اسٹور ہے وہ
جو نہیں سمجھنے کھلا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے جا کر اپنے لیے
ایک سینڈویچ یا چند کو کیز تو خرید سکتا ہے۔ پیسے آگئے
تھے اس لیے بھوک کا زیادہ احساس تھا اسے وہاں کہ خالی
پینٹ فینڈ نہیں آئے گی تب وہ وہاں سے ہٹا۔ وہ
سائٹ سے باہر نکلتا ہی تھا جب اسے سڑک پر سامنے

میں واقع اس کنسٹرکشن سائٹ پر آگیا تھا۔ وہاں ابھی
نیا ہی کم تھی۔ یہ کم لبادی والا شہر کا ممتاز علاقہ تھا۔
یوٹیٹی سروس سے بہت قریب تھا۔ پرانے لکھے ہوئے
کی وجہ سے وہ سائٹ انجینئر کے کئی طرح سے کام آ رہا
تھا۔ کون سا کنسٹرکشن میٹریل کب کیا کتنی مقدار میں
آتا کتنے کا خرید گیا وہ سائٹ انجینئر کو کمپیوٹر پر یہ سارا
حساب کتاب سارا کام بھی کر کے دے رہا تھا اور محنت
مزدوری بھی کر رہا تھا۔ جہاں کہیں کسی ورکر کی کمی ہوتی
تھی بلا لیا جاتا۔ بے تحاشا وزن اٹھانے اور سخت
مشقت کا کام کرنے سے اس کے ہاتھوں پر جھیلے پر
مئے تھے۔ مگر ایک وہن اور ایک جھتو سوار تھی اس
کے لوہے۔ ابھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ دن بھر
میں صرف لچ کر تاجو کہ تمام مزدور دن کو سائٹ پر مفت
فریڈم کیا جاتا تھا۔ اس کی پلاننگ یہ تھی کہ جانے کے
کرائے کے علاوہ بھی اس کے پاس کچھ پیسے بچ
جائیں۔

اس نے سائٹ انجینئر سے درخواست کی اسے
سائٹ پر ہی سونے کی اجازت دے دی جائے۔ سائٹ
انجینئر اسے اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہاں ورکرز کو
اس بات کی اجازت نہیں تھی۔ مگر اس نے جب اپنی
بجوری بتا کر بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ مان گیا تھا۔ ویسے
بھی وہ کون سا وہاں مستقل ورکر تھا۔ صرف ایک ہفتہ
ہی کی اجازت تھی۔

سائٹ انجینئر کون بھی اس سے خوش تھا۔ وہ ایک
ایک لڑکائی ورکرز کے حصے کا کام اسے کر کے دے رہا
تھا۔ وہ صبح سے شام گئے تک کنسٹرکشن سائٹ پر جو جو
کام اس کے سپرد کیے جاتے دیکھ جاتا تھا۔ کام شروع
کرنے والا سب سے پہلا ورکر ہوتا تھا اور کام ختم
کرنے والا سب سے آخری ورکر بھی وہی ہوتا تھا۔ وہ
دن گن گن کر ہفتے کے دن انتظار کر رہا تھا جب اسے
اس کی محنت کی کمالی ملتی تھی۔ سب کے چلے جانے
کے بعد وہ رات میں بلندنگ سائٹ میں ہی ایک طرف
لوپچی نیچی زمین پر لیٹ کر سو جاتا تھا۔

کنسٹرکشن سائٹ غیر آباد علاقہ میں تھی وہاں دن

زمین پر زور سے مارا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔

"ایسا! مجھے بچائیں سیلا! مجھے بچائیں۔"

وہ چلا چلا کر باپ کو نکار رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ مضبوط سے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کو قابو میں کر لیا تھا۔ اب اس کی چیخیں اس کی فریادیں اس کے اندر ہی دم توڑ رہی تھیں۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ اسے بچانے کے لیے اس کا بہت طاقتور بہت با اثر باپ نہیں آیا تھا۔ اس کی ہمد کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ صبح ہونے پر اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر وہ چاروں وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ وہ جس بری طرح مارا بیٹا اور زخمی کیا گیا تھا، جتنی مقدار میں اس کا خون بہہ گیا تھا۔ اگر وہ کچھ دیر اور اس مرکز پر رواں تانہ شاہد وہیں اس مرکز پر ہی مر گیا ہوتا۔ پتا نہیں کون تھا جو اسے اسپتال لے آیا تھا، جس نے اس کی جان بچالی تھی۔

اپنی جان بچانے والے اس شخص سے اسے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔ ذلت بھری یہ زندگی گزارنے کے لیے آخر اسے زندہ کیوں رہنے دیا گیا تھا؟ ہوش آنے پر اس نے خود کو بیٹوں میں جگہ اسپتال میں پایا تھا۔ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے اسے ہمدردی سے دیکھا تھا۔ اس نے اس سے اس کے گھر اور گھر والوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے فون مانگا تھا۔ وہ اپنے گھر پر فون کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے سینے پر سر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ وہ کس طرح بال کیا گیا ہے تو یہ صرف اپنے باپ ہی سے کہہ سکتا تھا۔ اس کا جسم نہیں اس کی روح روئے والی تھی۔ اس نے اپنے گھر پر فون کیا تھا۔ فون شمر یا رخا نے اٹھایا تھا۔ وہ ان کی آواز سن کر اس طرح رونا تھا۔ جیسے میلے میں کھو جانے والا بچہ واپس ملے باپ کو یا کر رونا ہے۔

"ہیلو! اس نے روتے ہوئے انہیں نکارا تھا۔

"کیوں فون کیا ہے تم نے میاں؟" ان کا سخت

سے چار سیاہ فام امریکی آتے نظر آئے شراب کی بوتلیں ہاتھ میں لیے۔ فٹے میں دھت زور زور سے گاتے اور ایک دوسرے سے بے ہنگم ہنسی مذاق کرتے۔ ان میں سے ایک نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اور ہنس کر اپنے باقی ساتھیوں کو بھی متوجہ کیا۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے وہاں سے گزر جانا چاہتا تھا مگر وہ چاروں اس کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ "لبے چوڑے" مضبوط جسامت والے۔

اپنی کمانی رقم کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بلی سارے بینک کی جیب میں۔ اس نے ان کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹ پر دیکھی تھیں۔ وہ اپنی اپنی محنت کی کمانی انہیں لوٹے نہیں ہوئے گا۔ اس نے وہاں سے اندھا دھند بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ چار تھے اور وہ کیا۔ وہ مضبوط جسامت والے سیاہ فام مرد تھے اور وہ بیس سال کا نیاور سا لڑکا جس کی دنیا گھر اور کیمپس تک محدود رہی تھی۔

ان چاروں نے اسے اپنے گھر سے لے لیا تھا۔ وہ دروازہ کراں سے رحم کی جھپک مانگ رہا تھا۔ بری طرح اسے مارتے ہوئے انہوں نے اس سے اس کے سارے پیسے چھین لیے تھے۔ وہ دروازہ کراں پر ہاتھ رکھ کر یہ پیسے اس نے بڑی محنت کڑی مشقت کے بعد کمانے ہیں۔ اسے ان پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنے پیسے چھین جانے پر زارو قطار رہ رہا تھا۔ مگر ان سیاہ فاموں کا مقصد صرف اس کی رقم لوٹ لینے پر پورا نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے 'شراب پی رہے تھے۔ وہ ان سے اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب وہاں سے ایک قدم ہٹنے کی بھی اس میں سکت نہ تھی مگر ان کی آنکھوں میں شیطانی چمک دیکھ کر اس نے خوف سے چیخ مارتے ہوئے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

اس کی طرف بڑھتے ایک سیاہ فام نے ایک زوردار مکا اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ لوہے سے منہ مرکز پر گرا پھر اس نے اس کے بال کھینچے۔ اس میں دیوچ کر اس کا سر

رو رو کر اللہ سے پوچھتا۔ اس نے خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر لیا تھا۔ پہلی مور آگیا تھا۔ کئی بار اس نے خود کشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے پیپا بھتیجا "ٹھیک کہتے تھے وہ واقعی بے غیرت تھا۔ اس ذلت بھری زندگی کو جینے کے لیے تیار تھا وہ موت سے ڈرتا تھا۔ خود کو نہ گول بار پایا، نہ اپنے پیٹ میں ٹیغ تار پایا اور نہ کسی اونچائی سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیا تھا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے میٹوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس ذلت بھری زندگی میں اسے جو بھی کام ملتا وہ کر لیتا تھا۔ کبھی وہ کسی بار بار نائٹ کلب میں کام کرنے لگتا، کبھی کہیں کسی کنسٹرکشن سائٹ پر جاکر محنت مزدوری کر لیتا، کبھی بھوک کھلی، دلی تو کسی امیر شخص کے کتوں کو نسلانے دھلانے کی نوکری تک کر لیا کرتا تھا۔ وہ کسی بنجارے، کسی چھپی کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ دنیا کی ٹھوکروں نے اسے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔ اب وہ گھر کی آرامی و فضاؤں میں رہنے اور باروڑ میں پڑھنے والا سکندر شہر مار نہیں تھا۔ اب وہ ایک اسٹریٹ اسٹارٹ بنجارہ اور چھپی تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھی بہت مضبوط ہو چکا تھا۔

اس رات کے بعد کبھی کسی کی مجال نہ ہوئی تھی اس کے نزدیک بھی چٹنگ سٹاک ایک بار وہ نائٹ کلب سے اپنی ڈھونڈ ختم ہونے پر علی الصبح واپس جا رہا تھا، جب سڑک پر دو کالے امریکیوں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی۔ تب اس پر ایسا جھڑن سوار ہوا تھا ایسی غیر معمولی طاقت اچانک اس کے اندر آگئی تھی کہ اس نے انہیں مار مار کر اوڑھ مٹا کر دیا تھا۔ وہ دونوں اس سے رحم کی جھپک مالتے گئے مگر وہ انہیں جان سے مار ڈالنے کے ورے تھا مگر پھر انہیں زخموں سے چور چور کر کے چھوڑ دیا۔

وہ رات اس کی زندگی سے کبھی نہیں نکل سکی تھی۔ اس رات کے بعد اگلی صبح وہ خود سے بھی اور دنیا سے بھی پہلے سے بھی زیادہ نفرت میں مبتلا ہو کر دنیا کی

بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا۔

لب و لہجہ ویسا ہی تھا۔ بے چلک غیر جذباتی اور سرد سا ناظر۔

"پیپا! کل رات سپلا کل رات میرے ساتھ نہ" روتے ہوئے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنے مضبوط باپ کی پٹاؤں میں جلا جانا چاہتا تھا۔ نہیں ہے ڈر کمزور لوگ اتنا مضبوط کہ دنیا کی ٹھوکروں کا مقابلہ کر سکے۔

"پیپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پیپا مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا پیپا۔ پلیز۔ مجھے پیپا لیں۔ پیپا! مجھے گھر آنا ہے مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔ پلیز میرے پاس آجائیں پیپا!" اس نے زار و تار روتے ہوئے ان سے التجائی کی تھی۔

"میرے گھر میں تم جیسے بد کردار اور بد فطرت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ آئندہ یہاں فون مت کرنا۔ تم میرے لیے سرچھے ہو۔ میں تمہیں روچکا ہوں۔"

اس کے باپ نے سخت لب و لہجے میں یہ بات کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔ فون بند ہونے کی تیز آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یک لخت ہی اس کی آنکھوں سے آنسو روک گئے تھے۔

وہ واقعی مرد کا تھا اور مردے ویسا نہیں کرنے۔ وہ کئی ہون اسپتال میں رہنے کے بعد پھر سڑک پر آگیا تھا۔ بوسٹن، میساچوسٹس، ہارورڈ، نیچلز، لاء، ورسٹ، گھر زندگی۔ اس کے لیے ہر چیز بے معنی ہو چکی تھی۔ وہ جسمانی طور پر نہیں روحانی طور پر مرد کا تھا۔ اب نہ اسے ام مرمیم کا خیال آتا تھا نہ اس سے انتقام لینے کے منصوبہ اس کے ذہن میں آتے تھے۔

اس رات کی وہ بے بسی، وہ خوف، وہ ذلت اسے راتوں کو سونے نہیں دیتی تھی۔ سوچا تھا تو ڈراؤنے خوابوں کی صورت وہ اسے اٹھا کر بٹھایا کرتی تھی۔ اسے سوتے میں ہرایا ایسا لگتا اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس کا دم گھونٹنا جا رہا تھا۔ اسے سانس لینا دشوار لگنے لگا۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟"

"میں ہی کیوں اس کا شکار بنا؟" وہ راتوں کو چلا چلا کر

فخص کے سر پر اس قوت سے مارا تھا کہ وہ چیخا ہوا
نکلن پر گر پڑا تھا۔

دشخت اور جنوں بھرے انداز میں اس نے اسے
لاتیں اڑا رکھیں مارنے اس کے بازو اور ٹانگہ پر سے
خون بہہ رہا تھا مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔ اس نے اپنی
جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی تھی اور اسے
لٹنے سے بھی بچایا تھا۔

پلی اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے
سکندر کی ستواہ کچی گنا برہا کر اسے یہ اضافی ذمہ داری
بھی سونپ دی تھی کہ اب اگر کوئی بار میں زیادہ شراب
پی لینے کے بعد عمل غیاضہ کرنے کی کوشش کرے یا کوئی
شراب پی لینے کے بعد بل ڈوانہ کر رہا ہو تو وہ ایسے
غڈے بد معاشوں سے نمٹے۔ خود کشی کرنے سے بے
شک و ڈر رہتا تھا مگر جوں کی تو اسے اپنی کوئی پروا تھی ہی
نہیں عسودہ غنڈوں اور بد معاشوں سے نمٹنے کا کام بخوبی
کر رہا تھا۔ کوئی زیادہ شراب پی کرنے میں بد ہوش ہو کر
کسی ویٹرس سے بد تمیزی کرنے کی کوشش کرتا تو
سکندر کو پایا جاتا تو اسے اٹھا کر بار سے باہر پھینک دیتا۔

کسی کی زیادہ پی لینے کے بعد اپنے ہی ساتھیوں سے
بار میں بیٹھ بیٹھ کلام گلچن کر رہا تھا پانی شروع ہو جاتی تو
وہ ان سب کو دھکے مار کر بار سے باہر نکل دیتا۔ وہ ہر
طرح کے شرابیوں، اچکوں، غنڈوں، بد معاشوں سے
آسانی اور بخوبی نمٹ لیتا تھا۔

پلی جس کی بیوی مریجی تھی اور بیٹا اسے چھوڑ کر
کسیں لوہ رہتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ وہ سکندر کی
پروا کرنے لگا تھا مگر اسے اب کسی کے بھی پیار اور محبت
کی ضرورت نہیں تھی۔ رشتے پیار، محبت، چاربت
بجربہ لفظ اب اس کے لیے کھوکھلے اور بے معنی
تھے۔ یہ تمام لفظ بس لفظ ہی تھے اس کی نگاہوں میں
ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ مگر بھر بھی وہ جانتا تھا کہ پلی
آہستہ آہستہ اس سے پیار کرنے لگا تھا۔

وہ اپنی جان بچاتے اور اپنا بار سنبھالتے اس بہادر اور
عزیز لڑکے میں اپنا بیٹا دیکھنے لگا تھا۔ اس انسان کے

وہ ان دلوں ایک بار میں نوکری کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کو
شراب پیش کیا کرتا تھا۔ اپنا کام ایمان داری سے کرتا۔
کام سے ہٹ کر کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ اس کے
چہرے پر بچیلی مٹی اور گہرے دیکھ کر کسی کی جرأت بھی
نہ ہوتی تھی اس سے ناگواریات کرنے کی۔ بار کا بچپن
سالہ امریکن مالک بل اسے اس کی ایمان داری کی وجہ
سے پسند کیا کرتا تھا۔ مینے کے آخر میں جب بل سب
کی تنخواہوں کا حساب کتاب کر رہا ہوتا تب سکندر سے
اس کام میں مدد لے لیا کرتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ
جمال دیدہ شخص بن گیا تھا کہ وہ پڑھا لکھا اور کسی
آہستہ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہی کام کرتے باقی
دینرز اور بار میں روز کی طرح معمولی پڑھا لکھا اور معمولی
خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔

وہ حساب کتاب میں بل کی مدد کر رہا کرتا تھا، کمپیوٹر
پر اس کا کام کر کے رہے دیا کرتا تھا۔ اس نے خود کمرہ کر
آئی ڈیولن دسہر تین سے رات تین تک رکھوائی ہوتی
تھی۔ راتوں کو سونا دہریے ہی نہیں چاہتا تھا سونا بار بند
ہونے کے بعد چم تک جو کہ صبح کے تین بجے تک کا تھا وہ
اپنی ڈیولن انجام دیا کرتا تھا۔ اکثر وہاں سے بار بند کر کے
نگاہت صبح کے چار بجے پایا کرتے تھے۔

ایک رات بار بند ہو جانے کے بعد بل باہر نکل کر
اپنی گاڑی کے پاس جا رہا تھا تب اسنے سے لیس ایک
فخص اسے لوٹنے آگیا تھا۔ سکندر چند منٹ قبل ہی بار
سے نکلا تھا۔ وہ بڑکے پر ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا۔ صبح
کے چار بجے شور اور پلی کے چیخنے کی تو آوازیں اسے
صاف سنائی دے گئی تھیں۔ وہ فوراً راپس رہا۔

اسے بل سے نہ کوئی محبت تھی نہ انیت اور نہ ہی
ہمدردی مگر خود پر گزری اس سیاہ اور بد قرص رات کے
بعد اس کے اندر یہ جنوں اور وحشیانہ پن آگیا تھا کہ اب
وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کہیں پر بھی اور کسی پر بھی
کوئی ظلم اور زیادتی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
اس کے پاس مگر بھی اور سکندر تھا۔ سکندر کی ٹانگ
اور بازو پر گولیاں لگی تھیں، مگر اس نے اس زخمی
حالت میں بھی اس کا ریو اور چیخ کر اس کا ہٹ اس

ایک بڑے سے گھر سے اسے ریسٹ قرار دے کر رور دھکے مار کر اکالا گیا تھا اور دوسری رات بھی بواب اس کی عزت نفس اس کا وقار اس کی شخصیت کی آن ہون اس سے چھین کر لے گئی تھی اسے زندہ و زور کو کر دیا گیا تھا۔ بل کو وہ دیکھنے میں برا مضبوط نظر آتا ہے؟ کیا بل کو پتا ہے کہ وہ کج بھی راتوں کو ان دوراتوں کے خوف اور رشت کا شکار ہو کر روناؤنے خواب دیکھ کر چیخیں مار کر اٹھ بیٹھتا ہے؟

”میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا بل امیری زندگی جیسے گزر رہی ہے میں اسے ایسے ہی گزار دیتا چاہتا ہوں۔“ وہ قطعیت سے بولا تھا مگر بل اسے اس کی زندگی براہ کرتے تھیں وہ دیکھ پا رہا تھا کہ وہ اسے پیار سے سمجھتا رہتا تھا۔

بل اسے زندگی کی طرف راہیں لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ خواہش کے باوجود کوشش کے باوجود کبھی اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تک نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ سکندر کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا مگر اسے لگتا تھا سکندر کو اس کے بیٹا کہنے باندھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

مگر مسلسل کوشش کرتے رہنے سے بل اسے اس بات پر راضی کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ اپنی اوجھڑی تعلیم مکمل کر لے۔

”خود کو اس قابل تو بناؤ سکندر! کہ جن لوگوں نے تمہاری زندگی تباہ کی ہے، تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے، کبھی دوبارہ ان سے سامنا ہو تو دوبارہ دیکھ کر رنج و رنجائش کہ تم ان کے لاکھ جاننے پر بھی تباہ نہیں ہوئے، تمہاری زندگی براہ نہیں ہوئی۔“

اس نے کبھی پچھڑے سے ملنے کا کوئی شوق تھا نہ کسی پچھڑے پر کچھ بہت کرنے کا۔ مگر جب وہ زندہ بھی تھا زندہ لوگوں کی طرح نوکری بھی کرتا تھا لگتا تھا پتا بھی تھا تو واقعی یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ وہ ساری زندگی کس بار یا ہائٹ کلب میں کام کر کے گزارے گا۔ اس نے میونسس کے ہی ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ دن میں پڑھتا تھا۔ پھر کالج سے سیدھا رات میں ہی دوبار

پہل نظر ایک رز بل نے اس سے کہا کہ وہ اپنی اوجھڑی تعلیم مکمل کرے۔ اس نے حیران ہو کر بل کو دیکھا تھا۔

”تم نے بھی پتاؤ تب بھی میں جانتا ہوں تم کسی اچھی بات سے تعلق رکھتے ہو اور پڑھنے لکھنے بھی ہو۔ تعلیم کی وجہ سے پوری نہیں کر سکتے ہو۔“

بل اسے پیار سے دیکھ کر بولا تھا۔ بل کے لفظ پر وہ کچھ پھر نہیں پڑا تھا۔ وہ کیا جانتے اس شخص کو کہ وہ کس کا بیٹا ہے، کتنے بڑے آدمی کا۔ کج اپنی وہ سچیل زندگی وہ بڑا باب، وہ انچا خاندان، وہ اعلا اسٹیشن اسے خود ایک مذاق لگ رہا تھا۔ شہر مار خان کا بیٹا جسے وہ اور وہ میں پڑھا رہے تھے، جسے اپنا نشان وادگیر شروع کرنا تھا، آج میونسس کے ایک چھوٹے سے بار میں لوگوں کو شراب پیش کرتا ہے۔ شراب پی کر پیسے نہ دینے والوں سے اپنے بار کے مالک کو پیسے وصول کر کے دیتا ہے۔ شراب کے نشے میں رھت بنگامہ کرنے والوں کو مار پیٹ کر دھکے مار کر بار سے نکالا کرتا ہے۔

زندگی کے کڑے چچ اسے دلا نہیں رہے تھے بلکہ ہمارے تھکے بار وڈ کالاء مگر پوٹ بنے تھے وہ ایک بار میڈرین گیا تھا۔ اسے خود پر ہی آئی تھی۔ بل اسے قائل کر رہا تھا۔ اس کا بہت ظلم خیر خواہی کر اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے اپنی اوجھڑی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔

”مجھے تم اپنے بیٹے کی طرح پیار دے ہو گئے ہو۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا سکندر بلکہ تم ساری زندگی میرے بار پر کام کرتے گزار دو۔“

وہ بل کو یہ سمجھا نہیں سکا تھا کہ وہ تو زندہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو اس اندھیری رات واشنگٹن کے مضافات میں بلڈنگ سائٹ کے پاس اس سڑک پر کب کا مر چکا ہے۔ اسے مرے ہوئے کی سالن جو چکے ہیں۔

اس کی اس مردانہ کی سی زندگی پر وہ راتیں اپنی پوری دولٹا کی اور پوری سیانی کے ساتھ جھپائی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک رات وہ بھی جب واشنگٹن کے

سے کہیں زیادہ بہتر رہ سرج کر کے اسے لیٹھل ڈاکو منٹس ڈرافٹ کر کے دینے لگا تھا۔ جب کرنے کے ساتھ اس نے مہحسن کی ایک لیٹور سنی میں داخلہ لے کر لاء پڑھنا بھی شروع کر دیا۔

اس کی ذہانت، قابلیت اور فرم کے لیے اس کی اہمیت کے سبب اسے دوران ملازمت تعلیم حاصل کرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی اور فرم کی طرف سے اس کی فیس کی ادائیگی میں بھی اسے تعاون فراہم کیا گیا تھا۔ وہ صبح سے دپہر تک کمپن میں ہوتا تھا اور پھر دپہر سے رات گئے تک فرم میں موجود رہا کرتا تھا۔

اس نے اپنی لاء کی ڈگری کا پہلا سلی مکمل کیا تو اسے ترقی دے کر لیٹھل سیکریٹری سے پیر الیکٹل بنا دیا گیا تھا مگر ابھی وہ کسی بھی کورٹ میں اور جج کے سامنے اپنی فرم کی طرف سے بطور وکیل پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ چار سال قبل جب وہ لاء پڑھ رہا تھا اور بطور پیر الیکٹل اسی فرم میں کام کر رہا تھا تب شہرہ رخاں نے اسے اس کی ملاکی تیاری کے سبب دشمنوں کو فون کیا تھا۔

اس کی جدائی کے دکھ نے اس کی ملا کے وجود کو کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ انہوں نے آٹھ سال سے اسے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا۔ جب چاہے وہ سویتے سوتے آخر وہ ایک روز صحت یاب ہو گئی تھیں۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ بیماری ابتدائی اسٹیج پر ہی پک چلی گئی تھی۔ علاج بھی ممکن تھا اور ڈاکٹر ان کے صحت یاب ہو جانے کے بارے میں بھی پر امید تھے۔ ان کا فوری طور پر آپریشن کر دیا گیا تھا جو کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر پھر بھی ان کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی۔ تب یقیناً "آمنہ کے سرجن کے مشورے پر وہی شہرہ رخاں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔

انہوں نے اسے کیسے ڈھونڈا وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاس ایک دن اچانک اس کے دفتر میں ان کی کال آئی تھی۔

"تمہاری ملا بہت پیار ہے۔ تمہیں یاد کر رہی ہے۔"

کجا نا تھا اور پھر رات گئے بار بند ہونے کے وقت تک وہاں کام کیا کرتا تھا۔ بار بند ہونے کے بعد یہ کالج یوں لگتا تھا جیسے وہ آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹی دیا گیا تھا۔ مگر وہ اس جگہ کا بار بند ہونے کے ساتھ مقابلہ و موازنہ نہیں کرتا تھا۔ بار میں آج بھی اس کی ذہنی جاب بھی مل اب اس پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔ بار کے تقریباً تمام معاملات اب وہی دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنی تعلیمی زندگی میں عین سٹی پیپس ہو گیا تھا۔ اگر پڑھائی میں یہ وقفہ نہ آیا ہوتا تو وہ آج لاء کے بھی دوسرے سال میں ہوتا۔

بل اب بیمار رہنے لگا تھا۔ بار کو اب سکندر ہی سنبھال رہا تھا۔ دوسرے اس کا بیٹھڑا مکمل ہوا مگر بل کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹھڑا پورا ہوتے بل نے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی اس کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔ بل کا بیٹا جو اسے چھوڑ کر کہیں اور رہتا تھا۔ اس کے انتقال کے فوراً بعد ہی آ گیا تھا۔ بار کا الگ اب وہ تھا سارا انتظام اس نے سنبھال لیا تھا۔ وہ سکندر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہ شک رہتا تھا کہ سکندر بار پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے خاموشی سے بار چھوڑ دیا تھا۔ مگر بل کے ساتھ اتنے سال رہنے سے یہ ہوا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی پہلے کی طرح برباد نہیں کرتا چاہتا تھا۔ وہ اپنی گرجبوت ڈگری پوری کر چکا تھا اور اب کہیں بہتر ملازمت کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد ہی اسے ایک لاء فرم میں جاب مل گئی تھی۔ اسے فرم کے ایک سینئر وکیل کے سیکرٹری کی جاب مل گئی تھی۔

اب وہ تعلیم یافتہ اور بہت ذہین اور قابل لوگوں کے درمیان رہتا تھا اور ان ذہین اور قابل لوگوں کے درمیان اس کی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت بہت عرصہ چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اسے پاس کے لیٹھل ڈاکو منٹس ٹائپ کرتے کلانٹنس کے ساتھ اس کی میٹنگز کا شیڈول بناتے وہ مختلف کیسوں کی لیٹھل رہ سرج میں اپنی فرم کے اس سینئر قانون دان کو جس کو عنقریب فرم کا ایک پارٹنر بن جانا تھا مدد دینے لگا تھا۔ بلکہ ان

میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ جب تک میں اپنے سکندر سے مل نہ لوں۔ مجھے موت نہ دینا پرومگار۔ سکندر! میرے بچے مجھ سے اب دور مت جانا۔“

وہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے بوٹی تھیں اور اس رات اس نے اپنی بہار میں سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ ان سے نہیں کھوئے گا۔ غالباً ”وفا شعار اور مہربان اطاعت گزار بیوی کو موت کے دہانے سے واپس پلٹنے دیکھ کر شہزاد خان کا دل بھی تھوڑا نرم ہو گیا تھا تب ہی ہسپتال سے واپس آ جانے کے بعد جب آمنہ نے اس کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیے رکھا تو شہزاد خان نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

اس ایک رات وہ ہسپتال میں ماں کے پاس رہا تھا اور وہ پھر سے جی واضح تھیں۔

اگلے روز وہ ہسپتال ہی سے واپس چلا گیا تھا۔ اس ایک رات کے بعد پھر وہ دوبارہ کبھی پاکستان نہیں گیا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کا اپنی ماں سے فون پر رابطہ رہنے لگا تھا۔ مختصر سی گفتگو۔ ایک دو مرتبے سے بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود نہ کہہ سکنے والی گفتگو۔ آمنہ نے کئی بار اس کے ماضی کے سالوں کے متعلق پوچھا تھا۔ مگر وہ اس موضوع پر کچھ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب ماں سے بھی اپنے اندر کی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ اگلے شکوکے شکاک تین ٹھنڈیاں روٹھنا منانا تھا ہونا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ اپنے معنی و مطلب کو چکا تھا۔

اس دوران مہمنس میں اسی فرم میں پیر الیکٹریکی جاب کرتے اگلے پونے دو سالوں میں وہ اپنی لاعلمی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ ہارورڈ سے نہیں ایک عام سی یونیورسٹی سے کسی اعزاز اور میڈل کے ساتھ نہیں، علم سے انداز میں۔ اس کی زندگی کا آزمائشوں اور سختیوں سے بھرپور وقت آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا تھا۔ بار اور ٹائٹ کلب میں لوگوں کو شراب پیش کرنے والا وہ دوبارہ معاشرے میں باعزت بن گیا تھا۔

دو سال قبل اسے وہاں اس آئی بی بیٹل سیمین میں الیکٹریڈوانز کی اپنی موجودہ اور کافی اچھی تنجیل مل

تھی۔ جملہ انہوں نے اس سے کہا تھا۔ وہ آ رہا ہے بائیس یہ بھی کنفرم نہیں کیا تھا۔ وہ ماں کی بھاری کی اطلاع دیتے ہی ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چار سال قبل وہ اپنی زندگی میں کج طرح سیٹل نہیں تھا۔ ایمر جنسی میں پاکستان جانے کے لیے اسے گلوٹس سے ارحار مانگنا پڑا تھا۔ تب گلوٹس اس کی فرم میں ہو گیا تھا۔ لورڈ وہاں ایک پیر الیکٹریکل مگر گلوٹس اسے برابری کے درجے پر رکھتا تھا۔ اب کے فون سے ہی اسے پتا چلتا تھا کہ اب اس کی فیملی پاکستان میں رہتی ہے۔

وہ کراچی پہنچتی ہی سیدھا ہسپتال اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ اس کی شکل نہ دیکھنی پڑے یہ سوچ کر اس کا بھائی بھتی ریرہ ہسپتال میں رہا ہسپتال نہیں آیا تھا اور اب ہسپتال ہی میں کہیں موجود ضرور تھا پھر اس کی شکل دیکھنا اس نے بھی گوارا نہ کیا تھا۔ اگر وہ دونوں اس سے مل لیتے۔ اسے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کی ماں جن کی حالت بہت تازگ بھی ہو گئی تھی کبھی دیکھنے پر پندرہ دنوں سے آئیں نہیں کھول رہی تھیں اس کی توازن سننے ہی انہوں نے آئیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر روئی رہی تھیں۔

وہ ان کے سر ہانے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھیں اس لیے وہ ان کے پاس جھکا ہوا تھا۔ کبھی وہ اس کا چہرہ چومیں کبھی اس کے ہاتھوں پر پیار کرتیں۔ وہ زار و قطار ررتے ہوئے اسے رالمانہ چومے جاری تھیں۔

وہ ماں سے بہت نیاز بہت عزت بہت احترام سے ملتا تھا۔ انہوں نے اسے جنم دیا تھا۔ پالا ہوا تھا۔ مگر کج وہ خود کو ان کے قریب محسوس نہیں کر پاتا تھا۔

آمنہ روتے ہوئے کبھی اسے حسرت سے دیکھتیں کبھی پیار سے کبھی دکھ سے کبھی اندامت سے۔ اس نے ماں سے کوئی گلہ کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کے پچھلے آٹھ سالوں میں کچھ برا ہوا ہی نہیں تھا۔

”امو جان! آپ ٹھیک ہو جائیں پلیز۔“ اس نے اس سے بار بار کہا تھا۔

”میں تمہیں دیکھتی ہی ٹھیک ہو گئی ہوں بیٹا! پتا ہے

زندگی میں ہنسی، خوشی، محبت اور زندگی بن کر دو چلی نل تھی۔

بارہ سال بعد ایسا لگا تھا جیسے وہ زندہ ہے۔ بارہ سال بعد اس کا خواب دیکھنے کو مل چکا تھا۔ خوش ہونے کو ال چاہا تھا۔ بارہ سال بعد اس لڑکی نے اسے اس کے ان خوف ناک خوابوں کے حصار سے باہر نکالا تھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے دل کی سنتا، اس کے پیچھے پیچھے فلورس چلا آیا تھا۔ اس نے لیزا کو اپنے بارے میں دونا دیا تھا، جو وہ مرتے دم تک کبھی کسی کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔



وہ ساری رات وحشت کے عالم میں جاگتا رہا تھا۔ صبح ہوئے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ صبح ہوگی تو وہ لیزا کے ملے بغیر ہی یہاں سے چلا جائے گا اور پھر وہ اس سے زندگی بھر نہیں ملے گا۔ کل رات اپنی جی بھیا تک سچائی اس نے لیزا کو بتائی ہے، اس کے بعد اب وہ اس کا سامنا کیسے کر سکتا ہے؟

صبح سویرے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو داخل کے عملے کا ایک فرد وہاں کھڑا تھا۔

”یہ آپ کے لیے بھجوا دیا گیا ہے۔“

اس نے سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ اور ایک سیلے سے بیک ہوا گفٹ اس کی طرف بڑھایا۔ حیران ہوئے اس نے وہ چیزیں اس سے لے لیں۔ پھولوں کے ساتھ کوئی کارڈ منسلک نہ تھا۔ اس نے گفٹ پر چڑھا بغیر کھولا اس میں سے نکلنے والی چیز کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ جاپانی سیورائی کا ایک منی ایچر مجسمہ تھا۔ جنگلی لباس میں چہرے پر طاقت کا تاثر اور ہاتھوں میں مضبوطی سے لکوار تھا۔ سیورائی۔

گفٹ باکس میں سیورائی کے مجسمہ کے ساتھ ایک کارڈ بھی رکھا تھا جو ہاتھ سے بنایا ہوا تھا، کسی ماہر آرٹسٹ کے ہاتھوں کا بنایا ہوا، کارڈ پر سیورائی کی تلوار کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پینٹ کیا گیا تھا۔

گئی تھی۔ اس کی زندگی میں عزت اور رتبہ والیں اہلیا تھا۔ وہ نہ بن سکا تھا جو اس کے لیے کبھی کسی نے خواب دیکھے تھے، جو وہ بننا چاہتا تھا اور جو کچھ بننے کی اس میں اہلیت اور قابلیت تھی۔ کبھی اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو اتفاق چھو سکتا ہے اس میں اتنی بے مثل ذہانت اور ایسی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں کہ وہ نئے جہان اور نئی دنیا میں دریافت کر سکتا ہے۔

گمراہ آج بھی زندہ لاش ہی کی طرح اپنے وجود کو گھسیٹتا تھا۔ اس کے لیے زندگی اپنی کشش کھو چکی تھی وہ نوکری بھی کرتا تھا، لوگوں سے ملنا بھی تھا۔ وہ زندہ لوگوں جیسے تمام کام کرتا تھا مگر بغیر زندگی کی امنگ کے۔ اس کے سامنے نہ کوئی مقصد تھا نہ منزل۔

کبھی کوئی پوچھتا کہ اگلے دس سالوں بعد وہ زندگی میں خود کو کہاں دیکھتا ہے تو وہ دل میں سوچا کرتا کہ وہ اگلے دس سالوں بعد زندہ ہی نہیں ہونا چاہتا تو کچھ اور کیا سوچے۔ مستقبل کی کسی پلاننگ آنے والے کل کی کسی امید کے بغیر جیسے زندگی کو گھسیٹ رہا تھا۔ اب بھی اس کا خود کشی کرنے کو جی چاہتا تھا مگر بارہ سال بعد بھی وہ اتنا ہی بزدل تھا۔

بارہ سال میں بڑھتا، اپنی قابلیت اور صلاحیتوں سے دنیا کو فتح کر لینے کے خواب دیکھتا، سکندر کہیں کھو چکا تھا۔ بارہ سال بعد بھی وہ دریا میں اسے ترجیح بھی ڈراؤنے خوابوں کی صورت سوتے سے جگا دیا کرتی تھیں، اسے اعضاء و زور بے خوابی میں مبتلا کیے رکھتی تھیں۔ اسے خود سے زندگی سے اور دنیا سے نفرت میں مبتلا کیے رکھتی تھیں۔ وہ ان خوابوں سے بارہ سال بعد بھی اتنا ہی ڈرتا تھا جتنا روز اول ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہے گی اور پھر ایک دن یونہی تمام درد سے سستہ حتم بھی ہو جائے گی۔

مگر اسے پتا نہیں تھا اس زندگی میں اسے لیزا محمود بھی ملے گی۔ اس زندگی میں ابھی اسے زندگی بھی ملے گی۔ جب نہ اسے ہنسی کی کوئی ضرورت رہی تھی نہ خوشی کی نہ محبت کی اور نہ ہی زندگی کی تیب اس کی

درد کوئی تکلیف کوئی خواب کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کو کیا کہے جو ہر بار اس کے چہرے پر ہنسی اور دل میں خوشی لانے کا باعث بنتی ہے۔

”یہ سیمورائی کا لقب تم نے مجھے کب دیا؟“
”نہایت یوں میں۔ جب تم نے فلمی ہیروز کی طرح ان جہسپوں سے، بھول چار لڑائی کی تھی۔ دل تو میں تم پر بہت پہلے ہی پار چکی تھی مگر سچ کہوں تو اب اس روز میرے دل نے تمنا تھا مجھے اسی بہادر مرد کے ساتھ اپنی تمام عمر گزارنی ہے۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے اطمینان اور سکون سے بولی تھی۔ وہ تصدیق لیزا کے جملے کا آخری حصہ نظر انداز کر کے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں؟“

”گوگل پر سرچ کیا تھا۔“ وہ ہنس کر اسے چیمیزنے والے انداز میں بولی اس کی کل کی بات کا حوالہ دے رہی تھی۔

”میں تمہاری طرح مشہور شخصیت تو نہیں جو گوگل پر سرچ کرنے سے مل جاؤں۔“

وہ جواباً ”نہا۔ لیزا ابوں پر مسکراہٹ لیے اسے رکھ رہی تھی۔ وہ ایک بل کے لیے چپ ہوا۔ اس نے لیزا پر سے نظریں نہائیں اور بل بھر کے توقف کے بعد اس نے اسے مخاطب کیا۔

”لیزا میں۔“ وہ جو کتنا چاہا رہا تھا شاید وہ سمجھ گئی تھی تب ہی اس نے اس کے ہاتھوں پر فوراً اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسے مزید کچھ کہنے سے روکنے کے لیے۔

”جو باتیں تمہارے دل کو اتنی تکلیف دیتی ہیں تم انہیں مجھ سے بھی مست دہراؤ سکندر؟ تم نے کل جو کچھ مجھے بتایا۔ وہ نہ مجھے بتاتے سب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جان لینے کے بعد بھی کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی سوائے اس کے کہ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ گئی ہے۔ بہت لو پریشان اور مبعوضی بات کہنے کی مگر میں کہوں کہ تمہاری زندگی کے دکھوں پر میرا دل دور رہا

ساتھ ہی اوپر خوب صورت انداز میں نمایاں حروف میں لکھا تھا۔
”You are stronger than a samurai“

(تم سیمورائی سے زیادہ طاقتور ہو۔)
اس نے کارڈ نکولا۔ اندر اسے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا۔
”سیمورائی سکندر!“

سیمورائی وہ بہادر مرد تھے۔ جو نہ موت سے ڈرتے تھے نہ زندگی کے دوسرے استقامت سے۔ وہ آج اپنی اور عزت پر جان دے دینے والے تھے اور آج بھی طاقت بہت تمہاری اور دیکری کا سہیل سمجھے جاتے ہیں مگر میرے لیے سیمورائی سے بھی زیادہ بہادر اور باہمت تم ہو سکندر!

کل رات کے بعد سے میرے دل میں تمہاری عزت اور تمہاری محبت اور بڑھ گئی ہے۔ جو زندگی کے اتنے مشکل حالات سے گزرنے کے بعد بھی خود کو سنبھالنے کے تمام بہترین حالات کا شہا جواں مردی سے سامنا کر لے اس سے بڑھ کر بہادر اور کون ہو سکتا ہے؟
تم ایک بہادر مرد ہو سکندر! اور مجھے بہادر مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں بچے تمہارے ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔
لیزا۔“

وہ فوراً ”ہیڈ سے کھڑا ہوا تھا۔ کارڈ اور مجسمہ وہیں رکھا۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی ذمہ داری بھی گوارا نہیں کی تھی البتہ اپنی رات بھر کی جاگ ہوئی آنکھوں پر پانی کے چیمپے ضرور مارے اور انتہائی تیز رفتاری سے نیچے آیا۔

لیزا اسے سامنے ہی ایک میز پر بیٹھی نظر آگئی تھی۔ لیزا کے سامنے میز پر ناشتے کے تمام لوازمات سجے تھے۔ گو یا وہ ناشتا منگو کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ اب میں بالکل بے اختیاری کیفیت میں وہ بھی مسکرایا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر رات کا کوئی

نہیں کہہ رہی کہ میں کبھی کوشش بھی نہیں کروں گی۔ ہم دونوں اپنی اپنی زندگی کی کمزوریوں، خامیوں، کیوں اور غیر معمولی بن کے ساتھ بھی تو زندگی گزار سکتے ہیں سکندر! وہ مضبوط لہجے میں بولتی جیسے اسے قائل کر لیا جانتی تھی۔

”اچھا، ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تاسٹا کر لیں، کھنڈا ہو رہا ہے۔“ وہ جیسے اپنا راسن بھرا کر بولا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ وہ رشتوں کا ایسا سا ہوا تھا کہ اب ایک نیا رشتہ بنانا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

وہ اس جذباتی کیفیت میں ایسی کوئی بات نہیں کرتا چاہتا تھا جو کل کو لڑائی پر سکون زندگی میں دکھ ہی دکھ لے آئے وہ خود کو نہیں لیزا کو رکھوں سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ زندگی میں اتنی چو میں لو راستہ تو ختم کھا چکا تھا کہ اب کوئی نیا زخم کوئی نئی جوت اسے زیادہ تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھی۔ مگر سچی ہنسی بننے والی اس لڑکی کو جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتا تھا دلکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو تک گولار نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کے ساتھ نے اس لڑکی کو آنسوؤں کے سوا کچھ رتا نہیں تھا۔ وہ اپنے نوے گھراور بکھری، خلی کی بات کر رہی تھی۔ اسے سکندر سے مائل قرار دے رہی تھی وہ اسے کیسے بتائے کہ اس کی زندگی اور سکندر شہر پار کی ذلت، رسوائی اور شکست سے بھری زندگی میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی مماثلت کبھی ہو بھی۔ وہ ہیرا تھی وہ کوئلہ تھا۔ کچھ نکل کپورڈیشن ایک سی مگر بھر بھی بہت فرق تھا۔ ہیرا جس تن پر راج جاتے اس کی تندر بہن بھارے لڑکوں کو ملے جس ہاتھ میں جائے تم سے بھی سیاہ کر در داغ رہا نہ دے۔ وہ اس داخلی تشناب اور چارائی لڑکی کی زندگی پر اپنی زندگی کی نحوستوں کا کبھی سایہ بھی نہیں پڑے رہے گا۔

لیزا اٹھو، بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کو قصداً ”نظر انداز کر کے ناشتہ کے لوازمات پر نگاہیں دوڑائے لگا۔“

”ڈاکٹر میرا ٹورٹ مشرو مزرا لا آئیٹ آڈر اٹالین کلک۔“ اس نے اپنی پلیٹ میں آئیٹس ڈالا۔ ”تم بھی

ہے۔ میں کل رات بہت روئی ہوں سکندر!“ اس نے نظرس اٹھا کر لیزا کو دیکھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں الجھن سی تھی تیری نظرات کی۔ وہ لڑکی اس کے دھوکوں پر رو رہی تھی۔ وہ ایک بل کے لیے روکی پھر اس نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”سکندر لی، جو بہت بے یارک تھا وہ ماضی تھا اب وہ گزرو چکا ہے۔ ماضی کو کس وطن کر کے تم آج کی بات کرو۔ آج کی میری اور اپنی ہمارے آج کی ہمارے آئے والے کل کی۔“ وہ بہت سنجیدہ تھی۔

اب یہ کہنا بے کار تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس کا لیزا کے پیچھے فلورنس چلے آتا ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اس لڑکی سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں لیزا! مگر جو تم چاہتی ہو وہ ممکن نہیں۔“ وہ اسے رکھ سے دیکھ کر اٹھتی سے بولا۔

”کیوں؟ کیوں ممکن نہیں ہے سکندر!“ ”میری زندگی ایک نارمل شخص کی زندگی نہیں ہے لیزا! میں اس ایٹارل زندگی اور تنہائی کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں اب اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔ میں میرا لائف یا فیملی لائف کو انجوائے کرنے والا ہوں نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چاہے جتنی بھی محبت کرتے ہوں مگر میرا ساتھ تمہیں دھوکوں کے سوا کچھ بھی نہیں دے گا۔“

”میں بھی باج سادوں سے اکیلی اپنی فیملی کے بغیر رہ رہی ہوں سکندر! اپنے بابا سے میرے بہت اختلافات ہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں لن کے ساتھ پاکستان میں رہوں۔ میں اپنے بابا کو ناراض کر کے لندن میں رہتی ہوں۔ وہ پاکستان میں اپنی دوسری رائف کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری مٹی میرے بابا سے طلاق کے بعد تین شایاں مزید کر چکی ہیں! اکل کی زیادتی نے انہیں کئی بیماروں میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ آئے دن ہسپتال میں داخل ہو جاتی ہیں۔ نارمل فیملی لائف تو کبھی میں نے بھی نہیں گزارا۔ پھر بھی میں تمہاری طرح یہ تو

ہم تک سے نفرت کرنے لگوں۔" وہ ایک دم ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم صاف کیوں نہیں کہتے سکندر شہیار بہر تم رشتے بناتے ہوئے ڈرتے ہو۔ کہیں تمہیں پھر کوئی نئی چوٹ نہ لگ جائے اس خوف سے تم نے رشتے جوڑنا ہی نہیں چاہتے۔" وہ ایک گھنٹہ ہی غصے سے بولی۔

"ہاں ڈرتا ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں رشتے جوڑنے سے۔ رشتے بنانے کی اہلیت گنوا چکا ہوں۔ مگر مجھے یہ خوف اپنے لیے نہیں تمہارے لیے ہے، لیزا! میں خود کو نہیں، تمہیں دکھوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری بات سچ لگے یا جھوٹ ہو، لیکن اس کا نتیجہ میری تم سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی دکھی نہیں دیکھ سکتا اس سے پہلے تو میں مر جانا پسند کرتا تھا۔"

اس نے بات لیزا ہی کے انداز میں غصے سے شروع کی تھی مگر آخر میں آکر اس کی آواز جذبات کی شدت سے بھرپور ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور بے بسی چھلکنے لگی تھی۔ لیزا جب چاہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اس نے جیسے خود کو کپڑا کیا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے ایرپورٹ جانے کے لیے تیار ہونا ہے۔ میری فلائٹ میں کم وقت رہ گیا ہے۔"

وہ اسے اسی طرح بیٹھا چھوڑ کر لفٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے لیزا سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں بیٹھنے کی پابندی جانے لگی۔



وہ دونوں ایرپورٹ پر تھے۔ وہ ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ سارا راستہ وہ دونوں خاموش رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک لفظ تک کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔

وہ اسے خفا کر کے جاتے ہوئے بہت اواس تھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں خفگی، اواپی اور آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا تھا۔ اس نے لیزا کو دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھول ہی رہا تھا کہ

شروع کر دیا۔

وہ چھری اور کانٹے کی مدد سے آلیٹ کھانے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین رول بھی کھا رہا تھا۔ اس نے لیزا کی آلیٹ میں بھی آلیٹ ڈالا تھا۔

"بیلا! اس طرح اواس بیٹھی تم مجھے بالکل اچھی میں لگ رہی ہو۔ پائیز ناشتہ کرنا میں ابھی نہیں گیا ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ ہم اس ٹاپک پر غصے کے بعد بھی بات کر سکتے ہیں۔"

لیزا نے جیسے محض اس کا ساتھ دینے کے لیے آلیٹ کھانا شروع کیا تھا، اسی اور خاموشی کے ساتھ سکندر۔ بھرپور انداز میں ناشتہ کر رہا تھا۔ اپنے اندر اس وقت ہوتی ٹوٹ پھوٹ، شکست اور سختی، وہ لیزا پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کو سمجھ کر اپنے سینے سے لگا لے، اس لڑکی کو ابھی اسی وقت اپنا لے۔ اسے خود سے کبھی ایک بل کے لیے بھی دور نہ ہونے دے۔ مگر، خود غرض نہیں تھا۔ دوسرے لوگوں اور رشتوں کے ساتھ کبھی خود غرض نہ رہا تھا تو اس لڑکی سے محبت کے رشتے میں کیونکر خود غرض ہو سکتا تھا؟

وہ دونوں ناشتہ کر چکے تھے۔ وہ بھرپور انداز میں جبکہ لیزا اواس کے ساتھ اس سے شکوہ اور ناراضی، لیے۔

"میری فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔ کیا تم مجھے ایرپورٹ چھوڑنے چلو گی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں گنڈ بانی کہنے؟" بے بسی اور غصہ بھرا تھا اس کے سوال میں۔

"گنڈ بانی کیوں؟ اب ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہا کریں گے۔ تمہارے ساتھ ساری زندگی دوستی کا تعلق تو میں چاہتا ہوں لیزا! میں چاہتا ہوں دل کھول کر رہنے اور بہت بولنے والی لیزا محمود زندگی بھر میری دوست رہے۔"

"کیا ہم زندگی کے ساتھی نہیں بن سکتے؟"

"نہیں تب ہم دوست نہیں رہ سکیں گے۔ میرا ساتھ نہیں آتے دکھ دے گا کہ تم میری شکل میرے

ہے، میں تمہارا ساتھ مانگ کر اپنی زندگی اجاڑ رہی ہوں تو اجاڑ لینے دو مجھے میری زندگی۔ ایسی آباد زندگی جس میں سکندر شہنشاہ میرے ساتھ نہ ہو میرے لیے سب سے اجاڑ اور سب سے دیران ہوگی۔ پلیز سکندر! مجھے اپنا ساتھ دے دو۔"

وہ دھڑکتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے لفظوں میں خند بھی تھی اور محبت کی شدت بھی۔ اور وہ بارگیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی محبت کی شدت کے سامنے ہسپا ہو چکا تھا۔ "ٹھیک ہے لیزا! تمہاری ضد اور تمہاری خوشی کے آگے میں سر نہ رکھتا ہوں۔ میں ہمارا رہا ہوں لیزا محمود! بولو کب شادی کرنی ہے؟"

لیزا نے روتے روتے ناراضی سے اسے گھورا تھا۔ "ایسے پروپوز کرتے ہیں کسی خوب صورت لڑکی کو؟ جس سے محبت بھی ہو؟ اسنے فضول اور غیر دبانک انداز میں۔ گویا مجھ پر احسان کیا جا رہا ہو۔" وہ سوچ بھاؤں کا بواؤ نکلتی نظر آتا تھا۔ وہ بولتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

"دیکھا میں نے کہا تھا ہاں غم میرے ساتھ چھٹاؤ گی۔ دیکھ لو، میں کتنا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھ سے اس نے رشتے کے پہلے لمحے ہی میں تمہیں مجھ سے شکایت ہوگئی۔ ابھی ابھی وقت ہے سوچ لو۔" وہ لیزا کو شریر نگاہوں سے دیکھتا ہوا چہرہ کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار جھینپ گئی۔ رخساروں سے رگڑ رگڑ کر فوراً اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔

"اچھا اچھا اب زیادہ فضول بولنے کی نہیں ہو رہی۔ یہ بڑا اہم شادی تک کر رہے ہیں؟" وہ اپنی خفت منانے کو رعب سے بولی۔

"میں تمہارے آگے ہتھیار ڈال چکا ہوں۔ جب تم کو کہوں کہ تم کو ہم وہاں شادی کر لیں گے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

ایک لمحے میں ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ اسے استغراق بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نے بے اختیار بہت مضبوطی سے اس کے ہاتھ تھام لینے چاہتے

لیزا بھرائی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی۔ "مجھے گند بانی مت کہنا سکندر! اچھلی بار میں مضبوط رہی تھی مگر آج جو بڑوں گی۔ تم مجھے ٹھکر آکر جا رہے ہو تو خاموشی سے چلے جاؤ۔ مجھے تمہارے پر تکلف الوداع جملوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بے اختیار لیزا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور نرمی سے بولا۔

"مجھ سے خفا مت ہو لیزا تم نہیں جانتیں مگر میں جانتا ہوں اپنے اندر ازنی تھائیاں اور دیرایاں۔ تم میرے ساتھ کبھی خوش نہیں رہو گی۔" "میں تمہارے بغیر بھی تو خوش نہیں رہوں گی۔" وہ بولتے ہوئے رو پڑی تھی۔

وہ اس لڑکی کو دکھ دینے اور رلائے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی وجہ سے رونا دیکھ کر اس کا دل تڑپ رہا تھا۔

"میں تمہارے بغیر کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی سکندر! تمہارے ساتھ اگر میں دلچسپی بھی رہی تاں تب بھی نہیں الزام نہیں دوں گی۔ پلیز مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ۔"

"کیوں خود کو کانٹوں پر گھسیٹ رہی ہو؟ اپنی اچھی پہلی پر سکون زندگی کو کیوں ایک کڑے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہو؟ تمہیں میرے ساتھ میں کانٹوں بھرے راستے کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

وہ اس کے سامنے کھڑی ڈارو رفتار دوڑنی تھی۔ وہ اس لڑکی کے آنسوؤں سے بارے لگتا تھا۔ نہیں دیکھ سکتا وہ اسے رونا ہوا۔ اب اس کے انکار میں شدت نہیں رہی تھی۔ ایک بار مان لینے والی کیفیت ابھی تھی وہ جیسے اس لڑکی کے آگے ہتھیار ڈالنے لگا تھا۔

"چار دن نہیں گزر دیں گے تمہیں میرے ساتھ زندگی شروع کیے اور تم اپنے فیصلے پر پچھتانے لگو گی۔"

"میرے میری زندگی سے تاں سکندر! میں اس کے ساتھ جو بھی کر دوں میری مرضی۔ میں پچھتاؤں کی بات بھی ہوں گی، تمہیں اس سے کیا پر اہم ہے؟ مگر تمہیں لگتا

”ابھی بھی وقت ہے تم سوچ لو۔“
 ”میں نے سوچ لیا۔“ سینورا سکندر! میں تم ہی سے
 شادی کروں گی یہ وقت تمہے ساتھ ہر کسی میں تبدیلی آ
 جاتی ہے اور پھر محبت میں ہمّت طاقت ہے یہ سب کچھ
 دل کر رکھ سکتی ہے۔“ سکندر کی چیخیں اڑھارے کے

✱ ✱ ✱

اس بار اس کے دور جانے پر وہ بالکل بھی اواس نہ
تھی۔ اس بار یہ زمینی فاصلہ جو ان کے بیچ حائل ہوا تھا
وقتی تھا۔ سکندر کو اپریل پورٹ چھوڑنے کے بعد اگلا کام
اس نے سیم کو فون کرنے کا کیا تھا۔
”سیم سیم سیم ایس بہت خوش ہوں سیم!“ اس

خاموشی کے بعد سیم نے اس سے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

سیم اتنی سنجیدہ تھی جیسے اس نے اسے اپنی موت کی اطلاع دے دی ہو۔

"ابھی نہیں بتایا۔ میں یہ خوشی سب سے پہلے تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی سیم۔"

وہ دیکھ بھرے لمحے میں بولی تھی۔ اس کے لمحے میں ایک شکوکہ بھی چھپا تھا، بس کے لیے کہ وہ اس کی زندگی کی اس اتنی بڑی خوشی کے موقع پر پاکستانی مردوں سے متعلق وہ قصہ کیوں شروع کر بیٹھیں گی۔

"نرا میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم ان پاکستانی مردوں کو نہیں جانتی ہو۔ محبت سب کچھ نہیں ہوتی ٹرپلینز سمجھو۔" سیم اس کی اداسی اور غلط محسوس کر کے بہت پیار سے بولی تھی۔

"سیم! میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرے لیے یہ محبت ہی سب کچھ ہے۔"

وہ رندھے لمحے میں بولی تھی۔ سیم کی سنجیدگی نے اسے اداس کر دیا تھا۔ سیم سے اسے جتنا پیار تھا اس کی خواہش تھی کہ سیم اس کی زندگی کی اس خوشی میں پورے دل سے خوش ہو۔ وہ سیم کو خفا کر کے اگر شادی کر لیتی تو بہت اداس رہتی۔ وہ سیم کو خفا کرنے کا قصور نہیں کر سکتی تھی۔

"پلیز سیم! کیا تم میری خاطر اس رشتے پر خوش نہیں ہو سکتیں؟ اگر تم خوش نہیں ہو میں تم میری شادی پر نہ ہو میں تو میں پورے دل سے خوش نہیں ہو پاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں کچھ چھلک اُٹی تھی۔

"کس نے کہا میں نہیں آؤں گی۔ میں صرف تمہیں سمجھا رہی تھی نرا! لیکن اگر تم اس رشتے پر خوش ہو! میں شادی کرنا چاہتی ہوں تو میں بھی خوش ہوں۔ میری گڑبازی، بس دلہن بننے کی تو کیا میں اس کے پاس نہیں ہوں گی؟ یہ بتاؤ کب کر رہے ہو تم دونوں شادی؟"

اس کی اداسی اور آنسو محسوس کر کے سیم فوراً ہی

کے فون اٹھاتے ہی اس نے کہا تھا۔
"لور میں تمہاری خوشی سے بھرپور آواز سن کر بہت خوش ہوں نرا۔"

"وجہ کیس کنو میری خوشی کی؟"

"تمہارا شو تمہاری امیدوں سے زیادہ کامیاب ہو گیا ہے؟" اس نے سیم کی مسکراتی آواز سنی۔

"جی نہیں اس سے بھی بڑی بات ہے۔ بہت بڑی بات ہے سیم! اس نے بل بھر کا ڈرامائی سا نوٹ دیا پھر خوشی سے کھٹکتی آواز میں بولی۔

"میں شادی کر رہی ہوں سیم!"

"واقعی نرا؟ کس سے؟ کون ہے وہ؟"

"دہی، جو مجھے روم میں ملا تھا، پھر کچھ گیا تھا۔ وہ مجھے پھر مل گیا ہے سیم! اب کی بار کبھی بھی نہ بچھڑنے کے لیے۔ جس طرح میں اس سے محبت کرنے لگی تھی وہ بھی کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے تلاش کر رہا تھا، وہ لوہے کی تلک آگیا تھا۔ کتنی رومانٹک بات ہے نا یہ سیم!"

وہ خوشی سے کھلکھلا رہی تھی۔ اسے جواب میں وہ سری طرف مکمل خاموشی سنائی دی تھی۔

"سیم! کیا ہوا؟ تم چپ کیوں ہو گئیں؟"

"نرا! میں کیا بولوں؟ تم ایک پاکستانی مو سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر کے اس قدر خوش ہو رہی ہو۔ میں کیا بولوں؟"

سیم کی بہت سنجیدہ آواز اس کی سماعتوں سے نکرائی تھی۔ اپنی بے تحاشا خوشی میں سیم کی اس وجہ سنجیدگی نے اسے بھی بل بھر میں ہی بالکل سنجیدہ کر دیا تھا۔

"وہ جو ہے جیسا ہے جس ملک سے ہے میں اس سے محبت کرتی ہوں سیم! میں اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"جب تم فیصلہ کر رہی تھیں تو کب میں کیا کہوں؟"

سیم کا لہجہ بہت سنجیدہ اور بہت دھکم بھرائ تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی اور سیم چاہتے ہوئے بھی اسے اس فیصلے سے روک نہیں پا رہی تھی۔

"تم نے پیا کو بتایا اس بارے میں؟" چند سیکنڈ کی

محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔
 "میں تمہیں ایک 'دو دن' میں فون کر کے بتاؤں گی۔"

انچر مجسمہ رکھے ہوئے بیٹھا تھا جو آج صبح لیڑا نے اسے
 دیا تھا۔ اس کا بنایا کارڈ بھی اس نے اپنے سامنے کھول
 کر رکھا ہوا تھا۔
 وہ ان چیزوں کو دیکھتا لیڑا کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔
 پاس رکھا موبائل بجا تھا۔ لیڑا کال کر رہی تھی۔ اس
 نے لپک کر فوراً "فون اٹھایا تھا۔
 "لیڑا۔" اسنے حق کے ساتھ اس کا نام لے کر آکٹا اچھا
 لگ رہا تھا، "کس قدر دل نشیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
 "کیا کر رہے تھے؟"

"سوئے جا رہا تھا۔" وہ اسے چاہے کو بولا تھا۔
 "تم مجھ سے بات کے بغیر سو جاتے۔ وہ بات چیتنے کے
 بعد اتنی تفریق تو تمہیں ہوتی نہیں کہ ایک فون کال ہی
 اپنی خیریت بتانے کی کر دیتے اور ابھی بھی مجھ سے بات
 کیے بغیر سوئے جا رہے تھے۔" وہ لڑنے والے انداز میں
 بولی تھی۔

"شکایت نمبر دو 'چودہ گھنٹوں' میں اب تک تمہیں
 مجھ سے لڑ کاہٹیں ہو چکی ہیں سینورز! وہ ہنس کر بولا۔

"مجھے ایک دن میں ایک ہزار شکایتیں ہوں گی مگر
 میں تمہارا پیچھا تب بھی نہیں چھوڑاؤں گی۔ ان فکٹ
 مجھ سے چھٹکارا اب تمہیں زندگی بھر نہیں ملے گا۔"
 وہ دھونس دینے والے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے 'منت' چھوڑنا میرا پیچھا مگر ابھی تو مجھے
 سونے دو۔ چٹھیاں تھماری ہیں۔ یہاں رات خاصی ہو
 چکی ہے اور میں نے صبح آؤں جاتا ہے۔" وہ اس سے
 بات کرنا ہوا صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر
 پیٹیم مسکراہٹ تھی۔ سچی مسکراہٹ۔ اس بل اسے
 دنیا کی کوئی چیز بری نہیں لگ رہی تھی۔ اسے زندگی
 بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا زندہ رہنے کو دل چاہ
 رہا تھا۔ اس کا خدا سے اپنی لمبی عمر کا دعائے کامل چاہ
 رہا تھا۔ وہ ابھی ٹکی تھی، ابھی ابھی۔ وہ اس کے ساتھ
 ایک بہت طویل عمر گزارنا چاہتا تھا۔

"بڑے بد تمیز اور بے مروت، تو تم سکندر شہزاد!"
 وہ اس کی سونے والی بات کے جواب میں مصنوعی فحش

"ٹھیک ہے اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں تم
 سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں سیم!"
 سیم کی محبت کے جواب میں وہ بھی بہت ڈالمانہ پن
 سے بولی تھی۔ وہ فون رکھ کر چپ چاپ بیٹھی تھی۔
 سیم جب سکندر سے ملے گی تو اسے اندازہ ہو گا کہ تمام
 پاکستانی مرد بڑے نہیں ہوتے۔ اگر ان کے بلایا اور ہاشم
 بڑے ثابت ہوئے ہیں تو یہ کوئی فارمولا تو نہیں کہ تمام
 پاکستانی مرد بڑے ہی ہوں گے۔ وہ سیم کی اس سوچ کو
 تبدیل کر دینا چاہتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا سیم کو
 سکندر بہت پسند آئے گا۔ وہ تنہا ہی اتنا اچھا۔ وہ کسی کو
 بھی ناپسند ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دوسری کال وہ فنی کو کر رہی تھی۔ وہ فنی کے گلے
 لگ کر سکندر کو کھینچنے پر اتار دیتی تھی، "آج انہیں جانا
 چاہتی تھی کہ جسے اس نے کھو دیا تھا۔ وہ اسے بھڑل گیا
 ہے۔"

"فنی! میں اور سکندر شادی کر رہے ہیں۔" سلام
 کے بعد اس نے اگلی بات انہیں یہی بتائی تھی۔ فنی
 خوش بھی ہو رہی تھیں اور بہت حیران بھی۔ اسے
 آرٹ گیلری اپنے شو میں پہنچنا تھا اس لیے مختصر
 غفلتوں میں اس نے جلدی جلدی فنی کو ساری بات
 بتائی تھی۔



رات وہ اپنے فلیٹ میں تھا۔ وہی فلیٹ وہی ابھی
 بکری زندگی وہی فلیٹ میں تھا۔ وہی خاموشی مگر پھر
 بھی اسے ہر طرف رونق ہی رونق محسوس ہو رہی
 تھی۔ کل رات اس کا بی چاہا تھا وہ نہ ہوا اپنے بل
 اوجھتا جنگلوں سے نکل جائے اور کچھ وہ بے وجہ
 مسکراتے جا رہا تھا۔ اسے زندگی اچھی لگ رہی تھی
 اسے اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے وہی منی

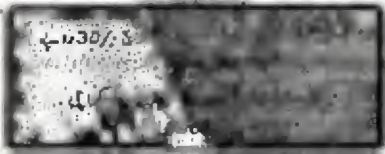
سکندر!"

وہ آنکھیں بند کیے اس کی نرم آواز سن رہا تھا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا وہ لیزا کے شانے پر سر رکھ کر
اپنے اندر کے برسوں سے جسے سب آنسو بہا ڈالے۔
اپنا ہر غم اس سے کہہ دے۔ اسے بتائے کہ دنیا ہے
لوگوں نے رشتوں نے اسے کتنے دکھ دیے ہیں۔
(بائی آئندہ وہ ان شاء اللہ)

سے بولی تھی۔
"شکایت نمبر تین۔" وہ توجہ لگا کر ہنسا تھا سوہو بولایا
چیز بڑے انداز میں فوراً "بولی تھی۔
"سو جاؤ لیکن وہاں تک انسان!" وہ مسلسل ہنس رہا
تھا۔ اس بار اسے لیزا کی بھی ہنسی سنائی دی تھی۔
"کچھ اچھی بات ہی بولی ہو۔ جسے سوچ کر میں
ساری رات خوش ہوتی رہوں۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	موضوع	کتاب کا نام
500/-	آہستہ چش	ہما دہل
600/-	ماحتہ نہیں	دور موسم
500/-	ہمنا ہمارے	زندگی ایک دوستی
200/-	رخسانہ کاروان	خوشبو کا کرنی گھر نہیں
400/-	نارہ چوہری	شہر کی کدو دانے
250/-	نارہ چوہری	حیرت نامک شہریت
450/-	آہستہ مرزا	دل ایک شہر نہیں
500/-	فاکر افکار	آنکھوں کا شہر
500/-	فاکر افکار	بہول بھولوں غریب گلیاں
250/-	فاکر افکار	بھلاں نہ ہو سب کالے
300/-	فاکر افکار	یہ گلیاں نہ چہارے
200/-	غزلہ مزمل	عین سے محبت
350/-	آہستہ لانی	دل آئے احوال نا
200/-	آہستہ راتی	بھگتا جائیں خواب
250/-	فوریہ پاکین	دل کو خند تھی مچائی سے
200/-	فوریہ سعید	دل کی کاجو
450/-	الکسان آفریدی	ایک خوشبو ہوا دہل



"لیزا! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ مگر
تمہارے معیار کے مطابق وہاں تک نہیں ہوں۔
جیسا تم توقع رکھتی ہو اس طرح کا اظہار محبت شاید میں
نہیں بھی نہ کر پاؤں مگر میرے دل میں ہر طرف تمہی تم
ہو۔ پلینز جلدی سے آجاؤ میری زندگی میں۔ میں
تمہارے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں، میں تمہارے ساتھ
خوش ہونا چاہتا ہوں، میں تمہارے ساتھ زندگی کو
محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ آنکھیں بند کر کے اس سے بول رہا تھا۔ اپنے دل
کی تمام رزسیاؤں اور گہرائیوں کے ساتھ۔
"تم صبح بچھے فون کر دو گی؟" اس نے آنکھیں بند
کیے کیے آہستگی سے پوچھا تھا۔ وہ اپنی صبح بھی اسی کی
آواز سن کر کرنا چاہ رہا تھا۔

"ہر بار میں فون کیوں کروں۔ تم فون کرنا۔"
"نہیں پلینز، تم کرنا لیزا! میں چاہتا ہوں صبح میری
آنکھ تمہاری آواز سن کر کھلے۔" بہت آہستہ آواز
میں بولا تھا۔ اس بار جیسے اس کے چہرے پر موجود اور
دل میں جیسے تمام جذبات اس تک پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی
آہستہ آواز میں غری سے بولی تھی۔

"میں صبح تمہیں فون کروں گی سکندر!"
"میرا دل چاہ رہا ہے تم اس وقت میرے پاس
ہو تیں۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اپنے پاس چھپا لو۔ مجھے
اپنے پاس لانا کہ بہت گہری نیند ملا۔ میں برسوں سے
سو رہا نہیں ہوں۔"

وہ اس کی اتنی اپنی تھی کہ اپنا آپ اس پر عیاں
کرتے ہوئے اسے کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔
"میں تمہارے سارے دکھ سمیٹ لوں گی"

زین کی زندگی میں ذہن اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پروڈیوکر مانتا ہے۔ شہیار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔
پول ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی
سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد
اخلاقی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس بات پر زین سکندر سے مزید رشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھروالوں کی عدم موجودگی میں
سکندر ام مریم پر بھراؤنا حملہ کرنا ہے مگر بروقت زین اور شہیار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔
ام مریم پر بھراؤنا حملہ کرنے پر شہیار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی
آہستہ شہیار سکندر کو فون کرتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا چلی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پور ٹریٹ بنانے کی اجازت دے رہا ہے۔ تصویر
بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لٹوانے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے اسیں مار چکا
ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر دم سے ہمیشہ سے لے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر
دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے سنبھلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ زین کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے
نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا اسم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بناوٹی
کہتی ہے۔

ام مریم زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آئے مگر شہیار خان اسے دھکے
دے کر نکال دیتے ہیں۔ امواجان دوڑ کر لپکا لپکی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہیار خان ان کی ایک
نہیں سننے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد اسے خالق کر کے ہیرہ رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا
رہتا ہے۔

سکندر دوبارہ چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرنا ہے۔

سب سے پہلی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم محمود خالد کی بیباں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بدتمیز تھی۔ اپنے شوہر
ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کر رہا رہتا ہے۔ سکندر کو وہاں ایک لڑکی پر لیزا
کا نشان مگڑا رہا ہے مگر لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دم اتارنے کے بعد غیر اداوی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلوئس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا
ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایک بے بسی کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی
محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مزاحیہ و قار مضروب ہو
چکا ہے۔ وہ نہ رامت محسوس کرنا ہے اور وہ ٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی باور کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی
مشینز ام مریم نے ایک لڑکی سے ہوتے ہوئے اسے دھجائے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی ٹھٹھا الزام
لگا کر اسے اپنے گھروالوں کی نظروں میں ڈھیل کر دیا۔

9 نویں قسط

وہ اس کی آواز سن کر سویا تھا وہ اس کی آواز سن کر
ہل اٹھا۔
بہت گہری بہت پر سکون نیند سو رہا تھا تو جب اس
کے موبائل پر لیزا کی کال آئی تھی۔ وہ ٹھیک اس کے

جسے ہوئے ٹائم پر اسے جگا رہی تھی۔ ایک دو گھنٹوں
کے بعد وہ جاگھا۔
”اٹھ جائیے سینور سکندر“ اس کے نیند میں
ڈوبے ہوئے کے جواب میں اسے مسکرا کر بولی۔

”روا باجا چھوڑ سکتی ہو؟“
 ”ہاں۔“ وہ بغیر ایک پل کی ہچکچاہٹ کے فوراً
 بولی۔

”اگر تم میری خاطر یہ وہ چیزیں چھوڑ سکتی ہو تو اس کا
 مطلب ہے تم مجھ سے واقعی بہت محبت کرتی ہو۔“ وہ
 مسکرا کر شریر سے انداز میں بولا۔
 ”تمہیں میری محبت کا یقین ہونا چاہیے سکندر
 شہزاد!“

”مجھے تمہاری محبت کا یقین ہے لیذا میری بہت عطا
 اور بہت بکھری ہوئی زندگی میں واحد خوشی واحد روشنی
 تم ہو۔ میری زندگی میں زندگی ہی تم ہو۔“
 بولتے ہوئے اس کا لہجہ بے حیدر ہم ہو گیا تھا۔ اس
 کے لہجے میں جذبات کی شدت تھی۔ جواب میں چند
 سیکنڈ کے لیے لیذا بالکل خاموش رہی۔
 ”بس اب تم گزری ہوئی باتوں کو مت سوچا کرو۔
 اچھی اچھی باتیں سوچا کرو، میرے اور اپنے بارے میں
 جو زندگی ہم ایک ساتھ گزاریں گے اس کے بارے
 میں۔“

لیذا کی نرم لہجے میں سمجھائی ان باتوں کو مسترد ہوا وہ
 بیڈ سے اٹھ گیا۔ اسے آفس کے لیے دیر ہو رہی تھی
 اس لیے اسے خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کیا۔
 جلدی جلدی نما کر آفس کے لیے تیار ہونے کے بعد وہ
 کچن میں آیا تاکہ ناشتا کر سکے۔ وہ گھڑی سے باہر نظر
 آتے صبح کے منظری کی طرح خود کو بہت فریش اور تروتازہ
 محسوس کر رہا تھا۔

کیا وہ یہاں آئے گی؟ کیا وہ اس کے ساتھ ایک نئی
 زندگی شروع کرے گی؟ وہ کچن اور کچن سے باہر نظر
 آتے اپنے فلیٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ دل کی
 دھڑکنوں میں بھی اس لڑکی کے ساتھ تمام وعدے کر
 لینے کے باوجود اس سے تمام عہد محبت و وفا سن لینے
 کے باوجود بھی وہ اس کے ساتھ کے خواب دیکھتے ہوئے
 ڈر رہا تھا۔

اس کے اندر ایک خوف تھا۔ لیذا اس سے کہہ

وہ اس کی آواز سننے ہی بالکل خوش باش اور چست
 ہو گیا۔ یوں جیسے غنڈے سے جاننے کے ساتھ ہی اسے دن
 بھر کے لیے بھرپور توانائی مل گئی ہو۔
 ”میں جاگ گیا ہوں سینور!“

”تمہیں نیند آئی؟“ وہ جانتا تھا لیذا اس کے نیند نہ
 آنے کے مرض کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سے یہ
 بات پوچھ رہی ہے۔ اسے لیذا کا اپنی فکر کرتا اور محبت
 سے بھرپور انداز میں سے بھی بڑھ کر اچھا لگا۔
 ”ہاں مجھے نیند آئی۔ بہت پرسکون اور بہت گہری
 نیند۔“

”ضرور تم نے مجھے سوچا وہ گا؟“ اس لیے پرسکون نیند
 سوئے ہو۔“ وہ اس کے کنبے میں شامل شرارت پر
 مسکراتا ہوا بیدار اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں میں تمہیں سوچتے ہوئے سوچا تھا اور اب میں
 تمہیں سوچتے ہوئے ہی اپنے دن کا آغاز کرنا چاہتا
 ہوں۔ اب تم کوئی اچھی بات کہو مجھ سے۔“
 ”اچھی بات؟“ لیذا حیرانی سے بولی گویا اس کی بات
 سمجھ نہ پائی ہو۔

”ہاں اچھی بات کوئی ایسی بات جسے سوچ کر میں
 سارا دن خوش ہوتا رہوں۔“

اس نے لیذا کا رات والا جملہ اسی کے انداز میں
 دہرایا تھا۔ لائن کے دوسری جانب سے اسے لیذا کے
 کھانکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس
 کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

”میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں سکندر!“
 ”سستی؟ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو لیذا!“

وہ اسے بہت جانتی ہے وہ جانتا تھا پھر بھی اس
 وقت وہ یہ منہا چاہتا تھا کہ وہ بھی چلا جاتا ہے۔ سب سے حد
 اور بے حساب۔

”تم سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں تمہارے لیے
 کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

”تم میرے لیے بیشک چھوڑ سکتی ہو؟“
 ”ہاں۔“

”جھوٹ مجھے یاد کر رہے ہو، تو مجھے فون کرتے۔“

اس نے فوراً اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ جواب میں اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس طرح کی منفی سوچوں میں گھرا ہے سوچ رہا تھا۔

”خیر چھوڑو اس بات کو۔ مجھے تم سے یہ پوچھنا تھا“

تم نے ہماری شادی کے بارے میں کیا سوچا؟

”کیا سوچا مطلب؟“ وہ غائب دماغی سے بولا۔

”تم شادی پر کس کلر کا سوٹ پہنو گے اس بارے میں۔“ وہ اس کی غیر حاضر دماغی پرچہ کر بولی۔ وہ جواب میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

”میرا خیال ہے بلیک کلر کا۔ بلیک کلر مجھ پر چلتا ہے اور تم؟“

”یک دم ہی اس کا موڈ تبدیل ہو کر خوشگوار ہو گیا۔

اسے میں خواب لرز آرزوئیں سب بھر دل میں جاگ اٹھیں۔ اسے لیزا کے ساتھ غیر منجیدہ انداز میں گفتگو کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

”جو تم مجھے خرید کر دو گے میں رہی چٹنوں گی۔

تمہیں میں پاکستانی دلہن کے روپ میں اچھی لگوں گی یا

وہ سنسنی دلہن کے روپ میں؟“

”تم ہر روپ میں اچھی لگو گی۔ تم پر ہر رنگ ہر

لباس بیجا ہے۔“

”ٹیلی ویژن جواب نہیں دیتی پسند تاز۔“ وہ رعب

ڈالنے والے انداز میں بولی۔

”پاکستانی دلہن۔ میں خفا ہوں۔“

وہ بے اختیار اپنی پسند بتا گیا۔ بغیر کسی شعوری

کوشش کے یک دم ہی اس کے ذہن میں مس خرم کا

خوب صورت، جو ڈاڑھ کے ذہن بنی لیزا کا تصور ابھر آیا

تھا۔ یہ خوابوں میں رماناں نے کب سے شروع کر

دیا؟ وہ ذرا اپنے تصور پر حیران ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر تم مجھے ریڈ کلر کا پاکستانی برائیل ڈ

ڈرہیں دلاتا۔“

رہی ہے اور جو وہ اس کے کہنے پر مان بھی گیا ہے وہ ہو نہیں پائے گا۔ وہ اور لیزا ایک نہیں ہو پائیں گے۔ لیزا اس کی زندگی میں نہیں آئے گی۔ کہیں نہ کہیں سے اس کی زندگی کی محسوسات اسے پھر اپنے گھیرے میں لے لے گی۔ وہ اس لڑکی کو کھو دے گا۔ جب تک اس کی محبت قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا، جب تک اسے اپنی محبت دینے سے انکار کر رہا تھا تب تک خدیجہ دل کو اس نے سنبھالنا ہوا تھا مگر اب اسے اپنی زندگی میں لیزا محمود چاہیے تھی۔

اگر زندگی نے اس بار اس کے ساتھ کچھ برار کیا، اگر لیزا اسے نہ ملی تو اب کی بار وہ ایسا ٹوٹ کر پھڑکے گا کہ پھر لیزا بھی اسے سمیٹ نہیں پائے گی۔ کیا زندگی تمام عمر سکندر شہزاد پر صرف تنگ ہی برساتے گی؟ کبھی کوئی بھولے کوئی خوشی کوئی ہنسی اس کے حصے میں نہیں آئے گی؟ وہ لیزا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ لڑتے ہوئے زندگی کو بتا رہا تھا کہ اس بار اس سے اس کے خواب اور محبت چھیننے کی کوشش نہ کرے۔ زندگی لیزا محمود کو اس سے چھیننے کی کوشش نہ کرے۔

آج ہفتے کا دن تھا، اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ مگر کچھ ضروری کام کی وجہ سے اسے آفس جانا پڑا تھا۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے متعلق اپنا قانونی نقطہ نظر دریافت کر رہا تھا اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ پر مرکوز تھیں، اس کی انگلیاں حیرت فز فز سے حروف ٹاپ کر رہی تھیں۔ مگر اس کا دل مسلسل اسے وہاں اور اندیشوں میں جٹا کر کے مشغول کر رہا تھا۔ اس کی منفی سوچیں اس پر حاوی ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا موبائل بج رہا تھا۔

”لیزا!“ وہ اس کی آواز سن کر آج تک کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا منفی سوچوں کے ان لمحوں میں۔

”کیا کر رہے تھے؟“ وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

”تمہیں یاد کر رہا تھا۔“

”میں تمہیں ریڈ کھڑکا براہیل ڈریس ضرور ملاؤں گا ویسے تم اصل میں پوچھ کیا رہی تھیں؟“ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ اصل بات کی طرف آیا۔
”میں بس یہی پوچھ رہی تھی تم نے کچھ پلان کیا ہاوی شادی کے بارے میں؟ یعنی ہم شادی کب کر رہے ہیں اور کہاں؟“

”تم نے اپنی بہن اور بھئی سے بات کر لی؟“
”ہاں اوہ دونوں میری شادی سے بہت خوش ہیں۔ یعنی تو بہت ہی ایکسٹینڈ ہیں۔ ان دونوں نے مجھ سے کہا ہے میں انہیں جب اور جہاں آنے کو کہوں گی وہ دونوں میری شادی میں شرکت کے لیے وہاں آجائیں گی۔ بابا کو ابھی میں نے نہیں بتایا۔ میں سوچ رہی تھی پہلے ڈیموٹ اور جگہ ملے کہ کس بھری انہیں بتاؤں گی؟“

ان دونوں ہی کی زندگیوں لیبارل تھیں۔ جس طرح وہ تمام خفیہ رشتوں کے ہوتے ہوئے تھاتھا۔ اسی طرح لیزا ابھی باپ کے ہوتے ہوئے اپنی شادی میں اس کی شرکت یا عدم شرکت سے بے نیاز تھی۔ وہ لیزا کی اس کے پاس سے ناراضی سے باخبر تھا اس لیے کہ جواباً

”لیزا! اس وقت میں آفس میں ہوں۔ ہم اس ٹاپک پر رات میں تفصیل سے بات کر لیں؟ جب ہی دم دونوں مل کر ساوی جیس ملے کر لیں گے۔“
”اوکے سینور سکندر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ فون بند کرنے کے بعد دوبارہ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ پھر اپنا کام کرنے لگا تھا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب اس کے لیوں پر ایک مدھم سی زندگی کی امنگ سے بھری مسکراہٹ تھی اور اس کے دل میں خوشیوں خواب اور آرزوئیں پھر سے شور مچاتے اسے زندگی کے خوب صورت ہونے کا یقین ملا رہی تھیں۔



انہیں آفس سے آئے ابھی کچھ ہی دور ہوئی تھی۔ شاور لے کر آنے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے لی دی پر ریخوٹ سے چھیل تبدیل کر کر کے مختلف پروگرام دیکھ رہے تھے۔

خائستہ بچن میں ان کے لیے چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس تیار کر رہی تھیں۔ وہ آفس میں زیادہ دیر ہی نہیں کرتے تھے۔ بہت سے بہت ہوا تو تھوڑی سی سلا ریادی لے لی ورنہ وہ بھی نہیں۔ سو عائشہ ان کی دفتر سے واپسی پر چائے کے ساتھ کچھ پھلکے اسنیکس کا اہتمام رکھا کرتی تھیں۔

انہیں باہر کسی کے پوٹے اور باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ”مریم آئی گئی۔ بہت دور سے جب ابھی آواز واضح بھی نہیں ہوئی تھی وہ اس کی آواز پہچان گئے تھے۔

”السلام علیکم یاما۔“ وہ اندر داخل ہوئی۔
”وعلیکم السلام۔“ لی دی کی آواز ہلکی کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا اور وہ بار اور شفقت سے مسکرائے۔ مریم ان کے پاس آئی۔ اس نے پیشہ کی طرح ان کے گل پر یاد رکھ بپ کی فطری محبت سے ان کا دل یک دم ہی بھرا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”ٹھیک ہو یا؟“

”بالکل ٹھیک ہوں یاما۔“ وہ ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔

”آفس سے گھر واپس جا رہی تھی میں نے سوچا کافی دن ہو گئے آپ سے ملے ہوئے اس لیے آگئی۔ آپ تو میرے گھر گئے ہی نہیں ہیں۔“ مریم نے مسکرا کر کہتے ہوئے ان سے شکوہ کیا۔ وہ کوئٹہ کے باوجود اس کے گھر جا نہیں پاتے تھے۔ کبھی مجبوراً جانا پڑتا تو وہ ان کا دل پریشان رہتا تھا۔ انہیں مریم کے گھر میں کسی کی سسکیاں اور آہیں سنائی دیتی تھیں۔

”والدین کو بیٹیوں کے گھر زبان نہیں جانا

چاہیے۔" وہ کوشش کر کے مسکرائے۔

"ایسا! یہ آپ کس زمانے کی ویڈیو سی باتیں کرتے ہیں۔"

مریم نے منہ ہلایا پھر یک دم ہی جیسے کچھ خیال آنے پر ان سے بولی۔

"آپ کے پاس لیرا کا فون آیا؟"

"نہیں۔ کیوں؟ وہ ٹھیک تو ہے۔ ہاں؟" ایک دم ہی ان کا دل گھبرا اٹھا۔ "خدا خیر کرے۔ ان کی کلثوم بالکل خیریت سے ہوتی۔"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔" انہیں محسوس ہوا "مریم ان کے چہرے کو بہت بخور دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"وہ شادی کر رہی ہے خدا جانے کس کے ساتھ۔ میں سمجھی اس نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔" مریم نے سنجیدگی سے کہا۔

ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ "شادی؟" "جی۔ آپ سے اجازت نہیں لی تھی، کم از کم آپ کو اطلاع تو کر دیتی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا بھی تھا کہ وہ آپ کو بتائے، آپ سے پریشانی لے، بلکہ پہلے آپ سے اس لڑکے کو ملوائے، جس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ مگر میرے سمجھانے کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔"

مریم کے لمحے میں تأسف اور بے چارگی جیسے لیرا کی خود کرنی اور سنائی سے دھکی ہو رہی تھی۔

ان کے چہرے پر یک دم ہی سختی سی آگئی۔ "تم جانتی ہو اس لڑکے کو؟" وہ سخت نگاہوں سے مریم کو دیکھ رہے تھے۔

"نہیں۔ خدا جانے کون ہے، کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے، کس ملک کا رہنے والا ہے۔ پتا نہیں مسلمان ہے بھی کہ نہیں۔ میں بالکل بھی نہیں جانتی کہ وہ کس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ میں اسے اتنا سمجھا رہی تھی کہ کم از کم لڑکے کو بتاؤ۔"

"میں کلثوم سے بات کر کے پتا کر لوں گا کہ کون لڑکا ہے۔ تم زیادہ فکر مت کرو۔"

مریم کا تأسف اور پریشانی بھرا جملہ انہوں نے بے حد سختی سے کہا۔ ان کے سخت لہجے میں یہ تنبیہ شامل تھی کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جانتے تھے ان کے تحت انداز اور بات کے دم ہی ٹکٹ دینے پر مریم کا موز آف ہو گیا ہے مگر انہوں نے اس کے برآمدنے کی پروا نہیں کی۔ تب ہی عائشہ ہاتھ میں ٹرسے لے وہاں آئی تھیں۔

"ارے مریم آئی ہوئی ہے۔" وہ مریم کو دیکھ کر خوشگوار انداز میں مسکرائیں۔ "السلام علیکم می۔" مریم عائشہ کو دیکھتے ہی صوفے سے اٹھی اور ان سے گلے ملی۔ عائشہ نے اس سے ہل کی طرح ہی بار بار کیا تھا۔ مریم انہیں می کہا کرتی تھی اور عائشہ جواب میں نہ سکتی تھیں انہیں اس کا می کہنا بے حد اچھا لگتا تھا۔

"کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد آئیں؟" عائشہ کے آتے ہی ماحول میں پیدا ہوا خا خاتم ہو گیا تھا۔ اب لڑکی کا ماحول بے حد خوشگوار تھا۔

عائشہ مریم کو اسی طرح اہمیت دے رہی تھیں جیسے میکے آئی شادی شدہ بیٹی کو دی جاتی ہے۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران وہ زیادہ وقت خاموش رہے تھے۔ جنہاں کہیں عائشہ یا مریم انہیں بولنے پر اکساتیں۔ وہ تب ہی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سا جملہ بول دیتے۔ وہ اس وقت بہت ڈسٹرب تھے۔ کلثوم کے شادی کر لینے کے فیصلے پر نہیں۔ وہ کسی اور بات سے پریشان تھے۔



مریم گھر واپس آ چکی تھی۔ اس کا موز بے حد خراب تھا۔ آتے ہی وہ بے وجہ ملانٹن پر چینی چائیاں تھی۔ ہاشم آج صبح ہی دفتری کام سے جائے گا تھا۔ وہ تین روز بعد اس کی واپسی متوقع تھی۔ شکر تھا کہ گھر پر نہیں تھا ورنہ اپنا غصہ اور جھنجھلاہٹ نکالنے کو وہ اس سے بھی لڑ پڑتی۔

ایسا اس سے اتنی دیر کیوں ہو گئے تھے۔ اس کے پاپا

حیات بھائی تھی اپنے باپ کا دل خوش کرنے کے لیے۔ اس نے محبت زندگی میں صرف ایک بار کی تھی، صرف ایک بار۔ سکندر شہزاد سے۔ بھانے ایسا کیا تھا اس شخص میں بچہ پانچ بارہ سالوں بعد بھی اس کے دھارے نکل نہیں سکی تھی۔

وہ نہ اس شخصیت کی محبت اپنے دل سے نکل پائی تھی اور نہ اس کے خود کو ٹھکانے کی اڑت اور ذلت بھی بھول پائی تھی۔ اس نے زندگی میں صرف وہی لوگوں سے سچی محبت کی بھی جن پر اس کا خود کو مٹا دینے کو چاہا تھا۔ ایک سکندر شہزاد اور دوسرے محمود خالد اس کے باپ، سکندر سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لینے کے باوجود نہ اس کی محبت دل سے ختم ہوئی تھی نہ ہی وہ اسے بھی بھول پائی تھی۔

تیرہ سال قبل محمود خالد نے اسے اس کی خواہش پر امریکا بڑھنے کے لیے بھجوایا تھا۔ وہ میلان میں دوران تعلیم جس طرح ہر سال باپ کے پاس لندن جایا کرتی تھی اسی طرح کھنڈ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ہر سال پاکستان اپنی داوی کے پاس بھی جایا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے باپ کا دل اس سے خوش رہے۔ وہ شعل صورت اور زبانت میں تھی بھی لہجہ پر اور ان کا دل خوش کرنے کے لیے پڑھتی بھی بہت لکھن کے ساتھ رہی تھی۔

اس نے امریکا بڑھنے کے لیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو محمود خالد نے اسے بڑھنے کے لیے امریکا بھجوا دیا تھا۔ باپ کا دل خوش کرنے کے لیے اس نے اپنی ہی سہلی ذریا یونیورسٹی میں کیا تھا۔ آکر وہاں لاس انجلس میں رہنے لگا۔

اس کے باپ کو یہ یقین ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق مشرق اور پاکستانی رسم و رواج کو پسند کرتی ہے۔ اس نے ہاں کے رکھے نام سنا کو نہیں، باپ کے رکھے نام ام مریم کو چاہتا تھا۔ جب باپ اسے اس قدر یاد تھا تو ان کے رکھے نام سے کیوں نہ ہوا؟ بہت سے لوگ اس کے ساتھ اور اس کی محبت کے حتمی و خواہاں رہا کرتے تھے۔ اس نے بیشہ مرواں کو

آخر اس سے اتنی دور کیوں ہو گئے تھے؟ وہ تو ان کی سب سے لادلی تھی، اس میں تو ان کی جان تھی، وہ تو ان کی ام مریم تھی۔ پھر آج وہ اتنی دور کیوں محسوس ہوئے تھے؟ چودہ سال کی عمر میں جب اس سے اس کے باپ اپنے تھے تب وہ حاضریں مار مار کر کہنے میں روئی تھی۔ ہاں وہ اکیلے میں روئی تھی۔

وہ بہت بہادر لڑکی تھی، وہ ام مریم تھی، وہ بھی کسی کے سامنے نہیں روئی تھی۔ کوئی دوسرا شخص اس کی ایسی کمزوری بھی نہ تھا کہ وہ اس کے لیے بھی روئی مگر اپنے باپ سے جدا ہونے پر وہ چلا چلا کر روئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے باپ کی جان تھی، کیونکہ وہ اپنے باپ کی سب سے بڑی کمزوری تھی، کیونکہ وہ اپنی زندگی تھی۔ باپ نے زندگی میں صرف اور صرف اس سے چار کیا تھا۔ وہ اپنے باپ پر جان دیتی تھی۔ مگر چون سال کی عمر میں جب باپ اس سے ختمے تب وہ دور کی ایسی دوری ثابت ہوئی کہ آنے والے برسوں میں لاکھ کوششیں کر لینے کے باوجود پھر ان کے اس طرح قریب نہ ہوا پائی جیسے بچپن سے لے کر چودہ سال کی عمر تک رہی تھی۔

زمین فاصلے نے اسے باپ کے دل سے بھی دور کر دیا تھا۔ وہ اس سے بہت دور ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کب وہ اس سے پار کرتے بھی تھے کہ نہیں؟ وہ آج کتنی مختصر دور کتنی کم بات کیا کرتے تھے اس سے۔ عائشہ کے گفتگو میں شریک ہونے پر چاہے وہ ان کے ساتھ باؤں میں مصروف ہو جایا کرتی تھی، مگر اپنے باپ کی مسلسل خاموشی اسے بہت بری طرح چبھتی تھی، اس کے دل کو دکھاتی تھی۔ پھر اسے اپنا گھر، لہذا شہزاد اپنی عیش و آرام اور خوشیوں سے بھری زندگی سب کچھ زہر لگا تھا۔ بری چیز کو آگ لگا دینے کو کہا جاتا تھا۔

ہاشم سے اسے محبت نہیں تھی، مگر وہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ وہ اسے جان دینے کی حد تک چاہتا تھا۔ ہاشم کی عداوت سے بڑھی محبت اسے نحر اور غور میں جلا گیا کرتی تھی۔ اگرچہ کسی چیز کی کمی نہ تھی ہاشم میں مگر ہاشم اسد وہ نہ تھا جس پر ام مریم مرمت جاتی۔ وہ ہاشم سے محبت نہیں کرتی تھی، مگر اس سے شادی اسے

بھورے کی طرح اپنے گرد منڈلاتے دیکھا تھا۔ وہ سب اس کے لیے وقتی تقریر کی پھر اپنی ان کی تسکین کا سامان رہے تھے۔ سچی محبت تو یہ نہیں اسے کبھی کسی سے ہوئی بھی تھی یا نہیں۔ مگر لاپٹے تھا کہ وہ شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرے گی۔

اس کے پاپا اپنے ملک سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹیاں پاکستانی لڑکوں سے شادی کریں تو وہ اپنے پاپا کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔ یونہی دیکھیں وہ ان تعلیم سے ذہن شیردار ملا تو اس کی تلاش ختم ہو گئی۔ وہ بے روقی کی حد تک اس پر فدا ہو چکا تھا۔ اس کے بلکے سے اشارے کی دیر بھی وہ کھینچا کھینچا اس کے پیچھے چلا آیا۔

زین کی محبت قبول کرنے کا فیصلہ اس کے دل کا نہیں بلکہ کا فیصلہ تھا۔ وہ ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا دولت چاندرا روپنہ اثر دوسری کسی چیز کی اس کی فیملی کے پاس کی نہ تھی۔

جو کچھ اس نے اپنے باپ کے پاس پایا تھا وہ سب کچھ زین کے ساتھ بھی اسے اسی طرح ملنا تھا۔ پھر زین کی شکل صورت پر سنائی بھی اچھی تھی وہ اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا اس کا مستقبل بہت شان دار تھا اور وہ احمق لڑکا اس سے بے تحاشا محبت بھی کرتا تھا۔

زین بری چوا کس نہ تھا۔ جب اس نے زین کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا تب اس وقت کے لحاظ سے وہ اس کا بہترین فیصلہ تھا۔ مگر کاش وہ زین سے ملنے سے پہلے سکندر سے مل لیتی۔ کہاں احساس کمتری کا بار زین شیردار اور کہاں دنیا پر کر لینے کی طاقت رکھتا سکندر شیردار۔ زین تو اس کے پاس تک بھی نہ تھا۔

سکندر کو ایک نظر دیکھتے ہی اسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا تھا۔ پچھتاوا ہوا تھا۔ باپ کے دل کو خوش کر لینے کے لیے جو اس نے زین کو بہتر آپشن سمجھتے ہوئے ایک سمجھو لیا تھا۔

سکندر کو دیکھتے ہی اپنے اس غلط فیصلے پر وہ سر پکڑ کر لگتی تھی۔ وہ تو رتی تھا جو اس کے لیے بلیا گیا تھا جو

ہو ہو اس کے جیسا تھا۔ جو اس کی طرح آسمان چھو سکتا تھا جو اسی کی طرح اپنی قابلیت اور ذہانت کے نل پر کچھ بھی حاصل کر سکتا تھا۔ کتنا اعتماد تھا وہ۔ زین کی طرح کا کوئی احساس کمتری اس کے اندر نہ تھا۔ ام مرم اور سکندر شیردار وہ دونوں غیر معمولی صلاحیتیں اور ذہانت رکھتے لوگ ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے۔

زین کیا سوچے گا اور اس کے دل پر کیا گزرے گی اس کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے محبت ہوئی تھی اور وہ زین شیردار جیسے عام سے لڑکے کے جذبات و احساسات کو سمجھ کر کہنے کے ذریعے اس محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔

کبھی ایسا ہوا ہی نہ تھا کہ اس نے کسی پر نگاہ ڈالی ہو اور وہ کھینچا کھینچا اس کے پاس چلا نہ آیا ہو۔ مگر مغرور و خود پسند سکندر شیردار نے اسے ٹھکرایا۔ اس نے اس کی تذلیل کی اور ام مرم ان لوگوں میں سے نہ تھی جو اپنی تذلیل چپ چاپ برداشت کر لیتے ہوں۔ محبت اپنی جگہ ٹھکرا اپنے ٹھکرائے جانے اور ذلیل و بے عزت کیے جانے کا بدلہ تو اسے سکندر شیردار سے لینا ہی تھا۔

اس وقت اس پر انتقام اس طرح حاوی ہوا تھا کہ اسے لگا تھا سکندر کی محبت اس کے گال پر پڑنے والے اس کے تھپڑ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے وہ ذلیل ہوا تھا وہ رسوا ہوا تھا وہ بے عزت ہوا تھا وہ اپنے گھر سے رینگے مارا کر نکال دیا گیا تھا اس کے دل کو تسکین پہنچی تھی۔ اسے ٹھکرانے کی کم سے کم سزا بھی سکندر شیردار کو بھی لینی چاہیے تھی۔ جب وہ ذلیل و بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکال دیا گیا تھا تب اس نے بھی فوراً ہی اس گھر سے رخصت ہونے کی تیاری کی تھی۔

جب تک سکندر سے نہ ملی تھی۔ زین کا ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ مگر اب زین جیسے عام سے لڑکے کا ساتھ قبول کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے سکندر شیردار چاہیے تھا یا پھر اس جیسا کوئی دوسرا۔ مکن کی انگوٹھی زین کو ٹوٹا تے ہوئے اس احمق اور بے روق لڑکے کے ساتھ تھوڑا سا محبت کا ذرا لہا کرنا ضروری تھا۔

تو صرف اپنے باپ سے کرتی تھی۔ مگر اب وہ لندن ان کے پاس بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ برسوں سے آؤ گے زندگی اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ باپ کے ساتھ رہنا اور خود کو پابندیوں میں جکڑ لینا اس کے لیے دشوار تھا۔

اس نے باپ پر اپنا جوہت مشرقی ہونے کا تاثر قائم کر رکھا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان سے دور رہے۔

وہ چاہتی تھی۔ اس کے باپ ہمیشہ بھی سمجھتے رہیں کہ ان کی بیٹی مشرقی روایات کی پاس دار اور بہت نیک اور پارساسے۔ وہ اپنی باتیں ماں پر نہیں بلکہ اپنے مسلمان اور پاکستانی باپ پر کرتی ہے۔ اگلی واپس آکر اس نے روپوں تعلیم مکمل کی اور پچھو چوں ملازمت بھی کر لی تھی۔

جب تک محمود خالد لندن میں رہے تھے وہ ان سے ملنے سال میں دو بار لندن جاتی تھی جب وہ پاکستان شہنشاہ ہو گئے تب وہ ان سے ملنے وہاں گئی۔ وہاں اسے ہاشم ملا تھا اور ہاشم ہاشم ہاشم ملاقات ہی میں اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔

اس کے دل ہار بیٹھنے میں نیا کچھ بھی نہ تھا۔ کب مردوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا کب اس کی ایک نگاہ التفات کے لیے زہین سے زہین مردوں نے احقانہ حرکتیں نہ کی تھیں جو وہ ہاشم کے خور پر نفاذ ہو جانے پر چونک جاتی۔ ساری زندگی اسے چاہا ہی گیا تھا اسے سزا ہی گیا تھا۔ سوائے اس ایک شخص سکندر شہیار کے باہر اسے ہاشم کے بارے میں کبھی اسے ایک نگاہ دیکھ کر اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیا کرتا تھا۔

ہاشم سے مل کر اسے سکندر بہت یاد آیا۔ وہ اتنے برسوں بعد بھی ابھی اسے بھول نہیں پاتی تھی۔ اور نہ اس کے ٹھکانے کی اذیت کبھی کم ہو پائی تھی۔ اس نے زندگی میں دو مردوں سے محبت کی تھی 'المان' اور شدید محبت 'جان' سے بڑھ کر محبت۔ ایک اس کے باپ اور دو سراسر سکندر شہیار اور یہ اس کی بونصیبی تھی کہ وہ دونوں ہی اس سے چھن گئے تھے۔ اس کے باپ اس سے خود سنل کی عمر میں چھن گئے تھے پھر وہ ساری عمر

اس نے آلمو بہاتے ہوئے دوڑا مانتے بھرپور انداز میں کیا تھا کہ زمین کو یہ لٹیں آجائے کہ وہ مجبوراً دل گرفتہ ہو کر اسے چھوڑنے جا رہی ہے۔

وہ اس کے گھر سے باہر نکل کر اپنی جذباتی اراکاری اور زمین کی محبت اور دکھ بھری باتوں پر مبنی تھی۔ وہ احمق تو واقعی اس سے جدا ہوتے وقت رو دینے کو تھا۔ وہ بخوبی اس سے پیچھا چھڑا آئی تھی۔

وہ لاس اینجلس واپس جاتی تو زمین نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اس لیے وہ لاس اینجلس سے اپنا سارا سامان سمیٹ کر اپنے باپ کے پاس لندن آگئی۔ محمود خالد تو اس کی منگنی میں شریک ہوئے تھے زمین کے ساتھ اس کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہوا تھا مگر لڑا اور عاقبت بھی اس کی منگنی سے واقف تھیں۔

وہ وہاں زمین کے بھائی کا ذکر لاتی تھی۔ وہ کس طرح کا بدمعاش اور لڑکا تھا اور کس طرح اس نے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی اور زمین نے بجائے اپنے بھائی کو قصور وار ٹھہرانے کے اسے ہی الزام دیا تھا۔ زمین اور اس کی فیملی اس قابل نہ تھی کہ وہ دل رشتہ قائم رکھ پاتی۔ وہ اسی وقت زمین کے منہ پر منگنی کی انگوٹھی پینٹ آئی تھی۔ وہ اس لیے لاس اینجلس اسی وقت چھوڑ آئی تھی وہ اسی لیے اب وہاں اپنی پرچائی جاری نہیں رکھنا چاہتی تھی کہ وہاں ٹیمپس میں اس کا زمین سے آسنا سامنا ہوا کرے گا اور وہ اس جیسے بچ لڑکے کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔

وہ جانتی تھی اس کے باپ لیزا اور عاقبت سب کو اس کی باتوں کا ٹھہراؤ آچکا ہے اور وہ گئے زمین کے گھر والے تو سکندر کی اس کھینچا حرکت کے بعد ان میں سے کسی کی بھی کبھی ہمت نہیں ہوگی کہ اس کے باپ کو نوٹ کر کے یہ پوچھ سکیں کہ ام میرا زمین سے منگنی کیوں توڑ آئی ہے۔

اس نے واپس اٹلی جانے اور اپنی اوصوری تعلیم دیں مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماں کو چھوڑے تو اسے عرصہ ہو گیا تھا۔ اسے نہ اپنی اس سے محبت تھی نہ ہمدردی نہ انیت۔ اسے ان سے نفرت تھی بس وہ محبت

ان کے پیچھے ہی بھاگتی رہی تھی اور سکندر شہر بارے
ٹھکرا کر اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ سکندر شہر بارے تو
اسے مہر بھراب بھی ملنا نہیں تھا مگر اسے اب اپنے پیلا
واپس چاہیے تھا۔

اپنے پیلا کا دل خوش کرنے کے لیے اسے کسی
پاکستانی مروجے شادی کرنی تھی اور بلا کے قریب رہنے
کے لیے پاکستان ہی میں شادی کرنی تھی تو ہاشم اسد ہی
کیوں نہیں؟ وہ بہت امیر تھا۔ دولت جائیداد کسی چیز
کی کمی نہ تھی۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں تو اس کے
بینک اکاؤنٹ اور پراپرٹی تھی۔ اس کا گیارہ شان دار
تھا اور پرنسٹن بہت باوقار۔ وہ ایک خوب صورت اور
وجہ مروج تھا۔

دو زمین کی طرح کا احساس کمتری کا مارا شخص بھی نہ
تھا۔ وہ براہ اعتماد تھا، وہ بے حد جیڈ سم تھا، وہ بہت ذہین تھا،
دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بہت شاطر نیزہ اور چالاک
تھا مگر اس کی محبت میں دُوب کر وہ اپنی ساری چالاک اور
تیزی بھول کر اس کا غلام سا بن جاتا تھا۔

اس کا واحد ٹیکہ لوائنٹ اس کا شادی شدہ ہونا تھا تو
اس نے شادی سے پہلے یہ شرط رکھ دی تھی کہ ہاشم اپنی
بیوی کو طلاق دے دے۔ ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو
طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اپنے بچوں کی خاطر
اس نے اسے کہیں اور دوسرا گھر لے کر دے دیا تھا۔ وہ
اپنے بچوں کا خرچہ بھجھا کرتا تھا۔ اس عورت اور اس
کے بچوں کو عیش و آرام والی زندگی گزارنے کے لیے ہر
بوسے میں تیار رہے تھے۔ کئی قہاریہ اس عورت اور اس
کے بچوں کے لیے۔

محمود خالد کی کاروباری حوالے سے ہاشم سے دوستی
اور واقفیت پہلے سے تھی مگر ظاہر ہے کہ وہ اس کی گھریلو
زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔

اس نے ہاشم کے ساتھ اپنا الیون محمود خالد اور
عائشہ سے اس وقت تک چھپائے رکھا تھا جب تک
ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نہ نکال
دیا۔ ہاشم کے اس کی بیوی کو طلاق دے دینے کے بعد
بھی انہوں نے ایک ہیڑھہ بابت انتظار کیا تھا۔ ہاشم تو اس

کی ہریات ماننا تھا تو وہ اس انتظار کے لیے راضی ہو گیا
تھا۔ ہاشم اس کے کہنے پر محمود خالد سے یہ بصورت
بولنے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی بہت
لڑاکا اور بد زبان عورت تھی۔ ان دنوں کے درمیان
کوئی ذہنی ہاشم اس کی نہ تھی۔ وہ پھر بھی یہ رشتہ بھجھا رہا
تھا۔ مگر اس کی بیوی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔
طلاق اس نے خود مانگی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے
مطلبے پر اسے طلاق دینے پر مجبور ہوا ہے۔

اکیلے میں مریم نے عائشہ کو تنگ کر دیا تھا کہ ہاشم
کی بیوی کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ہاشم ہی کے کسی
دوست کے ساتھ الیون چلا رہی تھی۔ اسے یقین تھا
عائشہ یہ بات محمود خالد تک ضرور پہنچائیں گی۔ اس
کے پیلا کے اوپر کبھی اس کا کوئی برا امپریشن نہیں پڑتا
چاہیے۔ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کی بھجھتا چلا ہے تھا کہ ان
کی مرحوم واقعی مریم ہے اور ہاشم کے اپنی بیوی کو طلاق
دینے کی وجہ اس کی بد کرداری اور بد فطرت ہے۔ ہاشم
نے محمود خالد سے اس کا رشتہ مانگا تو اس کی رضامندی پا
کر انہوں نے اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔
جب انہوں نے اس سے ہاشم کے رشتے کے متعلق
پوچھا تب وہ بہت بے چارے سے ان سے بولی تھی۔

”بابا! میں شادی کرنا چاہتی ہوں“ اس لیے کہ میں
آپ کے قریب رہنا چاہتی ہوں۔ ہاشم سے شادی کر
لوں گی تو آپ کے پاس کراچی ہی میں رہوں گی۔ ساری
زندگی آپ سے دور رہی ہوں بابا! اب آپ کے نزدیک
رہنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ صرف لڑکا فتنہ تھا کہ وہ آپ
کے ساتھ رہے اور مجھ سے چودہ سال کی عمر میں آپ
چھین جائیں؟“



یہ ورنگ ڈے تو تھا نہیں سو وہ افس سے اپنے کام
نہا کر جلدی اٹھ گیا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے قبل ایک
ضروری کام کرنا تھا جو کل کر نہیں پایا تھا۔ اسے لڑکا
کے لیے انگوٹھی خریدنی تھی۔ اب جب بھی اس سے
مانتا تھا اس نے سب سے پہلے اس کی انگلی میں اپنے نام

میں پکا سا طرز کیا تھا۔ ”انہوں نے مجھے پریشان کر کے ہاتھ سے شادی پر مجبور کیا تھا اور تم تو خود ہی اپنی خوشی اور مرضی سے انہیں لن کی مرضی کا کلمہ کر کے دے رہی ہو۔ ایسی Satisfaction بھی پایا کے چرے پر کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ ساری زندگی انہوں نے اور میں نے اپنی مرضی کی زندگی گزار لی ہمیں نظر انداز کیے رکھا اور جب ہماری زندگیوں کے اس سب سے بڑے فیصلے کا وقت آیا تو میں نے اور تم نے پایا کو وہی کر کے کہا جو وہ ہم سے چاہتے تھے۔“

اس کے لمحے میں ایک چھپی ہوئی ناراضی اور پرہی تھی اور اس کے لمحے کی یہ پرہی لیزا نے محسوس کر لی تھی۔

”سیم پلین اس طرح تو مت بولو۔ مجھے پتا ہے تم میرے شادی کے فیصلے سے خوش نہیں ہو مگر۔“

اسے سنا دے اسے سمجھ میں نہیں رہی تھی اس نے لیزا کی بات کا رد کیا۔

”میں تمہارے شادی کرنے پر نہیں جس سے تم شادی کرنے جا رہی ہو اس پر فکر مند ہوں۔ تمہاری شادی کی بجھ سے زیادہ اور کس کو خوشی ہو سکتی ہے لڑا مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ جو میرے ساتھ ہوا جو میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں ہونا چاہیے لڑ اپنی زندگی کی بربادی میں سہکتی مگر تمہیں۔ کوئی دیکھ پتھا تو میں۔ نہیں پاؤں گی۔“ اس کا لہجہ بے حد جذباتی اور محبت بھرا تھا۔

”تم میرے لیے بالکل بھی پریشان مت ہو سیم۔ سکندر بہت اچھا ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرنا ہے۔ تم اس سے ملو گی تو کوئی عین نے تم سے اس کی کم تعریفیں کی تھیں۔“ لیزا نے عین دلاسنے کی کوشش کی۔

”لنڈن کرے ایسا ہی ہو لڑ۔ لنڈن کرے وہ تم سے بہت محبت کرے اور تم ہمیشہ خوش رہو۔“ لیزا نے یہ دعا تہ جملے بولتے اور اسے اپنا بہت خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اس نے فون بند کیا۔

ابھی اس نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کے موبائل

کی انگوٹھی پر پتلی تھی۔ وہ ڈھائی گھنٹے لگا کر اور کئی دکانوں میں دیکھنے کے بعد وہ ایک خوب صورت انگوٹھی لیزا کے لیے پسند کر لیا تھا۔ اسے وہ انگوٹھی خریدتے ہوئے بے تحاشا خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسا احساس جو اب تک کی زندگی میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔

اس کا موز ہنوز خراب تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور چرے پر گہری سوچ۔ چائے پیتے ہوئے اس نے لیزا کا نمبر ملا یا۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر پرسکون سے انداز میں بیٹھی تھی۔ اپنے شاندار کمرے میں جملہ چیزیں پرانے تھے۔ کیمچی ترین تھی اور اس کے ذوق اور مرضی کے مطابق تھی وہاں اس کی لاکھ روپے کے ڈیزائنڈ بیڈ پر ٹیبلٹس وہ کوئی ملکہ ہی لگ رہی تھی جو شاندار انداز میں اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہی ہو۔ لیزا نے اس کا نام دیکھتے ہی پہلی بیل پر کلر۔ سیو کر لی تھی۔

”کیسی ہو لڑ؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”تھک ہوں۔ ابھی ایگزیمینشن ہی میں ہوں۔ آج تو کل سے بھی زیادہ لوگ آئے ہیں۔“ اس نے لیزا کی خوشی سے کھلکھلاتی آواز سنی۔

”داؤنٹینس گریٹ ایما آ رہا ہے؟“

”ہاں مزا بھی آ رہا ہے اور تھوڑا تھک بھی گئی ہوں۔“

”پلو م تب تم لنڈن جا کر اکٹھا آرام کرنا یہ بتاؤ پلایا سے تمہاری بات ہوئی؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی میں نے لیا کو فون نہیں کیا۔ کیوں؟“

اس نے لیزا کا جرنی بھر انداز محسوس کیا۔

”آج میں نے بتا دی ہے پلایا کو تمہاری شادی کی بات۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”پھر؟ کیا بولے؟“

”خوش ہوئے بہت۔ آخر کو پلایا جو چاہتے تھے انہوں نے ہم دونوں سے وی کروالیا۔“ اس کے لہجے

شام و محل رہی تھی جب وہ لڑاکے لیے انکو غمی خرید لینے کے بعد اپنے فلیٹ واپس آیا۔ وہ راستے بھر مبی سوچتا ہوا آیا تھا کہ اسے آمنہ کو کال کرنی چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کے اس انتہائی اہم فیصلے سے اپنی ماں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ وہ کہہ نہیں پائی تھیں مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی اموجان اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا اور خوشگوار دیکھنا چاہتی ہیں وہ جانتا تھا وہ دل سے چاہتی ہیں کہ اب وہ شادی کرے۔ اسے ماں سے بات کرنے سے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ اس کے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں گی۔ وہ گھر کے لینڈ لائن نمبر پر کال نہیں کرتا تھا۔ وہ آمنہ کے موبائل پر انہیں کال کرتا تھا۔

”سکندر! کیسے ہوینا؟“ وہ ہمیشہ کی طرح فلان پر اس کی آواز سنتے ہی خوشی سے سرشار ہوتی تھیں۔
”میں ٹھیک ہوں اموجان۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے بیٹا! جتا ہے آج میں تمہیں بست یا کر رہی تھی۔“

اور وہ جانتا تھا کہ ماں صرف آج نہیں بلکہ ہر مل اور ہر گھڑی اس کو یاد کرتی ہیں۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ایک مل ان کے درمیان خاموشی رہی تھی۔
”اموجان! میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں شادی کر رہا ہوں۔“ اس کی سنجیدگی سے جانی اس بات کے جواب میں آمنہ کی خوشی بڑی والہانہ اور بے ساختہ تھی۔

”واقعی؟“ ہم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟“ انہیں جیسے مارے خوشی کے یلین نہیں آ رہا تھا۔

”جی اموجان۔“ وہ ان کی خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔
”میں بہت خوش ہوں سکندر! تم میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مجھے جانتا تھا میں! کیسی ہے میری ہونے والی بہو؟“

اسے ماں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مارے خوشی کے در پڑی ہیں۔ شاید انہیں لگتا تھا وہ ساری زندگی یونہی تھا گزار دے گا۔

پر ہاشم کی کال آئی۔ اس کے چہرے پر بے زاری آئی تھی۔ وہ یہ چند دن ہاشم کے بغیر گراچی میں سکون سے گزارنا چاہتی تھی کچھ کل ویسے ہی اس کا موڈ خراب چل رہا تھا۔ ایسے میں ہاشم کے چاؤ جو بچے اسے ذہر لگ رہے تھے۔ ”ہیلو۔“

”کیا حال ہے میری جان کا؟“ ہاشم کا لہجہ سربراہیت تھا! جان بچاؤ کرتا ہے پر فدا ہوتا۔
”ٹھیک نہیں ہوں۔“ وہ بے زاری اور غصے سے بولی۔

”کیا ہوا؟“ میری حسین بیوی کا موڈ کس نے خراب کر دیا؟“
”یہ تمہارے گھر کے نوکر۔“ مجال ہے کوئی کام ڈھنگ سے کریں۔“

وہ غوت سے ناک چڑھا کر بولی۔ وہ اس گھر کی ملکہ تھی اور ہاشم اس کا بھادر اور غلام۔ وہ اس کی غلامی کرتا۔ اس پر مل و جان سے نثار ہوتا تو اس کی انا کو بڑی تسکین پہنچتی تھی۔ اس کا مشورہ انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ جو تھکنیں اور چاٹیں ہاشم اسے دے رہا ہے وہ اس کا حق ہے۔

یہ ام مریح کا حق تھا کہ اسے چاہا جائے اسے ساری زندگی چاہا جانا رہے۔ ہاشم کی توازن سننے ہی اسے احساس ہوا کہ اس وقت اسے اپنی انا کی یہ تسکین ہی ور کار تھی۔ اس کا شوہر اس کا غلام ہے اس پر جان بچاؤ کرنا ہے۔ وہ اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے اسے یہ یقین وہاں پھرد کر تھی۔

ہاشم اب اسے منانے لور اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اس کی خاطر کیا کیا کچھ کرے گا وہ جانتی تھی۔ وہ بظاہر منہ مٹائے ہاشم کے محبت میں ڈوبے جلتے سن رہی تھی سوہ اس کے کسی وعدے کسی عہد کسی بات سے خوش نہیں ہو رہی تھی اور وہ اسے خوش کرنے کے لیے پتا نہیں مزید کہا کیا وعدے کر رہا تھا اور اندر اس کی زحمتی انا کو ہاشم کی غلامی اور تابعداری سے بہت تسکین مل رہی تھی۔



اور اپنی ہو سے وہاں آکر مل لوں گی۔ میں حم دونوں کو گلے لگا کر ریا کرنا چاہتی ہوں دُعا میں دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں تمہاری ہونے والی دلس کے ساتھ جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں۔

”امو جان! وہاں کے آنسوؤں سے ایسا بے بس سا ہو رہا تھا کہ صاف انکار کرنے کی جرأت خود میں نہیں پا رہا تھا۔

”کیا تمہیں بھی مجھ پر رحم نہیں آیا بیٹا؟ میں نے بار بار سالوں سے تمہیں اپنے سینے سے نہیں لگایا۔ میں تمہیں جی بھر کر دیکھنے اور پیار کرنے کو ترس رہی ہوں میری جان ایک بار تو آکر اس سے مل لو بیٹا۔ کیا میرے مرنے پر ہی آؤ گے میری زندگی میں نہیں؟“ وہ بلک بلک کر یوں رو پڑی تھیں جیسے تمام حوصلے اور ہمت بار چینی ہوں۔

”خدا! غواستہ! امو جان! پلیر ایسی باتیں مت کریں۔ ٹھیک ہے جیسی آپ کی خوشی میں دینا چاہی کر دیں گا۔ میں پاکستان آ رہا ہوں آپ کی ہوس کو آپ سے ملوانے۔“

اس کا دل ماں کی آہوں اور آنسوؤں سے ابسا ہے چین ہوا کہ وہ ان سے آنے کا وعدہ کیے بغیر وہ نہیں سکا تھا۔

”واقعہ؟ تم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟ مجھے ہلنا تو نہیں رہے؟“ وہ خوشی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں بولیں۔

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں امو جان۔“ مسکرا کر انہیں یقین دلاتے دلاتے وہ ایک دم ہی رکنا تھا۔ وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہوا تھا بے حد سنجیدہ۔

”مگر میری آپ سے ایک ریکورسٹ ہے امو جان! میں آپ سے ملنے کراچی آؤں گا تو آپ مجھے گھر آنے کے لیے مجبور نہیں کریں گی۔ آپ کو انکار کرتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہوئی امو جان! مگر میں وہاں نہیں آسکتا۔“

وہ ماں کے جذبات کے آگے ہار مان گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”امو جان! اس کا نام لیرا ہے۔ مجھے دماغ میں ملی تھی۔ اس کے بابا پاکستانی اور ممی انگلیں ہیں۔ وہ ایک مشہور آرٹسٹ ہے۔ پینٹنگز بناتی ہے۔ لندن کے ایک کالج میں آرٹ پڑھاتی بھی ہے۔“

وہ انہیں لیرا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ لیرا کا نام لیتے ہوئے اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے اندر خوشی اور اسٹنگ پیدا ہوتی محسوس کر رہا تھا۔

”دیکھنے میں کیسی ہے؟ میرے بہت پیٹنڈ سم بیٹے کے ساتھ بچے کی ناں؟“ وہ جیسے بدلتے بدلتے ہنسی چھین۔ ہنسنے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ بھی جواب دینا۔

”وہ بہت خوب صورت ہے امو جان! میں آپ کے موبائل پر اس کی تصویر Send کر دیں گا“ آپ دیکھ لیجئے گا۔“

”بس تصویر send کر دے؟ مجھے اس سے ملناؤ گے نہیں؟“

انہوں نے رنج اور کرب میں گھر کر سوال کیا تھا۔ اس سوال میں ان کے آنسو اور مسکریاں شامل تھیں۔ ”امو جان! نہ کیا کہے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”سکندر! میں اپنی ہونے والی ہوس کو دیکھنا چاہتی ہوں میں تمہاری دلسن کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے ایک بار تو آکر مل جاؤ بیٹا۔ میری ہوس کو تو مجھ سے ملنا۔ میں تمہیں اس کے ساتھ خوش اور مسکرا کر دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیپوڑیا موبائل پر نہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بے حد نزدیک۔“ وہ بدلتے ہوئے جیسے اس سے التجا کر رہی تھیں۔

”امو جان! آپ پلیر، اس طرح مت روئیں۔ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ وہ ماں کے دل کو کیسے تسلی دے۔ ایسا کیا کرے کہ ماں مسکرا دے، خوش ہو جائے۔

”نہم گھر پر نہیں آنا چاہتے ناں ممت آؤ۔ مگر تم کراچی تو آؤ۔ تم لڑکی آکر جہاں کو مجھے؟ میں خود تم سے

”کیا کر رہے ہو؟“ اس نے لیزا کی کھٹکتی ہوئی آواز سنی۔

”کھانا بنا رہا ہوں اپنے لیے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”کھانا بنا رہے ہو؟“

”فی الحال گڑھ سری مشاپ سے خرید کر لایا ہوں گا۔“ پکٹ کھول رہا ہوں۔ ہریڈیڈل کے ساتھ انہیں کھانا ملے گا۔ ویسے میں کھنگنی کر لیتا ہوں۔“ وہ پکٹ کھولتے ہوئے بولا۔

”جلو یہ اچھا ہے تم کھنگنی کر لیتے ہو بعد میں ہمیں سہولت رہنے کی۔“ وہ اپنے اسی ہنستے مسکراتے موزوں تھی۔

”ہاں ہادی آسانی رہے گی۔ تم ہنسنے لگو ہادی رہا کرنا اور میں آفس سے آکر تمہارے اور اپنے لیے ڈرنیٹر کر لیا کروں گا۔“

لیزا کے لمحے کا ساتھ دیتے ہوئے اس نے گواہ سے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا! زیادہ دل مت جلاؤ اپنا۔ میں بہت اچھی مشق کر رہی ہوں گی تمہاری۔“ نئی بڑا اچھا نقشہ کھینچتی ہیں پاکستانی بیویوں کا۔ میں تمہاری فرماں بردار ٹائپ پاکستانی بیوی ہوں گی۔ خوب خدمت کروں گی تمہاری۔“

وہ ساری الجھن بھلا کر نقشہ لگا کر فیس پراگتا۔ لیزا کا انداز تھا ہی لڑکاؤ پسند سا۔

”تم یقیناً بہت اچھی بیوی ثابت ہو گی مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں۔“ دعا کو میں تمہارے لیے دیا ثابت ہو سکوں جیسا تم نے مجھے سمجھا ہے۔ کاش میں نہیں سمجھی یا اس نہ کروں۔“

ہنستے ہنستے وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہوا۔ اس کے لمحے میں اداسی تھی جیسے اس کے دل میں یہ خدشہ ہو کہ وہ بحیثیت شوہر لیزا کی امیدوں پر پورا نہیں اتر پائے گا۔ ”خدا کے لیے سکندر رباب پھر وہی فضول ہائیں مت شروع کرو کہ میں اپنے اس جذباتی فیصلے پر پچھتاؤں گی اور یہ کہ مجھے تم سے شادی کے فیصلے پر ایک بار پھر غور و فکر کر لینا چاہیے۔“

”مجھے بتا ہے بیٹا! میں یہ بات جانتی ہوں۔ میں جس ایسی مکی بات کے لیے کبھی مجبور نہیں کروں گی۔ جس سے ہمیں تکلیف پہنچے۔“

وہ جانتا تھا ماں اس بل اس سے ملنے کے لیے خوش ہونے ہوتے کچھ یاد آجانیے پر پھر اس ہو گئی تھیں۔ جیسے چند لمحوں کے لیے بھولی یہ بات کہ خوشیاں ان کے اور ان کے اسی بہادر بیٹے کے لیے نہیں ہیں انہیں ایک دم ہی پھر یاد آ گئی تھی۔ ماں سے بہت جلد ملنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کیا۔ وہ بہت دیر تک ایک ہی جگہ ایک ہی ذرا سے سے بیٹھا ماں کو سوچ رہا تھا۔ ان کے آسواپنے دل پر کرتے محسوس کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو پاسکا تب اسے یہ یاد آیا کہ اس نے ماں سے پاکستان لان کے پاس آنے کا وعدہ کیا ہے اور اس وعدے کے ساتھ ہی اسے لیزا کا خیال آیا۔ وہ اس سے پوچھتا ہوا موجدان سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔ لکھنؤ اس سے لیزا کو لندن جانا ہے۔ اس کی چٹھیاں ختم ہو رہی ہیں اسے اپنا کالج دوبارہ جوائن کرنا ہے۔ پائیس پاکستان جانا اس کے لیے ممکن ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ لیزا کے اپنے پیار کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے ان کے بلانے پر بھی پاکستان نہیں گئی۔ سب تو کیا اب اس کے کتنے پروردہ ہیں جانے کے لیے راضی ہو جائے گی؟ اگر لیزا نے اس کے ساتھ پاکستان چلنے سے انکار کر دیا پھر؟

وہ عجیب سی الجھن اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسی لیے بجائے فوراً ہی اسے فون کرنے کے وہ کچن میں آ گیا۔ وہ قہر طور پر اس پریشانی سے خود کو بچانے کے لیے وہ اپنے لیے کھانا بنانے لگا تھا۔

اسے ماں سے وعدہ کرنے سے پہلے لیزا سے تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب اگر اس نے انکار کر دیا تو وہ اموجان کو کیا جواب دے گا؟ وہ بے دلی سے فرزاد میں سے فرزاد چکن کبابوں کا پکٹ نکال رہا تھا۔ اسی وقت اس کے مہیا بل پر لیزا کی فال آئی تھی۔ اس نے میز پر سے فوراً ”سوباگل اٹھایا۔“

لیزائے جیسے بری طرح چڑکھتا تھا اس کی منت کی۔ وہ جواباً خاموش رہا۔ وہ چمکت کھول کر یونی میز کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ کچھ بھر کی خاموشی کے بعد لیزا اس سے پوچھنے لگی۔

”تم نے کیا سوچا؟ ہم شادی کب اور کہاں کر رہے ہیں؟“

لیزا اب میری امواجان سے۔ ”وہ ایک پل کے لیے اچکا کر جب ہوا۔“

لیزا کی محبت کا یقین ہونے کے باوجود وہ اپنے اندر گھری ماہوسیوں کے سبب فوراً بڑی نہیں پایا تھا۔ نجانے کیسا یہ احساس اس کے اندر سرایت کر چکا تھا کہ وہ ان چلا اور Un wanted ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس لائق ہی نہیں ہے۔

”وہ بہت بیمار رہتی ہیں۔ وہ کیمرہ شٹ رہ چکی ہیں۔ گو ان کی بیماری کا ابتدائی تشخیص ہی علاج کیا جا چکا ہے مگر وہ ابھی بھی میڈیسنز پر رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے۔ میں نہیں ان سے ملوانے پاکستان لے کر آؤں۔ وہ اتنی بیمار رہتی ہیں لیزا! میں انہیں انکار نہیں کر پایا۔“

”مسکندرا! نہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تم کس انداز میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟“ اس نے لیزا کی ناراضی بھری آواز سنی۔

”تمہاری اپنے پاپا کی ساتھ باراضی ہے ناں لیزا! تم ان کی وجہ سے پاکستان میں جانا چاہتیں میں اس وجہ سے۔“

اس کمرضاحتی جملہ لیزائے فوراً ”قدرے خفگی سے کٹ دیا۔“ ”حد کرتے ہو تم مسکندرا! تمہاری امواجان اتنی بیمار ہیں، تمہیں ان سے ملنے ضرور جانا چاہیے۔ میری پاپا سے ناراضی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ میں تمہاری امواجان کے بلانے پر پاکستان نہ جاسکوں۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں مسکندرا!“

وہ لڑکی سر پاپا اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس کی محبت کے احساس میں گہرا خوشی سے سرشار بنا

کھڑا تھا۔

”تمہیں کس لیزا! تم نے میری پریشانی دور کر دی۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر امواجان سے یہ وعدہ کر بیٹھا تھا کہ ان کی ہونے والی ہوا کو ان سے ملوانے پاکستان لاؤں گا۔ فون رکھنے کے بعد مجھے تمہارا خیال آیا کہ چاہیں تمہیں پاکستان جانا چاہو گی بھی یا نہیں۔“

”نہج برداشت کر لے جس میں نے تمہارے یہ فارمل جملے آئندہ نہیں کروں گی۔ میں تمہاری کوئی کولیگ ہوں جسے تم اس قدر پر تکلف نہیں کھینکس بولو گے؟ تم مجھے آج فون کر کے مجھے لیزا! کسی بھی طرح کل کی فلائیٹ سے دیا آج کل میں ہوں، ہم نے کراچی جانا ہے۔ میں تم سے بغیر کچھ پوچھتے چل پڑی۔ تمہارے سپر ویس نے اپنی پوری زندگی گزری ہے مسکندرا!“

وہ کچھ خفگی کر رہی تھی اپنا بیت سے ہوئی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی ہے وہ جانتا تھا۔ وہ اس سے دلہانہ محبت کرتی ہے اس کے دل کو معلوم تھا۔

”دعا کرو لیزا! میں تمہاری اس محبت کی قدر کر پاؤں۔ چاہیں کیوں ایک ڈر سا ہے میرے اندر۔ کچھ برا ہو جائے گا۔ جب تک تمہیں سمجھنا پڑا تھا اس رشتے کے لیے منع کر رہا تھا تب تک خود کو بھی سمجھا لیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ مگر اب تمہارے لیے میرا دل مندی بچے کا سا ہو رہا ہے۔ اب مجھے میری زندگی میں لیزا محمود چاہیے۔ چاہے میں شادی کے بعد اسے مایوس کروں گا تھا کروں گا یا وہ مجھ سے شادی کر کے چھوٹ جائے گی مگر اب وہ مجھے میری زندگی میں ہر حال میں چاہیے۔“

وہ خود کو کہنے دل اپنی سوچوں اپنے اندیشوں کو اس پر اس طرح عیاں کر رہا تھا جیسے خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

”تم مجھے نہ تھا کہ وہ گے نہ مایوس۔ تم مجھے بہت پیار کرو گے، میں جانتی ہوں۔ اچھا یہ جانا، تمہارا ذریعہ ہو گیا؟“

لیزا کے پوچھنے پر اسے کہا ہوں کہ جی ہاں آیا۔

”نہیں! ابھی نہیں ہوا۔“ وہ ہانسیں دھونے لگا۔

”بس پھر اب تم جلدی سے کھانا تیار کرو مسکون سے کھانا کھاؤ۔ مزے داری کافی پیو اور ریلیکس کرو۔ ہم کل صبح بات کر کے پاکستان جانے کا پروگرام فائنل کر لیں گے۔“

”کل صبح نہیں، آج رات۔ تم مجھ سے رات میں سوئے سے پہلے بات کرنا چاہتے ہو۔“

”نہیک ہے، ٹھیک ایک شرط پر۔“

”تم مجھے Bella (بلا) کہو۔ تم یہ کہتے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“

”لیز لگتی مسکراتی آواز سن کر وہ بھی مسکرا دیا تھا۔“

”Bella! اس نام سے بہت پار کرتا ہوں۔“

”دل خوش کر دیا آپ نے سینئر سکندر! میں نے جو

مانگا آپ نے مجھ اس سے بھی بہتر کر خوب صورت

بات بول دی۔“

وہ اپنے ہونٹوں پر دم میں تھی اور اپنے پایا کو فون ملنا

روٹی تھی۔ سکندر سے بات کرنے کے بعد اب جب

کہ یہ طے ہو چکا تھا کہ وہ دونوں پاکستان جا رہے ہیں تو

اسے سب کچھ اپنے پایا کو بھی بتانا تھا۔ اس نے دلہن

لندن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ کل اس کی

انگریزیشن کا آخری دن تھا اور اس نے کل رات ہی

واپس روم چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہاں سے وہ لاہور پھر کرانی جانے کی تمام تیاری ہو

جانے کے بعد اس کو پہلی فلائٹ سے سکندر کے

پاس دہا چلے جانا تھا۔ لندن تو ویسے بھی اس کو اب

سب کچھ رائیڈ اپ کرنے ہی جانا تھا۔ ظاہر ہے اپنی

جانب اس کو صحیح طریقے سے نوٹس پیرڈ پورا کرنے

کے بعد چھوٹی تھی اور لندن میں اپنے فلیٹ اور دیگر

تمام معاملات کو نمٹانا تھا۔ اپنے دوستوں اور کوئیکز سے

اچھی طرح مل کر انہیں الوداع کہنا تھا اور اس سب

میں اسے کچھ وقت تو لگنا تھا۔

ابھی وہ سکندر کے ساتھ پاکستان ہو آئے پھر لندن

چلی جائے گی۔ فی الحال اس نے لندن اپنے کالج کے

دین کو فون کر کے اپنی چھٹیاں برہموا لی تھیں۔ ساتھ ہی

اس نے کن کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی تھی کہ وہ

شادی کر رہی ہے اور جب واپس کالج جوائن کرے گی تو

استیفے کے ساتھ اپنا ٹولس پیڑ پوڈا کرنے کے لیے

کرے گی۔

اس کے فائن میں مسلسل سکندر کی باتیں گونج رہی

تھیں اس کا کہ بھرا بھرا گونج رہا تھا۔ آخر کتنا ایوس کیا

تھا اسے لوگوں اور رشتوں نے جو وہ رشتوں سے اس

قدر ڈر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا تھا مگر وہ

اس طرح سے ڈرا ہوا تھا جیسے اسے خوف ہو کہ جس

طرح جاتی تمام لوگوں اور رشتوں نے اسے دکھ دیے تھے

وہ خود کار یا تھا ایسے ہی وہ بھی کرے گی۔

محمود خالد کی کال مل گئی تھی۔ اس نے سکندر سے

دھیان ہٹا کر اپنے پیارے دھیان مرکوز کیا۔ وہ اس کی کال

ریسیو کر چکے تھے۔

”میں ابھی تم ہی کو یاد کر رہا تھا بیٹا۔ سوچ رہا تھا

تمہیں فون کروں۔ آج مریم آئی تھی۔ بتایا اس نے

مجھے تمہارے شادی کے Decision (فیصلہ) کے

بارے میں۔“

ان کے لمحے میں اس بات کی ذرا سی بھی ناراضی یا

خفگی شامل نہیں تھی کہ اس نے اپنی زندگی کا اتنا اہم

فیصلہ ان کے مشورے کے بغیر کیے کر لیا۔ ان کے لمحے

میں ایک فکر شامل تھی مگر ناراضی ہرگز نہیں تھی۔

”میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے فون کیا۔ بیٹا!“

جو بھی تھا وہ اس کے باب تھے اسے دل میں

تھوڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ جو انہوں نے کیا۔

وہ ان کا فعل تھا۔ جو وہ کر رہی ہے وہ اس کا غلط ہے۔

”وہ کون ہے کلثوم؟ مجھے کچھ بتاؤ اس کے بارے

میں؟“

کیا وہ اس سے یہ سننا چاہتا ہے تھے کہ وہ پاکستان آئی

تھی۔ وہ بجائے اس کی بات محسوس کرنے کے 'برا' ماننے کے کٹ شوق اور خوشی سے پوچھنے لگے۔

"سکندر کا نام ہے اس کا؟"

"جی! وہ لڑکے کے لیے میں شامل محبت پہ مل بھر کے لیے شرمندہ ہو کر بالکل چپ ہو گئی تھی۔ انہوں نے سکندر کا نام بے حد محبت سے لیا تھا۔ جیسے جوان کی بیٹی کو اچھا لگا تھا انہیں وہ لہجہ ملے ہی اچھا لگ گیا تھا۔

"اب یہ ایک ہفتہ کیسے گزرے گا بیٹا! میں تو آج سے ہی دن کیا گھنٹے گھنٹے شروع کر دینا چاہتا تھا تم سے اور سکندر سے ملنے کے لیے۔"

لن کا لہجہ باپ کی شفقت اور محبت سے لبریز تھا۔ وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔ کیا وہ سکندر کے پاکستانی اور مسلمان ہونے پر خوش ہو رہے تھے یا اس لیے خوش تھے کہ وہ خوش تھی؟

"تم سے ایک بات کون کلثوم؟" وہ کچھ کہتے کہتے ہلکی کر چپ ہوئے۔

"جی ہاں؟"

"مجھے بتا ہے بیٹا! تم میں اور میری بہن میں بہت پیار ہے۔ تم کراچی آ کر غالباً اس کے پاس رکنا چاہو گی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہی مگر میرا مشورہ ہے تم یہاں آ کر میرے پاس رکو۔ باپ کا گھر ہوتے ہوئے تم بہن بہنوں کے پاس ٹھہرو گی تو تمہارے ہونے والے سرکاری کاموں میں گے؟"

لن کا لہجہ التجائیہ سا تھا۔ جیسے وہ شدت سے چاہتے تھے کہ وہ سیم کے پاس نہیں! لن کے پاس ٹھہرے مگر اس کی ضد سے ڈر کر نرمی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔

وہ باپ کے التجائیہ لہجے پر شرمسار سی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے یہ سوچا نہیں تھا کہ وہ کراچی جا کر کہاں ٹھہرے گی یا شاید اندر ہی اندر یہ طے تھا کہ اسے سیم کے پاس ٹھہرنے سے اس لیے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اگر اس کے پیارے یہ خواہش ہے کہ وہ لن کے پاس ٹھہرے تو ٹھیک ہے۔ سکندر بھی تو اپنے گھر والوں سے ملاشی کے بارے میں اپنی

سے شادی کر رہی ہے یا نہیں یا حقیقت میں اس کی فکر اور محبت میں یہ سوال کہا تھا؟

"وہ لاڑ ہے بیٹا! وہاں رہتا ہے۔ ایک ملٹی نیشنل میں لیگل ایڈوائزر ہے۔" سکندر کے مسلمان اور پاکستانی ہونے کا بیانے بغیر اس نے انہیں بتایا۔

"عادت کا کیا ہے؟ میری حساس اور نازک بیٹی کا خیال نور کے گناہ؟" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس کے ساتھ پاکستان آ رہی ہوں بیٹا! آپ اس سے خود مل سکیں گے۔" وہ سنجیدگی سے اور بہت نرمی سے انداز میں بولی مگر جواب میں لن کی خوشی و امانت ہے ساختہ اور بہت عجیب تھی۔

"تم پاکستان آ رہی ہو کلثوم؟" وہ اسے کلثوم کہتے تھے۔ یہ ان کی ضد تھی۔ جو نام انہوں نے اس کا رکھا چاہے وہ اسے قبول نہیں کر لی مگر وہ اسے اس سے پکاریں گے۔ سیم کے ساتھ انہوں نے ہر معاملے میں زبردستی کی تھی۔ اس کے پسندیدہ نام سنانا کے بجائے ہر جگہ اس کا نام ام مریم لکھوایا تھا مگر اس پر وہ اپنی مرضی مسلط نہیں کر پائے تھے۔ تو زبانی اسے کلثوم پکار کر لبرانام سے نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔

سکندر کا قفل پاکستان سے تھا! کیا ہوا! وہ یہ شادی کر تو اپنی مرضی سے رہی ہے۔

اس نے سیم کی طرح جلا کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کی زندگی کے تمام فیصلے خود کرتے بھروسہ۔ وہ سختی سے سوچ رہی تھی۔

"جی میں پاکستان آ رہی ہوں بیٹا۔ سکندر کے ویزٹس کراچی میں رہتے ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اس لیے میں سکندر کے ساتھ شاید اگلے ہفتے تک کراچی آ جاؤں گی۔"

اس کے اندر خلی المہر تو اس نے فوراً ہی باپ کو یہ جواب دیا مگر وہ بد انہیں یہ بتانا چاہا کہ وہ سکندر کو ان سے ملوانے پاکستان نہیں لا رہی بلکہ سکندر کی فیملی سے ملنے اس کی خاطر پاکستان آ رہی ہے مگر محمود خالد نے جیسے اس سے کبھی بھی خفا نہ ہونے کی قسم کھا رہی تھی۔

سے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے خیالوں سے جو تک کر لوہرہ کو دیکھا۔ "کیا ہوا بیٹا؟"

"میں یہ پوچھ رہی تھی اسوجان کہ آپ کچھ کھوٹی کھوٹی لگ رہی ہیں اور کسی بات پر بہت خوش بھی ہیں۔" نوہرہ نے مسکرا کر ان سے پوچھا۔

"بات خوشی ہی کی پتا چلی ہے ناں۔ کل میری سکندر سے بات ہوئی تھی۔ وہ شادی کر رہا ہے۔"

وہ جیسے اس اتنی ہی خوشی کو شیشے کے بغیر وہ نہیں سکی تھیں۔ اسی وقت لاؤنج کے دو دروازے پر شہیار خان آئے تھے۔ وہ باہر لان میں علی کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اب کھیل ختم کر کے انہوں نے اندر کا رخ کیا تھا۔ نوہرہ اور آمنہ نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں کی ان کی طرف پشت تھی۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" نوہرہ نے آمنہ کی بات پر بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں بہت خوشی کی بات ہے۔ زندگی میں خوشیوں پر اب میرے سکندر سے زیادہ اور کسی کا حق نہیں۔"

میں نے سکندر سے کہا ہے وہ میری ہونے والی بہو کو لے کر کراچی مجھ سے ملوانے لائے۔ جسے میرے بیٹے نے زندگی کی ساتھی کے طور پر چنا ہے۔ میں اسے جی بھر کر دیکھوں گی۔ پیار کر دوں گی اور اس سے یہ بھی کہوں گی کہ میرے بیٹے نے زندگی میں بڑی تختیاں کٹی ہیں۔ بڑی آزمائشیں برداشت کی ہیں۔ اب تم اسے اتنا پیار دو کہ۔"

بولتے ہوئے آمنہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ بھرائے لمحے میں بول رہی تھیں۔ "انسان کی آنکھوں سے بنے لگے تھے۔ ابھی ان کا جملہ پورا ہو بھی نہیں پایا تھا کہ شہیار خان کے پیچھے بھاگتا دوڑنا علی بھی اندر داخل ہوا۔ الٹی کر کے کیپ لگائے ہاتھ میں چھوٹا سا بیٹ اور بال پکڑے۔"

"اما! میں نے داداجان کو ہرا دیا۔" علی بھاگتا ہوا ان لوگوں کے پاس آ رہا تھا۔ نوہرہ اور آمنہ نے فوراً ہی

مخزن تھکا کر زور زور سے کی طرف دیکھا۔ ان دونوں ہی

ہاں سے ملے جا رہے تو کیا وہ چند دنوں کے لیے باب کا دل خوش کرنے کو ان کے پاس نہیں رک سکتی۔ آگے کون سا ہے ان کے پاس کراچی میں رہنا ہے۔ چند دن گزر کر تو وہ اور سکندر واپس آجائیں گے۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"جی جی رہو جان بابا! دل خوش کر دیا تم نے اپنے آئے کا بنا کر۔" جس اب جلدی سے آجاؤ۔ میں تمہاری اور سکندر کی راہ روک رہا ہوں۔" ان کا لہجہ محبت اور چاہت سے بھر پور تو تھا ہی مگر نچالے کیوں اسے رنڈھا ہوا بھی لگا۔

کیا اس کے بابا دور سے تھے؟ نہیں مگر تو نہیں رویا کرتے اور اس کے بابا تو ایک انتہائی سخت مسرو مزاج اور غیر جذباتی سے آدمی ہیں۔ وہ بھلا کیوں دو نہیں گے؟ انہیں خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ بیٹے پر بالکل چپ چاپ اور گم صدم سی لکھی تھی۔ اس کے کانوں میں باب کا رنڈھا لہجہ ابھی بھی گونج رہا تھا۔

نوہرہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں صوفے پر آمنہ بیٹھی نظر آئیں۔ کسی گہری سوچ میں گم۔ گہری سوچ میں گم اور اس تو وہ ہر وقت رہا کرتی تھیں اس وقت مختلف بات یہ تھی کہ وہ اس سوچ میں تھیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھیں اور ان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

نوہرہ ان کی مسکراہٹ کو بغور دیکھتی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

انہوں نے نوہرہ کا آنا اور اپنے پاس بیٹھ جانا محسوس ہی نہ کیا تھا۔ وہ اس وقت یہاں تھیں کب؟ وہ اس وقت اپنے سکندر کے پاس تھیں۔ وہ اسے اور اپنی ہونے والی بہو کو سوچ رہی تھیں۔ اپنے سکندر کی دیکھ کر کو سوچ رہی تھیں۔ جو ان کے بیٹے کو پیاری تھی انہیں تو وہ بغیر ملے بغیر دیکھتی بہت پیاری ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے اسوجان؟" نوہرہ نے مسکرا کر شہیار

آنے کا بیانا تھا۔

”ہاں الحمد للہ۔ میرا دل برا مطمئن ہے ابھی ملا نہیں ہوں اس لڑکے سے مگر چونکہ یہ کلثوم کا بڑا اکیلی کا فیصلہ ہے اس لیے مجھے یقین ہے اس نے کسی غلط شخص کا انتخاب نہیں کیا ہو گا۔ اگر کسی کے Influenca (ثر) میں آکر اس نے یہ فیصلہ کیا ہو تو میں یقیناً پریشان ہوتا۔ میں کلثوم کے لیے بہت فکر مند بھی اسی لیے روتا تھا کہ مجھ سے ناراضی اور میری ضد میں آکر جس طرح وہ پچھلے پانچ سالوں سے لندن میں اکیلی رہ کر خود کو نقصان پہنچا رہی تھی کہیں میری ضد میں وہ کسی غلط جگہ شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔“

وہ خاصے مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔ عمران کے چہرے پر ابھی بھی کسی بات کی نشین تھی۔ عائشہ ان سے محبت کرتی تھیں کہ ایک اچھی شریک حیات اور ان کے دکھ درد کی ساری سہولتیں سہولت کی باتیں ایسی تھیں جو وہ عائشہ سے بھی شہر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عائشہ سے کچھ کرنا چاہتے تھے مگر کہنے کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب کر رہے تھے۔

انہوں نے سر جھکا کر اپنی بلیٹ میں چال ڈالے اور چند نوائلے چالوں کے کھائے بھی تھے یہ چند لمحے سوچنے کے لیے لینے کے بعد انہوں نے عائشہ کو دیکھا۔

”تمہاری مریم سے بات ہو تو اسے کلثوم کے پاکستان لے کر آگے جانا۔“ ان کا انداز سنجیدہ تھا۔

”کیوں؟“ عائشہ نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

”اچھا ہے ناں، کلثوم اچانک آکر اسے سر پر اتار دے گی۔“ انہوں نے اپنے لیے کی سنجیدگی کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

عائشہ جو اب ”مسکرائی تھیں۔“ ”نہیک ہے میں

نہیں بتاؤں گی۔ مگر ان دنوں بہنوں میں بھار اور دوستی اس قدر ہے کہ دیکھ لیجئے گالیز اخوات سے تارے لگی۔“

”ہاں کلثوم، مریم سے بہت محبت کرتی ہے۔“ انہوں نے ایک سنجی ہوئی سی سانس لے کر گلاس میں

کی انہیں علی پر نہیں شہسار خان پر جا کر کھسکی تھیں۔ آئندہ کے گمبیک دم ہی بولنے پر سوت ہوئے تھے جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے رنٹے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں۔ سکندر کی بات کرنا تو کیا وہ شہسار خان اور زمین کے سامنے کبھی بھولے سے اس کا نام تک نہیں لیا کرتی تھیں۔ کچا کہ آج وہ سکندر کی بات کرتے آئے یاد کر کے آنسو بہاتے دیکھ لی گئی تھیں۔ وہ فوراً ہی گھبرا کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھیں۔

”دوڑی جان رو رہی ہیں؟“ علی ان کے پاس حیران پریشان سا آیا۔

”میں میری جان۔“ انہوں نے علی کو گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ نوریہ نے قدرے گھبرائی ہوئی ایک نظر آئندہ کو گود بھر سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑے شہسار خان کو دیکھا۔

”آئیے مل بیٹا، علی نے کتنا دکھایا آپ کو؟“

اس نے فوراً ہی صورت حال کو سمجھا کر اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ شہسار صوفے پر ان لوگوں کے نزدیک آگئے تھے۔

”تمہیں دکن نہیں ہوتی۔ ہم دوا دیتے۔“ نے خوب انجوائے کیا ہے۔ آج تو دوائے علی کو پرایا بھی ہے۔“

صوفے پر بیٹھے ہوئے شہسار خان گویا علی کو چھینر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کچھ بھر پور کی کسی بات کا کوئی تاثر موجود نہیں تھا۔ وہ بر سکوان اور گیسو ڈھانچے جیسے پیشہ ہوا کرتے تھے۔ علی فوراً سارا سخی سے انہیں دیکھا بولا۔

”جی نہیں! دوا دوا جان ہارے ہیں میں جیتا ہوں۔“ آئندہ علی اور شہسار خان کی نوک جھونک پر چھیکے سے انداز میں مسکرائی تھیں۔



”لیو پاکستان آرہی ہے۔ یہ تو بہت خوشی کی بات بتائی آپ نے۔“

کھانے کی میز پر وہ اور عائشہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے عائشہ کو لیو کے شادی کے فیصلے اور پاکستان

اپنے لیے اپنی ڈالا تھا۔



اس کا سولو شو کامیابی سے ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ ٹکوریس سے واپسی کی تیاری کر رہی تھی۔ اپنا سامان پیک کرتے ہوئے اس نے سیم کا قہر ملایا۔ وہ اسے جانا چاہتی تھی کہ وہ لندن نہیں جا رہی، واپس مدام جا رہی ہے۔ کیونکہ اگلے ہفتے کسی روز وہ پاکستان آ رہی ہے۔ سیم نے اس کی کل رہیم کی تو اپنے پیلو کے بعد اس نے اسے اگلی بات بھی بتائی تھی۔

”کیا ضرورت بری ہے تمہیں پاکستان آنے کی؟ شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو دم بدمادہ کہیں بھی شادی رکھ لو۔ تم جہاں کو بھی تمہاری شادی اٹینڈ کرنے والے آ جاؤ گی۔“ وہ فوراً ہی سنجیدگی اور محبت سے بولی۔

”میرا آنا ضروری ہے سیم۔“

”میرا مشورہ ہے تم یہاں نہ آؤ۔ تمہیں یہاں کی نیچر کا پتا ہے ناں؟ محض اس ضد میں کہ تم ان کی نہیں اپنی مرضی سے شادی کر رہی ہو، وہ تمہاری شادی رکوانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو وہ اپنی منوانے کے علوی ہیں اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ چاہے ان کے ایسا کرنے سے ان کی بیٹیوں کی زندگی برباد ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔“

سیم بہت جذباتی انداز میں بول رہی تھی اس کے لیے میں اس کی محبت اور فکر شامل تھی۔ وہ سیم کی خود سے محبت پر مسکرائی۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا سیم! میری پاپا سے بات ہوئی ہے وہ میری شادی کی بات سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور اگر وہ خوش نہ بھی ہو تب مجھے تو تب بھی پاکستان آنا ہی تھا۔ سکندر کی فیملی پاکستان میں ہے۔ وہ مجھے اپنی ماں سے ملوانا چاہتا ہے۔ ان سے ملنے تو مجھے کراچی آنا ہی ہے۔“

اس کی رسائی سے کی بات کے جواب میں سیم یکدم ہی غصے اور ناراضی سے بولی۔

”جب تم ملے کر چکی ہو تو ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آتا ہے کرو۔ وہ چند دنوں سے ملنے والا شخص مجھ سے زیادہ اہم ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں پاپا کچھ الٹا سیدھا کریں، تمہاری شادی یہاں نہ ہونے دیں تو روٹی ہوگی میرے پاس مت آنا۔“ سیم نے بات پوری کر کے ہی اسے کچھ کہنے کا موقع دے بغیر کھانک سے فون بند کر دیا تھا۔

سیم بہت بخور غصے لیے میں بولی تھی اس کی تو بازو چھی تھی۔ سیم کے قصے اور اس کی لٹی کا اس نے برا نہیں بانا تھا۔ وہ جانتی تھی سیم اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور اس کی اس بے تحاشا محبت ہی میں اس کی فکر میں جتا ہو کر وہ اس پر چالنی تھی، ناراض ہوئی تھی۔ کوئی بات نہیں وہ کراچی جا کر سیم کو منانے گی۔ منا کیلے گی، اس کی شکل دیکھتے ہی سیم اپنی ساری ناراضی خود ہی بھول جائے گی۔



صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ لیڈر اکو لینے ایروپورٹ آیا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس دبا آئی تھی، یہاں سے ان دونوں نے مل کر کراچی جانا تھا۔ وہ اسے سامنے سے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ پورے ایک ہفتے بعد پھر اس کے سامنے تھی۔

”Signorina Buon giorno“

وہ دسے دیکھ کر شر سے انداز میں بولا۔ وہ بالکل لوز سا بلاؤڈ آف وائٹ لیٹن سینٹ کے ساتھ اپنے تھمیں۔ حسین تو وہ بھی کب اپنی ہی لٹا کرتی تھی۔

”Buon giorno“

شکر تم اٹالین بھولے نہیں۔“

”جتنی آئی تھی وہ یاد رکھی ہوئی ہے، باقی تم مجھے سکھانا۔“

وہ زلی اس کے ہاتھ سے لے کر خود چلا آ ہوا اپنی گاڑی تک آ گیا تھا۔ اس نے لیڈر کا چھوٹے مائیکرو سوٹ کیس گاڑی کی ڈبگی میں رکھا۔ وہ تو پاکستان کا صرف دو یا تین دن کا پروگرام بنا رہا تھا مگر لیڈر اس

”بہت خوب صورت ہے۔ پتا تو دے۔“

اس نے جھٹ اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش و خوش رہی تھی کہ وہ رنگ خریدنے والی بات بھولا نہیں تھا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی تھی۔

لیزا مسکراتے ہوئے انگوٹھی سے بچہ اپنے ہاتھ کو ہر روز اویسے سے دیکھ رہی تھی۔

”اچھی لگ رہی ہے ناں میرے ہاتھ میں؟“

”ہاں بہت۔“ اس نے ہمارے لیزا کو دیکھا۔

”چلیں؟“ اس کی ٹوشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ خوب بھی مسکرا رہا تھا۔

لیزا نے سرانبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ”چلو۔“

وہ اسے لے کر اپنے فلیٹ آگیا تھا۔ راستے بھر وہ

اسے اپنی انگوٹھیں کی باتیں بتاتی رہی تھی یا پھر اپنی بہن کا ذکر کرتی رہی تھی جس سے ملنے کے لیے وہ صدمت

ایکسا بندھ گئی تھی۔ غنی نے اسے دعا پڑھا سنا دیا تھا جو اسے لیزا نے راستے میں پینچا دیا تھا انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا

تھا کہ وہ ان دونوں کی شادی میں ضرور شریک ہوں گی۔ وہ چالی لگا کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ لیزا اس

کے ساتھ کھڑی تھی۔

اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے ایک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا فلیٹ لیزا کے شایان شان نہیں۔

اس کا دل ایک دم ہی بھجھ سا گیا۔ اسے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔

”آؤ۔“ لیزا نے اس کے ساتھ اندر قدم رکھا۔

”تمہارے روم والے فلیٹ کے مقابلے میں میرا فلیٹ چھوٹا ہے۔ مجھے پتا ہے تمہارے دیکھ کر یاس ہو

رہی ہوگی۔ میں شادی سے پہلے تمہیں اور اس سے بڑا فلیٹ نے لوں گا۔“ اس کے لہجے میں افسردگی در آئی

تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔ اس کے فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم تھا جو وہ ”لیونگ روم“ کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی کچن اور

ایک بیڈ روم تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں سکیندر؟ تمہارا فلیٹ بہت

سے کما تھا کہ جب وہ اپنی بیڑیاں کا دل خوش کرنے کے لیے پاکستان جا رہی تھی تو اسے وہاں چند دن تو ٹھہرنا چاہیے تاکہ وہ اچھی طرح اس سے مل سکیں۔ لیزا بھی کراچی میں اپنی بہن سے ملنے کے لیے بہت ایکساٹڈ تھی۔

وہ پہلی بار پاکستان جا رہی تھی۔ وہ پانچ سالوں بعد اپنے باپ سے ملنے والی تھی اور کافی مہینوں بعد اپنی بہن سے ملنے والی تھی سو وہ بھی وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا

چاہتی تھی۔ یوں لیزا کے کہنے پر انہوں نے ایک ہفتے کراچی میں رہنے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہوں نے کراچی

ساتھ جانا تھا وہاں اسے وہاں ساتھ واپس آنا تھا۔ ان کے قیام کی مدت اگر لیزا نے ملے کی تھی تو ج

کس فلائیٹ سے لیزا لایا آئے گی اور کس فلائیٹ سے وہ دونوں کراچی جائیں گے یہ اس نے طے کیا تھا۔ وہ

آج لیزا کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جتنا ہو سکا ہے وہ

لیزا کے ساتھ وقت گزارے۔

اس نے لیزا سے کہا تھا ”جج مسویرے جو سب سے پہلی فلائیٹ اسے دہا پینچائے وہ اس سے

آجائے یوں اس وقت جبکہ جج پانچ بجے تھے لیزا اس کے سامنے تھی۔ آج رات گئے کراچی چلنے والی جس

آخری فلائیٹ میں انہیں سیٹیں مل سکی تھیں وہ اس سے کراچی جا رہے تھے۔ یوں آج جج پانچ بجے سے

رات گئے تک ایک دوسرے کے ساتھ باہیں کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہتریں وقت گزارنے کے

لیے ان کے پاس کئی گھنٹے موجود تھے۔

کراچی پہنچ کر پتا نہیں وہ ایک دوسرے سے کتنا مل باہیں گے کتنا وقت ساتھ گزارا باہیں گے گاڑی میں

بیٹھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ”خوب صورت سی ڈییا نکالی

جس میں لیزا کے لیے خریدی انگوٹھی موجود تھی۔“

”اوہ تم نے رنگ خرید لی سکیندر۔“ اس نے ڈیبا سکول کر اس کے سامنے کی توں مسکرا کر بولی۔

”ہاں! کیسی ہے؟“

"تم جو ہو جیسے ہو، مجھے بہت پسند ہو اور اس بات کا یقین کرو کہ سکندر! میں نے تم سے کبھی ہاپوس ہوں گی نہ تمہارا ساتھ چھوڑوں گی، نہ تم سے محبت بھی میرے دل میں کم ہوگی۔"

وہ مضبوط ہاتھ میں اسے اپنی محبت اور وفاؤں کا یقین دلاد رہی تھی۔ وہ کچھ پل یونی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ کیا غم مجھے اپنے گھر لاکر یونی سزا میں کھڑا کیے رکھو تھے؟ ایک تو پچھلے اپنی انگریزیشن، اس کے بعد فلورنس سے روم بھاگ ڈو اور اس کے بعد جلدی جلدی پیکنگ ریفریج کرنے میں میں اتنا تھک گئی ہوں۔ اور پھر تم نے صبح سویرے وہاں اپنے کی بدایت کر کے میری کل رات کی نیند اور آرام خراب کروایا۔"

وہ اپنے مخصوص زندہ دل سے بھرور انداز میں بولتی اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلاد رہی تھی۔

"اے! اس کم سو سو ری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تم واقعی تھک گئی ہو گی۔"

وہ فوراً "شرمندہ سا ہونا اس کا سوت کیس پکڑے اپنے بند روہ کی طرف بڑھا۔ لیزا اس کے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔

"تم شاور لے لو، فریش ہو جاؤ۔ پھر تھوڑی دیر سو جاؤ۔" اس نے اس کا سوت کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کمر لیزا نے سرفرشی میں بلایا۔

"سوو نہیں رہی میں۔ تمہارے ساتھ بیٹھا کرنے کے لالچ میں، میں نے غلامی پر کچھ بھی نہیں لیا۔ مجھے ناشتہ کرواؤ اچھا سا۔ اس کے بعد مجھے وہاں بٹھائے۔"

بولتے بولتے وہ پل بھر کے لیے رکی پھر اسے کچھ مٹھکوں لگا ہوں سے دیکھ کر بولی۔

"تمہارے آئینے میں جانناں؟"

"نہیں جی۔ تمہیں پورا دن اپنے ساتھ گزارنے کے لیے یہاں بلاؤں گا اور خود آئینے جا کر بیٹھ جاؤں گا؟"

اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں کچ سے ہی چھٹی ہوں۔ میں نے فی الحال ایک چٹنے کی چھٹی لی ہے۔ اس کے شادی کے لیے ہم جو بھی پلان کرتے ہیں پھر اس

اچھا ہے۔ میرے لیے ہر وہ جگہ خوب صورت ہے جہاں تم میرے ساتھ ہو۔"

وہ جیسے قدرے برا مان کر بولی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو غور دیکھ رہا تھا۔

"جیسا! میں اپنی انجھی بکھری زندگی کی وجہ سے پریشان سا ہو جا ہوں کہ کیس نہیں ہاپوس نہ کروں۔"

لیزیا نے اسے دیکھا اور سیکری بہت اچھی ہے۔ میں اچھی سے اچھی جگہ بھی افورڈ کر سکتا ہوں۔ بس

میں نے بھی اپنے لٹیک کو گھر سمجھایا نہیں، کبھی گھر سمجھ کر اسے سنبالنے سنبالنے کی ضرورت ہی محسوس

نہیں کی مگر اب دل چاہنے لگا ہے زندگی کو ترتیب دینے کا ایک بہت بڑا بہت خوب صورت سا گھر ہو جہاں ہم

دونوں رہیں۔ میں تمہارے لیے دنیا کی ہر نعمت اکٹھی کر لیتا چاہتا ہوں۔"

وہ رک رک کر بولی بول رہا تھا جیسے اسے خوف ہو، اندیشہ ہو کہ جو وہ سوچ رہا ہے وہ کبھی ہو نہیں سکے گا۔

لیزا اور وہ کبھی ساتھ زندگی گزار نہیں پائیں گے۔ لیزا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"غم خواب دینے سے ڈرنا چھوڑو سکندر۔ تمہارے سارے ذہن غلط ثابت ہوں گے۔ اس بار تمہاری زندگی میں کچھ برا نہیں ہوگا۔"

وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ جو وہ اس سے کہہ نہیں پایا تھا وہ اسے بھی کچھ پچھ تھی وہ

اسے زندگی میں سب کچھ اچھا ہونے کا یقین دلاد رہی تھی۔

"مجھے تھوڑا وقت دینا لیزا! میں برسوں سے اندھیوں میں رہنے کا عادی ہو چلا ہوں۔ زندگی کے

ہنگاموں اور درختوں سے میں نے خود کو سالوں سے دور کر رکھا ہے۔ تم خوش رہنے اور ہنسنے ہنسنے والی لڑکی

ہو۔ میں تمہاری پسند کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا بس تم مجھ سے ہاپوس مت ہو جانا۔

مجھے تھوڑی رعایت، تھوڑی گنجائش دیجی رہتا۔" وہ اپنے ہاتھ پر رکھے لیزا کے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر لے لیا۔

حساب سے مزید چھٹیاں لے لوں گا۔“

وہ اس کے دعب دار سے انداز پر ہنس کر بولا۔

”نہار کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اس لیے پوچھ رہی تھی۔“

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ وہ لیزا کے لیے ڈرا ہتمام سے ناشتے کی تیاری کرنا چاہ رہا تھا۔



نہانے لور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ خود ہی اس کے فلیٹ میں گھومتی گئی۔ لیزا ابھی تھی۔ جہاں میز پر ناشتے کے کچھ لوازمات سجائے جا چکے تھے اور کچھ وہ ابھی تیار کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں ہائیکردو پونٹس اور برنز تینوں کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ہنسی مچاتی اندر آگئی۔

”اتنا اہتمام بھی مت کرو میرے لیے۔“ اس نے ٹونسٹر سے ٹوسٹ نکال کر پاس رکھی پلیٹ میں رکھے اور وہ پلیٹ فبرا“ ہی میز پر پہنچائی تھی۔ سکندر بڑی صراحت سے آلیٹ بنا رہا تھا۔ پہلے اس نے ٹین میں بھینٹے ہوئے انڈے ڈالے۔ وہ ایک سیکنڈ بعد اس پر مشرو مزاد و شیر ڈالا تھا اور پھر بڑے سہارنہ انداز میں اسے جلدی جلدی دھلی کر رہا تھا۔

”نم ساجیج کھاتی ہو؟“

”میں سب کچھ کھاتی ہوں۔“ وہ میز پر رکھی پھلوں کی خوب صورت سی ٹوکری کو دیکھ کر مسکراتی۔ اس میں صرف ایک ہی پھل تھا۔ ناشپاتیاں۔ ٹوکری پوری لبالب بھری ہوئی تھی ناشپاتیاں سے۔ اس نے پلیٹ میں آلیٹ نکالتے سکندر کو مسکرا کر دیکھا۔ اسے یہ پھل کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ وہ یہ ناشپاتیاں کس کے لیے خرید کر لایا تھا وہ جانتی تھی۔

”تم ناشپاتیاں میرے لیے لائے تھے؟“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ آلیٹ کی پلیٹ میز پر رکھتا سکندر بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں۔ صرف ناشپاتیاں نہیں، بلکہ یہ فورٹ باسکٹ بھی میں نے کل شام ہی خریدی ہے۔“ لب بے

ڈھنگے ہیں سے پھل بو نمی شہر میں بڑے چھوڑنا تو تم میرے چھوڑیں برا فوس کرشم۔“

وہ ہنس کر بولا جیسے اپنی کل فورٹ باسکٹ خریدنے والی حرکت کو ابھی تک بخواسے کر رہا ہو۔ وہ سکندر کے میزبانوں کی طرح برا خلاق دعوت دینے سے قیل ہی ہاشا شروع کر چکی تھی۔

”کیا تم میری پسند ناپسند ہمیشہ اسی طرح یاد رکھو گے؟“ آلیٹ کو دوسرا سبج کھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”جانتا نہیں۔“ وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا پھر وہ اس سے بولا۔

”میں تمہاری امیدوں پر پورا اڑنا چاہتا ہوں لیزا۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ نہیں میں تمہیں خوش رکھ بھی پاؤں گا یا نہیں؟ میں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں لیزا! اب تمہارے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ ہم شادی کر سکتے جا رہے ہیں۔ تم اس وقت میری پسندی ہوئی، رنگ پنے میرے سامنے بھی ہو مگر میں اس وقت پھر بھی بات کہوں گا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم مجھ سے بہت بہتر شخص ڈ کر گئی تھیں۔“

اس کے چہرے پر لڑائی تھی، جیسے اپنے آپ سے ناپوسی تھی۔ لیزا نے یک دم ہی اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔

”میں اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہوں کیونکہ سکندر شہزادہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس جیسے اچھے شخص کو زندگی میں کتنی محروم پھر بھی مجھے مل رہا ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے کیونکہ ہمارا رشتہ محبت اور سچائی پر قائم ہوا ہے۔“

اس نے دیکھا سکندر کے چہرے کی ناپوسی فوراً ہی مسکراہٹ میں تبدیل ہوئی تھی۔ اور پھر فوراً ہی سنجیدگی اور سچائی میں۔

”پلیز مجھے بھی چھوڑنا نہیں، مجھے سب نے چھوڑ

وہ گھبرا کر بولی۔
سکندر کی لٹی اور اس کا خود پر غصہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی
تھی۔ سکندر نے خالی خالی نگاہوں سے اسے بغور
دیکھا۔

"میں بیس سال کا تھا لیرا، میں اس وقت صرف
بیس سال کا تھا۔ کیا کوئی باپ اپنے بیس سال کے کم عمر
بچے کے ساتھ ایسا ظلم کر سکتا ہے؟ کیا کوئی بھائی اپنے
بھائی کو تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے؟ یہ
تھے میرے خونی رشتے۔ یہ تھے میرے خونی رشتے۔"
بولتے بولتے سکندر کی آواز بالکل مدھم مدھم تھی
وہ سر جھکا کر میز کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ بہت دکھ بہت
کرب سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے نرم نرم
وجہ پر کس طرح مزہم رکھے کہ وہ اپنی کی ہر شے یاد کو
بھول جاسے؟

"یہ جو آج میں تمہیں ایک باعزت انسان نظر آتا
ہوں ملٹی نیشنل میں معزوسی جاب کرتا۔ میں یہاں
تک کس طرح پہنچا ہوں اگر تمہیں بتا دوں تو شاید تم
میری سخت جالی پر حیران رہ جاؤ گی۔ مگر سے مگر اور
گھٹیا ہے گھٹیا وہ کون سا ایسا کام ہے جو اپنے
Survival (بقا) کے لیے میں نے نہیں کیا تھا۔ میں
نے ٹائٹ کلڈز اور بارڈز میں لوگوں کو شراب پیش کی
ہے، میں نے لوگوں کے جانوروں، کن کے کنول کے دیکھ
بھلی کی ہے، میں نے کنسرکشن سائٹ پر محنت
مزدوری کی ہے۔ میں سڑکوں، فٹ پاتھوں اور پارک کی
نیچڑوں تک بر سوا ہوں۔ جیسے نہ ہونے کی وجہ سے
میں کسی کئی دن بھوکا رہا ہوں، کوئی بھی مجھے ایک وقت کا
کھانا کھانے کے لیے میے دے گا اس کے لیے میں بیچ
سے بیچ کام کرنے تک کے لیے تیار ہوا ہوں۔ اس ملٹی
نیشنل کمپنی میں لیگل ایڈوائزر کی پوسٹ تک پہنچتے
پہنچتے میں نے زندگی میں کتنی دلچسپی برداشت کی ہیں،
تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

وہ اسی طرح میز کو گھورتا آہستہ آواز میں کرب سے
کہہ رہا تھا۔

"اسی لیے تو میں تمہیں ایک برباد انسان کہتی ہوں

رہا تھا۔ مجھے رشتوں نے اور زندگی نے صرف نفرتیں
دی ہیں۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا، اگر تم مجھ سے دور
ہو میں تو میں زندہ کس طرح رہاؤں گا؟"

اور وہ جانتی تھی کہ سکندر شہر یا آسانی سے لوگوں
پر کھل جانے والا شخص نہیں تھا۔ اسے اندر جھانکنے کی
وہ کسی کو اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ اگر وہ اسے اپنے
اندر جھانکنے دے رہا تھا اسے دیکھ کر اپنی کمزوریاں اس
سے شہر کر رہا تھا تو وہ اسے اپنی زندگی میں سب سے
اہم رہنے پر لے جا کر بٹھار رہا تھا۔ وہ اسے اپنے دل اور
اپنی مدد تک رسائی دے رہا تھا۔

"جنہوں نے تمہیں نفرتیں دیں، جنہوں نے
تمہیں چھوڑ دیا، وہ بد نصیب لوگ تھے سکندر! یہ
شہزادی نہیں ان کی بد نصیبی ہے کہ وہ جنہیں چاہتے
سکے، تم سے تو صرف محبت کی جا سکتی ہے سکندر۔"

سکندر کا دیکھ اس کا کرب محسوس کرتے ہوئے اس
کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی اس کی آواز بھر آگئی تھی۔
وہ ٹٹکتلی باندھے ہالکے خاموش اسے دیکھ جا رہا تھا۔
"تم مجھ سے پوچھو گی نہیں لیرا کہ میرے گھر والوں
نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تھا؟ انہوں نے مجھے نفرت سے
کیوں بھڑکا دیا تھا؟"

وہ چند لمحوں کے بعد آہستگی سے بولا۔ اس کے
چہرے پر کتنی ابھراؤ آئی تھی۔

"تمہیں میں تم سے یہ سب نہیں پوچھنا چاہتی
اس لیے کہ میں وہ سب جانتا ضروری نہیں سمجھتی۔"
اس کے نرم لہجے میں کئی بات جیسے سکندر کو یک دم ہی
مزید تلخ کر رہی تھی۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا تھا مدت
منقشر ہو کر۔

"پوچھنا چاہیے تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے
تمہیں مجھ سے کہ آخر میرے اپنے گھر کے باپ نے مجھے
اپنے گھر سے دھکے مار کر کیوں نکال دیا تھا؟ میرا لگا بھائی
مجھ سے اس حد تک نفرت کیوں کرتا تھا کہ اگر میرے
مرنے کی اطلاع آئی تو اس پر سب سے زیادہ خوش
ہونے والا وہ ہوتا؟"

"سکندر پلیر، تم خود کو کیوں لذت دے رہے ہو؟"

اس روز مجھے خود پر گزری ایک ایک بات چلائی۔
 اور وہ اس لڑکی کے خود پر یسین اور محبت کو دیکھا
 گیا تھا۔ اس کے موڈ پر چھائی پر مرموگی اور اداسی
 کرنے کے لیے لیزا نے فوراً ہی یہ شور مچایا تھا کہ وہ
 اسے گھمانے لے کر چلے اور یہ کہ اسے یہاں پر
 شاپنگ بھی کر لے۔ یہاں زیادہ تر شاپنگ باڑی صبح دس
 بجے یا اس کے کچھ بعد کھلا کرتے تھے۔ اس صبح خود
 دقت تھا۔ وہ اس میں لیزا کو دبا کی مختلف خوب صورت
 سڑکیں اور روز ڈیر گھمانا رہا تھا۔ کئی جگہ وہ رنگ جام
 میں بھی پھنسے تھے۔ گویا صبح صبح یہ دن کی لگا لگا ڈرائیو
 تھی۔

وہ ابھی بھی لو اس تھا، وہ دل سے خوش ہونے سے
 ڈر رہا تھا مگر وہ لیزا سے اپنی یہ کیفیت چھپا رہا تھا۔ وہ بظاہر
 ڈرائیو کرتے اس کی باتوں پر یوں مسکرا رہا تھا جیسے
 بہت خوش ہو، جیسے کوئی خوف، کوئی اندیشہ اس کے دل
 کو پریشان نہ کر رہا ہو۔

اب وہ دونوں اس جدید اور بے حد خوب صورت
 پیرسائن شاپنگ مال میں تھے جہاں ابھی سے اچھی اور
 منگنی سے منگنی ہر شے موجود تھی۔ لیزا کو ایک شاپ پر
 اپنے لیے ایک اینڈ بگ پسند آ گیا۔ وہ اسے خریدنے
 لگی۔

"پنا ہے مجھے تمہارے پاس بہت پیسے ہیں۔ مریانی
 کر کے یہ والٹ اندر رکھ لو۔"
 اسے سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔
 وہ قدرے رعب سے بولا۔ اس نے خود اس کی
 بیسٹ کی تھی۔

"میری شاپنگ کی؟ سمجھتے ہو؟" وہ دونوں
 بیک خرید کر شاپ سے باہر نکلے تو لیزا نے مسکرا کر اس
 سے پوچھا۔
 "ہاں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے سنجیدگی سے
 بولا۔

"یہ تو بہت فائدے کی بات ہے۔ اب تو میں دل بھر
 کر اور خوب منگنی شاپنگ کروں گی۔" وہ کسی نوعمر لڑکی
 کی طرح خوشی اور ایکسٹنٹ کا اظہار کرتے ہوئے

سکندر، انہم بہت بہادر ہو، زندگی کی کھوکھوں سے تم نے
 ہار نہیں مانی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہو تاکہ خود کو تباہ و برباد
 کر چکا ہو۔ مگر تم نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کر اسے بتا دیا کہ تم ہارنا نہ والے نہیں ہو۔ تم
 بدترین حالات کا سامنا کر لو گے مگر خود کو برباد نہیں ہونے
 دو گے۔ تم نے ناممکن زمین اور مشکل ترین حالات
 میں اپنی ایکویشن مکمل کی لازمی ہے، تم بہت بہادر ہو
 سکندر۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ مجھے تم سے محبت ہونے پر
 فخر ہے۔ تم میری زندگی میں شامل ہونے جا رہے ہو
 مجھے تمہارے اس ساتھ پر فخر ہے۔"

سکندر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں
 میں نرمی اور چاہت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر
 بغیر کچھ بولے چپکے سے انداز میں مسکراتا تھا۔
 "خود کو اتنا حد مت دبا کر سکندر۔" وہ رمانیت
 سے بولی۔ "چاہے ہو اور خود کو اتنا شہا بھی کرو۔ بہت
 کر لیں، ہم نے یہ دل دکھانے والی باتیں۔" وہ اس کے
 لیے کپ میں چائے ڈالنے لگی تھی۔



وہ لیزا کو ساتھ لے کر وہیں کے ایک بڑے سے
 شاپنگ مال آیا تھا۔ اس نے لیزا کے اصرار پر تھوڑا
 بہت ناشنا کر لیا تھا۔ ماضی کو دہرا کر اسے یاد کر کے اس
 پر عجیب سی اداسی اور قنوطیت طاری تھی۔ ناشتے کی میز
 لیزا نے سمجھنی تھی، اس نے جھولے برتن، ڈش، واشٹر
 میں ڈالے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا تھا۔ لیزا
 اس کے بعد ایک بار پھر اس کے پاس میز پر آکر بیٹھی
 تھی۔

"جو باتیں سوچنے اور دہرانے سے نہیں اتنی
 تکلیف ہوتی ہے سکندر، اتم انہیں مجھ سے بھی مت
 کہا کرو۔ کبھی جب ہماری شادی کو بہت عرصہ گزر چکا
 ہو گا۔ میرا ساتھ تمہارے اندر کی گھٹیاں کچھ کم کر چکا
 ہو گا، تم خواب دیکھنے سے ڈرنا چھوڑ چکے ہو گے،
 تمہارے اندر سے یہ اندیشہ بھی ختم ہو گیا ہو گا کہ باقی
 سب لوگوں کی طرح میں بھی تمہیں چھوڑ جاؤں گی، تم

بولی۔

ہوں تم اسے اپنے کمرے میں اپنی بیڈ سائڈ ٹیبل پر
سجائو۔ جس طرح تم نے وہاں سمورانی کا مجسمہ اور میرا
بنایا کارڈ سجا کر رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ

You are the only one
the key who hold
to my heart

(تم وہ واحد آدمی ہو جس کے پاس میرے دل کی چابی
ہے۔) کہ بے حد سنجیدگی سے بولی تھی۔
”نہ لے لو بیٹا! میں اسے بہت سیٹھال کر لوں گا
رکھوں گا۔“

اسے ابھی بھی ہنسی آ رہی تھی۔ اس طرح کا نو عمر
لڑکے لوگوں والا اتھخندہ خریدے جانے پر کمر اس نے لیزا
کو سنجیدہ دیکھ کر اسے خریدنے کو کہا تھا وہاں بہت
سے تھے ایسے بھی تھے جنہیں خریدنے سے پہلے لوگ
Personalised کر دیا رہے تھے اپنے نام یا تصاویر
ان میں جیسا ہا کتندہ کروا کر۔

”نہم ان مک کو پر مسئلہ نہ کرو آئیں؟“

ابھی وہ لیزا کی چابی والی حرکت ہی پر محفوظ ہو رہا تھا
کہ وہ سامنے رکھے مختلف رنگوں اور ڈیزائنز کے گول
کو دیکھ کر بولی۔

”کیا لکھنا چاہتی ہو تم مک پر؟“ وہ محفوظ ہوتے
ہوئے بولا۔ وہ صبح ناشتے کے دوران ماضی کو یاد کرتے
ہوئے کتے ڈریشن میں چلا گیا تھا۔ کتنا مایوس اور کتنا
اوس ہو گیا تھا۔ اب اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ لیزا
کے ساتھ ان پچکانہ سی چیزوں کو لیتا خوش ہو رہا تھا
تہہ اچھا لگ رہا تھا جیسے لیزا سولہ سال کی دسیرتھی
اور سو سترہ سال کا نو عمر لڑکا۔

”مسٹر اینڈ مسز سکندر۔“ لیزا نے مک ہاتھ میں
اٹھاتے ہوئے فوراً ”ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسے اس پر
کیا لکھوانا ہے۔ اس نے وہ مک اٹھا لیے تھے۔ اب وہ
کاؤنٹر پر کھڑی سیلز مین سے انہیں مسٹر اینڈ مسز سکندر
کنڈ کاری کر کے لکھنے کو بول رہی تھی۔ جتنی دیر سیلز
مین نے مکوں پر کنڈ کاری کی وہ اوسر اوھر ہو رہے تھے
رہے۔ سیلز مین مکوں پر نام کتندہ کر دیا تھا۔

وہ اسے دیکھ کر کمرے پر لیزا کے لیے وہ بیگ خریدنا
اسے اچھا لگا تھا اس کا موڈ خوشگوار ہونا شروع ہو گیا
تھا۔

”میں چلیں؟“ ایک سیلینر پر چڑھ کر وہ دونوں اگلی
منزل پر آئے تو وہاں ایک گھٹ تھاپ دیکھ کر لیزا اس
سے بولی۔ اس نے سر اٹات میں ہلا دیا تھا۔ وہ دونوں
اس تھاپ میں آ گئے تھے۔ وہ ایک طرف مختلف
ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہا تھا اور لیزا دوسری طرف کچھ
اور دیکھ رہی تھی۔

”سکندر! یہ دیکھو یہ میں تمہارے لیے لے رہی
ہوں۔“ وہ بہت اکیسا ٹینڈ ہی اس کے پاس آئی۔ اس
نے سر جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں
تینتی لکڑی سے بنی ایک خوب صورت اور بڑی سی چابی
تھی جسے الماری یا میز پر سجایا جاسکتا تھا۔ اس پر سنہری
حروف میں کتندہ الفاظ پڑھ کر دے جسے بغیر نہیں سکتا تھا۔

Only you hold the key

to my heart

”یہ؟ تم میرے لیے خریدو گی؟“ وہ تہہ رنگار
ہنسا تھا۔

”ہاں یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔“

Key to my heart اس میں بننے والی کیا
بات ہے؟“ اس کے تہہ رنگار بننے پر ندرے برا
مان کر بولی۔

”جیسے ٹین اینڈ لڑکے لڑکیوں ایک دوسرے کو
اس طرح کے پچکانہ تھے دیتے ہیں۔“ وہ ہنوز ہنس رہا
تھا۔

”اب اگر ٹین اینج میں مجھے کسی سے محبت نہیں
ہوتی تھی تو کیا میرے دل میں کوئی ارمان ہی نہیں ہوں
گے؟ کیا اٹھا میں سال کی عمر میں میں اپنے ٹین اینج
والے شوق پورے نہیں کر سکتی؟“ وہ بہت سنجیدہ تھی
اس چابی کو خریدنے کے لیے۔

”نہ ضرور نہ کرو۔ میں نے کب روکا ہے۔“

مگر میں یہ تمہارے لیے لے رہی ہوں۔ میں چاہتی

"ہم ابھی خرید لیں گے کھانے کے بعد۔ یہاں ہوں گی ناں پاکستانی اور امیڈین ہونہ کس؟" اس نے سکندر سے پوچھا۔ اس نے جواباً "ثبات میں سہلایا۔" تمہاری اموجان کیسی ہیں، ہیرا مطلب سے دیکھئے اور عارت میں۔" وہ اسے اپنی ماں سے ملوانے پاکستان لے جا رہا تھا تو اس کا دل چاہا وہ سکندر سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھے۔

"بہت حسین، بہت خوب صورت۔ تم انہیں دیکھو گی تو وہ تمہیں بھی بہت اچھی لگیں گی۔ آہستہ آواز میں اتنی نرمی سے بولتی ہیں وہ۔ میں نے انہیں کبھی پیٹتے چائے اور غصے میں نہیں دیکھا۔ چاہے وہ ڈاکٹر ہیں۔ مگر اپنے گھر اور بچوں کے لیے انہوں نے اپنی ڈگری کی قربانی دے دی، کبھی میڈیکل پریکٹس نہیں کی۔"

ماں کے بارے میں بولتے ہوئے اس کے چہرے پر از خود ہی نرمی اور محبت بکھر گئی تھی۔ وہ بہت جذباتی سا ہو کر بول رہا تھا۔

"تم انہیں اموجان کہتے ہوتاں؟"

"ہاں۔" بولتے ہوئے وہ مسکرایا۔ "بچپن میں میں نے ہی انہیں اس نام سے بلانا شروع کیا تھا۔ اموجان بچپن میں ہمیں بہت کمائیاں سنایا کرتی تھیں۔ کبھی کتابوں میں سے براہ کرا کبھی خود ان کی بچپن میں سنی کمائیاں ایک بار انہوں نے ایک کمائی سنائی تھی، جس میں بچہ اپنی ماں کو اموجان کہتا تھا اور اس میں ماں کا کردار مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تب شاید میں چار یا پانچ سال کا تھا۔ تب خود بخوری میں نے انہیں مٹی کی کتابچہ جوڑ کر اموجان بلانا شروع کر دیا تھا اور میری وہ کھار کبھی سے۔"

بچہ حیاتی میں بولتا ہوتا ایک لخت ہی خاموش ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غمی آگئی تھی۔

"بہت خوب صورت نام ہے اموجان۔" لیزا نے فوراً ہی مسکرا کر کہتے ہوئے بولیں ظاہر کیا جسے اس کا بولتے بولتے حیرت ہو جانا اور وہ بے سوچے سمجھے کیا بولنے جا رہا تھا، سمجھا ہی نہ ہو۔ وہ چپکے سے انداز میں

"کیسا لگ رہا ہے؟"

لیزا ایک ہاتھ میں لے کر اس سے پوچھنے لگی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا، میں آرٹ کی اتنی قدر اور شخصیت سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔ لگ تو ایسا رہا ہے، میری شادی کسی سولہ سترہ سال کی بچی سے ہونے والی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ ڈیکوریشن پیس کے لیے لیزا نے بے کیا تھا اور گلوں کا اس نے۔ شاپنگ بیگ ہاتھ میں لیے وہ دونوں شاپ سے باہر نکلے تب وہ لیزا سے بولا۔

"کبھی کبھی انسان کو بچہ بننا چاہیے۔ بچوں جیسی حرکتیں بھی کرنا چاہئیں۔ اب جو تم ہر وقت ساتھ ستر سال کے بزرگ بنے رہتے ہو میں تو اس پر کچھ نہیں کہتی۔ تو تم کیا میری خاطر تھوڑی دیر کے لیے میرے بچپن کو انجوائے نہیں کر سکتے؟"

وہ لیزا کو ساتھ لیے شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں آگیا۔ وہاں فوڈ کورٹ کے ساتھ بچوں کے لیے Playing ایریا بھی تھا اور ان ڈڈر آفس امپکیننگ کی سہولت بھی۔

"مجھے تمہارا بچپنا بہت اچھا لگ رہا ہے لیزا۔ ان فیکٹ مجھے بہت مزا آ رہا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

لیزا بھی جواباً مسکرائی تھی۔

"کیا کھاؤ گی؟"

"کچھ بھی کھاؤ۔"

"برگر کھاؤ گی یا پھر لمبھو ریا پھر سوٹی؟" وہ دونوں فوڈ کورٹ میں مختلف مشہور ہوٹلز اور ٹاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس کے کاؤنٹرز کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے سوٹی اور لمبھو ریا ٹھیک ہے۔" تھوڑی دیر بعد وہ دونوں وہاں ایک میز پر اپنا اپنا کھانا لے کر بیٹھ گئے تھے۔

"تمہارے پاس کوئی پاکستانی ڈریس نہیں ہو گا ناں؟" لمبھو ریا کھاتے ہوئے اس نے لیزا سے پوچھا۔

"نہیں، کیوں؟" پوچھتے پوچھتے جیسے اسے از خود ہی سمجھ میں آگیا تھا کہ سکندر اسے اپنی ماں سے ملوانے پاکستان لباس میں لے جانا چاہتا ہے۔

اپنا ہاتھ رکھا۔

”نکرت کرو۔ وہ بالکل ٹھیک ہوں گی اور تمہارے آلے کا جان کر بہت خوش ہوں گی۔ تم ان سے ملو گے تو ان کی طبیعت اپنے آپ بہتر ہو جائے گی۔“ لیزا مسکرا کر اسے یقین دلادی تھی۔ اس نے جواباً ”مسکرا کر سر ہلایا تھا۔

فؤاد کورٹ سے اٹھ کر وہ دونوں اسی مال میں موجود ایک بوتھک میں آگئے تھے وہاں انڈین اور پاکستانی ملبوسات موجود تھے۔ لیزا نے کیا تھا۔ دلویا اس نے تھا۔ کڑھائی کی ہوئی بنک ٹکڑی خوب گھیر والی فراک، جوڑی دار اچالے اور دلچپنے کے ساتھ۔ اس نے اس کے علاوہ بھی لیزا کو کافی کچھ دلویا تھا۔

”تمہارے بہت میھے خرچ ہو گئے ناں؟“

دل بھر کر شاپنگ کرنے کے بعد جب وہ دونوں مال سے باہر نکل رہے تھے تب وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔ وہ اس کی اس مصنوعی معصومیت پر مسکرایا۔

”پتا ہے لیزا! تمہارے لیے کچھ خرید کر مجھے ملتی خوش ہو رہی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار خود سے وابستہ کسی رشتے کے لیے کچھ خرید رہا ہوں۔ مجھے اپنے اندر یہی جی سی خوشی اور زندگی کی امنگ محسوس ہو رہی ہے۔“

اس سے دل کی باتیں کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب جو وہ سوچتا تھا، جو محسوس کرتا تھا، اُسے بھجک اس سے شیر کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اسی بوتھک سے اپنی اموجان کے لیے بھی ایک نیٹی جوڑا خریدا تھا۔ پسند لڑا کی تھی۔

اب لیزا کو وہاں کی سائڈ دیکھنا تھا۔ ڈھیر ساری شاپنگ کر کے وہ دونوں فارغ ہوئے تو سہ پہر کا اختتام اور شام کا آغاز ہوا جاتا تھا۔

وہ اسے لے کر Corniche پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ وہاں حسب معمول جاگنگ ٹریک پر لوگ جاگنگ کر رہے تھے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ چل قدمی کرنے کے لیے بنائی گئی خوب صورت روش پر لوگوں کی ایک

مسکرایا۔ یہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ بہت کوشش کر کے اپنے چہرے پر لا پاتا تھا۔

”اور کچھ بتاؤ ناں اپنی اسوجان کے بارے میں میں انہیں اچھی لگوں گی ناں؟“

”تم انہیں بہت اچھی لگو گی۔ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔ تم تو ہونے بہت خوب صورت لیکن اگر میں نے کوئی نام ہی لڑکی بھی اپنے لیے پسند کی ہوتی تو اسے بھی پسند کرتیں کیونکہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔“ لیزا اس کی بات پر مسکرائی تھی۔

”تمہاری باتوں سے مجھے لگ رہا ہے تمہاری اسوجان بہت اچھی ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے میں ان سے جلدی سے ملوں۔“

”میرا دل بھی دل چاہ رہا ہے۔ پتا ہے میں اس سے پہلے ان سے چار سال قبل ملا تھا۔ تب وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں۔ ان کی سرجری ہوئی تھی۔ اس پوری رات میں ان کے ساتھ رہا تھا۔ اس روز میں پورے آٹھ سالوں بعد ان سے ملا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں میرا ان سے کسی بھی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے یاد کر کر کے اتنی پیار لگتی تھیں۔ ان کی صحت اب بھی بھی زیادہ ٹھیک نہیں رہتی۔“

اس کے لہجے میں ماں کی محبت اور ان کی صحت کی فکر شامل تھی۔

”کیا خدا انہیں کبھی نہ لیزا نے تشویش سے پوچھا۔“

”نہیں! اس کا الحمد للہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر دو تین مہینے بعد اس حوالے سے ان کے ٹیسٹ وغیرہ اور ڈاکٹر کے پاس تفصیلی چیک اپ ہو جاتا ہے۔ اس طرف سے اطمینان ہے۔ مگر ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ کبھی بلڈ پریشر، کبھی شوگر، کبھی کبھار سسٹول کبھی کبھار اور کبھی نہ کبھی صحت کا مسئلہ انہیں مسلسل رہتا ہے۔ اپنی صحت کے متعلق وہ مجھے زیادہ بتاتی نہیں ہیں مگر مجھے پتا ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ میں نے انہیں چار سالوں سے دیکھا نہیں ہے لیزا۔“ لیزا نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر

بھی اپنا سکتی ہوں تمہاری خاطر کچھ بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

وہ بہت شدت اور سچائی سے بولے۔ اس کا لفظ لفظ اس کے دل میں چھپی اس کی محبت کا شدتوں سے اظہار کر رہا تھا۔ ایک بل اس کی طرف دیکھتے رہنے اور اس کی وہ المانہ محبت کو محسوس کرنے کے بعد یکدم ہی اس کا دل شرارت پر تکانہ ہوا۔ جیسے یکدم ہی بہت خوش ہو کر دل شریر ہوا تھا۔

"تم میرے لیے کیا کیا چھوڑ سکتی ہو؟"

"کچھ بھی۔"

"تم میرے لیے پیشکش چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روا جانا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ پچھلی بار ہی کی طرح شرارتی انداز میں سوالات دہرا رہا تھا اور وہ رنے رنے انداز میں بغیر سوچے فوراً "ہاں کہہ رہی تھی۔"

"اگر تم میری خاطر یہ چیزیں چھوڑ سکتی ہو تو اس کا مطلب ہے تم سے بدلے سے مجھ سے محبت کرتی ہو۔" وہ قہقہہ لگا کر کہتے ہوئے بولا۔ لیکن ابھی جواباً "نہی تھی۔"



آمنہ زیورات کے ڈبے اور ایک خوب صورت صندوقچی نما چوہری باکس جس میں ان کے پرانے زیورات رکھے تھے نکال کر بند پر بیٹھی تھیں۔ ذہنوں میں قدیم سے نئے ذرا ان کے ان کے زیورات جبکہ صندوقچی میں ان کے خاندانی زیورات تھے۔ کل برسوں بعد ان کا سکندر ان سے ملنے آ رہا تھا، ان کی ہونے والی ہوس کو ان سے ملوانے کے لیے وہ کل اپنے بیٹے اور اپنی ہونے والی ہوس سے ملیں گی۔ وہ اپنی ہوس کو اپنے زیورات میں سے کوئی زیور دینا چاہتی تھیں۔ بہت خوش تھیں۔ بیٹے سے ملنے کی خوشی نے ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ لبوں پر خوشی سے بھری مسکراہٹ لیے مختلف زیورات دیکھ رہی تھیں۔

بڑی تعداد چمچل قدمی کرتی نظر آ رہی تھی۔ ہاں کے درختوں کی چھاؤں میں بیچوں پر بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کثیر المنزلہ اور جدت کی حامل عمارتوں کا منظر بھی بہت خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں چمچل قدمی کرنے لگے۔

"ہم نے ایک بات ابھی تک طے نہیں کی۔" آہستہ قدموں سے چلتے اس نے لیڑا سے کہا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟"

"تمہاری جاب۔ تمہاری جاب کا کیا ہو گا؟ میں نے تم سے پوچھے بغیر از خود یہ فرض کر لیا کہ تم لندن چھوڑ کر رہنا چاہو گی۔"

"ہاں تو ٹھیک سوچا تم نے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو کیا تم اپنی جاب چھوڑ دو گی؟ تمہاری جاب بہت اچھی ہے لیڑا۔"

"مگر جس سے میں شادی کر رہی ہوں، وہ بھی تو بہت اچھا ہے۔" وہ اسی کی زبان میں فوراً بولی تھی۔

"جاب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے سینور سکندر، میں ایک کامیاب آرٹسٹ ہوں۔ شادی کے بعد گھر سے اور تم سے بچ جانے والے مائتم میں پیشکش بنایا کروں گی، اپنی انگریزیشن کی تیاریاں کیا کروں گی اور اگر مجھے لگا کہ مجھے گھر پر رویت ہو رہی ہے، مائتم نہیں گزرے تو میں یہاں رہاں کسی آرٹ اسکول یا کالج میں جاب کر لوں گی۔"

"مگر تمہیں اپنی لندن میں جاب بہت پسند ہے۔ تم صرف اپنی اس بہترین جاب کی وجہ سے لندن چھوڑ کر رہنا نہیں چاہتی تھیں۔" صرف سال کے دو مہینے رہا میں گزارتی ہو۔ اگر وہاں سے اتنی محبت کے باوجود تم لندن میں اپنی جاب چھوڑ کر رہنا نہیں چاہتی تھیں ہو میں تو کیا یہ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی کہ تم میری خاطر اپنی بہت اچھی جاب چھوڑ دو؟"

وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں سینور سکندر، کہ تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں، تمہاری خاطر کچھ۔"

کرنے لیٹ جائیں گے۔ سینے میں جیسے ایک دل نہیں،
بچہ تھا شہیار خان کے۔
شہیار خان بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنر پر
تیک لگا کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے تھے۔

"یہ زیور سکندر کی بیوی کے لیے نکال رہی ہو؟"

شہیار خان سنجیدگی سے ان سے مخاطب ہوئے
تھے۔ سکندر کا نام اور یہ جملہ ان کے لبوں سے سن کر
آمنہ نے سب طرح چونک کر شدید حیرت کے عالم میں
انہیں دیکھا۔ وہ زیور واپس رکھنا بھول گئی تھیں۔
مارے حیرت کے وہ جواب میں فوراً "کچھ بول بھی نہیں
پائیں۔ ایک دو سیکنڈ بعد انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی۔"

"کیا یہ بھرتہ ہوتا کہ تم زیور کو بلا کر کچھ نئے
زیورات خریدیں اسے دینے کے لیے؟"

"یہ سکندر کی وادی، پڑ وادی، ملتی اور میرے
زیورات ہیں۔ مجھے لگا اس چیز سے وہ زیادہ خوش ہو
گا۔"

وہ ابھی تک حیرت کے عالم میں تھیں۔ شہیار خان
انتہائی سنجیدگی سے اپنے مخصوص نئے تلے اور غیر
جذباتی انداز میں گفتگو کر رہے تھے مگر آمنہ تو ان کے
لبوں سے سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کا ذکر سن کر
ہی شاک میں تھیں۔ شہیار خان نے ان کی توجہ میرے
سر ہلایا۔

"فہمک ہے یہ زیور بھی دے دینا۔ مگر کل میں
جیولر کو بھی فون کر دیا گا۔ کچھ نئے زیور بھی خرید
اس کی بیوی کے لیے۔"

شہیار خان پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے۔
انہوں نے نہ تو ادنیٰ کھولا تھا اور نہ ہی آرام کرنے کے لیے
تھے۔ انہیں انداز ہوا کہ وہ ان سے مزید کچھ اور بھی کہنا
چاہتے ہیں۔

"آمنہ! میں تم سے کل کے بارے میں کچھ بات
کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو

انہوں نے وہ جزاؤں نگاہیں جو انہیں منہ
دکھائی میں شہیار خان نے دیے تھے اور اس سے پہلے
شہیار خان کے والد نے ان کی والدہ کو۔ یہ ان کے
خاندانی ایرہست یعنی نگلن تھے۔ یہ انہوں نے نورہ کو
نہیں دیے تھے۔ یہ انہوں نے اپنے سکندر کی دہن
کے لیے سنبھل کر رکھے تھے۔ وہ اپنی ہونے والی ہسو کو
اپنی یہ بہت خاص اور اہم چیز دینا چاہتی تھیں۔ اپنے
اس بیٹے کو وہ بہت کچھ نہیں دے سکی تھیں جو انہیں
دینا چاہیے تھا۔ نگلن کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا ایک
جزا اور اس کی لڑکیوں والی دونوں مالا بھی سکندر کی بیوی کو
دینے کے لیے اچھی لگ رہی تھی۔

وہ زیورات دیکھنے میں مگن تھیں، تب ہی کمرے کا
دروازہ کھلا۔ شہیار خان اندر آئے تھے۔ وہ اسٹڈی میں
تھے۔ آج دفتر سے گھر جلدی آ گئے تھے۔ آنے کے
بعد سے وہ اسٹڈی میں تھے۔ انہوں نے کافی بھی وہیں
سنگولی تھی۔ وہ اسٹڈی میں مٹا لے میں مصروف ہیں
یہی سوچ کر آمنہ یوں زیورات دیکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔
شہیار خان کو اندر آتے دیکھ کر ان کا چہرہ فوراً
سنجیدہ ہو گیا۔ انہوں نے درے مخاطب سے کہنے میں
پوچھا۔

"کچھ چاہیے تھا آپ کو؟"

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے جواب دے کر ہنر پر اپنی
سوئے کی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔

وہ سنجیدگی سے سر جھکا کر زیورات واپس دھند دیتی
میں رکھنے لگیں۔ اپنے جذبات اپنی سوچیں شوہر سے
شیئر کرنے والا ان کا اعتقاد ہی نہیں تھا۔ شوہر سے دیکھ
سکھ کہنے والا ان کا رشتہ ہی نہیں تھا۔ ساری زندگی
شوہر نے فیصلے سنائے تھے۔ انہوں نے سر جھکا کر فیصل
کی بھی۔ سوال کرنے یا دچ پوچھنے کی کبھی جرأت ہی
نہیں کی تھی۔

شہیار خان جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہی ہیں وہ جانے
تھے کہ کل سکندر آنے والا ہے مگر وہ شوہر کے مزاج کو
کبھی نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ اس بارے میں ایک لفظ
بھی کہے بغیر یا توئی دن دیکھنے لگیں گے یا پھر آرام

دیکھا۔ غلام احمد کو بتا دیا اس لڑکی پر ہمارے خاندان کا اچھا تاثر پڑنا چاہیے۔ اسے چاہنا چاہیے کہ وہ کس بڑے خاندان کی ہو بننے جا رہی ہے۔

شہسوار خان کا مغرور و دونوک انداز آمنہ کے دل میں کئی جھٹکے ہوئے سوال اٹھا رہا تھا۔ وہ پوچھنے کی جرات نہ دہتی تھیں ورنہ ضرور پوچھتیں، مگر یہ لہجے میں۔ "اپنے بچے کو گھر سے بے دخل کر کے اسے سرک پر لے جا کر گھرا کر کے آج انہیں اچانک وہ اپنے خاندان کا حصہ کتنے لگا ہے؟ صرف اس اثابن لڑکی اور اس کی فیملی کے سامنے اپنی آن، بان اور خاندانی شوکت بتانے کو۔ وہ لڑکی سکندر کی ماں سے کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں مل کر کہیں ان کے خاندان کو کوئی معمولی خاندان نہ سمجھ بیٹھے۔

بچے کی زندگی تباہ و برباد کر کے بھی کچھ اہم رہا تو خاندان؟ اس کی ایک غلطی کی اسے اتنی کڑی سزا دے ڈالی؟ اس کی زندگی اندھیروں میں و گھل دی۔ اسے برباد کر دیا۔ ان سے آمنہ شہسوار خان سے ان کا بیٹا چھین لیا۔ ماں کی گودا جاؤ دی۔ اور آج بھی چہرے پر کوئی پچھتاوا، کوئی دکھ نہیں؟ فکر ہے تو اپنے خاندانی جاؤ و جلال کی؟

"ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دوں گی۔" کہیں کن کے چہرے پر بکھرے سوال اور شکستیں۔ وہ بڑھ نہ لیں اس خوف سے کہ سر جھکا کر آہستہ سے ہولی نکھیں۔



شام دھل چکی تھی جب وہ دونوں سارا دن گھوم بھر کر اس کے فلیٹ لوٹے تھے۔

"میں نے ابھی تک اپنی پیکنگ نہیں کی ہے۔ تم چاہو تو تھوڑی دیر رست کر لو۔ میں پیکنگ کر لوں گی؟" واپس آنے کے بعد وہ اس سے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم پیکنگ کر دو۔ میں ہم دونوں کے لیے مزے دار سی کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

باہر گھومنے پھرنے میں وہ دونوں رات کو فوجی اسٹاک ہو

"تم نے سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کو ملنے کے لیے کراچی بلایا ہے، تم ان دونوں سے ملنا چاہتی ہو۔ ٹھیک ہے یہ بہت اچھی بات ہے مگر میری رائے میں یہ قطعاً مناسب نہیں ہو گا کہ تم ان دونوں سے ملنے ان کے ہوسل جاؤ یا کہیں اور یا ہر ملو۔ وہ شئی لڑکی جو فارمز بھی ہے کیا سوچے گی ہمارے خاندان کے بارے میں؟ تم ان دونوں کو گھر پر بلاؤ۔ دوسرے کایا رات کا کھانا کھا میں وہ دونوں ہمارے گھر پر۔"

تو بچے کی محبت نے دل میں جوش نہیں مارا تھا۔ خاندانی کان بان نے دل کو بے چین کیا تھا۔ چل بھر کے لیے جو دل خوش قسم ہوا تھا کہ شاید برسوں بعد لوٹنے والے بچے کے لیے باب کا دل گداز ہو گیا ہے "نورا" ہی وہ خوش فہمی دہر رہی تھی۔ انہوں نے افسوس بھری نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔ اگر اللہ کسی کے دل سے غری اور محبت نکال دے تو انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے شہسوار خان۔ چل چاہتا انہیں سمجھوڑیں، پوچھیں کہ کیا دل نام کی کوئی چیز ان کے سینے میں موجود بھی ہے؟ بچے کی زندگی برباد کر دی اور آخر میں فکر رہی تو اپنی بھولی آن بان اور شان کی!"

"وہ گھر نہیں آئے گا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آنے پر اس شرط پر راضی ہوا ہے کہ میں اسے گھر نہیں بلادوں گی۔"

وہ نظرس جھکا کر بظاہر زیورات کو دونوں میں رکھتے محتاط لہجے میں بولی تھیں۔ ایک دوسرے شہسوار خان کا جواب سنائی نہ دیا تو انہوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ان ہی کو دیکھ رہے تھے ان کا چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔

"ٹھیک ہے تو یوں کر لیتے ہیں گان دونوں کو کل ہمارے فارم ہاؤس پر بلاؤ۔ میں غمغورہ اور علی دانا جائیں گے۔ زین نہ جانا چاہیے تو اس کی مرضی ہے۔ میں غلام احمد سے کہہ دیتا ہوں کہ کسی اچھے ہوٹل کو کھانے کا آرڈر کر دے گا۔ تم کھانے میں جو بھی بدشیز رکھو لانا چاہتی ہو یا باہلی کو وغیرہ کرنا چاہتی ہو وہ سب

ان کے لیے میں اس سے ملنے کی رزب تھی بے
قراری تھی۔ وہ ان کی بے قراری کو محسوس کر رہا تھا۔
اس نے انہیں اپنی فلائٹ اور کراچی پہنچنے کا وقت بتا دیا
تھا۔

”یہ چند گھنٹے کسے گزر س گئے سکندر؟ مجھے تو ایک
ایک بل صدیوں کے برابر لگ رہا ہے۔ تم تھوڑے دن
کراچی میں رکو گے تو میں؟ ایسا تو نہیں ہو گا کہ کل
آئے اور برسوں والی ہو؟“

وہ بہت بے چین ہو کر بولی تھیں۔ جیسے برسوں سے
پھڑپھڑے سے گویا کھینے اسے چھوٹے اسے پکار کر کہنے کو
ان کی مانتا بری طرح تڑپ رہی ہو۔
”جی امواجان! میں تھوڑے دن رکوں گا کراچی میں۔
آپ فکر نہ کریں۔“

اس نے تشکر بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی
لیزا کو دیکھا تھا لیزا کے کہنے پر اس نے ایک ہفتے کا
پروگرام بنا دیا تھا۔ ورنہ شاید اس وقت انہیں یہ بنا کر کہ
وہ محض دو یا تین دنوں کے لیے آ رہا ہے۔ وہ ماں کے
دیکھے ہوئے دل کو مزید دکھانے کا باعث بننا۔ لیزا
مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھ سے بہت ساری باتیں کر رہی ہو گے لیے ملو گے ناں؟
مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں بیٹا! انہیں جی
بھر کو دیکھنا ہے۔“

ان کی آواز بوندھ گئی تھی۔ وہ بولتے بولتے ایک دم
یوں چپ ہو گئی تھیں جیسے خود کو روکنے سے روک رہی
ہوں۔

”میں آپ سے بہت ساری باتیں کر رہی ہوں گے لے ملوں گا سو
جان۔ جب تک کراچی میں ہوں گا ہم روز تمہیں گے اور
بہت ساری باتیں کریں گے۔“
وہ ماں کا کرب محسوس کرتے ہوئے رمانیت سے
بولتا تھا۔

کھانکے تھے کہ اب ان دونوں میں سے کسی کا بھی ذرہ کا
ارادہ نہیں تھا۔ واپس آتے ہی لیزا نے شاپنگ بیگ
میں سے دونوں تک اور چابی نکالی تھی۔ اس نے خود ہی
وہ چابی اس کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر سجادی تھی۔ وہ اسے
دیکھ کر ہنسنا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی لے کر کمرے
میں آئی تو کافی دن ہی گول میں تھی جن پر مسٹر اینڈ مسز
سکندر لکھا ہوا تھا۔ اس نے بیڈ پر سوٹ کر کھانا
تھا۔ وہ اس میں اسے کپڑے رکھ رہا تھا۔ اس نے کراچی
میں ہو بل میں روم کی بنگلہ بھی ہمیں سے کراچی تھی۔
لیزا کا اسے پتا تھا کہ وہ اپنے پیارے گھر پر ٹھہرے گی۔

”سیم آئے گی مجھے اس پورٹ لینے یہاں آتے
ہوئے میں نے اسے فون کر کے اپنی فلائٹ اور کراچی
پہنچنے کا وقت بتا دیا تھا۔“ وہ بیڈ کے سامنے رکھے
جوتے پر بیٹھ گئی۔ کافی عرصے کے لیے اس نے بھی
تھوڑی دیر کے لیے پیکنگ کا کام روک دیا تھا۔ وہ لیزا
کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو اپنی بہن کے ذکر پر جگر کاٹھا
تھا۔ وہ بے پروا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سوا بل پر کال آ رہی
تھی۔ یہ اس کی امواجان کی کال تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔ اسے ماں
سے ملنے کی بہت خوشی تھی مگر ساتھ ساتھ دکھ اور ذلت
بھرے کچھ احساسات بھی تھے۔ وہ ماں کے گلے لگانے
چاہتا تھا۔ ایک ماں ہی تھی جس نے اس سے محبت کرنا
بھی نہیں چھوڑی تھی۔ ان کا دل اسے گناہ گار بننے
کے لیے وسیع تھا۔ وہ بیٹے کا گناہ کب کا معاف کر چکی
تھیں۔ یہ اس کی بد نصیبی تھی کہ پوری دنیا میں کوئی
ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہہ دینا کہ سکندر نے وہ
گناہ نہیں کیا تھا۔ اسے بھروسہ اور اعتماد ماں کے پاس
بھی نہ مل سکا تھا مگر یہ کیا کم تھا کہ اس سے محبت کرنی
تھیں اسے دل و جان سے چاہتی تھیں اس کے
انتظار میں دن گن گن کر گزار رہی تھیں وہ اس کی
واپسی کی راہ تک رہی تھیں۔

”کل کس وقت پہنچ رہے ہو بیٹا؟“

”صبح سویرے ان شاء اللہ۔“

”کس فلائٹ سے آ رہے ہو؟“

باقی آئندہ شمارے میں

زین کی زندگی میں ذہن اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرہیز کرنا ہے۔ شہیار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔
 ہیں ان دونوں کی معافی ہو جاتی ہے۔ معافی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی
 سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد
 اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین سکندر سے مزید برکت ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھروالوں کی عدم موجودگی میں
 سکندر ام مریم پر بھاریانہ حملہ کر کے مگر بدقت زین اور شہیار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔
 ام مریم پر بھاریانہ حملہ کرنے پر شہیار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی
 آمنہ شہیار سکندر کو فون کرتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹ بٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ نصیب
 بنانے کے دوران وہ مقامی لڑکے ان دونوں کو ملنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بیٹھا
 ہے۔ لیزا بہت آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر رو م سے پیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر
 دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نئی گوانڈا آ رہی ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے
 نفرت کرنے کے بارے میں سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا بہم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی
 ہے۔

ام مریم زین سے معافی قسم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہیار خان اسے دھکے
 دے کر نکال دیتے ہیں اسوجان رو رو کر انتہا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں وہ بہت جھوٹا ہے مگر شہیار خان ان کی ایک
 نہیں سننے اور سکندر کو اپنی تمام باتوں سے غائب کر کے ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا ہوتا
 رہتا ہے۔

سکندر وہاں چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات یاد کرنا ہے۔

بہم یعنی ام مریم اور لیزا اپنی عقلمند محمود خالد کی سبب ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت خندی اور بد مزاج تھی۔ اپنے شوہر
 باشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے باشم اسے مٹانے کے ہر وقت تین کرنا رہتا ہے۔ سکندر کو وہاں جس ایک لڑکی پر لیزا
 کا دل لگتا ہے مگر وہ لیزا راضی نہیں ہوتی۔ اسے خود بہت جبریت ہونے لگتی ہے۔

سکندر وہاں آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ مگر فیس میں لیزا کی فائنل پر پہنچنا
 ہے لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی انگریز بیٹش کا چملاؤں گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی
 محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے نامی کے بارے میں بتا دیتا ہے کہ اس کا سروانہ و نادر معصوبہ
 دکھا ہے۔ وہ بدآہستہ مجبوس کرنا ہے اور وہ مل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا نامی یاد کرنا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی
 شہید تیرام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے اسے بچانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انہماکی گھٹا الزام
 لگا کر اسے اپنے گھروالوں کی نگاہوں میں دلیل کر دیا۔

ام مریم باشم کی بیوی کو طلاق دوا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر وہی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔

سکندر نے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدی۔ لیزا خالد مجبور کو اور سکندر اموجان کو اپنی شادی کے فیصلے سے آگاہ کرنا ہے
 وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ اموجان سکندر سے ملنے پر اصرار کرتی ہیں۔ وہ وعدہ کر لیتا ہے۔ لیزا کی انگریز بیٹش ختم ہو جاتی
 ہے۔ وہ وہاں میں پورا دن سکندر کے ساتھ گزارتی ہے۔ سکندر اس کو شاپنگ کر دیتا ہے۔ وہاں سے لیزا کے لیے روانہ
 ہوں گے۔ شہیار خان آمنہ بیگم سے لیزا کے لیے زیورات خریدنے کو کہتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

دسویں قسط

اعتراض تھا مگر آج بھی ان کے گھر میں حکم شہریار خان ہی کا چلتا تھا۔ اگر وہ ان کے حکم کے خلاف جا کر اپنی بیوی اور بچے کو روک لیتا تو یقیناً ”شہریار خان سخت غصے اور برہمی کا اظہار کرتے اور اموجان جو برسوں بعد اتنی خوش نظر آدمی تھیں ان کی خوشی دکھ لور آسموں میں بدل جاتی۔ لہذا لورہ لور علی کے کل شہریار خان اور اموجان کے ساتھ فارم ہاؤس جانے پر اس نے خاموشی اور بے نیازی والا رویہ اختیار کر لیا۔

بہت کڑی سچائی تھی یہ مگر تھی سچائی اسے مانی پڑ رہی تھی کہ اس نے پورے بارہ سال بعد اپنی اموجان کو اتنا خوش رکھا تھا۔ اتنا خوش وہ اس کے بارہ رو سے لا واپس کر لینے پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی شادی پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ علی کی پیدائش پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سبب یہ خوشی تھی اس سے اسے جتنی بھی نفرت تھی مگر اپنی ماں کی منی اور لانا کی خوشی اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہاں کے دل کی یہ خوشی اور چرے کی یہ منی سدا قائم دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی اور بچے کو ماں باپ کی خاطر سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے ملنے دے سکے اتنی وسعت وہ کوشش کر کے اپنے اندر پیدا کر چکا تھا۔

سکندر کو نفرت سے سوچتے ہوئے آج پھر اسے ام مرحوم بری طرح یاد آ رہی تھی۔ کہاں ہوگی وہ؟ سکندر شہریار صرف اس کا نہیں وہ ام مرحوم کا بھی مجرم تھا۔ اس کے تصور میں بار بار بارہ سال پہلے کا وہ دن آ رہا تھا جب ام مرحوم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تھی۔

جس کے سبب وہ اس سے جدا ہوئی وہ شخص آنے والی صبح واپس آ رہا تھا۔

وہ دونوں جہاز میں ساتھ بیٹھے تھے جہاز میں بیٹھے ہی سکندر بالکل گم محم اور چپ چپ سا ہو گیا تھا۔ وہ اسے ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی سکندر اس وقت اپنی اموجان کو سوچ رہا ہے۔ وہ آج برسوں

”کراچی سے واپس آ کر ہم نور“ شادی کر لیں گے میں اب تمہیں لندن یا روم واپس نہیں جانے دوں گا۔“

وہ دونوں اریو روٹ جانے کے لیے فلیٹ سے نکل رہے تھے تب وہ لیزا کا ہاتھ تھام کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی شدت تھی۔

”دیکھا میری محبت کا اثر۔ تم بھی رومانٹک ہوتے جا رہے ہو۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تمہارے جیسا رومانٹک میں ابھی بھی نہیں ہوں۔ پرستار نہ ملے گا۔“ کی ٹوہائی ہارٹ والا۔ وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

”یعنی میں یہ سمجھوں کہ تم ہماری شادی والے دن انس جاؤ گے اور مجھے ہنی مون پر بھی نہیں لے کر جاؤ گے؟“ اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورا۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“ وہ لاپرواہی سے شانے کا کر بولا۔

”مگر کے تو دیکھو غم ایسا۔ حشر کروں گی میں تمہارا۔“

”ہونے والے شوہر کی کیا سہی سکتی کی جا رہی ہے“ جان اللہ۔“ وہ اس کی ہونٹوں پر قبضہ لگا کر ہنس پڑا۔

اسے خند نہیں آ رہی تھی۔ تمام دن اس سے اس موضوع پر کسی نے بات نہیں کی تھی پھر بھی وہ جانتا تھا کہ سکندر اموجان سے ملنے کراچی آ رہا ہے۔ اس نے آج شہریار خان کو لورہ سے گفتگو کرتے بھی سنا تھا۔ اب تو کل سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کی فارم ہاؤس پر دعوت کے انتظامات کے حوالے سے کر رہے تھے۔

شہریار خان کو اموجان کی بیماری نے انہیں اس حد تک نواز دیا تھا کہ وہ ان کا دل خوش کرنے کے لیے نامہ کی شکل دیکھنے کو راضی ہو گئے تھے؟ جو بھی ہو کم از کم وہ سکندر کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی بیوی لورہ بچے کے بھی وہاں جانے پر

وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ فجر میں ابھی وقت تھا۔ سوچا تھیں کہ غلامی کو اکر لی جائے۔ وہ بغیر کوئی آہٹ کوئی شور پیدا کیے ہیڈ سے خاموشی سے کھڑی ہو رہی تھیں۔
”کیا ہوا آمنت! غلامی نہیں آ رہی کیا؟“

شہنار خان کی آواز پر وہ چونک کر مڑیں۔ ابھی جاگ رہے تھے۔

”جی۔“ وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکیں کہ روز غم انہیں سوئے نہیں دیتے تھے، آج خوشی میں انہیں غم نہیں آ رہی ہے۔ آج ان کی عید کا دن ہے۔ ان ہاں بیٹے نے جو بن باں کاٹا ہے، آج اس کے ختم ہونے کا دن ہے۔

مختصر سا جی کہہ کر وہ ہاتھ روم کی طرف جانے لگی تھیں، جب شہنار خان کی آواز نے انہیں روک لیا۔
”سکندر کس وقت پہنچ رہا ہے؟“

”پون گھنٹہ باقی ہے۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولیں۔

”کیا ایر پورٹ جانا چاہتی ہو اس سے ملنے؟“ آمنت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وحیرت سے شہنار خان کو دیکھ رہی تھیں۔

”جی، کیا میں چلی جاؤں؟“ انہوں نے محتاط سے لہجے میں اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں چلی جاؤ۔ کراچی صبح سویرے تمہارا ڈرائیور کے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ میں تمہیں لے چلا ہوں۔“ شہنار خان سنجیدگی سے بولتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

وہ بے تحاشا حیران ہوئی تھیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ اور شہنار خان ایر پورٹ جانے کے لیے گھر سے نکل چکے تھے۔ شہنار خان گاڑی چارہ تھے۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے وہ دونوں ایر پورٹ جلدی پہنچ گئے تھے۔

”سکندر! آج شام پانچ منٹ پہنچنا ہے، مجھے فارم ہاؤس آنے کا کہہ دیجئے۔“ ایر پورٹ پہنچ کر وہ ان سے بولے۔

بعد ان سے ملنے والا ہے اس کے دل کی عجیب حالت ہوگی۔ چار سال قبل وہ ان کی شدید بیماری میں ان سے ملا تھا۔ آج وہ نچانے کتنے سارے احساسات ایک ساتھ اپنے دل میں پیدا ہوتے محسوس کر رہا ہوگا۔ اسے اپنا جی اور غم سے بھرنا بھی بھی شدت سے یاد آ رہا ہوگا۔ سکندر کو شاید اس وقت خاموشی اور کار بھی سو اسے خاموشی فراہم کر کے وہ خود سیم کو سوچنے لگی تھی۔

سیم اس سے خفا تھی۔ اس نے روم سے دوبارہ نکلنے سے قبل اسے کل کر کے اپنی کراچی آمد کا نام بتایا تھا۔ اس نے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ فون بھی فوراً ہی بند کر دیا تھا۔ محمود خالد نے یہ جاننے کے لیے کہ کب اور کس فلائٹ سے کراچی پہنچ رہی ہے، فون کیا تو اس نے نام نہیں بتایا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ ابھی اس نے سیٹ بک نہیں کروائی ہے۔ خواہش تھی اسے ایر پورٹ پر لینے صرف اور صرف سیم آئے۔ سیم سے ایر پورٹ پر مل کر پچھوہ محمود خالد کے گھر چلی جائے گی۔

اس روز فون پر وہ محمود خالد کی جذباتی باتوں کے حصار میں آگئی تھی۔ بعد میں روم جا کر جب اس نے سوچا تو اسے لگا کہ سیم ٹھیک کہتی ہے، ان کے بیاہ کو ان بہنوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے آتے ہیں۔ اس سے جذباتی انداز میں باتیں کر کے اسے اس بات کے لیے آمادہ کروا لیا کہ وہ کراچی آکر ان کے پاس ٹھہرے۔ وہ ان کے گھر پر ٹھہرنے کی ضرورت مگر اپنی زندگی کے کسی بھی معاملے میں انہیں آج بھی ایک لفظ نہیں کہنے دے گی۔



وہ بند پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ساری رات ایک پل کے لیے بھی انہوں نے پلکیں تنک نہیں جھپکیں۔ اس وقت سکندر ہوائی جہاز میں ہو گا۔ اور اس کے ساتھ لڑا بھی ہوگی، انہوں نے زیر لب بہت بار اسے یہ نام لیا۔ وقت کاٹنے نہیں کٹ رہا تھا۔ بے قرار ہو کر

کیا اس چھوڑ کر خود تیر قدم اٹھا کر ان تک پہنچا۔
 "اسلام علیکم اموجان۔" آمنہ نے بہت تڑپ کر
 اسے اپنے گلے سے لگایا تھا۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے مجھے میرے بچے
 سے ملوایا۔" وہ اسے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر
 روریزی تھیں۔ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 اس کے گلے لگے ان کا وجود ہولے ہولے کر رہا تھا۔
 ان کا مضبوط اور ڈھٹا جیٹا پیلی پیار اور غم سے نہ حال ماں
 کو سہارا دے کھڑا تھا۔ اس نے لیزا کا اپنے اوپر اموجان
 کیسے اس اگر کھڑا ہونا محسوس کیا تھا۔

"بس اموجان! اس طرح مت روئیں۔ آپ کی
 صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

اس نے پیار سے ان کا سر اپنے کندھے پر سے
 ہٹایا۔ ماں کے آنسوؤں سے اس کا ستانہ جھلک چکا تھا۔
 وہ ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا۔

"میں آٹو گیا ہوں آپ کے پاس۔ اب آپ کیوں
 رو رہی ہیں؟" اس نے پیار سے ماں کے ہاتھ تھام کر
 کہا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں بیٹا! یہ شکرگزاری کے
 آنسو ہیں۔" آمنہ نے والمانہ انداز میں اس کا ہاتھ
 چوما۔ وہ لگتی باندھے اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی
 تھیں۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی
 تھیں۔

"اموجان! آپ لیزا سے تو ملی نہیں۔" اس نے
 مسکرا کر اسے ساتھ کھڑی لیزا کی جانب اشارہ کیا۔ آمنہ
 نے لب پہلی بار لیزا کو توجہ سے دیکھا تھا۔

"السلام علیکم آئی! لیزا نے فوراً انہیں سلام
 کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" لیزا کا سلام اگر
 چٹکی ہٹ اور تکلف لیے ہوا تھا تو آمنہ کا جواب اتنی ہی
 بے تکلفی اور والہانہ پیار لے ہوا تھا۔ انہوں نے لیزا کو
 بھی اسی طرح گلے لگایا تھا۔ خاصوش کہ لیزا کو
 گلے لگاتے اور پھر اس کا ہاتھ پتے دیکھ رہا تھا۔

"اسٹی نہیں! ماں ہوں تمہاری! جیسے سکندر کی

"جی۔ آپ بھی آ رہے ہیں کیا؟" آمنہ نے
 ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ شہیار خان نے گاڑی پارکنگ
 میں لے جا کر روکی۔
 "نہیں غم مل آؤ۔ میں تمہارا نہیں انتظار کر رہا
 ہوں۔"

ابھی روکشی نہیں ہوئی تھی۔ ارد گرد اندھیرے کے
 سبب وہ شہیار خان کے تاثرات ٹھیک سے دیکھ نہیں پا
 رہی تھیں۔ وہ سنجیدہ تو تھے مگر سنجیدگی کے ساتھ کچھ
 اور بھی تھا ان کے لہجے میں مدد سمجھ نہیں پائی تھیں۔
 سر ہلا کر خوشی سے سرشار وہ گاڑی سے اتر گئیں۔
 سامنے ہی انٹرچینل ارا سیل نظر آ رہا تھا۔ بس کسی بھی
 لمحے ان کا سکندر ان کی نگاہوں کے سامنے ہو گا۔ وہ دل
 ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگ رہی تھیں۔

"یا اللہ! جیسے خیریت سے میرے سکندر سے ملا
 دے۔" سامنے سے مسافر لیاں چلاتے باہر نکلے نظر
 آ رہے تھے۔

وہ جو سامنے سے اس طرف آتا نظر آ رہا ہے۔ وہ ان
 کا سکندر ہی ہے۔ خوب صورت بوجہ۔ بھرپور توانا مرو
 ان کا پیلا۔ ان کا دل فخر اور خوشی سے بھر گیا۔ انہوں
 نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ نظری کا دعا پڑھ کر دور
 سے اس پر دم کی۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں
 رہی تھیں۔ اس کے ساتھ چلتی لڑکی کو انہوں نے ابھی
 تک توجہ سے دیکھا نہیں تھا۔ ان کا دل تیز تیز ہڑک
 رہا تھا۔ خوشی اتنی کہ سنبھالنے نہیں سنبھل رہی
 تھی۔

سکندر ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ ان کا بیباں
 سے لینے ان کے پاس آ چکا ہے۔ ایک پل انہیں خوشی
 سنبھالنے میں لگا تھا۔

انگلے پل دو دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی تھیں۔



سکندر نے اموجان کو دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی
 اس نے انہیں آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے
 والمانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ٹہلی لیزا

ہے۔

انہوں نے پرس سے ایک تہہ کی ہوئی چٹ نکال کر لیزا کے ہاتھ میں پکڑالی۔

"امو جان! دعوت وغیرہ کو رہنے دیں۔ میں اور لیزا اس کے بغیر ہی آپ سے مل لیں گے۔" وہ واضح اور صاف لفظوں میں منع نہیں کر پاتا تھا۔

فارم ہاؤس پر کون وے رہا تھا۔ دعوت؟ وہاں پر کس کس نے موجود ہونا تھا؟ وہ سب جانتا تھا مگر وہ کسی سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ کسی کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں تم سے نہیں اپنی ہو سے بات کر رہی ہوں۔" آمنہ نے فوراً ہی اسے سخت انداز میں ڈانٹ کر چپ کر دیا تھا۔

اب انہوں نے اس کے ہاتھ چھو کر بہت پیار سے لیزا کے ہاتھ تھامے تھے۔

"تمہاری سنسا یہ؟"

"جی! لیزا ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ کر جس پر واضح لفظوں میں کسی بھی دعوت اور فارم ہاؤس پر جانے سے انکار لکھا تھا۔ آمنہ سے قدرے ہلکا کر بولی۔ وہ جیسے الجھن میں آگئی تھی کہ ماں کی سنے یا بیٹے کی طرف دیکھے۔

"تو پھر توج شام اسے ساتھ لے کر ہمارے فارم ہاؤس آجائے۔ میں تم دونوں کا شدت سے انتظار کروں گی۔" وہ بڑی امید سے لیزا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں اور سکندر توج شام آپ کے پاس ضرور آئیں گے امو جان! لیزا نے بے اختیار انہیں یقین دلایا۔

"وعدہ کر رہی ہوں؟"

"میں آپ سے وعدہ کر رہی ہوں امو جان۔"

"مجھے مایوس مت کرنا۔ برسوں بعد مجھے کوئی خوشی ملی ہے۔ اس خوشی کو مایوسی میں مت بدلانا۔ میں بہت شدت سے شکر ہوں گی تم دونوں کی۔"

"امو جان! ہم دونوں آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔" لیزا پر یقین لہجے میں محبت سے بولی۔

ہوں۔ مجھے امو جان بولو گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔" وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں لیزا کے چہرے کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

"جی امو جان! لیزا کی ہچکچاہٹ اور ٹکلفہ آمنہ کی وہ المانہ محبت کے آگے ہسکراہٹ اور اپنائیت میں چند لمحوں میں بدل گئی تھی۔

"سکندر! میری بہت پیاری ہے۔ لیزا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا۔

وہ بے ساختہ ہسکراہٹ لیزا کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی وہ اس کی ماں کو یونہی چھی لگتی کہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔

"آپ کس کے ساتھ آئی ہیں امو جان؟" اسے ایک وہمی خیال آیا۔

"تمہارے پیلا کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" آمنہ ہسکری سے بولیں۔ تمہارے پیلا کے الفاظ اسے بہت عجیب سے لگے تھے۔ وہ حقیقت اسے برے لگے تھے مگر برسوں بعد ماں سے ملنے پر وہ خوشی کے موقع پر کوئی بد مزگی والی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اب چلوں۔" اس کے چہرے کو پیار سے مسکتے ہوئے وہ بولیں۔ انہوں نے پھر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

جانے کی بات کر رہی تھیں اور اس کے ہاتھ تھام کر نکھڑی تھیں۔ جیسے بارہا اگر اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پھر کہیں کھری جائے گا۔

"جی امو جان! آپ اب گھر جا کر آرام ہیجیے۔ تھوڑا دنا نکل آئے پھر ہم دوبارہ ملیں گے کہیں ساتھ بیٹھ کر خوب ڈھیر سمری باتیں کریں گے۔" اس نے دیکھا آمنہ اس کی بات سن کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔ ایک بل کی سوچ کے بعد انہوں نے سکندر کے بجائے لیزا کو مخاطب کیا۔

"لیزا بیٹا! تمہاری اور سکندر کی توج شام میری طرف سے دعوت ہے ہمارے فارم ہاؤس پر۔ شہر کی حدود سے ذرا باہر نکل کر ہے ہمارا فارم ہاؤس۔ اس لیے گھر سے تھوڑا جلدی نکل جانا۔ یہ وہاں کا ایڈریس

تھا۔ "لیزا نے ارد گرد ہر طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔
"تم فون کرلو۔" لیزا سراپا میں ہلا کر نورانی اپنی
ہنس کو فون ملانے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" کئی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی
جب لیزا کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا تب اس نے
پوچھا۔

"تیل جاری ہے۔ مگر سیم کل ریسیو نہیں کر رہی۔
اس کے لینڈ لائن نمبر پر بھی کل ریسیو نہیں ہو رہی۔"
اس نے دیکھا لیزا کے چہرے پر یو سی آئی تھی۔

"ہو سکتا ہے کسی کی آنکھ نہ کھلی ہو۔" اس نے لیزا
کو تسلی دینی چاہی۔

"میرے آنے پر اس کی آنکھ نہ کھلی ہو؟ تمہیں پتا
ہے سکندر! سیم مجھ سے کنٹریا کر رہی ہے۔ میں زندگی
میں پہلی بار پاکستان آئی ہوں۔ میرا آنا سیم کے لیے اتنا
معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا کہ وہ سوئی رہ جائے۔" وہ
تدریسے خفگی سے بولی۔

"لیکن اب تم اس طرح یہاں کھڑی تو نہیں رہ
سکتیں ناں۔ چلو میں ہوٹل جاتے ہوئے پہلے تمہیں
تمہارے پیپا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ وہاں جا کر تمہارا
کر لینا کہ سیم تمہیں لینے کیوں نہیں پہنچ سکتی۔"

سکندر رومانیت سے بولا۔ لیزا نے جواباً سرانبات
میں ملا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا لیزا کے چہرے پر یو سی
پھیل گئی ہے۔ وہ اپنی ہنس کے ایریورٹ نہ آنے پر
دکھی ہو گئی تھی۔



سکندر نے کیب کر لی تھی۔ اس نے پہلے اسے اس
کے پیپا کے گھر ڈراپ کیا، وہ خود اپنے ہوٹل چلا گیا۔
چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھولا۔ وہی اسے لاؤنج
تک چھوڑ کر بھی چلا گیا اور اسی نے انٹرکام پر محمود خاور
کو اس کی آمد کی اطلاع دی تھی کہ اتنی صبح ابھی وہاں نہ
گھر کا کوئی فرزند موجود تھا نہ ہی کوئی ملازم۔

"میری بیٹی! آئی ہے۔" محمود خالد اور ان کے چچے
عائشہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پاس آ رہے

"جیتی رہو بیٹا! اللہ تمہارے وجود سے میرے سینے
کے گھر کو سدا سجائے رکھے۔ تم دونوں کا باہمن
خوشیوں سے بھر دے۔"

وہ ایک بار پھر اٹھانے انداز میں لیزا کو پیار کر رہی
تھیں۔ آنکھوں میں نمی لیے وہ التجا کرتی نظروں سے
سکندر کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے بے اختیار اسے بھر
گلے لگا لیا تھا۔

لن کی پُرم نمی آنکھیں بے آواز اس سے مخاطب
تھیں۔ نہ ناں ایک لفظ بولی تھی نہ جواب میں اس نے
کچھ کہا تھا۔ بس نگاہیں نگاہوں سے مخاطب تھیں۔
اپنا دروازہ کرب ایک دوسرے کو بتا رہی تھیں۔

"میں چلتی ہوں۔" چند سیکنڈ بعد خود پر قابو پا کر وہ
گلوگیر لہجے میں بولیں۔

وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ لیزا انہیں خدا حافظ کہہ رہی
تھی۔ وہ واپس لیٹ گئی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت
تھا۔ لیزا اس کے ساتھ کھڑی خاموشی سے دیکھ رہی
تھی۔

"آٹم سو ری سکندر! میں جانتی ہوں تم اموجان کی
دعوت ایکسیپٹ نہیں کرنا چاہتے تھے مگر وہ جس طرح
کہہ رہی تھیں، انہیں انکار کرنے کے لیے پتھر کا دل
چاہیے تھا۔ وہ بہت دھچی ہیں سکندر! لن کا دل خوش
کرتے کے لیے یہاں تک آ گئے ہو تو اب وہ جہاں بلا
رہی ہیں، صرف ان کا دل خوش کرنے کے لیے وہاں
بھی چلو۔ اگر ہم نہیں گئے تو ان کا دل بہت دکھے گا۔ ہم
نہیں گئے تو وہ کتنا درد میں گئی۔"

لیزا نے اس سے آنکھیں اور نرمی سے کہا۔ وہ پھیکے
سے انداز میں سر ہلا کر مسکرایا۔

"ہم شام میں جیل ریسے ہیں ناں؟" لیزا نے امید
سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ ایک تھکی ہوئی لمبی سانس لے کر بولا۔
"سیم نہیں آئی تھیں لینے؟ تم نے کہا تھا انہیں
لینے آنے دلی ہے۔" اس نے یک دم ہی موضوع
تبدیل کر دیا۔

"ہاں پتا نہیں کیوں اب تک تو اسے آجانا چاہیے

تھے۔ وہ ان دونوں کو آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ باپ کے گھر آئی تھی مگر دل میں ایسا لگ نہیں رہا تھا کہ اپنے باپ کے گھر ہے۔

محمود خالد کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری تھی۔ اس کے پاس آتے ہی انہوں نے محبت سے اسے گلے لگایا۔

”السلام علیکم یاربنا۔“

”وعلیکم السلام۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں اپنے آگے؟ میں تمہیں ایرویزٹ لئے آتا۔“

اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ جواباً ”چپ رہنا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنی آمد کا فون پر نہ جانے کی کیا توقع دے۔ باپ کی بے تحاشا خوشی اسے مصنوعی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے ان کی آنکھوں میں غمی نظر آ رہی تھی۔ اسے ہلکی سی اندامت ہوئی۔“

”خیر تم آئیں کلثوم! میرے لیے تو یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ آج کتنے سالوں بعد میں اپنی بیٹی کو دیکھ رہا ہوں۔“ انہوں نے جیسے اس کی اندامت محسوس کر لی تھی۔ اس لیے فوراً ہی مسکرا کر خوشی سے بھرپور انداز میں بولے۔ عائشہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کیسی ہیں آئی؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جیسا ہے، محمود بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کل رات بھی دیر تک مجھ سے تمہاری ہی باتیں کرتے رہے۔ صبح صبح اچانک پہنچ کر تم نے ہمیں بڑا دردست سر پر اندر دیا ہے۔“

اس کے دل میں جانا کد امت کا احساس محمود خالد اور عائشہ دونوں نے فوراً ہی اندر کر دیا تھا۔

”عائشہ! باتیں وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں کلثوم کو اس کا کرا دکھا دوں۔“ محمود خالد اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔ عائشہ نے مسکرا کر سر اٹھاتے میں ہلکا سا

”آؤ بیٹا! انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر بیڑیوں پر چڑھنے لگے۔

”تمہارا اسلام میں ابھی کمرے میں رکھوا دیں گے۔“ وہ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے بولے۔ فون پر بات کرتے ہوئے جذبات کو سرور کر لینا، سرور و سیاحت انداز اختیار کر لینا، مختلف بات تھی۔ آئے سارے ان کی والہانہ چاہت کے اظہار کے سامنے وہ سمجھ نہیں رہی تھی کہ اپنا سرور انداز کس طرح برقرار رکھے؟

”جب میں نے یہ گھر خریدا تھا۔ تب ہی یہ کرا تمہارے لیے منتخب کر کے اسے تمہارے لیے سجایا تھا۔ میں نے سوچا تھا میری آرٹسٹ بیٹی کے لیے یہی کرا ہونا چاہیے۔ یہ دیکھو! یہاں کھڑکی سے باہر ہمارے لان کا کتنا خوب صورت منظر نظر آ رہا ہے۔“

اس سے بولتے ہوئے انہوں نے کھڑکی پر سے پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کی کھلتے ہی لان کا سرسبز اور خوب صورت منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ لان میں لگے خوب صورت پھول، پودے، درخت، گھاس اور سب سے بڑھ کر لان کے پتوں پر چنے ہوئے نوارے سے گر رہی پانی بہت خوب صورت منظر تھا۔ مگر وہ اس منظر کو نہیں دہ اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

”خوب صورت لگ رہا ہے نا یہاں سے لان کا ویو۔“ محمود خالد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی! باپ سے باتیں کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ان سے کیا کہے۔“

”ایک چیز اور بھی ہے تمہارے لیے۔ دکھاؤں؟“ وہ مسکرا کر بولے۔ انداز میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

”جی ہاں! دکھائیے۔“

”تم ابھی تھکی ہوئی ہو۔ سوچ رہی ہو گی بیٹا! بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں مگر میرا دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں تمہارے کمرے کے ساتھ ساتھ تمہارا اسٹوڈیو بھی دکھاؤں۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑکی کے پاس سے بٹے تھے۔ اس کے کمرے کی دایں دیوار میں ایک خوب صورت دروازہ تھا۔ محمود خالد نے اس دروازے کو کھولا اور اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے تھے۔

اب وہ جس کمرے میں تھے وہ اس کے بیڑ روم

جوناہ" سوائے سر اثبات میں ہلانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔



”تم مجھے سکندر سے کب ملواری ہو؟“ کرا اور اسٹوڈیو دیکھنے کے بعد وہ شاد لینے چلی گئی تھی۔ نما کر فریش ہونے کے بعد نیچے آئی تو ناشتے کی میز پر محمود خالد اور عائشہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سکندر کا نام یاد رکھے جانے اور اس کا نام اتنی محبت سے لیے جانے پر حیران ہوئی تھی۔

”سکندر کو باپ سے ملوانے پاکستان نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کی ماں سے ملنے پاکستان آئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ساری سوچیں آ رہی تھیں۔“

”سکندر سے محبت میں نہیں ملنا چاہتے۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی کروانے کے لیے کچھ بیان کر رہے ہیں۔ سیم کے ساتھ بھی تو انہوں نے کئی کیا تھا۔ یہ محبت صرف ایک دکھاوا ہے۔ مگر دکھاوا ہے تو اتنی سچی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔“

”آج شام مجھے اس کے پیرئٹس سے ملنے جانا ہے۔ وہ مجھے پک کرنے آئے گا۔ میں اس سے کہوں گی کہ تم فوراً جلدی آجائے۔ پھر آپ اس سے مل لیجئے گا۔“ اس کے ذہن میں جو بھی سوچیں آ رہی تھیں مگر وہ لاکھ کو شش کے باوجود بھی باپ کو کوئی تلخ جواب نہیں دے سکی۔

”میں تمہارے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں بیٹا۔ مجھے یقین ہے تم نے ایک اچھے لڑکے کا انتخاب کیا ہو گا۔“ وہ اس سے چارے سے بولے تھے۔ عائشہ ان دونوں کے آگے چائے رکھ رہی تھیں۔

”محمود بہت خوش ہیں تمہاری شادی کا سن کر۔ بلکہ ہم دونوں یہ دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ سکندر کی فیملی بھی اگر کراچی ہی میں ہے تو پھر محمودوں میں ہی شادی کر لوں۔“ عائشہ اس سے بولی تھیں۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔ سکندر کے اپنی فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ کچھ اختلافات ہیں۔“

سے بھی کچھ برا کرا تھا۔ اس کا فرض لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ وہاں میز بھی تھی، صوفے بھی تھے، ٹرانکس جیڑ بھی تھی۔ کب شیف بھی تھا۔ مختلف طرح کے آرٹ بھی تھے، رنگ بھی تھے۔ پینٹنگ بنانے سے متعلق ایسا میز پر سلیجے رہے رکھی تھیں۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز توڑیاں تھیں۔ کب شیف میں مصوری اور آرٹ سے متعلق قیمتی کتابوں کا کیکشن بھی تھا۔

”یہاں کا انٹیریر میں نے ایک آرکیٹیکٹ سے کروایا تھا۔ مجھے خود تو پینٹنگ کی اے لی سی بھی نہیں آتی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا آرٹسٹ لوگوں کے اسٹوڈیو کیسے ہوتے ہیں۔ اب جب تک تم یہاں ہو، پینٹنگ کرنے کا دل چاہے تو یہاں آکر کام کرنا۔“

ان کے چہرے پر یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اسے یہاں پر کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے آرٹسٹ بننے کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے کے بعد اس کے آرٹسٹ ہونے پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کھانا تھا۔ وہ چپ چاپ تو کھری نہیں رو سکتی تھی۔

”بہت خوب صورت اسٹوڈیو ہے۔ نہینکس یا!“

”تمہیں پسند آگیا۔ میری محنت وصول ہو گئی۔ سناج سال سے میں منتظر تھا کہ تم آؤ اور اپنا یہ اسٹوڈیو دیکھو۔“

ان کا انداز اسے شرمندہ کروانے والا یا یہ بتانے والا مرکز نہیں تھا کہ وہ باپ سے ضد باندھ کر ان کے لاکھ بنانے پر بھی پچھلے پانچ سالوں میں بھی ایک بار بھی ان سے نہیں ملی تھی۔ وہ بس پیسے اسے ایک بہت چارہ ہے تھے۔ شرمندہ وہ خود ہی ہو رہی تھی۔ اسے شرمندگی کیوں ہو رہی تھی؟

”میں تمہارے آنے سے بہت خوش ہوں کلثوم! اب شادی کے بعد بھی میرے پاس کراچی آئی جانی رہنا۔ تمہاری تو ہونے والی سسرال بھی کراچی ہی میں ہے۔“

وہ محبت بھرے انداز میں اس سے بولے تھے۔

مست ہو۔ میرے گھر آجاؤ۔ میں ڈرائیور کو بھیجوں کیا؟
سیم کے لہجے کی خشکی اور ناراضی اب پھر اس کی فکر
اور محبت میں بدل چکی تھی۔

”میں پیلا کے ڈرائیور کے ساتھ ہمارے گھر
آجاؤں گی سیم اگر ابھی نہیں۔ آج وہ سہرے مجھے سکندر کو
پیلا سے ملوانے اور پھر شام میں مجھے خود سکندر کی فیملی
سے ملنے جانا ہے۔ میں کل آجاؤں گی۔“
وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر محتاط سے انداز میں بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“ سیم
ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
”ٹھیک ہے تو میں تم سے پھر بات کہوں گی۔ بائے۔“

سیم نے سنجیدہ ہی انداز میں فوراً سنون بند کر دیا تھا۔
فون رکھنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بیٹھ کر سوچنے لگی
تھی کہ آج سکندر کی فیملی سے ملنے اور سکندر کو محمود
خالد سے ملوانے کے بعد وہ سیم کے گھر ہی چلی جائے۔
کراچی آنے سے قبل اس نے سیم کے گھر پر نہ رکنے
کے حوالے سے باپ سے کیا وعدہ کیا تھا سیم کی آواز
سننے ہی اسے بھول گیا تھا۔

شاید اسے سیم کے گھر پر جانے سے منع کرنا اس
کے پیلا کی کوئی سازش ہی تھی۔ ان دونوں بہنوں کو
یہاں پر ایک دوسرے سے دور رکھوانے کے لیے تاکہ
جب وہ اس کی اور سکندر کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے
کی کوشش کریں تب سیم اس کی مدد کر سکے۔
وہ کل صبح ہی سیم کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے
سوچا سازش، پلاننگ، دھوکا اور جھوٹی محبت سے اسے
بھٹکے ہوئے تھے تھی۔

محمود خاندان کی خواہش تھی کہ سکندر آج ان لوگوں
کے ساتھ لہج کرے مگر اس نے خود سکندر کو لہج کی
دعوت نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی سکندر اس
کے پیلا سے بہت زیادہ دیر کے لیے ملے اس سے فون

اس کے اپنے والد کو بھائی کے ساتھ۔ وہ یہاں صرف
اپنی والدہ سے ملنے آیا ہے۔ ”وہ جو بابا“ سنجیدگی سے
بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ تم بس مجھے سکندر سے ملواند
تمہاری شادی یہاں پر بھی ہوگی نہیں اور عاتقہ وہاں
ضرور آئیں گے۔ میری بیٹی باپ کے ہوتے ہوئے
باپ کی دعاؤں کے بغیر تو رخصت ہرگز نہیں ہوگی۔“
اس کی سنجیدگی اور دو ٹوک سے انداز کے جواب
میں محمود خاندان پر اور نرمی سے بولے تھے۔

”بچہ تمہیں تم؟“ ناشتے کے بعد کمرے میں آکر اس
نے سیم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ اس بار اس کی کلر ریسیو
کر لی گئی تھی۔ وہ رخ سے لہجے میں اس سے بولی تھی۔
”تم مجھے لینے ایرپورٹ کیوں نہیں آئیں سیم؟“ وہ
جانتی تھی اس کی سکندر سے شادی اور پاکستان آنے کی
بات پر سیم اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ اس نے غصے
میں پچھلی دونوں بار اس کی فون کالز بند کر دی تھیں۔

وہ جانتی تھی سیم اس کی محبت میں اس پر غصا ہوتا
تھی اسے اس کی ہر وقت فکر جو بہت رہتی تھی۔ اسے
یقین تھا اس کے آنے پر وہ رک نہیں پائے گی اپنی
ساری ناراضی بھلا کر وہ بھائی بھائی کے پاس
ایرپورٹ چلی آئے گی۔ چاہے ابھی لاکھ ناراضی ظاہر
کر رہی ہے۔ مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ سیم اس سے
واقعی بڑی سنجیدگی سے غصا تھی۔

”اس لیے کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ مجھے غم پر
بہت غصہ ہے تو۔“ وہ خشکی سے بولی۔
”سیم بلے اب مجھ سے خلاص ہو۔“

”تمہاری بہن تو فی پر غصا بھی بند ہوں؟ تمہارا کو جانتی
نہیں ہو تو۔ تم ابھی تک بہت سادہ ہو۔ تمہیں پتا نہیں
ہے وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں تمہارے ساتھ۔“

وہ سیم کی بات پر چپ ہو گئی تھی۔ وہ نہ باپ کی
حمایت میں کچھ کہہ پاتی تھی نہ مخالفت میں۔
”اب پاکستان آئی، بچی ہو تو کم از کم پیلا کے گھر پر تو

گیر شوہر نہیں تھا کہ زورہ کو اس سے ہٹ کرنے کے لیے پہلے اجازت لینی پڑے لفظ سوچنے پڑیں۔ ان دونوں کا تو بڑا ہی دوستانہ اور سہارا بھرا تعلق تھا جس میں ایک دوسرے کے لیے عزت بھی تھی اور محبت بھی۔ پھر آج زورہ کو کیا ہوا تھا؟ وہ کتنا فحاشی نگاہوں سے اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟
”کونویرہ!“

وہ کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکا تھا جب دل ماضی کی بھول بھلیوں میں پھر سے گھویا ہوا تھا تو لبوں پر مسکراہٹ کہاں سے آئی۔

”زین! یلیز! مجھ سے شکایت نہ کیے گا۔ میری بات ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کیجئے گا۔“
وہ خاموشی سے اسے دیکھا گیا۔

”بارہ سال پہلے آپ کے گھر میں کیا ہوا تھا؟ میں نہیں جانتی مگر جو کچھ بھی ہوا تھا اور چاہے وہ جتنا بھی برا ہوا تھا مگر اسے گزرے بارہ سال گزر چکے ہیں زین! اتنے سالوں میں دنیا بدل گئی ہے زندگی بدل گئی ہے۔“
”تم کیا کہنا چاہتی ہو زورہ؟“ اس بار اس کا لہجہ ٹھوڑا سخت تھا۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب آپ بھی خود کو تھوڑا تبدیل کیجیے۔ اپنے دل میں وسعت پیدا کیجیے۔ صلہ رحمی اللہ کو پسند ہے۔ کیا اللہ ہمارے بڑے بڑے گناہوں کو معاف نہیں کر دیتا؟ تو ہم اس کے بندے اس کی پسندیدہ ترین صفت کو کیوں نہیں اپنا سکتے؟“

وہ خرم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ وہ ایک دہی غصے سے لب لباب بند کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور غصہ آ گیا تھا۔ وہ خاموش صرف اس لیے تھا کہ وہ اس موضوع پر زورہ سے ایک لفظ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

”آپ کو پتا ہے زین! میں نے آج کی یہ دعوت کیوں رکھی ہے؟“ اسے خاموش دیکھ کر زورہ نے پوچھا۔
”امو جان کی وجہ سے۔“ امو جان سکندر بھائی کے کہنے پر بہت خوش ہیں۔ میں نے کل جنت مجھے فارم ہاؤس کی دعوت کا بتایا تھا۔ تب انہوں نے کہا تھا کہ

کر کے اس نے بس یہ کہا تھا کہ اسے پک کرنے تھوڑا پہلے آجائے گا کہ اس کے پیلا سے بھی مل سکے اس نے محمود خالد کو یہ بتایا تھا کہ سکندر سال پرانے نہیں کرے گا۔ کچھ دیر سے کیے گا کیونکہ وہ بہت بڑی ہے تو انہوں نے عاتشہ سے چائے کے ساتھ بھرپور نسیم کے ریفریشنٹ کا کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے ہونے والے داماد کے پہلی بار گھر آنے پر بہت پر جوش تھے۔



اس کی امو جان کی خوشی سے چمکتی تواؤز آج اسے برسوں بعد سنائی دے رہی ہے۔ مگر۔۔۔ وہ اس سب سے لائق تھی کہ اسے کمرے میں میز کے آگے لیپ ٹاپ رکھ کر بیٹھا تھا۔

”غلام احمد! اگر میں میں مٹھایاں رکھوا دی تھیں؟“ اس کے کان میں پھر اپنی امو جان کی خوشی سے کھنکھتی تواؤز آئی تھی۔ اس نے خود کو پہلے سے بھی زیادہ لائق تھی کہ اس نے کچھ سندی نہیں ہے۔

”کیا کر رہے ہیں؟“ زورہ کمرے میں آئی تھی۔ سب لوگ گھر سے جلدی نکل رہے تھے۔ غالباً اس کی امو جان دعوت کا سارا انتظام اپنی مگرانی میں کر دینا چاہتی تھیں۔ گاڑیوں میں سالن رکھوایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد سب کو تیار ہو کر گھر سے نکل جانا تھا۔ زورہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”آفس کا کام تھا تھوڑا۔“ وہ سر اٹھائے بغیر لاپرواہی سے بولا۔

زورہ نے آج صبح اس سے امو جان اور پیلا کے ساتھ فارم ہاؤس جانے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے بغیر کوئی لمبی بات کیے صرف ایک ہاں کہہ کر اسے اور علی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔

”نہیں کوئی کام ہے؟“ اس نے سر اٹھا کر زورہ سے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ بہت سوچ کر محتاط سے انداز میں بولی۔

وہ اپنے پیلا کی طرح کا حاکمہ مزاج رکھنے والا سخت

نظروں میں دوڑ رہا تھا، تھی تھی شکایت تھی اُسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہیں یہ بے بسی تھی۔
 اپنی جگہ میں سا کھڑا تھا آمنہ وہاں سے جا چکی تھیں۔
 ”دیکھی آپ نے اسو جان کے چہرے کی خوشی؟
 آج اس خوشی کو مکمل ہوئے دس دین! آج اس خوشی میں غم کا کاسا بھی ٹکس نہ پڑے گا۔“
 اس نے اپنے ساتھ کھڑی نورہ کی آواز سنی۔ وہ گردن اٹھا کر نورہ کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہاں سے نظر ملنے کے لمحے کے حصار میں تھا۔

”ہم خود بھی والدین ہیں دس دین! ذرا سوچیں اگر علی چند دنوں کے لیے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ اسو جان آج بارہ سالوں بعد اپنے جدا ہوئے بیٹے سے ملنے والی ہیں! تب ان کی خوشی میں دکھ کا یہ احساس شامل نہ ہوتا دس کہ برسوں بعد ایک کھویا بیٹا واپس ملا ہے تو دس سراپنا ساتھ نہیں۔ ان کے بیمار اور کمزور دودو کو آج پوری طرح خوش ہو لینے دس۔ اپنی ساری فیملی کو اکٹھا دیکھنے کی خوشی انہیں حاصل کر گئے دس دین!“
 آخر میں اگر نورہ کا لہجہ اٹھائیے سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”تم تیار ہو جاؤ نورہ! تم لوگوں کو دیر ہو جائے گی۔“
 بغیر اسے دیکھے وہ سبیدگی سے بولا۔ اس کے جواب نے نورہ کے چہرے پر گہری بایوسی پھیلا دی تھی۔
 وہ مزید کچھ کہنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔



وہ وہی گلابی فراک پہن کر تیار ہو چکی تھی جو سکندر نے لستہ دہائے دہائی کی تھی۔ سکندر تین بجے ان کے گھر آیا تھا۔ محمود خالد نے اس کی آمد کی اہمیت اور خصوصیت کو کیدار کو بتا رکھی تھی۔ اسی لیے جیسے ہی وہ آیا جو کیدار نے اسی لمحے انہیں اطلاع دی۔ اس سے بھی پہلے محمود خالد صوفے پر بے لگتے تھے۔ وہ سکندر کے استقبال کے لیے گیت تک جا رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آئی تھی۔

انہوں نے برسوں بعد انہیں اس طرح خوش دیکھا ہے اور وہ انہیں پوری طرح خوش ہونے کا موقع دینا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے سکندر بھائی اور ان کی ہونے والی بیوی کی دعوت نہ کی ہے۔ ملا آپ سے کم تو خفا نہیں سکندر بھائی سے۔ جب وہ اسو جان کی خوشی اور ان کی صحت کے لیے اپنا غصہ اور ناراضی پس پشت ڈال سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں۔ وہ بارہ سال بعد اپنے سب گھر والوں کو ایک ساتھ، ایک ہی جگہ پر موجود دیکھیں گی۔ یہ خوشی ان کی صحت پر کتنا اچھا اثر ڈالے گی دین!“

سن لینے کے باوجود نورہ کی باتیں نہ سننے کا سا تاثر دینا کمرے سے جانے لگا تھا۔

”دین! میری بات کا جواب تو دے دیں۔“ نورہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ نورہ کو جواب دے بغیر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے سامنے اسو جان نظر آئی تھیں۔ ان کا ہاتھ یوں اٹھا ہوا تھا گویا وہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دینے والی تھیں۔

پلی بھر کے لیے اس کی اپنی ماں سے لگا ہیں ملی تھیں۔ ان نگاہوں میں شکوہ تھا۔ اس پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد آمنہ پیچھے کھڑی نورہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”نورہ! میں تم سے یہ کہنے آئی تھی بیٹا تیار ہو جاؤ۔ علی کو بھی تیار کر دو۔ آؤ مجھے گھٹے بعد ہمیں کھانا ہے۔“

برسوں بعد اس نے اپنی ماں کو پلی سے تیار ہوا دیکھا تھا۔ انہوں نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ جیولری بھی پہن رکھی تھی اور ہونٹوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل بھی تھا۔ وہ برسوں بعد اتنی خوب صورت اور خوش لگ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے اسو جان! نورہ ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ آمنہ وہاں سے واپس پلٹنے لگی تھیں۔ صرف ایک مل! بس ایک مل کے لیے اس کی نظر میں اپنی ماں کی نظروں سے پھر گرائی تھیں۔ وہاں کر رہا تھا۔ وہ نظریں اس سے غائب ہونے لگیں۔ وہی تھیں۔ ان

لوہر اپنا بیٹیت سے سکندر کو مختلف ڈسٹنریشن کر رہی تھیں۔ وہ خود بالکل چپ بیٹھی اپنے باپ اور ان کی مسز کو اپنے ہوتے والے داناؤ کی آگ بھگت کرتے دیکھ رہی تھی۔

”ہٹا! یہ کہل تو چکھو۔ شہزادی آئی بہت مزے کے بنائی ہیں۔“ محمود خالد اصرار کرتے ہوئے سکندر کی پلیٹ میں خود کہل ڈال رہے تھے۔
”ایسا! تم بھی کچھ لے لو۔“ غنائش پیار سے اس سے بولی تھیں۔

”میں لے رہی ہوں آئی!“ وہ دونوں نے زبان ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے نہ ایک دوسرے سے کوئی بات کر رہے تھے۔ سکندر سنجیدی کا شائق سے محمود خالد اور عائشہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے کیک کا ایک چھوٹا سا پیس کٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔

محمود خالد سکندر سے اس کی جانب کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ بظاہر سرسری سا انداز جیسے گفتگو برائے گفتگو کے طور پر اس کے پروفیشن اور کریئر کے متعلق بات کر رہے ہوں۔ مگر حقیقت وہ سکندر کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے انداز سے قائم کر رہے تھے۔

سکندر سنجیدی سے نے تلے انداز میں انہیں اپنی جانب وغیرہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ چائے پینے کے دوران سکندر نے دوسرے گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔

”ایسا! میرا خیال ہے اب ہمیں لکھنا چاہیے۔“ سکندر کی اسوجان ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ کافی دیر کے بعد کچھ بولی تھی۔
”ہاں بالکل۔ تم لوگ نکلو۔ راستے میں ٹریفک بھی ہو گا۔“

وہ دونوں جانے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ محمود خالد کا سکندر کو رخصت کرنے کا انداز استقبال کرنے والے انداز سے بھی زیادہ گرم جوشی والا تھا۔ گویا بیٹی کا انتخاب انہیں پسند آ گیا تھا۔

”بہت خوشی ہوئی مجھے تم سے مل کر سکندر!“

سکندر کو کراچی کے راستوں کا علم نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ریسٹ پر گاڑی بعد ڈرائیور لے رکھی تھی۔ ڈرائیور باہر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلی تو محمود خالد گرم جوشی سے سکندر سے ہاتھ ملا رہے تھے۔
”آرام سے بیچ گئے میا! لکھو! سوئے میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”میں صبح لیزا کو ڈراپ کرنے یہاں آیا تھا۔“ سکندر مذہب انداز اور سنجیدی سے بولا۔ اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے اس لباس میں بہت پاری لگ رہی ہے، مل بھر کے لیے اس کی انٹھی ان نکاتوں نے اسے بتا دیا تھا۔ سکندر نے اپنی نگاہیں فوراً ہی اس پر سے ہٹا کر اس کے باپ پر مرکوز کر دی تھیں۔

محمود خالد سکندر کو گھر کے اندر لے کر جا رہے تھے۔ ان دونوں کو چار بجے گھر سے نکل جانا تھا۔ سکندر یہاں صرف ایک گھنٹے کے لیے آیا تھا اور یہ بات وہ پہلے ہی باپ کو بتا دے بے عروقی سے بتا چکی تھی۔

سکندر کو جلدی آئے اور اس کے گھر پرچ کرنے پر نکلا۔ ”غرض نہ تھا۔ مگر وہ ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے اور سکندر کے رشتے کے بیچ اپنے باپ کی کسی سازش کو نہیں آنے دے گی۔“

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ عائشہ بھی وہاں آگئی تھیں۔ وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے سکندر سے مل رہے تھے۔ اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کراچی کا موسم، عرب ممالک کے معاشی حالات، ابتدا ان موضوعات سے ہوئی تھی۔

سکندر اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں بی بی ملی گفتگو کر رہا تھا۔ وہ صرف اس کے ساتھ بے تکلف ہو کر آتا تھا۔ باقی سب کے ساتھ وہ جیسا سنجیدہ نظر آتا تھا ویسا ہی محمود خالد کے ساتھ بھی تھا۔

ان کی ملازمہ نے عائشہ کی نگرانی میں چائے کے ساتھ گھر کے بنے کئی سارے لوازمات وہاں سجادیے تھے۔ رانی اور میز انواع و اقسام کی ڈسٹنریشن سے بھری تھی۔ لگ رہا تھا یہ پہلی بار گھر آنے والے داناؤ کا شاندار اور گرم جوشی سے بھرپور استقبال ہے۔ عائشہ بڑی محبت

مصافحہ کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر دے ہوئے۔
"مجھے بھی آپ سے مل کر اچھا لگا۔"

وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "جیسے وہ اس کی
یعنی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اسی طرح اس کے پیلا کو نہ تو
انگل کہہ سکتا تھا اور نہ ہی بابا۔"

"بہت پیاری ہے میری یہ بیٹی۔ تھوڑی سی ضدی
اور جذباتی ہے مگر اس کا دل بہت خوب صورت اور
آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے اس
نے تم جیسے باوقار اور خوب صورت شخص کا انتخاب کیا
ہے۔ اللہ تمہارے دل کو سدا خوش رکھے۔"

انہوں نے مصافحہ کرنے کے بعد بھی سکندر کا ہاتھ
فورا "نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھانے
ہوئے تھے۔ ان کے لیے میں سکندر کے لیے والہانہ
محبت اور شفقت شامل تھی۔ اس نے حیران ہو کر باپ
کو دیکھا تھا۔

کہاں تھی وہ ضدی اور جذباتی؟ اس کے بابا نے اس
کے لیے یہ الفاظ کیوں کہے؟ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ
ایسی کون سی ضد کردی تھی اس نے باپ سے اور ایسا
کون سا جذباتی پن ظاہر کیا تھا۔ جس کا وہ حوالہ دے
رہے تھے۔

"تم اپنی والدہ کو یہی لانا چاہتا تھا۔ سب ساتھ مل کر
ڈنر کریں گے۔" عائشہ سکندر سے محبت سے بولی
تھیں۔ سکندر کی فیملی کا ذکر نہ کر کے جیسے انہوں نے یہ
احتیاط رکھی تھی۔ عائشہ کی بات یاد تھی کہ سکندر
کے اپنی فیملی کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہیں۔
"بچی ضرور۔" وہ بظاہر جواباً مسکرا کر می بولا تھا۔

حمود خالد اور عائشہ چاہے نہ جانتے تھیں مگر وہ جانتی
تھی سکندر کا ایسا کوئی ارادہ ہے نہ ہی کبھی ہو گا۔ وہ
صرف موقع کی نزاکت کا خیال کر کے اس بارے میں
ہلکی بھر گیا تھا۔



وہ سب "قارم ہاؤس" آچکے تھے۔ شمر کے
مشغلات میں یہ "قارم ہاؤس" تھا۔ وہ شہزاد خان گھر

سے ملا زمین لائے تھے جو یہاں سے وہاں بھاگتے
دوڑتے تمام کام انجام دے رہے تھے۔

آمنہ جیسے ایک دم ہی بالکل تندرست اور صحت
مند ہو گئی تھیں۔ وہ ملا زمین کو مختلف ہدایت دیتی اور صبر
اور حیا آدھی تھیں۔ باہر نکلی جگہ پر باہر کی تیاریاں
شروع ہو چکی تھیں۔ خوشی آمنہ کے ہر ہر انداز سے
ظاہر تھی۔ نورہ ان کی خوشی میں ان کا ساتھ دیتی
لو کر دیں سے ان کی مرضی کے مطابق کام کر رہی تھی۔

گازان میں جہاں برڈز رہتا تھا وہاں کی آرائش
سجاوٹ نورہ نے کروائی تھی۔ شہزاد خان علی کو
سوں تک سکھا رہے تھے۔ ان کے سب گھر والے
یہاں ان کے سالوں بعد لوٹنے والے بنے پور اس کی
ہونے والی بیوی کا استقبال کرنے کو موجود تھے سوائے
زین کے۔ وہ جانتی تھیں زین نہیں آئے گا۔ پھر بھی
دل کی خواہش تھی کہ کاش تن وہ بھی یہاں آجاتا۔ کیا
صرف آج چند گھنٹوں ہی کے لیے وہ اپنی ضد اور غصہ
بھلا کر مایاں کے دل کو خوشی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ
اپنے تمام گھبراہٹوں کو اکٹھا ایک ہی جگہ پر دیکھ سکیں۔
وہ گازان میں ڈنر کے لیے اتنے خوب صورت
انداز میں میز اور کرسیاں وغیرہ لگوانے پر نورہ کو سراہ
رہی تھیں۔ جب انہوں نے سامنے سے زین کو آتے
دیکھا سفید شلوار قمیص میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ
چٹا وہ ان دونوں کی طرف آ رہا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں
پر یقین نہیں آیا تھا۔

"نورہ! یہ زین آ رہا ہے نا؟"

"جی اموجان!" نورہ نے بھی بے حد خوش ہو کر
زین کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آتے زین کی طرف
دیکھ رہی تھیں۔

"کیا تم نے کہا تھا زین سے آنے کے لیے؟" زین
کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نورہ سے پوچھا۔

"کہا تو تھا۔ لیکن مجھے لگتا ہے زین میرے کہنے سے
نہیں بلکہ آپ کے کچھ بھی نہ کہنے کی وجہ سے آئے
ہیں۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آپ کی آنکھیں جو ان

وہ اور سکندر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سکندر کے پیلا کے فارم ہاؤس جا رہے تھے۔

”تم نے میری تعریف نہیں کی۔“ طیزانے اس سے شکوہ کیا۔

”تعریف کس بات کی؟“ وہ مسکراہٹ لبوں پر دوکتا سنجیدگی سے بولا۔

”کسی بھی بات کی نہیں۔“ چوڑا جواب دیتے اس نے اپنا چوکھڑی کی طرف کر لیا تھا۔

”بیلا! تم ہمیشہ ہی حسین لگتی ہو۔“ اس نے اپنے نزدیک سکندر کی سرگوشی سنی۔ مگر ظن تھا کہ اس نے اسے دیکھا۔

”ہمیشہ پاکستانی ڈریس تو نہیں پہنا ہوتا۔ آج میں نے فرمٹ ٹائم پہنا ہے تمہارے لیے۔“ اس نے منہ ہٹا کر کہا۔ سکندر آنکھ کھاتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا میری نظروں نے تمہاری تعریف نہیں کی تھی؟“

”کی تھی مگر زبان بھی تو کرے۔“ اس بار وہ مسکرائی تھی۔

”زبان سے تمہاری تعریف کرنے کے لیے تو مجھے شاعر ہونا پڑے گا۔ کیونکہ عام سی تعریف تو تمہاری کی نہیں جاسکتی۔ تمہاری تعریف تو بہت خاص لفظوں اور خاص انداز میں ہونی چاہیے۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔

”ہاتھ بنائی تمہیں خوب آتی ہیں۔“ مجھ میں پتا ہے، لڑکیوں کا دل کسے خوش کیا جاتا ہے۔

”لڑکیوں کا نہیں، صرف ایک لڑکی کا۔ اپنی بیلا کا۔“ آہستگی سے بولتے ہوئے سکندر نے گاڑی کی سیٹ پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ سکندر کی بات پر خوش ہو کر سبے ساختہ مسکرائی تھی۔ چند لمحے وہ دونوں خاموش رہے تھے۔

”تمہارے پیلا مجھے اچھے لگے لیکن راج بولوں تو تم سے سن کر میں نے ان کا جو اٹیج بنایا تھا، وہ اس نے بہت مختلف ہیں۔“

اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت سنجیدگی اور

سے اتنا کچھ کہہ رہی تھیں۔ زمین آپ سے پیار بھی تو بہت کرتے ہیں اموجان!

انہوں نے بے ساختہ اپنے برابر کھڑی نورہ کو دیکھا تھا۔

”میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی تھیں مگر ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”دعا کرو بیلا! میری محبت ان دونوں کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ اب تو اس کے سوا اور کوئی خواہش نہیں کہ کچھ ایسا ہو جائے ان دونوں بھائیوں کے دل بھرے مل جائیں۔ ان کے دلوں سے سب رنجشیں اور ناراضیاں دور ہو جائیں۔ میں اپنے دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ ایک ہی چھت تلے دیکھ سکوں۔ ہم سب پہلے کی طرح پھر بھی خوشی ساتھ رہنے لگیں۔“

”اگر شاء اللہ ایسا ضرور ہو گا اموجان! ان سال قدرے آپ کی آزمائش کی ہے۔ اب بس سب اچھا ہو گا۔“

زمین ان دونوں کے بالکل نزدیک آچکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑے شہ سے آنکھیں پوری صاف کی تھیں جیسے آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا۔

”علی کہاں ہے؟“ زمین ان دونوں کے قریب آگیا تو جیسے اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا بات کرے۔

”وہ پیلا کے ساتھ سونے تک کر رہا ہے۔“ نورہ مسکرا کر بولی۔ زمین بے حد سنجیدہ تھا جیسے بحالت غجوری یہاں آگیا تھا مگر دل سے خوش نہیں تھا۔

”اچھا ہوا زمین تم بھی آگئے۔“ آمنہ آہستگی سے بولی تھیں۔

”آپ کی وجہ سے آیا ہوں اموجان!“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا کہ سکندر کے لیے آج بھی وہی محسوس کرنا ہے جو بارہ سال پہلے کرتا تھا۔ آمنہ اور نورہ چپ کھڑی رہ گئی تھیں۔ زمین وہاں سے اندر چلا گیا۔



سچے دل سے اس کے پاپا کی تعریف کر رہا تھا۔
وہ ہیشہ سے ایسے نہیں تھے سکندر! وہ نہ چاہتے
ہوئے بھی کچھ تلخ ہوئی تھی۔ اپنی لور سیم کی زندگی کی
بہت ساری محرومیاں یاد آگئی تھیں۔
”لیکن وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے ان
کے ہر برائے انداز میں تمہارے لیے والدینانہ محبت محسوس
کی ہے۔ وہ مجھ سے بھی اس لیے اتنی محبت سے مل
رہے تھے کہ میں ان کی بیٹی کی پسند اس کا انتخاب ہوں۔“
سکندر بے حد شہیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر
بول رہا تھا۔

”آج انہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے مگر کل جب
مجھے ان کی محبت کی ضرورت تھی تب وہ کہاں تھے؟ تم
اس بات کو رہنے دو سکندر! تم نہیں جانتے انہوں نے
سیم کو کتنے دکھ پہنچائے ہیں۔“ وہ ماضی کی تلیوں میں
گم ہو گئی تھی۔
”اوس کے اہم اس ٹاپک کو رہنے دیتے ہیں۔ تم سیم کا
ذکر کر رہی ہو۔ یہ بتاؤ وہ آج ایرپورٹ کیوں نہیں آئی
تھی؟“

اس کا موڈ خراب نہ ہوا اس خیال سے سکندر نے
نورا، اسی موضوع پر تبدیل کر دیا تھا۔
سیم آج اسے لے کر کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کو
وجہ نہیں بتا سکتی تھی۔ جس سہولت سے اس نے
اپنے پاپا کے متعلق منفی باتیں سکندر سے کر لی تھیں،
سیم کے بارے میں نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سکندر کو یہ
کیسے بتا دیتی کہ سیم ان دونوں کی شادی پر خوش نہیں
ہے اور ناراضی کے اظہار کے طور پر ایرپورٹ نہیں
آئی تھی۔ اگر وہ ایسا کچھ کہتی تو شاید سکندر کے دل میں
یہ بات رہ جاتی۔ پھر جب وہ سیم سے ملتا تو یہی سوچ کر
ملتا کہ لیزا کی بہن اسے خست ٹاپسند کرتی ہے اور پھر شاید
جواب میں سکندر بھی سیم کو ٹاپسند کر دیتا۔

سکندر اور سیم اس کی زندگی کے اہم ترین لوگ
ان دونوں کو ایک دوسرے کو پسند کرنا چاہیے تھا ایک
دوسرے کا دوست ہونا چاہیے تھا ایک دوسرے کے
بہاؤ میں ان کا بہت اچھا بہت چڑھکار اور دوستانہ
تعلق

وہ دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ وہ سکندر کے
ساتھ گاڑی سے اترے۔ اسے بالکل سامنے سکندر کی
ہموجان، ایک پیاری سی لڑکی اور ایک بچے کے ساتھ
اپنے اور سکندر کے استقبال کے لیے گھڑی نظر
آئیں۔

ان تینوں سے بہت دور گاڑیوں میں درختوں کے
پاس اسے ایک ہاؤس کا رخہ بھی نظر آرہے تھے۔
بہت فاصلہ تھا، شعل واضح نہیں تھی۔ صرف کھڑے
ہونے کا شاندار اور باوقار انداز اپنایا تھا۔
میں کھڑے وہ شخص کیا سکندر کے پاس تھے؟ سکندر کی تو

حصان حج کے لیے سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اسے وہ گول مٹول سا شرارتی بچہ بہت پیارا لگا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے ساختہ اس نے جبک کر اس کے گال پر پیار کیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام علی۔“

”اصولاً تو علی کو آپ کو تاکی امی یا بڑی ماما بلانا چاہیے۔ مگر اتنی رنگ سی لڑکی کو اسے بھاری بھر کم ناموں سے پکارنا اچھا تو نہیں لگے گا۔ میرا خیال ہے لیزا آئی بی بی ایل ٹھیک ہے۔“

نورہ اس سے فٹس کر بولی۔ اگر سکندر کو اس کے ماما اچھے لگے تھے تو اسے بھی اچھی لگ سکندر کے گھر کا کوئی فرد برا نہیں لگا تھا۔ خوش اخلاق، مہربان، محبت کرنے والا، وہ چاہے سکندر کی اموجان ہوں یا نورہ یا پھر یہ کیونٹ سا بچہ۔ وہ ان سب سے مل کر کسی تین لفظ سوچ رہی تھی جبکہ وہ سکندر سے سننے کے بعد اس کی فیملی کے حلق بہت مختلف رائے لے کر آئی تھی۔ وہ جواہر مسکرائی تھی۔ تب تک آمنہ اور سکندر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

”لیزا بھی کیا سوچ رہی ہوگی۔ میں نے اپنی بیٹی کو پیار بھی نہیں کیا۔ ماشاء اللہ اس پاکستانی لباس میں کتنی خوب صورت لگ رہی ہے۔ میری بہنو۔“ آمنہ نے اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگی تھیں۔ نورہ لب سکندر سے مخاطب تھی۔

”السلام علیکم سکندر بھائی!“

”وعلیکم السلام۔“ وہ آمنہ کے اس کی خیر و عافیت کے متعلق سوالوں کے جواب دے رہی تھی پھر بھی اس کا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ نورہ نے سکندر کو بھی اتنی ہی گرم خوشی اور دوستانہ انداز و اباحت سے سلام کیا تھا جس طرح اس سے ہائے چلو کی تھی۔ مگر سکندر کا جواب سنجیدہ تھا اور ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ جیسے کسی اجنبی۔۔۔ کے سلام کا جواب دے دیا جاتا ہے۔

”سکندر بھائی! میں آپ کی بھابی ہوں اور یہ شریر بچہ آپ کا بیٹا ہے۔“ نورہ مسکراتے ہوئے سکندر کو بتا رہی تھی۔

شاید اس طرف نگاہ بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ گاڑی سے اترتے ہی سیدھا اپنی ماں کی طرف بڑھ چکا تھا۔

اس کی اموجان بھی تڑپ کر اس کے نزدیک آئی تھیں۔ انہوں نے بالکل سچ بولے ہی انداز میں سکندر کو پچھنے سے لگا لیا تھا۔ وہ کبھی اس کا ہاتھ چوم رہی تھیں، کبھی اس کے ہاتھ۔ وہ جیسے ابھی تک اسی خوف کے حصار میں تھیں کہ ان کا بیٹا ان سے پھر نہ پھڑک جائے۔

”ہائے لیزا۔“ اس نے سکندر اور اس کی اموجان سے نگاہیں ہٹا کر اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پر غلوں اور ستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔
 ”ہائے۔“ وہ جواہر احتیاط سے مسکرائی تھی۔

سکندر کا اپنی اموجان کے سوا باقی تمام افراد کے ساتھ کیا رویہ ہوتا تھا اسے اسی لحاظ سے یہاں یابی افراد کے ساتھ گفت و شنید کرنی تھی۔ اس نے نورہ کا ہاتھ ہاتھ تمام لیا تھا۔

”میں نورہ ہوں۔ اموجان کی چھوٹی بہو اور بہت جلد آپ کی دیورانی بن جاؤں گی۔ یہ میرا بیٹا ہے علی۔ علی! سلام کر لے لیزا آئی کو۔“

اس نے اپنے ساتھ کھڑے بچے سے کہا۔ اسے شاید سمجھا گیا تھا کہ اس نے مہمانوں کے سامنے زیادہ شرارتیں نہیں کرنی۔ اس لیے وہ برا سعادوت مند سا بیٹا کھڑا تھا مگر اس کی آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی تھیں۔ یقیناً وہ بہت شریر بچہ تھا۔

”اگر میرے مرنے کی اطلاع آئی تو اس پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہ بنانا۔“

اسے بے اختیار سکندر کی کل صبح کی بات یاد آئی۔ تو یہ سکندر کے بھائی کی بیوی اور اس کا بیٹا تھا۔ سکندر ابھی تک روتی ہوئی آمنہ کو سنہال رہا تھا۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر پھر جذبات پر قابو نہیں رکھ پائی تھیں۔

”السلام علیکم لیزا آئی۔“ علی نے ماں کے حکم پر ”اے سلام کیا تھا اور بالکل بڑوں والے انداز میں

طرف دیکھا۔ اب اسے وہاں پر کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے مصنوعی جھیل کے پاس گارڈن میں آگئے۔ جہاں آرام دہ کرسیاں بٹلی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں میں سے ایک پر سکندر کے پاپا بیٹھے تھے۔ جس شخص کو ابھی اس نے بہت دور سے دیکھا تھا گیارہ کی تھے؟

کسی تعارف سے پہلے ہی اسے پتا تھا وہ سکندر کے پاپا ہیں۔ باپ اور بیٹے میں مماثلت تو اس قدر تھی۔ سکندر اپنے باپ کی جوتی تھا۔ شہر مار خان، سکندر کا پرہیلا تھے۔ بلا کی مشابہت تھی باپ بیٹے میں۔ شہر مار خان ان لوگوں کو آتا دیکھ کر فوراً "کری سے اٹھتے تھے۔ جیسے مہمانوں کی آمد کے موقع پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اس نے بے اختیار سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ پل بھر کے لیے اسے سکندر کے چہرے پر ایک درد بھرا اثر نظر آیا جیسے ماضی کا درد تلخ یاد آیا ہو جب بیس سال کی عمر میں اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگلے پل وہ بھرے اپنے چہرے کے اثرات کو سرد اور سپاٹ بنا چکا تھا۔

اس نے آمنہ اور نورہ کے چہروں پر یہ اثر دیکھا جیسے وہ دونوں بھی نہیں جانتی تھیں کہ شہر مار خان سکندر سے کس انداز میں ملیں گے۔ کرسی سے اٹھنے کے بعد وہ سکندر ہی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ "السلام علیکم" سکندر نے دو کھڑے کھڑے غیر جذباتی اور سپاٹ سے انداز میں انہیں بغیر پاپا پکارے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر؟" وہ اس کے نزدیک آئے تھے۔ گلے لگانا تو بہت بڑی بات ہے وہاں تو ہاتھ بھی نہیں ملایا گیا تھا۔ سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔ "ٹھیک ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ "ما نہیں کیونکہ اگر اسے ایسا لگتا تھا جیسے شہر مار خان سکندر کو گلے لگانا چاہتے تھے۔" وہ اسے بہت حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس

تھی۔ سکندر سنجیدہ اور سپاٹ چہرے کے ساتھ نورہ اور علی کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم سکندر بیٹا۔" علی کو جیسے ماں نے سب سے پہلے سے سمجھا رکھا تھا۔ وہ بڑے مزے دار سے انداز میں پوتا سکندر کی بھی طرف ہاتھ بوجھائے کھڑا تھا۔ سکندر نے علی کی طرف جھک کر اس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ مگر نہ تو وہ بچے کی معصوم سی حرکت پر مسکرایا تھا نہ ہی اس نے اسے چھوئے یا پیار کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس فیملی میں شامل ہونے جا رہی تھی مگر ابھی وہ ایک اجنبی کی طرح تمام افراد کے غم اور درد عمل دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ آمنہ کو علی کا سکندر کو "سکندر بیٹا" کہنا بہت اچھا لگتا تھا انہوں نے بے اختیار بہت پیار سے اپنی بیوی کو دیکھا تھا۔ گویا یہ نام بیٹے کو نورہ آج ہی سکھانے لائی تھی۔ سکندر یہاں آئے ہی اسے اتنا ہی سنجیدہ نظر آنے لگا تھا جتنا روم میں ملاقات کے ابتدائی دنوں میں لگا تھا۔ چہرے پر سرد اور سپاٹ تاثرات اور اجنبیت کی لہر وار فادرل سا ایک ایسا انداز کہ کوئی بھی اس سے ضرورت سے زیادہ بات کرنے سے احتراز کرتے۔

وہ اس وقت اس پر اپنا آپ کھول دینے والا اپنی کمزوریاں بتا دینے والا سکندر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سنجیدہ اور سپاٹ تھیں۔ ان میں کسی بھی طرح کے کوئی جذبات نہیں تھے۔ "ہمارے گھر میں علی کی شرارتوں سے سارا وقت رونق رہتی ہے۔" آمنہ مسکرا کر اسے اور سکندر کو بتانے لگیں۔

"امو جان! ایسا آپ سکندر بھائی اور لہز کو نہیں کھڑا رکھیں گی؟"

نورہ نے آمنہ کو مخاطب کیا۔ سکندر کا سنجیدہ اور فاصلہ لیا انداز محسوس کر کے نورہ قدرے محتاط سی ہو گئی تھی۔

"ارے ہاں۔ چلو بیٹا تو۔ چل کر بیٹھے ہیں۔" آگے چلنے کی بات پر امن نے ایک دم بھراؤ خوں کی

عمران کی مخاطب وہ تھی۔

"کیا کرتی ہیں بیٹا آپ؟"

ان کا لہجہ شائستہ اور سنجیدہ تھا۔ نگاہوں میں اس کے لیے نرمی اور عزت تھی۔

"میں لندن کے ایک کالج میں لینڈ اسکپ اور اسل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ آرٹسٹ ہوں"

پینٹنگ بناتی ہوں۔ "وہ ان کا مشاہدہ کرنے میں ایسی مہربانی تھی کہ اس سوال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھی۔ ان کی شخصیت کے رعب سے متاثر ہو کر

اس نے اپنا کچھ نامعلوم متعارف کروایا۔

"آپ لندن میں رہتی ہیں؟" وہ اسے آپ کر کے مخاطب کر رہے تھے مخاطب کرنے کے انداز میں آمنہ جیسی نجبت یا اہلاندہ پن نہیں تھا مگر اسے شائستگی نرمی اور اہل انصافیت محسوس ہو رہی تھی۔

سکندر اس کی اپنے پیلا سے گفتگو سے لا تعلق ظاہر کرتا آہستہ آواز میں اپنے برابر بیٹھی آمنہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ گویا اسے اپنے باپ کی لیزا سے گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"جی انکل"

"اور آپ کے پیرنس؟"

"میرے پیرنس کی ڈاٹی ورس ہو چکی ہے۔ میرے فادر پاکستان میں رہتے ہیں اور بد رالٹی میں۔"

وہ سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ اسے وہ ایک بار شک ہوا کہ شہزاد خان اس سے گفتگو کے دوران گاہے گاہے سکندر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

جب اس کی نگاہیں آمنہ پر پڑتی ہیں تب وہ جیسے چپکے سے اسے دیکھتے ہیں۔

"سکندر تیار رہا تھا۔ لیزا بہت مشہور آرٹسٹ ہے۔ ابھی ایک دو ہفتے پہلے فلورنس میں اس کا سولو شو ہوا کامیاب گیا ہے۔"

سکندر سے گفتگو چھوڑ کر آمنہ نے فوراً "شہزاد خان کو بتایا۔ گویا وہ اتنی دیر سے بظاہر سکندر سے باتیں کر رہی تھیں عمران کا دھیان اوھر بھی تھا۔ اسے

سکندر کی اموجان کے اس انداز پر حیران آیا۔ نہ اس نے

کے قریب جانا چاہتے تھے مگر قریب جانے سے ڈر بھی اسے تھے۔

ماحول میں ایک عجیب سا کچاو، تکلف اور اجنبیت پھیل گئی تھی۔ آمنہ بیگم، سکندر اور شہزاد خان دونوں کو محاط سے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ ماحول میں

پابلی اجنبیت، تکلف اور خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ ان دونوں سے بولیں۔

"بیٹھو بیٹا! لیزا تم بھی بیٹھو بیٹا" آمنہ کے کہتے ہی وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

علی بھائے ان سب کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کے گھاس پر بھاگ دوڑ کرنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا

وہاں سب سے سوائے سکندر کے بھائی کے۔ اپنی بیوی اور بچے کو سراں بھیج کر کیا وہ خود آیا ہی نہیں تھا؟ سکندر سنجیدگی اور خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔

باپ اور نویرہ کے سامنے وہ ماں کے ساتھ بھی فارمل سا ہو گیا تھا۔ جیسے ماں کے ساتھ چاہت، محبت اور جذبات کا اہلاندہ اظہار وہ ان لوگوں کے سامنے

نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈ کا تکلیف دہ سناٹا حائل رہا تھا ان چاروں کے بیچ۔ نویرہ بھی محتاط سی ہو کر چپ بیٹھی تھی۔ آمنہ بھانے کسی پریشانی اور خوف میں

نہیں۔ وہ ایک بل خاموش بیٹھے گھاس کی طرف دیکھتے سکندر کو دیکھتیں۔ دوسرے بل سنجیدہ بیٹھے شہزاد خان کی طرف۔ پھر جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے

آمنہ ہی نے لیزا کو مخاطب کیا۔

"پاکستان پہلی مرتبہ آنی ہو لیزا!"

"جی اموجان!" اس نے آمنہ کو مسکرا کر جواب دیا۔

اسے پہلی مرتبہ شہزاد خان کی نظروں خود پر محسوس ہوئی۔ اتنی دیر میں انہوں نے یا تو سکندر کو دیکھا تھا یا

پھر بھانے دوڑتے علی کو۔ باقی سب سے وہ قدرے لا تعلق تھے۔ اس پر تو جیسے ابھی تک انہوں نے دھیان

بھی نہ دیا تھا۔ سکندر اور شہزاد خان دونوں خاموش بیٹھے۔ ان کی خاموشی بے حد بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ شہزاد خان نے خاموشی توڑنے میں پہل کی تھی

شہزاد خان کے سامنے آجھے پن سے اٹھی اور اپنی نیلی کی شٹن داعلا رتبہ بنایا تھا۔ پیٹنگ کے حوالے سے اپنی شہرت کا ذکر کیا تھا۔ مگر آمنہ جیسے چاہتی تھیں کہ ان کی ہونے والی ہو کی ہر خوبی سب کو بتا چلتے۔
 ”دیری گڈ لایہ تو بہت اچھی بہت ہے، شہزاد خان ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”کیا پیٹ کرتی ہو لیزا؟“

اس بار انہوں نے اسے تم کہہ کے مخاطب کیا۔ جیسے تکلف اور اجنبیت کو دور میان سے جٹا دیا ہو۔ وہ جواباً شائستگی احترم اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پیٹنگ میں اپنے خاص موضوعات انہیں بتانے لگی۔
 سکندر ان دونوں سے لافطی اسی طرح ہاں سے محو گفتگو تھا۔ علی بھاگتا ہوا نویر کے پاس آیا تھا۔
 ”بابا! فاش رکھا میں۔“ اس کی فرمائش پر نویر کرسی سے اٹھی۔

”او لیزا! تم بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔“
 اس نے فوراً ”سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی الجھن کا شکار تھی کہ یہاں اگر کوئی اس کے ساتھ اپنائیت اور محبت سے پیش آئے تو اسے جواباً ”کیا کرنا چاہیے۔“ سکندر نے اسے نہیں دیکھا تھا اگرچہ وہ اس کا اپنی طرف دیکھنا محسوس کر چکا تھا۔ گویا اس کی مرضی تھی۔ اس نے جانا ہے تو جانے نہیں جانا چاہتی تو نہ جانے۔ وہ نویر کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ گئی۔

وہ یہاں آ کر اتنی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا کہ وہ لیزا کو گھڑ بھی نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ماضی کو باور کرنا خود پر گزری قیامتوں کو سوچنا اسے خود پر ترس کھانا لگ رہا تھا مگر پھر بھی یہاں آ کر بتا نہیں کیا کیا بھولا بھرا پھر آو آنے لگا تھا۔ وہ تینوں اب پھر خاموش تھے۔

”ماشاء اللہ لیزا بہت ساری ہے سکندر! تم سے سن کر جیسا میں سوچ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔“

وہ ہاں ہیٹا آپس میں مخاطب نہ ہوئے قصود باپ بیٹا نہیں جیسے وہ ابھی تھے، جنہیں ایک ہی جگہ لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے بیچ خاموشی اور فاصلہ تھا۔
 بجائے انہیں یا آمنہ کو دیکھنے کے، لا تعلق سا بیٹھا سامنے لیزا کو جھیل کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں کی چھوٹی بہو اور دو ناچھی گھرے تھے۔
 ”تم جی! انٹر نیٹل میں چل رہے ہو؟“

اس نے شہزاد خان کا سوال سنا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں صرف اجنبیت اور فاصلہ تھا۔ شہزاد خان کی نگاہوں میں کیا تھا اس نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”جی۔“ بارہ ماہ پہلے اسے منع کر دیا گیا تھا۔ انہیں پانی نہ کے اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا اس گھر لے کے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا وہ نہ انہیں بلایا کہ رہا تھا نہ ماں کے سواریاں کسی کو اپنا سمجھ رہا تھا۔

”بہت اچھی کمپنی ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔“ شہزاد خان اس سے سنجیدگی سے بولے تھے۔

آگے بڑھنے کے مواقع؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر فحشی پیدا ہوتی تھی۔ کیا آگے بڑھنے کے راستے اس کے لیے بند نہیں کر دیے گئے تھے؟ کیا اسے زلت بھری کھائی میں دھکیل نہیں دیا گیا تھا؟ کیا اس کا ہندار اس کا وقار اس کی شخصیت کی ان بہان اس سے چھین نہیں لی گئی تھی؟ کیا اسے یہ نہیں بتا دیا گیا تھا کہ وہ ان سب کے لیے نرچکا ہے؟ کیا اسے رسوائیاں اور ذلتیں نہیں بخش دی گئی تھیں؟

”کم از کم ان لہو لہو پر اس کی ترقی اور آگے بڑھنے کی بات چیتی نہیں تھی۔ ان لہو لہو سے نواس کی تلاش و ہرادی ہی کی باتیں ابھی لگا کرتی تھیں۔ اس سے اظہار نفرت اور اعلان لا تعلق ہی سجا کر تھا۔ وہ اپنے چہرے پر کسی بھی طرح کے جذبات کو آنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو مکمل طور پر سپاٹ، سہو دار غیر جذباتی کر رکھا تھا۔“



”رودم میں؟ واؤ! سودا، ٹانگ۔ اتنی سودا، ٹانگ جگہ پر مل کر تو یہ رشتہ بنائی تھا۔ کیا سکندر بھائی نے تروی میں تین کواٹرز (سکے) اچھالے تھے؟“ نورہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ جواباً ”کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔“

”تین کواٹرز نہیں اچھالے تھے پھر بھی ہماری شادی ہو رہی ہے۔“

نورہ بھی زور سے ہنسی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی دور کرسیوں پر بیٹھے شہیار خان، آمنہ اور سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر نے سٹے سنجیدہ سے انداز میں آمنہ سے باتیں کر رہا تھا۔ سکندر اور شہیار خان کے بیچ وہ کرسی خالی تھی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ شہیار خان بظاہر وہاں بیٹھے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے مگر ان کی نگاہیں مسلسل سکندر پر تھیں۔ اسے شہیار خان کی شخصیت پڑی ابھی ہوئی سی لگی۔ وہ خود کو ظاہر کچھ اور کر رہے تھے ان کے اندر کچھ اور تھا۔ وہ بظاہر غرور سے سر نہانے بیٹھے تھے ان کی شخصیت باوقار اور بارعب نظر آ رہی تھی۔ مگر اسے ان کی آنکھوں میں مسلسل اکہ بے چینی اور ایک اضطراب نظر آ رہا تھا۔ جو سطح پر نظر آ رہا تھا شاید کمرائی میں وہ نہیں تھا۔ شاید وہ اندر سے بہت مختلف انسان تھے۔ اسی وقت کسی ملازم نے آکر آمنہ سے کچھ کہا تھا۔ آمنہ نے دیس بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کو آواز دی تھی۔

”نورہ! میرا بیٹا! آجاؤ تم لوگ کھانا کھا گیا ہے؟“

چونکہ رات زیادہ ہونے سے قبل ان لوگوں کو واپس بھی پہنچنا تھا اس لیے کھانا جلدی نکالیا گیا تھا۔

”آجاؤ لیرا!“ نورہ اپنا بیت سے اس سے بولی۔ علی بھاگتا ہوا وہاں جا رہا تھا وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے وہاں آگئی تھی۔ آمنہ شہیار خان اور سکندر رجی کرسیوں پر سے اٹھ چکے تھے۔

”دین گاہی ہے؟“ بلواؤ اسے بھی۔ ”آمنہ نے نورہ سے کہا۔“

علی بانی کے پاس جھک کر کھڑا ہو گیا۔ برقی پھیلنے کی خوش ہو کر دیکھ رہا تھا وہ دونوں اس کے پاس کھڑی تھیں۔

”سکندر بھائی کی پسند لا جواب ہے۔ میں نے جب سے اموجان سے سنا تھا سکندر بھائی کی ہونے والی بیوی اٹالین ہے۔ تصور ہی تصور میں تمہارا ایک خاکہ بنایا تھا۔ اٹالین مرد اور عورتیں بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔“

نورہ بے تکلفی سے اس سے بولی تھی۔ وہ عمر میں شاید اس سے ایک دو سال چھوٹی تھی مگر بے تکلفی سے اسے تم کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تعریف پر مسکرائی۔

”تھنکس۔“

”تم اردو کسے بول لیتی ہو؟ ہم تو سمجھ رہے تھے تم سے انگلش میں بات کرنی پڑے گی۔“

”میں مکمل اٹالین نہیں ہوں۔ میرے پیلا پاکستانی ہیں۔“

”ہاں یہ تو مجھے پتا ہے۔ اموجان نے بتا دیا تھا۔ مگر تم دیکھنے میں بالکل اٹالین لگتی ہو۔ اگر اردو نہ بولو اور یہ پاکستانی ہو تو تم مکمل اٹالین لگتی ہو۔“

یہاں سکندر تھیں تھا اس لیے وہ جواباً ”مکمل کر مسکرائی۔ وہ یہاں سکندر کے حوالے سے کن لوگوں سے مل رہی تھی مگر اس سے خود سے بے تحاشا خوش اخلاقی، کرم جوئی اور محبت سے ملتی اس لڑکی سے رکھائی نہیں برتی جا رہی تھی۔

”سب یہی کہتے ہیں۔ ایک جو کئی میں شکل صورت میں اپنی مٹی پر ہوں۔ تم میری بہن سے ملو تو وہ نہیں بالکل پاکستانی لگے گی۔ وہ شکل و صورت میں میرے پیلا ہے۔“

نورہ نے جواباً ”مسکرا کر کہہ دیا تھا۔“ تم سکندر بھائی سے کہاں ملیں؟“

”رودم میں۔“

”جی، اموجان! میں ہا کر لاتی ہوں۔“ اس نے فوراً
سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر کا چہرہ ہنوز بے تاثر تھا۔
گویا ذہن کے آگے نہ آنے سے اسے کچھ فرق نہیں
پڑتا۔ نوید وہاں سے چلی گئی تھی۔



فارم ہاؤس کے روزگارڈن میں ڈنر کے لیے میز اور
کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ چاروں اطراف کچے رنگولے اور
قبوئوں کے گلاب نظر آ رہے تھے۔ ان کے دلکش
رنگ اور بھینی بھینی خوشبو فضا کو منظر اور خوشگوار بنا
دی تھی۔

گھڑوں کی تمام لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ
ابھی مغرب کا ہی وقت تھا اور اندھیرا پھیل چکا نہیں تھا۔ مگر
وہ جگہ گولڈن لائٹس سے جگمگا دی گئی تھی۔ گارڈن
سے اس بار فائرے فاصلے پر پارلے کیو ہو رہا تھا اور گرم
گرم ہوا ابھی دھپیں لگ رہی تھی۔

وہ سب لوگ کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ ملازمین
نے بڑی بھرتی اور مستعدی سے میز پر گرم گرم مین اور
پارلے کیو ڈش لاکر سروس کرنا شروع کی تھیں۔ اسی وقت
اس نے نوید کو ایک ہینڈم شخص کے ساتھ اس
طرف آنا دیکھا۔ سکندر سے مشابہت نہ تھی، پھر بھی
نوید کے ساتھ اسے آنا دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ
سکندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ ہینڈم تھا مگر سکندر جتنا
نہیں۔ اس کی شخصیت سکندر جیسی شاندار نہیں
تھی۔

سکندر اپنے پیارے تھا اور اس کا بھائی اموجان پر
اسے وہ نوید کے ساتھ چلا اس کی دوستانہ فطرت کے
بالکل برعکس لگ رہا تھا۔ اے تھامس! پیچیدہ چہرہ اور ایسا
انداز جیسے اسے یہاں جلا لایا گیا ہے۔ وہ مزید تک آگیا
تھا۔ لیزا نے سکندر کی طرف دیکھا۔

وہ ذہن کو نظر انداز کر کے اپنے موبائل پر آیا کوئی
میسیج دیکھنے لگا تھا۔ ذہن نے جی میز پر بیٹھے تمام
لوگوں کی طرف دیکھا تھا سوائے سکندر کے۔ وہ دونوں
ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“ ذہن بطور خاص کسی کو بھی
مخاطب کے بغیر سلام کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میز پر
بیٹھے جس فرد کا دل چاہے یہ سمجھ لے کہ اس نے اسے
سلام کیا ہے۔

وہ سکندر کے برابر بیٹھی تھی اور سکندر کے دائیں
جانب آمنہ بیٹھی تھیں۔ ذہن سامنے والی کرسی پر نوید
کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ علی شہریار خان کے برابر بیٹھا تھا۔
انہی ان دونوں بھائیوں کے چہروں پر تڑاؤ اور سختی نظر
آتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ
رہے تھے۔

باقی تمام افراد ماحول کی اس شلشن کو بظاہر نظر انداز
کر رہے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر وہ حقیقت وہ سب
اس تڑاؤ کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔
”لیزا! اتم ٹھیک ہے لو؟“ اس نے شہریار خان کی
آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ نجالہ
کیوں اسے ان کی نگاہوں میں ایک باپ کی بے بسی نظر
آئی۔

نوید یہاں کامیوڈ دیکھ کر اس وقت بالکل خاموش
تھی۔ آمنہ اور شہریار خان ماحول کی تعبیر اور تڑاؤ کو کم
کر کے ذہن کی کوشش کر رہے تھے۔
”ہاں لیزا! وہیانا۔“ آمنہ بھی فوراً بولیں۔

”میں لے رہی ہوں۔“ وہ ہلکی مسکراہٹ کے
ساتھ بولی۔ سکندر نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاوا
ڈال رکھا تھا۔ وہ پلیٹ میں کاٹا اور احرار چھٹا کر رہے
رہ جیتی سے کھا رہا تھا۔ یہ سلاوا بھی جیسے اس نے
مرونا اور مجبوراً کھایا تھا۔ شہریار خان نے ملازم کو
آواز دے کر بلایا تھا۔ ملازم دو دو دو دو فوراً وہاں آگیا
تھا۔

”مشن جی اور لے کر آؤ بالکل گرم اور اچھی مٹی
ہوئی۔“

ملازم ان کا حکم سنتے ہی فوراً واپس پلٹا تھا۔ اب
اس سے مخاطب تھے۔
”تمہارے اٹالین کھانوں کی طرح تمہارے پاکستانی
کھانوں میں بھی تمہیں بہت درستی ملے گی۔“

زین سب سے لا تعلق سر جھکا کر کھانا کھا رہا تھا۔
 "کی کی بھی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ زین کو
 قہر سے بغور دیکھ کر پتا نہیں کیوں بار بار اسے ایسا
 لک رہا تھا جیسے اس نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے؟
 اب؟ کہاں؟ اسے بالکل یاد نہیں تھا۔
 "جی انکل! مجھے پتا ہے پاکستانی کھانے بہت مزے
 ہوتے ہیں۔"

لازم مقن کی خوب صورت دوش میں رکھ کر لے
 آیا تھا۔ شہیار خان نے خود اس کا ایک پیس کاٹ کر
 اس کی پلیٹ میں رکھا تھا۔
 "یہ لڑائی کرو تمہیں اچھی لگے گی۔ سکندر کی پلیٹ
 میں بھی ڈالو۔"

انہوں نے دوش اس کی اور سکندر کی طرف بڑھائی
 تھی۔ اس نے محسوس کیا آمنہ اور نورہ شہیار خان کو
 نیات سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یوں دیکھ رہی تھیں
 یہ وہ اپنے مزارع سے بہت کچھ کام کر رہے تھے۔
 "تمہیں دوسرا سکندر؟" اس نے آہستگی سے اس
 سے پوچھا۔

اس نے سنجیدگی سے نفی میں سر ہلادیا تھا۔ اس نے
 شہیار خان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اور سکندر ہی کو
 یاد رہے تھے۔
 سکندر کا انکار میں اپنا مرائوں نے دیکھا تھا۔ اسے
 ایسا بار بھر شہیار خان کے چہرے پر غم اور بے بسی نظر
 آتی تھی۔

زین ہر چیز کھا رہا تھا۔ اس طرح جیسے یہاں صرف
 اور صرف کھانا کھانے ہی کے لیے آکر بیٹھا تھا۔ سب
 لہنا کھا چکے۔ سب کھانے کی میز سے سب سے پہلے
 اٹھنے والا زین تھا۔

"تم کہاں چلے؟" شہیار خان نے اس سے پوچھا۔
 "سر میں تھوڑا درد ہے لپا آکرے میں رست کروں
 گا۔" سنجیدگی سے بولتا وہ فوراً وہاں سے جانے کے
 لیے مڑا تھا، بغیر ان دونوں کو خدا حافظ کہنے جیسے وہ
 سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے مخاطب ہوتا تو
 اور ان کی شکلیں سکندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

اسے زین اچھا نہیں لگا تھا۔ جو بھی ناراضی تھی مگر
 اس کا بھائی پورے بارہ سال بعد اس کے سامنے آیا
 تھا کیا وہ مرچا؟ بھی بھائی کے ساتھ سلام دعا نہیں کر
 سکتا تھا؟ سکندر کا دکھ اس نے پھر نئے سرے سے
 محسوس کیا تھا۔ ظلم بھی اسی کے ساتھ ہوا تھا اور
 ہجروں جیسا سلوک بھی اسی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔
 بجائے اس پر ہونے ظلم پر شرمندہ ہونے کے وہ ابھی
 تک اس کے خلاف دل میں نفرت لے کر بیٹھا تھا۔
 وہ سب بھی میز پر سے اٹھ گئے تھے۔ زین اندر جا
 چکا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔" سکندر
 سنجیدگی سے آمنہ سے بولا۔

"سب ساتھ کافی لی لیتے ہیں۔ پھر چلے جانا۔"
 شہیار خان نرم لہجے میں سکندر سے بولے۔
 "نورہ ہو جائے گی۔ لیزا کے لپا گھر پر اس کا انتظار کر
 رہے ہوں گے۔" وہ جواباً "سنجیدگی" سے بولا تھا وہ
 ٹوک سے انداز میں۔ گویا میں مزید نہیں ٹھہرنا چاہتا
 تھا۔

اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر شہیار خان نے نورہ کو
 کچھ اشارہ کیا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ
 سب آہستہ قدموں سے چلتے روز گارڈن سے باہر نکل
 رہے تھے۔ وہ لوگ واپس وہیں آگئے تھے جہاں پر
 یہاں آنے کے بعد بیٹھے تھے۔ جھیل کے نزدیک والی
 جگہ۔

نورہ تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں
 ایک چوہری باکس تھا۔ نورہ نے وہ چوہری باکس
 آمنہ کو لا کر پکڑ لیا تھا۔ باکس کا ساڑن ہٹا رہا تھا اس میں
 سونے کی چوڑیاں یا کنگن ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک
 دم گھبرا گئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر سکندر کی طرف
 دیکھا تھا۔ کیا اسے کوئی تحفہ یہاں سے لینا تھا یا نہیں
 لینا تھا؟

"بہت اچھی لگی ہو تم مجھے۔ اللہ تمہیں اور سکندر
 کو دیر ساری خوشیاں دے۔ تمہارے دل پر مٹی محبت
 سے ملے رہیں۔" آمنہ نے دعائیں دیتے ہوئے وہ

”اچھی ہوئی تم دونوں یہاں پر؟“
”جی اموجان! وہ مسکرا کر بولی۔“

باسکی لڑاکی طرف بڑھایا تھا۔
”یہ چھوٹا سا تحفہ تمہارے لیے میری طرف سے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ سکندر ان سے بولا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے اموجان! کسی بھی تحفے سے زیادہ قیمتی ہمارے لیے آپ کی دعائیں ہیں۔ آپ بس ہمیں اپنی دعائیں دیں۔“

اس کا لہجہ عزت اور احترام لینے مہذب سا تھا مگر اس کی نگاہوں میں سختی اور انکار تھا۔ وہ یہاں سے کچھ نہیں لے گا۔ نہ اپنے لیے نہ اپنی بیوی کے لیے۔
”پھر بھی جی! میری خوشی تھی۔ میری دوسو پہلی بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔“

آمنہ کا لہجہ مرعہ سا اٹھایا تھا۔ مگر اس وقت سکندر نے اس کے لہجے میں شامل وہ کہہ کو ان کی آنکھوں میں دور آتی نم کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”تو آپ نے اسے اتنی زبردستی دعائیں دی تو ہیں دنیا کا تیسرا سے قیمتی تحفہ آپ کی دعاؤں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔“

وہ خاموش تماشائی کی طرح ہاں اور پیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے شہیار خان کو آمنہ کی طرف اشارہ کرتے دیکھا کہ وہ سکندر سے مزید اصرار نہ کریں۔ جیسے وہ سمجھ گئے تھے۔ سکندر سے کتنا بھی اصرار کر لیا جائے وہ یہاں سے ایک ٹکڑا پاتا تک لے جانے کا روادار نہ ہو گا۔

اس نے صرف آمنہ کی کے نہیں شہیار خان کے چہرے پر بھی ایسی پینٹری دیکھی۔ اس کی طرح نورہ بھی اس چوٹیشن میں بالکل خاموش تھی۔ آمنہ شوہر کا اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

”اچھا! میں ابھی تمہاری خوشی۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی تھیں۔

واپسی میں نورہ اور آمنہ کے ساتھ شہیار خان بھی انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ آمنہ نے اسے گلے لگا کر بڑا کر دیا تھا۔

وہ سکندر کو اس کے ہر رویے کے لیے سو فیصد حق پر سمجھ رہی تھی مگر پھر بھی اس پہلے اس کے دل باپ سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بہت سدا گئی تھے۔

آمنہ اب سکندر سے مل رہی تھیں۔ اسے بھر گیا لگا رہی تھیں۔

”کل مجھ سے ملو گے ناں؟“ سکندر نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا جیسے باقی سب کے سامنے اس میں سے بھی فاصلے پر چلا گیا تھا۔

”اللہ حافظ۔“ اسے محسوس ہوا تھا کہ آمنہ کے ملنے کے بعد شہیار خان سکندر کی طرف بڑھے تھے۔ مگر ان کے بڑھنے سے پہلے سکندر سب کو اللہ حافظ کہتا گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔

”اللہ حافظ! نکل!“ اس نے انہیں اللو اے کہا تھا۔ انہوں نے بزرگانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”خوش رہو جی!“ اس نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو اسے ان کی نظروں میں دکھ اور بے بسی نظر آئی تھی۔ نورہ سے بھی خوشوار انداز میں گلے مل کر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ تینوں افراد وہیں کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ نورہ اور آمنہ ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ شہیار خان سنجیدہ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی دکھ اور بے بسی نظر آ رہی تھی۔



واپسی میں سارا راستہ سکندر بالکل خاموش تھا۔ اسے وہ بہت تنہا بہت دکھی اور بہت اس لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا تلخ ترین ماضی کسی آسیب کی طرح پھر اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ بہت ڈسٹررب لگ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔
 "کچھ نہیں۔"
 "اواس ہو؟"
 "ہاں۔" وہ ایک گہری دھک بھری سانس لے کر بولا۔

"میرے ہوتے ہوئے اواس کیوں ہو رہے ہو اندر! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ چاہے ساری دنیا تمہارے خلاف ہو اے میں تب بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔"
 وہ مضبوط لہجے میں اس سے بولی۔ سکندر کے اواس ہرے پردہ ہم سی مسکراہٹ آئی تھی۔
 "لیزا! تمہاری یہ محبت تمہارا یہ ساتھ ہی اب میرے لیے زندگی گزارنے کی وجہ ہے۔ تم ساتھ ہو تو میں اس خود کو زندہ محسوس کر رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو میں نواب دیکھ رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو زندگی ہے لیزا۔"
 وہ سکندر کے ہر لفظ میں سچائی پاری تھی۔ وہ اس شخص کا ساتھ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک بچائے گی۔ جنہوں نے اسے دکھ دیا اسے چھوڑ دیا وہ ان لوگوں کی طرح کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ وہ اسے اب کبھی محبت اور رشتوں سے بے اعتبار نہ دے گی۔

سکندر اسے محمود خالد کے گھر ڈراپ کر کے اپنے اوٹل چلا گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو لاڈلے میں محمود خالد اور عائشہ کے ساتھ سیم اور ہاشم بھی بیٹھے نظر آئے۔

سیم کے ساتھ ساتھ ہاشم بھی اسے دیکھتے ہی سونے سے کھڑا ہوا تھا۔ اپنی بہن کی زندگی اجاڑنے والے اس شخص سے اسے نفرت تھی پھر بھی وہ مٹلی اس سے مسکرا کر ملی تھی۔
 "اکتا قریبی رشتہ اور ہم اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں لیزا۔" ہاشم اس سے مسکرا کر بولا۔

"مریم جب بھی لندن یا روم تم سے ملنے جاتی تھی میں اس سے کہتا بھی تھا کہ میں بھی چلتا ہوں۔ اپنی اکلوتی سالی صاحبہ سے ایک بار ملاقات کا شرف تو حاصل ہو جائے۔ مگر مریم مجھے منع کر دیتی تھی۔ اب پوچھو اس سے یہ مجھے تم سے کیوں نہیں ملوانی تھی؟ وہ دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں بولا تھا۔

"ایسے ہی بول رہا ہے ہاشم۔ خود کے پاس ٹائم ہوتا نہیں ہے برائے رئیس سے ہٹ کر کہیں جانے کا۔" سیم جواب دیتے ہوئے اس سے منگنے لگی تھی۔
 "تکلفی دیر سے آئی ہوئی۔ ہوں تم سے ملنے کے لیے۔ تمہارا نہیں کہاں گھومتی پھر رہی ہو۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں سیم۔ میں سکندر کے گھر والوں سے ملنے گئی تھی۔"
 ہاشم صوفے پر واپس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اور محمود خالد ساتھ بیٹھے ہوئے تھے وہ سیم کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

ہاشم کی تصویر اس نے بے شک دیکھ رکھی تھی۔ مگر آئے سامنے اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ خاصا پینڈھ اور باد قار مرو لگ رہا تھا۔

"کیسی رہی تمہاری اپنے سسرال میں دعوت؟" سیم بغور اس کے پاکستانی لباس اور تیاری کو دیکھ رہی تھی۔

"اچھی رہی۔" سیم کے سامنے وہ مختصر ہو کر بول رہی تھی۔ اکیلے وہ دونوں بہنیں ہوتیں تو وہ طویل تہنہ کرکری سیم سے سکندر کے گھر والوں کے متعلق۔
 "یہ تم نے پاکستانی ڈریس کب سے پہننے شروع کر دیے۔"

سیم اس سے ہنس کر بولی۔ اس کا انداز قدرے مذاق اڑانے والا تھا۔ وہ اپنی تیاری کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

"کیوں کیا اچھا نہیں لگ رہا مجھ پر یہ ڈریس؟" کیا سکندر اس کی امواجان لایا اور عائشہ نے اس کا ہل رکھنے کو اس کی جھولی تعریف کی تھی۔ کیا واقعی یہ لباس اس پر اچھا نہیں لگ رہا تھا؟ سیم کہہ رہی تھی تو ایسا ہی

ہوگا۔ سہا سے کبھی کچھ غلط مشورہ نہیں دیتی۔

”تم جس طرح کے کپڑے پہنتی ہو اس میں زیادہ پیاری لگتی ہو۔“ سیم اس سے پیار سے بولی تھی۔

”مگر مجھے تو کٹھنم این لباس میں زیادہ پیاری لگ رہی ہے۔ اس کے ساس سر کو بھی اچھا لگا ہوگا کہ وہ ان سے ملنے پاکستانی لباس پہن کر آئی ہے۔“

محمود خالد سنجیدہ لب و لہجے میں سیم سے بولے تھے۔ ان کا انداز ایک نامحسوس سی سختی لیے ہوئے تھا۔ وہ حیران ہو کر اپنے پیلا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی ملازمہ چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ کیک اور بامداد کا حلوا بھی تھا۔ محمود خالد فوراً داماد کی مہمان نوازی کرنے لگے تھے۔ وہ اسے اصرار کر کے حلوا لینے کو کہہ رہے تھے۔

”بری خاص جگہ کا حلوا ہے ہاشم! کچھ کر دیکھو۔ تمہیں ضرور پسند آئے گا۔“ وہ ہاشم کی پلیٹ میں خود حلوا ڈال رہے تھے۔

بہی کے ساتھ تلخ لہجہ اور داماد کی آؤ بھگت؟ اسے اپنے بابا کا انداز سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ سیم کو بھی محمود خالد کا انداز برا لگا تھا مگر وہ میاں کی موجودگی کے سبب زبردستی مسکرا رہی تھی۔

”چلو اچھا ہے لڑا! تم پاکستانی ڈریس پہن کر اپنے پاکستانی میاں کو خوش کرنا۔“

”مریم! میاں! تو تمہارا بھی پاکستانی ہے۔“ ہاشم حلوا کھاتے ہوئے اس سے ہنس کر بولا۔ عائشہ سب کو چائے سرو کرنے کے لیے اٹھنے لگی تھیں۔

”آپ! بیٹھیں می! میں دسے دیتی ہوں۔“ سیم نے انہیں پیار سے منع کیا تھا۔ وہ خود سب کو چائے سرو کرنے لگی تھی۔

”میری بات الگ ہے ہاشم! اگر تو بڑی کی تھی اس معاملے میں کہ کسی پاکستانی سے ہرگز شادی نہیں کریں گی پاکستانی مردوں سے سخت نفرت کرتی ہے لڑ۔“

اسے سیم کے جملے میں کوئی بھی بات بری یا قابل اعتراض نہیں لگی تھی مگر اس نے محمود خالد کے چہرہ پر پھر سختی اور غصہ آتے دیکھا تھا۔ وہ فہمے کو دیا

رہے تھے۔ انہیں سیم کی بات بری لگی تھی۔ وہ بظاہر مسکرا کر سیم سے بولے تھے۔

”انسان کی سوچ اور خیالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے مریم! میں تجھ سکندر سے ملا ہوں۔ مجھے وہ بہت پسند آیا ہے۔ میں کٹھنم کے فیصلے سے بہت مطمئن ہوں۔“

ان کی مسکراہٹ کے باوجود اسے ان کی آنکھوں میں سختی نظر آتی تھی۔ ان کے لیے اور آنکھوں میں سیم کے لیے ایک نامحسوس سی سختی اور تنبیہ تھی۔ وہاں کچھ محسوس نہ ہو مگر سننے والا محسوس کر جائے کہ تمہیں کوئی رنجش ہے دلوں میں۔ سیم پر حکم کر کے کہا اب بھی بابا اس سے ناراض تھے؟ ناراض سیم کو اونا چاہیے تھا ناراض تھے؟

بہی کے مقابلے میں ان کا داماد سے بات کرنے کا انداز بہت محبت بھرا تھا جیسے ہاشم انہیں بے حد پسند اسے تھوڑی سی دیر ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بابا سیم سے ناخوش تھے اس سے خفا تھے۔ چنانچہ ہاشم اور عائشہ کو یہ بات پتا تھی یا نہیں پتا تھی۔

جب وہ چند لمحوں میں ان کے کہنے کی سختی محسوس کر گئی ہے تو کیا ہاشم اور عائشہ نہیں کر سکتے ہوں گے؟ پہلے سیم کی شادی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف کر دی صرف اپنے بار و بار کی فائدے کے لیے اور اب اسی سے خفا بھی ہیں۔ اس کی نگاہوں میں باپ کی ایک برائی اور بڑھی تھی۔

”پھر کب ملواری ہو تم مجھے سکندر سے؟“ سیم نے محمود خالد کی بات پر کچھ خاص دھیان دیے بغیر اس سے پوچھا۔

”جب تم کو۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ وہ کھانا کھا کر اٹلی تھی۔ اس لیے صرف چائے پی رہی تھی۔

”بس پھر کل بلا لو سکندر کو ہمارے گھر لایاؤ نرم۔“ جنہیں تو میں ابھی اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ بس اب تم تین بچاؤں ہم نے پاس بھی سو۔ کیا ہاشم! میں تمہیک کہہ رہی ہوں ناں؟“ سیم نے حق رکھنے والے انداز میں اسے مخاطب کیا اور پھر اسے

ہر کو بھی شامل ہنگو کرنا چاہا۔

"ہاں بالکل۔ چلو لیزا ہمارے ساتھ۔ اب کچھ نہیں بھی مہمان نوازی کا موقع ملنا چاہیے۔" ہاشم

طرز فکر پہلے سیم اور پھر اس سے بولا۔
"کیوں انکل؟ ہم لیزا کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں؟"

ہاشم نے محمود خالد سے پوچھا۔

"ایسا کیا اعتراض ہو گا۔ بس لڑتے جلدی سے اپنا ایک ٹیک کرو۔ تم ابھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔"

ہم نے مسکرا کر حق رکھنے والے انداز میں کہا۔

وہ سیم کے ساتھ جانے کے لیے بخوشی تیار تھی۔

اس کے کہ وہ ہائی بریکریٹ محمود خالد فوراً انہوں نے

ہاشم بیٹا کلشوم ابھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا

اے گی۔ دراصل کل میں اور عائشہ اسے اس کی

ماری کی شاپنگ کرانے لے چارے ہیں۔ کپڑے

جو روغیو۔ ابھی تو کلشوم ہے ناپا یہاں۔ شادی کی

ایک پوری ہو جائے پھر آجائے گی یہ تم لوگوں کے

باب۔

محمود خالد مسکرا کر دماغ سے بولے سیم کو وضاحت

نے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ایں حال کو صاف انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا

چاہتے تھے۔

لوں سی شاپنگ؟ کیسی شاپنگ؟ اس کا ہرگز ہرگز

ایں پروگرام نہیں بننا تھا اپنے باب یا عائشہ کے ساتھ

ماری ابھی بھی شادی کی شاپنگ کرنے کا۔ مگر اب بیچ

نفل میں وہ باب کی بات کو بھونٹا قرار دے سکتی تھی اور

نئی انکار کر کے انہیں شرمندہ کر سکتی تھی۔ اس لیے

اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

"اچھا یہ بات سے تو ٹھیک ہے پھر ہم کل کے لیے

امرار نہیں کرتے مگر لیزا شاپنگ ختم کرتے ہی تم

نے ہمارے پاس آنا ہے۔ چند دن ہمارے ساتھ بھی

یلا کے جھوٹ کی سمجھ آگئی ہے۔ وہ جانتی ہے۔ شاپنگ

کی بات محض ایک جھوٹ ہے اسے سیم کے گھر پر

جانے سے روکنے کے لیے۔

کیا واقعی اس کے باب اس کے خلاف کوئی سازش کر

رہے تھے؟

کیا وہ اپنی سازش کامیاب کروانے کے لیے سیم کو

اس سے دور رکھ رہے تھے تاکہ سیم اس کی کوئی مدد نہ کر

سکے؟

ہاشم کا ابھی مزید بیٹھنے کا موڑ تھا مگر سیم ایک دم ہی

صوفے پر سے اٹھ اٹھی۔

"میرا خیال ہے ہاشم اب ہمیں چلنا چاہیے۔ بابا

جلدی سو جاتے ہیں۔ ان کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"ارے ایک کوہ دن دیر سو رہ جاتی ہے۔ تم لوگ

بیٹھو۔ مرا آ رہا ہے سب ساتھ بیٹھے ہیں۔" عائشہ

مسکرا کر سیم سے فوراً بولیں۔

"نہیں مہی! میں پھر آؤں گی۔"

اسے سیم جھنجھلائی ہوئی اور خفا لگ رہی تھی۔ وہ

زبردستی مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کا موڑ بہت خراب

تھا۔



سیم اور ہاشم کے خطے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے

میں آگئی تھی۔ وہ کچھ آنکھی ہوئی سی تھی۔ اسے اپنے

بابا کا سیم کے ساتھ سخت انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس

کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"بیٹا! میں اندر آ جاؤں؟" محمود خالد نے دروازہ

تھوڑا سا کھول کر اس سے پوچھا۔

"جی ہاں! آئیے پلیز۔" وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

محمود خالد اندر آ گئے تھے۔ وہ بے غماخ سنجیدہ تھے۔

اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

"سوئیں نہیں ابھی تک؟"

"جی نہیں سوئے گی تھی۔" وہ انہیں قہر سے

حیرت سے دیکھ کر بولی۔

انہوں نے رسالت سے اس سے پوچھا۔ اس نے
مراثات میں ہلایا۔ وہ انہیں تجسس دیکھ رہی تھی۔
"میں جانتا ہوں کٹھن! خنہیں مجھ سے بہت
شکایتیں ہیں۔ مجھے خود اپنے آپ سے بھی بہت
شکایتیں ہیں!"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔
 "میں تم بہنوں کے لیے ایک اچھی ماں نہ لا سکا۔
 میں نے ایک بری عورت سے شادی کی۔ یہ میری
 زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ پھر جب میں نے
 اپنی اس غلطی کو ٹھیک کرنا چاہا تب شاید بہت دیر ہو
 چکی تھی۔ میری اس غلطی کو ٹھیک کرنے کی کوشش
 میں تم نے بہت سفر کیا اور محنت۔"

۱۵ لیم کا ذکر کر کے کچھ بولتے بولتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر درد اور کرب ابھر آیا تھا۔ بچھتاوے ان کی آنکھوں سے جھانک رہے تھے۔

"خیر مجھ کو اس بات کو۔" وہ اسے کچھ بتاتے بتاتے

ماضی میں جو ہو چکا ہو چکا کٹھن اہم میں سے کوئی بھی اب اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں ہمارے دل میں میرے لیے جتنی بھی ناراضیاں ہیں تم ان سب کو دل سے نکال کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم میری بہت پیاری سہیلی ہو۔ تم نے شادی کے لیے ایک اچھے شخص کا انتخاب کیا ہے مجھے

سکندر بہت پسند آیا ہے میں نے اس کی آنکھوں میں
سچائی اور تمہارے لیے محبت دیکھی ہے سو جو میری
دل میں ایک خوف سا تھا ناں کلثوم اب کہ میں صرلہ
میری ضد میں کس کے کہنے میں اگر تم کسی غلط آدمی
انتخاب نہ کر لو۔ اہمدا اللہ دور ہو گیا ہے۔ میرا دل
تمہارے مستقبل کے حوالے سے مطمئن ہو گیا ہے
بیٹا!!

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ گارنڈھ گیا تھا۔ وہ ان کی میں پہلی بار یوں اپنے جذبات کا اس سے اظہار کر رہے تھے۔

”ایا! باپ کی آنکھوں کی نمی فوراً مجھے میں شامل
عجائبات کی شدت اس کی آنکھوں میں بھی نمی لے آئی
تھی۔“

”ایسا! اس کی آنکھیں یکدم ہی آنسوؤں سے भर گئیں۔ باپ کے اسے نزدیک بیٹھ کر ان کی آنکھوں میں نمی دیکھتے ہوئے وہ خوب قابو نہیں رکھ پالی تھی۔ محمود خالد نے یکدم ہی اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ رورے سے۔“

”کاشم! مجھے معاف کرو بیٹا! میری سب غلطیوں کے لیے مجھے معاف کرو۔ میری غلطیوں کی سزا میں سب خود کو مزید کوئی نقصان مت پہنچانا بیٹا!“

وہ ہوتے ہوئے اس سے کہہ رہے تھے۔ وہ باب
کے سینے پر سر رکھے بلک بلک کر روتی تھیں۔ پچھلی
خرومیاں، پچھلے کدو، کھانے سے کیا کیا رانجھا۔

”میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں کھٹوم! میری جان بھری زندگی ہو تم۔ میں تمہیں کبھی کسی دیکھ نہ سکے گی۔“

باپ سے اپنی کوئی ناراضی کوئی گلہ کوئی شکوہ اس سے نہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ محمود خلد روتے روتے اس سے بول رہے تھے۔

"تمہارا دل شفاف ہے بیٹا! اس لیے تم سب کو اپنی

وہ اسے بہت محبت بہت شفقت سے دیکھ رہے تھے۔



وہ اپنی اسٹڈی میں رانگ چیر رہے تھے۔ وہ ظالم اپنے مظالم کا حساب کرنے میں مصائب تو فائدہ آنکھوں سے یونہی دور ہو جاتی ہے جیسے ان کی آنکھوں سے۔ چند گھنٹے پہلے وہ اپنے اس بیٹے سے مل کر آئے تھے جس کی زندگی بگاڑنے کے وہ وہاں آئے تھے۔ جس سے اس کی شخصیت کی آن باں اس کی اما اور دقار سب کچھ چھین لینے کے وہ مجرم تھے۔

جو کسی کو جان سے مارے اسے بھاسکی کی سزا مل جاتی ہے مگر جو کسی کی مدح کا قتل کرے اس کے لیے کیا سزا ہوتی ہے؟

باپ تو اولاد کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں بچا ڈالتا ہے۔ اولاد کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنی زندگی روکن رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ کیسے باپ ہیں؟ آخر وہ کیسے باپ ہیں؟ انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر دی۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ بالکل ٹھیک اس کے کیا یہ وہ آج ان کے ساتھ۔

اس نے انہیں پایا کہہ کر مخاطب کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس نے ان کے گھر کا کھانا کھانا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو ان کا ریا تحفہ بھی قبول نہیں کرنے دیا۔ جو لوگ کو گھر پر لا کر انہوں نے آئینہ کے ساتھ بیٹھ کر خود لہذا کو دینے کے لیے سولے کے چار کنگن خریدے تھے۔ آئینہ انہیں حیرت سنہ دیکھ رہی تھیں اور وہ ان کی حیرت نظر انداز کیے رہے تھے۔

ٹھیک کیا سکندر نے لن کا تحفہ لن کے منہ پر مار کر چلا گیا۔ لن کا تو یہ منہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے غدار قبول کرنے پر اصرار ہی کیا ہے۔ آج ان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ سکندر سے اعتراف جرم ہی کیا ہے اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔

اس سے یہ کہہ پائے کہ وہ اس سے بہت پیار کرے۔

طرح سمجھتی ہو۔ مگر میری جان لہذا تمہاری طرح تھی اور شفاف نہیں ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔ لوگوں کو سمجھنا سیکھو۔ دلوں میں چھپی نظریں اور محبت لیے چروں کے پیچھے چھپے اصلی اور بد صورت چہرے پہچانا سیکھو۔

انہوں نے اس کا سر اپنے سینے پر سے ہٹایا تھا۔ اب وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے دو بال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کیں۔ خود کو سنبھالا کہ اسی طرح بے آواز روئے جا رہی تھی۔ برسوں کے جمع کیے اشک تھے انہیں بچانے لگتی دیر تک بہتے رہنا تھا۔ مگر اسے اپنے باپ کی کوئی بھی نصیحت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے آنسو صاف کرنے کے بعد اب وہ اپنے پوروں پر اس کے آنسو جن رہے تھے۔

”تم سے ایک بات کہوں مانو گی؟“
”جی ہاں!“ اس نے آنسو بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے یکدم ہی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

”تم مریم کے گھر مت جانا یا!“
”کیوں پایا!“ وہ بے طرح حیران ہوئی تھی۔
”بس میں تم سے کہہ رہا ہوں اس لیے اگر میری محبت کا یقین کر لی ہو تو مریم کے گھر ہرگز مت جانا۔ جب تنگستان میں ہو میرے ہی پاس رہو۔“
وہ اس کے ماتھے پر ہاتھ کر رہے تھے اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا اگرچہ وہ لن کے ایسا کہنے کی وجہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ اب تم سو جاؤ۔“
وہ اس کے پاس سے اٹھنے لگے تھے۔ یکدم ہی اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”پاپا! آئی لویو۔“
خود خالد بے ساختہ مسکرائے تھے۔ خوشی سے بھری طمانیت نے مسکراہٹ۔ انہوں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”جان پایا! پاپا بھی تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔“

کچھ طے کرتے رہیں گے۔ وہ سر جھکا کر ان کی فرمائش پوری کرتا رہا۔ ان کے معیار کے مطابق خود کو ثابت کرتا رہا۔

چھوٹا بیٹا جو نہ شکل و صورت میں لائق پر ہے نہ ذہانت میں۔ اس پر انہوں نے کبھی وقت بربادی نہیں کیا تھا۔ ابتدا ہی میں نظر اگیا تھا، وہ ان کے اور لائق کے باپ کی طرح غیر معمولی شخصیت اور ذہانت نہیں رکھتا

بیوی اور بچوں کے لیے پیسہ بھرت تھا، عیش و آرام بہت تھا مگر انہیں لائق کے سامنے سر اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ خود پسندی اور مغروریت کے ساتھ اپنے اعلاٰ حسب نسب پر فخر کرنے کا احساس انہوں نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کے اندر ایسا بٹھاتا تھا کہ کسی کو بھی اپنی برابری کا نہیں سمجھتے تھے۔ کسی اور کو تو کیا، انہوں نے بیوی تک کو کبھی اپنے دل کے اندر جھانکنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

جس خاندانی جادو و شہرت اور فیملی بیک گراؤند پروں فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ اندر سے انہیں اس پر فخر نہیں شرمندگی ہے، غصہ ہے، نفرت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں کو ان کے وادائیگی کی شان و شوکت، ذہانت اور قابلیت کے قصے سنائے تھے۔ اپنے باپ کو اپنے بچوں کے سامنے ایک امیڈل اور پریزیڈنٹ انسان کے طور پر پیش کیا تھا۔

کون جان سکتا تھا کہ اے اسی آئیڈل اور پریزیڈنٹ باپ سے وہ انتہائی حد تک نفرت کرتے تھے۔

وہ اپنے باپ کو نہ کل معاف کر پائے تھے نہ آج معاف کرنے کا ظرف ان میں پیدا ہو سکا تھا۔

ان کے اس سخت اور کھردرے مزاج کا وہمہ دار کوئی اور نہیں، لائق کا اپنا سا باپ تھا۔

(باقی آئندہ امان شاعر اللہ)

اپنے ہر ظلم پر بہت شرمندہ ہیں۔ وہ بالکل دور سے اسے اپنا پورٹ پر چھپ کر کھڑے دیکھتے رہتے تھے اور کھڑے اسے گیزائے کے ساتھ فارم ہاؤس میں آتا دیکھتے رہتے تھے۔ کتنا خیر و جوان ہو گیا تھا ان کا بیٹا۔ ہر پور تو اتنا طاقتور مر رہا۔

اتنی اخلاقی برائیاں میں نہ تھی کہ اسے اپنے سینے سے لگا سکتے۔ انہیں لگا تھا وہ تکمیل کر انہیں خود سے ہٹا دے گا۔

آئندہ ان کی آج کی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ لیں انہیں کہ انہوں نے سکندر اوزلن کی ہونے والی دای کو اپنی خاندانی شان و شوکت بنانے کے لیے فارم ہاؤس پر بدعو کیا تھا۔ زین بھی یقیناً یہی سمجھتا ہے اور اس سکندر بھی یہی سمجھا ہو گا اور وہ تینوں ایسا کیوں نہ تبصیر؟ ساری زندگی انہوں نے خود کو جیسا ثابت کر لیا تھا اب وہ سب انہیں ورسای تو سمجھ رہے ہیں۔ رحمت اور غور میں ذہن خود پسندی میں جھٹکا، اپنے اپنے خاندان پر فخر اور زعم کا شکار، ساری دنیا کو اپنے ہونے کی لوگ پر سمجھنے والے شہسار خان۔ ان کے دای اور بچے اگر آج انہیں ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ اپنے اندر کی کمزوریاں اور خامیاں ہمپائے رکھنے کو انہوں نے خود کو ساری زندگی لوگوں کے سامنے ظاہر ہی اسی طرح کیا تھا۔ ان کے بچے یہاں نہ کہ ان کی بیوی بھی انہیں چانتیں کہ وہ پوچھنے کی حد تک سخت مزاج اور اصول پسند کیوں ہیں۔ انہوں نے دای اور بچوں کو اتنے سخت اخلاقی میں کیوں رکھا جہاں ہر لائق کا حکم چلتا تھا اور بیوی اور بچوں کی رعایت تھی؟ ثابت تھی۔ وہ حکم دیں گے بیوی تعمیل کرے گی۔ دای کو نہ بولنے کی اجازت تھی نہ اس کی کوئی رائے نہ نہ نہ مرضی۔

براہیہا جو ان سے اور ان کے باپ سے غیر معمولی حد تک مشابہت رکھتا تھا اور جو لائق کے اور ان کے باپ کی طرح غیر معمولی ذہین تھا۔ اسے انہوں نے ہمیشہ اس خوف اور آزمائش میں جھٹلایا رکھا کہ وہ ان کے لیے کوئی معیار پر پورا اترتا رہے یا نہ اس کے لیے سب

فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے بغیر کسی ملازمہ کی مدد اور دو چابی جیسے کے باہر نہیں نکل سکتی تھیں سو ان کا زیادہ وقت کمرے ہی میں گزرا کرتا تھا۔ ان کے بابا اور چچا آتے جاتے مہل کی خیر و غایت دریافت کیا کرتے تھے۔

شہیار خان اس گھر کے سب سے بڑے بچے تھے۔ تب وہ آٹھ سال کے تھے۔ ان کی بہنیں صفیہ، نور و ربیعہ پانچ اور چار سال کی تھیں اور چچا کا بیٹا آٹھ منوہ کا تھا۔ انہوں نے اپنے بابا کو کام کی بات کے علاوہ کبھی چچی سے کوئی زیادہ بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ چچا سے بھی وہ عمر میں خاصے بڑے تھے تو ان پر بھی بڑے بھائیوں والا رعب رکھا کرتے تھے۔ دلوا دیا کے انتقال اور داؤی کی معذوری کے بعد اب ان کے بابا ہی عملی طور پر اس گھر کے سربراہ تھے۔

ایک رات انہیں خند نہیں آ رہی تھی۔ رات کا ایک ڈیڑھ بج رہا تھا۔ وہ پانی پینے کے لیے کمرے سے باہر نکلے تب ہی انہوں نے بابا کو اپنے کمرے سے نکلتے اور دو بے پاؤں چل کر چچا کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ فوراً "ستون کے پیچھے ہو گئے تھے بابا کا لاندہ اڑا تھا، ایسا پتھروں جیسا۔ وہ ہر طرف چوکنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

چچا کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر بھی بابا نے مڑ کر چاروں طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔ کہیں پر بھی کوئی نہیں ہے یہ اطمینان کر لینے کے بعد وہ اندر چلے گئے تھے۔ چچا تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے پھر بابا اپنی رات کو ان کے کمرے میں کیوں گئے تھے؟

ان کے دل کو بے چینی اور بے سکونی ہو رہی تھی۔ وہ دو بے پاؤں بغیر کچھ آواز پیدا کیے چل رہے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے اور سناتے سے ڈرے بغیر گھر کے رہائشی حصے سے باہر بیگ یا رڈ میں نکل آئے تھے۔ جہاں چچا کے کمرے کی بیک تھی۔ انہوں نے وہیں بیچوں کے محل خود کو اونٹنیا کے کمرے کی سے اندر جھانکا۔

کمرے میں موجود لوگوں کو شاید اپنی رات گئے بیک یا رڈ میں کسی کی موجودگی کی توقع نہیں ہوگی سو کمرے پر

انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باب کو بہت سخت مزاج انسان پایا تھا۔ وہ حاکمانہ طبیعت کے حامل تھے۔ بیوی بچوں پر رعب رکھنے والے شہیار خان اپنے بابا کے اگلیے بیٹے تھے مگر ان کی کبھی مجال نہ ہوئی تھی کہ باب سے بے تکلف بات چیت کر سکیں۔ باب تک اپنی ہر خواہش اور فرمائش پونچھنے کے لیے وہ بیٹوں ماں کا سارا لیتے تھے۔

ان کی امی جی خولانہ کے بابا کے آگے جھکی جھکی کسی کنیر کی طرح رہا کرتی تھیں۔ انہیں تو ایسا لگا تھا امی جی بھی بابا سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ بہت محتاط ہو کر ان کا مہیو دیکھ کر ایک ایک لفظ لب لبول کر دیاں سے بات کرتی تھیں۔ پتا نہیں بابا کسی سے خوش ہو کر نہیں کمرے تکلف سے بات کرتے بھی تھے کہ نہیں۔ کم از کم بیوی بچوں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی خوشگوار انداز میں مسکرا کر باتیں نہیں کی تھیں۔ ہمیشہ حکم ہی صادر کیے تھے۔ ہمیشہ اپنے فرماں منواتے ہی تھے۔ خاندانی جاہ و جلال، ریویہ پیہ پیہ، عالی شان گھر، گاڑیاں گھر میں سب کچھ تھا مگر وہاں ان کی امی جی اور ان بھالی بہنوں کو ہول کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

ان کے کمرے میں ج سے بڑھ کر تھے بابا کا رویہ بیوی کے ساتھ اپنی غلاموں والا ہوتا تھا۔ ان کے گھر میں جو اسٹ فنیل سسٹم تھا۔ وہاں ان کی دادی بھی تھیں پچا اور چچی بھی تھے اور ان دونوں کا بیٹا بابا بھی تھا۔

چچی اس گھر میں پیدا کرکٹی آئی تھیں۔ وہ خاصی شوخ و چوچل تھیں۔ وہ بے تحاشا خوب صورت تھیں۔ شہیار خان کی پانچ سال کی بہن صفیہ کو وہ کبھی کسی فلمی لڑاکا کی جیسی لکھتیں اور کبھی کسی فلمی لڑاکارہ سے بھی لڑاوا حسین۔ اندرون سندھ ان کی زمینیں بھی تھیں اور قبائلیاں بھی جن کے تمام معاملات چچا سنبھالا کرتے تھے۔ سو انہیں چہرہ بہتے شہر سے باہر جانا ہوتا تھا۔ کبھی ایک دن کے لیے "بھٹی" دو تین دنوں کے لیے۔ ناہ کراچی میں تمام کاروباری معاملات ان کے بابا دیکھا لیتے تھے۔

داؤی بہت ضعیف اور بھلا تھیں۔ جب سے ان پر

روے گرانے بھول گئے ہوں گے یا پھر شاید نفس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی ہوگی۔
اندروں کا منظر دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ چچا چچی کا بیٹا کلب میں بے خبر سو رہا تھا اور اس کے بابا اور چچی بیڈ پر ایک دوسرے کی ہانپوں میں بالکل مدھوش پڑے تھے۔ انتہائی شرمناک حالت میں۔
مدھوشی میں جو باتیں وہ دونوں ایک دوسرے سے کر رہے تھے انہیں سن کر ان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

”میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں وقار! اجمل زیب او آب کے ایشب بھی نہیں۔“
”مگر اس کی قسمت دیکھو اسے تم جیسی حسین لڑکی مل گئی اور مجھے وہ جاہل مغزاور عورت۔ جہاں زیب بہت لگی ہے۔“

”مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں وقار! میں آپ کی ہوں۔“

”اور جو راتیں اس کے ساتھ گزارتی ہو وہ؟“
”وہ تو مجبوری سے وقار۔ دل سے تو مجھے صرف آپ کے نزدیک رہنا اچھا لگتا ہے۔“

”اب کی بار میں نے ایسا کاموں میں الجھا کر بھیجا ہے اس کو۔ پانچ دن سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ یہ پانچ راتیں ہماری ہوں گی۔ میری اور تمہاری۔“
”خود کو مجھے میں بولتے بابا چچی کے کور بھی نزدیک ہو گئے تھے۔“

”اٹھ سال کے بچے کو گناہ، زنا اور بدکاری کے الفاظ نہیں جانتے، رشتوں کا تقدس بھی، ابھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر پھر بھی انہیں یہ سب بہت غلط، بہت برا لگا تھا۔ انہیں اپنے بابا بہت برے لگے تھے۔“

وہ ساری رات جانتے رہے تھے۔ کبھی ان کا دل چاہتا، وہ جا کر اکیلی جی کو اٹھا دیں۔ انہیں سب کچھ بتا دیں، کبھی دل چاہتا، بابا اور چچی کو جاں سے مار دیں۔ انہیں یہ تو سمجھ میں آگیا تھا کہ ہنستے کے جتنے دن بچاؤ دوسرے شہر میں ہوتے تھے، ان تمام دنوں کی راتیں بابا چچی کے کمرے میں ان کے ساتھ گزارتے تھے جیسے تیسرے

انہوں نے صبح ہوئے کا انتظار کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی ۱۱ بجھاگ کر اکیلی جی کے کمرے میں آئے تھے۔ عمدہ دلیلی کو دیکھتے ہی ٹھیک کر رک گئے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ روروں کی سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا وہ ساری رات روتی رہی تھیں۔
وہ اپنی جگہ بالکل سن ہو کر کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ ماں کو لاٹھیاں سمجھ کر انہیں بابا اور چچی کے نعلین کے بارے میں بتاتے آئے تھے۔ مگر وہاں تو ان کی ماں کی روتی ہوئی درجن بھر آنکھیں اور اجاڑ وجود یہ داستان سنا رہا تھا کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں۔

ان کی اکیلی جی سب جانتی تھیں اور چپ تھیں۔ اکیلی جی چپ کیوں تھیں، وہ دواوی سے کہیں ’ہانا‘ ’نانی‘ سے بابا کی شکایت کرتیں۔ وہ ان کی خاموشی پر بہت الجھے تھے۔

رات بابا کو چچی کی ہانپوں میں دیکھ کر ان کا دل چلا ہوا تھا۔ وہ ان کے پیٹ میں چاٹتا اور دوس۔ بابا سے اکیلی شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔ مگر صبح جب بابا سے سامنا ہوا تو کچھ کرنا تو درکنار، تو نفرت بھری نگاہوں سے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ کر نہ کہہ سکے تھے۔ بابا کی وہ ہشت اور بہت اتنی تھی۔ وہ روزانہ کی طرح ان کے آگے سر جھکا کر ہی بیٹھے رہے تھے۔ بابا سے تو کیا وہ خوف کے مارے کسی اور سے بھی کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ اگر بابا کو پتا چل گیا کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہے تو بابا تو ان کی کھال اڈھیر کر رکھ دیں گے۔

وہ اس روز اپنے کمرے میں بالکل اکیلے سب سے چھپ کر بہت روئے تھے۔ اپنی کمزوری اور بزدلی پر اپنی ماں کی بے بسی اور خاموشی پر اور اپنے باپ کے علم پر۔ وہ چپ رہے تھے۔
پھر وہ چپ ہوتے چلے گئے۔

جیسے جیسے ان میں سمجھ داری آئے گی، انہیں یہ بھی پتا چلے گا کہ ان کی اکیلی جی بابا اور چچی کے اس ناجائز رشتے کے بارے میں جانتی ہیں۔

وہ جس رات بابا کو چچی کے کمرے میں جانا دیکھنے اس کی صبح ماں کی روروں کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھا

کے روئے سننے زمین کو سکندر سے مقابلہ بازی اور حسد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ انہوں نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ زمین اور سکندر کے بیچ بھائیوں جیسی بے تکلفی اور دوستی نہیں بلکہ سردہری اور بہت فاصلہ ہے۔ انہوں نے اس بات کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ بیوی، بچوں کے احساسات کو وہ سوچا ہی کب کرتے تھے۔

بارہ سال قبل 31 دسمبر کی اس شام کو جب نیا ایر پارل میں جاتے جاتے وہ گھر واپس آئے تھے تب اپنے گھر کا وہ منظر دیکھ کر وہ تھکے سے پاگل سے ہو گئے تھے۔ ان کا بیٹا اپنی ہونے والی بھانجی کے ساتھ؟

انہیں اس بل سکندر کی شکل میں اپنا باب نظر آیا تھا، ام مریم کی روئے کی آواز ان میں اپنی ماں کے گھٹ گھٹ کر روئے کی آواز سنائی دی تھی۔ کل وہ کمزور تھے۔ باپ سے ڈرتے تھے۔ ان کے آگے کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکے تھے۔ ماں کی حمایت میں اٹھ نہ سکے تھے۔ باب کو اس گھناؤنے عمل اور ظلم سے روک نہ سکے تھے۔ مگر آج وہ کمزور نہیں۔ آج وہ طاقتور ہیں۔ آج وہ حاکم ہیں۔ باپ کے خلاف ان کے اندر جتنا بھی باہل اور غصہ تھا وہ سب باہر نکل آیا تھا۔

انہیں اپنی ماں کے آنسوؤں اور دکھوں کا حساب لینا تھا اس بدکار شخص سے۔ وہ ام مریم کی تہوں اور مسکروں میں مسلسل اپنی ماں کی آہیں سن رہے تھے۔ ایک جنون، ایک پاگل پن سالن پر سوار تھا۔ ضد اور جنون ان سے ان کے ہوش اور سوچ سمجھ چھین کر لے گیا تھا۔ وہ سکندر کو نہیں بلکہ اپنے بدکردار باپ کو اپنی زندگی سے باہر نکال رہے ہیں۔ رشتوں کی دھجیاں اڑانے والا ان کا بدکردار بیٹا صرف شکل و صورت اور ذہانت ہی میں اپنے دادا پر نہیں گھیا تھا، وہ عادتیں اور خصلتیں بھی دادا کی سی لے کر پیدا ہوا تھا۔ بدکردار، نفس کا غلام، اپنے ہی گھر کی عزت پر نظر رکھنے والا۔

سکندر کے ساتھ انہوں نے وقار خان کو اپنے بابا کو بھی اس گھر سے دھکے مار مار کر نکل دیا تھا۔ انہیں اپنے فیصلے پر نہ انبوس ہوا تھا نہ پچھتاوا۔ برسوں سے ان کے

کرتے۔ امی جی بابا سے خوف زدہ تھیں۔ بابا انہیں اپنے گھر سے نکال دیں گے، انہیں نانا، نانی کے گھر بھیج دیں گے، انہیں طلاق دے دیں گے۔

وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھیں، ختم ہو رہی تھیں۔ خوف کے سبب ان میں بابا کے آگے سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی مگر دل میں ان کے لیے نفرت ہی نفرت اور غصہ ہی غصہ تھا۔

بابا کے بچپن کے ساتھ ناجائز تعلقات ختم نہ ہوئے تھے۔ ہاں! غم میں گھلتی، ظلم، جبر اور زیادتی کو خاموشی سے چپ چاپ سستی سستی ان کی امی کی ایک درز ضرور ختم ہو گئی تھیں۔

باب کی اس منافقانہ و ہری شخصیت اور گھناؤنے عمل نے ان کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

بیوی کے ساتھ سخت رویہ، بچوں کے ساتھ حاکمانہ انداز۔ آمنہ ان کی ماں کی طرح صابر تھیں۔ ان کے سخت رویے اور مطلق العنانی کو سر جھکا کر قبول کر گئی تھیں اور سچے اسی طرح کمزور تھے جیسے کل اپنے بچپن میں وہ کمزور تھے۔

سدا اس دنیا میں کس نے رہنا ہوتا ہے۔ اپنے تمام گھناؤنے اعمال اور ظلم و زیادتی ساتھ لیے ان کے بابا ان کی امی جی کے انتقال کے برسوں بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اپنے اندر کا احسان کبیری اور شرم ناک بچپن چھپانے کے لیے انہوں نے بیوی اور بچوں کے سامنے ہمیشہ اپنے بابا کی تعریفوں میں زمین، آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ آخر ان کے بدکردار بابا تھے تو ایک بے تحاشا ذہن اور خوب صورت مرد۔ وہ اپنے بابا پر تھے اور سکندر ان دونوں پر۔ وہ سکندر کو اپنے جیسا اور اپنے بابا جیسا کامیاب انسان بننے کی نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود بھی تھیں۔ وہ بن سکتا تھا ان دونوں جیسا۔

اپنی تمام توجہ سکندر پر مرکوز کر کے وہ زمین کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا۔ ان

سنے میں لگی آگ ابھی تھی۔ آج وہ چپ نہ رہے تھے۔ آج انہوں نے غلط کو غلط کہا تھا۔ مجرم کو مجرم کہا تھا۔ زانی کو زانی کہا تھا۔

زین خاموش تھا۔ ام مہرین ان کے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی اور آمنہ مسلسل رو رہی تھیں۔ وہ بار بار ان سے التجا میں کر رہی تھیں کہ وہ سکندر کو گھر واپس لے آئیں۔ وہ آمنہ پر بہت زور سے چلائے تھے۔ ان کے گھر میں موت کا سا سناٹا اور دیرانی تھی۔ سکندر پھر گھر آیا تھا۔

”میں بے گناہ ہوں بابا! اس لڑکی کا مجھ پر لگایا ہر الزام جھوٹا ہے۔“

کل دو ہفتہ گھر آکر پریشان ہو کر رو کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ آج مضبوط لہجے میں۔ مگر وہ اس کی بات نہ کل سننے پر راضی تھے نہ آج۔ انہیں محبت تو دور اس پر رحم تک نہیں آیا تھا اس بل۔ وہ ابھی صرف بیس سال کا ہے بہت جھوٹا ہے۔ وہ کہاں جائے گا کیا کرے گا کیسے زندہ رہے گا؟ انہیں ان میں سے کسی بھی بات کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جو جیسہ وہ آرام سے بے درجہ خرچ کرتا ہے وہ کیا کس طرح جاتا ہے؟ وہ سخت لہجے میں اسے اپنے گھر اور زندگی سے نکل جانے کا حکم دے رہے تھے۔

انہیں پتا تھا وہاں زین بھی کھڑا ہے۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ زین چاہتا ہے وہ سکندر کو پھر گھر سے نکل دیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ زین کی خاموشی میں بہت سے احتجاج وہ سن رہے تھے۔

”آپ نے ہمیشہ اس میں اور مجھ میں فرق رکھا اور اب بھی رکھ رہے ہیں؟ بے گناہ اگر میں نے کیا ہوتا تو کبھی معاف نہ کیا جاتا۔ مگر آپ کے قاتل اور لائق بیٹے نے کیا ہے تو اسے معافی مل جائے گی۔“

انہوں نے اس بل بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کے سخت اور حاکمانہ رویوں کا اثر ان کے بچوں پر کس قدر منفی انداز میں پڑا ہے۔ زین کو ہر وقت سکندر کی مثالیں دے دے کر اور پھر اسے نظر انداز کر کے انہوں نے ان دونوں بھائیوں کے بچ کس قدر نفرت پیدا کر دی

ہے۔ انہوں نے سوچا تھا تو یہ کہ زین کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اسے بتا دیں کہ اپنے باپ کی خصلت پر پیدا ہوئے سکندر شہسوار کو وہ مرتے دم تک معاف نہیں کریں گے۔

روٹی ہوئی آمنہ وہاں آئیں سکندر کی حمایت میں بولیں تو انہوں نے غصے سے انہیں جھڑک دیا تھا۔ انہیں آمنہ کی باتوں پر سخت غصہ آ رہا تھا مگر وہ دانش سے کام لیتے رہتے اگر آمنہ ان کے بابا کا بیٹا ہے تو لا تقبل۔

”کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کہاں دے رہے ہیں؟ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہسوار۔“

آمنہ کے الفاظ انہیں آپے سے باہر کر گئے تھے۔ آمنہ کو ان کے بابا کے بارے میں کیسے پتا چل گیا؟ اس راڈ کا ٹران کے ان کی امی جی اور چچی کے سوا کوئی کواں تک نہ تھا۔ پھر آمنہ کو کیسے؟ وہ طیش میں آ کر تیز اور تندی سب کچھ بھول گئے تھے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار آمنہ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا اور انہیں گالی بھی دی تھی۔ سکندر نے انہیں آمنہ کے منہ پر دو سرا پھینک نہیں مارے دیا تھا۔ وہ پھر اس نے اپنے کال پر کہا یا تھا۔

وہ ایک دم ہی اپنی صفائی میں مزید کچھ بھی کے بغیر وہاں سے جانے لگا تھا۔ نکلنے سے قبل اس نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی اور سکندر کی نگاہیں ملی تھیں۔ سکندر کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وہ مظلوم ہے۔ بے گناہ ہے۔ اس پر جمعنا الزام لگا گیا تھا۔ مگر وہ اس وقت اپنے آپ میں کب تھے؟ آمنہ کے منہ سے باپ کا طعنہ، باپ کی گالی انہیں بالکل آپے سے باہر کیے ہوئے تھی۔

ان کے گھر میں جیسے کسی کی موت ہو گئی تھی۔ آمنہ ہر وقت روٹی رہتی تھیں۔ ”کون مر گیا ہے اس گھر میں؟ کس کا نام بتائی رہتی ہو ہر وقت؟“

چند دن پروا داشت کرنے کے بعد انہوں نے آمنہ کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جیت گئی تھی۔ انسان، جیت گیا تھا۔ گناہ اور گناہ گار ہار گئے تھے۔ مظلوم جیت گئے تھے۔ مگر ایک باپ ہار گیا تھا۔

ان کے اندر وہ باپ رو رہا تھا۔ جس نے کج سنی دنوں بعد اپنے بیٹے کی آواز سنی تھی اس حال میں کہ ان کا بیٹا زخمی تھا، شاید وہ بیمار تھا، شاید اسے چوٹ لگی تھی۔ نجانے وہ کس مشکل میں تھا۔ اسے کہاں چوٹ لگی تھی۔ وہ کس طرح ہلک ہلک کر رو رہا تھا۔ ان کا آسائشوں میں پلاہ بیٹا باہر دنیا کی سختیاں نجانے کس طرح سہہ رہا تھا، نجانے دنیا نے ان کو گلوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا جو یوں رو رہا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا تھا۔ سکندر کی اس فون کال کا ذکر انہوں نے آمنہ سے کرنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے اس فون کال کو بالکل بھلا چکے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود انہوں نے بالٹی مور سے کی جانے والی اس کال کا وہ فون نمبر اپنے پاس محفوظ رکھا تھا۔ جس سے سکندر نے انہیں کال کی تھی۔ نجانے کیوں؟

دن پردن گزر رہے تھے۔ وہ اندری اندر سکندر کے لیے بے چین ہوا کرتے تھے مگر خود سے بھی یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ آمنہ کی خیال نہ تھی کہ سکندر کا نام لے سکیں، اسے یاد کر کے ایک آنسو بھی بہا سکیں۔ کہاں سے دل لائے تھے وہ یہ سب کرنے کے لیے؟ مگر جب وہ سب کر رہے تھے تو لگتا تھا وہ حق پر ہیں۔ وہ اصول کی بات کر رہے ہیں۔

دن میٹوں میں اور صبیٹے سالوں میں بدل رہے تھے۔ جو خواب انہوں نے سکندر کے لیے دیکھے تھے انہیں زمین پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہار دڑ سے لاء کر رہا تھا۔

اور سکندر؟ وہ کہاں تھا؟ وہ کن کے لیے مرجھا تھا۔ آمنہ بیمار رہنے لگی تھیں، انہیں پروا نہیں تھی ان کے گھر میں موت کا سناٹا رہنے لگا تھا۔ انہیں پروا نہ تھی۔ ان کی رشتہ منٹ ہو گئی تھی۔ وہ آمنہ کو سامنے لے کر پاکستان واپس آ گئے تھے۔ ان کے بابا کی وفات کے بعد چچا نے فیکٹریوں اور ملوں کے معاملات کو سنبھالا تھا مگر

بہت سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ آمنہ نے ان کے خوف سے کن کے سامنے رونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان سے جھپ جھپ کر تنہائی میں رو رہے تھے۔ آمنہ کی خاموشی خالی اور دیران آنکھیں ہر لمحے ان سے التجا کرتی تھیں کہ سکندر کو واپس بلا لیں۔ اسے دعوہ کر واپس گھر لے آئیں۔ ان پر آمنہ کی ان التجا کرتی رحم کی جھپک باگتی نگاہوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

پھر اس روز جب سکندر کو ان کے گھر سے گئے آٹھ یا دس دن ہی ہوئے تھے اس کا فون کیا۔ ایک انہوں نمبر سے۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف کے عالم میں بول رہا تھا۔ جیسے زخمی ہو کر اسے چوٹ لگی ہوئی ہو اسے بولنے میں دشواری کا سامنا ہو۔

”پاپا! کل رات۔۔۔ پاپا! کل رات میرے ساتھ۔۔۔“
دور سے ہوئے سائیں ایں کیا جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ فون اس کی آواز سننے ہی غصے سے پاگل ہوئے لگے تھے۔ تھا وہ بد کردار اپنے روادا کی طرح عیاش اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والا۔ اسی فائل کہ دنیا کی ٹھوکروں میں بڑا رہے۔ وہ رو رہے تھے۔ ان کی منت کر رہا تھا۔
”پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پاپا! مجھے آکر لے جائیں۔ میں مری جاؤں گا۔ پاپا! پاپا! مجھے پاپا لیں۔“

وہ زار و قطار رو رہے ہوئے تکلیف سے گراہ بھی رہا تھا۔ کیا اسے چوٹ لگی تھی؟ کیا وہ زخمی تھا؟ وہ کہاں تھا؟ ان کے اندر ایک باپ بہت بے چین اور مضطرب ہوا تھا۔ مگر نہیں۔ تنہا باپ کو کمزور نہیں رہنا۔ اگر یہ باپ کمزور پڑا تو وقار خان جیت جائے گا۔ ان کی ماں بار جائے گی۔ وقار خان ساری زندگی گناہ کر کے بھی عزت دار رہا تھا اور انہیں مظلوم ہو کر بھی خاموش دیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ آج وقار خان کو ہارنا تھا۔ ان کی امی جی کو جیتنا تھا۔ یہ تو یوم حساب تھا۔ یہ تو سزا اور جزا کا دن تھا۔

”میرے گھر میں تم جیسے بد کردار اور بد فطرت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم میرے لیے مرجھے ہو۔ میں تمہیں روچکا ہوں۔“

اور وقار خان ہار گیا تھا۔ امی جی جیت گئی تھیں۔ سزا

مری ہوئی ماں کے آنسو بھی پاؤں آتے تھے۔ اگر کچھ حاوی ہوتا تھا تو بیچہناوے، فکر اندیشے، غم، دکھ، آنسو، آپس اگر کچھ باو آتا تھا تو اپنی ماں باپ سال پہلے بھی پتا چل سکتا تھا کہ سکندر کسی ہسپتال سے فون کر رہا تھا مگر تب تو باپ کو ہراسے کا جنون ان کے سر پر سوار تھا۔ تب نے وصوفیہ کا کتنا آسان تھا۔ مگر اب سالوں کے بعد؟ اب اتنی بڑی دنیا میں وہ اسے کہاں ڈھونڈیں؟

دیوانگی کے عالم میں انہوں نے سکندر کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا۔ آمنہ سے کسی کا فرض کاغذ تراش کر وہ امریکہ آئے تھے۔ زین تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان دنوں دوستوں کے ساتھ یورپ گھومنے گیا ہوا تھا۔ امریکہ آتے ہی وہ سیدھے ہائی مور کے اسی ہسپتال پہنچے تھے جہاں سے وہ سکندر کی تلاش شروع کرنا چاہتے تھے۔

وہ ورلڈ بینک میں اتنی اونچی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ آج بھی ان کے بہت تعلقات اور بہت اثر و رسوخ تھا۔ سو ہسپتال کے عملے کو انہیں ان کی مطلوبہ معلومات کا ریکارڈ ڈھونڈ کر دینے میں اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ان تاریخ اور وقت بتایا تھا۔ کیا سکندر شہر یا نام کا کوئی ہسپتال (مریض) یہاں داخل تھا؟ وہ کس مرض میں مبتلا تھا؟ اس کا کس نوعیت کا علاج کیا جا رہا تھا یہاں پر؟

کمپیوٹر پر ٹھٹ کھٹ اس لڑکی کے ہاتھ چل رہے تھے۔ وہ پانچ سال پرانا ریکارڈ نکال چکی تھی۔ جنوری کے مہینے کی انیس تاریخوں کا دورہ ہوتا رہا تھا۔

وہ کہہ دی تھی کہ ہاں سکندر شہر یا نام کا ایک ہسپتال یہاں داخل کیا گیا تھا۔ وہ یہاں ایک ہفتے تک زیر علاج رہا تھا۔

”کیا اس کا کوئی امکسڈنٹ وغیرہ؟“ انہوں نے نیکیا لی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

پیشہ ورانہ نوعیت کے غیر جذباتی سے انداز میں کمپیوٹر کی طرف دیکھتے وہ لڑکی بتا رہی تھی کہ سکندر شہر یا نام کا Gang rape کا نشانہ بنا تھا۔ نوعیت بری طرح زخمی تھا۔ صاحب یہاں داخل کیا گیا تھا۔ اس کی کمر

چند سال ہوئے ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا تو اب ان کی کوئی سب کی کوئی بھال کرنا تھی۔

وہ گزشتہ چند سالوں سے امریکہ میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سال میں دس سے تین چکر لگا رہے تھے تاکہ خاندانی بزنس کی ساتھ ساتھ رہے۔

خاندان، عزت، نام، مرتبہ، بہت اہم تھیں یہ تمام چیزیں ان کے لیے۔ بظاہر کسی کو بھی لگتا نہیں تھا کہ وہ بھی سکندر کو سوچتے بھی ہوں گے۔ مگر وہ اسے سوچتے تھے۔ خوسے بھی چھپا کر۔ وہ دن میں جتنے بھی مضبوط نظر آتے تھے گمرات میں وہ سو نہیں پاتے تھے۔

سکندر کہاں تھا؟ پانچ سال بیت چکے تھے اسے ان سب کی زندگیوں سے نکلے آخر وہ اب کہاں تھا؟ ایک روز جب دل کی بے قی، بہت ہی بڑی تھ اب انہوں نے پانچ سالوں سے اپنے پاس محفوظ وہ فون نمبر نکالا تھا۔ انہوں نے اس نمبر پر کال کی تھی۔ وہ ہائی مور کے ایک ہسپتال کا نمبر تھا۔

وہ ایک ہسپتال کا نمبر تھا؟ وہ کانپ گئے تھے۔

”یہاں کل رات سب یہاں کل رات میرے ساتھ۔۔۔“ ان کے کانوں میں اس کی تکلیف سے کراہتی اور زار و قطار روٹی ہوئی آواز گونجی تھی۔ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ کل رات؟ کوئی حادثہ؟ کوئی کار امکسڈنٹ؟ کیا؟ آخر کیا؟ دوسرے باؤل تک پیسہ میں منا گئے تھے۔ وہ روزے تھے۔ وہ پانچ سال بعد روزے تھے۔

”یہاں! مجھے گھبراہٹ ہے۔ پلیز یہاں! مجھے آکر لے جائیں۔“

اس کی روٹی، فریاد کرتی آواز اس کی آپس ان کا دل ہار دی تھی۔ کسی غیر کو بھی اس طرح التجا کے جانے پر رحم آجائے مگر سکندر بد نصیب تھا۔ اس کے بچے باپ کو اس پر رحم نہیں آیا تھا۔ اس روز انہیں نہ اپنی ماں یاد آئی تھی نہ باپ۔ اس روز انہیں صرف اور صرف سکندر یاد آیا تھا۔ باپ کو ہراسے کی دیوانگی اور جنون میں انہوں نے اپنا بیٹا مار دیا تھا۔ اپنا سکندر مار دیا تھا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھوڑا تھا۔ پانچ سالوں کے بعد اب باپ کو ہراسے کا کوئی احساس ان پر حاوی نہ ہوا تھا۔

وہ کرسمس کی ان چھٹیوں کے بعد کبھی واپس نہیں آیا تھا نہ بوشن نہ کیمبرج اور نہ ہی کیمپس بارڈر گریجویٹ ڈائریکٹری میں نہ تو سکندر کے اپنے بیچ میں نہ ہی اس کے بعد کے کسی بیچ میں اس کا کوئی نام و نشان ملا تھا۔

وہ جتنا ڈھونڈ سکتے تھے انہوں نے ڈھونڈا تھا۔ مگر سکندر کا پتا کیمس نہ چلا تھا وہ امریکہ تھا کئی ریاستوں پر مشتمل ایک بہت بڑا ملک وہ بغیر کسی اتے پتے کے اتنے بڑے ملک میں اسے کیسے تلاش کرتے اب؟ وہ دونوں ہاتھوں سے باہوں کو فوج فوج کر بری طرح جھڑپے تھے۔ ناکام اور مایوس وہ پاکستان لوٹ آئے تھے۔ واپس آنے کے بعد ان میں آمنہ سے لگا ہوا ملائے کا حوصلہ نہ تھا۔ کیا کہیں وہ آمنہ سے کہ اپنے بیٹے کو اس کی ایک غلطی کی جتنی کڑی سزا دی انہوں نے مہلک بھی ہوئی جا سکتی تھی سکندر کی وہ ایک غلطی۔

انہیں بریل، ہر گھڑی سکندر کا خیال آتا۔ وہ اپنے تمام اثر و رسوخ استعمال کر کے ابھی بھی اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر جیسے جیسے اس کی تلاش میں ناکامی ہو رہی تھی ویسے ویسے یہ خوفناک خیال دل میں ابھر رہا تھا کہ کیس ایسا تو نہیں کہ سکندر زندہ ہی نہیں؟ یہ خوفناک خیال دل میں آتا تو وہ ملک ملک کر دوڑتے۔ ”نہیں خدایا! میرے گناہ کی اتنی کڑی سزا مجھے مت دینا۔ وہ مجھے زندگی بھر اب بھی نہ ملے مگر مجھے صرف اتنا پتا چل جائے کہ وہ زندہ ہے۔“

انہوں نے سکندر کو تلاش کرنے کے لیے انٹرنیٹ کے استعمال میں مہارت حاصل کی تھی۔ یہ کج سے تقریباً ساڑھے چار سال قبل کی بات تھی بوشن نیٹ ورکنگ سائنس، دوسری دہائی سائنس اور ہر جگہ اسے تلاش کر رہے تھے مگر وہاں بھی وہ اسے ڈھونڈ نہیں پا رہے تھے۔

آمنہ کی صحت و فائدہ بن گرتی چلی جا رہی تھی۔ عیم کوششوں کے بعد انٹرنیٹ دی کے ذریعے انہیں مہمفیس کے اس لاء اسکول کا پتا چلا تھا جہاں کے enrolled اسٹوڈنٹس میں سکندر شہباز ولد شہباز

گرہن اور باندو کی رشد ید چو میں آئی تھیں اس کی پسیاں ستار ہوئی تھیں ایک آنکھ بھی ستار ہوئی تھی بیٹائی گئی تھی۔ اس کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ وہ اگر دیوار کا سہارا نہ لیتے تو بیچ کر پڑتے۔

”دیا پلین۔ مجھے اگر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے بچالیں۔“ اس انجان لڑکی کے سامنے ان کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے تھے۔

انہیں خود پتا نہیں تھا کہ وہ دور سے ہیں۔ وہ لڑکی انہیں ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ چند سیکنڈ بالکل خاموش رہنے کے بعد انہوں نے شکستہ لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

”وہ کس کی بیٹی کو یہاں سے ڈسچارج ہوا تھا؟“ لڑکی نے انہیں نائن بتا دی تھی۔

”وہ یہاں سے کہاں گیا تھا؟“ لڑکی نے معذرت کرنے والے انداز میں اعلیٰ کا اظہار کیا تھا۔

”اسے یہاں لے کر کون آیا تھا؟“ لڑکی کے پاس ان کے اس سوال کا بھی جواب نہیں تھا اور لن کے ان سوالوں کے جواب صرف ہسپتال کے عملے کے پاس ہی نہیں بلکہ کسی کے بھی پاس نہیں تھے۔

انہوں نے پاگلوں کی طرح جنونی انداز میں دیوانگی کے ساتھ سکندر کی تلاش شروع کی تھی۔ وہ بوشن آ گئے تھے۔ بوشن میں، کیمبرج میں، بارڈر میں انہوں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی جہاں سکندر کو نہ ڈھونڈا ہو۔ انہوں نے سکندر کے دوستوں کا فلاں فیلوز اساتذہ اور کمبینن جن مختلف لوگوں سے ملاقاتیں اور فون کالز کر کے سکندر کے بارے میں پوچھا تھا۔

اس کے فلاں فیلوز اس کے دوست تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی اپنی عملی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔

اب کوئی کہیں رہتا تھا کوئی کہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو تو ڈھونڈنا بھی ایک مرحلہ رہا تھا۔ لیکن انہوں نے انہیں کسی نہ کسی طرح ڈھونڈا تھا۔ مگر جواب پر ایک کے پاس سے یہی مل رہا تھا کہ اس نے سکندر کو پانچ سالوں سے نہیں دیکھا۔ سب یہی بتا رہے تھے انہوں نے سکندر کو پانچ سالوں سے نہیں دیکھا۔

ایک اطالوی دوست سے ملنے کے لیے کراچی کے ایک فائو اسٹار ہوٹل میں آنا پڑا۔

یونیورسٹی کے دنوں کا دوست تھا۔ سالوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کراچی میں قیام مختصر تھا۔ اسے اسی رات اپنی بیٹی کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جانا تھا کہ وہ ہاپ بیٹی یہاں کو بیٹائی کے لیے آئے تھے۔ ہوٹل میں وہ اپنے دوست اور اس کی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے suite کی طرف جا رہے تھے جب انہوں نے لفٹ سے نکلتی ایک بے پناہ خوب صورت لڑکی اور اس کے ساتھ ہاشم اسد کو دیکھا۔

ہاشم اسد کے ساتھ ان کی براہ راست کوئی دوستی اور راہ دور سم نہ تھی۔ مگر کراچی کے کاروباری حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ ایک ہاپی پروفاصل شخص جس سے ملنا اور تعلق رکھنا لوگ باعث فخر سمجھا کرتے تھے۔ جب ایک بار وہ کاروباری نوعیت کے ذریعہ یارنیز اور کانفرنسوں میں اس سے مل چکے تھے گفتگو کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے ہاشم اسد شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔

وہ ہاشم کو اس فائو اسٹار ہوٹل میں ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایک اور کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر اس قدر نہ چونکے اگر وہ اس لڑکی کو پہچانتے نہ ہوتے۔ ساڑھے سات سال طویل عرصہ تھا مگر اتنا طویل بھی نہیں کہ وہ ام مریم کو پہچان نہ پاتے۔ جبکہ اس میں کچھ خاص تبدیلی بھی نہ آئی تھی۔ وہ دیکھی آس مسلم، افسارٹ، حسین اور نازک سی تھی جیسی ساڑھے سات سال قبل تھی۔

ام مریم اور ہاشم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، کسی دواغٹک کیل کی طرح ایک دوسرے میں گم اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ام مریم کو ہاشم کے ساتھ دیکھ کر چونکے تھے اس لیے کہ وہ ایک پارٹی میں ہاشم کی بیوی سے بھی مل چکے تھے۔ وہ ام مریم کا لباس دیکھ کر انکشت بدندان دلا گئے تھے۔

وہ جس ام مریم کو جانتے تھے وہ بے شک جینز اور

خان کا نام بھی شامل تھا۔ یہ بھی ان کی خوش نصیبی ہی تھی ورنہ اتنے بڑے ملک کے بہت سارے لاء اسکوٹز میں اسے ڈھونڈنا مشکل ہی تھا۔ انہیں سکندر پر فخر بھی ہوا تھا اور خود اپنے آپ کو مار ڈالنے کو بھی جی چاہا تھا۔ اپنے زمین اور قابل بیٹے کو انہوں نے کہاں سے کہاں پہنچایا تھا۔

خدائی کا دعوا نہیں کیا تھا مگر خود کو سمجھ خدا ہی بیٹھے تھے۔ خود سے وابستہ افراد کی زندگیوں کے بارے میں نیلے سناتے، جزا و سزا نافذ کرتے انہوں نے کس طرح سکندر اور اس کی ماں پر ظلم کیا تھا۔ وہ فوراً امریکہ جانے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ انہیں سکندر کے پاس مہمٹس جانا تھا۔

ان کے اس بیٹے نے بہت دکھ اٹھائے تھے۔ وہ اسے گلے لگا کر ہار کرنا چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے ہوئی تھی اس سے کم عمری میں ایک بھول، ایک غلطی۔ وہ اس کی ہر غلطی ہر بھول معاف کر چکے ہیں۔ اپنی اس ایک غلطی کی بہت سخت سزا کاٹ چکا ہے ان کا بیٹا۔ کاتب تقدیر اس لمحہ ان کی سچائی سے لاعلمی پر سختی سے مسکرایا ہو گا۔

”تو چلو آؤ شہزادہ خاں باب تم سچائی بھی جان ہی لو۔ وہ سچائی جو تمہیں زندہ و درگور کر دے گی۔ وہ سچائی جو تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لے گی۔ تم اعلا طرف بن کر آٹھ سالوں بعد اسے معاف کرنے چلے ہو؟“

تقدیر نے ان پر ہنستے ہوئے ہنسا لاکر ان کے سامنے کھڑا کیا تھا جس نے ان کے خواص گم کر دیے تھے۔ یہ بدترین سچائی تقدیر نے انہیں اس صورت بتائی کہ ام مریم کو ایک روز لا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ تقریباً ساڑھے چار سال قبل اس روز کیا ہوا تھا؟



وہ امریکہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مہمٹس اپنے سکندر کے پاس۔ اسے معاف کر دینے کے لیے۔ اسے گلے لگانے کے لیے۔ جب اس روز انہیں اپنے

کرنا قطعاً "معیوب نہ تھا۔

"بنا ہے ویڈیو! سیم کا اپنے اسٹیمپ فادر (سوتیلے باپ) کے ساتھ بڑا زوردار فیئر تھا۔ اس کے پیرئیس کی ڈانٹی ورس (طلاق) ہو گئی تھی۔ سیم اپنی مٹی اور اسٹیمپ فادر کے ساتھ میلان میں رہتی تھی۔ وہ فریج تھے اور بہت مشہور فیشن ڈیزائنر تھے۔ پیپر بھی لن کے پاس بے تحاشا تھا۔ سیم ان سے خوب قیمتی قیمتی تھے لیکن تھی اور اسکول میں ہم دوستوں کو دکھا دکھا کر ہمارے دل چلایا کرتی تھی۔ چند وہ سال کی عمر میں اس نے اس چالیس سال کے مرد کو اپنا دلنہا کر رکھا تھا۔

اتنی حسین اور کم عمر لڑکی کے آگے اس کے سوتیلے باپ کو بچہ سیم کی مٹی میں کیا چارم نظر آسکتا تھا۔ سیم کی وجہ سے اس کی مٹی کی شادی شدہ زندگی خراب ہو گئی تھی۔ سولہ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں سیم ہر بکنٹ تک ہو گئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ چاہتا تھا کہ سیم ابارشن نہ کروائے کہ آخر ان دونوں نے شادی تو کرنی ہی ہے۔ سیم نے اپنے سوتیلے باپ کو ادا کرتے بناتے اس سے شادی کے وعدے تک کر رکھے تھے۔ وہ سیم کے ساتھ بہت سنجیدہ تھا اور سیم وہ دوستوں کے ساتھ اسکول میں بیٹھ کر اپنے سوتیلے باپ کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

وہ کہتی تھی کہ اسے اپنی ماں سے شدید نفرت ہے۔ اس کی ماں کی وجہ سے اس کے باپ کی طلاق ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بدلہ لینے کے لیے اسے نیچا دکھانے کے لیے اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ انہیں چلا رہی تھی اور پھر اس انہوں کے نتیجے میں اسے بے تحاشا قیمتی تھے "آمنشیں اور بے حساب پیسہ ملے گئے مگر اس سب کے باوجود اس کا اس قلعی کو کبھی بچنے کا کوئی داروہ نہیں ہے۔

ہم سب دوستوں کی نانج میں تھی یہ بات کہ اپنے سوتیلے باپ کی لاکھ منت ساجت کے باوجود بھی سیم ابارشن نہ کروا آئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ اس بات پر بہت ناراض ہوا تھا۔ وہ سیم سے فوراً شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سیم کی مٹی کو فوراً طلاق دینا چاہتا تھا۔

لانگ اسکرپس پہنا کرتی تھی مگر جسم کی نمائش اس کے کسی بھی انداز سے ظاہر نہ ہوتی تھی جبکہ اس وقت اس نے ریڈ کلر کی شیفون کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سلیو لیس اور بیکہ لیس بلاؤز کے ساتھ اس کے بازو اس کا گلا اس کی پوزیٹو کمر سب کچھ ساڑھی کے باریک پلو سے چمک رہا تھا ام مریم اور ہاشم Suite کے دو دروازے کے سامنے رُک چکے تھے ہاشم دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ ابھی درجہ حیرت ہی میں تھے کہ ان کے اٹالوی دوست کی بیٹی ام مریم کو کچھ کر کے ساتھ حیرت سے بولی۔

"اوہ! سیم یہاں؟" ام مریم اور ہاشم اپنے سوٹ کے اندر جا چکے تھے۔

"سیم؟" انہوں نے حیرت سے اپنے دوست کی بیٹی کو دیکھا۔

"ہاں یہ سیم ہے انکل۔ سافٹ میری کلاسی فیلو۔ میلان میں میرے ساتھ اسکول میں ہوئی تھی۔ ہم ہوٹل میں روم میٹ بھی تھے۔ آپ جانتے ہیں کیا اسے؟" وہ تینوں سوٹ میں داخل ہو گئے تھے۔

"ہاں! امریکہ میں اس سے ملنا تھا چند سال پہلے۔ یہ وہاں پڑھنے آئی ہوئی تھی۔ مگر اس کا نام ام مریم ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی یہ تمہاری کلاسی فیلو سیں ہوگی۔" وہ اب بھی بے یقین تھے۔

"ہم نے اپنی اسکول تک ایک ساتھ میلان میں رہا ہے انکل! میں اسے بچپن میں غلطی کرتی نہیں سکتی۔ بلکہ جب یہ امریکہ سے اپنی اسٹڈیز پوری کیے بغیر اٹلی واپس آ گئی تھی تب بھی میں اس سے تین چار مرتبہ ملی ہوں۔ اس کے پاپا کسٹلی ہیں ناں۔ اس لیے ڈو کو مینٹس وغیرہ میں اس کا نام ام مریم ہی ہے مگر ہم دوست اسے سیم ہی کہتے تھے۔"

ان کے دوست کی بیٹی کچھ سوچ کر لوہا دکر کے فہمی تھی۔ وہ اب اپنے باپ کو اپنی اس رانی دوست کے بارے میں جاننے لگی تھی جسے وہ سیم کہہ رہی تھی اور جسے وہ ام مریم کے نام سے جانتے تھے۔ وہ باپ بیٹی اٹالین تھے اور ان کے ہاں بیٹی کا باپ سے ایسی باتیں

صبح ڈھکے جیسے لفظوں میں اس لڑکی کی برائی ان سے بیان کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اور اس شام جب وہ پانی میں جانے کے لیے تیار ہونا چاہتے تھے وہ تب بھی ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کتیا پر شان لگ رہا تھا۔ لگتا تھا اسے کوئی بہت ضروری اور سنجیدہ بات انہیں بتانی ہے۔ اس لڑکی کی مکاری، اپنے بیٹے کی معصومیت سب واضح تھا۔

سب کچھ بارہ سال پہلے بھی واضح تھا۔ مگر جو آج بھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہو جائیں گاں رکھتے ہوئے بھی بہرے ہو جائیں ان کو سچ نہ نظر آتا ہے نہ سنا کی دیتا ہے۔

وہ اس دزد دیواروں سے سرواڑ کر روئے تھے۔ دنیا کے کسی باپ نے اپنی اولاد پر ایسا ظلم نہ کیا ہو گا جو انہوں نے اپنے بیٹے پر کیا تھا۔ اس پر ایک ایسے گناہ کا الزام لگایا جو اس سے سرزد ہی نہ ہوا تھا اور پھر ان کے اس ظلم کے نتیجے میں ان کے بیٹے کو اسی سفاکی کا نشانہ بنا دیا گیا جس کا انہوں نے اس پر الزام لگایا تھا۔ rape Gang انہیں بالائی مور کے ہسپتال کی ملازم اس لڑکی کے الفاظ پھر یاد آئے تھے۔

وہ اب سکندر کا سامنا کیسے کریں۔ اس سے اس کی زندگی اس کی عزت، اہم و وقار سب کچھ چھین لینے کے بعد اب اس کے سامنے کس طرح جائیں؟ وہ اسے معاف کرنے اور غلے لگانے جارہے تھے تب جانا بہت آسان لگ رہا تھا۔ مگر اب؟ اس سے اس کا سب کچھ چھین لینے کے بعد وہ کس منہ سے اس کے سامنے جائیں؟ اس سے معافی مانگیں اور کیا؟ انہیں معاف کر دے گا؟ وہ انہیں مرتے دم تک معاف نہیں کرے گا۔

وہ جانتے تھے وہ ان ہی کا بیٹا ہے۔ وہ اب رو رو کر بھی فریاد کریں مگر گراں میں وہ تب بھی اب کبھی پلٹ کر ان کی دنیا میں واپس نہیں آسے گا۔ غیرت اور عزت اور وقار پر جان دینے والے صرف وہی تو ہیں ان کا غیرت مند بیٹا بھی تو ان ہی کا خون ہے۔

انہوں نے اس سے کہا تم میرے لیے مر چکے ہو تو

جب سیم نے دیکھا کہ اس کا سوتیلایا بہ زیادہ ہی اس کے گلے پر رہا ہے تب ایک رات اس نے شور مچا کر سارے خٹلے کو اکٹھا کر کے اپنے سوتیلے باپ پر ریپ کا الزام لگا کر اس سے جان چھڑائی تھی۔ تب پھر سیم ہوسٹل آگئی تھی۔ غیرت کے ساتھ وہاں وہ قوتی تھی۔ ہم روم میں تھے۔

سیم کی محی کو اس کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی۔ اس کا سوتیلایا باپ واقعی اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے عشق میں پاگل ہوتا اس کے پیچھے آتا اور سیم اسے دھتکار دیتی۔ بڑی تیز اور خطرناک لڑکی تھی سیم۔ اسے مردوں کو اپنے پیچھے لگانا اور اپنا دیوانہ بنانا آتا تھا۔

جب تک یہ آگلی میں تھی سمیرا اس سے کبھی کبھار رابطہ ہو جایا کرتا تھا پھر شاید یہ پاکستان آگئی تھی۔ آج بہت عرصے بعد نظر آتی ہے۔ اور لگتا ہے کچھ تک مردوں کو اپنے پیچھے دیوانہ بنائے پھر رہی ہے۔ ابھی جو ساتھ میں تھا شاید اس کا کوئی نیا شکار ہے۔

ان کے دوست کی بیٹی ہنس کر بولی تھی۔ ان کا دوست جواب میں کیا بولا تھا وہ کچھ بھی سن نہیں پائے تھے۔ ان کے کانوں میں تو اپنے بیٹے کی چالا کر چٹائی جاتی آواز گونج رہی تھی۔

”میں بے گناہ ہوں لہذا یہ لڑکی جھوٹی ہے۔“

”ایسا امیر لائقین کرس۔“

”وہ ایک بدکردار لڑکی ہے۔ زین ایک سچ لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے جارہا تھا۔“

وہ اپنی صفائی دینے نہا تھا۔ مگر کون سنتا اس کی وہ سچائی؟ غصے میں اندھے ہو کر انہیں لے بیٹے کی کوئی آواز سنائی کہ دی تھی؟ پر کج اس کی گئی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔

اس نے آخری وقت تک خود پر لگائے ہر الزام کو جھوٹا کہا تھا۔ عدالت ہی لگائی تھی تو جانے وقوعہ پر ثبوت ہو گا اور نشان دیکھتے۔ وہ ثبوت اور نشان کسی جبر کی کہانی سنارہے تھے یا کسی بدترین منصوبے کا راز فاش کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ام مریم اپنے ٹھکرائے جانے کا اس سے بدلہ لے رہی ہے۔ وہ اس

کے تمام ٹیسٹ کروائے گئے تھے اور پھر ان ہی دونوں ان ٹیسٹ کی رپورٹوں نے یہ بتا دیا کہ آمنہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہیں۔

ان کے عظام کی فہرست طویل تھی، ان کے گناہوں کی داستان بڑی سفاک تھی۔ شاید معلیٰ اور توبہ کے دور ان کے لیے بند ہونے کو تھے۔

”یا اللہ! آمنہ کو صحت دے دے اسے زندگی دے دے۔ میں اسے سکندر سے ملا سکوں۔“

انہوں نے آمنہ کے علاج میں خود کو اپنے آرام سکون سب کو بھلا دیا تھا۔ کامیاب آپریشن کے بعد بھی آمنہ کی حالت سنبھل نہ رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر نہ جانتا ہو مگر وہ جانتے تھے اس ماں کو کیا چاہیے تھا۔ اس کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس نہ تھی۔ ان سے کہتی تھیں کہ میں نہیں کما تھا کہ وہ سکندر کو بلا لیں۔ انہوں نے از خود اسے فون کیا تھا۔ اب نہ سکندر سے معلیٰ مانگے گا نہ تھا نہ اس کی ماں سے۔ مگر اسے گناہوں میں سے ایک گناہ تو کم کر سکتے ہیں۔ کم از کم وہ اس بیمار ماں کو اس کے پیچھے بیٹے سے ملوا تو سکتے ہیں۔

فون پر اس کی کواز سنتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ زیادہ کچھ بولتے تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مختصر سی بات کر کے فون فوراً بند کر دیا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ کئی گھنٹے روئے زہرے تھے اور پھر سکندر ماں سے ملنے پاکستان آ گیا تھا۔

وہ اس کا سامنا کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ حرمہ اسے چھپ کر دیکھنے سے خود کو روک نہ پاتے تھے۔ رات میں جب نرس دوبار آمنہ کے کمرے میں گئی تب بھی انہوں نے کمرے کے کھلے دروازے سے خود کو چھپا کر اندر جھانکا تھا۔

اپنے بیٹے کو دیکھا تھا کہ وہ کتاب دہل چکا تھا۔ وہ ان سے اتنے فاصلے پر چلا گیا تھا کہ وہ اسے پکارتے تو وہ ان کی پکار نہ سنتا۔

وہ جانتے تھے۔ وہ ان کا غیرت مند بیٹا ہے۔ اب وہ لاکھ چاہیں ہزار معافیاں مانگ لیں وہ تب بھی خود کو ان

اس نے خود کو ان لوگوں کے لیے واقعی ماری ڈالا۔ اس پر جو بھی گزری جن بھی آزمائشوں کو اس نے سہا مگر پلٹ کر بھران کے در پر نہ آیا۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیس، اب واپس کبھی بھی نہیں آئے گا۔ جب مشکلوں کے دور میں نہیں آیا تو اب جب کہ لاء پھر رہا ہے۔ عفریب تعظیم مکمل کر لے گا، ایک اچھی جگہ ملازمت بھی کر رہا ہے۔ اب کیوں ان کے پاس واپس آئے گا؟

وہ جانتے تھے سکندر ضد لانا اور تکیا بان میں ان ہی کے اوپر ہے۔ وہ اب مرتے دم تک ان کے گھر کی دھنیز تک بار نہیں کرے گا۔ ام مریح کی سچائی سامنے آنے کے بعد ان کی ساری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ سکندر کا سہانا کرنے کی جرأت وہ اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ وہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

ان دونوں ان کا حقیقتاً کئی بار خود کو جان سے مار ڈالنے کو بھی چاہا تھا۔ بیٹے پر ایسا ظلم توڑ سکے تھے جس کا اب مذاق بھی ممکن نہ تھا۔ کماں سے لا کر دیں گے وہ اسے اس کی زندگی کے کھوئے آٹھ سال۔

آٹھ سالوں میں اس کی زندگی میں سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا۔ کیا وہ اسے اس کی شخصیت کا وقار لوٹا سکتے ہیں؟ کیا وہ دوبارہ میں سال کا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دوبارہ بارود میں جا سکتا ہے؟ کیا وہ ماں سے لاء پاس کر سکتا ہے؟ کیا وہ کمرس کی چھٹیاں واپس آ سکتی ہیں؟ کیا ان چھٹیوں کے بعد دوبارہ اپنے کیسپس جا سکتا ہے؟ کیا وہ گھناؤنا داغ اپنے بیٹے کے وجود پر سے مٹا سکتے ہیں؟ ان کے فکرمعقول نہیں کہ معاف کر دیے جائیں۔

اور آمنہ، اس ماں کو وہ کیا کہیں جو بیٹے کی جذباتی کا ورد چپ چاپ سستہ سستہ بالکل ہستہ سے ہی لگ گئی ہے؟

ام مریح اور ہاشم سے ان کے سامنا کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا جب آمنہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔

گزشتہ کئی ماہ سے وہ خاصی بیمار تھیں۔ وہ ان کے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔ شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس ان کا علاج ہو رہا تھا۔ بہترین ہسپتال میں ان

رانی تبدیلیوں کے بارے میں بتا چلی رہا تھا۔ ان کا وہ بیٹا جس میں دنیا تفسیر کر لینے کی صلاحیتیں تھیں۔ اپنی ان صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے گھر پر اور پروفیشن میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ کس کی وجہ سے؟ اپنے ابا بابرل باب کی وجہ سے۔ ہاں وہ ایک ابا بابرل شخص تھے۔ کبھی کسی نے انہیں یہ لفظ نہیں کہا مگر وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک ابا بابرل شخص ہیں اور ان کی ابا بابرل طبیعت کا نشانہ ان کی بیوی 'زین' اور سب سے بڑھ کر سکندر رہا ہے۔

سکندر شادی کر رہا ہے اور آمنہ اسے اس کی ہونے والی بیوی کے ساتھ ملنے کے لیے پاکستان بلائی ہیں۔ یہ خبر برسوں بعد انہیں ملنے والی سب سے بڑی خوش خبری تھی۔ بیٹے سے معافی مانگنے کا تو لب بھی حوصلہ نہیں تھا ان میں مگر ان کی خواہش تھی اس سے اس کی زندگی کی ہر خوشی جیمیں لینے کے بعد اب اس سب سے بڑی خوشی کے حصول میں وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوں۔ ان کے دل میں چھپا ارمان جسے وہ ابھی تک زبان پر لاند سکے تھے یہ تھا کہ سکندر کی شادی وہ خود کریں اور بہت دھوم دھام سے اور عالی شان طریقے سے کریں۔

آج فارم ہاؤس کی دعوت انہوں نے اس جانب پہلا قدم اٹھانے کے لیے رکھی تھی۔ وہ جانتے تھے سکندر ان کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا تو انہوں نے فارم ہاؤس کا انتخاب کر لیا تھا۔

وہ چاہتے تھے سکندر کی شادی پورے روایتی مشرقی جوش و خروش کے ساتھ ہو۔ وہ خود سکندر کے لیے لہزا کا ہاتھ مانگنے اس کے باب کے پاس جائیں۔ وہ بیٹے کی شادی پر اپنے گھر پر حراغ لگائیں کریں۔ خود کارڈز تقسیم کریں جس میں دیکھ کی دعوت ان کی اور آمنہ کی طرف سے دی گئی ہو۔ اس دیکھ کی دعوت کے میزبان وہ اور آمنہ ہوں اور اس میں وہ اپنے ہر ملنے والے ہر دوست اور تمام عزیزوں کو مدعو کریں۔

مگر انہیں شروع ہو گئی تھیں۔ آج پھر وہ تمام رات جاگتے رہے تھے۔ آج پھر وہ ساری رات سکندر

کی زندگی میں کبھی شامل نہ کرے گا۔ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے کہیں بہت شاندار ملازمت دلوانے کی کوشش کریں گے تو وہ ایسی ملازمت کو ٹھوکر مار کر چلا جائے گا۔

انہیں خوف لاحق ہوا تھا کہ اگر وہ سکندر سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے اس سے ملیں گے اس کے پاس جائیں گے تو شخص ان سے چھچھا چھڑانے کے لیے وہ خود کو پھروٹیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دے گا ان کے خاموشی اختیار کیے رہنے سے اتنا تو بے تال کہ اب سکندر اور آمنہ کا رابطہ رہتا ہے۔ انہیں آمنہ کے ذریعے یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ سکندر خیریت سے ہے 'اچھی جگہ پر ملازمت کر رہا ہے' باعزت زندگی گزار رہا ہے۔ اگر اب کی بار انہوں نے اسے کھو دیا تو کیا نہیں پھر کبھی ڈھونڈ بھی پائیں گے یا نہیں۔

وہ بالکل چپ ہو گئے تھے۔ اب اندر ہی اندر گھلنے اور ختم کرنے کی باری ان کی تھی۔ مگر ان کی سزا کی تھی 'ان کی سزا یہی ہونی چاہیے تھی کہ سکندر سے معافی مانگنا تو وہ روہ جیتے جی بھی اس کے سامنے بھی نہ جاسکیں۔ زمین پر خدائی کا رعبا کر نے والے ان جیسے فرعون صفت لوگوں پر توبہ اور معافی کا دیو نہیں بند ہو جاتا ہے۔

کبھی خود کسی کو اعلا طرف ہو کر معافی دی تھی جواب اپنے لیے رستہ قلبی اور ہمدردی چاہتے۔ ان کے بیٹے نے زندگی بھر انہیں معاف نہیں کرنا تھا۔ اس نے زندگی بھر ان سے نفرت کر لی تھی اور یہی شہرِ ارباب کی سزا تھی۔

آمنہ سکندر کے ساتھ رابطہ میں رہنے پر جو ان کی جانب سے غصہ اور مخالفت کی امداد کر رہی تھیں اس خاموشی پر حیران رہ گئیں۔ وہ آمنہ کی حیران پرائیڈ میں بہت روئے تھے۔ ان کی بیوی انہیں دیکھائی تو سمجھ رہی ہے جیسے وہ ہیں جیسے وہ خود کو ساری زندگی ثابت کرتے آئے ہیں۔ سکندر نے لاء کی تعلیم پوری کر لی اسے وہاں میں بہترین ملازمت اپنے مل بوتے پر مل گئی۔

آمنہ کے ذریعے انہیں سکندر کی زندگی میں آنے

موبائل پر آتی کال کا احساس ہوا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ لیزا اسے کال کر رہی تھی۔ وہ لڑکی واقعی اس سے کئی محبت کرتی تھی۔ ابھی اس نے اسے سچے دل سے یاد کیا ہی تھا اور اس کی کال آگئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو۔“

”تم کہاں ہو سکندر؟“ لیزا کی آواز میں پریشانی سی تھی۔

”ہمیں۔۔۔ کیوں کیا ہوا؟“

”میں ساری رات تمہیں فون کرتی رہی ہوں۔ تم کال ریسیو نہیں کر رہے تھے تو مجھے اتنی پریشانی ہوئی۔ میں نے پریشان ہو کر تمہارے ہوٹل فون کیا۔ تم سے بات کرنی چاہی تو پتا چلا تم اپنے روم میں نہیں ہو۔“ اس نے اپنے سامنے پھرے سمندر کو دیکھا۔ ”صبح ہو گئی؟ پوری رات گزر گئی؟ اسے بتا ہی نہیں چلا۔“

”تم کیوں فون کر رہی تھیں؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”اتنیج تم میرے ہر سوال کے جواب میں سوال کیوں کر رہے ہو سکندر؟ میں تمہارے لیے فکر مند تھی اس لیے تمہیں فون کر رہی تھی مجھے لگ رہا تھا تم اتنے سالوں بعد اپنی ٹیلی سے ملے ہو یقیناً“ ڈسٹر ب ہو گئے۔ دیکھی ہو گئے۔ میں تم سے بات کر کے تمہاری اداسی اور دکھ کم کرنا چاہتی تھی۔“ وہ اس کے جواب نہ دینے پر قدرے تنگی سے بولی۔

”تم بہت محبت کرتی ہو مجھ سے لیزا؟“ جاننا تھا پھر بھی اس وقت یہ یہ سنتا چاہتا تھا کہ وہ چاہا جاتا ہے۔ بے حد اور بے حساب۔

”ہاں!“ وہ اس کے سوال پر حیران ہوئے بغیر فوراً بولی۔

”کتنی؟“

”تم سوچ بھی نہیں سکتے اتنی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”پھر بھی کتنی؟“ اب اس کے لبوں پر مدھم سی

کے ساتھ رہے تھے۔ کاش ان میں اتنی جرات آسکتے کہ وہ اپنے بیٹے سے معافی مانگ سکیں۔ وہ اس سے اعتراف جرم تو کر لیں۔ اپنے سینے پر اس بوجھ کی شدت کچھ تو کم کر لیں۔ سوہ جھگڑے اُنداز میں کرسی پر سے اٹھتے تھے۔

وہ سمندر کے کنارے ٹھہرا بیٹھا تھا۔ وہ ساری رات سمندر کے کنارے بیٹھا رہا تھا۔ لیزا کو اس کے پیار کے گھر واپس کرنے کے بعد وہ اپنے ہوٹل میں گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا تھا کہ اسے سی سائڈ لے جائے۔ وہاں پہنچ کر اس نے ڈرائیور کو بھی واپس بھیج دیا تھا کہ اس کا یہاں سے اتنی جلدی واپس کاروانہ نہیں تھا۔ اس کا دل بہت اداس اور کرب میں مبتلا تھا۔ شہریار خان اور زین سے بارہ سالوں بعد ملنا ایسا منہوئی واقعہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ہوٹل کے آرام و سکون میں اسے کسی آن کر کے پرسکون نیند سو جاتا۔ آج ماں کی خاطر اسے کس کس سے ملنا پڑ گیا تھا۔ کس کس کو دیکھنا پڑ گیا تھا۔

وہ لوگ جن کو وہ جیتے جی دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جن کے لیے وہ مریح کا تھا ان کے لیے وہ مرا ہوا ہی رہتا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جلد تو جلد پاکستان سے واپس چلا جائے۔ اپنی دنیا میں اپنی زندگی میں۔ بہت دیر تک وہ ساحل پر ٹنگے پاؤں چلا تھا۔ بہت دیر تک وہ ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر سمندر کو تنگی پاندھ کر دیکھتا رہا تھا۔ بس یہ چند دن جلدی سے گزر جائیں اور وہ اور لیزا یہاں سے واپس چلے جائیں۔ واپس چلتے ہی وہ دونوں شادی کر لیں۔

وہ ماشی کو کہیں بہت دور بہت پیچھے چھوڑ کر لیزا کے ساتھ جلد از جلد نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس کا جب میں برا موبائل نمائے کب سے بیجے جا رہا تھا۔ اس کا دھیان ہی نہ تھا اس پر۔

ایک اونچی لہر آکر گھٹنوں سے اوپر تک اسے بھگو گئی تباہ چونک کر اپنے خیالوں سے نکلا۔ تب اسے

مسکراہٹ تھی۔ سمندر ہوا، صبح طلوع ہو، آسورج اسے سب اچھے لگ رہے تھے۔ کیونکہ لیزا محمود اس وقت اس کے ساتھ تھی۔

”اتنی کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

پیشکش چھوڑ سکتی ہو؟

”ہاں۔“

”روا چھوڑ سکتی ہو؟“

”ہاں۔“

”میں بھی ساحل پر آ سکتی ہو؟“

”ہاں۔“ وہ ریانی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتے دیتے اس آخری سوال پر ہاں بولتے ہوئے چونکی۔

”تم سب سائڈ پر ہو؟“

”ہاں! کیا تم ابھی آری ہو میرے پاس؟ ابھی صبح کے چھ بجے بھی نہیں بچے ہیں۔“ اس نے کٹانی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا جو پونے چھ بجاری تھی۔

”نہیں آری، ہول سیٹیور سکندر۔“

اور وہ واقعی اپنے بیا کے ڈرائیور کے ساتھ آوٹے گھنٹے بعد اس کے پاس آئی تھی۔

وہ دونوں بوا پر چڑھ کر ساتھ بیٹھ گئے تھے۔

”کیوں بلایا تم نے مجھے اس وقت یہاں پر؟“ وہ ہوا سے منہ پر آتے ہاتھوں کو ہاتھوں سے پیچھے کر رہی تھی۔

”بس میرا دل چاہ رہا تھا کہ جس اس وقت دیکھنے کو۔ بہت تنہا محسوس کر رہا تھا خود کو۔“ وہ آسکتی سے بولا۔

”تم تنہا نہیں ہو سکندر۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔“ لیزا نے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

”بیلا ابلدی سے آجاؤ میری زندگی میں۔ میں بہت تنہا ہوں۔“ وہ اوا سی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔



وہ غماز پڑھ کر کٹانی دیر سے واپس آئے تھے۔ آمنہ

لال میں بیٹھی تھیں۔ سر پر نماز کے انداز میں دوپٹہ لپے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ اپنے روزانہ کے معمولات کے وظائف پڑھ رہی تھیں۔ نذہال سے قدموں سے جلنے ہوئے وہ ان کے پاس آگئے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے نظریں گھاس پر جماد رکھی تھیں۔

”آپ رات بھر سوئے نہیں؟ ساری رات اسٹڈی میں مگر آری؟“

”ہاں! بس وہ نیند نہیں آ رہی تھی۔“ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر آمنہ کو دیکھا۔

”آمنہ! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ کمال سے لفظ لال میں، کہاں سے؟ کیسے بات شروع کریں؟ وہ مضطرب ہو کر آمنہ کو دیکھ رہے تھے۔

”جی کہیے؟“ وہ انہیں قہر زنی نے سمجھنے سے اور کچھ فکر مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

”میں جانتا ہوں، تم مجھے ایک سخت مزاج اور سنگ دل شخص سمجھتی ہو۔ میں نے خود کو ہمیشہ ثابت بھی ایسا ہی کیا ہے۔“ وہ حسرت خورہ لہجے میں بولے۔

وہ سکندر کی دھوم دھام سے شاوی خود لپے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے اور یہ بات وہ آمنہ سے کہنا چاہتے تھے۔ کہ صرف وہی تھیں جو شاید سکندر کو اس بات کے لیے تیار کر سکتی تھیں سو تمام تر ہمتیں جمع کر کے بات تو انہیں کرنی ہی آمنہ سے۔

”آپ یہ کس طرح کی بات کر رہے ہیں شہیار؟“ میں خدا خواست آپ کے لیے برا کیوں سوچوں گی؟“ وہ

اسی فرمانی برداری اور عاجزی سے بولیں جس سے ساری زندگی ان سے بات کر لی آئی تھیں۔ وہ بیوی کے تابعدار اور عاجزی بھرے انداز پر زخمی سی مہی بنے۔

”میں ان بدترین لوگوں میں شامل ہوں جن کی عزت ان کے خوف کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے دلوں میں بھی اپنی محبت بے دانہ کر سکا۔ وہ عمر بھر خوف میں جلا رہا کہ میری تعظیم و تکریم کرتے رہے۔“

آمنہ دم بخود بالکل ساکت انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”آمنہ! کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ سچ بولنا۔

”تمہیں کس نے بتایا تھا؟“

”صفیہ کہا ہے۔“ آمنہ کا جواب انہیں پورا کا پورا

ہلا گیا تھا۔

”تو باپ کے گناہ کے صرف وہ نہیں ان کی بہنیں بھی گواہ تھیں۔ وہ تینوں جھاتی بہن یہ بات جانتے تھے مگر کبھی زبان پر ایک دوسرے کے سامنے بھی نہ لائے تھے؟“

”ہماری شادی کے شروع دن سے آپ کا بے تحاشا سخت رویہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں آپ کو خوش کرنے کے لاکھ چن کر لیتی تھی مگر آپ بھر بھی خفا ہی لگتے تھے۔ سکندر پیدا ہو گیا تو میں پیدا ہو گیا مگر آپ کے رویے کی سختی میں کمی نہ آئی۔ تب ایک روز صبح بار گریں صفیہ آپ کے سامنے رو پڑی تھیں۔ مجھے لگا تھا آپ مجھے پسند ہی نہیں کرتے۔ شاید آپ کی مجھ سے زیادہ سی شادی کروائی گئی ہے۔ تب صفیہ آپ نے آپ بھائی بہنوں کے بچپن کی تمام باتیں مجھے بتائی تھیں۔ آپ کے ماضی کو جاننے کے بعد آپ کی سخت مزاجی کی وجہ سمجھنے کے بعد آپ کے ساتھ زندگی گزارنا کچھ آسان ہوا تھا شہزاد اور نہ میں تو شادی کے ابتدائی سالوں ہی میں پارمان جاتی۔“

آمنہ آہستہ سے بول رہی تھیں۔ 33 سال 33 سال اس عورت نے ان جیسے ظالم انسان کے ساتھ گزار دیے تھے۔

”بہت صبر اور بہت برداشت دی ہے اللہ نے تمہیں آمنہ! تم نے مجھ جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزار دی۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا تو پتھروں پر چلنے کے مترادف تھا۔“

شہزاد خان نے بے اختیار لہجے کے ہاتھ تھاں تھے۔ آمنہ جواباً ”چپ رہی تھیں۔ چند سیکنڈوں میں ہی خاموش رہے تھے۔

”اس گھر پر چھاپا موت کا ماسٹانا اور رکھوں کے سائے سب میرے لائے ہوئے ہیں آمنہ! میں اپنے عمر بھر کے گناہوں کے کفارے ان کے اوزار کے ایک انٹی سی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی بھر تم نے

بالکل سچ؟“ ان کی شریک حیات نے بے اختیار گہرا کر اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔

”کس طرح کا سوال ہے شہزاد؟ آپ میرے شوہر ہیں۔ میرے بچوں کے باپ ہیں۔“ انہیں جواب کا منتظر رکھ کر نگاہیں کترائے کترائے ہی وہ آہستگی سے بولیں۔

”بے اختیار ایک زخمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی تھی۔ حاصیل نسبت ہے کیا شہزاد خان؟ کوئی ایک بھی رشتہ ایسا نہیں جس کے دل میں اپنی محبت پیدا کروا سکے ہو؟“

”نہیں کرتیں تم مجھ سے محبت آمنہ اور ٹھیک کرتی ہو۔ کیوں کرو گی تم مجھ جیسے ظالم شخص سے محبت؟ میں نے تم پر کتنا برا ظلم تو ڈالتا تھا۔ تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا تھا۔ تمہیں اس کی شکل دیکھنے اس کی آواز سننے تک سے ترسا دیا تھا۔“

ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ آواز بھرائی تھی۔ یوں کے آگے بھی اپنا دل نہ کھولیں تو آخر کہاں کھولیں گے؟ آمنہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر انہیں تعجب سے دیکھا تھا۔ ان کی بھی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جیسے خود پر ٹوٹا ہر ستم پھر سے یاد آ گیا تھا۔

”ایک بار تو ان آنسوؤں کو میرے کندھے پر سر رکھ کر بہا لو آمنہ! میرے خوف سے چھپ چھپ کر روئی رہی ہو آج میرے سامنے رو لو۔ مجھ سے لڑو۔ مجھے جو جی میں آتا ہے مجھے میرے باپ کی مٹا دو۔ شاید میرے دل میں غلطی نہ راست کی آگ کچھ دیر کو کم ہو سکے۔“

بولے بولے وہ خود رو پڑے تھے اور انہیں رو تا دیکھ کر آمنہ بھی خود کو روک نہ پائی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔

”جب تم بابا کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو تو پھر یہ بھی سمجھ لو مجھے اتنی رعایت دے دو کہ میرے ایسا ہونے کا سبب دے۔“

”میں جانتی ہوں شہزاد۔“

ہے یہ زیادہ مزے کی ہے۔“ لیرا حلوہ پوری کا مزا لیتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے چائے بھی دودھ پتی منگوائی تھی۔ آج بالکل ویسی ہو جانے کو جی کر رہا تھا۔

اس دھابے نما ہوٹل پر بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے لیرا نے یہ طے کیا تھا کہ وہ آج شادی کی شاہجگ کریں گے۔ اس کا سوڑ ساحل پر بیٹھے بیٹھے لیرا سے باتیں کرنے کے دوران ہی خوشگوار ہو چکا تھا۔ وہ باغی کی تمام تر باتوں سے نکل کر اپنے اس حال میں لوٹ آیا تھا جہاں لیرا محمود اس کے ساتھ تھی۔ اس پر اپنی والہانہ چاہت لٹاتی ہوئی۔ وہ جو اس سے کہہ رہی تھی وہ کر رہا تھا۔ پروگرام وہ بنا رہی تھی۔ عمل وہ کر رہا تھا۔ ”ہت Dominating ہوئی ثابت ہو گئی۔“ وہ تھوڑا سا انکار کرنے کے بعد لیرا کی شاہجگ کی فرمائش مانگے ہوئے بولا۔

”تمہیں ضرورت بھی مجھ ہی جیسی کی ہے سینور سکندر؟ جو تمہارے اس ہر وقت لگے ہوئے منہ اور زندگی سے ہزار انداز کو ہنستا مسکراتا بنا سکتی ہو۔“ وہ ہنس کر بولی تھی۔

وہ خود برسوں بعد پاکستان آیا تھا اس لیے اچھے عرصی بلہوسات اور شادی بیاہ کے کپڑے وغیرہ کہاں مل سکتے ہیں یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ان دونوں نے دیں دھابے پر بیٹھے بیٹھے موبائل پر انٹرنیٹ کے ذریعے سرچ کیا تھا۔

”تم مجھے ڈپ ریڈ کلر کا براؤنڈل ڈریس دلواؤ۔ میں تمہاری مرضی کے مطابق بالکل پاکستانی دامن بننا چاہتی ہوں۔“

وہ دونوں لیرا کے لپٹا کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ لیرا اپنے لپٹا کو فون کر کے بتا چکی تھی کہ وہ سکندر کے ساتھ ہے۔ تفصیلی ناشتہ کرتے کرتے انہیں ساڑھے مکیا رہ چکے تھے۔

ڈرائیور کو لیرا نے بتایا کہ کہاں جانا ہے تو اس نے ان دونوں ہی کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی تو کوئی بازار کوئی دکانیں، کوئی مارکیٹیں، کوئی شاہجگ باغ نہیں کھلے ہوں گے۔ بارہ سے ایک بجے کے درمیان یہاں

میرے ہر تاجاز حکم کو سر جھکا کر مانتا ہے۔ آج تم سے دونوں ہاتھ جو ذکر ایک درخواست کر رہا ہوں۔ اسے اپنے گناہ گار شوہر کی التجا سمجھ کر مان لو۔ میں سکندر کی شادی خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا ہوں تمہارے اسی گھر سے۔ میں چاہتا ہوں لیرا کے والد سے اس کا ہاتھ مانگنے سکندر کے والدین جائیں۔ سکندر کی شادی میں اور تم، ہم دونوں مل کر کریں۔ خوب دھوم دھام سے۔ بہت شاندار انداز میں۔“

انہوں نے حقیقتاً اپنے دونوں ہاتھ آمنہ کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ آج اس ماں کے پاؤں پکڑ کر بھی بیٹھنا پڑ جائے وہ بیٹھ جاتے۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ پلیز ایسے مت کریں۔“ ان کے ہندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولتے ہوئے آمنہ زار و قطار رو پڑی تھیں۔

”آمنہ! سکندر کی زندگی برباد کر دی میں نے۔ وہ وقت واپس نہیں لا سکتا۔ مگر آج جب وہ نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے تو میں چاہتا ہوں اس کی زندگی کی اس خوشی کو اس کے لیے بھرپور اور بادلگاراں دلوں۔ پولو آمنہ! تم اس کام میں میرا ساتھ دو گی؟ میری مدد کرو گی؟“ انہوں نے روتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔ شہباز! میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ وہ ان کے ہاتھوں میں چہرہ چپا کر رو پڑی تھیں۔

انہوں نے آمنہ کا سراپے کندھے سے لگا لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے اپنی اس ہم سفر کے ساتھ نرمی چاہت اور محبت کا اس انداز میں اظہار کیا تھا۔



وہ دونوں ساحل پر بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ ساحل سے نزدیک ایک عام سے ہوٹل میں بیٹھ کر ان دونوں نے حلوہ پوری کا ناشتہ کیا تھا۔

”میں نے ہمیشہ غنی کے ہاتھ کی بنی حلوہ پوری کھائی ہے۔ مگر گھر کی بنی حلوہ پوری میں اور اس میں بہت فرق ہے۔“

”کیا لیزا کے ساتھ نہ آنے پر آپ سیٹ ہو؟“
نرم نگاہوں اور محبت سے اپنی کم عمر اور حسین بیوی کو
دیکھ رہا تھا۔

”میں اس کے نہ آنے سے کہیں آپ سیٹ ہوں گی؟“
ساری زندگی اس نے کبھی پاپا کی نہیں سنی۔ میری کوئی
بات وہ کیسے مان لے گی۔ پتا نہیں کس کو اٹھا کر لے آئی
ہے شادی کرنے کے لیے۔ پاپا اس کی شادی کے فیصلے
سے بالکل بھی خوش نہیں ہیں۔ ”مریم برائے کر فوراً“
بولی تھی۔

”مگر مجھے تو وہ بہت خوش لگ رہے تھے۔ اتنی خوشی
خوشی وہ لیزا کو شادی کی شینگل کرنے کی بات کر رہے
تھے۔“ مریم نے اس کو نظلی سے دیکھا تھا۔

”صرف تمہارے سامنے اپنی عزت رکھنے کے لیے
ہاشم! اب داد کے سامنے کیا وہ یہ بتائے کہ وہ اپنی خود سر
بیٹی کے شادی کے فیصلے سے ناخوش ہیں؟“

”شادی اپنی مرضی سے کرنا خود سری تو نہیں ہے
مریم! تم نے بھی تو مجھ سے اپنی مرضی سے شادی کی
تھی؟“ وہ قدرے صاف گوئی سے بولا۔

”مگر پاپا کو ناراض کر کے نہیں۔ ان کی اجازت سے“
ان کی مرضی سے۔ اور یہ لیزا۔ نہیں پتا ہے صرف
اپنی ضد کی وجہ سے وہ پورے پانچ سالوں سے پیلا سے ملی
نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ہماری شادی تک پر نہیں
آئی تھی۔ پاپا اس کی ضد اور خود سری سے انتاؤرتے

ہیں کہ اب ڈر کے مارے ہر معاملے میں اس کی ہاں
میں ہاں ملاتے ہیں۔ ”جی ہاں یہ تھی کہ اسے مریم کی
ہاں نہیں کھ اور پیاری لگی تھی۔ جیسا مریم اسے بتایا
کرٹی تھی وہ کسی خود سر اور بد تمیز لگی تو نہیں تھی۔“

”لیکن مجھے تو ایسا لگ رہا تھا“ انکل لیزا سے بہت
پیار کرتے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا۔ لیزا ہم سے زیادہ ان کی
لاڈلی ہے۔ ”مریم! کچھ غصے سے سوجھنے لگا تھا۔“

”یہ لاڈ اور محبت ہمیں ہاشم! اپنا حصہ لیزا کی خود
سری اور ضد سے خوف زدہ ہیں پیلا کی سب سے زیادہ
لاڈلی، سب سے زیادہ قیمتی ہمیشہ میں رہی ہوں۔ پیلا دنیا
میں سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔“

شینگل سینئر کھیلے ہیں۔ وہ دونوں جن ملکوں سے آئے
تھے وہاں صبح کا آغاز جی ہو جایا کرتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے
ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ جس ملک میں دن کا آغاز
آدھا دن گزار دینے کے بعد ہوتا ہے وہ ترقی کس طرح
کرائے؟



ہاشم کسی میٹنگ کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا اس
لے کوچ اسے آفس نہیں جانا تھا۔ اس کی داہنی کل
منج ہوئی تھی۔ وہ آج کچھ دیر سے سوکراٹھا تھا۔ وہ شاد
لے کر نیچے آیا تو مریم کو لاؤنچ میں بیٹھا دیکھ کر حیران
ہوا۔ وہ اخبار پڑھ رہی تھی۔

”تم آفس نہیں آئیں؟“
”ہاں! موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر سے جاؤں
گی۔“

ہاشم اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے نیلے
رنگ کی جینز کے ساتھ پگ کمر کی لانگ سرٹ پہن
رکھی تھی۔ بالکل ساہ لباس! ہاں کچھ جوش لپٹے نہ
میک اپ نہ جو لری۔ پھر بھی اس ساہ انداز میں بھی
وہ غصہ ڈھار رہی تھی۔ ہاشم اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“ مریم نے اخبار سے
نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔
”نہیں۔ بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“

اس نے غور سے اسے دیکھا تھا جیسے اس
وقت اس کا موڈ خراب تھا اور اپنی اکل اسے اپنی
تقریریں بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

”کیا ہو اسوٹ ہارٹ! موڈ کیوں خراب ہے؟ کل
رات جب سے ہم تمہارے پیلا کے ہاں سے ہو کر
آئے ہیں۔ تمہارا موڈ خراب ہے۔“

کل رات محمود خالد کے ہاں سے واپس آتے ہی
مریم سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اس کا موڈ تھا وہ
دونوں تھوڑی دیر جاگتے باتیں کرتے مگر مریم نے نیند
آنے کا کہہ کر سونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

کی بھی ہو جاتی تھیں جیسے میری ضد بر میرے ساتھ آتو
گئی ہو مگر اس طرح آنے کو غلط بھی سمجھتی ہو۔“
ہاشم جبکہ کربست پیار بہت چاہت سے مریم کو
دیکھ رہا تھا۔

مریم جو واقعی اپنے نام کی طرح مریم تھی۔ بہت
ماؤرن ہونے کے باوجود اندر سے بہت روایتی جو اس
بات پر یقین رکھتی تھی کہ اسے زندگی میں صرف ایک
ہی بار کسی کا ہو جانا ہے عمل طور پر۔ وہ جیسے زندگی کے
گزشتہ سالوں میں ملنے والے سب لوگوں کو ٹھکراتی
صرف اسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ جس کی بولیانی ایک
دینا تھی جسے نہ جانے کون کون چاہتا تھا وہ اسے چاہتی
تھی۔ اسے صرف ہاشم اسد نے چھوڑا تھا۔ صرف اور
صرف ہاشم اسد نے۔ وہ مریم کے لیے بیانا پڑھ لیا تھا۔



وہ دونوں راستے میں تھے جب اس کے پاس آمنہ کی
کال آئی۔
”السلام علیکم امو جان۔“ لیزا اس کی طرف دیکھنے
لگی تھی۔ وہ مسکراہٹ چہرے پر لیے ماں سے بات کر
رہا تھا۔ دوسری طرف آمنہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔
”کہاں ہو بیٹا اس وقت؟ میرا نام سے ملنے کوں چاہ
رہا ہے۔“

”امو جان! میں اور لیزا شاپنگ کے لیے جا رہے
ہیں۔ شاپنگ کے بعد میں آپ سے۔۔۔“ وہ فوراً ہی
شاپنگ کے بعد آج دن یا شام کا کوئی وقت اور جگہ ماں
سے ملنے کے لیے طے کر رہا تھا مگر آمنہ بے ساختہ اس
کی بات کاٹ کر بولیں۔

”کس جگہ جا رہے ہو شاپنگ کے لیے؟ میں بھی
وہیں آ رہی ہوں۔“ وہ لٹن کی موجودگی چاہتا بھی ہے یا
نہیں یہ پوچھتے ہمارا انہوں نے فوراً اس سے کہا۔
”امو جان! آپ سے۔۔۔“ وہ نچلے کیا کہنا چاہتا تھا مگر
آمنہ اس کی بات سے بغیر فوراً بولیں۔

”شادی کی شاپنگ کے لیے جا رہے ہو ماں تم دونوں؟“

مریم ایک دم ہی بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ بہت
زبان غصے میں آگئی تھی۔ ہاشم جانتا تھا مریم اپنے باپ
سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ وہ یہ سننے کو ہر گز تیار
نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کے پیار اس سے زیادہ کسی اور
سے پیار کرتے ہیں۔

”اور تم دنیا میں سب سے زیادہ کسی سے پیار کرتی
ہو؟“ اس نے مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں
پوچھا۔ وہ نزدیک بیٹھی لگ اتی پیاری رہی تھی کہ اس
وقت کسی اور کی باتیں کرتے رہنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔
اس کا دل چاہتا تھا۔ اس وقت وہ اور مریم اپنی باتیں کریں
بہت ہو گئیں مریم کے پیار اور ماں کی باتیں۔
”پیارا۔۔۔“ وہ اس کی شرارت سمجھ چکی تھی پھر
بھی سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں! ان سے تو کرتی ہو۔ مگر ان کے علاوہ اور کون
ہے جس سے تمہیں بہت محبت ہے۔ جس کے بغیر تم
رہ نہیں سکتیں؟“

”ہاشم اسد نام کا ایک بندہ ہے۔“ اس بار وہ کہتے
ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔

”یہ پسلی یہی نام ہے اس شخص کا؟“ وہ جس کر
بولی۔

”جی ہاں یہی نام ہے۔ میں نے پیار کے بعد صرف
تم سے محبت کی ہے ہاشم۔“ مریم نے اس کے کندھے
پر سر ٹکا دیا تھا۔ وہ اس کے اس اظہار اور دلہانہ انداز پر
خدا ہی تو ہو گیا تھا۔

”مجھے بہت فخر کا احساس ہوتا ہے مریم کہ تمہاری
زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد میں ہوں۔
اٹالین ماں کی تربیت اور ساری زندگی یورپ میں
گزارنے کے باوجود تم اندر سے کتنی مشرقی رہیں۔
تمہاری زندگی میں پہلی بار کوئی آیا تو میں۔ بہت سوں
نے تمہیں چاہا ہو گا۔ تمہیں پسند کیا ہو گا مگر جسے تم نے
چاہا جسے تم نے اپنے نزدیک آنے والا نہیں ہوں۔
شادی سے پہلے میں تم سے لاکھ بار اصرار کرتا تھا کہ تم
میرے ساتھ وقت گزارنے پر راضی ہوتی تھیں اور
میرے ساتھ ہوتے ہوئے بعض مرتبہ تم کیسی چپ

"جی۔"

"بس پھر میں بھی وہیں آ رہی ہوں۔ تم مجھے جگہ بتاؤ۔"

خریدی جانے والی اشیاء میں اپنے باب کا ایک پیسہ شامل کیا جانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ وہ بس پسند کرنی جا رہی تھیں بلکہ وہ بے کر رہا تھا۔

"امنے کے اٹل اور فیصلہ کن انداز کے سامنے وہ چپ ہو گیا تھا۔ اس نے امین جگہ بتادی تھی۔"



وہ لیزا اور آمنہ تینوں شاپنگ کے لیے ساتھ تھے۔

لیزا اور آمنہ مل کر کپڑے پسند کر رہی تھیں۔ اس کا کام فقط پے منٹ کرنا تھا۔ شادی کے دن کا جوڑا لیزا نے

آمنہ سے کہا تھا کہ وہ پسند کر لیں۔ اسے لیزا پر خر کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی ماں کو خوشی دینے کے لیے

اپنی زندگی کے سب سے اہم دن پر پسینے جانے والا اہم ترین جوڑا انہیں پسند کرنے کو کہہ رہی تھی جسے وہ خود

اپنی مرضی اور پسند سے خریدنے کے لیے بے حد پر جوش تھی۔

"تم پر تو ہر رنگ بچتا ہے لیزا۔ تم جتنا مینا! شادی کے دن کس رنگ کا جوڑا پہننا چاہتی ہو؟" خوشی سے

مرشار آمنہ نے لیزا سے پوچھا۔

"ڈیپ ریڈ۔" (گہرا سرخ) لیزا نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

پھر آمنہ ہی نے شادی کے دن کے گہرے سرخ رنگ کا خوب بھاری کام والا غراہ لیزا کے لیے پسند کیا

تھا۔ آمنہ نے ایک اور بھاری کام سے مزین سی گرین شرارہ ان کے دلیر کے لیے پسند کر لیا تھا۔ وہ

ماں کو روک نہیں سکا تھا۔ اس کا بڑی سادگی سے شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ کوئی رحام و حام اور رنگ برنگی

تقریبات اسے نہیں چاہیے تھیں جو اس طرح کے جوڑوں کا اچھرا لگایا جاتا۔

بہر حال وہ ان کو کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی خودداری اور غیرت مندی کو اس کی ماں

سمجھتی ہیں کیونکہ ہی انہوں نے لیزا کے لیے اپنے پیسوں سے کچھ بھی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جیسے جانتی تھیں کہ اپنی ہونے والی بیوی کے لیے

مستند کے بیچ خاموش تھا۔ ان کا بیٹا سرو کیا بنا چکا تھا۔ وہ

"میرے بیٹے نے مجھے دلوای ہے۔ اسے میں تمہاری شادی پر پیسوں کی سکندر۔"

وہ مسکرا کر خوش ہو کر اس سے بولی تھیں۔ کیا آمنہ ان دونوں کی شادی پر دوبارہ اعلیٰ آنے کا ہر گز امید نہیں رکھتی تھیں؟

وہ آج لیزا کے ساتھ بات کرنے کے شادی کی جگہ اور دن طے کر لیتا چاہتا تھا۔ اسے ماں کی بات پر قدرے حیرت سی ہوئی تھی۔ دھیر سارے شاپنگ سٹور اٹھائے

وہ لوگ شاپنگ مال سے باہر نکلے تو مسہر کے سارے تین بج رہے تھے۔

"کچھ ساتھ کر لیتے ہیں کس۔ کیا خیال ہے تم دونوں کا؟" آمنہ ان دونوں سے مخاطب تھیں۔

پہلی بار ماں کو کبھی کھانا کھلانے کے لیے جا رہا تھا اس نے راز سے کہا تھا۔ وہ انہیں کسی بہت اچھے ریسٹورنٹ لے جائے۔

"کپ آرڈر کریں اموجان۔"

اس خوب صورت ریسٹورنٹ میں وہ تینوں ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آج کل کی طرح اس کی

ماں کی آنکھیں بات بات پر ہلک نہیں رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ جیسے آج اچانک ہی انہیں کوئی ان ہوئی اور بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔

وہ خاصی پر جوش سی رہی تھیں شاپنگ کے دوران بھی۔ کبھی کبھی ایک بل کے لیے بھی وہ جذباتی ہو کر روئی نہیں تھیں۔ وہ بہت خوش خوش مینو میں سے

رکھ کر دیکھ کر اپنی پسند کی ڈشز آرڈر کر رہی تھیں۔

"تمہیں کتنی آتی ہے لیزا؟" وہ ماں کو لیزا کی گفتگو کے بیچ خاموش تھا۔ ان کا بیٹا سرو کیا بنا چکا تھا۔ وہ

خاصی سے کھانا کھا رہا تھا جبکہ آمنہ لیزا سے باتیں کر رہی تھیں۔

”جی اموجان! آتی ہے۔“

”سکندر کو اٹالین اور پاکستانی کھانے بہت پسند ہیں۔“ بارہ سال پہلے اس نے آخری بار ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھایا تھا۔ انیس اس کی پسند ناپسند سب یاد تھی۔ جس طرح اسے یہ باتھا کہ ماں کے ہاتھ کی کچی وال بھی کس قدر مزے کی ہوا کرتی تھی۔

”اٹالین تو میں بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔ پاکستانی سیکھ لوں گی۔“

لیزا کے سعادت مندانہ جواب پر آمنہ کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ہنس پڑا تھا۔ آمنہ نے بے اختیار بیٹے کے ہنسنے پر ہنسنے کو بہت پیار سے دیکھا۔ جیسے دل ہی دل میں دعا کر رہی ہوں کہ انا کے بیٹے کے لبوں پر لب یہ ہنسی سدا رہے۔

”تم دونوں نے شادی کے بارے میں کیا ڈیساؤ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے دن، جگہ وغیرہ۔ تمہارے والد اس بارے میں کیا کہتے ہیں لیزا؟“ آمنہ لیزا سے مخاطب تھیں۔

”ابھی کچھ بھی ڈیساؤ نہیں کہا اموجان۔ بابا کو سکندر بہت پسند آیا ہے۔ ہم دونوں جو بھی ڈیساؤ کریں گے بابا اس پر راضی ہوں گے۔“

اسے پتا نہیں تھی اپنی ماں کی گفتگو کا انداز کچھ مختلف لگا۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھیں، جیسے وہ کچھ پازن کر چکنے کے بعد اس وقت ان دونوں کے ساتھ موجود تھیں اور یہ تمام گفتگو کر رہی تھیں اور قصداً لیزا سے کر رہی تھیں اس سے نہیں۔ وہ کیا کتا چاہتی تھیں یہ وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔

”میں تمہارے والد سے ملنا چاہتی ہوں لیزا۔“ ایک دم ہی آمنہ نے لیزا سے کہا۔

وہ تو جو چونکا تھا سو چونکا تھا مگر لیزا بھی انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”ویسے تو تمہارے والد سکندر سے مل چکے ہیں اور اسے پسند بھی کر چکے ہیں۔ انہیں اس رشتے پر کوئی

اعتراض بھی نہیں ہے۔ مگر میری خواہش ہے میں تمہارے گھر سکندر کا باقاعدہ رشتہ لے کر آؤں۔ وہ جو ہمارا روایتی مشرقی انداز ہے اس کے مطابق میں ان سے تمہارا رشتہ مانگوں۔ یہ میری بہت بڑی خواہش ہے۔ اگر تم دونوں مجھے اس کی اجازت دو تو یہ میرے لیے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔“

دولیزا سے مخاطب تھیں اس سے نہیں۔ اسے اپنی ماں کی ذہانت پر رشک آیا۔ پہلے فارم ہاؤس کی دعوت اور اب رشتہ لانے کی بات۔ دونوں بار وہ جانتی تھیں کہ اگر اس سے یہ بات کہی گئی، تو وہ صاف انکار کر دے گا۔ سوانہوں نے بات کرنے کے لیے لیزا کا انتخاب کیا تھا اور بات ایسے موقعوں پر کی تھی جب وہ بیٹوں کے ساتھ تھے۔

لیزا سکندر کی ناپسندیدگی اور انکار سمجھنے کے باوجود بھی ظاہر تھا۔ اس کی ماں کو صاف منع کس طرح کر سکتی تھی اور وہ خود اپنی ہونے والی بیوی کے سامنے اپنی ماں کی بات رو کر کے انہیں شرمندہ کس طرح کروا سکتا تھا؟

اس کی اموجان نے دونوں بار بہت ٹاک کر اور درست موقع پر دونوں باتیں کی تھیں۔ وہ فارم ہاؤس کی دعوت رو نہیں مگر بابا تھا اور اب اس وقت بھی بالکل چپ تھا۔ لیزا شش و پنج میں مبتلا ایک نظر اسے اور ایک نظر آمنہ کو دیکھ رہی تھی۔ آمنہ اس کے جواب کی خنجر تھیں ان کے چہرے پہ حسرت اور امیدیں تھیں ایک التجائی تھی ان دونوں سے۔

”بتاؤ بیٹا! میں تجاؤں تمہارے گھر؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“ انہوں نے رسائی سے اپنا سوال پھر دہرایا تھا۔

”آپ آجائیں اموجان! جب آپ کا دل چاہے۔“ لیزا اٹھنے لگے۔ ہاں اور نہ دونوں کرنا مشکل تھے اور دونوں مشکوک تھیں اس نے ہاں کرنے والی مشکل کا انتخاب کیا تھا۔

وہ اس کی ماں کو انکار کر کے شرمندہ نہیں کر سکتی تھی۔ آمنہ کو ہاں کہنے کے بعد لیزا نے معذرت طلب

نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو "میں کیا کرتی۔ تمہاری ماں کو کس طرح انکار کرتی؟"

دل میں وہ ماں کی اس خواہش پر جتنی بھی کوفت اور ناپسندیدگی محسوس کر رہا تھا پر منہ پر تو وہ بھی لیزا کے سامنے ماں کو اس بات نہ کہنے کے لیے منع نہیں کر پایا تھا۔ آہستہ سے ایک دم ہی خوشی سے یوں مسکراتی تھیں انہوں سرشاری ہوئی تھیں گویا کوئی بہت بڑی اور ناممکن نظر آنے والی خوشی پائی ہو۔ انہوں نے بے اختیار لیزا کے ہاتھ کے اوپر گرم خوشی سے اپنے ہاتھ رکھے تھے۔

"بہت شکریہ لیزا! تمہارے گھر سکندر کا رشتہ لاکر میں اپنی بہت بڑی خوشی پوری کروں گی۔ میں کل تمہارے گھر آؤں گی۔"

"امو جان! آپ لہجہ پاؤں ہمارے ساتھ بچے گا۔ لیزا نے مسکرا کر کہا۔ بغیر کسی تکلف کے آمنہ فوراً بولی۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ میں کل لہجہ پر تمہارے گھر آؤں گی۔ بس میں اور سکندر رہوں گے۔" آمنہ بے تحاشا خوش تھیں۔ جیسے ہفتا فلیم کی دولت مل گئی ہو۔ لیزا کن اکھوں سے اس کے بنیاد چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی اور معذرت تھی۔

"آہم سو رہی سکندر! تم ناراض ہو گئے ہو یاں؟" لہجہ کرنے کے بعد آمنہ اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ گھر واپس چلی گئی تھیں جبکہ وہ دونوں لیزا کے پایا کی گاڑی میں واپس جا رہے تھے لیزا معذرت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی سو وہ جواباً چپ رہا تھا۔ "مجھے پتا ہے۔ تم اس بات کو کبھی پسند نہیں کر سکتے مگر میں تمہاری امو جان کو کیسے انکار کرتی؟" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ہار مان لینے والی تھی تھکی سی مسکراہٹ۔

"مجھے پتا ہے لیزا! تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔ تمہاری جگہ میں ہونا تو میں بھی تمہارے بابا کو انکار کرنے سے بچاؤں گا۔ امو جان کو بھی یہ بات پتا تھی تب ہی وہ آج ہم دونوں سے ملی تھیں۔ وہ گھر سے سب کچھ

ٹلے کر کے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آج دراصل تم سے بات ہی یہ کرنی تھی اور وہ بھی میرے سامنے۔" اس کے چہرے پر اداسی بھری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"تمہیں غصہ آ رہا ہے سکندر؟ تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ ہے ناں؟" لیزا فکر اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"غصہ نہیں آ رہا لیزا! موڈ بھی ٹھیک ہے۔ بس یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ امو جان کی ایک اور خوشی اگر میری وجہ سے پوری ہو رہی ہے تو ٹھیک ہے۔ چلو ایسا ہی سہی۔" لیزا سر نشانات میں ہلاتی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

وہ بے چینی سے آمنہ کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں جیسے ہی انہوں نے پورج میں گاڑی رکھنے کی آواز سنی وہ کمرے میں بیٹھنے نہ سکے۔

وہ فوراً "لاؤنچ" میں آگئے۔ ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیا جواب دیا ہو گا سکندر نے؟ کہیں انکار نہ کر دیا ہو جیسے کل گفتگو لینے سے انکار کیا تھا۔ مگر وہ انکار اس نے ماں کو نہیں انہیں کیا تھا۔ ماں سے تو وہ بہت پار کر رہا ہے۔ وہ اپنی بیار ماں کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اتنا تو انہیں یقین تھا۔ خدا کرے آمنہ خوشی کی خبر لانی ہوں۔ آمنہ اندر داخل ہوئی تھیں اور ان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر ہی انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ کامیاب لونی ہیں۔ وہ بے اختیار ان کے نزدیک گئے تھے۔

"سکندر مان گیا؟" "ہاں! دل سے مانا ہے یا نہیں۔ مگر زبان سے ان نے مجھے نہ انہیں کہا ہے۔ میں کل لہجہ جاری ہوں لیزا کے گھر۔" "یا اللہ حیران لاکھ لاکھ شکر ہے۔" بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا تھا۔

"تھنک یو آمنہ! بس اب اللہ جلدی سے یہ خوشی دکھا دے کہ ہم دونوں مل کر سکندر کی شادی کریں۔"

زندگی میں پہلی بار وہ میاں بیوی کی طرح 'دستوں کی طرح ایک دوسرے سے دل کی باتیں شیئر کر رہے تھے۔ پہلی بار کوئی خواب تھا جو وہ دونوں مل کر ایک ہی جتنی امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار کوئی دعا تھی جو وہ دونوں ایک ہی شدت سے مانگ رہے تھے۔

"آمین۔"

"بس اب تم کل ایراکے والدین سے شادی کی تاریخ لے کر آنا۔ میں چاہتا ہوں مہندی شادی ولیمہ سکندر کی شادی کی ہر تقریب یادگار ہو۔ لوگ سالہا سال اس شادی کو یاد رکھیں۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا شہزاد!"

وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کر رہے تھے انہیں لازماً کچھ دواؤں سے پر کھڑے زین کے منہ تو آنے کا پتا چلا تھا نہ وہاں رکنے کا اور نہ ہی وہاں سے چلے جانے کا۔



وہ اسٹڈی میں تھے۔ وہ شادی کے ڈیرے انٹرنو کارڈز کے کچھ ڈیزائن گھر منگوا چاہتے تھے۔ اسی کے لیے وہ چند ایک فون کالز کر رہے تھے جب زین اسٹڈی میں ان کے پاس آیا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز تیار تھا وہ ان سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہے ورنہ انہیں فون پر بات کرنا دیکھ کر بولت جاتا۔

"آپ کل صبح تک بھجوا دیں۔ مجھے سہیلز۔"

انہوں نے فون پر گفتگو مختصر کی تھی "ٹھیک ہے بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔"

"کیا دوا زین؟" فون بند کرتے ہوئے انہوں نے زین سے پوچھا۔ زین کے چہرے پر ناراضی تھی۔

"یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے لیا؟"

"کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے تعجب سے زین کے غصے بھرے چہرے کو دیکھا۔

"سکندر کی شادی کی تیاریاں۔ آپ اموجان کی

خاطر اس سے مل لیے تھیک کیا۔ مگر اس کی شادی کی اس طرح تیاریاں۔ دس از نو بجے اگر میں اس گھر میں رہ گیا اس کی شادی یہاں پر ہوئی تو اتنے دنوں کے لیے میں اپنے بیوی بچے کو لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

انہوں نے غصے سے بولتے زین کو دیکھا وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

"تمہیں جہاں جانا ہے چلے جاؤ زین! مگر سکندر کی شادی میں اور آمنہ مل کر ہی کریں گے۔ یہ گھر صرف تمہارا نہیں سکندر کا بھی ہے۔ بلکہ اس گھر پر مجھ، تمہارے بہنوئی ہر جہیز پر سکندر کا حق تم سے زیادہ ہے۔ مانا کیا میرے اس بیٹے کو مجھ سے؟ جو اٹنے دکھوں اور تکلیفوں کے؟"

انہوں نے سخت لہجے میں جواب دیا شروع کیا تھا مگر جیلے کے آخر تک آتے آتے ان کا لہجہ دکھوں اور بچھتاؤں سے بھر گیا تھا۔

"اسے جو ملو اسی لائق تھا۔" زین نفرت سے بولا۔

"اچھا؟" زین کے نفرت بھرے انداز پر وہ تسلی سے مسکرائے تھے۔ زین نے اس بار جیسے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔ جیسے ان کا انداز سمجھ نہ پایا ہو۔

"بے خبری بہت بڑی نفرت ہے زین! جس بھائی سے تم بھی دل میں نفرت لیے بیٹھے ہو، اگر میں تمہیں سچائی بتا دوں تو زندگی بھر خود اپنے آپ سے نفرتیں نہیں ملا پاؤ گے۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائے تھے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ زین ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلہ سکندر کے لیے نفرت تھی۔ بھائی کی بھائی سے اس درجہ نفرت کی بنیاد کہاں رکھی گئی تھی؟ کس نے رکھوائی تھی یہ بنیاد؟ زین کی آنکھوں میں سکندر کے لیے نفرت دیکھتے ہوئے ان کا دل چاہا وہ چیخیں مار مار کر رو میں خود کو اپنے وجود کو مٹا دالیں۔

"میں ساڑھے چار سالوں سے ایک دھماکا گناہ، شرم اور ندامت کو ساتھ لیے زندگی گزار رہا ہوں زین!

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawate-ndigest.com



مولویہ کا فاسٹ فوڈ

مولویہ کا فاسٹ فوڈ... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

ذاتی

ذاتی... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

مولود

مولود... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

فہم

فہم... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

رازِ محبت

رازِ محبت... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

خاتونِ شہنشاہ

خاتونِ شہنشاہ... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

پیشین

پیشین... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

اسٹیلیا

اسٹیلیا... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

بدامِ رشیدی

بدامِ رشیدی... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

القا و شہنشاہ

القا و شہنشاہ... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

پندھن

پندھن... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

پرچہ خاندان

پرچہ خاندان... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

پندھن

پندھن... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

پندھن

پندھن... ایک نیا ذائقہ... ایک نیا تجربہ...

لہیں اس ندامت اور گناہ کے احساس سے بچانا چاہتا تھا۔ ورنہ ساڑھے چار سال پہلے ہی تمہیں ساری ہمالی بتا دیتا اور شاید تمہیں نہ بتانا میری غلطی تھی۔ اگلے لکس بد کردار لڑکی کی حقیقت تمہیں ضرور بتا دینی چاہیے تھی جسے تم نے بارہ سال پہلے اپنی شریکِ حیات بنانے کے لیے چنا تھا۔ پھر کل فارم ہاؤس پر تم ہمالی کے لیے چروے پر نفرت لیے کھانے کی میز پر اس کے سامنے نہ بیٹھتے۔ تم اسے دیکھتے ہی اس کے سامنے معافی مانگنے کے لیے ہاتھ جوڑ دیتے۔ رو رو کر اپنے اس ہمالی سے معافی مانگتے جس سے کل تم نے سلام دعا کر لی تک گوارا نہ کی تھی۔

وہ زین کی طرف دیکھ رہے تھے جو حیرت زدہ سا نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ان کی کوئی بھی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔

”کیا جانتے ہو تم ام مریم کے بارے میں زین؟ ابھی میں تمہیں اس کی سچائی بتا دلوں تو تم شرم سے خود اپنے آپ سے نظریں نہ ملا پاؤ گے کہ اس بد کردار لڑکی سے تم شادی کے خواہش مند تھے۔ اس کے رچائے دار اسے کا یقین کر کے تم نے اپنے بڑے بھائی پر ہاتھ اٹھایا تھا اس کو گایاں دی تھیں؟ اس سے زندگی بھر کے لیے قطع تعلقی کر لیا تھا اور آج تک اسی لڑکی کے دکھائے اس جھوٹ کوچ مان کر اپنے بھائی کی شکل تک سے نفرت کرتے ہو۔“

بولتے ہوئے جذبات کی شدت میں آکر ان کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ وہ زین کو غصے سے دیکھ رہے تھے۔ زین اب بالکل چیپ تھا۔

”سکندر ام مریم کے بارے میں بالکل سچ کہتا تھا زین! وہ لڑکی طوائفوں سے بھی بدتر تھی۔ جب وہ تمہیں لاس انجلس میں ملی تھی تو نہ کنواری تھی نہ اگر وارنہ حیات دار و شہزادہ جو تم نے اسے سمجھا تھا میں نے اور آمنہ نے اسے سمجھا تھا۔ وہ تمہیں کیا مجھ جیسے دنیا کیجئے ڈوبن اور تجربہ کار آدمی تک کو بے وقوف بنا گئی تھی۔ اتنی چالاک اور مکار تھی وہ۔“

جذبات کی شدت ان پر غالب تھی۔ بولتے ہوئے

رجسٹر کے لیے جانے کا انتقام لینے کے لیے اس نے سارا سین کر بیٹھ کر دیکھا تھا۔ اس ہوشیاری کے ساتھ کہ اس پر ہجرت کا کمان ہو۔ یاد کرو زین! جب ہم سکندر ہم ہاتھ اٹھا رہے تھے تب وہ چلا چلا کر تم سے کہا کہ رہا تھا وہ تمہیں اور مجھے ام مریم کی سچائی جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہم جو اس کے سب سے زیادہ اپنے ہمارے لیے سکندر سے زیادہ قابل اعتبار وہ بدکردار لڑکی تھی جسے ہم سے ملے فقط کچھ ہی عرصہ رہا تھا جس کا ماضی بھی ہم نہیں جانتے تھے۔

شہزاد خان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ ان کی آواز مدھمکنی تھی۔

انہیں سانس لینے کو جذبات کو قابو کرنے کو بل بھر کر رکنا پڑا تھا۔ زین بالکل سناٹا کہہ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ام مریم کا بدکاری سے بھر ماضی مجھے کسی اور نے نہیں اس کی ایک پرانی سیٹی نے بتا تھا۔ ام مریم اپنے سوٹیلے باپ کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر کے سارا حصہ سولہ سال کی عمر میں ریجنٹس تک ہو چکی تھی اپنا بچہ ضائع بھی کر چکی تھی اور اس ایفٹر کے نتیجے میں اپنی ماں کو طلاق بھی دلوا چکی تھی یہ اس کا وہ فیصلہ ہے جو میں جانتا ہوں۔ تم سے ملنے سے قبل اس کے اور کسی کس سے تعلق رہے ہوں گے وہ میں نہیں جانتا۔ مگر اب جس امیر پر اس میں سے شادی کر کے وہ کراچی ہی میں رہ رہی ہے اس سے نکاح کرنے سے قبل اس کے ساتھ جو ٹولوں میں جا جا کر رہا تھیں گزارا کرتی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس بات کا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ہاشم اسد کے ساتھ ہوٹل کے روم میں بانسوں میں بائیں ڈال کر جاتے دیکھا ہے۔ اس کے عشق میں پاگل ہو کر ہاشم اسد نے اپنا سب سب لیا گھر اجاڑ دیا۔ اپنی بیوی اور تین بچوں کو چھوڑ دیا۔ میری باتوں کی تصدیق چاہتے ہو تو جا کر اس مظلوم عورت سے ہاشم اسد کی پہلی بیوی سے اس ناگن کی سچائی جان لو۔ اپنی سگی ماں کا گھر ام مریم نے اجاڑا۔ تین بچوں کے باپ کا گھر اس نے خراب کر دیا۔ ہمارے گھر کی خوشیاں اس نے اجاڑیں۔ یہ نہیں گھر تو وہ ہو گئے جن کا گھٹے پتا ہے عزیز شہزادے کتنے گھر اور کتنے لوگوں کو اس ڈائن نے تباہ کر دیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا۔"

غصے کی شدت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کی آواز بلند تھی۔ زین جیسے سب کچھ کھانا سنا بھول گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں حیرت، بے یقینی اور سکتے لیے ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم سے منتی کروانے کے بعد اس کا سکندر پر دل آ گیا تھا۔ وہ تو بھی ہی سچ۔ سکندر کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ مگر میرے غیرت مند اور بدکردار بیٹے کو رشتوں کی حرمت کلاس تھا۔ اس نے ام مریم کی پیش قدمی کو ٹھکرایا اسے روک دیا تو

"ساڑھے چار سائوں سے گناہ کے بوجھ تلے دبا زندگی گزار رہا ہوں میں۔ زین! بوجھ میرا ہے قصور اور معصوم بیٹا البتہ کسی خطا کے عمر بھر سزا کا نواہ ہے۔ میں تو آج اس سے معافی مانگنے کے بھی قابل نہیں ہوا خود کو! وہ ترحیح آئندہ کے سامنے دیئے تھے اور اب زین کے سامنے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔

بیٹے کی برادری اس کی پامالی پر ان کا بھی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر دیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ زین کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ مردہ انداز میں بولتا تھا۔

وہ عجیب شکستہ قدموں سے چلتا اسٹڈی سے جا رہا تھا۔ لگتا تھا کسی بھی پل گر پڑے گا۔ ابھی تو انہوں نے زین کو وہ سب سے بڑی بات نہیں بتائی جس کے واقف صرف وہ سکندر اور اللہ ہے۔ زین کی نظروں اور ان کے پاگل پن نے گھر سے نکالے جانے کے بعد سکندر کو کس حال تک پہنچا دیا تھا۔ اس کا مردانہ وقار اس کی عزت و آبرو کس طرح پامالی کی گئی تھی۔ بتادیں تو زین شاید خود کو جہنم سے ہی مار ڈالے۔

یہ انتہائی حد تک تکلیف دہی اور رلائی سچائی ہونے پر کبھی آمنہ کو بتانا چاہتے تھے نہ زین کو۔ اس نے سکندر کی عزت اور اس کا وقار انہیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر پکارا تھا۔ وہ اسٹڈی میں اس کیلئے بیٹھے سکندر کے اس دکھ پر اس کے وقار کی پامالی پر پھر سے بد پرزے تھے۔

(بالی آئندہ اثناء اللہ)

قسط ۱۲

جس کا ذی چلا رہا تھا۔ اسے خود بہت نہیں تھا وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ تھا بھی کہ نہیں۔ کیا وہ زندہ تھا؟ کیا وہ سانس لے رہا تھا؟ کیا یہ سب کچھ سننے اور جاننے کے بعد بھی زندہ تھا؟ اس کے کانوں میں تو آدیس گونج رہی تھی۔ بہت سی تو آدیس۔ کسی کی خود کو یاد سے لگا رہی باقی صدا نہیں۔

”تم نے میرے ساتھ کھیلنا کیوں چھوڑ دیا ہے زین؟“

”آؤ زین! ہم ساتھ مل کر کھیلنے ہیں۔“

”میں تم سے بہت پار کرنا ہوں زین۔“

”میری اسپورٹس گاڑی تم لے لو زین۔ میرا جھوٹا بھائی اس سے کھیلے گا تو مجھے زیادہ خوش ہوگی۔“

اس نے خود کو بیک دیو مرہ میں دیکھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا وہ رو رہا تھا۔ زین شہر پار سکندر شہر پار کے لیے رو رہا تھا؟ اس کے لیے جس کے لبوں کی اسی لہر اس کی ہر خوشی اس سے بھی اس نے چھین لی تھی چاہی تھی لوہر پھر چھین بھی لے لے تھی۔ وہ جیسے کسی کمری کھائی میں گرتا جا رہا تھا۔

بے خبری واقعی بہت دیر تھی۔ اس سے نفرت کرتے ہوئے زندگی کے بارہ سال کس سہولت سے گزار دیے تھے۔ ترجیح سب جان لینے کے بعد بارہ منٹ گزارنے میں مشکل ہو گئے تھے۔

”شکر! تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین؟“ بھائی الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں تو کیا ایک دوسرے سے فون پر بھی بات نہیں کرتے۔“

”مجھ سے جھوٹی محبت جتانے کے بجائے وہ کوجو تھوڑے دن میں بے وفائی کر دیا۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔“

بہت کی تکلیف ہے یاں نہیں؟“ اس کی پار بھری جدائیں تھیں اور جواب میں اس کی اپنی نفرت سے چھکارا دیا۔ زہریلے آواز۔ جیسے ایک فلم نگاہوں کے سامنے چل رہی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کا بچپن ’لڑکپن‘ (چوہلی)۔ سکندر کی اس سے محبت اور جواب میں اس کی اس سے نفرت۔ بے تمنا نفرت۔ سکے بھائی سے کوئی اتنی نفرت بھی کر سکتا ہے؟ اتنی نفرت۔ اتنا حسد۔ اتنی دشمنی۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح ہلک ہلک کر رو رہا تھا۔

نجانے کون سی شاہرہ تھی، کون سی سڑک جس کے کنارے گاڑی کھڑی کر کے وہ مسٹرنگ پر سرنگار زارو قطار رو رہا تھا۔ باپ نے اسے صرف سکندر ہی کے بارے میں نہیں بلکہ ام مریم کے بارے میں بھی بہت کڑوی اور تلخ چٹائیاں سنائی تھیں۔

وہ لڑکی جسے اس نے بے حد اور بے حساب چاہا تھا جس کی محبت وہ آج تک اپنے دل سے نکل نہیں پایا تھا۔ اسے بھی ابھی بتایا گیا تھا کہ مریم کی وہ محبت جھوٹ تھی ’دھوکا دہی‘ مکاری تھی۔ بہت کرب تک تھی یہ سچائی مگر اسے ام مریم کی خود سے بے وفائی اور جھوٹ اس بل نہ یاد آ رہے تھے۔ نہ دلا رہے تھے اگر کچھ یاد آ رہا تھا تو سکندر۔ اگر کچھ دلا رہا تھا تو اس کی چاہی اور بریلو۔ سکندر اس کا اپنا اس کا۔ بھائی۔ بھائی۔ جس کی زندگی اس کی نفرت اور دشمنی نے اجاڑ دی تھی۔ اس کا وہ بے مثال لوہر شاہنشاہ وار بھائی جس میں دنیا تغیر کر لینے کی صلاحیتیں تھیں۔ اس کی حسد اور نفرت کا ڈھکڑھو کر کہاں سے کھل جائے گی کیا تھا؟

سکندر سے حسد؟ ہاں۔ حسد۔ آج تو یہاں لے لے یہ چاہی کہ سکندر سے اسے کوئی حسد نہ ہو۔ وہ حسد کے۔ سکندر نے اس کا کبھی کوئی نقصان نہ کیا تھا۔

دل نہیں نکلتا۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نہیں سوچا میرا بھائی نبھانے کہاں اور بد پرچہ رہا ہو گا؟ کس حال میں ہو گا؟ میں آسانشوں میں جی رہا ہوں۔ نبھانے اسے دو وقت کا کھانا بھی نصیب ہو رہا ہو گا یا نہیں؟ وہ آج بارہ سالوں بعد خوف اور اور لذت سے کانپ رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے کب سے بھائی پر ہاتھ اٹھایا تھا اسے بری طرح مارا تھا، گالیاں دتی تھیں۔ اس کا بھائی وحش کے مار مار کر ذلیل و رسوا کر کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ آخری وقت تک وہ چیخ کر رو کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

گھر سے نکال دیے جانے کے بعد وہ کہاں گیا ہو گا؟ وہ آج پورے بارہ سالوں بعد یہ بات سوچ رہا تھا۔ 31 دسمبر کی رات جب اس نے گھر کے ر آسانش کمرے میں بیٹھ کر وہ اس بد کردار لڑکی پر ٹوٹے ظلم کا اہم منارہا تھا جب اس کا وہ مظلوم بھائی کہاں رہا تھا؟ وہ رات اس نے کہاں بتائی تھی؟ اپنی زندگی کے گزرنے بارہ سال اس نے کہاں گزارے تھے؟ کس طرح گزارے تھے؟ وہ کن مشکلات سے گزرا تھا۔

اسے دینے کس کس طرح اپنی ٹھوکر پر دکھا ہو گا؟ بھائی کی خوشیاں اس کے خواب چھین کر وہ خود آج کہاں کھڑا تھا؟ باب گھر بہترین تعلیم آسانش کلاسک کیر بڑ بہترین پروفیشن بیوی بیٹے اس کے گھر اور اس کا بھائی؟ اس کے حسد کا نشانہ بن کس کا باب سے دور گھر سے دور نبھانے بن مصائب سے گزرا تھا۔ نبھانے کس طرح اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ نبھانے کیسے اپنی تعلیم پوری کی تھی۔ نبھانے کس طرح وہ بالکل شمار رہا تھا۔ سکندر کا کوئی ایک خواب بھی پورا نہیں ہوا تھا اور اس کے تمام خواب پورے ہوئے تھے۔ آج بارہ روڈ کا ڈگری یافتہ زمین شیردار ہے۔ سکندر شیردار نہیں۔

خوش ہو جاؤ زمین شیردار! جشن مناؤ۔ تم نے سکندر کو بڑ لایا ہے۔ ٹھیک سوچا کرتے تھے تم سکندر بیٹے ہی تو ظلم عالم نہیں ہو اگر نہ سکندر ہا بھی تو سکتا ہے ہاں سکندر ہا سکتا ہے اگر اس کا زمین شیردار جیسا حاسد

وہ اگر زیادہ زمین تھا تو یہ اس کا قصور نہ تھا باب اس کی ذہانت کی وجہ سے اسے زیادہ اہمیت دیتے تھے تو یہ بھی سکندر کا غلطی نہیں تھی۔ اس کی ذہانت پر خوش ہونے اور اس کی کامیابیوں پر خیر کرنے کے بجائے اس نے بھائی سے حسد اور مقابلہ بازی شروع کر دی تھی۔ وہ کبھی اخلاطی کا مظاہرہ کر کے بھائی کی خود سے برتری کیوں تسلیم نہ کر سکا۔ اور اس کے بھائی کا گریز اس کا پروفیشن اور ان سب کے حوالے سے دیکھے اس کے خواب سب بکھر گئے اس کے حسد کی وجہ سے۔

سکندر کے بارہ روڈ میں پڑھنے سے جلتا تھا ناں؟ خوش ہوئے آج کہ وہ بھائی بارہ روڈ سے ڈگری نہ لے سکا تھا۔ اس کی ذہانت سے حسد کرنا تھا تو جشن منانے آج کہ وہ بھائی لڑا کوئی بھی خواب پورا نہ کر سکا تھا۔ خود کو مظلوم سمجھتا کل وہ اسی بھائی سے کس نفرت سے فارم باؤس پر ملا تھا؟ کس دیدہ دلیری سے وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا اتنی جرأت اتنی مجال کہاں سے آگئی تھی کہ جسے بڑا کر دیا اس کے سامنے نفرت سے کھرا بھی ہو سکے؟

اس کا حسد سے مر جانے کو جی چاہ رہا تھا یہ آگئی بہت کڑی تھی۔ یہ آگئی اسے اس کی اپنی بہت کڑی اور حیا تک شکل دکھا رہی تھی۔ بارہ سال سکون سے رہا مگر اب زندہ کس طرح وہ پائے گا۔ اپنے قدموں پر کھڑا کس طرح رہے گا۔ خود کو بہت اچھا اور بہت مظلوم سمجھتے سمجھتے پتا چلا تھا۔ وہ دنیا کا سب سے سنگدل اور کم ظرف انسان ہے۔

وہ اپنے ہی بھائی سے ساری زندگی حسد میں مبتلا رہا ہے اس کا حسد اس کی جگہ آجاؤ گی اس کے بھائی کی زندگی کو۔ ساری زندگی مظلومیت کا ڈھول بٹھاتا رہا تھا۔ مظلوم؟ کس بات کی مظلومیت؟ آخراں کے ساتھ ظلم ہوا کیا تھا؟

وہ ایک بد کردار لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور یہ شادی ہو نہیں پائی تھی۔ یہ تھی اس کی مظلومیت؟ مظلوم حقیقت میں تھا کون؟ بدترین ظلم جس پر توڑا گیا تھا وہ کون تھا؟ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کا

اور کم ظرف بھائی ہو۔



”تم میرے گھر نہیں آئیں بل لڑ۔ بہت بری“

سیم کاشام میں اس کے پاس فون آیا تھا۔ وہ فون سن کر
میں ملتی بارگاہ سے مسیج کر کے اس سے پوچھ چکی
تھی کہ وہ اس کے گھر کب آ رہی ہے۔ وہ سیم کو یہ کیسے
بتائی کہ کل رات اسے پیانے منع کیا ہے سیم کے گھر
جانے سے۔ وہ سیم کو یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ کل
رات محمود خالد اس کے گھر سے میں اس کے پاس آئے
تھے۔ انہوں نے اپنے دل کی بہت سی باتیں پہلی بار
اس سے کی تھیں اور وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر روئی
بھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ باب سے اظہار محبت کیا تھا۔
ان کے لیے دل میں محبت محسوس کی تھی۔ زندگی میں
پہلی بار اس نے خود کو ان کے قریب محسوس کیا تھا۔ یہ
محسوس کیا تھا کہ اس کے پیارویسے نہیں جیسا وہ برسوں
سے انہیں سمجھتی آ رہی ہے۔

وہ سیم کو بتانا چاہتی تھی کہ ان کے پیار اندر سے ایک
بڑے ہی دھڑکی انسان ہیں اور وہ اس سے بے حساب
پیار کرتے ہیں۔ وہ اس کو ہمیشہ بہت خوش رکھنا چاہتے
ہیں۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی رکوانے کے لیے
کچھ کر سکتے ہیں ایسا تو اب وہ خواب میں بھی نہیں سوچ
کتی مگر سیم سے وہ یہ ساری باتیں کہہ نہیں پا رہی
تھی۔ پر اتنا طے تھا کہ پیانے کی بات مانے گی۔ وہ ان کا دل
رکھے گی۔ اگر انہوں نے منع کیا ہے تو وہ سیم کے گھر
نہیں جائے گی۔

”بس۔ اب میں کچھ بھی نہیں جانتی لڑا تم کل
میرے گھر آ رہی ہو اور سکندر کو بھی وہیں بلا رہی ہو۔
میں کیا اپنے ہونے والے بہنوئی سے ملوں گی بھی نہیں“

اس کے یہ جتانے پر کہ وہ ترجیحاً ”مبارک“ سکندر
کے ساتھ شاپنگ میں مصروف رہی تھی۔ سیم

نورا بولی تھی۔ اپنے اسی مخصوص رعب بھرے انداز
میں جس سے وہ اپنی باتیں اس سے منوالیا کرتی تھی۔
”کل تو میں بالکل بھی نہیں آ سکتی سیم اگلے پیانے
ملنے سکندر کی مٹی آ رہی ہیں پھر۔“ بیانا اس کے پاس
موجود تھا اور تھا بھی۔ سوہ نورا بولی تھی۔

”لوہ تو یہ بات ہے۔ کل تمہاری ہونے والی ساس
صاحبہ شریف لا رہی ہیں؟“ سیم ہنس کر بولی تھی
پرمزاح سے انداز میں۔ مگر پھر بھی اسے اس کے کچے میں
کچھ مختلف سی بات محسوس ہوئی جسے وہ کوئی نام نہ
دے سکی۔

”ہاں۔ کل پھر سکندر اور اس کی مٹی ساس آ رہے
ہیں۔“ وہ جواباً مسکرا کر بولی تھی۔

”چلو پھر میں بھی کل وہیں آ جاؤں گی۔ میں بھی تو
ملوں تمہاری ساس صاحبہ اور مسٹر سکندر سے۔“
سیم شرارتی سے انداز میں بولی تھی۔ محمود خالد کو وہ
گھر واپس آتے ہی سکندر کی اسوجان کی کل ان کے گھر
آمد کی بابت بتا چکی تھی۔

وہ اس بات کو سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ شاید
ان کے بھی دل میں چھپی خواہش یہی تھی کہ ان کی بیٹی
کی بالکل روایتی انداز میں شادی ہو۔ انہوں نے اسی
وقت ہی عائشہ کے ساتھ بیٹھ کر کل مہمانوں کی خاطر
تواضع شاندار انداز میں کیے جانے کا پورا پورا گرم ہٹا لیا
تھا۔ سکندر کی والدہ کے ساتھ اور کتنے افرانے آنا تھا وہ
جانتے تھے عزیز انہیں بتا چکی تھی مگر پھر بھی انہوں نے
اہتمام اس طرح کرنا شروع کیا تھا گویا لڑکی مسرال
سے سو پندرہ افرانے آنا تھا۔



اگلے روز صبح ہی سے ان کے گھر پر اس طرح شور
شربا اور ہنگامہ تھا۔ جیسے آج ہی گھر پر لڑائی شادی کی
تقریب ہو۔ وہ باب کی محبت کو محسوس کر رہی تھی وہ
ان محبتوں پر خوشی سے سرشار ہو رہی تھی اور دل میں
یہ بھی سوچ رہی تھی کہ وہ ان سے ہمیشہ اتنی دور کیوں رہی
کہ کبھی ان کے دل میں جھانک کر اپنی محبت دریافت



تھی۔

”چلو تمہارے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کر لے لیا۔“

اسے گلے لگا کر مارتا کرنے کے بعد سیم اس سے ہوا تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا شاگل بیک تھا۔ وہ سیم کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

سیم نے اس کے کمرے کو بہت غور سے دیکھا تھا جیسے گھر کے اس کمرے میں پہلی مرتبہ آئی ہو۔

”یہ روم تم نے خود سیٹ کیا ہے نہ؟“ چاروں طرف نگاہیں گھماتے ہوئے سیم نے اس سے پوچھا۔ اس کی نگاہوں میں کمرے کی آرائش و سجاوٹ کے لیے سٹائش کی تھی۔

”نہیں میرے آتے سے پہلے ہی پیلا نے تیار کر دیا کر رکھا تھا۔“ سیم نے ایک بل کے لیے اسے بغور دیکھا بہت سنجیدہ نگاہوں سے۔ پھر وہ مسکرا دی تھی۔ ”چلو ہم نہیں زندگی میں پہلی بار اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ کرنے کا خیال تو آیا۔“ سیم کا ہجہ طعنے دار سنہرا تھا۔

”پیلا بہت بدل گئے ہیں سیم! ہم انہیں جہاں جیسا سمجھتے ہیں۔ وہ اب ویسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ ہم لادلوں کے ساتھ بچپن میں جو کچھ بھی ہوا۔ اس پر بہت تکی ٹل کر رہے ہیں۔“

وہ بے اختیار سنجیدگی سے بولا۔ اس کے لہجے میں باپ کی محبت تھی۔

”لاڈل ابھی تمہیں یہاں آئے ہوئے ہیں نہ۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ اتنی جلدی کوئی رائے مت قائم کرو۔ میں آج صرف اتنی ہی اس لیے ہوں کہ بلا سکندر یا اس کی مہمی کے ساتھ کوئی اتنی سیدھی بات نہ کر سکیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہو گا سیم! تم فکر مت کرو۔“ دونوں ساتھ بید پر بیٹھ گئی تھیں۔

”کیا پسند رہی ہو تم آج؟“ سیم نے غصہ کو کامو مضمود تبدیل کیا تھا۔ مسکرا کر دیکھی سے پوچھ رہی تھی۔ ”شلوار لیں۔ بلکہ چوڑی دار بنے شلوار نہیں۔“

نہ کر سکی؟ پانچ سال پہلے تک وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ لندن میں رہتی تھی۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ کبھی ان کی محبت کو کیوں نہیں سمجھ پائی تھی؟ صبح لوگ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ سیم بھی آگئی۔ عائشہ گل اور ملازمہ کو ساتھ لگائے لچکی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

اس وقت وہ محمود خالد کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی تھی۔

سیم کی گاڑی پورچ میں رکھی دیکھ کر اگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی، دل خوش ہوا تھا تو وہ سری طرف محمود خالد کا سیم کو دیکھتے ہی مڑاؤ آگیا ہو گا تھا۔ وہ جیسے آج کے اس دن اس موقع پر سیم کی اپنے گھر موجودگی کو پسند نہیں کر رہے تھے۔

”مریم کو تم نے انوائٹ کیا ہے؟“ انہوں نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”نہیلا۔“ وہ انہیں یہ نہیں بتا سکی تھی کہ میں نے انوائٹ نہیں کیا۔ صرف اسے آج سکندر اور اس کی اموجان کے آتے کا بتایا تھا۔ وہ سال خود آئی ہے۔ اگر سیم آج یہاں آگئی تھی تو اس میں برائی کیا تھی؟ وہ باپ کی ناراضی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”پیلا! آپ کو کیا سیم کا آنا اچھا نہیں لگا؟ میری اکلوتی بہن۔ سہیلا۔ میں چاہتی ہوں۔ میری شادی سے بڑے ہر مقام پر وہ میرے ساتھ ہو۔ مجھے سیم کا اپنے پاس موجود ہونا اچھا لگے گا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ اس کے لفظوں میں بہن کے لہجہ المانہ مارتا تھا۔

محمود خالد بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیسے خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔ پھر جیسے جملے پر نظر مانی کر کے نرمی سے بولے۔

”ٹھیک ہے جیسا! جیسی تمہاری خوشی۔“ اسے یہ جواب دیتے ہی وہ فوراً وہاں سے بٹے تھے۔ وہ ٹیرس سے جا رہے تھے۔ ایک سیکنڈ حیرت سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ بھی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ وہ سیم سے ملنے نیچے جا رہی تھی۔ مگر سیم اوپر ہی چلی آئی

لائی ہو۔ مگر پلیر مائنڈ مت گرے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی۔ بہت بول رہی ہے۔"

اس نے اس کی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے سیم سے کہا۔

"بھائی! آج کل پاکستان میں سب لڑکیاں اسی طرح کے کپڑے پہنتی ہیں۔ اس ساڑھی میں تمہارا فکرو کیا غضب کا گنگے گلہ پوری قیامت لگو گی تم۔"

سیم اس کے انکار کو خاطر میں لانے بغیر بات منوانے والے انداز میں بولی۔ مگر اس کا اس ساڑھی کو پہننے کا قلعہ "کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"اگم سو ری سیم! میں یہ نہیں کہہ سکتی۔ میں یہ والا ذریعہ ہی پہن لوں گی۔"

وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر اس کی سے بولی تھی۔

اسے دل ہی دل میں سیم کے اور تھوڑی سی کوفت بھی ہونی چکی۔ آخر اس نے اسے گب اس طرح جسم کو نمایاں کرتے کپڑے پہنے دیکھا تھا جو اس کے لیے اپنی

سی تھوڑی ساڑھی اس قدر مختصر ہواؤ کے ساتھ خرید لائی تھی۔ وہ سیم کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کا اس ساڑھی کو پہننے کا قلعہ "کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ

جانتی تھی سیم بہت شوق اور محبت سے یہ تحفہ اس کے لیے لائی تھی شاید ایشم سے شادی کے بعد وہ اس طرح کے بولڈ کپڑے پہنے گی ہوگی مگر وہ تو ایسا نہیں کر سکتی تھی ناں۔ سیم کے چہرے پر ہلکی سی ناراضی آگئی تھی۔

ابھی وہ دونوں شاید اس موضوع پر مزید بھی کچھ بات کر رہی تھیں کہ اس کے موبائل پر سکندر کی کال آئے گی۔

موبائل بیل پر ہی پر اٹھا اور دیکھا "جہاں سیم بیٹھی تھی وہیں رکھا تھا۔ اس کے فون اٹھانے سے پہلے سیم نے موبائل اٹھا لیا تھا۔ سکندر کا لنگ۔ سیم نے آواز بلند بولا تھا سہ موبائل سیم کے ہاتھ سے لینے لگی تھی۔

"لاؤ مجھے دو سیم۔" سیم ایسے چھیڑنے کو موبائل اپنے دوسرے ہاتھ میں لے گئی تھی۔

"یہ کال تو میں ریسیو کروں گی ٹیڑھے۔"

آخر اس نے Brother in law (بھائی) سے سلام دعا تو کرنی ہے ناں مجھے۔" سیم شرارت بھرے

انداز میں بولی کال ریسیو کرنے لگی تھی۔

کل شام ہی اتنی ایمر جنسی میں میرے لیے خرید کر لائی ہیں۔ مجھے خود تو یہاں کی مارکیٹس کا زیادہ آئیڈیا نہیں ہے۔ کل میں نے اور سکندر نے برائینڈل ڈسکس خریدے تھے تو اس کی می ہمارے ساتھ تھیں۔"

وہ فوراً ہی انھی کپڑوں کی تاکہ وارڈ روم سے نکال کر ہم کو اپنا آج پہنا جانے والا جوڑا دکھانے لگی۔

"تم نے برائینڈل ڈسکس بھی خرید لیے؟ بڑی ایڈمز میں ہو تم دونوں۔ آج ہی نکاح صحت رکھو لیا۔"

وہ وارڈ روم سے بیگر سمیت جوڑا نکال رہی تھی تب اس نے سیم کی ہنستی ہوئی آواز سنی۔ وہ مسکراتے

اور سیکو ایس ہیڈ پر آگئی تھی۔

"یہ پہن رہی ہوں میں آج۔ شرارہ اور غراہ تمہیں ابھی دکھائی ہوں۔"

وہ ہینڈ پر سیم کے سامنے بھر پڑ گئی تھی۔ بہت خوش ہو کر مسکرا کر سیم کو اپنا جوڑا دکھا رہی تھی۔ براؤن اور شاٹنگ پنک رنگوں کے اسٹریچ والا بہت خوب صورت ڈریس عائشہ اس کے لیے خرید کر لائی تھیں۔

"تم پہ پہنو گی؟ اتنے فضول اور بورنگ کپڑے؟ حد کرتی ہو تو۔" سیم نے برا سامنے بنا کر جوڑے کو فوراً رد کر دیا تھا۔

"اجھا خاصا خوب صورت تو ہے سیم۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے بورنگ کپڑے پہننے کی۔ اپنی ساسوایاں اور ہونے والے شوہر صاحب کا دل خوش کرنے کو تمہیں لائٹ لونز Looks چاہئیں مجھے پتا تھا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے کل رات ہی جا کر یہ ساڑھی خریدی تھی۔ اسے پہن کر تم غضب ڈھاؤ گی۔ ساس صاحبہ آج ہی شادی کی ٹھٹھ ملے کر کے نہ جائیں تو کنگ۔"

سیم نے پاس رکھا شاٹنگ پنک اٹھایا تھا۔ اس نے اس کھول کر اس میں سے ساڑھی باہر نکالی تھی۔ وہ نیسن کلر کی شیفلون کی پلین ساڑھی تھی۔ جس کے ساتھ خوب صورت کام ہا سیلیو نیس پلوڈ ڈیزائن کی مختصر

ساتھا۔

"تھیں کس سیم! تم میرے لیے ساڑھی خرید کر

...

"سیم! پلیز مجھے بات کرنے دو۔ اسے کوئی ضروری بات کرنی ہوگی۔" وہ موبائل سیم سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کجاحت سے بولی۔

"یہ لو کرو بات۔" آخر سیم نے اسے سنتے ہوئے موبائل دے دیا۔ اس دوران موبائل مسلسل بچتا رہا تھا کہ اسے چھیننے کے باوجود سیم نے کل ریسیو نہیں کی تھی۔ موبائل ہاتھ میں آتے ہی اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

"ہیلو! اباں سکندر۔" سیم شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بالکل برابر میں اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔

"میں نے سوچا، نہیں بتاؤں، ہم تمہارے گھر کے لیے نکلے والے ہیں۔ میں اسو جان کا انتظار کر رہا ہوں۔ جیسے ہی وہ آئیں گی، ہم تمہارے گھر کے لیے نکل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سیم کی موجودگی کی وجہ سے سنبھل کر بولی۔ سیم اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی فون پر سکندر کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے چھپنے کے لیے زچ کرنے والے انداز میں دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔

"اور کچھ بھی نہیں کہو گی؟" فون کر رہا۔

"کی؟"

"کچھ بھی۔" "آئی لوو" ہی کہہ دو۔ مجھے اچھا لگے گا۔"

سیم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنا تھکے ہوئے آواز گھونٹ کر بری طرح فون میں دے دی تھی۔ وہ سیم کو گھورتے ہوئے اسے دھکا دے کر اس کے پاس سے اٹھی۔ بیڈ سے کچھ دور آگئی اور فون پر بہت آہستہ سے بولی۔

"آئی لوو! بہت بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے۔"

وہ سیم سے خاصی دور فوراً تنگ ٹیبل کے پاس کھڑی تھی۔ قصداً اس نے اپنا رخ بھی سیم کی طرف سے موڑ لیا تھا۔ اس کی گواہ سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں

تھی۔

"میرے لیے پیٹنگ اور روپا چھوڑ سکتی ہو؟"

وہ جیسے اس وقت فارغ بھی تھا اور اچھے موڈ میں بھی۔

"میں تمہارے لیے، اب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔"

"پھر تم پیٹنگ، روپا اور کچھ بھی بھی مت چھوڑنا۔ اب کی بار نہیں فائونٹین کے پاس ہٹا کر میری پیٹنگ بنانا۔" وہ بے اختیار کھٹکھٹا کر رہی۔

"ٹھیک ہے سینور سکندر!" وہ سکندر سے بات کرتے ہوئے سیم کو بالکل بھول گئی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ وہیں گھومی اور اس کی سیم پر نظر پڑی تو اسے سیم کے چہرے پر عجیب تا قیاس قسم کا اثر نظر آیا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی آنکھیں؟

وہ سیم کی آنکھوں کے تاثر کو کوئی ہم نہ دے سکی۔ پتا نہیں، سیم کی آنکھوں کا تاثر ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت بہت غصے میں تھی۔ وہ بالکل بھی خوش نہیں تھی۔

"کیا ہوا سیم؟" تعجب سے بولتی وہ اس کے پاس آ گئی۔

"ہو گیا تمہارا اظہار محبت؟" سیم نے فوراً ہی اپنا موڈ تبدیل کیا اور فون کر پوچھا۔

"ہاں! اور تم کتنی بد تمیز ہو۔ مجھے بات نہیں کرنے دے رہی تھیں۔" سیم کو متاؤ کچھ کہہ بھی نہ سکی تھی۔

سیم کی نگاہوں کا وہ پل بھر کا عجیب سا تاثر فوراً ہی اس نے سر جھٹک کر ذہن سے نکال دیا تھا۔

"اور کیا فرما رہے تھے مسٹر سکندر؟" سیم کا انداز اب پھر اسے چھیننے والا تھا۔

"وہ لوگ نکلنے والے ہیں تمہاری دیر میں۔"

"پھر تم تیار ہو جاؤ جلدی سے۔" وہ سر ہلاتی فوراً بیڈ سے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

آمنہ میزائے گھر جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔

واپس آئے گا۔“

زین کل ان کے چوکاہ پر اور دل دہلا دینے والے انکشافات سننے کے بعد سے گھر سے غائب تھا۔ اس کا موبائل بھی ہند تھا۔ انہوں نے آمنہ اور نویرہ کی نسلی کے لیے ان دونوں کو کل یہ کہہ دیا تھا کہ کسی کیس کے سلسلے میں زین کو ایمر جسی میں لاہور جانا پڑ گیا ہے۔ مصروفیت بھی زیادہ ہے اور کیس کی نوعیت بھی حساس ہے، اس لیے اس نے سیل آف کر رکھا ہے۔ زین جہاں کیس بھی تھا، فریٹ سے تھا۔ اتنا ان کے دل کو یقین تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور خود کو کوئی نقصان نہ اس لیے نہیں پہنچا سکتا تھا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کو ایک مرتبہ پھر اولاد کا غم نہیں دیتا تھا۔

زین کی تکلیف کا انہیں اندازہ تھا۔ وہ دس وقت کس کربس، کس احساسِ مذمت اور احساسِ گناہ سے گزر رہا تھا، وہ اندازہ کر سکتے تھے۔ کئی سال انہوں نے اسے اس احساسِ گناہ سے بچانے کے لیے بیج نہیں بتایا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ زین کو سچائی بتا چلے۔ اپنی بھی نور سکندر کی بھی۔ زین کو احساسِ گناہ میں مبتلا کرنا ان کی منشا نہ تھی، مگر سکندر کی سب گناہی کسی نور طرح زدہ جہاں نہیں سکتے تھے سوائے اس کے کہ زین کو ام مریہم کی ساری حقیقت بتاویں۔

وہ جانتے تھے نویرہ، زین کے کل سے اب تک گھر نہ آنے سے پریشان ہے۔ آمنہ کا دل بھی بے چین تھا۔ انہوں نے سوچا تھا آمنہ لیزا کے گھر جانے کے لیے نکل جائیں، پھر وہ زین کو تلاش کریں گے۔ تمام سلمان گاڑی میں رکھوایا جا چکا تھا۔ وہ پورچ میں آمنہ کے ساتھ خود چل کر آئے تھے۔ انہوں نے اطمینان کے لیے ایک بار پھر گاڑی میں برکھی تمام اشیاء کا جائزہ لیا تھا۔ کہیں کوئی نوکرا، کوئی تھیلی گھر پر نہ رہ گیا ہو۔ اسی وقت پورچ میں زین کی گاڑی آ کر رکی۔ انہوں نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ بار شکر تھا، زین بخیریت گھر واپس آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑا ہوا تھا۔ اس کے

پہلے انہیں سکندر کے ہوٹل جانا تھا۔ وہاں سے پھر ان دونوں کو ساتھ لیزا کے گھر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شہر بار خان نے بہت جوش و خروش سے لیزا کے گھر جانے کے لیے آمنہ کی تیاری کر دالی تھی۔ تاج اپنی ہونے والی بہو کے گھر بھجوانے کے لیے خریدی گئی تمام چیزیں ہیں ان کی اور آمنہ کی مشترکہ پسند اور مرضی شامل تھی۔

وہ خود آمنہ کے ساتھ پہلے ایک بوتھ تک نور پھر چیلور کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اور آمنہ نے ابھی پسند کے ساتھ لیزا کے لیے ممکن کا جوڑا اور انگوٹھی خریدی تھی۔ شہر بار خان نے پہلوں اور مٹھائیوں کے نوکرے خود اپنے نگرانی میں تیار کروائے تھے۔ شہر کی بہترین وکان سے لیزا کے لیے پھولوں کا زور منگوایا تھا۔ بہت سارے بارچول، ٹنگن اور مہرے اضافی بھی تھے۔ یوں جیسے انہوں نے اپنی ہونے والی بہو کے گھر کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ وہ آج ہر چیز بہترین اور شان دار چاہتے تھے۔ وہ سکندر سے جو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، تم اذکم ان کی بھجوائی چیزوں سے چھلکتی محبت ہی کہہ جائے۔ انہوں نے آمنہ کو تاکید کی تھی کہ وہ لیزا کے گھر والوں کو کل یا پرسوں۔ کن کے گھر کھانے کی دعوت دے کر آئیں۔

وہ لوگ آتے ہیں یا نہیں، سکندر ان لوگوں کو آمنہ کی دعوت قبول کرنے دیتا ہے یا نہیں، مگر وہ لیزا کے گھر والوں کو پھر بھی اپنے گھر پر عمو کرنا چاہتے تھے۔ سکندر انہیں اس بات کی کبھی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا، ورنہ آج لیزا کے والد سے اس کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگنے وہ خود جاتے۔ آمنہ تیار تھیں۔ وہ بہت خوب صورت اور بہت خوش بھی لگ رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے اب تمہیں نکل جانا چاہیے۔“ گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے انہوں نے آمنہ سے کہا۔

”زین ابھی تک گھر نہیں آیا شہر بار۔“ آمنہ نے قدرے تشویش سے کہا۔

”اس کا فون آگیا تھا آمنہ! وہ شاید شام تک گھر

”لیز! آپ کی۔۔۔“ آمنہ جیسے شدید حیرت کے عالم میں تھیں۔ کچھ کہتے کہتے رگ گئیں۔
 ”لیز! میری چھوٹی بیٹی ہے۔“ محمود خالد جیسے، بشکل بول سکے تھے۔ وہ ان دونوں کے چروں کو قہقہے سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ کوئی عجیب و غریب ہی صورت حال تھی جیسے دونوں جس بھی حوالے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے، کم از کم یہاں اس جگہ اس حیثیت میں ایک دوسرے سے ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہ رکھتے تھے۔

”جیسے ان کا ڈرائیور رہا گا بھگا تو کمرے لے جا لے جا کر اندر دیکھ رہا تھا اور یہاں یہ چاروں اسی طرح کھڑے تھے۔ محمود خالد جیسے کسی ایسی پریشانی میں آئے تھے کہ انہیں مسماؤں کو اندر لے جا کر بٹھانا بھی بھول گیا تھا۔ عائشہ نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس تکلیف و دلور عجیب و غریب خاموشی کو توڑا۔

”آپ لوگ اندر چل کر تو بیٹھیں۔“ عائشہ مسکراتے ہوئے، مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

”ہاں ہاں لیز! آپ لوگ اندر چلیں۔“ محمود خالد جیسے دقت مسکرائے تھے۔

وہ اپنی ماں اور لیزا کے بیاہ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ محمود خالد اور عائشہ کی موجودگی میں وہ آمنہ سے کچھ پوچھ بھی نہیں پارہا تھا مگر اندر اندر اس کا دل ہری طرح پریشان تھا۔

اگر محمود خالد اس کی اموجہن یا اس کے پلاکے کوئی پرانے جہانے والے تھے تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات تھی؟ آخر اس کی اموجہن اس طرح سے پریشان کیوں ہو گئی تھیں؟ یہاں آنے سے پہلے اور یہاں پہنچنے کے بعد جو جوش خودش اس نے ان کے چہرے پر دیکھا تھا وہ محمود خالد کو دیکھتے ہی نیشن ”نکرار“ پریشانی میں کھل بدل گیا تھا؟

وہ جاندار اندر آگئے۔ عائشہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ محمود خالد جیسے اپنی پریشانی چھپانے کو

ڈرائیور اب گاڑی میں سے ایک بڑا سا چاندی کا تھال نکال رہا تھا۔ جس میں پھولوں کا سارا زور بڑی خوب صورتی سے سجا تھا۔ غلاب اور موتیا کے گلن ہار، ٹکڑوں کی بالیاں، انگوٹھی، پھولوں سے بنا ٹیکا اور ان پھولوں کے زوروں کے بالکل درمیان نیلے رنگ کی پتیلیں ڈیا جس کے اندر مگنی کی انگوٹھی تھی۔
 ”پہلے یہ تھال اندر لے جا کر احتیاط سے رکھو۔ پھر یہ نوکرے اندر پہنچانا۔“ وہ قہقہہ ”تو سے نظر انداز کر کے ڈرائیور سے مخاطب تھیں۔

ڈرائیور نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے لا بڑے بڑے ڈبے بھی نکالے۔ ان دونوں میں لیزا کے لیے خوب صورت لمبومات تھے۔

”آپ مجھ سے کد دیتیں۔ جو آپ لانا چاہ رہی تھیں، میں خرید کر لے آتا۔“ وہ بے تحاشا الجھن اور غصہ محسوس کر رہا تھا۔

”یہ سب چیزیں میں اپنی ہوس کے لیے لائی ہوں۔ تمہارے لیے کچھ لائی تو تم اعتراض کرتے۔“

انہوں نے اختلاف کرنا اپنی ناراضی ظاہر کرنا، ان سے مزید بحث کرنا چاہتا تھا، مگر محمود خالد اور عائشہ کو دیکھ کر اسے چپ ہونا پڑا۔ بہت گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے محمود خالد اور عائشہ اس کے نور آمنہ کے پاس آکر کھڑے تھے۔

”السلام علیکم۔“ محمود خالد نے آمنہ کو سلام کیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے چروں پر ایسا تاثر آیا تھا جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چند سیکنڈ ان دونوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے پہچاننے میں لگائے تھے۔
 ”محمود صاحب آپ؟“ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنی اموجہن کی حیرت میں ڈوبی آواز سنی۔ کیا اس کی اموجہن لیزا کے پلاکے سے جانتی تھیں؟

”مسز شہزادہ؟“ محمود خالد کے منہ سے بھی حیرت زدہ سے انداز میں نکلا تھا۔ صرف سکندر ہی نہیں، عائشہ بھی آمنہ اور محمود خالد کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

زبردستی مسکرا رہے تھے۔
 "آپ لوگ پاکستان کب آئے؟"

"کافی عرصہ ہو گیا۔ شہرہ کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی ہم واپس آ گئے تھے۔" آمنہ سنجیدگی سے بولیں۔ وہ خاموشی سے آمنہ اور محمود خالد کو دیکھ رہا تھا۔

"مسکندر آپ کا بڑا بیٹا ہے؟" محمود خالد کی آنکھوں میں اسے اپنی امہ جان سے بھی زیادہ پریشانی نظر آرہی تھی۔ وہ کیوں پریشان تھے آخر؟ صرف وہی نہیں، عائشہ بھی آمنہ اور محمود خالد کے مدبے اور انداز پر حیران سی بنی تھیں۔

"جی، ازیں سے تقریباً ایک سال بڑا ہے۔"
 تو کیا وہ زمین کو بھی جانتے تھے؟ وہ بے حد حیران تھا۔ مگر موقع اور صورت حال ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے کچھ پوچھ پاتا۔

"ازیں بھی پاکستان ہی میں ہے؟" محمود خالد نے قدرے تنگ کر پوچھا۔

"جی۔" آمنہ آہستگی سے بولیں۔ پھر جیسے کسی ایسی بات کی وضاحت کرنے لگیں جو یہاں پر ان سے کسی نے بھی پوچھی نہیں تھی۔

"شادی ہوئی ہے زمین کی۔ ایک بیٹا ہے اس کا۔"
 "اچھا! انشاء اللہ۔" یہ پسیلیوں کی طرح انہی باتیں اسے ہری طرح الجھا رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ وہ مزید الجھتاؤر اننگ روم میں ایک بینڈ سم اور باوقار سا مرد داخل ہوا۔ اس نے بہت گرم خوشی سے سب کو سلام کیا۔

"السلام علیکم۔" محمود خالد اور عائشہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"وعلیکم السلام۔" آدھا شتم۔ "محمود خالد نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ فوراً "آمنہ کو بتانے لگے۔

"یہ ہاشم اسد ہیں۔ میرے داماد۔"
 تو یہ لیزا کا بہنوئی تھا۔ سم کا شوہر۔ اس نے ہاشم کو گرم خوشی سے اپنی طرف پڑھنے دیکھا تو خوش اخلاقی مسکرا کر فوراً "صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ ہاشم گرم

خوشی سے اس سے ہاتھ ملایا تھا اس نے بھی جواباً خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کا عازبانہ تعارف تو انکل نے کرا دیا تھا سکندر!" ہاشم مسکرا کر بولا اس کے برابر ہی میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اسلام آباد سے کب آئے ہاشم؟" عائشہ نے اس سے مسکرا کر پوچھا۔

"بس ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے آنٹی۔ ویسے تو مجھے آفس جانا تھا، لیکن میں نے سوچا آج لیزا کا کارنشہ ملے ہو رہا ہے، مجھے یہاں آ جانا چاہیے۔ مجھے یہاں دیکھ کر انکل بھی خوش ہو جائیں گے اور میری بیگم بھی وہ ہنس کر بولا۔

"جانتا ہوں ہے بیگم صاحبہ کو میں یہاں آنے والا ہوں۔ حیران رہ جائے گی مجھے دیکھ کر۔" عائشہ اور ہاشم مسکرا رہے تھے۔ محمود خالد اور آمنہ اس طرح چپ سے تھے جیسے اندر ہی اندر کوئی پریشانی لاحق ہو۔ وہ دونوں نگاہ اس پریشانی کا اظہار نہیں کر رہے تھے، مگر ان کی آنکھوں سے پریشانی چھلک رہی تھی۔

"محمود صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ پھول اور رنگ میں لیزا کو پہنانا چاہتی ہوں۔"

آمنہ نے محمود خالد کو مخاطب کیا۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھیں۔ ہاشم مسکراتا ہوا اس گفتگو پر دھیان دے رہا تھا۔ سب کی نظریں سامنے رکھے چاندی کے تھال پر تھیں۔

"کلوٹم اب آپ کی ہی امانت ہے مسز شہرہ! جو آپ کی خوشی ہے وہی میری بھی خوشی ہے۔" محمود خالد جواباً "ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کلوٹم" پر آمنہ حیران ہوئی تھیں۔ وہ محمود خالد سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ جانتا تھا وہ اسے لیزا نہیں، کلوٹم کہتے ہیں۔ آمنہ کی حیرت دیکھ کر عائشہ نے جلدی سے وضاحت کی۔

"محمود عزیز! کو کلوٹم کہتے ہیں۔"

"اچھا! اچھا۔" آمنہ نے جیسے زبردستی مسکرائے کی کوشش کی۔ جبراً مسکرائے کی مسلسل کوشش صرف

وہی نہیں، محمود خالد بھی کرتے نظر آ رہے تھے۔

"میں لیزا کو بلاتی ہوں۔" محمود خالد نے عائشہ کو اشارہ کیا تو وہ فوراً صوفے پر سے اٹھیں۔

"میری خواہش ہے، ہم شادی کی تاریخ بھی آج ہی طے کر لیں۔" آمنہ نے محمود خالد سے کہا۔

ماں کے چرے پر اس نے یہ تاثر دیکھا جیسے وہ لیزا کے پیلا سے پوچھ رہی ہوں کہ کیا اسبب شادی ہو سکے گی؟ اس نے لیزا کے پیلا کو دیکھا۔ ان کے چرے پر جیسے ایک خاموش بے بسی تھی۔ جیسے وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اسبب شادی ہو سکے گی یا نہیں۔

آخر معاملہ تھا کیا؟

وہ بری طرح پریشان ہو رہا تھا۔ ہاشم بھی ابھی آیا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکا تھا، عمروہ اس خاموش اور ابھمی ہوئی صورت حال پر حیران پریشان سا تھا۔

اسی وقت عائشہ ڈرائنگ روم میں واپس آئیں ان کے پیچھے پیچھے لیزا تھیں۔ لیزا کو دیکھتے ہی وہ جیسے ساری کوفت بھولنے لگا۔ اسے لور لیزا کو ایک ہونے سے کون روک سکتا ہے؟ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ خوب صورت لباس پہنے اور سر سے دھنالیے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"السلام علیکم امو جان!" لیزا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ سب کی موجودگی کی وجہ سے وہ اسے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی نہیں تھی۔ وہ اسے دیکھنے جا رہا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا!" آمنہ کا انداز محبت سے بھرپور تھا۔ وہ جانتا تھا بظاہر اس کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود بھی لیزا اس کی نگاہوں کی پسندیدگی اور تعریف کو پوری طرح محسوس کر رہی تھیں۔ لیزا کے پیچھے پیچھے اس کی بہن ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا۔ اور سلام کرتے ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گئی تھی۔ وہ لوگ بری طرح چونکے۔

ام مریم اور سکندر۔ آمنہ کے چرے پر عجیب سی پریشانی پھیلی تھی۔ محمود خالد بھی متحیر سے نظر آئے

تھے۔

"تم؟" مریم نے اسے شدید حیرت کے عالم میں دیکھتے ہوئے "تم؟" کہا تھا۔

وہ اس ناگن کو بارہ سالوں میں کیا بارہ صدیوں بعد بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ یکدم ہی سخت غصے میں صوفے پر سے اٹھا۔ اسے غصے میں صوفے سے اٹھتا دیکھ کر آمنہ بھی بے اختیار صوفے پر سے اٹھیں۔

"سکندر!" انہوں نے اسے گواہی دی۔ مگر اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ بارہ سال پہلے کی 13 دسمبر کی اسی شام میں پہنچ گیا تھا، جب اس سے اس کا سب کچھ اس ناگن نے پھین لیا تھا۔ وہ بھی اسے نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے وہ اپنے برابر میں کھڑی لیزا سے مخاطب ہوئی۔

"واہ لیزا! واہ! ساری دنیا میں تمہیں شادی کرنے کے لیے ملا تو کون؟ سکندر شہیار؟" محمود خالد کے چرے پر تناؤ تھا۔ آمنہ کے چرے پر بھی پریشانی تھی جبکہ عائشہ، ہاشم اور لیزا دم بخود تھے جیسے آنا "فانا" ماحول میں یہ تبدیلی ان میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

"مریم! اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ سکندر اس گھر کا ہونے والا دارا ہے۔"

محمود خالد نے قہقہے میں انداز میں مریم سے کہا۔ وہ بھی صوفے پر سے اٹھ گئے تھے۔ اب وہاں صرف ہاشم اور عائشہ ہی تھے جو ہنوز بیٹھے ہوئے تھے بے حد حیرانی کے عالم میں۔ لیزا سکتے کی سی حالت میں اسے اور مریم کو دیکھنے جا رہی تھی۔

"ایلا! آپ سے زیادہ اعلیٰ ظرف بھی دنیا میں شاید ہی کوئی ہو گا۔ جس شخص نے آپ کی ایک بیٹی کی زندگی برباد کرنے کی کوشش کی، آپ اسی کے ہاتھ میں اپنی دوسری بیٹی کا ہاتھ دے رہے ہیں؟"

وہ منہ پھینکے، جیسے اپنے اشتعال اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس سکندر کے خلاف؟ سکندر اگر زین کا بھائی ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ زین

کے ساتھ اپنی منگنی تم نے خود توڑی تھی۔“

محمود خالد نے مریم سے غصے سے کہا۔

”کیوں توڑی تھی وہ وجہ بھول گئے آپ؟“ مریم اسے نفرت سے دیکھتی باپ سے بولی۔

”لیزا! یہ سکندر شہزادہ زین کا بڑا بھائی ہے۔ زین جس سے میری امریکا میں منگنی ہوئی تھی۔ ہمیں یاد ہے میں نے منگنی توڑ کر امریکا سے واپس آگئی تھی صرف اور صرف اس کی وجہ سے۔ اس نے میرا رپ کرنے کی کوشش کی تھی اپنے گھر پر۔“

”مریم۔“ محمود خالد بہت زور سے چلائے۔

”آپ کو میرا یقین نہیں ہے لیا! تو پوچھیں اس کی اموجان سے۔ یہ معنی شاید ہیں اس وقت کی۔ انہوں نے ہی اپنی جگہ سے میرے جسم کو ڈھانکا تھا۔ اسے اس گھناؤنی حرکت کے بعد اس کے پیانے لپٹے گھر سے نکال تک دیا تھا۔ پوچھیں اس کی اموجان سے۔ پوچھیں ان سے۔“

مریم اپنے باپ سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلائی تھی۔ وہ سکندر کو یہاں دیکھ کر اس طرح اشتعال میں آئی تھی کہ اسے اپنے شوہر کی یہاں موجودگی کی بھی پروا نہ رہی تھی۔

”مریم! بیٹا تم۔ خدا کے لیے اب یہ باتیں مت کرو۔ ماضی میں جو ہوا تھا اسے بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتی ماضی کی تلخیاں سکندر اور لیزا کی زندگی کی خوشیوں کو برباد کریں۔“

اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہاں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر شرمندگی تھی، غم تھا، خوف تھا۔ وہ جیسے اس بات کو ختم کرنا چاہتی تھیں مگر ان کے چہرے پر کچھ شرمندگی یہ بتا رہی تھی کہ مریم جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سب حرفِ بہ حرفِ بچ ہے۔ وہ جو کچھ لکھوں گے اسے اپنی جگہ سناکت ہو گیا تھا، نیکدہی اس کے جسم میں حرکت پید ہوئی۔ آمنہ کے مریم سے مزید کسی بھی انتہا پر جلتے پہلے وہ اس کے مقابل جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر ایک بھر پور ٹھپڑ مریم کے منہ پر مارا۔

”سکندر! خدا کے لیے یہ تم کی کر رہے ہو بیٹا۔“

مریم نے ٹھپڑ لگنے کے بعد خود کو گرنے سے بچشکل بچایا تھا۔ اس کے کانوں میں اپنی ماں کی ٹھپرائی ہوئی آواز ضرور آئی تھی، عمر وہ بچھے نہیں رہا۔ وہ اسی طرح ام مریم کے عین مقابل کھڑا تھا، عائشہ ہاشم لیزا سب کے سب اپنی جگہوں پر سناکت تھے۔ یہ نفرت اور حقارت سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ٹھپڑ کے بعد مریم کا ہاتھ ابھی تک اس کے گلے پر تھا۔ یوں جیسے وہ اس ٹھپڑ کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ اتنے سارے لوگوں کے سچ ٹھپڑ لگنے پر وہ غصے اور نفرت سے پاگل سی ہو رہی تھی۔

”یو ہاسٹو۔“ وہ غصے سے چلائی۔ وہ مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اس نے اسے بولنے نہیں دیا۔

”مزید ایک لفظ بھی تم نے کہا تو میں یہ بھول جاؤں گا کہ یہاں تمہارا شوہر اور والد موجود ہیں۔ چاروں کیا ان لوگوں کو تمہاری سچائی؟“

اس کی آنکھوں میں حقیقتاً ”خون اتر آیا تھا۔ یہ ناگن کسی آسب“ کسی بد دعا کی طرح اس کے پیچھے تھی۔ اس کی زندگی کی ہر خوشی کے ختم ہونے کی وجہ کل بھی یہی تھی اور آج بھی یہی۔ مریم چیخ و تاب کھاتی کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے لگی تھی۔ مگر اس سے پہلے وہ بولا تھا۔ اس بار اس کے مخاطب محمود خالد تھے۔ ڈرانگ روم میں کھڑے تمام لوگ جیسے سکتے کے عالم میں تھے۔ کسی ایک کے لبوں سے ایک لفظ تک نہیں نکل رہا تھا۔

”آپ کی بیٹی درست کہہ رہی ہے محمود صاحب! آج سے بارہ سال قبل واقعی ایک حادثہ ہوا تھا ہمارے گھر میں۔ بارہ سال پہلے میں نے اسے جو جواب دیا تھا، وہی جواب آج بھی دے کر جا رہا ہوں۔ تب بھی میں نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا تھا آج بھی اس کے منہ پر ٹھپڑ مار کر جا رہا ہوں۔“

محمود خالد کی طرف زچہ کر پر سکون سے لہجے میں بولنے کے بعد اس نے ایک نفرت بھری نگاہ مریم پر ڈالی اور پھر فوراً ”ہی وہ تیزی سے گھوما۔ وہ بڑی تیز رفتاری

ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر سے باہر جا رہا تھا۔ عائشہ حیرت اور دکھ میں جھکا کھڑی تھالی میں بچے پھولوں کی منگنی کی انگوٹھی اور منگنی کے نوکریوں کو دیکھ رہی تھیں۔



آمنہ گاڑی میں بیٹھی گھر واپس جا رہی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے متواتر بہہ رہے تھے۔ ان کا دل جیسے شدت غم سے پھٹ سا رہا تھا۔

کیوں آخر کیوں؟ آخر کیوں زندگی ان کے سکندر بنی کی آغوش کیے جاتی ہے؟ ساری دنیا میں لیرا کی بہن کسی کو ہونا تھا تو ام مریم کو؟ ساری دنیا میں لیرا کا باپ کسی کو ہونا تھا تو محمود خالد کو؟ بارہ سال پہلے کی وہ شام کیا ان کے سکندر کی زندگی سے نکل نہیں سکتی؟ سب کو معافی مل جاتی ہے۔

ان کے بیٹے کو کیوں نہیں؟ کیوں زندگی بار بار اسی کو آزمائے جا رہی ہے؟

کیا یہ سب جاننے کے بعد اب لیرا سکندر سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوگی؟ کیا محمود خالد سکندر کے ہاتھ میں لیرا کا ہاتھ دیں گے؟

اس سے تو کہیں اچھا تھا وہ سکندر کو لیرا کے ساتھ رہ پایا اگلی ہی میں شادی کر لے دیتیں۔ میاں پر بٹاتی ہی نہیں۔ ایک بار شادی ہو گئی ہوئی تو شاید لیرا اور محمود خالد اپنے دونوں میں چپکے لے آتے مگر اب کیا ہوگا؟

”یا اللہ! میرے بیٹے کی زندگی میں خوشیاں کیوں نہیں آتیں؟ سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میرے سکندر کو کیوں نہیں؟“

وہ بے آواز آنسو بہاتے ہوئے اللہ سے شکوے کر رہی تھیں۔



وہ لاؤنچ میں بیٹھے تھے ان کے ارد گرد شادی کارڈز کے کئی طرح کے نمونے رکھے ہوئے تھے ان میں

سے مضبوط قدموں سے چلتا ڈرائنگ روم سے جا رہا تھا۔

”سکندر! رک۔ سکندر۔“ آمنہ نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ مگر وہ ان کی بات سننے کے لیے وہاں رکا نہیں اسے اندازہ تھا کہ آمنہ اس کے پیچھے تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکلی ہیں۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ وہ آمدنی مٹھان کی رفتار سے اپنی گاڑی تک آیا۔ وہ فوراً گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اشارت کر دی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دیکھا، آمنہ اپنی کانپتی بھاگی ہوئی پورچ تک آئی تھیں۔ ان کے پیچھے محمود خالد بھی وہاں آئے تھے وہ گاڑی گیٹ سے نکل چکا تھا۔ وہ اس بار کسی کے بھی پکارے پر رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس بار نہیں دے گا۔ وہ اس بار ہرگز نہیں دے گا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔



ڈرائنگ روم میں کھڑے چاروں افراد پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

”واہ لیرا! اولاد دیتی ہوں تمہارے انتخاب کی۔ اپنی بہن کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنے والے کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے چلی ہو؟ تمہاری جیسی بہن شاید ساری دنیا میں اور کوئی نہیں ہوگی۔“

سیم طنز انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔ سیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باقی سب کو جیسے سانپ سونگھا ہوا تھا۔ سیم آنکھوں میں آنسو لیے ڈرائنگ روم سے جا رہی تھی۔ وہ اسے روک نہیں سکی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھی۔

سیم اور سکندر سکندر کو سیم وہ شاک کی ایسی کیفیت میں تھی کہ اسے اپنے اعصاب مفلوج ہوئے لگ رہے تھے۔

سیم کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ ہاشم بھی ایک دم ہی وہاں سے جانے کے لیے مڑا تھا۔ فرق یہ تھا کہ سیم گھر کے اندر گئی تھی۔ ہاشم

ساتھ ان کی دعوت دے۔

زین وہاں آ رہا تھا۔ انہوں نے قلم روک کر نکاحیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں پر سے پڑھنے والی عینک اتار دی۔ زین شکست قدموں سے چل رہا تھا۔ وہ بالکل مدحلال سے انداز میں ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے زین سے شادی کے کارڈز اور دعوت نامے کا مضمون چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں انداز تھا اس وقت زین کی نگاہیں ان کارڈز اور رائٹنگ پیڈ پر تھیں۔

”ظہور کہاں ہے؟“ انہوں نے زین کو پوچھ دیکھا۔

”فعلی کو سلا رہی ہے۔“ وہ آٹھ سی سے بولا۔

”تم نے کھانا نہیں کھلایا؟“

”دل نہیں چاہ رہا۔“

انہوں نے دیکھا۔ زین ان کی طرف عینکی باندھے دیکھے جا رہا تھا میوں جیسے کچھ کھا چاہتا ہو۔ انہوں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا بات ہے کیونکہ خوابات بھی تو اسے جانتے تھے۔

”کسی اور سے نفرت کرتے ہوئے زندگی بڑی سہولت سے گزر جاتی ہے بلیا! مگر خود اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے زندہ کس طرح رہا جاتا ہے؟“

وہ سوت بے بسی سے ان سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ابھی وہ جواباً کچھ بھی نہ کہہ پائے تھے کہ آمنہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اگر آمنہ روتی ہوئی واپس نہ آئیں، وہ تب بھی ان کی اتنی جلدی واپسی پر حیران ہوتے مگر اب جس طرح وہ آنسو بہاتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں اس نے تو ان کے اوسلن خطا کر دیے تھے۔

”آمنہ! کیا ہوا؟“ وہ یکدم ہی پریشان ہو کر صوفے پر سے اٹھے تھے۔

یوں لگ رہا تھا آمنہ کسی بھی لمحہ لوکھڑا کر گر پڑیں گی۔ انہوں نے جلدی سے انہیں سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ زین بھی حیران پریشان سامان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پاس آگیا تھا۔ آمنہ کی سائیس اکڑی ہوئی سی تھیں۔ وہ مسلسل رو رہی

تھی کوئی ایک کارڈ انہوں نے سکندر کی شادی کے کارڈ کے لیے منتخب کرنا تھا۔ آمنہ ساڑھے بار بجے گھر سے نکلی تھیں۔ ان کا انداز تھا ساتھ ساتھ چند کربات چیت کرنے کی تیاری اور پھر شادی کی تازگی وغیرہ طے کرنے میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ آمنہ کی واپسی عین ساڑھے تین بجے سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

یہ وقت گزارنا انہیں کافی مشکل لگ رہا تھا۔ کب آمنہ واپس آئیں گی اور اگر انہیں یہ خوش خبری سنائیں گی کہ وہ تیرا کو مصطفیٰ کی انگوٹھی پہنا آئی ہیں۔ وہ سکندر کی شادی کی تاریخ ٹھہرا آئی ہیں۔ جوش میں ان کی بھوک پیاس بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان کا کچھ کارڈی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سکندر کی شادی کا کارڈ منتخب کرنے اور اس کارڈ کا مضمون تیار کرنے میں آمنہ کی واپسی سے پہلے کا یہ سارا وقت گزارنا چاہتے تھے۔

زین آنے کے بعد سے اپنے کمرے میں فورہ اور علی کے ساتھ تھا۔ شاید اس نے فورہ سے یہ کہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے فورہ کو زین کے لیے کمرے میں چائے لے جاتے دیکھا تھا۔ اپنی موجودہ حالت اور کیفیت کے بارے میں وہ فورہ سے پوچھ کر بھی کیا سکتا تھا؟ فی الحال ان کی یہ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زین سے کیا کہیں؟ جس احساس ندامت میں وہ مبتلا ہوا ہے اس سے اسے کیسے نکالیں؟ انہوں نے زین کی طرف سے قصداً اپنا دھیان ہٹا کر پھر سے شادی کے کارڈ کی طرف دیکھا۔ میز پر سامنے ہی رائٹنگ پیڈ اور قلم بھی انہوں نے رکھا ہوا تھا۔ آمنہ شادی کی تاریخ ٹھہرا کر آجائیں گی تو آج ہی انہوں نے یہ کارڈ چھپنے کے لیے بھجوانے تھے۔ وقت مختصر تھا۔ سکندر کو فورہ کو یہاں زیادہ دن قیام نہیں کرنا۔ شادی جلدی ہی کر لی ہوگی۔ انہوں نے فوراً ہی رائٹنگ پیڈ اور قلم ہاتھ میں لیا تھا۔

”الحمد للہ ہمارا بیٹا سکندر شہسوار جناب محمود خالد کی صاحبزادی لیڈا محمود کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہا ہے۔ ہمارے بیٹے اور بہو کو ان کی نئی زندگی کے اس حسین آغاز پر اپنی دعاؤں سے نواہنے اور ہمارے

تھیں۔

”کیا ہوا آمنہ؟ تم ٹھیک تو ہو؟ سکندر ٹھیک ہے ناں؟“ ایک ہی بل میں نبجانے کتنے برسے برسے خیال ان کے دل میں آگئے تھے۔ اندر ہی اندر ان کا دل بری طرح کر رہا تھا۔ کیا آمنہ یا پھر سکندر کسی حادثے کا شکار ہو گئے تھے؟ آخر وہ اتنی جلدی واپس کیوں آگئی تھیں اور وہ بھی اس حالت میں۔ اس طرح زاد و قطار روٹی ہوئی؟ زین ان کے لیے بھاگ کر پانی لے آیا۔

”پانی پی لیں، اموجان۔“ آمنہ نے اس کے ہاتھ سے پانی کے دو ٹھونٹ لیے تھے۔ زین ان کے شانے کے گرد ہاتھ دکھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہو گئی اموجان؟“ اس نے رسانیات سے ان سے پوچھا۔ صوفے پر آمنہ کے ایک طرف زین بیٹھا تھا اور دوسری طرف وہ۔ آمنہ نے زین کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ شرار خان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”خوشیوں پر میرے بیٹے کا حق کیوں نہیں ہے شرار؟ زندگی کا دامن صرف میرے سکندر ہی کے لیے کیوں تنگ پڑ جاتا ہے؟“ وہ روتے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھیں۔

سکندر؟ کیا پھر کچھ برا کچھ غلط ہو گیا تھا ان کے بیٹے کی زندگی میں؟ ان کا دل اندر ہی اندر ڈوبا تھا۔ خوف اور اندیشوں کے سبب وہ آمنہ سے کوئی سوال تک نہ کر سکے۔ آمنہ روتے ہوئے خود ہی بولی تھیں۔

”آپ کو کیا ہے لیزا کی بہن کون ہے؟“

”کون؟“ انہوں نے پریشانی سے آمنہ کو دیکھا۔

”ام مریم۔ ام مریم لیزا کی سگی بہن ہے۔“

صرف وہی نہیں، زین بھی بہت بری طرح چونکا تھا۔

”ام مریم لیزا کی بڑی بہن ہے۔ وہ اس کی سگی بہن ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولیں۔

”بارہ سال پہلے جو ہوا تھا، آج مریم نے سب کے سامنے اس واقعہ کو پھر دہرا ڈالا۔ سب برائے زخم اس نے اوجھڑا لے۔ ماضی کی اس راکھ کو پھر آگ لگا کر اس

نے ایک نئی قیامت جپا کر دی۔“

زین دم بخودوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اور شرار خان جیسے آمنہ کی زندگی میں آئے ہوئے تھے۔ خاموش، مریہ لب وہ آمنہ کی گریہ زاری سن رہے تھے۔ لاؤنج میں موت کا سنا سنا تھا۔ سوائے آمنہ کی سسکیوں کے وہاں دوسری کوئی آواز نہ تھی۔

”برے سے برے مجرم کو قتل تک کے مجرم کو جب وہ سزا کاٹ لیتا ہے تو معافی مل جاتی ہے۔ میرے بیٹے کی سزا کب ختم ہوگی؟ عمر قید تو وہ کاٹ آیا ہے پھر اب یہ لوگ اسے معاف کیوں نہیں کر دیتے؟ اللہ معاف کر دیتا ہے پر ہم انسان سزا کاٹ چکے شخص کو کبھی بار بار کیوں اس کی غلطی یاد دلاتے ہیں؟ کیا میرے سکندر نے بارہ سال کا بن باس کاٹ نہیں لیا؟ اب بھی اسے معافی کیوں نہیں مل رہی؟“

”کس بات کی معافی اموجان؟“ زین سخت غصے میں بولا۔ زاد و قطار روٹی ہوئی آمنہ نے زین کو تعجب سے دیکھا، جیسے اس کی بات سمجھ نہ سکی ہوں۔ سوچ چاپ زین کو دیکھ رہی تھیں۔ لیزا ام مریم کی بہن اور محمود خالد کی چھوٹی بہن ہے۔ یہ سچائی جانتے ہی وہ جیسے بالکل ہی ہمت ہارنے لگی تھیں۔

”کہا مجرم کی معافی مل جاتی چاہیے سکندر کو؟ وہ جو اس نے بھی کیا ہی نہیں تھا؟ جو عمر قید ہوئے باس اس نے کاٹا ہے، وہ میری وجہ سے۔ میں مجرم ہوں، بیٹے بھائی کا۔ اموجان! میں گناہ گار ہوں، اپنے بھائی کا بھی اور آپ کا بھی۔ لیا سے پوچھیں! یہ کئی سالوں سے یہ سچائی جانتے ہیں کہ سکندر کو جس جرم کی پاداش میں گھر بدری نصیب ہوئی تھی، وہ اس سے کبھی سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ اس بد کردار لڑکی کو میں نے کرایا تھا، دم لوگوں کی زندگیوں میں۔ سزا اگر کسی کو ملنی چاہیے تو مجھے۔

سنگار کیا جانا چاہیے تو مجھے، اپنے بھائی کی زندگی اجاڑ دی میں نے۔ اس کے جسم کو نہیں اس کی روح کو مار ڈالا۔ اس بد کردار لڑکی کا دکھایا جھوٹ مجھے سچ نظر آیا تھا۔ اپنے بھائی کی جی جی کراچی جاتی تو از میری سماعتوں تک نہیں پہنچی تھی۔“

وہ تنہی سے بولتے ہوئے تقدیر سے شاکہ تھے۔ اب جبکہ وہ سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوششیں کر رہے تھے تب سب کچھ پہلے سے بھی زیادہ غلط ہو گیا تھا۔

”آپ اتنی آسانی سے ہار مار رہے ہیں بیٹا؟“ زین نے انہوں سے بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ جواباً فکرت خوردہ سے انداز میں چپ رہے۔

”مگر میں ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ماضی کو بدلنے سے میں قاصر ہوں۔ مگر اپنے بھائی کے حال میں اور اس کے مستقبل پر اب کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اپنے بھائی کی اور ہمارے گھر کی خوشیوں کو تباہ کرنے والی اس ٹانگ میں سرچکیں دوں گا۔ آپ محمود انکل کو فون کیجیے یا! انہیں بتائیں کہ سکندر پر لگایا مریم کا ہر الزام جھوٹا ہے۔ بارہ سال پہلے بھی اس نے سکندر پر بہتان لگایا تھا۔ وہ توجہ بھی اس پر بہتان لگا رہی ہے۔“

زین کے مضبوط اور دو ٹوک سے انداز نے ان کے اندر دم توڑتی امید اور آس کو نئے سرے سے جگایا تھا۔ انہیں کوشش کو گہنی چال سے سچائی محمود خالد اور لیزا تک پہنچانے کی۔ وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھے تھے۔ زین ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ انہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ سکندر کو اس کے حصے کی خوشیاں دلوانے کے لیے اس بار انہیں دنیا سے لڑنا پڑ جائے گا۔ انہیں لڑ جانا چاہیے۔ اس بار کوئی ان کے بیٹے کی خوشیوں کے رستے میں آئے تو انہیں اسے جان سے مار ڈالنا چاہیے۔ ان کے چیتے جی اب کسی میں یہ جرات نہیں ہونی چاہیے کہ سکندر سے اس کی خوشیاں چھین سکے۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتے نئی فون تک آگئے۔

”آمنہ! لیزا کے گھر کا فون نمبر بتاؤ۔“ انہوں نے ریسپور اٹھاتے ہوئے آمنہ سے کہا۔ آمنہ اب رو نہیں رہی تھیں۔ جیسے اتنے سارے حواس گم کر دینے والے اکٹھا شات نے انہیں روٹا ہی بھلا دیا تھا۔

”میرے پاس لیزا کے گھر کا تو نہیں مگر اس کا موبائل نمبر ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”ٹھیک ہے۔ آؤ۔“ آمنہ نے پرس سے اپنا

زین کی آنکھوں میں نئی آہنگی تھی۔ اس کی آواز بولتے بولتے بھرنے لگی تھی۔ اس کے لہجے میں خود اپنے لیے نفرتیں تھیں۔

آمنہ روٹا بھلا کر جیسے شاکہ کی سی حالت میں زین کی باتیں سن رہی تھیں۔

زین کی طرح شرابا خوں کے اندر بھی ایک مرتبہ پھر باوسیاں اور احساسِ مذمت پھیل رہا تھا۔ جس بیٹے کے بچم تھے اس کی زندگی میں توڑی سی خوشیاں لانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے تو پرانے زخم اوجھڑ کر پھر نئے دکھ بھی دے دیے گئے تھے۔ آمنہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”زین! سچ کہہ رہا ہے آمنہ! میں ام مریم کی سچائی گزشتہ کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ تمہارے سامنے بھی یہ اعتراف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جس جرم کی سزا میں میں نے سکندر کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس بدکردار لڑکی کا سکندر پر لگایا ایک بہتان تھا۔“ وہ گلو کیلے لہجے میں بولے۔

”کاش! آپ نے اموجان کو سب کچھ سچ بتا دیا ہوتا یا! تو آج اموجان لیزا کے گھر سے ہوں روٹی ہوئی اور خاموش واپس نہ آتیں۔ وہ اس بیخ لڑکی کو اس کی اوقات یاد دل کر اور اس کے منہ پر تھوک کر واپس آتیں۔“

جہاں جملے میں ام مریم کا ذکر آیا وہاں زین بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ سخت ترین اشتعل غور غصے میں آ گیا تھا۔ جیسے اگر ام مریم اس وقت اس کے سامنے ہوتی تو وہ اسے جان سے مار ڈالتا۔

”آمنہ کو اگر سب کچھ پتا ہوتا یہ وہاں پر خاموش نہ رہی ہوتی۔ تب بھی اس سے سکندر کی زندگی میں خوشیاں تو واپس نہیں آ جاتی تھیں زین؟ کیا محمود صاحب اور لیزا سکندر کا اعتبار کرتے؟ ان دونوں کے لیے زیادہ قابل اعتبار تو ان کی بیٹی اور بہن ہی ہوتی نا۔

میرے بیٹے کا مقدر ہی خراب ہے۔ تقدیر کو پھر اس کی آناش مقصود ہے۔ ورنہ اپنی بڑی دنیا میں کوئی بھی اور لڑکی لیزا کی بہن ہو سکتی تھی۔ مگر کوئی تو ام مریم۔“

کی ساعنوں سے نگرانی اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر فوراً ہی محمود خالد نے ”خدا حافظ“ کہہ کر فون بند کر دیا وہ محمود خالد کے لہجے سے کچھ بھی اخذ نہ کر پائے۔ کیا ان کا لہجہ یہ اشارہ دے رہا تھا کہ وہ اب بھی سکندر اور لیزا کے رشتے کے حق میں ہیں؟ ان کا بے پناہ سنجیدہ انداز انہیں کسی بھی طرح کی رائے قائم کرنے سے روک رہا تھا۔



سکندر کے جاتے ہی آمنہ بھی ان کے گھر سے چلی گئی تھیں اور اس کے فوراً بعد ہی ہاٹم بھی چلا گیا تھا۔ ان باتوں کے چلے جانے کے بعد وہ لاؤنچ میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بالکل اکیلے بیٹھے تھے۔ عاتشہ ان کے پاس آئی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر انہوں نے تسلی آمیز انداز میں کچھ کہا بھی تھا شاید ٹھکرہ اتنی الجھی بکھری حالت میں تھے کہ انہیں عاتشہ کی وہاں موجودگی سے وحشت سی ہوئی تھی۔ معذرت خواہانہ انداز میں انہوں نے عاتشہ سے فقط اتنا کہا تھا کہ وہ کچھ دیر بالکل تنہا رہا کرتے ہیں۔

عاتشہ ان کی کیفیت سمجھتے ہوئے بغیر رمانے وہاں سے چلی گئی تھیں۔ اسی طرح سر دونوں ہاتھوں میں تھامے انہیں نہ جانے کتنی دیر گزری تھی، جب وہاں صوفے پر لیزا کا موبائل بجا تھا۔ بے دھیالی میں انہوں نے کال ریسیو کر لی تھی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ یہ کال انہوں نے ریسیو کر لی تھی۔ ورنہ نہ جانے وہ کتنی دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھے رہتے۔ یہ وقت اس بات پر بیٹھ کر انہیں کس نے کالو نہیں تھا کہ سکندر زمین کا بڑا بھائی کیوں ہے نہ اس بات پر انہیں کس نے آج جو کچھ ہوا، وہ عرم نے کیوں کیا تھا؟ یہ وقت کلثوم کی فکر کرنے کا تھا۔ اس کی زندگی کی خوشیوں کو بھانے کا وقت تھا۔ کلثوم تھی کہیں؟ ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ان سب لوگوں کو ان کے گھر سے گھٹے اس کے بعد سے انہوں نے کلثوم کو نہیں دیکھا۔ انہیں یکدم ہی اس کی بے طرح فکر لاحق ہوئی تھی۔ آج جو کچھ ہوا اس نے

موبائل نکالا۔ وہ لیزا کا فون نمبر بول رہی تھیں اور وہ اسے کال مار رہے تھے۔ کال مل گئی تھی۔ وہ دوسری جانب لیزا کی آواز سننے کی توقع کر رہے تھے مگر ان کی کال لیزا نے نہیں، محمود خالد نے ریسیو کی تھی۔ بارہ سال بعد ان کی آواز سنی تھی کیسے بچپان سنسکتے تھے۔

”ہیلو۔۔۔ میں شہیار خاں بول رہا ہوں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے اپنا تعارف کروایا تھا۔

”میں محمود بات کر رہا ہوں شہیار صاحب۔ آپ کیا لیزا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں تھی نہیں اس لیے کال میں نے ریسیو کر لی۔“

انہوں نے محسوس کیا کہ محمود خالد بہت محتاط ہو کر بولے تھے۔ جیسے بولنے سے قبل اپنے ایک ایک لفظ پر غور کیا ہو۔

”نہیں! مجھے آپ سے ہی بات کرنی تھی۔ آپ کے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ اس لیے لیزا کے موبائل پر کال کی۔“

ان کا لہجہ سنجیدہ اور بہت مضبوط تھا۔

”آج جو کچھ ہوا شہیار صاحب! مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔“ محمود خالد آگے نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے مگر وہ ان کی بات مکمل سے بغیر فوراً ”بولے۔“

”میں آپ کی بیٹی ام مریم کے سکندر پر لگائے ہر الزام کی تردید کرتا ہوں۔ میں ام مریم کے متعلق زیادہ کچھ کہہ کر بات بڑھاتا نہیں چاہتا۔ جو کرتی ہے اور جو کچھ کر چکی ہے وہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ آپ سے میری فقط اتنی درخواست ہے کہ آپ لیزا اور سکندر کے رشتے کو اسی طرح برقرار رکھیں۔ کسی کی بھی باتوں میں اگر اس رشتے کو ختم نہ کہہ دیجئے۔ یہ سکندر اور لیزا کی خوشیوں کا سوال ہے۔ خدا کے لیے ان دونوں کو ان کی خوشیوں سے محروم نہ کہہ دیجئے۔“

وہ درخواست کرتے ہوئے واقعی ان کا لہجہ التجا سی ہی ہو گیا تھا۔

”آپ مجھے تمہارا وقت دیجئے شہیار صاحب! ان شاء اللہ سب بہتر ہو گا۔“

محمود خالد کا بے حد سنجیدگی سے دیا گیا یہ جواب ان

ان کی بیٹی پر کیا اثر ڈالا تھا۔ نہ ٹھیک تو تھی نا؟ وہ فوراً مہر لیڑا نامو بائیل ہاتھ میں لیے صوفے پر سے اٹھے۔
وہ لاؤنج سے باہر جا رہے تھے۔ نہ جانے وہ تھی کہاں؟ سب سے پہلے وہ ٹیسے تلاش کرتے اس کے کمرے میں آئے اور وہاں پر وہ انہیں مل بھی گئی تھی۔ مگر وہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ مریم بھی تھی وہاں پر اس کے ساتھ۔ مریم کو لیڑا کے پاس بٹھا دیکھ کر ان کا دل بری طرح پریشان ہوا تھا۔ آج پھر۔۔۔۔۔ زہر بھر دی تھی وہ بڑا سکہ نہن میں۔
وہ کمرے کے اندر آگئے۔ لیڑا اور مریم نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ لیڑا بالکل گم صدم سی بیٹھی تھی جبکہ مریم زور زور قطار رو رہی تھی۔ وہ رونے ہوئے لیڑا سے کہہ رہی تھی۔
"میں سکندر کی منت کرتی رہی کہ میں تمہارے بھائی کی عزت ہوں پر اس پر تو شیطان سوار تھا لیڑا۔ اس نے میرے کپڑے۔۔۔ میں روئی رہی چلا چلا کر دھوکے لیے پکارتی رہی اس سے رحم کی بھیک مانگتی رہی پر وہ اپنے نفس کا بھاری ہوس میں لندھا ہو چکا تھا۔ اس نے میری عزت۔۔۔ پہلی بار پایا کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہونے کے بعد مئی کے فریج خوش ہر نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور دوسری بار سکندر شہیار نے۔ میری خوب صورتی ساری زندگی میری آواز میں بنی رہی۔ آج بھی ایک زندگی کا بندھن جنس پیا کی خاطر نبھا رہی ہوں کہ پاپا کے بزنس فرینڈ بائیں اسد کا دل میری خوب صورتی پر آگیا تھا۔ میری بائیں کے ساتھ شادی کی وجہ سے پاپا مسلسل اس سے بزنس میں فائدے حاصل کرتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ تو جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں لیڑا۔ ہر میں تم پر آج نہیں آنے والی گی۔ میں پاپا سکندر کو تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کرنے دوں گی۔ تم کل ہی کی فلائٹ سے واپس لندن چلی جاؤ۔ چھوڑو سکندر شہیار کو۔۔۔ چھوڑو دیا پاپا کو۔۔۔ سب تمہیں اپنے اپنے مطلب کے لیے مستحق مگر کرتے رہیں گے۔ تم لندن جا کر وہاں پر اپنی مرضی اور پسند سے کسی سے بھی شادی کر لو۔ پاپا کو اپنی

شادی کے یکے یا رے میں جانے کی تمہیں نہ کوئی ضرورت ہے نہ ان سے اجازت لینے کی۔ تمہارا ہونے والا شوہر مسلمان ہو یا نہیں، بس اس کا اچھا انسان ہونا تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے۔ تمہاری اب بالکل بھی پروا مت کرنا۔ آخر کیا کیا ہے انہوں نے تمہاروں کو؟

وہ مریم کی زہرا لکھتی زبان خاموشی سے سن رہے تھے۔ مریم جو پوری طرح لیزا کی طرف متوجہ تھی۔
 بولتے بولتے اسے ایک دم ہی جیسے کسی کی وہاں موجودگی
 کا احساس ہوا تھا۔ پہلے مریم اور پھر لیزا نے انہیں دیکھا
 مریم یک لخت ہی گھبرا کر چپ ہوئی تھی سو شاید اس
 وقت یہاں ان کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔
 "چپ کیوں ہو گئیں مریم؟ آگلو زہر۔ جتنا زہر
 تمہارے اندر ہے آج سب اگلے والے" انہوں نے
 طیش کے عالم میں مریم کو دیکھا۔

"ایسا! وہ میں — میں چاہتی تھی لیزا کو سکندر کی ساری سچائی بتا دوں" تاکہ اسے اپنی غلط چوائس کا احساس ہو سکے۔ مزید بول کر فوراً ہنسی۔

”کیسا رہے گا اگر آج میں بھی اسے ساری سچائی
بتاؤں؟ بہتر رہے گا کہ کلثوم آج اپنی تمام غلطیوں اور
کاؤراک کر لے گی۔“ وہ طنز اور غصے سے بولے۔

میں ہم کی بات انہوں نے مکمل نہیں ہونے دی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے بالکل سامنے آئے اور انہوں نے صحیح کر ایک ٹھنڈے کال برار۔

”یہاں یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ لیزا اٹھ کر فوراً بیڈ سے اٹھی۔

"تم دہیں روکو کلثوم! آج میرے اور اس کے بیچ میں
برسرِ رزیت آگاہ۔"

وہ غصہ کرنے اور چیخنے چلانے والے آدمی نہ تھے۔ مگر آج وہ جلا رہے تھے۔ انہیں اس قدر غصے میں دیکھ کر لڑائی جگہ سہم کر رک گئی۔

”آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا یا؟“ مریم نے بے یقینی اور غصے سے منہ پر ہاتھ رکھے رکھے پوچھا۔ یہی جملہ پر سے اٹھ جاتی۔ لیزا، مریم کے ساتھ گھڑی گھسی نہ وہ ان

دونوں کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ تھپڑ بچھے تمہارے منہ پر بہت پہلے مار دینا چاہیے تھا مگر کاش! میں نے یہ تھپڑ تمہیں اس روز مار دیا ہوتا جب تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ مجھے تمہارے تعلقات کا علم ہوا تھا۔"

وہ یہ تمام الفاظ بولتے ہوئے کچھ عجب اور شرم سے زمین میں گڑے رہے تھے۔ برسوں پہلے جب یہ شرمناک بانیں پتلی تھیں تب بھی اسی طرح وہ شرم اور غیرت سے زمین میں گڑے گئے تھے۔ لیزا ان کے انکشافات پر سناکت تھی، بے یقین تھی اور مریم پھنسر گئے کی ساری تکلیف اور غصہ بھلائے یوں کھڑی تھی جیسے یہ توغ مرکر بھی نہیں کر سکتی تھی کہ باپ کو یہ تمام باتیں معلوم ہوں گی۔

"یہ جھوٹ ہے پاپا یہ سب جھوٹ ہے۔ کسی نے یہ ساری بکواس کی ہے آپ سے میرے مطلق۔ آپ کا دل مجھ سے خراب کروانے کے لیے۔"

مریم بوکھلا کر بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور آنکھوں میں خوف تھا۔

"تمہاری ماں نے مجھے فون پر روتے ہوئے یہ بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا، تم اس کا گھر خراب کرنا چاہتی ہو۔ میں نے اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ تمہارے سوتیلے باپ نے یہ بات بتائی۔ میں نے یقین نہیں کیا تھا مگر جب ان دونوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے میں اس مکان کو لو جھٹ کے پاس پہنچا جس کا پتا تمہاری ماں کو سوتیلے باپ نے بتایا تھا۔ اس نے تمام شہوقوں کے ساتھ اس بات کی تصدیق کی کہ میں پھوٹ پھوٹ کر دیوار تھا۔ میری بیٹی اتنی بدکردار کیسے ہو سکتی تھی؟ آخر کیسے؟ پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک تمہارے اخیوتز کا مجھے پتا چل رہا اور میں اندر ہی اندر شرم اور ندامت سے گڑا ہوا سمجھتا چلا گیا کہ میری بڑی بیٹی جسے میں نے ہمیشہ چھوٹی بیٹی سے زیادہ چاہا تھا۔ اس نے میری صرف شکل لی تھی مگر ذرا انی ماں کا لے لیا تھا۔" بولتے ہوئے ان کی آواز بھرائی تھی۔ شرم غیرت اور دکھ سے جیسے لٹن کا سید پھنسا جا رہا تھا۔ انہیں یکدم

ہی چکر سا آیا۔ خود کو لڑکھڑا کر گرنے سے بچانے کے لیے انہوں نے پاس رکھی کرسی کا سہارا لیا تھا۔

"پاپا۔ لیزا پریشان ہو کر دوڑ کر ان کے پاس آئی۔ ان کے اوسان خطا کر دینے پر اسے ان انکشافات نے لیزا کی حالت بھی غیر کر رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے انہیں تمام گرسار اوسے کر صوفے پر بٹھایا۔ وہ اپنے دل کی پریشانی بھلا کر باپ کے لیے فکر مند ہوئی تھی۔ وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں پاپا؟" انہیں اپنے سینے پر دوا دوسا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کا ہاتھ سینے پر جانا کچھ کر دہ بہت بری طرح پریشان ہوئی تھی۔

"میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں پاپا۔" انہیں تسلی دینے کو وہ بدقت لگا سا مسکرائے تھے۔ رکھ اور کرب سے بھری مسکراہٹ۔



وہ باپ سے دور کھڑی تھی۔ لیزا ان کے برابر میں بیٹھی تھی۔ وہ ان سے دور رہے۔ لیزا ان کے پاس ہے۔ وہ اپنے حواس کھوئے لگی تھی۔ پاپا نے برسوں پہلے اسے خود سے دور کر کے لیزا کو اپنے نزدیک کر لیا تھا۔ اسے مئی کے ساتھ بھیج کر اپنے ساتھ رکھنے کے لیے لیزا کا انتخاب کیا تھا۔

باپ کے ساتھ بیٹھی لیزا پر اس کی نظر پڑی تو اس کے اندر نفرت کا وہی طوفان اٹھا جو چاہتا تھا لیزا باپ کی نظروں سے گر جائے۔ لیزا کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے۔ وہ چودہ سال کی عمر سے اس لڑکی سے نفرت کرتی آئی تھی۔ اس نے ساری زندگی اتنی نفرت اور کسی سے بھی نہیں کی تھی، جتنی لیزا محمود سے کی تھی۔ اپنی زندگی کے چودہ برسوں تک اسے یہ بتایا گیا تھا کہ باپ اسے سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ وہ اسے ساری دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ مگر ماں اور باپ میں طلاق کے وقت اسے اچانک ہی پتا چلا جو کچھ وہ چودہ برسوں تک سمجھتی رہی، وہ غلط تھا۔ لیزا کو اپنے ساتھ

گرزاری تھی کہ لیزا کو پیلا سے دور کروا دے اور پیلا کو لیزا سے بدگمان کر دے۔ ویلا کو لیزا سے بدگمان نہ کبھی نہ کروا پائی تھی۔ ہاں لیزا کو ان سے دور رکھوانے میں وہ بہت کامیاب رہی تھی۔ لیزا کسی مسلمان اور پاکستانی مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے، بہر حال اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ اس شادی کو کسی بھی طرح رکوانا چاہتی تھی۔ اگر لیزا کی شادی یہاں ہوگی تو پیلا تو اس سے بہت خوش ہو جائیں گے۔ ان کی مرضی کے مطابق شخص سے شادی کر کے تو لیزا ان کے قریب ہو جائے گی۔

پتا نہیں کون تھا وہ شخص جس سے لیزا محبت کر رہی تھی۔ اس شخص کی محبت اتنی زور آور تھی کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ لیزا پر اپنا حصار کمزور پڑا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے لیزا کو منع کیا۔ پیار سے، غصے سے، ہر طرح اس نے لیزا کو پاکستان آنے سے روکا۔ کم از کم وہ خود سری دکھا کر، اگلے شادی کر کے پیلا کے دل کو دکھا دے۔ مگر لیزا پاکستان آگئی تھی۔ اس کی کوششیں ناکام جا رہی تھیں، پھر بھی آج وہ ہر سے پہلے تک وہ مایوس نہیں تھی۔ اسے یقین تھا وہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کرنے میں کامیاب ہو جائے گی کہ لیزا کی یہاں شادی نہیں ہو سکے گی۔ وہ آج یہاں اسی امید پر آئی تھی کہ کسی بھی طرح لیزا یا پیلا کا دل ان لوگوں سے خراب کروا دے، جنہیں لیزا شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ شادی کر کے لیزا پیلا سے قریب ہو جائے گی اور ایسا وہ مر کر بھی نہیں ہونے دے گی۔

سکندر شہوار کو لیزا کے ہونے والے شوہر کے روپ میں دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی وہاں موجود ہے، اسے اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ جوان اور وحشت میں جو اس کے منہ میں آیا وہ بولتی چلی گئی تھی۔

آخر ایسا تھا کیا اس عام سی لیزا میں کہ جس کسی کو بھی وہ بچے دل سے چاہتی ہے، وہ اسے ٹھکر کر لیزا کو اپنا لیتا ہے۔ اس کے پیلا بھی لور سکندر شہوار رہی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی بھی شعلے نکل رہے تھے۔ یوں

رہنے کا انتخاب اس کے پیلا نے کیا تھا۔ پیلا نے اسے نہیں لیزا کو چننا تھا اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ وہ اپنی محبت کی بلا شرکت غیرے مانگ تھی تاہم پیلا نے بہت کافور مان اور لاڈ لے ہوئے کا تاج اس کے سر پر سے اندر کر لیزا کے سر پر پہنا دیا تھا۔ اس روز اسے لیزا سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ اس روز اسے اپنی ماں سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔

اس کے اندر ایک آگ لگی تھی برسوں سے جو کبھی کسی طرح ٹھنڈی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنی ماں سے انتقام لینے کے لیے اپنے سوتیلے باپ کو اپنی جانب منتقل کر دیا تھا۔ ماں نے اس سے اس کا گھر اور باپ بچھا تھا۔ اس نے ماں سے اس کا گھر اور شوہر بچھن لیا تھا۔ ماں سے انتقام کی آگ میں جلتی وہ تمام حدود عبور کر گئی تھی۔ اسے اس فیضیہ خیرات سے شادی نہیں لینی تھی۔ اسے تو فقط ماں کا گھر اجازت تھا۔ جب یہ کام کر چکی تو ہاسٹل چلی آئی۔

لیزا اس سے پیار بھی بہت کرتی تھی اور وہ بے خوف بھی بہت تھی۔ وہ ہمیشہ سے اس کے اثر اور حصار میں رہی تھی۔ وہ شروع سے اس کی تابعدار رہی تھی۔ جب تک وہ دونوں ماں باپ کے ساتھ اٹلی میں رہی تھیں، اس نے لیزا کی تابعداری اور سامگی کو کبھی اس کے خلاف استعمال نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ اس کے ہاتھ کے بارے ہی میں سوچا تھا۔ مگر جب محبت کا خزانہ عزیز از جان ہونے کا تاج پیلا نے اس کے سر سے اندر کر لیزا کے سر پر سجایا تب اس نے لیزا کے نقصان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے ماں باپ کی تلخ دیکھ کے اول روز سے لیزا کا دل باپ سے خراب کر دینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے محبت اور پیار کا نام لے لیزا سے ہر وہ کام کر دیا، جس سے پیلا لیزا سے دور ہو جائیں۔ اس سے خفا اور بدگمان ہو جائیں۔

وہ چاہتی تھی کہ پیلا نے لیزا کو خود سے قریب کرنے کی بہت کوششیں کی تھیں، مگر اس کا حصار لیزا پر اتنا مضبوط تھا کہ پیلا لیزا کو کبھی بھی خود سے نزدیک نہیں کیا کرتے تھے۔ اس نے ساری زندگی اسی کوشش میں

لگ رہا تھا اس کا پورا وجود ایک آنکھ کی طرح تھا۔ وہ شدید نفرت سے لیزا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا اس کے باپ کا ہاتھ ابھی بھی ان کے سینے پر تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے۔ لیزا اٹھ کر ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔ وہ انہیں اپنے ہاتھ سے پانی پلا رہی تھی۔ یکدم ہی اس پر جنون سا مودار ہوا۔ وہ لیزا کے سامنے آئی۔ اس نے ہاتھ مار کر لیزا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گرا دیا۔

"ابس کرو تم یہ ڈرامے لیزا! تم باپ سے کتنی محبت کرتی ہو یہ باپ ابھی جانتے ہیں اور میں بھی۔"

پانی سے بھرا گلاس چھٹانے کے ساتھ ساتھ یکدم ہی باپ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔

"پاپا! آپ سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی مکاری کا یقین مت کریں۔ آپ سے محبت صرف اور صرف میں کرتی ہوں۔"

باپ کے پیروں پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے وہ رو پڑی۔ پاپا کو یہ یقین تو نہیں کھانا چاہیے کہ وہ ان کی مومن ہے۔ وہ ان سے بہت پیار کرتی ہے۔

"سیم" اس نے لیزا کی روٹی ہوئی آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ محمود خالد نے اپنے پیروں پیچھے ہٹائے۔ انہوں نے اپنے پیروں پر سے اس کے ہاتھ جھٹک کر ہٹا دیے۔

"پاپا! آپ" اس نے روتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ اسے باپ کی آنکھوں میں ناراضی نظر آئی۔ ان کا ایک ہاتھ ابھی تک ان کے سینے پر تھا۔

"مجھے پتا ہے اس نے کوئی دھرم بھرا ہے آپ کے دل میں میرے خلاف۔ اسی نے آپ کو مجھ سے چھینا تھا۔" وہ بیانی انداز میں چلائی۔ اس نے لیزا کو نفرت سے دیکھا۔

"سیم! خدا کے لیے پاپا کی حالت کا خیال کرو۔ دیکھو پاپا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

اس نے بھائی لیزا کے پیلا سے لندھے لے کر ہاتھ رکھ کر ان کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ روتے ہوئے اس سے

خاموش ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھکا۔

جہنم پاپا کے پاس سے۔ مجھ بہت ابر سارگی سے ڈرامے کر کے تمہارا گھر سے نہیں چھین سکتیں۔"

وہ یکدم ہی جنونی انداز میں اٹھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر پوری قوت سے کھینچ کر لیزا کو پاپا کے پاس سے اٹھا کر لیزا کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ پاپا کی آنکھوں میں اپنے لیے ناراضی اور بے اعتباری دیکھ کر وہ واقعی اپنے حواس کھوئے گئی تھی۔ اس پر جیسے کوئی دھرم بھرا تھا۔

جنونی انداز میں چلا رہی تھی۔ لیزا اس کے ساتھ چھینچھونے سے اٹھ گئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"مریم! خدا کے لیے بس کرو۔ اب بس کرو۔"

تکلیف اور درد میں مبتلا اس کے پاپا کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ان تک جانا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے لیزا وہ ذکر بھران کے پاس چلی گئی۔

"پاپا! اپنا تیل چلیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پکڑ لیزا چلیں۔" لیزا نے روتے ہوئے ان کی منت کی تھی۔

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا! میں ٹھیک ہوں۔ شاید بی بی پانی ہو رہا ہے۔ ابھی ہوائے لوں گا۔"

وہ اس طرح بول رہے تھے جیسے انہیں سانس لینے میں دقت کا سامنا ہو۔ لیزا انہیں فکر سے دیکھ رہی تھی۔ لیزا ان کے پاس چھینچھونے اور وہ ان کے مقابل ان سے بہت دور میلوں اور کوسوں دور۔

"میں ٹھیک ہوں کلثوم! تم میری فکر مت کرو پاپا۔ بس میری ایک نصیحت سن لو بہت غور سے اور اس پر عمل بھی کرو۔"

وہ جیسے اپنے باپ کو نظری نہیں آ رہی تھی۔ انہیں اگر کوئی نظر آ رہا تھا تو لیزا۔

"جی پاپا! لیزا سعادت مندی سے ہوئی۔ اس کی سعادت مندی اس کی آنکھوں میں پھر غیظ و غضب لے آئی تھی۔ اسے پھر نفرت کی انتہاؤں پر لے گئی تھی۔

بیبا خود کو سچ سے دور کر دیا۔ اس نے ساری زندگی گئی۔ یہ تمہاری زندگی برباد کر دے گی۔ یہ ساری زندگی

”کلوٹوم! ہم محسوس نہیں کر رہے ہیں مگر جس روز سے تم نے سکندر سے شادی کا فیصلہ کیا ہے، یہ تمہاری شادی کسی بھی طرح روکوا دینے کی فکر میں جلتا ہے۔ جب سے تم پاکستان آئی ہو۔ میں اس کی شکل دیکھ کر محسوس کر رہا ہوں کہ یہ تمہاری شادی سے خوش نہیں ہے۔ چہرے پر بڑھانا سیکھو کلوٹوم! دلوں میں چھپی نفرتیں جاننا سیکھو۔ یہ بہن نہیں، تمہاری دشمن ہے۔ دور کرو خود کو اس سے کلوٹوم!“

اس کے پایا جیسے بالکل پھٹ پڑے تھے جیسے برسوں کا لاوا باہر نکل آیا تھا۔ ان کے لمبے میں اس کے لیے دکھ بھی تھا، مایوسی بھی تھی اور ناراضی بھی تھی۔ یوں جیسے جو کچھ وہ بول رہے تھے، اسے بولتے ہوئے انہیں بہت تکلیف ہو رہی ہو مگر پھر وہ سب کہہ دینا ضروری لگ رہا ہو، اپنی عزیز از جان لیزا کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اس بار اپنے پایا کو بھی غصے سے دیکھا۔ لیزا کے لیے اس کی آنکھوں میں نفرت تھی اور پایا کے لیے چہرے پر غصہ۔

”بالکل ٹھیک، کہا آپ نے! ہاں میں اس کی دشمن ہوں۔ اس سے نفرت کرتی ہوں۔ اسے میرے اور توجہ دے کر آپ نے اس نفرت اور دشمنی کی بنیاد رکھی تھی۔ اگر میں بری ہوں تو مجھے برا بنایا کس نے؟ تھا؟ آپ نے! یا! صرف اور صرف آپ نے۔“ وہ غصے سے چلائی۔

”آپ نے اپنے ساتھ لندن لے جانے کے لیے اسے چنا تھا یا؟ بولے چنا تھا کہ نہیں؟“ وہ روتے ہوئے حلق سے بل چلائی۔ لیزا اپنے لیے اس کا نفرت، بھرا الجھن کر اگر حد سے تنگ نہ بنی تھی تو اسے اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔

”آپ نے اسے چنا، سکندر شہیار نے اسے چنا۔ آخر کیا ہے کیا اس عام لیزا میں؟ جس کسی سے بھی میں محبت کرتی ہوں، وہ میرے بجائے اسی کو چاہتا ہے۔ آپ بھی سکندر شہیار بھی۔ میں نے آپ سے بہت محبت کی ہے یا! اپنی جان سے بھی زیادہ مگر آپ

میرے خلاف تمہارے اندر زہر بھرتی رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا سب جانتا تھا، پر چپ رہتا تھا۔ میں اپنی ایک بیٹی کے خلاف دوسری بیٹی سے کیا کرتا؟ سکندر نے والدین اور زمین سب سکندر کو تصور وار سمجھتے ہیں۔ جب یہ زمین سے منگنی تو ذکر آئی تھی تب میں نے امریکا فون کر کے شہیار خان سے بات کی تھی۔ وہ بے چارے مجھ سے بہت شرمندہ ہوئے تھے۔ اپنے بچے کی غلط حرکت پر مجھ سے انہوں نے معافی تک مانگی گی۔ میں نہ تو تب سکندر سے کبھی ملتا تھا، نہ اس واقعہ کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتا ہے مگر میں بارہ سال پہلے بھی یہ جانتا تھا کہ بدکردار زمین کا بڑا بھائی نہیں، بری بیٹی ہی ہے۔ جو اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ اتنا شرمناک رشتہ قائم رکھ سکتی ہے وہ منگیتر کے بوسے برائی کے ساتھ کیوں، انوالو نہیں ہو سکتی؟ زمین کے ساتھ اس کی منگنی میں نے خود کروائی تھی یہ سوچ کر کہ چلو! ایک اتھے خاندان کا ٹیکہ، شریف اور مذہب لڑکا اس نے اپنے لیے چنا ہے۔ شاید اس کا ساتھ اس کے اندر تبدیل یاں لے گئے۔ یہ اپنی اصلاح کر لے۔ تب میں اس سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا، میری بیٹی راستہ بھولی ضرور تھی ہے، بھٹک ضرور تھی ہے مگر جلد وہ راہ راست پر واپس آئے گی۔ مگر اس نے بعد آنے والے برسوں میں اس کے غلط راستے پر اگے سے آگے بڑھتے قدم مجھے یہ بتاتے رہے کہ میری بیٹی نے اس بھٹکی ہوئی اور غلط راہ کو ہمیشہ پیشہ کے لیے چن لیا ہے۔ میں لاکھ کو ششیں کر لوں، اسے درست راستے پر واپس نہیں لاسکتا۔“

وہ لیزا سے مخاطب تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر کہیں رہے تھے۔ اب ان کی طبیعت تدریجاً سنبھل جاتی تھی۔ وہ بہت دکھ اور کرب سے بول رہے تھے مگر ان کی سانس نہیں کھڑ رہی تھی۔ اس کی سماعتوں میں باپ کی اپنے متعلق باتیں گونج رہی تھیں۔ مگر اس کی نظر لیزا پر تھیں۔ وہ پایا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لیزا پایا کی عزیز از جان بھی اور وہ انتہائی قابل نفرت، جس کی طرف سے لیزا کھنا تک گوارا نہیں کر رہے تھے۔

مجھے محی کے پاس چھوڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آپ نے اسی کو چلا، مجھے نہیں اور سکندر نے بھی مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ مجھے روکو دینے کے بعد ترج وہ اسے اپنا چاہتا ہے اس عام سی لیزا محمود کو؟ جس میں مجھے جیسی کوئی ایک بات نہیں۔ ہاں! میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں نے ساری زندگی اتنی نفرت کسی سے نہیں کی، جتنی اس سے کرتی ہوں۔

وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ ہانکوں کی طرح ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر پلید آواز میں چلا رہی تھی۔ اس کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ پیلا نے لیزا کے سامنے اس کے بارے میں اتنا کچھ بول دیا تھا تو اب اپنی نفرت چھپانے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ وہ لیزا سے اپنی نفرت کا اظہار مانگ رہی تھی۔

”سیم! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ لیزا! اب است بولو۔“ اس نے لیزا کی روٹی ہوئی آواز سنی۔ ”میں نے ساری دنیا میں سب سے زیادہ بار تمہیں کیا ہے سیم۔ محی سے بھی زیادہ پیلا سے بھی زیادہ۔ میرے لیے میری فیملی، میری دوست، میری ماں، میرا باپ سب کچھ تم رہی ہو سیم!“

وہ روتے ہوئے اس سے بول رہی تھی۔ اس کے نوپر لیزا کے آنسو اثر کر رہے تھے نہ اس کی باتیں وہ ایسے دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے پیلا کو دیکھ رہی تھی۔ بچپنوں نے روٹی ہوئی لیزا کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اسے پار کر رہے تھے۔ اس کا بڑی شدت سے دل چاہا تھا وہ لیزا کو ان کے پاس سے ہٹا دے، اسے مٹا دے اسے عتاب کر دے گت جان سے مار ڈالے۔

”میریم! میں نے کٹھوم کو تم پر فوقیت نہیں دی تھی۔ تم بھی جانتی ہو کٹھوم بھی جانتی ہے، میں تمہیں زیادہ چاہتا تھا اور یہ بات تمہاری ماں بھی جانتی تھی۔ تمہاری ماں سے شاد۔ میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تھی۔ میں اپنی ماں کی ایک بات نہ مانتا تھا۔ میں اپنی ماں میں سے کوئی ایک بچی بھی اس پر گرد اور عورت کے پاس چھوڑنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ محمود! لیزا ایک

شاطر اور رکار عورت تھی۔ علیحدگی کے وقت مجھے لہجہ کرنے اور پریشان کرنے کے لیے اس نے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تمہیں اس لیے چنا تھا کہ مجھے تکلیف دے سکے۔ یہ خواہش بھی اسی کی تھی کہ ایک بچی اس کے پاس اور ایک میرے پاس رہے گی۔ اسے تم دونوں میں سے کسی سے بھی محبت نہیں تھی۔ مگر مجھے غف نام دینا چاہتی تھی۔ اس لیے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کی شرط عائد کر دی تھی۔ میں اس کھٹیا عورت کے منہ میں لگانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنی اوقات دکھانے پر اتنی تو میری عزت اور نیک نامی تک کورسوائی اور جگ ہنسائی میں تبدیل کر دے گی۔ میری عزت کے ساتھ میری بچیوں کی عزت بھی جڑی تھی۔ اپنی اور تم دونوں کی عزت قائم رکھنے کے لیے میں اس وقت قدرتی طور پر خاموش ہو گیا تھا۔ مگر میرا دل روز سے تمہیں اس کے پاس چھوڑ دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تم دونوں میں سے ایک کو بھی وٹوریا کے حوالے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تمہیں اپنے پاس لندن بلانے کی کوششیں کر رہا تھا اور اس دوران میں تم سے نہ تو غافل ہوا تھا نہ بے پروا۔ میں مسلسل تمہاری خبر گیری کرتا تھا۔ یاد کرو! میں تمہیں دن میں کتنی بار فون کرتا تھا؟ سال میں ایک بار تمہاری چھٹیوں میں تمہیں اپنے پاس لندن بلواتا تھا۔ کتنی بار اپنے جانے والوں کو جو کسی کام سے اٹلی جا رہے ہوتے تھے، تم سے بطور خاص ملنے کی تاکید کرتا تھا۔ اس عرصے میں میری مسلسل یہ کوشش رہی تھی کہ تمہیں جلد از جلد وٹوریا سے واپس لے سکوں۔ مگر جہاں اس کے کہ میری کوششیں کامیاب ہوئیں، مجھے تمہارے مختلف اذیتوں کی خبریں ملنی شروع ہو گئیں۔ میں تم سے ظاہری طور پر درپردہ غمازیم، مگر تمہاری ہر ہر خواہش سے خبر رکھتا تھا۔ ابھی میں تمہارے اذیتوں سے پریشان ہوا تھا کہ مجھے تمہارے سویلے باپ کے ساتھ تمہارے تعلقات کا پتا چلا۔ تمہاری ماں نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔ میرے جاننے والوں نے مجھے خبر دی

شادی کا فیصلہ کیا تاکہ میں تمہیں ایک پاکستانی شخص سے شادی کرنا رکھ کر خوش ہو جاؤں۔ مگر میں تمہارے اس فعل پر ایسے خوش ہوتا محرم؟ جانتی ہو تمہاری شادی کے چند دنوں بعد ہاشم کی پہلی پوی مجھ سے آکر ملی تھی۔ اس کی آپس اور بد رعائیں جو اس نے مجھے اور تمہیں دی تھیں، ہر گز میرا مقابلیہ کرتی ہیں۔ میں ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں اس مظلوم عورت اور اس کے معصوم بچوں کی کوئی بد رعائے کوئی آہ تمہیں نہ لگ جائے۔ جتنا بھی مجھے تم پر غصہ ہو جتنا بھی تم نے مجھے باؤس کیا ہو، پھر ہو تو تم میری اولاد محرم! تمہیں اگر کوئی تکلیف پہنچی تو سب سے زیادہ درد تو مجھ ہی کو ہو گا نا؟ میں تم سے درخواست کرتا ہوں محرم! خود کو بد لو۔ اتنی بد رعائیں مت سمیٹو کہ میری رعائیں بھی تمہیں کسی پکڑے بچانہ سکیں۔

اس کے پاپا بھی ہوئی آرا میں اس نے بولے۔ وہ صوفے پر سے اٹھے اور وہاں سے جانے لگے۔ بغیر ان دونوں میں سے کسی کی بھی طرف نہ دیکھے۔

وہ ان کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے باؤس تو زمین نے جکڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے پاپا کو بہت شکستہ بہت پارے ہوئے قدموں سے گرنے سے جانا رکھ رہی تھی۔ کیا وہ اپنی نظموں سے گرنے لگی ہے؟ کیا انہوں نے اسے اپنے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل دیا ہے؟ وحشت زدہ ہو کر اس نے اپنے قدموں کو اٹھانا چاہا۔

اس بار اس کے قدم اٹھ گئے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر جا رہی تھی بغیر لڑائی کی طرف نہ دیکھے۔ وہ فوری طور پر اس کمرے سے چلے جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ اپنے گھر جا کر وہ سکون سے ساری صورت حال کو دوبارہ سے سوچے گی۔ سوچے گی کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ وہ کمزور اور بزدل لڑکی نہیں ہے۔ وہ اس محرم ہے۔ کبھی بھی ہار نہیں سکتی۔ خدا نے اس کی تخلیق اس مٹی سے کی ہے جس کی فطرت میں بار ہے ہی نہیں۔ صرف اور صرف جیت ہے۔ صرف اور صرف جیت۔

تمہیں ان باتوں میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا، مگر تم مجھ سے اتنی دور جا چکی تھیں اتنی پستی میں اتر چکی تھیں کہ تمہارے پاس رہائی کا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ تم مجھے لاعلم سمجھتی تھیں اور میں اکیلے میں تمہاری بد کرداری پر پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔ تمہاری حرکتوں کا پتا چلنے کے بعد چاہے میرا دل تم سے کتنا ہی شاک کیوں نہ ہوا تھا، مگر میں نے تمہیں بائبل میں رہنے سے منع کیا تھا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جانا چاہتا تھا۔ بار کرو! میں نے تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ مگر تم میرے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ آزادی اور رہے راہ دہی کے جس راستے پر تم چل پڑی تھیں، وہاں میرے ساتھ رہنا تمہیں ہندش لگا تھا۔ میں تمہیں مزید باتوں میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا، مگر زور زبردستی کر کے تمہیں اپنے ساتھ کیسے لے جاتا؟ وہ مغربی حاشرہ جہاں میں نے اپنی بیٹیوں کو روانہ کر دیا تھا، وہاں باب اگر لارڈ زور زبردستی کر نہیں سکتا تھا۔

وہاں چپ چاپ ساکت کھڑی باب کی غم زدہ آواز سن رہی تھی۔ وہ اب نہ تو اس پر چلا رہے تھے نہ غصہ کر رہے تھے، وہ بس مدھم آواز میں درد اور کرب آنکھیں میں سموئے اس سے بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کی آنکھوں میں یہ دکھ جھٹک رہا تھا کہ جس بیٹی کو انہوں نے دنیا کے تمام رشتوں اور نام لوگوں سے زیادہ چاہا، اسی نے انہیں سب سے زیادہ دکھ دیے۔ اس کا دل چاہا وہ دوزخ کی آگ میں جائے، ان کے سینے سے لگ جائے۔ مگر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے تل نہیں سکی تھی۔

”تم اخلاقی لحاظ سے ہر رائی میں ملوث رہیں محرم! میں چپ رہا۔ تم کلثوم کے دل میں میرے خلاف زہر بھرتی رہیں، میں چپ رہا۔ اکیلے میں روتا تھا کہ میری دونوں بیٹیاں اپنی اپنی زندگیاں جہاں کر رہی ہیں۔ میں انہیں کیسے روکوں؟ کیسے بچاؤں؟ تم نے مجھے یہ بتانے کے لیے کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو ہاشم سے



بارہ سال سکندر سے نفرت کی تھی 'لب زندگی کے باقی تمام عرصے میں اسے خود سے نفرت کرتی تھی۔
"اب کیا ہو گا شہنشاہ؟" اس کے کانوں میں اپنی ماں کی آواز آئی۔ "دُرُخوف اور اندیشوں میں گہری ہوئی آواز۔"

"ہا نہیں۔" گرم صم سے انداز میں شہنشاہ خلیں بولے۔ ان کے چہرے پر پریشانی ہی پریشانی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ یکدم ہی انہوں نے آئندہ سے پوچھا۔

"آئندہ اسکندر کہاں ہے؟" باپ کے اس سوال پر وہ بھی ہری طرح چونکا تھا۔

"شاید اسے ہوٹل چلا گیا ہو گا۔ مجھے نہیں پتا۔ وہ مجھ سے پہلے گیزا کے گھر سے نکل گیا تھا۔" آئندہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ جو آئندہ اپنے اس کے باپ کے دل میں پیدا ہو رہے تھے، وہی اس کے بھی دل میں پیدا ہونے لگے تھے۔

"سکندر ٹھیک تو تھا نا؟ وہ ٹھیک تو تھا نا؟" یکدم ہی بے چین ہو کر اس نے آئندہ کا موبائل اٹھایا۔ وہ اس پر سکندر کو کال ماننے لگا تھا۔

کال مل گئی تھی۔ بیل جاری تھی۔ مگر کال ریسیو نہیں کی جارہی تھی۔ شہنشاہ خان جیسے اس کے فون اٹھانے کے انداز سے وہی سمجھ گئے تھے کہ وہ کسے کال ملا رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" اس کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"سکندر کال ریسیو نہیں کر رہا۔" وہ کئی مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔

"تم اس کے ہوٹل فون کرو۔"

"پاپا! فون نہیں کریں۔ ہم اس کے ہوٹل خود چلے جاتے ہیں۔" وہ باپ سے سنجیدگی سے بولا۔

"شہنشاہ! میرا بچہ خیانت سے تو ہو گا نا؟ مجھے اس کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ لیذا کے گھر سے بہت غصے میں لگا تھا۔"

آئندہ خوف سے کانپتی 'رندھی ہوئی آواز میں

کہا کہ محمود صاحب نے؟" شہنشاہ خان واپس صوفے پر آکر بیٹھے تو آئندہ نے ان سے پوچھا۔

"ہا نہیں۔" انہوں نے بے بسی سے آئندہ کو دیکھا۔ "میں ان کے لیے سے کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔"

عجیب الجھا ہوا سانداز تھا ان کا۔

زمین چپ چاپ باب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا دل پریشان تھا۔ اس کا دماغ مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ کسی بھی طرح کسی بھی طرح سکندر کو لیذا کا ساتھ مل جائے۔ کم از کم اس کے بھائی کو

زندگی میں یہ ایک خوشی تو مل جائے۔ کل سے مسئلہ وہ مظلوم تھا سکندر ظالم تھا۔ کل جب اپنے مظالم اور جرائم کی فہرست سامنے آئی تو دل چاہا تھا خود کو ختم کر

والے اسی وقت موت کو گلے لگائے۔ کل زندہ رہنا بہت دشوار لگتا اور آج۔

آج اسے پتا چلا تھا کہ اس کی وجہ سے 'صرف اور صرف اس کی وجہ سے اس کے بھائی کی زندگی میں پھر

اندھیرے اور مایوسیاں آگئی تھیں۔ اس لڑکی ام مریم کو وہ لے کر آیا تھا اسے گھر میں۔ محبت میں اندھا اور بالکل

وہ ہو گیا تھا۔ اس کے بھائی کے کردار پر حسرت لگائی تھی تھی۔ اسے گریہ کر کیا گیا تھا۔ مگر زمین شہنشاہ کے گناہ

یہاں اگر ختم نہیں ہوئے تھے۔ ماضی کے دھند لکوں میں گم ہو چکا وہ واقعہ پھر بچہ محفل دورایا گیا تھا۔ اس کے

بھائی کی عزت اور ناموس پر پھر انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ برسوں بعد اسے ملنے والی ایک خوشی پھر اس کی

وجہ سے اس سے چھین رہی تھی۔ اس کا حقیقتاً 'دل چاہ رہا تھا وہ کسی بلند عمارت سے کود جائے یا سمندر

میں خود کو غرق کر دے۔ وہ کسی بھی تکلیف دہ اور لذت ناک ترین انداز میں خود کو ختم کر لیتا چاہتا تھا۔ مگر اس کی

توسہ دہائی تھی کہ اسے زندہ رہنا تھا۔ اس احساس گناہ کو ساتھ لیے ابھی اسے برسوں زندہ رہنا تھا۔ مریموں

سے بھی بدتر انداز میں 'خوف سے نفرت کرتے ہوئے۔

ہیں۔ جو خوفِ اُمّہ کے لبوں پر اڑا تھا وہ اس نے
اور شہیار خان کے دل اور دماغ میں پھیل رہا تھا۔
سکندر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک کر دینے کی فکر سے
بھی زیادہ بے تکلفی ہی یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ وہ کہاں
لگتا؟ وہ خیریت سے تو تھا؟



وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ شہیار خان اس کے برابر میں
بٹھے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ وہ دونوں بہت
پریشان تھے۔ اس کے بھائی کی زندگی ایک بار پھر
اندھیوں کی زد میں تھی اور اس کی وجہ وہ تھا۔ کل بھی
سکندر کی زندگی اسی کی وجہ سے جہاں ہوئی تھی، آج بھی
اس کی تباہی کا سبب وہی تھا۔ اس بدکردار لڑکی سے
اندھی محبت میں مبتلا ہو کر اس نے بھائی کی زندگی ہی
برباد کر ڈالی تھی۔

وہ باپ بیٹا ہو کر مل بیٹھ چکے تھے۔ اس کا بھائی اپنا گھر
اتے ہوئے بھی پر رسول بھدر وطن آنے پر ایک ہوٹل
میں کیوں رہ رہا ہے؟ اسی ہوٹل میں قدم رکھتے ہوئے
یہ سوچ اسے رلا رہی تھی۔ وہ کیسا بھائی ہے۔ وہ کیسا
بھائی ہے۔ ایسی نفرت تو کوئی اپنے بدترین دشمن سے
بھی نہیں کرتا ہو گا جو جس کی انگلی میں تل کر اس نے
اپنے بھائی سے کی تھی۔ وہ دونوں استنبیالہ پر آگئے
تھے۔

”وہیں سکندر شہیار سے ملتا ہے۔ مدم نمبر نہیں
آتا مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“
استنبیالہ پر موجود اس مذہب، خوش اخلاق لڑکی سے
اس نے کہا۔ چند لمحے کہیں پرچیک کرنے کے بعد جو
دواب اس لڑکی نے انہیں دیا وہ اس کے اور شہیار خان
کے حواس گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔

سکندر شہیار ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ وہ آج
اپہرے کہیں گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا
تھا۔

بے اختیار شہیار خان نے سارے کے لیے اس کا
اد تھا۔ اتنا اس نے باپ کو سنبھال لیا تھا۔

”ایسا! سکندر ٹھیک ہو گا۔ آپ فکر مت کریں۔“ وہ
دونوں ہونٹوں سے واپس نکل کر گاڑی میں آکر بیٹھے تو
اس نے سکندر کے موبائل پر پھر کل کی۔ ایک ’دو‘
تین بجائے کتنی مرتبہ اس نے گاڑی ملائی تھیں۔

”زین! میزائل گھبرا رہا ہے۔ کہیں وہ خود کو کوئی
نقصان نہ پہنچالے۔“ اس نے اپنے بہت مضبوط باپ
کو پھر فٹنڈا کھلانے کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔
”جیسا کچھ نہیں ہو گا بابا! آپ اللہ پر بھروسہ
رکھیں۔“

”زین! سکندر کو ڈھونڈو۔ کسی بھی طرح اسے
ڈھونڈو۔ اس بار اگر ہم نے اسے کھو دیا تو دوبارہ کبھی
حاشا نہیں کیا میں سکے۔ وہ یا تو خود کو کوئی نقصان پہنچا
دے گا یا پھر خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر دے گا کہ ہم
اسے تلاش نہ کر جا سکیں گے اسے ڈھونڈو زین!“
شہیار خان اس کے ہاند کو جکڑ کر روتے ہوئے بولے۔
”بابا! پلیز، خود کو سنبھالیں۔ آپ ہر طرح کریں
مگر تو اسو جان تو بالکل ہی حوصلہ ہار دیں گی۔“ سکندر ہی
اندرا اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔

”وہ بہت غیرت مند بیٹا ہے میرا۔ ایک بار میں نے
اسے گھر سے نکالا اس سے سب رشتے ٹاٹے تو زور دیا
تو وہ پلٹ کر پھر کبھی کوئی دھمکتے میرے پاس نہیں آیا۔
اس نے خود کو دنیا کے ہجوم میں گم کر لیا تھا زین! میں
اسے ڈھونڈ رہا تھا یہ میری خوش قسمتی ہے۔ مگر اب کیا
بار جو پھر اسے اس کی عزت اور آبرو کا نشانہ بنایا گیا ہے
وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں اور تم اس بار اسے ڈھونڈ
نہیں پا سکتے گے اگر اس نے خود کو کہیں گم کر دیا تو۔“
وہ اپنے روتے ہوئے باپ کو بے بسی سے دیکھ رہا
تھا۔ وہ دونوں واپس گھر پہنچ چکے تھے۔ جتنے انک
ہمانے تھے، جتنے خوف اور اندیشوں کا اظہار کرنا تھا وہ
شہیار خان راستے میں کر چکے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں
نے خود پر جبر کر کے بہت کوشش کر کے اپنا آپ سنبھالا
تھا۔

”اُمّہ کو یہ مست جانا زین! کہہ سکندر ہمیں نہیں ملا
ہے۔“

انہیں جیسے سکندر کے ساتھ ساتھ یوں کی صحت کی بھی فکر تھی۔ اس نے خاموشی سے محض سراثت میں بلایا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کرتا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب سکندر کو کہاں ڈھونڈے؟ کیا وہ ابر پوریت جائے؟ کیا وہ آج لہا اور امریکا جاسٹن والی فلائٹس کا پتا کرے؟



وہ اپنے کمرے میں تھما بیٹھی تھی۔ اسی طرح جس طرح محمود خالد اور سیم کی یہاں موجودگی کے وقت بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے لوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اسی طرح فریش پر بکھرے تھے۔ وہ بالکل ڈری اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دوسرے شام ہو چکی تھی اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

وہ بالکل خالی خالی نگاہوں سے اپنے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دنیا، زندگی، رشتے، ہر شے بے معنی لگ رہی تھی۔ سیم کی نفرت کی نظریں اس کے زہر میں بیجے الفاظ اسے اس طرح سمیٹ گئے تھے کہ خوف کے مارے وہ رو بھی نہیں پاری تھی۔ اس نے ساری زندگی سیم سے محبت کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے عمر بھر اپنی حسین اور ذہین بہن پر فخر کیا تھا اس کو بے حد خود سے برتر تسلیم کیا تھا۔ اس سے بے تحاشا محبت کی تھی۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسے فیصلے کرنے کا حق دیا تھا۔ سیم اس سے جو کہتی وہ آنکھیں بند کر کے کیے جاتی۔ سیم کہہ رہی ہے تو اسی میں اس کی بہتری ہے۔ اس لیے کہ سیم سے زیادہ تو اس کا بھلا کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔ وہ عمر بھر اپنے باپ کو اپنا دشمن سمجھتی رہی۔ اس کی اگر کوئی دوست تھی اگر کسی ایک رشتے میں وہ اپنا ہر رشتہ دھکتی تھی تو وہ اس کی پیاری بہن تھی۔ اس کی پیاری سیم تھی اور سیم کہہ رہی تھی وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے۔ وہ اسے تاجدار بنا کر بنا جاتی ہے۔ وہ اس سے اس کی ساری خوشیاں چھین لینا چاہتی ہے۔

اپنی سب سے عزیز، جان سے بھی بڑھ کر باہری بہن کا یہ بیانیہ روپ وہ دیکھ نہیں پاری تھی۔ واقعی سیم کی تھی۔ وہ اس تیرہ سال کی لڑکی طرح لگتی تھی جس سے اس کا کھلا اور بہن جیسی جارہا تھی۔ محبت، وفا، اعتبار، چاہت، بھروسہ، رشتے کیا سب بے معنی ہیں؟ جان سے عزیز شخص بھی اگر قاتل افسار نہیں تو پھر انسان افسار کس پر کرے؟ وہ درو کی ان انتہاؤں پر بھی کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہ رہا تھا۔ وہ بیٹھا جاتی تھی وہ سیم کی نفرت پر چڑھا ہوا کر رہتا جاتی تھی پر اس سے رو کیا نہیں جابجا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بالکل خشک تھے۔

اس کا دل بالکل بھروسہ پران ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت دنیا کا کوئی شخص یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی رشتہ یاد نہیں رہا تھا یاد رہا تھا تو اتنا کہ سیم اس سے نفرت کرتی ہے۔ سیم کا وہ پیار جس پر وہ فخر کیا کرتی تھی، جھوٹ تھا۔ سیم کی نفرت وہ سہہ نہیں پاری تھی یہ تلخ ترین چال، برداشت نہیں کر پاری تھی۔ اس کی محبت اس کا بھروسہ اس کا یقین بے یقین ہو رہے تھے یہ درد اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ کوئی اگر اسے بتا دے کہ سیم نے جو کچھ کہا وہ سب جھوٹ تھا یا پھر سیم ہی واپس آ جائے اگر ہنستے ہوئے اسے گلے لگالے۔

”مجھے ایسا سمجھی ہو تم؟ پاگل! میں تم سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کیا میں نے تمہیں نمی اور پیاس سے بھی زیادہ پیار نہیں دیا تھا؟ پھر تم میری محبت پر شک بھی کس طرح کر سکتی ہو لو؟“

پیار سے ڈانٹتے ہوئے وہ اسے گلے لگالے۔ اسے پیار کرتے۔

”سیم! آجاؤ۔۔۔ سیم! پلیز آجاؤ۔ اگر کو جو تم نے ابھی کہا وہ سب جھوٹ تھا۔ سیم! آجاؤ۔ مجھے بے یقین ہونے سے بھاؤ سیم! میں تمہیں کسی رشتہ پر بھروسہ نہ کر پاؤں گی اگر تم نہ آؤ گے۔“

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چلا جائے کہ سیم کو پکارے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



۔ ف کبے زندہ رہوں گا؟ باز انھے اب تارے
بغیر میں کس طرح زندہ رہوں گا؟

و نوت کر کھر باغ! رنو رنو ہو رہا غلہ عمر بھر کی
سنگ باری کے بعد کباب بھی بازار ہو کر نہ بھرے؟
اس کی زندگی کی آخری امید اور آخری خواب بھی اس
کا رنجہ جو زخمی تھا۔

”دوسروں کے لیے زخموں کے پلو جو میں زندہ رہا
تھا مگر تمہارے لیے۔ یہ اعتبار داری کے زخم کے بعد
اب میں زندہ کس طرح رہوں گا؟“

اک بلی اس نکل چلا وہ منھے پھول کی طرح اپریاں
رگڑ رگڑ کر دوسرے چلا چلا کر اسے بیلا (Bell) کہہ
کہہ کر نکارے۔ ”میت خوش ہوتی ہے علی! جب وہ
اسے Bell کہتا ہے۔ اسے اس کی یہ گناہت اچھا
گنتا ہے۔ وہ اس لفظ کی کشش سے بندھی اس کے
پاس چلی گئی۔“

اسے بلدا، مٹی سے بڑھنے پس رہا تھا۔ خود اپنا مدین
ازار اٹھا جسے اب بھی نہیں اتار اس کا واسطی
انٹھ کر رہا جاتا ہے۔ نہ مٹی سے کمرے کی خلی
رشتیں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا۔ آج زندگی نے
اس کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

ذرا نیورے گاڑی اشارت کدو کی بھی۔ اسے کھانا
جانا ہے مٹی نے جو۔ وہ بھی مٹی ذرا نیورے کچھ دیر
انتظار کرنے کا کہہ کہہ اندھا گیا تھا۔ وہاں گاڑی
میں آکر بیٹا تو اس نے ذرا نیورے اسے ہوئی چلنے
کے لیے کھل۔ آج کی مٹی بھی شام اور قحط رات اسے
اسی شہر میں گزارتی تھی کہ اسے دبا کسے کھل مٹی کی
کلاشت میں جھٹ کر رہی تھی۔

اسے آج کی جھٹ لیا جاتا تو ذرا نیورے اسے شہر
سے نکل جانا۔ لپے ہوئی مٹی طرف جاؤں شہر کی
دو فٹوں کی مٹی سے دلچہ رہا تھا۔ نکلنے کاں خود کو
زندگی کی تمام رونقوں سے باہر۔ کل فریاد کیا جا رہا ہے
مگر لب رہی بھی نہیں ٹھہرے گا۔ نہ کہیں اور چلا
جائے گا۔ کسرا نہیں دیکھنے چلی اسے کوئی نہ دیکھا
ہو۔ مٹی ٹھٹھٹ کبھی اور کھل ابلو اندر کی جلب اسے

نہیں چاہے ہے۔ جب یہ تعلیم ہو چھوڑا ہنس اس
کے اس سے اس آہیچہ نہیں چھڑا سکتا اس کا تھکے
کی ضرورت کیا ہے۔ پھر سے بخانا بن جائے گا۔
پھر سے امارت اسٹریٹ جیسی بن جائے گا۔ مٹی اور
فطرت سے اسے مستغنی کے لیے سب سوزا لینے
کے پھر اس کے اندر رحمت مند سے مدد دی تھی۔
رعازیں اراد کر رہی تھیں۔

وہ لپک لپک انداز سے دلہن بنانے جانے بھی
میں جلسہ باجوہ کچھ بھی ٹھہرے اس کی محبت اپنے دل سے
مرنے دم تک نہیں نکل سکتا۔ مٹی بات بھی محبت
کے لیے بیٹے دعوت پرانے کے بٹے اس نے
نہیں۔ اس نے اس کی محبت قبول کی ہی نہیں۔ وہ کھول
ست کی بھی مٹی رنج آکس نکل کی طرح وہ محبت اس
کے وجود سے لپک رہی تھی۔ اس کی سانسوں اس کی
دھڑکنوں میں لپک رہی تھیں۔ جس روز مٹی دیکھی تھی
وہ مٹی یہ محبت اس کے وجود کا ساتھ جوڑ سکتی تھی
اس سے پہلے فوج کو نہیں۔

گاڑی اس کے ہوئی نے سامنے آکر رک بھی
تھیں۔ وہ کوئی دیکھ کر بے ہوئی کی علامت کو کچھ ہوا
تھا۔

نہیں وہ پہلے اس اور مٹی میں مٹی خوشیوں اور
انگوں کے ساتھ آکر ٹھہرا تھا۔ نچ وہ مٹی اس لود
کلکت خود۔ اس مٹی راہیں قدم رکے رہا تھا۔ سکند
شہر ارکار مدین اسے خشک پڑا تھا اس کی زندگی میں
کبھی بھی کچھ بھی اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی زندگی
کی محنت نے یہاں بھی اس کا چھٹا نہیں چھوڑا تھا۔
سامنے بنائی ہوئی مٹی لپکا مٹی کی مٹی کیوں انٹی مٹی
وہ بد کردار لڑکی؟ یہ اس کی زندگی کی محنت ہی ہو
تھی۔

وہ انہونی ہو مٹی مٹی جس کا خوف اسے لپکا
محبت نہیں کرنے کے لیے اسے ذرا اٹھا۔ لپکا مٹی
اسے رات بھی بھی نہیں لپکے والی تھی۔ اس کی بیلا
اس کے لیے نہیں تھی۔
وہ لپکے کرے میں اٹھا۔ اس کا دل چاہا تھا۔

جائے گا مجھ سے۔ وہ ایک بار پھر کھو جائے گا۔
ہے۔"

انہوں نے غصے سے جھلانے ہوئے بات شروع کی
نئی مگر جیلے کے آخر میں انگریز کی آواز آنسوؤں اور
آندھ میں بدل گئی۔

"سکندر! آواز! اٹھو۔ اسو جان کی ناخوشی فون
اٹھو۔" اس کے گلے نے بڑی شدتوں سے مچھلی کو پکارا
تھک سکندر کو کلاں مانے کے ساتھ ساتھ دو سچ رات
میں اور علی خان بھر میں بار بار مارا جانے والی لٹاٹس
کا بھی جان کر رہا تھا۔ فون بھی کر رہا تھا اور لب لباب پر
اشریت کے ذریعے بھی معلومات لے رہا تھا اٹلاٹس
کے مٹھلے۔

لب لباب وہ کس صبح روزا جانے والی ایک فلائٹ
کے بارے میں معلومات لے رہا تھا اور ساتھ ہی آمنہ
کے سوا کسی سے ایک مرتبہ پھر سکندر کو کلاں ملایا تھا۔
"بیلو۔" اس نے دوسری جانب سکندر کی آواز
سنی۔ اسے میرے کانوں پر چین نہیں آیا۔ اس نے
پوچھنے کے لیے لب لباب کو لے جانے پر اس کی زبان
کو کھینچ کر دیکھی۔ وہ اس سے کہا کہ اور کبھی وہ فون اٹھ
میں لے کر روزا اور باب کے پاس آیا۔ اس نے فون
انہیں غماہا۔

"سکندر! اس۔ بھولی تو آواز میں کہا۔ آمنہ نے بھی
اس کی بات سن لی تھی۔ آمنہ نے شہزاد خان کے
ہاتھوں سے لپک کر فون ٹھہرا دیا تھا اس کے
پاؤں پر۔ اسے جان دینی اور جس کی فون پر۔ شہزاد
خان فوراً بات کر کے یہ جانکا کہ وہ بے کویں۔
شہزاد خان بھی شاید اسکا چاہتے تھے اس لیے بجائے
آمنہ کو فون دینے کے وہ بڑبڑاتے اٹھ گئے۔ آمنہ
فوراً اٹھ اٹھا اور علی نہیں سانس نے اس کے پاس پہنچ کر
فون کے شانے کے گرد بٹھ کر کہا۔ وہ آنکھوں میں محبت
لے لے کر دیکھ رہا تھا۔

"اسو جان! میں سکندر کو آپ کے پاس رکھیں گا اور
کاؤنڈ کر رہا ہوں۔ آپ اس وقت لپٹاؤ اس سے بات
کرتے ہو۔"

اس نے اپنی سوتلی بہن بیارلی کو گلے سے لگا لیا
جسے گھٹنوں میں "شدید بیمار نظر آنے لگی تھیں۔
بخار میں تھک رہی تھیں۔"

"سکندر! سنا! تم کہاں ہو؟"
شہزاد خان گھبرائے ہوئے تے انداز میں فوراً
پوچھے تھے مجھے انہیں خوف نہ کہ تمہیں سکندر فون نہ
نہ کرے۔

"میں غماہے پاس آیا ہوں بڑا امیر! انظر کر رہا
پلیرا امیر! انظر کر رہا۔"

اس نے اپنے باب کے چہرے پر سکندر کے پھر کر
نہ جانے کا خوف اور پریشانی دیکھی۔ انہوں نے من
کچھ کہے بغیر فوراً ہی فون بند کر دیا تھا۔

"زین! آؤ میرے ساتھ۔ سکندر روپنے ہو گل میں
ہے۔"

وہ لے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔
نورہ کو یہ لاشاں کرنا کہ وہ اسو جان کا خیال رکھے لب
کے پیچھے بھاگا تھا۔



ایک بار بھر دو فون ہو گئی جانب تھے۔ وہ گاؤں
پارہ تھا۔ شہزاد خان اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔
بست پر لیٹتے بست لگ رہا تھا۔ گاؤں جانا ان کا بے گاہ
اپ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر
بست کو ڈھکے اور گھڑو نظر آنے لگے تھے وہ باب کی
آنکھوں سے چمکتا رہا اور خوف پوری شدتوں سے
محسوس کر رہا تھا۔

رات کے آٹھ بجتے وانے تھے جب وہ ہو گئی
پہنچے۔ جس کے قدم سکندر کے کمرے کی جانب اٹھ
تھیں پارہ تھے وہ اس کا مہمانا کیے کمرے گا۔ اس
کے کانوں میں خود اپنی آواز میں گونج رہی تھیں۔

"بیٹا! میں کن جہانوں کی جلیں لے لوں گا اپنی بیٹی
دے دوں گا۔ میں اس ذلیل بے غیرت کو زندہ نہیں
چھوڑوں گا۔"

چلنے پھرنے رک گیا تھا۔ اس کی نظر میں اپنے دونوں

شہیاد خان کی طرف نہ کھما۔ اور بھی اندر آئے ہی موت
کبھی۔ کچھ بجے تھے۔ فن کے چہرے پر بے شمار غور
آگیا تھا۔

”متم مکمل جا رہے، ریکارڈر؟“ انہوں نے پریشانی
سے فوراً سچو جملہ

”ہاں۔ میں مکمل منج کی ٹکائٹ سے“ ہاؤڈیس بار بار
بولے۔ اس میں قحور اور جنٹ کام آگیا ہے؟“

وہ بے حد سنجیدگی سے انتہائی غیر مذہبی انداز میں
بولے۔ جیسے قحور جو کچھ ہوا تھا اس سے اسے کوئی
تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ جیسے برسوں سے اس کے
ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے اسے کوئی تکلیف
نہیں پہنچ رہی تھی۔

”تم واپس جا رہے ہو؟“ شہیاد خان کا لہجہ فن کی
پریشانی غور سے گواہ کر رہا تھا۔ لب کی بار بار پٹنا
اور گیونچر بھی نہیں ملے گا۔ فن کے چہرے پر غور
چھایا ہوا تھا۔ وہ نیولہ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ کچھ دبا غماخہ سکندر اسے بالکل بھی نہیں دیکھ
رہا۔ بے باؤ اور غیر مذہبی سے انداز میں، دونوں ہاتھ
پٹے پر باندھے وہ صرف باب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ
صرف فن ہی سے شائبہ تھا۔

”ابھی جلدی منت جاؤ سکندر! میں سب ٹھیک کر رہا
ہوں۔ ایک دن تو فوراً رک جاؤ۔ میں سب ٹھیک کر
ہاں گا۔“

شہیاد خان بہت تہیہ تو ان میں شکستہ لہجہ میں
بولے۔ ”وہ کچھ دبا غماخہ ان کی تمام ذرا تاہاں سلب ہو
گئی تھیں۔“ گھر جس مضبوطی سے ہول رہتے تھے
جس مضبوطی سے انہوں نے محو فائدہ فن
پلٹ کی تھی اور پھر جس امید کے ساتھ یہی ائے تھے
سب بچہ ایک لخت ہی تاملہ ہی کی وجہ سے ہلاک ہوا
تھا۔ سکندر کو جلدی کی جہاز کی کراؤ کچھ کر جیت فن کے
اندرا مارا یا سید جس دم پڑنے لگی تھیں۔

”اس میں ضروری کی بات نہ ہو، نوزک ہو جائے۔“
سکندر اسی غیر مذہبی انداز میں ہلا تھا۔ جیسے شہیاد

خانوہر جس نے انہوں نے اس نے بڑے ہول کی
بڑا تھا اور وہ جواب میں خاموشی سے صرف خود کو بھانا
پڑا اس نے بڑے میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا تھا۔
”تمہارا انتخاب درست نہیں ہے۔ وہی آگے
موتیں تھیں۔ موت کسی بھی طرح خاتمہ ہے
لیے سب نہیں ہے۔“

بہائی کی محبت، بھائی میں نہیں اور جواب میں
اس کی نفرت سے پھٹا رہی، ذرا زینہ۔

شہیاد خان لخت میں باقی ہو رہے تھے۔ انہوں
نے سزا اسے عجیب سے نہ کہا۔
”کچھ ہوا زینہ، جلدی تو۔“

باب کے کنارے پر ہوا تھا۔ وہ فوراً ”نیزنی سے چلا
فن کے چپے لخت میں، تمہارا لخت سے نکلی کر رہا
دونوں سکندر کے کمرے کی طرف رہے رہے تھے۔ وہ
سکندر سے موافق تھا تمام ہنر تھا۔ مگر کبھی مانگے گئے؟
کسی کی پوری زندگی بڑا کر رہا اور پھر معافی مانگے ہو۔ کہا
آغا ان کی معافی سکندر کو اس کی زندگی کے گزیرے
جس زینہ بارہ سال لوٹا سکتی ہے۔ وہ اس کے خواب
لوٹا سکتی ہے؟ کرتی اس کی معافی کھڑے لختوں کے ہوا
کہ کچھ بھی نہیں ہوگی۔

سکندر نے دستک پر دو اشارہ کھولا۔

وہ اسے شمار خان کے ساتھ وہی دیکھ کر جبراً
نہیں برا تھا اس نے سنجیدگی سے ان دونوں کو اندر
لے کر استوائ اس کا چہرہ سب سے ناز اور سرور سا تھا
”یہ خوش ہوئے، تمہیں ہر گز نہیں ہونے با کسی
بھی طرح کے جذبات کو محسوس کرنا ہی بسمل پر کا تھا۔
زینہ شہیاد اس کے پاس آگیا، جبراً نہیں تھا۔
زینہ شہیاد ساری زندگی اس کے پاس نہ آتا۔ اسے ہم
نہیں۔“

”اندرا اس نے ہی زینہ کا ہل چوک سے دیکھا۔
پھر سکندر کا موت کبھی رکھا تھا کہ لوگ وہ اس کے
ہوتے اور دیکھ رہا تھا وہی کچھ اگرا گیا، ان لوگوں
نے اسے سے قبل باہر بھاگنا۔ کا کام کر رہا تھا۔ اس نے

مکھڑا پس آتا تھا۔

”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں! تمہیں کسی کو بھی داپس لینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ صفائی دے کر لاسا ساتھ اور دھواؤں میں کر کے لی محبت مجھے ہرگز نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں سے میری درخواست ہے کہ مجھ کو مت چھوڑو۔“

ابھی سختی ”ابھا! اچھا! کن انداز! ابھا! اہل لہجہ تھا مکھڑو! مگر! انہوں نے شہسوار خان بھی اسے سبھالے یا توئی کرنے کی ہمت نہیں کرائے۔ نہ وہیں مزید رکنا اور کچھ بھی کھانا سنا۔ بے سوچے مکھڑو ان سب سے اتنی لاو کی پر جا چکا تھا کہ ان کی کواڑیں اس کے کانوں تک نہ نہواں۔ سچ رہی تھیں۔ قبول کر رہی تھیں۔ اسے سبھی تھیں۔ وہ مکھڑو سے بات کر سکتے ہیں اسے چھو سکتے ہیں اسے دیکھ سکتے ہیں۔ مگر وہ اس کے پاس نہیں جا سکتے۔ وہ ان کے پاس ہونے، انے بھی ان کے پاس نہ تھا۔ وہ مہذبوں، شرمندہ گیل اور نہ انہوں کے اظہار سے بہت پرے جا رہا تھا۔

اس نے اور چائے میں جلدی نہ کی تھی۔ انہوں نے اس تک انے میں بہت پر گروی تھی۔ مگر وہی دور کہ اب ”اسے دل کے دردانے کسی کے لیے بھی کچھ نہ کوئی تھا۔ میں غلہ بہت باپوس بہت ناہم بہت مل شکستہ باپ بٹا گھر لوٹ آئے۔“



مکھڑا پس آئے ہی انہوں کی حالت دیکھ کر ان دونوں کے اوسان خفا ہو گئے۔ وہ بظہر ہوش! وہ اس سے بیگانہ پڑی تھیں۔ فوراً انہیں ”اس میں لاسے کے نشون کر دی گئی۔“

”مکھڑو! جمالی کو پکارے جاؤں تھیں اسو جان۔“ سبھی آپ کو لوہوڑوں کو آواز میں سے دہی تھیں کہ مکھڑو کو پاپس لے آؤ۔ ان کو پاپس لے پاپس لے ہی بے ہوش ہو گئیں۔“

مکھڑا کی کھڑکی کی لہریاں میں کوئی نہ تھا۔ وہی تھی۔ اس نے لاڈلہ کو لڑکھوڑا کر لیا۔ کہنے لگا۔ پاپس لے سے

مکھڑو کے سامنے کھڑا ڈارہ ڈالو۔ وہاں تھا۔ شہسوار خان۔ وہ ان کے نزدیک کھڑے تھے۔ مگر وہیں سے ان میں کچھ بھی نہ لے کی شکستہ ہو۔

”کیا بچپن ہے؟“ اس نے روئے ہوئے مکھڑو سے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہ درہنہ تھی۔ نہ غصہ اور نہ ہی غم۔ اس کی آنکھیں غلہ آئے تھیں۔

”بچی! مکھڑو! تم کو محاف کرو! مکھڑو! ساری زندگی تم سے مقابلہ کرنے کے سوا میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرے حقد نے تم سے تمہارا سب کچھ جین لیا۔ تمہارے خولب ”تمہاری خوشیوں“ تمہارا مگر ”تمہارا غم۔“

”تمہیں مجھ سے محاف ہانکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کن سے بھی بارہنہ نہیں ہوں۔ جو کچھ ہوا۔“

”بچہ! تم سے ہوا۔“ ان سب سے اسنے قاصدے پر جا چکا تھا کہ وہ اس کی محاف بھی نہ کوئی نہیں تھا۔ نہ جہان نہ ہوا تھا۔ نہ اس کی آنکھوں میں بھی فانی تھی نہ ہوا تھا۔ نہ لہجہ نہ باپوس نہ ہوا تھا۔ اس بہت قاصدے کے دوئے سیات سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ اس کی کھائی میں تھا۔ ایک انجان شخص تھا جس کے ساتھ ہوا تھی۔ ظاہر کرنا افسوس کرنا جذباتی ہونا مکھڑو سکھڑا رہتے نہیں کر رہا تھا۔

شہسوار خان کی آنکھوں میں بے بسی اور اشک تھے۔ وہ بھی اس کی طرف سے بھی اور کچھ سے مکھڑو کو لوہو سے صدیوں کے قاصدے پر کھڑا کچھ دے تھے۔ اس نے انہیں سے اپنی آنکھوں سے ہٹے آنسو صاف کیے۔

”بچہ! کو ہمارا کرا اور سبھلگی سے بولا۔“

”تمہاری زندگی میں سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔“ مکھڑو اشک میں لب لباب کچھ برا نہیں ہونے لگا۔ ”میں لڑا! اور اس میں لڑا! مکھڑو!“

مکھڑو کے غم سے آواز اٹھانے اس کے آنسوؤں کو ٹپک رہا تھا۔ وہ اس کا لہجہ دہرا ہوا ضرور تھا۔ مکھڑو کے بے مار چہرے پر یکدم ہی بہت سختی اور

بھی زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی حالت کچھ کر اس کا خود کو
کوئیٹ مارنے کو ہی جا، وہ اٹھا۔ میں کو بار بار سولہ بعد
اس کا چھڑنا: داجنار ایس، ٹافا اور داس سے بھر کھو
جائے ولانا تھا۔ زاکیر آکر باج کاٹا۔ آندہ اب ہوش میں
تھیں۔ نمبر پڑ بھی کچھ کم نہ ہو گیا تھا، مگر وہ مسلسل دھن
جس میں دھن کی کے ہو، مہمانے سے چپ نہیں ہو رہی
تھیں۔

وہ ابھی اپنے اس بھائی سے مل کر آتا تھا جس کی
زندگی اس نے جلد ہی سچی۔ وہ اب اپنی بھئی کو کچھ دیا تھا
جس کے دل کو زخم اس نے ٹکائے تھے۔ مگر کہا وہ کیا
بجزم ہے سکندر کو اور اسو جہاں کا لڑکے بد کردار لڑکی بھی تو
اس کے بھائی اور میں باپ کی بجزم تے۔ اس کے اندر
ایک خون سا بھرنے لگا۔ اس کے بھائی اور اس کی اس
حالت کی ذرہ و ذرہ لڑکی بھی زب سے بدلتی ہوئی مانی کو
دیکھا، بیکہ مہی، جنھن سے انداز میں کرے سے نکلا۔
وہ لاڈلے میں سوار خان کے پاس جا رہا تھا۔
شمار خان کو کوہ اور نعل گھرے سے چلے گئے۔
یوں جیسے آندہ کا زب زب کر رہا ان سے نہ کہا نہیں
بار بار تھا۔



وہ لاڈلے میں بھی نہیں گھر واپس آئے کے بعد
سے وہ اسی طرح بھی تھی۔ ہاتھ بھی گھر میں ہی موجود
تھا مگر اس کی اس سے لڑات تھیں ہوتی تھیں۔ وہ
کرے میں غلامانہ نے اسے بتایا تھا کہ ہاتھ نے
اس سے اپنی منگو کاٹا تھا۔ ہاتھ کی گول کھا کر سو گیا ہے
اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ اسے فی الحال ہاتھ کا
بالکل بھی خیال نہیں آتا تھا۔ وہ کرے میں لباس
تبدیل کرنے لگی تھی وہ اس نے ہاتھ کو بھی بندھوا لیا تھا۔
اس وقت اسے لیزا اور سکندر کا بھی خیال نہیں آ رہا
تھا۔ ہاتھ سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ حقیقت اسے
اس وقت کوئی بھی بات نہیں غلامانہ لے لیا تھا۔
وہ مسلسل اپنے آپ کو سوچ رہی تھی۔ کیا اس سے
اداس ہو گئے ہیں۔ نہ کہا کرے۔ آخر وہ کہا کرے۔

اس نے اپنے جین پر کر سرو نوں میں غصوں میں تھا اس کا
میں کہہ چکا تھا۔ انیس سب کچھ شریک سے بنا تھا۔
اس کی ہر بات جانتے تھے۔ اس کے دل کی ہر بات
اور بے لٹی بھر رہی تھی۔

ذہن نہیں لیا اسے چھوڑیں گے غور نہیں۔
بھی بوجھنی تھا ہو گئے ہیں۔ باب واقعی طور پر تھا
جاس میں فکر اولاد کو پھوڑا کھول دینے میں نہ لگا
اسے اپنی اہم مریم کو کبھی چھوڑ دین نہیں سکے۔ وہ ان
سے معاملے مانے کی۔ وہ پایا کے پاؤں پکڑ لے گی۔
انہیں منانے کی۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی
مانگ لے گی۔ جس وقت ان سے وہ غلامانہ
ہو نہیں تو بہت معمولی تھی۔ پھر ان وقت لیا اس نے
بہت دور ایک دورے ملک میں رہتے تھے۔ کتے کچھ
اور غلط سمجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پایا کا دل خوش
کرنے کے لیے ہی لیزا سے بھی معاملے مانگ لے گی۔

پایا کا دل خوش کرنے کے لیے اب کی بار وہ خود کو
واقعی مندر مل کر لے گی۔ وہ پوری دنگواری سے ہاتھ کی
در جانے کی۔ وہ کب جلد سے جلد ملنے کی کو شش
کرے گی۔

پایا جب اپنے نواسے یا فراسی کو گھر میں لیس کے ذرا
کا دل خوش ہو رہی اس کے لیے بھی گداز ہو جائے گا۔
بھی اب اسے جلد سے جلد ملے ہیں۔ جابجا ہے مگر پایا
کا دل اس کے لیے پھر سے نرم ہو جائے اور ہاتھ کے
دل میں بھی اگر قریح کی باتوں سے کچھ بدگلی آئی ہے۔
اسے اپنے بچے کی مانی بنے و کچھ کردہ اسی طرح اس کا
دروازہ ہے جیسے ابھی ہے وہ سب ٹھیک کہنے کی
وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گی۔ وہ مرنے رہے مرنے
دے ہیں۔ نہ کہا باب تھوڑا ہی بلبا کرنے ہیں۔ پایا آکر
سب جانتے بھی ہیں تو کہا ہوا۔ وہ پھر سے کچھ وہ سب
وہ ہر قسم کے بھی نہیں۔ وہ اسے اس کی گھر کر مہی
منجہ لیا و کبھی کہنے اسے اپنے شوہر کو دینے کے
ماتھ ہسی خوشی ہوتے و کبھی کے خوساری یا راضی اور
کدو رستل سے مٹا دیں گے۔

”بیگم صاحبہ! آپ سے کوئی صاحب ملے آئے

"کیا اس بند کو میرا کم از کم میرے ماننے اب پادشاهی کا راجہ مت کر۔ میں تمہاری ساری حیا جانتا ہوں۔ شرم آتی ہے مجھے خود پر کہ تم بھی بن لوگی سے میں نے محبت کی تھی اور اس محبت کو لب تکسل سے نکالے جھٹاٹنا۔ سکندر تھک گیا تھا تم طواغوتوں سے بھی بدتر ہو۔ ان کا بھی شاید کوئی نمودار ہونا ہو گا۔ نمودار تو کوئی کرنا ہے۔"

"شہت لب زین لعل شہت لب۔ میرے ہی گھر پر گھرے ہو کر مجھے کیا لیاں دینے والے تم ہو گے کوئن ہو؟" سخت لب و لہجہ میں اس نے زین کی بات کائی۔

"میں کون ہوں؟ کیا تم نہیں جانتی؟ میں کون ہوں؟ میں "داحق ہوں" مجھے تم نے محبت کا نام لے لے کر نوب بے خوف بتایا۔ جس نے تمہاری محبت میں پاگل ہو کر اپنے سگے بھائی سے قطع قتل کر لیا۔ جو رنڈا اور بد محبت گھرے والی جوی کے ہونے ہوئے کج تک تمہیں ہار کا رہا تھا۔"

"میں نے نہیں کہا تھا کہ نہایت بھائی کو جھوڑا نہ ہی میں نے نہایت یہ فرائض کی تھی کہ میری محبت کو دل سے نکالے رکھا۔" وہ استہزائے انداز میں جس کر بولے۔ اس نے زین بھی احمق ہی تھا۔

"میں تمہاری ساری حیا کی جانچوں، تمہیں کیا اس بات سے کوئی فتنہ پڑا ہے یا تمہاری بیخ اور بے شرم ہو کر؟"

"زین شہزادہ انم میرے لیے نہ توکل اسنے اہم ہے کہ میں تمہیں سوجھی تھی ہی فرج مجھے اس بات سے کوئی فتنہ پڑا ہے کہ تم سب مجھ جانتے ہو۔" وہ مستحضرانہ انداز میں مسکرائی۔ وہ بے غلی سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں رلاں کر رہی تھیں۔

"تمہیں کوئی فتنہ پڑا بھی نہیں چاہیے ام سوجھی ہو لوگی اپنی بیوی کا گھر اجاڑ سکتی ہے کہ بے سوتیلے باپ کے ساتھ ڈنگ کی جوت پڑ جائے تعلقات قائم نہ کر سکتی ہے اس کا بچہ اپنی کونج میں بال سکتی ہے لے پتہ باپ سے

نہ۔" اس کے لازم کے لئے اگر اظہار دی۔ نہ اپنے باپوں سے چھ گئی۔

"کون ہے؟ تم نے نام نہیں پوچھا؟" گھڑی کی لمب دیکھنے ہوئے اس نے تعجب سے پوچھا۔ رات نے جوئے کی رائیخ کر ہے تھے اس وقت کون آیا تھا؟ "زین شہزادہ نام بتا رہے ہیں۔"

"زین شہزادہ؟" بڑی غصہ جھڑپ ہوئی۔ اگر آج اسکندر شہزادہ سے لیزا کے ہونے والے شوہر کے رپ میں نہ لی ہوئی تو اس وقت اسے سوچنا پڑتا کہ کون زین شہزادہ؟ مگر اب اسے معلوم تھا کہ یہ کون تھا

"افسوس! اگر ایک دم میں تھا تو میں آتی ہوں۔" لایزم سہلا ناواں سے جلا گیا۔ پتا نہیں تو کیوں کیا نہ آیا تھا۔ سہرا لی اسے زین سے کسی بھی طرح کا کوئی ڈر یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی حیرت یا حیرت محسوس کیے ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی۔

وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ جیسے اس کے فٹے کا بے بیتی سے ارتکاز کر رہا تھا۔ باہر صلی بند سارناہ رہا تھا۔ نہ وہ انہیں۔ سہرا کا کم عزرا کا تھا۔ اب انہیں صلی کا تھا۔

"کب سے یہ زین؟" اندر آنے کے بعد اس نے پرسوں سے انداز میں کہا۔

"بھجوا" وہ مسکرا کر بولی۔ زین اسے خفی لگا ہوں سے گھر رہا تھا۔

"سکندر میں جتنے نہیں ہے۔ پوچھنے آیا ہوں کہ نولہریت پالا کے گھر پر آنے اور شہزادہ ہوا تو تم نے کیوں کہا تھا؟" ایک بار سکندر کی زندگی اجاڑ دی تھی کہ وہ کلن نہیں تھا نہ رہے لے؟" وہ غصے بولا۔

"میں نے کسی کی زندگی نہیں اجاڑی۔ نہ ہاوسے جانی نے جو کہ باد سالی میں میرے ساتھ کہا تھا میں نے سب کے سامنے بیان کیا ہے۔" وہ تڑپ کر رہے گئے ہو کر رہی۔

ساری عمر حبس بول گئی ہے یعنی بہن کی غائبیوں کو اجاڑ سکتی ہے۔ اسے بہن سزاؤ کو دھوکا دے تو اس کی بھی ٹرمنٹ کی نہیں ہوئی چاہے ہے۔ اسے زبان سے نکلتی کرنے کے بعد اس کے بے ایمانی کے ساتھ دہشتہ اسرار کرنے کی کوشش کرنے ہوئے بھی کوئی لگایا ہوا نہیں ہوئی چاہے ہے۔ جو لڑکی اپنے ماں باپ اور بہن کی خوشیوں کو بے لگائی ہے اس کے لیے کسی کی بھی زد کی جا کرنا۔ ہمیں اپنی بہن چاہیے۔" اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھا ہوا بہن کی سے بول رہا تھا۔

ابکہ یہی اس نے دیکھا کہ بہن اور انکسٹم کے دروازے کی طرف کسی کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کی اس طرف جھٹ گئی۔ وہ بے اعتبار مڑی۔

درا انکسٹم کے دروازے پر ہاتھ کڑا تھا۔ ہاتھ؟ بہن؟ تو سب کچھ بدلے کر سوچا تھا۔ وہ خود کمرے میں پرک کر آئی تھی۔ وہ بے خبر رہا تھا۔ سب کچھ پلڑے کے بعد نوں اعلیٰ صبح سے پہلے بیدار نہیں ہوا کرتا تھا۔

"ہاتھ؟ اس کے لیوں سے بے فواید نکلا۔

بیویوں کے بچے نہ نکل سکتا تھا وہ آپ نے اسے زندہ کیا۔ لیکن اس نے سمجھ میں آنا تھا۔

"ہاتھ؟ سکندر کا چہرہ ابھی بے بسیا۔ ان کے ساتھ میٹھ مکھی کو لائی تھی۔ جب میں امریکا میں گر بیج ہو کر دی تھی۔" اس نے شہو کر لگے ہوئے چادر سے کہا۔ بوکھا ہٹ میں اس کی کچھ مجھ میں نہیں اور بھانگا اور کیا ہو۔

زین اور ہاتھ انکسٹم کے نوں پر کچھ رہے تھے۔ ہاتھ کے چہرے پر کوئی بھی مار پڑا نہیں یا وہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

"نئے قہر تل لڑ خوش ہوئی جیسا دواچی جملہ نہیں بول سکوں مجھ ہاتھ صوبہ ابونک مجھے قہر سے تل کر۔۔۔ ہندوستان وہی ہے۔ کپ پر جس اربا ہے میں نے انہی لڑکی کی محبت میں بے خوف بہن کر اس سے صرف سنی ہوئی تھی آپ نے نوں بے وفائی

کیا حد کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی بگاڑ رکھا ہوا ہے۔ قہر کو سزاؤ کھوں با انا عارفہ جو قہر نے ایک کر اور عورت کو گھریں بسا کھات؟ بہن ماں اس کی ہوں۔ میں بسلی اسے صرف بہن وارنگ و سبے قابل کتہ لیب کی بارہ میرے بھائی کی خوشیوں کے واسطے میں آئی ہوں۔ نے سکندر کو لڑ لڑ کی سزا دی کہ اس کی کوشش کی تو میں اسے چلے سے مار ڈال گا ہوں۔ میں اس سے سکندر کو زندہ کر ہوا میں نے دل کا۔" زین اسے نفرت کو در قہار سے کہہ رہا تھا۔ وہ سب کہنے لگی والیں گھو ما اور وہ بہن نیز قہار سے اور انکسٹم سے چلا گیا۔ اس نے بوکھا کر ہاتھ کی طرف بکھا۔

"ہاتھ؟ یہ کیوں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے مکانی تو دی تھی۔ اس بات کی جلیں اور قہر نکالے کو۔ میں آیا تھا تاکہ خدا واطل مجھ سے خراب کر دے۔"

وہ تیزی سے۔۔۔ ہاتھ کے ہاتھ قہار اس نے ہاتھ کے ہاتھ کے لڑ رہا تھا رکھا۔ وہ کوشش کر کے متکرائی۔ ہر زنی الٹ دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں اور ہاتھ کی کیا کرے۔

ہاتھ نے بغیر کچھ کہے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر۔ ہاتھ اٹھا۔ چلی گئی کے ساتھ۔ اور بغیر کچھ بھی کے ذرا انکسٹم سے جلنے لگا۔

"ہاتھ؟ میرا بات منو۔ تم اس باجلیں فری قہار سے ہم زندہ میں ہوئی ہوتے اور اعتبار کر کے میرا نہیں؟ زین مجھ سے جل گیا ہے ہاتھ اور میری خوش گوار منتقلی شدہ زندگی کو کچھ کچھ جلس ہو گیا ہے۔" وں دواچی ہوئی ہاتھ کے بچے اور انکسٹم سے نکلی۔

ہاتھ نے دیکھ کر ابک نظر اسے دیکھا۔ اس کی سخت اور سو نکا ہیں اسے یہ وارنگ وٹ رہی تھیں کہ خیر اور میرے پیچھے مزید ایک قدم بھی مت آنا۔" ٹھیک کر غور کرانی جگہ پر دیکھ گئی ہاتھ خیر سے سزا واطل ہاتھ رہا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے اپنے

ہے۔ بخیر! اس طرح کا بہت فرض سنبھالنے سے ہم فرس
چکا۔ ایک بار تو ہم مریخ کے پاس جانا ہی ہو گا۔
کہاں لپٹے بیانی کی زندگی کی برائی کا انتہائی کی
موجودہ حالت کا اپنے گھر کے بھرے شہر اترے کا
اپنے گھر سے دو غمی خوشیوں کا امن ملے سے کسی ایک
بھی چیز کا اس بد کردار لڑکی سے حساب نہیں ہائے!
اس کا اہل اور دو ٹوک انداز رکھ کر شہر انہیں نے
اپنے کسی کاروباری دوست سے ہاشم اسد کا پالے کر
اسے دیا تھا۔

وہ اس کے پیچھے پوچھنے تک آئے تھے اسے بہ
سمجھائے کہ وہ خن میں ڈاکر کی ملاقات نہ نہ لوائے۔
"اب گھر مت کریں یا! اندھنگی میں دلی بار میں
درست کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں وہ کرداں اول تو اب
کے بنے اور سکندر کے بیانی کو کرنا چاہیے۔ اس نے
ان سے سجدہ کی سے کہا اور گھر سے نکل گیا تھا۔
اور اب جبکہ وہ مریخ سے مل آیا تھا۔ اسے بے
عزت بھی کہا تھا اسے صحتا ابھی بھائی اس کے گھر
سے نکلنے کے بعد اس کے گھر کی جب حالت تھی۔
اس کے گھر پر اسے سائے گھراؤ کچھ کر اس کے اندر
ام مریخ کے لیے نگرانی ہی فرض تھی جس سے اسے خفی
لگاؤ اس سے دیکھا رہا تھا۔ اس نے اس کا واس
ہان سے ماہ دالے مریخ۔ اس نے کافی ایک
مرکز کے کھلے ہوئے ہوئے۔

بازو ملے اس نے ان لڑکی سے دالانہ محبت
کی تھی۔ کچھ اہل برسوں سے وہ اس کی محبت کی
نہاں خانوں میں جھپٹے پھا تھا۔ مگر اس سے مل کر
ابھی ابھی اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ ام مریخ نے
اس سے بھی ایک لمحے کے لیے بھی محبت نہیں کی تھی
وہ اسے روکا دینے پر ذرا بھی شرمسار نہ تھی۔ اپنی
محبت کی اس نذیل اور رسوائی پر اس کا دوسرے کوئی چلہ
رہا تھا۔

اس کے بچے اور کمرے جزیروں کا اس لڑکی نے
کس بے رحمی سے نڈان الیا تھا۔ ام مریخ اس کی
محبت کیا اس کی غرت کے بھی لائن نہیں تھی۔

ہے میں جا رہا تھا۔
ہیں گے اتنے پر کور ہوا ہوں پر پھنسے آہل غلام
اس کے پاس اور اب ہاشم۔ ایک ہی دن اس سے کہا ہو گیا
ہندو میں پہلی بار وہ خود کو بندھائی میں کفر محسوس کر
ہندو میں پہلی بار اسات ہو جانے کا خوف لاحق
ہندو کی میں پہلی بار اسے سب کچھ ہار جانے کا اندیشہ
ہندو اور اسات۔



وہ مریخ کے گھر سے نکل گیا فوراً ہی وہ گاڑی میں
بیٹا اور گاڑی اشارت کر دیا۔ اس نے ایک جھٹی سی
تجلیت میں "EG" مریخ کے گھر کے کاتب لکھا تھا۔
سکندر سب کچھ چھوڑ کر وہاں جا رہا ہے اس کی
دل سے ہاتھ دیکھ کر مزید مزید کر رہی ہے اور جو
وہ سے فرج کے اس سارے دلفنہ اور سارے ہنگامے
کی دوسروں سے اپنے گھر میں پہنچی ہے۔
اسے سکندر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک کرنا ہے
مگر اس سے بھی پہلے مریخ سے حساب صحت کرنا ہے۔
اسے وہ دیکھ کر رہی ہے کہ اب وہ سکندر کی زندگی میں
نئی اس کی خوشیوں کے راستے میں نئی فوج اسے
چھوڑے گا۔ مریخ اس نے اسی وقت شہر بار خان سے
مریخ کے گھر کے گھر کا چٹا معلوم کیا تھا۔ وہ مریخ کے
شہر کو سرسری سنا جانتے تھے۔ گھر کا چان کے پاس
نہیں تھا۔ وہ اسے کہیں سے بھی پتا معلوم کر کے دے
سکتے تھے مگر اس کی آنکھوں میں پھیلا جنون دیکھ کر
تجسس ہوتا ہے کہ وہ مریخ سے نہ ملے۔

"چھوڑو ام مریخ کو اس کے مل پر زمین اب اس
نے پس ہائے اسے کچھ کہنے سننے کا کیا فائدہ ہے۔"
نسل نے دیکھ بھری تھا اس سے کہا تھا۔
"یا! ایس اسے چھوڑو! معاف بھی کر دیتا اگر
بات صرف میری ذات کی اور۔" سکندر کا بہت فرض

اس کی اپنی انمول چاہتیں اور محبتیں پانے کی مستحق ہیں نہیں تھی۔

اس سکھنے کے کہیں بہت اندر ایک دودھ بھیل رہا تھا۔ محبت کی وصالی محبت کی نوہن پر محبت کے جھوٹا ہونے پر اور محبت کے قریب بھی دل میں سوچنے والے پر بائیں بوجھ تھا۔ اس پر کمر اور دھولائی لڑکی سے قریب بھی محبت کرنا تھا۔ اس محبت پر وہ خود سے بھی شرمسار تھا، خفا تھا، غور سے دل سے ٹھٹھکیں سناتا تھا۔ وہ لب بانی مادی عمر ہم مریم سے نفرت کرے گا ایسا نفرت جس کے اندر درد، ذلت، ملامتیں اور کرب شامل ہو جو۔

ام مریم نے محبت کا نام لے کر اس کے ساتھ کھلا غنا، غم، غصہ، نفرت میں اس سے محبت کرنا تھا۔ جب محبت اتنی بھی تھی تو دل سے یہ کھر نکلی کہنی نہیں۔ اسے اپنے اور مریم کے پاس انجیل جس میں کزرت دلت کے مختلف مناظر اور آیتیں تھیں۔ اس کی وہ محبت و ساتھ کہ بائیں کہ اس کے جوت تھا؟ کہا ام مریم نے یہ بھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے محبت نہیں کی تھی؟ اس سوالی کو تسلیم کرنا اسے بہت مشکل لگا رہا تھا۔

وہ تو قریب بھی اس کی بے خوف اور احمق تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اسے دل سے اس لڑکی کی محبت نکال کر پھینک نہیں سکتا تھا۔ وہ دنیا کے سامنے ام مریم کے سامنے تھی مگر نفرت کا لالچاں کرے گا۔ مگر دل کے اندر اسے اسے بھی یہی نہیں سکے گا۔

اسے کافی اس طرح سڑک کے کنارے روکے کھنکھرتی ہوئی تھی۔ بجائے کسی چیز کی آواز سے وہ چونکا تھا۔ شاید کوئی ڈوٹری اس کی گاڑی کے پاس سے گزرتی تھی۔ وہ ایک دھڑکنے پر کمر بند تھا ہوا۔ اسے سکندر کا لڑائی باں کا خیال آیا تھا۔

قریب کی دلت محبت کا سونگ مٹانے کی دلت تو نہ تھی۔ آج کی دلت تو بہت اہم تھی۔ آج دلت بھر میں اسے سب کچھ ٹھیک کر دینا تھا، تاکہ کل صبح سکندر واپس نہ جائے۔ سکندر دل میں اس سے کسی کے بھی

دوست سے نہیں رہ سکتا تھا، گمراہی کے دوست سے نہ کہنے سے نہ کہیں؟

گمراہی کے لئے اوتے وہ یہی سوچ کر آیا تھا کہ پورا مریم کے گھر جانے کا اور پھر لڑکا سے ملے گا۔ اس کے وقت کی دلت نہیں کی تھی۔ اس نے کافی ٹھوڑی دلت کے گھر جانے والے دوست پر زور دیا۔

رات کے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ہر سو خاموشی اور بچا ہوا ہوا تھا۔ وہ کرتے میں اسی طرح اسی انداز میں گمراہی تھی۔ محمود خالد اور مریم کے جانے کے بعد سے اس نے اپنا بیٹھنے کا انداز تک تبدیل نہیں کیا تھا۔

اس نے ابھی تک وہی لباس پہنا ہوا تھا۔ نو سکندر اور اس کی اسوجان کی آمد کے وقت پہن رکھا تھا۔ وہی میک اپ، وہی جوڑی۔ لڑکی میں کدو کی لہیرا ٹوٹنا کیا تھا جس نے اس کے حواس کھم کھم کر دیے تھے۔ اس نے سیم کی نفرت کے سوا اپنی ہر بات بھلا دی تھی۔

وہ ذرا ذرا سے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ سیم اس سے نفرت کرتی ہے۔ اپنی کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ سکندر بھی نہیں آئے تھے۔ ابھی نہیں۔ سیم نے آج اپنے لور سکندر کے گھر کے حوالے سے جو کچھ کہا وہ اس پر بھی کچھ نہیں سوچا۔

جب ڈرائنگ روم میں سب کے سامنے سیم نے سکندر پر الزامات لگائے تب وہ حیرت میں رہ گیا ہوا تھا۔ وہ فوری طور پر اس صورت حال اور ان تمام باتوں کو بالکل بھی سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اس لئے سمجھ میں آیا تھا کہ سیم لور سکندر ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے اور اس میں جس بھی حوالے سے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے، حق ایک دوسرے سے شہ بہ نفرت کرتے تھے۔

اس وقت صورت حال ایک دم ہی ایسی عجیب

باب کو سزا دینے کے لیے گنتہ دینے کے لیے لن سے لی جگہ نہیں تھی۔

”بنا! اگر مجھ سے ذہنی اور جذباتی طور پر بہت دور نہیں۔ تم میری سب سے قریب شخص۔ تم لوڑ اور میں نے کہا تھا تمہیں خود سے۔ عمل طور پر دور مریم نے کر دیا۔ تم ان پر انہیں بند کر کے انتشار کینی تھیں۔ تم مجھ سے اس حد تک متفرق تھیں کہ اگر میں بھی تمہیں نکال دیتا تو کوئی خوش حال نہ ہو۔ تم مجھ سے لڑ رہی تھیں۔ پچھلے سالوں سے تم سے محض خون کی حد تک میرا رابطہ تھا۔ وہ خون کا زجر میں کرنا تھا اور تم انہیں بے زلوی سے دیکھ کر تھیں۔ تم مختصر اور اکھڑی اکھڑی بات کرتی تھیں۔ تم عمل طور پر مریم کے ذریعہ تھیں۔ تمہیں مریم کے متعلق کچھ بھی بتانے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا تمہارا اعتبار تھا۔ تم مجھ پر اعتماد اور اعتبار کرتی تھیں سب اسی نوعیت کی باتیں سنیں۔ اب تو بولے اوتے دل کو بہت تشنگین ہوئی ہے۔ مریم نے تمہارا دل اور ذہن میرے خلاف اس حد تک کر رکھا تھا کہ برا بھی غلطہ خصوصاً جو اٹھا کہ تمہیں اس کے کہنے میں اگر صرف مجھے تشنگین پہچانے کے لیے تم کسی مثال آدمی سے شادی نہ کرو۔ ذرا سوچو کلام! اگر تمہارے باطن میں میرے پاس لٹنے سے پہلے میں تمہیں فون کر کے کہوں گا میں بتاؤں کہ آج میں نے تمہیں تو تب کہا تم میرا نہیں کرتی تھیں؟ تم میری سوجھیں کہ ان باتوں کے پیچھے میری کوئی سازش ہے۔ میں تمہارا دل بہنوں کو دور کر دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابی بے مری کہا کہوں فکر مریم کا ساڑھی ذہن بہت خطرناک منصوبہ ساز ہے جس شخص میں کے خطرناک عزائم ہے چنانچہ پتا تھا۔ شمع اپنی فکر نہیں تھی۔ مگر تمہارے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ اگرچہ تمہاری زندگی برباد کر رہے تھے۔ تم سے ملنے نہ کر لی اور تم اسے اپنا سب سے چار شہنشاہ اور عزیز از جان بہن سمجھتے ہوئے عمل طور پر اس کے ذریعہ اثر و کج پکارا۔ اب تم نے مجھے کوئی مہم پر نہ کر رکھا تھا۔ یہ وہ کہنی دن ہے۔ تم

کتیں ملن ہے۔ کہنی رات سے۔ تم کہیں رات سے لیجے میں میں کوئی لائن کٹ اور مٹا دیتا تھا۔ تم سے کہنے کر مکمل طور پر۔

باب کی ہر بات حرف بہ حرف سچ تھی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر آج سہم نے خود اپنے ذہن سے نفرت کا اظہار اور اس کی زندگی کی دلی کی خواہش کا اظہار کیا ہو تو اس کے پانی کی کہاں رہنا کے دوسرے کسی بھی اور فرد کے کہنے پر اس کی خود سے نفرت کا اظہار نہ کرے۔

”مجھے مواظفہ کر دینا! میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔“ اے اعتبار اس کے کہنے سے نکلا۔

صرف دیکھنے والی سہی فون نہیں اس سے پہلے جب وہ لنگ میں ساتھ رہتے تھے تب بھی اس نے ہمیشہ ہر وہ کام کیا تھا جس سے اب نے اسے منع کیا تھا۔ کچھ اور کہا کہ اس کا کلام کلیم نہیں بلکہ محمود تھی۔ اس نے باب کے دل کو بہت تشنگین پہنچی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ محمود غافلے اس کا سرانے کندھے سے لگایا۔

”تمہیں میری جان! تمہیں بچہ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگرچہ برا بھلا نہیں تو تمہارے بچپن میں میں نے خود کو تمہارے ساتھ بہت لا پرواہ بہت خوب مزہ دار رہا ہے۔ اس کے طور پر بتاؤں گا کہ اٹھل میں تمہیں وہ بوجھ اور بار کچھ نہ دے سکا تھا۔ جو میں نے مریم کو دیا تھا۔ تم مجھ سے بوسہ نہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں نے بھی تمہاری پروا نہیں کی تھی۔ ایک شی کو کاکھوں کا مارا یا کر میں نہ سرنی کو معمول فی جیلا تھا۔“

وہ باب کے کندھے پر سر رکھ کر بیٹھ آیا۔ اُسوہا رہی تھی۔ اسے جانتا تھا اس کے باب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے چونک کر اس کے سر پر آنسو گھسے۔

”اگرچہ میں آباہو ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“
”زین؟“ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ زین
”من کے گھر؟“ خیرات گئے؟

وہ ہسپتالی سے ملنے اس اسٹیج پر زمین سے نکلے
فاصلے پر پہنچ گئی۔

زمین اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اس
کے لیے ایک بھلی اور دوست والی محبت لود نری
چمک رہی تھی۔

"جو اثرات مریم قرین علیہ سر سندھو در لگا کر تھی تھی
میں نے ان سب کے مجموعہ ہونے کا اٹل کوٹنا ہے۔
میں جنہیں بھی قنصل سے "سارا رانہ سنانا چاہتا
ہوں۔"

"کیوں کیل زمین؟"

"کہ جسے سکندر کا اعتبار آئے۔ کہ نہ اسے
جنگ جڑنے کی بات سوجھ بھی نہیں۔" وہ اس کی حیرت
کے جواب میں سنجیدگی سے بولا۔

"مگر میں سکندر کو بھڑک رہی ہوں؟" وہ متعجب
سے انداز میں بولا۔

"چھوڑ نہیں رہی مگر میں اس کے پاس بھی نہیں
جھٹکتا لیوانہ تم اس کے پاس نہیں لے اسے نہیں کہا۔
فرے کسی بھی طرح اسے چھین نہیں دلا کہ تم مریم
کا نہیں اس کا اعتبار کرتی ہو۔"

زمین کے لٹاؤں نے اسے پکھنڈ ہی سکندر کے
لے تڑمنا کر با۔ سکندر کہاں تھا؟ "نہجک تو تھا؟ آج
دوسرے کے بعد سے کہ اس وقت پہلی مرتبہ اس نے
مکمل فوج کے ساتھ سکندر کو سوچا۔ زمین بغور اسے
دیکھ رہا تھا۔

"تم تو اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ پھر ہم
لوگوں جیسی کیسے ہو گئیں؟ سکندر سے محبت کی تھی تو
اس کا اعتبار بھی تو کرنا تھا ناں لیزا۔ جو ہم سب نے اس
کے ساتھ کیا ہم فوراً موت گوارا نہیں دے سکتے تھے
نہلہ دھ تھا۔

"مجھے سکندر کا اعتبار ہے زمین! میں اس کا اعتبار
کیوں نہیں کرتی گی؟"

بوسے ہوئے اسے سکندر بڑی حد دل سے یاد آیا۔

مافی در ہو گئی اسے آئے ہوئے کھن رن ہیرا
نہ کے ساتھ گھٹک ہوئی رہی ہے۔ نہت کچھ راسخ ہو
نہاں سے بائیں کر کے نہت ہی ابھی مختصاں سلجھ
نہاں۔ اب وہ جنہیں یاد رہا ہے۔ وہ نہت سے کچھ بات
چھی پائی ہے۔ چکر اس سے مل لو۔ میں نہت گما
نہاں۔ ذکر بہت چاہتا ہے۔ کہ کہ رہا ہے۔ اسے لائن میں
نہاں چالک رہا ہے۔

نہاں کے کہنے پر فوراً سمونے پر اسے اٹھی۔
"نہت" اسے محمود خالد نے پیچھے سے پکارا۔ وہ

نہاں۔
"جو فیملہ بھی کرو سوچ سچ کر کرنا۔" وہ بے حد
نہت۔

"کیوں مافی پلے؟"
"اب لود سکندر کے مستحق کا۔" وہ مگھری نہت
اور اس سکندر کو بھلی رہی تھی۔ اسے ایک مل کے
سے بھی اس کا حین نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کا خیال
رہا کہ یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا کہ وہ اور سکندر
نہاں۔ وہ ہے۔ نہجک ہے محبت اور رشقی پر اس
نہجک حیرت ہوا تھا مگر سکندر کی محبت اس کے دل
سے ہی اب رہا ہے نہت۔

"اب لود سکندر کی بھی سکندر کے ساتھ رہا ہے
نہاں۔ چھی اس کے ساتھ رہا ہے نہت۔"
اس نے باب کے لبوں پر طمانیت اور سرشاری
سے مگھری مسکراہٹ آتے رہی۔ وہ آہستہ آہستہ
سے چھی کرے سے نکلی تھی۔

نہاں جس تکی۔ لائن میں خط ایک۔ لب جس رہا تھا
نہاں کے اسے زمین فوراً غور پر اندھیرے میں نظر
نہاں اس کا غما۔ جب اس مدھم روشنی سے اس کی
نہجک۔ اس نے زمین کو اسے زمین سے لود پر پہنچا
نہاں۔ لائن سے بھی مگھری فوج لود پر جانی

"میں فابو لیزا! اس سے مدھم آواز نہت۔"

وہ کہاں غنا اور خیریت سے مرنے لگا؟ اسے سکندر کی محرومیاں اس کے دکھ اس کے خوف سب بار آئے تھے۔ اس کا ساتھ نہ مل کر رہنے ہوئے کسی نذر و راغنا۔ اس کی محبت چھن جانے کا کیا ایک اٹھانا ماحول سے اپنی اہلیت سے بے رحمتا تھا۔ یہ کھول کو خود بھی سمجھنے لگا تھا۔ وہاں تو اس کے لیے کسی نذر و راغنا۔ زندگی نے اس کے ساتھ کتنے بے باک کھیل کھیلے تھے۔ وہ دشمنوں اور محبتوں سے کسی نذر و خوف پر رہا کرتا تھا۔ ہاتھ دھو کر چپ ہو جاتا تھا۔ غنا جیسے اسے زندگی سے یہ خوف ہو کہ زندگی کو اس کا ہستا گوارا نہ ہوگا۔ زندگی اپنی آکر اس کی مسکن چھین لے گی۔

”تم صاف کہو، نہیں کہنے سکندر شہیار! کہ تم رہتے جاتے ہوئے ڈرتے ہو۔“ اس کے کانوں میں اپنی فیس سے چٹائی آواز گونجی۔

”بلند آہوں۔ بہت زیادہ۔“ رتنے بھائی کی اہستہ لڑچکا ہوں۔ اس کے کانوں میں سکندر کی دھکم بھری آواز گونجی۔

”کہوں خود کو کانٹوں پر محسوس رہی ہو؟ تمہیں میرے ساتھ میں کانٹوں پر بھرتے رہنے کے سوا کچھ نہیں سمجھ لے گا۔“ اس کی ضد سے پارہ استانی سے کہہ رہا تھا۔

”جیسے خود زانٹ ریت لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں ہنسنے پسند کے مطابق خود کو نہیل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنی جگہ سے ہلے نہیں ہوتا۔“ جیسے خود زانٹ ریت لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں ہنسنے پسند کے مطابق خود کو نہیل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنی جگہ سے ہلے نہیں ہوتا۔“

”بلند آہیں کتنی بھاری ہیں۔“ جیسے خود زانٹ ریت لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں ہنسنے پسند کے مطابق خود کو نہیل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنی جگہ سے ہلے نہیں ہوتا۔“

سکندر کو کہہ بھرا کہ اس وقت اسے دلا رہا تھا۔ زمین اس کی خاموشی کو نبھانے لگا۔

سب کچھ گزر رہے اس واقعہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ شب بھائی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی باتیں کھل کر سمجھ رہی تھی۔ اس کے بھی نہیں پڑی تھی۔ اسے نہ سکندر کے خوف نہ شے اندیشہ اور ان کے جواب میں اپنے پیروں پر اتر کر بیٹھ گیا۔

دوسرے اب سکندر کا خیال کیوں نہیں آتا تھا؟ کہاں نہیں جاتی سکندر دشمنوں کا زور سہا رہا؟ اس کے ساتھ رہا نہ رہا اس کے ساتھ دشمنوں کا زور سہا رہا۔

”جسم کو اس کی بہن کے دہم میں رکھ کر جسم کو اس کے زائیں سے لے کر اس کی کباہت ہوئی گی؟“

”کیا وہ شہر نہیں رہا؟ اس کا کہنا اس کے پاس ہے۔“

”سکندر! ہم سب رونا کا کوئی بھی فرد نہیں۔“

”اس کی آنکھوں کے کنارے بہنے لگے۔“

”اب تک اسے سکندر کے کسی دکھ کا خیال نہیں آتا تھا۔“

”سکندر کی زندگی کے ساتھ نہ رہا۔“

”آخر زندگی کو اس پر رحم کیوں نہیں آتا؟“

”عمر بھر کی شائیں اور بکھن کے بعد اسے اس کی محبت ملی۔“

”وہ ابھی ملی بھر کے لیے ہی خوش ہوا تھا کہ“

”کھڑکی کی گد لیزا! اس ام کو تم کی سگی بہن بن کر“

”اس کی زندگی کی پہلی کی زور وار ہے۔ اسے زندگی میں پہلی بار سمجھ کی بہن پر سہم تکی لگا رہی تھی۔“

”پتا نہیں کیوں ایک ذرا سا میرے امیر اور“

”وہ بولے گا۔ جب تک تمہیں سبھا رہا تھا۔ تب تک“

”خود کو بھی سبھا رہا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔“

”اب تمہارے لیے میرا دل خدی ہے کا سا اور“

”اب مجھے اپنی زندگی میں لیزا محمود چاہیے۔“

”اس شخص کو اس نے بے حساب چاہا تھا۔“

میں نے اپنے بھائی سے حسد اور مقابلہ بازی شروع کر دی۔ میں نے جیت نہ پایا اس سے نفرت میں بڑھ گیا اور تم نے اپنی بہن کو خوب سے انکار پر زور دیا۔ صاحب کر لیا کہ زندگی بھر جو کچھ وہ تم سے ملتی رہی منہم آنکھیں بند کر کے گنتی پڑیں۔ وہ تمہیں بڑائی کے دلانے لگے۔ جا بجا جانی بھی مارو تم انہیں بند کر کے اسے برتاؤ نہ کرنا کہ جس کے پیچھے جاتی جا رہی تھیں۔

زین کی باتوں میں کچھ ایسی پٹائی تھی کہ وہ اس کے لفظ توجہ سے سننے پر مجبور ہو جاتی۔ سب کو خود سے پرزہ خور سے ہنسنا اور اطمینان کرنا کہ اس کی ہر بات سنا کر ہی تھی۔ کوئی اسے اس بار حارہ نہ تھا۔

"کاشی! ہمہمذہبوں میں نے اپنے بانی اچھو رہائی اور بہن کے سبب مستعمل ہونے کو بے عمل انداز میں لیا ہو تو آج ہماری زندگی میں بہت مختلف ہو گئی۔" زین کے لیے میں مسکاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ زین کی آنکھوں میں چلے غم کو سمجھ رہی تھی۔ زین کی آنکھیں جو اس سے کہہ رہی تھیں کہ کاش! اس نے اور زین نے وہ نہ کیا ہو۔ بھوانیوں نے کیا۔ کاش! ان دنوں میں نے اپنے برادر کو غیر معمولی بہن بھائی اور بہن کی پرہیزی کو اس انداز میں نہ لیا ہو نا جیسے انہوں نے کیا۔ زین نے سکندر کو اپنا دشمن اور حریف سمجھ لیا اور اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سب سے ریموڈ کر کے پرہیز ڈھال لیا۔ اس پر اس حد تک اٹھ کر کہنے لگی کہ اپنی زندگی کا کوئی لمبا بھی ٹوڈ کر لینے کی طاقت نہ ہونے لگی۔

"میں تم سے بہ سب ان سے کہہ رہا ہوں لیذا کہ میرا اور تمہارا غم اور بچھڑاؤ کسی حد تک ایک جیسے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم میری باتوں کو سمجھ رہی ہو گی۔ میرا بھائی مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے لیذا مجھے میرا بھائی کا جو محو کر دیا ہے اس سے اسے باہر لائیں یا اس میں اسے لانا پڑتا ہوں۔ ان کے طے لگا چاہتا ہوں اس سے بہت پیار کر رہا ہوں اسے یہ مانا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرنا۔ لیذا! پھر میری مدد کرنا۔ جو نے ہونے زین کی کو توڑ بھراؤ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

ہے حساب محبت کی تقی اس سے۔ بھراؤ کہ کچھ ہر کاش! کہ وہ اس کے غم پر رونا پانی نہیں کی آنکھوں سے آنسو گرے گئے۔ زین اسے خود میں کھایا اور نہ بولتا کہ رہا تھا۔ "ہو زلات اپنا شکستہ رونا اور رسم باغی بنا رہا تھا۔

وہ اس سے کہنا پانی تھی کہ وہ اسے کچھ بھی نہ بتائے۔ کچھ بھی جانے بغیر بھی اسے سکندر پر اعتبار

پہنچا ہے لیذا! آج میری آنکھ کے ساتھ بہت دور تک انہیں ہوئی رہیں۔ میں کیا ہوں اس لیے تھا کہ انہیں اور جس سبب کی سبب تھیں انہیں سکندر کی بے گناہی ثابت کر سکتا۔ مگر انہیں نے بے اشتاف کر کے مجھے حیران کر دیا کہ وہ سبب کی تمام زبرد صورت سببوں سے آگاہ ہیں۔"

اس واقعہ کی تفصیلات سننے کے ساتھ ساتھ زین نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس سال اس نے سبب کی باتیں پر اندھا اعتبار اس لیے کر لیا تھا کہ سکندر کے خلاف غبار کراس کے طے میں دوسروں سے جمع ہو رہا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی زہن بھائی سے حسد اور نفرت کا کراٹھا تھا۔ اس وقت بھی سبب اس کی زندگی میں سبب نہیں ملتی تھی۔ اس لیے وہ بے درک ہو گیا۔ وہ بچے سے بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"انکھ نے مجھ سے تمہارے اور میری کے بارے میں بہت سی باتیں سُن کر کی ہیں۔ جس نے ان کی باتوں کو سننے کے بعد تمہارے بارے میں بہت سوچا ہے۔"

وہ زین کی طرف سے ضرور ہی تھی مگر اس کا زہن بھائی سکندر ہی میں الجھا تھا۔

"تم میں اور مجھ میں بڑی عجیب اور حیرت انگیز بات ہے لیذا! تمہاری ایک سال پڑی بہن ہو زندگی۔ ہر میدان میں تم سے آگے تھی۔ اپنی اچھو (high achiever) تھی اور میرا ایک سال بڑا لڑکا جس سے میں زیادہ سے پیچھے تھا۔

تمہارا ہونے ہی نے اپنے اپنے بھائی اور بہن کی اس بڑی کو بڑے عجیب اور ایذا ریل لہذا میں لیا۔

"میں دوس سے کہیں بدگمان ہوں گی؟ میں اپنے ساتھ
اس سے محبت کی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ بیچہ
یا اجڑا ہے۔ بس اس پریشان ہو گئی تھی اور کوئی
تھی مگر سکندر سے ہے انہار فو میں ایک سے کے
لے بھی نہیں ہوئی تھی۔"

زین نگاہوں میں یاد اور احرام لیے اسے روکھا
غدا۔

"سکندر کو روک لولہ! اسے اپنا ساتھ دے۔
اسے اپنا یاد روک، گزرے ملو وصل کی تمام محرومیں
اور فوجیں جاسے۔"
دائیں کی آنکھوں میں سکندر کے لیے محبت و کج رہی
نہی۔



مجھ کے پانچ بچے رہے تھے جب زین کے ساتھ
سکندر کے ہو کر جاری تھی۔ اس کی فلائٹ میں آٹھ
بچے تھے تو ابھی تو وہ نول ہی میں ہو گا۔ کئی لاکھوں
اس کے گھر سے گھاٹا اور انجینئر اس کے پاس جا
رہی تھی۔ بہت رقت تھا۔ اس عرصے میں بہت
سارے کھنے گزر چکے تھے۔

"لے بہت سارے مٹھنوں میں اس کے پاس
نہیں تھی تھی۔ اسے کوئی فائدہ نہیں تھا۔
سکندر کی اس سے تھی اور بدگمانی باز تھی۔ پر اور
ہو اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیا اگر وہ سکندر سے بہ کے
گئی کہ اس نے کل ایک سے کے لیے بھی سکندر
شک نہیں کیا غافل اس کا نہیں کرے؟ پھر سب
کہ زین سے سب چائیاں بنا کر منا اس کے پاس
لے رہا ہے؟

سکندر کو اس پر اعتبار کرنا چاہیے۔ اسے اس کی
حالت کو بھی فوج چاہیے۔ کل: خود ایک بہت
بہتے طریق کی دانش آئی تھی۔

وہ غم بھر جس بہت پر انھیں بند کر کے اندھا
بھروسہ کر گئی تھی جس کے جاتے ہر راستے پر
انھیں بند کر کے چلی آئی تھی۔ جس کی چلی بہت

آگے دیا جس سے روک رہا تھا۔
"سکندر کو اس سے ۳۴۵ کے اپنے آنسو زین سے
پھیلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آنسو اس کے
رخساروں پر بہ رہا تھا۔
"دائیں جابا ہے لیزا۔" اس کا دل دھک سے رہا
مکھا۔

دکھا ہے۔

"ہم میں سے کوئی بھی اسے روک نہیں پار رہا ہے
کام صرف تم کر سکتی ہو۔ اسے روک لولہ! اسے یہ
سوچنے۔ مجھ سے کہہ کہ اس سے محبت کرنے والا ہر فوج
اسے روک دے گا۔ اسے چھوڑ دے گا۔" زین کی
آنکھوں سے آنسو گرے تھے۔

"اسے روک لولہ! وہ پانچ چار ہاؤز زندگی
اور جا رہا ہے اور اب کی بار، کیا تو تم سمیت ہم میں
سے کوئی بھی اسے دائیں زندگی کی طرف نہیں لپاٹے
گا۔"

دیکھنے کے نام میں بھی تھی۔ سکندر کے جانے
کی بات نہ کر رہا بھول گئی تھی۔

"ہم میں سے لے چھوڑا کہ ہے زین اس سکندر
کے ساتھ کئی بھی تھا۔ آج بھی ہوں۔ مجھے اپنی
رعایت نہ لانی چاہیے کہ کئی جس لڑکی کو یہاں دیکھ کر
سکندر سے ملے۔ اس میں فوراً "چو! کیا غافل میری تھی
سکندر۔ یہ جس کو مجھ سے ملے۔ یہاں پاپ سے
بھی رہے کر تھی۔" وہ غصے اور افسوس سے کہی
ہوئی۔

"سکندر مجھ سے ملے بغیر مجھ سے بات کیے بغیر جا
رہا تھا۔ اپنی بے انتہاری محبت کی تھی زین اعتبار بھی ز
کرنا پڑا محروم۔

لیزا کو نہ کی گستاخو زندگی کے بنا سالی سے کیسے جا
سکتا تھا؟

زین بے اعتبار طرانت، بھرے انداز میں مسکرا
غدا۔

"اس کا مطلب ہے ہم سکندر سے بدگمان نہیں؟



اٹھ اٹھ کر آئی تھی۔ سب سے پہلی میں اسے بتایا کیا تھا کہ وہ بہت دیر پہلے وہاں نہیں آئے۔ جس راستے پر چنانچہ وہی گئی تھی اس کا اندازہ ایک گھنٹہ کے اندر ہوا تھا۔ تو کیا اسے بڑے بل ہلانا ہونے والے انگشتوں کے بعد وہ ٹارنٹل ہو سکتی تھی۔

سکندر کو اسے اپنی جانب اپنی مختصر تو جی میں بڑے گی کہ میں کی بھانک سہانی دیکھ کر اس کا ذہن متلوں ہو گیا تھا۔ سکندر شہیار عزیز کو اپنی زندگی کہتا ہے اگر لیا محمور دانی ہاں کی زندگی ہے تو مجھ زندگی کو اس طرح اپنی پہلی سے کہے مجھ کو اب اس کا کیا ہو گا؟ وہ داناں! وہ دل تیرے مجھے مجھے۔ زین نے گاڑی ہوئی ہے۔ اور سڑک پر ہی روک دینی۔

"نہ جاننا چاہوں کہ بہت سی افواہیں سونے والی ہے۔ مجھے وہ بت گانو تیرے مجھ نہیں میں لے کر آیا ہوں۔"

تو زین بھی واسے بھر رہی سوچا تھا کہ وہ سوچتی رہی تھی۔ اس نے سرانبات میں پایا بالور اور پتلی فلی۔ دور سے دیکھتے ہوئے۔ اس نے سکندر شہیار کا دورم غمناک کر کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے اٹھام کر دیا جائے۔

"سورنی ہم! وہ نہ چپک کر آت کر چکے ہیں۔" ریسپنشن پر کھڑی خوش ہو کر خوش کھل اڑتی بنے اسے امدوت قبولہ نفلوں سے نکلتا۔ "کب؟" اس کا ہل بہت شہر تیز حرکت کر رہا تھا۔ کہا اس نے اب فری ہوا: "اب اس نے واقعی بہت دور کر دی تھی؟"

"ابھی خود ہی وہ پہلے۔" ایک ہل چہ در کندی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اسے بتایا بالور وہ بغیر کچھ کے رہا ہے بہت گئی تھی پلٹ گئی تھی۔ وہ واپس ابھر جا رہی تھی۔ ان کا ہل خوف سے کانپ رہا تھا۔ "اے! اسے مجھ سے دور مت کرنا اسے مجھ سے کھوئے مستعد اسے کھو کر میں کہے گی یہ توں گی؟" اسے تو اب اس کو پکار رہی تھی بڑی شدت سے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

وہ ہر مل کے اندر اور گنگی میں کھڑا تھا۔ کیرا! راتج و اس کا سوٹ کس لوریک و رچو کب کوئی میں وہ کھ رہا تھا۔ خود ہی نہ وہ نہیں سے کھڑا تھا۔ لاہور در پہلے ہی کس دیکھا ہو؟ آنکھ کب کا چہرہ بھر جوتانے کی وجہ سے اسے پہلی مزید در کار ہو گیا تھا۔ بڑے سنے کے بعد اب کب در آئے وہ اس کا سالن کب میں روک رہا تھا۔ وہ جب پہل لور ہلک کم مسم سا لور تھا۔ وہ پہلی آگیا نہیں تھا تھا پردہ میں سے آگیا وہیں ضرور جا رہا تھا۔

"نہ مجھے کج فہم کر کے کہنے لیزا! کسی بھی طرح کھل کی تلاش سے وہاں آجلا۔ برسوں پہلے کراچی بتایا ہے۔ میں تم سے بغیر کچھ دیکھنے چل پڑتی۔ نہ اسے سپر میں نے اپنی دوری زندگی کر دی ہے سکندر!" کھلی کے بڑے فہم سے کہے تھے اس کی ساتویں میں کہ جب اس کے لور پر ایک کج مسکراہٹ آئی۔

اب کب میں بیٹھے کہے اب کب خود آگے چلا۔ "وہ تمہیں بتاتا جاتا میرے لیے ضروری ہے اسے تمہیں اتنا جانتی ہوں سکندر! میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ۔ بخلہ شخص ایک سچا لور کھڑا انسان ہے۔" ساتھ ساتھ میں کو تجھے۔ یہ اس کے اندر ٹھنکائی تھی۔ ابھر رہے تھے۔ محبت کا ہم لور کتنے انسان ہوا ہے۔ کھڑا ہے۔ جہاں کس اندر اسٹارو۔ اس نے کب کا دورا، کھولا تھا۔ وہ اندر بیٹھے کے لیے اپنا نام اٹھاتا تھا۔

"سکندر! اسے ہل دگا لیزا نے اسے پیچھے سے پھرا تھا۔ یوں جیسے وہ چاہتی تھی اس کے پاس آ رہی تھی۔" وہ مڑا نہیں۔ جانا نواب آواز اس کا وہ ہے۔ توازیج پر نہیں کھلی تھی۔ لیزا محمود کو اس کے پاس بھیجی تھی نہیں تھا تھا۔ "سکندر! دو۔" اس بار اسے دور سے پہلے سے لیزا ہر دور سے چلا کر پکارا تھا۔

میں بچنے پر تیار نہیں؟ میں تمہارے بغیر کیسے جیساں
کی سوچا ہے تم نے ان کا نام لیج کر کیا؟ میں اور امیرا جرن
نے اور تم اس جرم کی سزا میں مجھے جہنم زکر جا رہے ہو۔

وہ اس سے لڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو
گرہنے لگے۔ لبرائے اس کے لاکھوں پانڈ کئی کے پاس
سے مضبوطی سے غلام لے۔

"میں تمہیں صرف بتا رہی تھی کہ وہاں کی لڑکی سب
جن لوگوں کی طرح خوب صورت لگی تھی مگر انسان نہیں
ہے۔" سکندر۔

"اسی بات میں ہے لبرائے؟" وہ بے ایمان سے بولا۔
لبرائے کو ہوا میں جھکی آنسو آ کر جاس سے گڑبے کو لوگوں
کی وجہ سے دنا اور باغ۔

"اسی بات میں ہے تو تمہاری بہت کیسے ہوئی
میرے لبرائے کیلئے وہاں جلنے کی؟ مجھے خون کرنے سے
کیوں نہیں کہا تم نے کہ لبرائے میں کل سزا میں جا رہا
ہوں۔ تم بھی منع کیے۔ مجھے اور دور سے پہنچ جاؤ۔ جہاں نہ
آئی تو تم کہتے۔ مگر تم نے کیوں خون کرنے؟ کہ تو مجھے
مزدور بنی تھی۔ جو سب سے تمہارے ساتھ کہا تم اس کی
سزا مجھے دنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے دل سے از گئی
ہوں۔ کل کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنے دل سے ان لے
کہ میں سب کی بہن ہوں۔ تو وہ تو نظارہ دینے اور
اس سے لڑ رہی تھی۔

"تمہیں لبرائے نہیں۔ میں نے تمہیں ام مرتکب کی بہن
کی مشیت میں باک بار بھی نہیں سوچا ہے۔" وہ بھی
آواز میں بولا۔

"پھر تم مجھے جہنم زکر کیوں جا رہے تھے؟ مجھے جہنم
کرستہ جاؤ سکندر! مجھے سب کی بہن ہونے کی سزا
میں۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر جھک جھک کر رو
پڑا۔

اسی اس سے گزرنے لوگ شہل کب ذرا اندر
اس سے گزرنے لگی۔ کچھ رہے تھے۔

"لبرائے کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ لبرائے
روا نہیں کر رہی ہے۔" اس نے جھک کر اس کے کان

اس بار ہا ٹھک کر گئے اور بچنے نہ کر سکے۔
خود کو مدد نہیں پایا تھا۔ وہ اندھا حشر تھا جس کی
طرف ابھی نہیں۔ وہ رک گیا تھا۔ نیرہا گئے سے اس
کے کھلے باں ازا کر اس کے چہرے پر فرسہ تھی۔
اگلے لمحے اس کے پاس تھی۔ اس کی مانی اٹنے ہے
بھگوان! میں بڑھنے کی وجہ سے بری طرح بھولی ہوئی
کی۔

اس اذیت فیر (This is not fair) سب
سکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ آئے تھے۔ میرے بغیر تم کس
مخرج راہیں جا سکتے ہو؟ ہم ساتھ آئے تھے۔ ہم کو
ساتھ جا تھا۔

وہ اسی بھولی ہوئی سانپوں کے ساتھ غصے سے
پل پل سے چپ چاپ اسے دیکھ گیا۔ غصے سے اس پر
ہوا ہی تھی۔

"تم نے خود خودی میرے بارے میں سب کچھ
سوچ لیا۔ مجھ سے کچھ نہ بتا۔ بات کہا تک گوارا نہیں
کہہ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا ممکنہ، کہ لبرائے کی
تمہاری طرح ایک اور بہن ہے؟ مجھے تم کو کہہ دو اور تم
عمدوں کر کے اور بھی کر سکتی ہے۔ جس لوگ نے
تمہاری زندگی پر ہادی تھی اور لبرائے عمود کی سبکی۔ لیکن ہے
لو، لبرائے اپنی بہن کے بدترین اور بھانجک کر رہا ہے
زندگی میں۔ لیکن بار آگے بڑھ رہی ہے۔ جنگ میں بھی اور
سکتی ہے۔ بدترین اور تم بھی عمود کی سبکی ہے تو وہ
بھی سکتی ہے۔"

وہ نے بولنے اس کی نرا بھرائی۔ اس کی آنکھوں
میں آنسو آئے۔ کب ذرا اندر بھی وہاں موجود ہے
اسے ذرا ہوا نہیں تھی۔ اس اس سے گزرنے لوگ
اس کے اس طرح زبردست بولنے پر کہا سوچیں گے
اسے ہاتھ پر ہاتھیں۔ مگر سورے کا وقت تھا مگر
نہیں اس اس رات بھی چھ لوگ تو آ جا رہے تھے۔
سکندر ہاتھ خاصا کھڑا تھا۔ کب تک اس کے
جہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"اسی جیت فرے ہو جیو سے کہ مجھے ذرا سی بھی
روستہ دینے کو تیار نہیں؟ میرے دل کی حالت امیرا

میں سرگوشی لی۔ یہ شب بلی کوور سرحد ہی طرہاٹ سے آکر جاس سے گزرنے کو گول کوور کچہ رہا تھا۔

لیز اذیت کی حدت سے مغلوب تھی۔ صبح سویرے جلیں تگڑے نوگوں کی اسے گلاب پودا ہوئی اگر یہی جمع بھی جن ہونا وہ تب بھی ایک سب کو رہی ہوتی۔ اس نے لیز کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا۔

”میں بھی بھڑک کر نہیں جا رہا میں۔ ہم ساتھ جا رہے ہیں۔ ہم ساتھ رہیں گے جس جا رہے ہیں لبرٹ۔“

اسی لڑکی کی محبت ایسی نادر و ندر تھی کہ میں نے غرض سے
 ساویں بندھیں۔ جملہ گھبراہٹ و ہراساں کیا کہ اس لڑکی سے
 انچھوٹا ہے۔ یہی بڑا محبت کرتا ہے۔ اس کے بغیر
 زندگی گزارنے کا مقصد نہ دیکھ کر رہا۔

”چل سکو گی ابھی لڑا اسی رقت مہرے ساتھ؟“
اس نے رقت مجھے میں بڑے ہوئے جیسے اسے آہٹا
چاہا۔

”ای پلہ۔“ نور اہل۔ وہ ابھی بھی مدد ہی
تھی۔ اس کی خواہشوں سے ہمکا برا غلط۔

”جیسے زمانے میں جو سکندر، مسیحا اور ایسے نم سے
 ہمدردی سوتی ہیں جس کی مراد محبت کرنی ہو۔ یہ میں
 بغیر کسی سے ملے ابھی لوہ اس بقت ہمارے ساتھ جا
 سکتی ہوں۔“ وہ اسے اپنی آنکھوں میں دیکھ کر غفلت ہے
 رہا۔

”اے اہل! میں نے بھول گیا تھا۔ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔ میری خاطر کچھ بھی چھوڑ سکتی ہو۔“

دل کو غیر مسنونہ غم و غصہ کی نغمی اوجھت کا یقین ہوا
 انا غم کہ وہ بھی لوگوں کی موندیل فراسوں کر بٹھا تھا۔
 بڑے ناراضی سے اسے گھوڑا۔

”ہیں! میں نساوی خاطر سب کو چھوڑ سکتی ہوں
مکندر مبارک! تو رہتے ہوئے ہوئی۔“

”میری خاطر شک و محوہ سکتی ہو؟“ یہ لہجوں پر
سکراہت ہو کرنا سجدگی سے بولنا سکتی کی انکھوں میں
نراوت تھی۔

”بلکہ“ یہی اس کی شرفوں محسوس کر کے مداح
مدح نے نہیں کی۔

"وہاں پر جو کچھ ہو سکتا ہے"

“سازار و راز، عجب و سخن بود؟”

”میں نے اس کے بے اعتبار ہونے کو دیکھا“

آٹھوں سے گرتے آ رہے تھے۔ وہ خاصا دل پرہیزگار آدمی تھا۔ اس نے انہیں بولا کہ:

”زین کل کر رہا ہے۔“ منہ میں پکڑے ہوئے اس کو
 کہتے ہوئے بولی۔ ایک دم ہی اس کا چہرہ پھرت
 شعلہ دکھاتا۔

”زیر قفسہ پر لکھا ہے“

”میں جسے جان سے ادا ہوئی گی سکھ رہا اگر اب
میں سے بدگمان اوسٹے میں ہیں زمین کے ساتھ ہوا
میں سے بدگمان اوسٹے میں ہیں زمین کے ساتھ ہوا

انہی میں سے ایک ہے اس کے ساتھ آئی ہوں۔ فرین اپنی
 لکھنؤ، برہمن سڑک مندر سے ملندہ ۱۱

رواے کا واضحی سے گھوننے پر سنہ اولیٰ و ہری
 لوح سرمدیہ جو گیارہ نجات ہے بے اضیاء و ایسی کب
 کب کا جیسا جو فرما کہ اے والدین! تم لوگوں کی کھلی

”ہاں، زمین! چلو۔“ وہ مسکندہ کو گھوم رہے تھے۔

”لیز! اسکندر ملّا نہیں؟“ زن بے حد تجویز خواہ۔
 کچھ گھبراہٹ اور آواز میں تنگی سے بھی لگے۔

ہوئی! بسودو سکندر کی ابرو موٹ سکے بے نکلنے کی
 کی ہوئی۔ شکر اسی ٹھیکہ وقت پر پہنچ گئی۔ "اے ہنوز
 اندر کو کھنڈر وہاں آج بھی بے نام و نشان کے چھوٹا

پیرا ہست ہر زبان تو جہ نہیں وی نہیں۔
 لہذا! متکبر کہنا نامو جان کی طبیعت زبان خراب

میں جیسا کہ اس نے اس کے لئے کر رکھا ہے۔ میں بھی
 "سچا ہوں۔"

میں نے اس کے لئے یہ بھی کر رکھا ہے۔

اس چیز کے لیے تھا۔ "نار نہیں تھی۔ اس نے بے مشکل خود کو گرنے سے بچا لیا۔

"ہاشم!" اس نے بے ہوشی سے اسے دیکھا۔ وہ نگاہوں میں تخی اور غم کے لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی ہنسی تھی۔

"میں یہی بات نہیں کر چاہتا تھا! تمہارا بے ہوشی کروا رہا تھی میرے سامنے پوری صبح جہاں بوجھ رہا۔ کل صبح میں تمہارے بال کے گہرے سارا انگر وچ کر کے حیران بریلن رہ گیا تھا۔ تم کل رات تمہارے ساتھ ٹھہرنے جو کچھ مجھے چاہا۔ ات جان کر میرا ذہن کو ختم کر دینا کوئی چارہ ہے۔ ایسا تمہارا کروا رہے تھے رات کو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی کرنا چاہتا تھا؟" اسے سخت لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاشم! میں اس کو اس کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھکر دیا تھا۔ اس نے مجھ کو کٹ کے جانے کا بدلہ لے رہا ہے۔ یہ کچھ سے کتنی توڑے کا انتقام لے رہا ہے۔"

"بس سوچو! یہ جو ہوٹ نہیں۔" ہاشم نے وارننگ دینے والے انداز میں انگلی اٹھا کر اس کی بات بے حد تخی سے کی تھی۔

"میں کل تک ایسی خوش فہمی میں جلا تھا کہ تم نے پہلی بار جس مو کو چاہا اور میں تھا۔ میں اس معاملے میں بہت اعتماد مند ہوں۔ میری بیوی جب مجھے ملی تھی تو اس کے دل میں کوئی اور غماص کے جذبات آن چھوئے نہ تھے۔ اس سچائی کو جاننے کے بعد میں تمہارے ساتھ رہنے پر قرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ اور ہونے ہوں گے بے فہم میں ایسا نہیں ہوں۔ دوسرے مردوں کے ساتھ رانی گزار کر کوئی عورت میری بیوی نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔ سوچو!"

"نہیں ہاشم! نہیں۔" طبعیابا مت کرو۔ تم نہ کچھ سے بہت محبت کرتے ہو۔ تمہاری خواہش ہے ہاں میں تمہارے بچے کی ہاں ہوں۔ میں تمہارے بچے کی ہاں چاہتی ہوں ہاشم!" اس نے روتے ہوئے اس

جہاں بھی اشارت کر رہی تھی۔ وہ جیسے فوراً اس جہاں پہنچ جاتا تھا۔ زمین نے فوراً ہی خدا حافظ کر کے زنا کر دیا تھا۔ لہذا کے چہرے پر بھی پریشانی آگئی تھی۔

"نار نہ ہو! سکندر منجھ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر! اسوہاں کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

ہاشم رات سے اسی طرح کمرے میں بند تھا۔ رات نہ اپنے بندہ میں نہیں تو کمرے میں جلا گیا تھا۔ اس نے کمر اندر سے منقل کر لیا تھا۔ رات بھر میں کئی بار اس کمرے کے دروازے پر جھانکی تھی۔ ہر بار اسے انداز میں پوچھا کہ ہاشم! کمرے میں اس کی کچھ سمجھ میں نہیں رہا تھا۔ کیا کرے۔

ہاشم کو اس نے سدا اپنی غلامی کرنے کو کہا تھا۔ اس کا یہ سدا میری ہے اس کی بدولت سے باہر تھا۔ ہمیشہ وہ روتا کرتی تھی ہاشم! سنا کر اٹھا۔

اس کی خوب صورت لپ مر رہا ہے۔ ہاشم! کمرے میں نہ کر بہت اچھی طرح نماز ہوئی۔ کوئی بات نہیں۔ زینہ مناسی کی ہے۔ اپنی حسین لور کم عمر بیوی کو وہ کتنی خوب نظر انداز کر پائے؟

نہ ہو رہی ہے۔ سب مذہب کمرے سے اٹک گیا۔ وہ آج خود کو اس پر بھروسہ کر رہی تھی۔ اسے سب فیض بھی دلائے کہ سب وہاں جانا چاہتی ہے۔

وہ تیار ہو کر راتیں لڑائی میں آکر پہنچتی۔ ہاشم کو اس نے سب جہاں انز کر کے آنے دیکھا تھا۔ ہاشم! کمرے سے باہر نہ نکلا۔ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر فوراً صوفے پر سے اٹھ کر اور دالہ انداز لور خود لپکے سے اس کے گلے لگ گئی۔

"میری جان! میں تمہاری ہاشم! اس طرح ہواض کیاں ہو گئے؟" جاننے ہوئی میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

ہاشم نے اسے فوراً ہی رکھ کرے کر دیا۔ وہ

کے باند بکڑ لے

ہاشم نے اس کے ہاتھ جھٹک کر رہا ہوا تھا۔
 "تس کل رکت سے کئی بڑا مرہب! اس بات کا شکر
 ادا کر چکا ہوں کہ تم میرے بچے کی اماں نہیں بنیں۔ اگر
 ہاری کوئی لڑکا ہو گی ہوں تو آج جو فیصلہ میں کرنے جا
 رہا ہوں وہ کرنا میرے لیے بے حد مشکل ہو جاتا۔" وہ
 اُس کے لیے غرت اور تعارت نہی۔ جیسے وہ کوئی
 بد ور اور لرغیلہ سے بھی۔

"نہ کم کوں سا غبر شادی شدہ لود کنوارے سے؟ نہیں
 بچوں کے باپ سے تم۔ یہ میرا احسان تھا تم پر کہ میں
 نے تمہیں اپنا ساتھ لیا تھا۔" وہ یکدم ہی بدلتی انداز
 میں چلائی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی
 حالت غبر تھی۔ وہ جیسے کمرے سمندر میں ڈوبنے سے
 پہلے ہاتھ لاس پانی طر کر رہا تھا۔ چلانے کی آخری کوششیں
 کر رہی تھی۔

"بسمہ! افسوس ہے مجھے اس بات کا۔ بہت شرمندہ
 ہوں میں اپنے بیوی لڑکوں سے۔ تمہاری محبت میں
 پاگل ہو کر گیا۔ نے ان کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔ بہت
 زیادتی کی تھی۔"

"غریب بد لودا کر دہ اپنی شرمندگی کا۔" وہ بارہ نکلیا
 دھوا لوانی ایسی۔ بے چاری بیوی کے ساتھ۔ "وہ ملتی
 کے مل چلائی۔ اس کے پیانے کے جوتے میں ہاشم
 پاگل ٹھنڈے پر سکیں پانداز میں بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اُسے دیکھ کر
 خنہ انداز میں سکر لیا۔ "تمہاری سب باتیں احسنوں
 کی طرح جانتے پہلے جانے کے بازو میں نے ایک بہت
 تمہاری نہیں مانی تھی موسم! اس نے مدانہ کو طلاق
 دے دی تھی۔ تب تم سے اس بات کو چھپانے کی وجہ
 تمہیں رنج و کد تھی بلکہ تمہاری ناراضگی سے بچنا
 تھا۔ میں تمہارے عین میں باہل ہو کر اسے طلاق
 دے دیا تھا۔ تمہارا نے وہ کچھ سے منت کی تھی
 مجھے میری بیٹیوں کے مستقبل کا خیال ملا تھا۔
 میری بہن بال بڑی ہو رہی ہیں۔ کل کو ان کی شادی کا

وقت آئے گا تو ان کے رہنے ملے کرتے وقت ان کی
 نہیں کی طلاق لون کے لیے حوالہ نشان بن جائے گی۔
 میں نے اپنی بچوں کی خاطر مدانہ کی بات مان لی تھی۔
 میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا موسم۔ مدانہ آج بھی
 میرا بیوی ہے۔ اور فرج میں ہو رہی اس کے پاس نہ ہوا
 ہوں۔ حد بڑا ہار شکر بلکہ میرے بچوں کی اماں ایک
 شریف اور باکوار عورت ہے۔ تمہارے ساتھ
 گزارا کرتے وقت کو میں یہ سمجھ کر بھلانے کی کوشش
 کر رہا تھا کہ میں نے عیاشی کے لیے چند سال ایک
 بدکردار لڑکی اپنے نکاح میں رکھی تھی۔ جب میرا دل
 بھر گیا میں نے اسے طلاق دے دی۔" وہ اس کی
 تذلیل کر رہا تھا۔ جیسے کل رات نہ کوئی ہر جھگڑا
 اس نے غرت کرتے اس سے دل بے رجا تھا۔

دہاشم کی تذلیل پر کتنے میں نہیں تھی۔ وہ اس کے
 جھوٹ پر کتنے میں تھی۔ مدانہ آج بھی اس کی بیوی
 تھی ہاشم کی بچہ لڑکی سنی سے اس سے جھوٹ بولا ہوا
 تھا یہ بات تھی۔

وہ چہلوں مٹانے جت تھی۔ ہاشم سے لڑنا اس پر
 ہوا! لڑائی بکنا ب۔ کچھ بھولی، کچھ تھی۔ وہ جیت سے
 کچھ سمجھ کر ایک نیک اسے دیکھ باری تھی۔
 ہاری بیوی کی زبانوں سے جھوٹ بولتی تھی۔ وہ اس کے
 دل کی آبی تھی۔ کہ کوئی اسے بھی ہو کر لے سکتا تھا۔

"میں مدانہ اور اپنے بچوں کے پاس رہا نہیں جاؤ
 ہوں! تمہیں طلاق کے باخداات قرع شام تک
 میرا دل پہنچا ہے۔" میں تمہیں چند دن کا کوشش
 رہے ہوں! اول۔ اس کے چند دن میں میرا یہ کمر خالی کر دیا۔
 تمہاری وجہ سے اپنے بچوں کو میں نے سنا سے نکالا
 تھا۔ لب انہیں پورے غرت اور اجڑا ہوا ہے۔ اس
 کے گھر لڑکی بچ۔" ہاشم سدا سے کچھ میں بول رہا تھا۔
 اس کی آنکھوں میں سردی لود تھی کے سوا کچھ نہ
 تھا۔

"وہ گھٹیا تم تھا۔ ویسے میرا درد و سر نہیں کہ تم
 کوں ہلائی۔ کچھ بھی اگر تمہیں یاد ہو تو میں چند عار
 شامی کے دوران تم نے بہت کچھ مجھ سے نیچے لیا

زیر تحریکی آئندہ کا علاج ہو رہا تھا۔

اس سے شام اور شام سے رات ہونے لگی تھی۔
آئندہ کو انجانا کا ایک ہوا تھا۔ انجانا کے ایک کے
بعد فوری ہمسری طبعی سوالات ملنے کے باعث غلط
فیہ کیا تھا۔ مگر ان کے مستقل سوالات کے چہرے پر وہ
خبریں کچھ لگتی تھیں۔

آئندہ ہوش میں نہیں۔ انہیں آہستہ آہستہ لگی ہوئی
تھی۔ ہادی بابا نے انہیں غلطی غلطی پر کے لیے
ان کے پاس آتی تھیں۔ ہادی بابا ہر وقت تھے۔

آئندہ اسکند کو کچھ بھی دینے لگی تھیں۔ ہادی بابا کی
حالت بگڑنے لگا۔ ہادی بابا کے بعد سے آئندہ
کے مستقل سوالات نے ان کے غلط فہم کر دئے
شروع کر رہے تھے۔ انجانا کے ایک کے ساتھ ان
نبیوں کا کیا غلطی تھا؟

وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سا خوف محسوس کر رہا
تھا۔ گھر پر نور پوری تھی۔ وہ تین سالہ بچہ تھا۔
نئے۔ ان کے شہزادہ نند سے رات میں گھر چلے
جائے کو کھلا گھر آئندہ کے پاس سے جانے کو تھا
نہیں تھے۔ وہ ہی اڑا رہا تھا۔ ان کے لئے
مجبوراً "وہیں کو گھر جاؤ" تھا۔

وہ تینوں انہیں میں آئندہ کی طبیعت کے علاوہ اور کوئی
بات نہیں کر رہے تھے۔ ہادی بابا نے ہادی بابا کے ساتھ
اپنے تین سالہ بچہ تھے۔ شہزادہ نند اسے لڑائی
سے دیکھ رہے تھے۔ مگر ان انہیں نے آپس میں کوئی
بات نہیں کی تھی۔

آئندہ خواب اور بیدار کے زیر اثر ہادی بابا
رہ سکتا تھا۔ ہادی بابا کے ساتھ ہادی بابا کی حالت
تبدیل ہوئی تھی۔ گھر کی ہادی بابا کے ساتھ ہادی بابا
رہے تھے کہ جیسا کہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ ہادی بابا
ہے۔

یہ اسپتال کا انفرنگس روم کی طرف تھا۔ یہاں
کہنے کے خصوصی علاج کے ساتھ اس اسپتال کے
چند اور قافلہ ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ اسکند اور شہزاد
خان ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ کہنے کے کل وہ تھے

ہم تمام نبیوں کی رپورٹس ڈاکٹر کے سامنے رکھی
تھیں۔ آئندہ کے مستقل سوالات انہیں بہت کچھ
دینے والی بات بنا رہے تھے۔

"آپ کی سڑکی پر ہادی بابا نے ٹھیک نہیں لکھی ہیں
شہزادہ صاحب! گھر پر ہادی بابا نے لکھی ہیں۔ ہادی بابا
سے لکھی ہیں۔ ہادی بابا نے لکھی ہیں۔ ہادی بابا
نہیں کر رہا تھا۔ ہادی بابا نے لکھی ہیں۔ ہادی بابا
اسکند ہادی بابا نے لکھی ہیں۔ ہادی بابا
کہہ رہا تھا۔ ہادی بابا نے لکھی ہیں۔ ہادی بابا

دیکھنے کی سی کیفیت میں خوف زدہ ہوا تھا۔ وہ کچھ

"ڈاکٹر صاحب! ہادی بابا کی طرح ہو سکتا ہے؟ ہادی بابا
ہادی بابا کے تمام جسم پر ہادی بابا کے ساتھ
ہوئے تھے۔ ہادی بابا کی رپورٹس ٹھیک آتی تھیں۔"

جواب "ڈاکٹر صاحب! ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی
اور ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا

"مگر کوئی غلطی؟ آپ کیا ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب؟
آپ کا خوف اور ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔

"مگر ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا

"ہادی بابا! اس نے بے اعتبار آگے بڑھے۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا
ہادی بابا کی طبیعت کر رہی تھی۔ ہادی بابا

"سکندر! اپنی ہاں کو پھیلو۔ میں نے اس پر بہت ظلم کیے ہیں۔ اگر اسے کچھ دوا میں خود کو کیسے معاف کر پڑیں؟"

"خود اس لمحہ بہت اذرا برا تھا۔ باپ سے ناراضی، باپ کا خود پر کیا کوئی بھی ظلم اسے اپنی ہاں نہیں دبا تھا۔ اس نے اپنے زخموں کو بانڈیوں کے گرد پھیلا دیا۔ دوائیں نہ چل رہی تھیں۔"

"اس وجہ کو کچھ نہیں ہو گا یا ابھی انہیں علاج کے لیے امریکا لے کر جلاں گا۔ پڑے سے پڑے اور اچھے سے اچھے ڈاکٹر مل کر انہیں کڑوا دیں گا۔" وہ گلو گھر کی طرف اشارہ کیا۔ شہر و شہر کے روٹے ہوئے اپنا سراں کے کندھے پر تھکا ہوا۔

"سکندر! لڑاتے شاہی کر لو۔ جلد از جلد آمد کو بہت اوجھل ہے۔ ضروری شہر کا۔ اس طرح وہ چاہتی ہے کہ میں طرہ و طرح سے لیزا سے ملتی کر لو۔ اس کا جسم ضرور اسے ہی تم میں گھسا کر ہے۔ جس میں دوش دیکھ کر تو شاید اس کے اندر زندہ رہنے کی اس کے پیوند سے بھرنا یہ وہ اپنی تباہی سے لڑ سکتا۔"

"وہ دے ہوئے اس سے بول رہے تھے۔"

"میں لیزا سے اسی طرح ملتی کر لوں گا یا اس طرح اور جوں جوں کر۔"

"اور وہیں پہلی بار ایک دوسرے کی آنکھوں میں رکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جمع تھے۔ شہر و شہر کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ انہوں نے روٹے روٹے بے اختیار اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔"

"سکندر! اچھے معاف کر دینا۔ میں دشا کا بدترین باپ ہوں۔ میں نے شہر کی زندگی بچا کر گرنے میں کوئی کسر نہیں بچھوڑی۔ میں مجرم ہوں۔ تمہارا بھی تمہاری ہاں کا بھی۔ کچھ نہ کرنا اس حال تک پہنچی ہے تو میرا وجود۔"

"پاپا! یہ آپ کہا کر رہے ہیں؟ پاپا! ایسا مت کریں۔"

"ان نے اپنے سامنے بندھے ہون کے احوال کو گھولا۔"

"ایسا ہے۔" طالبی منگوا کر اس کی فٹا بھی نہ مٹی۔ اس کے قدم اس کی ہاں میں اس جلی کو پہنچ گئی۔ جس میں وہ باپ بہت کمزور ہو کر رہ چکا تھا۔ باپ نے بھی جس کی طاقت اور حسیں کو ایک دنیا حکیم کرنی تھی۔ اس میں اس کی ہاں کو پہنچ کر وہ گھبرا گیا۔ والدین بھی تو ان کی ہاں سے یہی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ پھر وہ پہنچا۔ باپ کے لیے جلی کو گھول کر دیا۔ اس کی ہاں میں وہ باپ کے سامنے کسی کے سامنے نہیں دیا تھا۔ ان دنوں وہ باپ کے سامنے رو رہا تھا۔ اس نے ان کے ہاتھوں کو غلام کیسے دے ان کے ہاتھوں کو روٹے روٹے چرے دیے۔

"بچے آپ کی اہل زوجہ کی بہت ضرورت ہے۔ پاپا! مجھے تب کی اہل زوجہ کی یاد آ رہی ہے۔ بہت ضرورت ہے۔" وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے قوازاںسو رہا ہے۔

فائدہ کو وہ میں منت کر دیا گیا تھا۔ کچھ شام میں ہون کی چھٹی زد جاتی تھی۔ انکڑ کے سفید فی الحال۔ گھر کا کتنی عجیب۔ باپ ان کے گھر کے پانچ میں بہت جلدی کے جلنے کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے خواہش کا جو میں دیکھتے ہوئے کل آمد کے ساتھ ہیں سے جنگ کے بعد ہی امریکا میں چند چوے اچھا ہیں سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ کیا تھا۔ وہیں سے فی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ان نے کچھ سوچے۔ یہی آمد کو تمام دوپہر میں پہلی انٹرنیٹ کے ذریعے امریکا میں گھس گھس۔

اس وقت وہ فانی آمد کے پاس کمرے میں موجود تھے۔ کمرہ چکی ہوئی تھی۔ لن کے ایک طرف وہ بیٹھا تھا۔ دوسری طرف فانی بیٹھا تھا۔ آہستہ باری باری ان دونوں کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت کمزور اور بہت زیادہ فخر آؤں تھی۔

"امو جان! آج جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ میں لیزا سے ملتی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے تب چاہوں گی۔"

"ہاں علی! کچھ شہر سے نکدو رہا اور لہذا اونٹنی کی شادی ہے۔" اسی کے بجائے علی کو زمین نے خواہش کیا تھا۔

امروزین کو اسپرزل سے کہنے پر ان دن ہو چکا تھے۔ دانی اللہ کی طبعی بیدارست رہیں۔ ان نے اڑچٹا سے آگے ہی شہر خانان نے محمود خان سے مل کر آگاہ کیا "شادی دو روز کے باقی ہے کر لیا تھا۔"

آمنہ کی راجھل سے گھر واپسی کے موقع پر وہ شہر خانان کو زمین کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔ ہر دے ہا "اسلے بید۔" اسی کی خط واری خود پسندی اور لانا سے کہیں زیادہ جتنی اس کی گلی کی فوج کی تھی۔ اسے گھر میں قدم رکھنے ہوئے ایک مل کے لیے پہلی بار نہیں آیا تھا کہ وہ نمبہ پاپ کے گھر میں کبھی نہیں آیا چوان تھا۔

شادی کی شادیاں بھاگ اور ذکر شہر خانان اور زمین نے کی تھیں۔ اس نے نوٹس ہائی دھڑوں میں فیتہ کو جلد اور جلد ملانے کے لیے امریکا لے جانے کے حلقے میں کوششیں کی تھیں۔ نکولس کا بڑا بھائی مران فرانسسکو میں ایک باڈی ٹائمر ورائٹس سرجن تھا۔ اس نے کبھی بہت کڑھ لور توہل سرجن کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ جس کے علاج سے کبھی بصر کے کئی مراضی صحت یاب ہو چکے تھے۔ وہ لوہی سرجن سے اس نے بھیجی تھیں۔ وہی اس توہل ڈاکٹر تک رسائی نکولس کے بھائی کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی۔

آمنہ کی رپورٹس دیکھنے کے بعد اس ڈاکٹر نے خاص امیڈولائی تھی کہ انی بخطان لای بھی ممکن ہے اور وہ ایک سرخندہ پھر اس موڈی مرض سے صحت یاب ہو سکتی ہیں۔ آج سے ٹھیک ہندو ان اجداد سے آمنہ کو سنان فرانسسکو لے جاتا تھا۔ شہر خانان بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے۔

کئی رات ہی جب صبح کھڑم ہوا تھا اور رات جب اس نے شہر خانان اور زمین کو بات چیتی تھی تو زمین دھول کے ایو بی جیوں پر امیڈولائی کے لکھی تھی۔ "اسرو جیوں ٹھیک اور جا میں کی ہیں تمکند رہ؟" زمین

پس ہر طرح۔ نمبہ جس فنکشن کے لیے تھیں کی ہیں۔ فنکشن دکھوں ٹھیک ہی ہے۔" وہ مسکرا کر انہیں نشین ہمارا تھا۔

آمنہ نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "لیڈ اور محمود صاحب راضی ہیں شادی کے لیے تمکند رہ؟" انہوں نے سخت بات بھری گواہی بے یقینی سے کہی۔

"نمبہ راضی ہیں بہت جلد! یہی آپ کا انتظار ہے۔ آپ جلدی سے طبیعت ٹھیک کر لیں تاکہ جلد سے جلد یہ شادی ہو سکے۔"

اسی مرتبہ آمنہ کچھ جواب دینے لگا تھا۔ آمنہ نے پہلے زمین کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا پھر اسے دیکھا تھا۔ وہ زمین کی بات کی ضدین کے لیے سرایات میں ہلا کر مسکرا رہا تھا۔

وہ گاڑی کی گاڑی اتار میں لیے پورچ میں آیا۔ اب تک اسے راستے ڈرو ہو گئے تھے اس لیے وہ گاڑی خود چا کر بڑا چاہتا تھا۔

وہ پورٹلانا سے پورچ میں زمین گھر کے جلد ملا زمین کے ساتھ مہار گاڑی کے پاس ٹھہرا نظر آیا۔ غی بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس فوکس میں پھول رہے۔ نوے سے بہت خوب صورت اور تازہ پھول۔ زمین ملا زمین کو ساتھ لگائے یہ لہائی گاڑی سنا ہوا تھا۔ وہ سر کی گاڑی کی طرف جارہا تھا۔ زمین نے اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کبھی لگ رہی ہے گاڑی؟"

گاڑی کا ایک حصہ پھول سے سج بکھا تھا۔ زمین اسی کو دیکھتا نکدو سے پوچھ رہا تھا۔

"بہت خوبصورت ہے۔" زمین کے پاس آکر رک گیا۔ اس نے مسکرا کر تعریف کی۔

"تمکند رہا! آج آپ کی شادی ہے نا! اجڑا آگیا ہے ساتھ؟" علی کے معصومانہ سے انداز میں دہانے پر وہ اس بڑا۔

نے رزمی تراز میں اس سے پوچھا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہاں سے بھری ہوئی تھیں۔

"یاب زین! ان شاء اللہ اسوچن بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کی زخمی زاریوں کو مجھے اور لیزا کو شاہی کمرے کے دروازے پر جاسے کی اور ہائی چارن اللہ راکٹر کے درمیان ٹھیک کر دیا ہے۔" وہ نرم صوفے میں زین سے بولا۔ اور زین کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے فلی وہبے کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ان شاء اللہ۔" زین اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

زین کے روبرو اس کے بچ کمرے اور سلاں کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بات ہونی تھی تو صرف ماں کے منہ سے۔ ان کی ملاقات مرکز طبی میں جس کے گرد و لوگوں بھائی ایک بن امید لڑو رعا کے ساتھ جمع تھے کہ ماں صحت یاب ہو جائے۔ ملی کے جسم سے ماری بھری در ہو جائے۔ ملی کے دل کا سارا غم مٹ جائے۔ ماں جو برہمن سے مدنی رہی ہے۔ اب اس کے لبوں پر صرف مسکراہٹیں ہوں اور وہ منہ میں فقط خوشیاں۔

"تم کبھی صحت یاب ہو؟" زین نے اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی کیجہ کر پوچھا۔

"ہم! اسوچن کی ایک دوا ختم ہو رہی ہے۔ وہ دیکھنے جا رہا ہوں۔" سکندر دندے سے سمجھتی سے بولا۔ دوسری گاڑی کی طرف جانے کے لیے اس نے قدم اٹھائے۔

سکندر بولا۔ "ابھی آپ کے سامنے چلوں؟"

سکندر رکت گیا۔ اس نے منکرانہ علی کو دیکھا تھا۔

"قبو علی!"

سکندر کے چہرے پر جھنجھٹے کے لیے والہانہ چاہت تھی۔ علی بھاگتا ہوا سکندر کے پاس گیا۔ سکندر نے بے ساختہ اسے گود میں لیا اور اس کے پیچھے ہار پیا رکھا۔ وہ خاموشی سے بھائی لورے کو کچھ دیکھا تھا۔ لیکن چند دنوں میں بھی سکندر دست بستہ ہو گیا تھا۔ سکندر کی زین سے ملی کی بھاری سے ہت کر کچھ زیادہ بات ہوئی تھی۔ نہ نوریہ سے ملاقات، نہ زبانی کچھ ہے

کلف منگو مگر نفی سے جیت اس کی پکی لائی ہو گئی تھی۔

"اس کرم کل نہیں کے سکندر بھائی؟"

"اس لیے علی کو اس کرم کل نہیں مجھے۔" سکندر نے اسے گود میں لیے گاڑی گاڑ دی اور بولا۔ "دونوں غائب ہونے میں ساری پرانی لائی لار رہے۔ کتنی فکر آ رہی ہے۔"

"اور چاقبے بھی ملائیں گے؟" ملی کی معصومانہ فراہمیں جاری تھیں۔

"چاقبے بھی ملاؤں گا۔" سکندر نے اسے اسے اپنی برآمدہ والی سبت پر بٹھالیا۔

زین کو دیکھنے کے گاڑی میں ساتھ۔ بند کر دیا۔ محبت سے کچھ دیکھا۔

ہر سکندر سے گستاخا تھا کہ وہ ملی کو دلدادہ سے زیادہ رشتہ اپنے ساتھ رکھا کرے۔ اس کی خواہش تھی اس کی پرانی کھلی ہوئی بڑا ہو کر سکندر جیسا بنے۔ محبت کرنے اور گڑ گڑ بننے والا نہ بنے۔ سکندر کو دیکھا تھا اعلیٰ عزت دیکھنے والا۔

اسے علی میں نہ تو ایک اور شہباز خان چاہیے تھا۔ نہ ہی ایک لڑ زین شہباز۔ لیکن کے والد ماجد کو نہ کیا۔ لورہ خود انتخاب پسند لڑکے تھے۔ مدنی لورہ ایک لوگ تھے۔ ملی پر فیل ملن کے خامن میں بیٹا تھا۔ بائیں اب ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جیسے سکندر نے ان کے خامن میں چلی آئی انتخاب مدنی و خود پر سنی نہیں ملے۔ چاہنا تھا علی بھی نہ ملے۔

برسوں کی دواں لورہ فاسٹے تھے۔ سب تو دروازہ کھلے جیسا ہونے میں بہت ہت لگا تھا۔ سکندر اسے لگے لگائے۔ وہ سکندر سے اپنے دل میں آئی یہ تمام باتیں کہہ سکتے تھے۔ سب ممکن ہو جانے میں ابھی بہت وقت لگا تھا۔ صدیوں کے ناسلے پل بھر میں انہیں سمجھنے تھے۔

ملی است باتیں کہنے ہوئے کسی کی معصومانہ باتوں کے منکرانہ: وہ سکندر نے گاڑی گھبراہٹ سے باہر نکلی تھی۔ وہ کتنی باہر سے اسی طرف دیکھے بار بار

خواتین ناچنے والیوں کو دیکھ کر 2012

مکھڑ کے اخراجے کے لیے مرگیا۔

✻ ✻ ✻

یہ مسئلہ راولپنڈی کے لیے کی رات تھی۔ کل بہت
 رعب و حرام سے ان لوگوں کی نگاہ پر چمکی تھی۔ اس
 کی وجہ کی حجاب کے مسئلہ پر ان کی بات تھی۔ آپ کے
 گھر سے تھی۔

آمنہ دہلائی گھڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی
نہیں۔ علی شہ ہٹا ہوا تھا۔ گاڑی زمین نے ہلائی تھی۔
نور، دہلائی گاڑی میں اس لوگوں کے ساتھ بیٹھی
تھی۔

آمنہ نے نیلوی کے وطن پر ہی سنا، جی ہاں ہنسی تھی، بہو
لیزا کے لیے عروس کی جو ساری کی خریداری کے موقع پر
ابن سے انہیں دل لائی تھی۔ آمنہ بے خفا خزانہ
تھیں۔ کئی بلی خوشی سے دربار میں لور کھینچ رہی تھیں
سکھلا کر کھینچ رہی تھیں۔

[illegible]

نیا ہی ہونے لگے۔ حکم سے خبر لی کہ مطلقہ اور اولاد کے لئے فائدہ ہے۔ لیکن کے جسم سے باہر نکلتی تھی مگر اس کے لباسات نہیں تھا کہ اس کی لہجہ میں لب لہجہ ہوا کی سے لڑیں گی۔ لیکن کے اندر زندہ رہنے کی اہلیت بھر سے پیدا ہو گئی ہے اور زندہ رہنے کی جہانگشاہی نہیں اپنی پہلے کی سے لڑنے میں مدد دے گی۔

[illegible]

فائدہ
تیسرے سے دوسری اور کا صلے کے موجب یہ بہت کم
دروہ سمجھا جاتا ہے، ہمیں کب یا ہاتھ مگر نور سے نونہ
نہ سب کچھ کہہ سکتے ہیں وہ اس سے بننے کی منتظر
بہت گزرتی تھی ان پہلے سکندر کی پریشانی اور پھر میں
پارسی کی بھانگ دلائش گزرتے تھے اسے سکون سے
بچ کر نور ہے اسے کہنے کی مصلحت نہ ملی تھی مگر
اس پریشانی اور ہانگ نہ میں بھی اسے نظر آ رہا تھا کہ
نظارہ اور چین اور کر کے تمام افراد کا صلے کی اس حیرت
ہمیں گزرتی اس سے دوسری میں بھی اس سے قاصد پر
میں بھی تھی اس کی آغوشوں میں ہر لمحہ ایک شکایت
ہوتی تھی۔

اسے شادی کے دن گزرے پر سوچ میں بھی اس نے یہ سوچ جس پر اٹھا کہ اس کی بھی کسی سے ملنے والی تھی۔ ام سرور۔ شمال کی زندگیوں میں کسی طوائف کی طرح مزاجیں تھانے غرضی کی سادہ راکھ تھی کہ وہ زالی تھی۔ جس شوہر کو وہ ملا کر گنت غبرے اپنا سمجھتی تھی مجاہد غرضی میں کسی کی محبت میں بھی مبتلا رہا تھا کہ وہ محبت افق نور نور تھی کہ اس نے اپنے لیے عیاں جب کہ وہ اس سال جوڑے رکھا تھا؟

ابن خلدون کے دل کی بدگلی اور ناراضیاں اور
کلی خصم۔ محبت نوبہ اس سے کرنا ہے جس کو کیا
حق ہے اگر وہ نوبہ کے دل سے بدگلی مٹانے کو یہ
کہہ دے کہ باہر سے پہلے اسے محبت دے دینا ہی میں
فرق کرنا نہیں تھا خدا نام صرف اپنی غیر معمولی طاقت اور
بے خوفانہ حسن کی وجہ سے اسے پسند آگیا ہوگی۔ منجہ
پسند ہی کو محبت سمجھ بیٹا اٹھ اگر اس کا یہ بھوت
نوبہ کے دل کو خوشی دے دیتا ہے جس سے ہجرت اس
کے نزدیک لے آتا ہے نوبہ اس بھوت کو جائز سمجھتا
تھا۔

حکیم کی رائی کے۔۔۔ ظن جبکہ ان کے گھر میں خوشیوں، بھجری، چوٹی، نصیب میں سے احسان صبح اور کون سا ہو مگر قاتل خوب سے ہر سب کہنے کے۔۔۔ اس نے گڑی کو کہہ دیا کہ کالاف کام نوکر کو سمجھاؤ اور خوش

جس کو کیا حرج ہے اگر اکا اکا ایک بندہ رو کر لڑا اٹلی میں
نواز آگئے۔

”جہیز تھا اس کی ہلا اس کی زندگی کو فانیوں سے
بجرا ہوا وہ چاہتی تھیں۔ ہمارے بل کو خوشی دینے ہی
کے لیے اس نے لیز اسکے سامنے اٹی جانے کا فیصلہ کر لیا
خدا۔ رات رات ہی ان لوگوں کی فحش تھی۔ جی
بھی ان کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بطور
خاص یا کشتن آنی ہو تھیں۔ شادی کی تقریب میں
شرکت کر کے کچھ رات انہیں بھی ان دنوں کے
ساتھ ہی دو سو ایس چلے جانا تھا۔“



سب لوگ انہیں ایورٹ پھوٹنے لے ہوئے
تھے۔ شہزادہ خان اپنے فرزند منی محمود خانداد
عائشہ۔ کنر رانی جیسے چھٹی تھیں۔ لیز اسکے بدلے
ہاتھوں پر ہندی دہتی تھی۔ اس انٹلسٹ ہنگر سادہ لباس
میں تھی۔ لیکن اس سلکی میں بھی اس کے جی جی
رہیں ہوئے جانا تھی رہا تھا۔ لیز شہزادہ خان، کندہ اور
غور سے مل رہی تھی۔ شہزادہ خان نے اس کے سر پر
اپنا ہتھیر کر کے دیا میں اس نے اپنے بارے میں اس
کی پیشانی چومی ”تو بہ نے بارے سے کچھ کہا تھا۔ علی
سکندر کی گود میں چڑھا ہوا تھا۔ اس کی سکاند رت ہے۔
تکلفزار، دوستانہ انداز میں انہیں پوچھ رہی تھیں۔“

زین فاموشی سے سکندر کو دیکھ کر چلے جانا تھا۔ جب
سکندر کی بارگت لے کر وہ لوگ گھر سے نکلے تھے
اس فائل چلا تھا، اور ہائی کے کچھ لگ جائے اسے
مبارک پورے۔ جب سکندر اور لیز کا نکاح ہوا اس
پہلے سب کو سکندر سے کچھ ملے اس نے دد سے اور
خسرت سے دیکھا تھا۔ اس کا بھی ہوا اٹھا وہاں کے
پہلے جانے اسے کچھ آ کر خوشیوں کی دعا میں ہے
مگر ایک جھک تھی ہوا اسے سکندر کے پاس چاہے
دک دہی تھی۔ نجلے سکندر اس کے کچھ لگا چاہے
کا بھی باہمیں ہمبست ملنے کے بعد لیز، محمود
خانداد سے مل رہی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر بہت

خوش تھی مگر پھر بھی ان کی آنکھوں میں ایک دک
چھلک رہا تھا۔ اس دک کی وجہ وہ جانتی تھی۔ وہ باپ کے
کچھ لگ گئی۔

”خوش رہو دنیا اس سے کچھ گریہ کر کے ہوئے
اسولے بنائی تھی۔“

”ابنا خیل رکھتے ہو لیلیٰ! باب کا وہکھ مجھوس کر
کے اس کی آنکھیں بغرا تھیں۔“

”تم نے سوچ کر فون کرنا تھا؟“ چند لکھوں بعد بہت
وجہی کہلا میں اسولے اس سے دو حجاب لب لباب
کے اپنے غما سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے
جولہ ہنسی میں سر ہایا۔

”میں نے بہت کوشش کی لیلیٰ! مگر ابھی خود میں اتنا
ظرف ہوا نہیں کہ سکھ کر اس سے مل سکیں اس سے
ہاتھ کر سکوں۔ اٹلی ہوا پاکستان فون کی خواہش سے ضرور
فون کی۔ یہ نور میری بہن ملی لیلیا سے زین کی بھر کے
لیے جھوڑا نہیں سکوں گی۔ محبت نہیں رہی مگر فون
بجارت نہ ہو لیلیا۔“ ”ہولنے، ولے اس کی آزاد عرا
تی۔“

سہم کے ایکسپلنٹ کی اطلاع پر محمود خانداد نے
اسے بلا لیا تھا۔ اور محمود خانداد اس میں سہم کے اس
موجود رہے تھے جب کہ سہم ہوش میں نہیں تھی
تھی اور وہاں موجود رہی تھی مگر اس کے ہوش میں
آئے ہی وہ بدلے چلی گئی تھی۔

اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہاں سے نہیں
لی تھی۔ ان کی ملاقات کا وقت ہوا، غما۔ اب انہیں
اندہ ملے جانا تھا۔ نئی ولے اس کے کندھے کے گرد
ہاتھ رکھ کر جیسے اسے تسلی دیتی جا رہی تھی۔ لیز اور
محمود خانداد کا کچھ محسوس کر رہی تھیں۔

”ہاں لیز اور پوری ہے۔“ ”اے اس سے پوچھیں۔
سکندر بھی اب دلی باپ تو میر“ محمود خانداد عائشہ
سے مل رہا تھا۔

”لیلیا! اور جین کی ساری بیماری گدا رہے گا۔ میں
کچھ خندہ نہیں تھوڑا ہوں گا۔“

”مگر منت کرو جانا! ساری بیماری ہو جائے گی۔ تم

اور لہذا میں مل بھر کر کہوں: "مہمہ اور انجوائے کر کے آؤ!"
شہر اور نکل منقش طور مجھ سے بولے
اس نے زمین کی طرف دیکھا۔ دل سے رکھ کر
سکڑا ہوا غصہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔
"ایسا خیال رکھنا سکندر! اس منکر آکر بولا۔

دو لب بھی بھائی کے گلے نہیں لگ سکا تھا۔ سکندر
نے براہ میں دیکھ کینے کے بجائے اسے گلے بچایا۔
جیسے اس کے دل کی بات وہ اس کے منہ سے ہی جان گیا
تھا۔

"تم بھی لہنا خیال رکھنا زمین! اسے گلے لگا کر
لٹا دے بولا۔

لورڈ زمین شہر کے زندگی میں پہلی بار اپنے پوتے
پہلی رخصت کیا تھا۔ رنگ تھا۔ کسی غریب باغ میں
بتا ہو کر نہیں، مگر اسے رنگ سے کہتے تھے جو اچھا کہ
کئی لہو بھی سکندر پہ پہلو آ۔ اس کی کھلی اظہار طرف
اور دیر کر کا جو صلہ رکھنے والا۔ اس کی طرح بھینوں کو بنا
لٹاؤں کے سمجھ اپنے ہوا۔



وہ اپنے فہم میں غماخی۔ ماحول سکندر سے
نزدیک سے قلب بھی برس پہلے اس نے اس وقت خرید
تھا جب سکندر قلعہ سے اپنی مہمہ اور اس وقت وہ فوجوں سے فوجوں
میں برابر برابر تقسیم کی تھی۔ تب لہو نے دم میں لور
اس نے کراچی میں اسے لے کر قلب خرید لیا تھا۔ اس کے
قلب کے لوگ دم کی بڑی بڑی فریج ریڈوز سے
سکندر کا خوب صورت منظر نظر آتا تھا۔ تب اس منظر
کی ہر شے سے معمور ہو کر اس نے تب قلب خرید لیا تھا۔

اب یہ منظر اس کے چوبیس گھنٹوں کا سا تھا۔ وہ
دن کے چوبیس گھنٹے پہلے ان کھڑکیوں کے سامنے
پہلے چہرے پر سکندر کو دیکھنے ہوئے کڑا دیا کرتی
تھی۔ اس خوفناک ایک سیٹلٹ میں اس کی جان بچ گیا
تھی۔ اس نے اپنی بہن۔ مگر اس کی قسمت میں بچ گیا
لور سکندر اور لہو کے پہلے دیر کھانا لکھا تھا۔ اس
کے کسی چہرے کو اس نے باخبر نہیں لکھا تھا۔ وہ اس کے

خفے میں سے گھر میں بھی نہیں تھی۔ مطلق کے
بعد اب اس چاس کی کسی بھی چیز کا جان تھا۔ اس کے
پہلے سے موت کو سننے کی گھر کے باہر سے اس کے
بعد اس کے ساتھ ان کے گھر چلے جائے گھر باب کی
فصلوں سے گھر کر، سکندر لور لہو کے گھر ایک بوجہ بن کر
وہ اس کے گھر کے جاننے تھی؟

اس مرم ساری، مگر سارا گھر زخمی تھی۔ اسے
دھل ہیر سے اسنے بننے بننے ہاتھ دم جانے ہر جے
کے لیے دم دم زخمی ہوئی تھی۔ سو اس کام کے لیے اس
نے ایک کئی کئی سبک دیا تھا۔

محمود غلام دزدان میں اس کے پاس آتے تھے۔ وہ
چہرے اس کے پاس گزرتے تھے۔ اس دور میں وہ
دونوں ہی خاموشی رچے بسنے ہوئے ہست چلنے
ہست تیز غیز زون کی لڑ میں شامل اس مرم بر لہو
بھول گئی تھی۔ اس کے اس لفظ کم ہر جے سے۔ اس
کے لور اس کے باب کے درمیان ہند غرض جلیوں کا
جلول ہو تا تھا۔ جیسے آج اسے فن سے پتا چلا تھا کہ لہو
اور سکندر وہی سون کے لیے آئی تھیں۔

"لہو! ہست خوش ہو گی؟" اس نے سکندر کی طرف
دیکھنے اور کھنکھنے سے لہو میں اب سے
ہو چکا۔

"اب اس کی نظروں میں اپنے لیے دیکھ لور
ایسی نہیں دیکھ پائی تھی؟" اس نے ان سے نظریں
نہیں ملا کر تھی۔

"میں ہی سارا دن اس کے رہ کر پتا نہیں کیا تھا سو جی
رہی اور میں ا میرے ساتھ گھر چلا۔" کئی چہرے اسے
پہلے اس نے اسے سمجھا تھا اور روزانہ کی طرح اس
نے پھر اکر کہا تھا۔

"ایسا اچھے اس ذہنی میں رہتے ہیں۔ میں دیکھا
اور لوگوں نے دیکھا نہیں کر پتا تھا۔"

روزانہ کی طرح اسے سمجھانے میں کام کر سکندر
خدا اب اسے گھر لوٹ گئے تھے۔

اب اسے لکھا ہوتا ہے۔ اب کلاں دیکھانے میں
اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑا تھی۔ مگر جہاں وہ تھا۔

دوڑاں کے پاس آنا تھا، اسے ساتھ لے جاتے کی کوشش کرتا تھا اس کے لیے سب سے زیادہ خطرہ رہا کہ رانا اور دو اسے معذور واپس کر کے مروں دیا کرتا تھا۔ اس کا باپ بھی تھا۔ وہ ان کی نظروں سے گزر جاتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ مگر باپ کی نظروں سے گزر کر اس کے لیے جتنا سخت دشوار ہو گیا تھا۔

ساوی، زندگی بھی رک کر کچھ سوچا نہیں تھا کہ زندگی کے بگاڑے فرصت نہیں لینے دینے تھے۔ کچھ سوچنے کے لیے فرصت ہی فرصت تھیں۔ سچا دوست زندگی میں کوئی ملتا نہیں تھا جو ایک کلمے چہرے اور معنوی سمجھیں اس نے اپنے گرد جمع کر رکھی تھیں۔ وہ اس کے دماغ چہرے لے کر اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ یا ایڈمز، روک شلٹس، کانفرسنس، سیمینار، پریزینٹیشن، انڈرٹیکنگ، کیمپین۔ اس کے کسی بھی دوست کو ایسے کسی بھی سہارے پر اس کی پلو نہیں آتی تھی۔ یہ سب کچھ ایک دم ہی اس کی زندگی سے باہر نکل گیا تھا۔

حاصل زندگی یہ تھا کہ اس کے پاس صرف ایک رشتہ۔

اس کا باپ۔

برجیور تھا، اب بھی اس سے محبت کرتے رہے۔

زندگی اسی طور گزر رہی تھی کہ صبح سے شام کو شام سے رات یہی خاموشی سے سمندر کو دیکھتے تمام دو جا رہا کرتی تھی۔ ہر دو، سمندر کو بھی سوچتی تھی اور لبراز کرتی تھی۔ سمندر کا خیال اسے پہلوں بے چین رکھتا تھا وہ شخص جیسے اس نے چاہا خلا، فضا جس نے اسے ٹھکرا رہا تھا اور جس سے اپنے ٹھکرانے جانے کا بدلہ اس نے اس کے گھروالوں کی نظروں سے گرا کر لوہ اس کے گھر سے نکلا کر لیا تھا۔ جو اس نے بار بار ملے فیل سمندر کے ساتھ کہا تھا، آج وہی سب کچھ اس کے ساتھ دو گیا تھا۔

سمندر اس سے باتیں کرتا تھا، سمندر اسے بعض رفتہ بہت سچی اور گہری باتیں کہہ جاتا تھا، سمندر اسے

کہتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ خدا کا انصاف ہے۔ اپنے باپ کی نظروں سے گزرنی تھی۔ اس کی بہن اسے محروم کر کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے اسے انہوں کے ساتھ اپنے گھر سے لور اپنی زندگی سے نکل دیا تھا۔

سمندر کہتا تھا اسے سکھ دی کہ آج بھی تھی۔ سمندر نے فیصلے کے کسی لمحے میں بڑے بے جا اسے اسے بدروناوی ہو گئی تھی۔ دو اس کے معذور میں اللہ نے موت نہیں لے معذور کی وہاں زندگی لکھ دی۔ کسی کو اپنے تھے خاطر میں نہ لائے، وہاں اب مریم کے اندر وہ اس کے دماغ چاہنے والے، اس پر بنا رہے ہونے والے رخصت ہو گئے تھے۔ خدا کو اپنی تھی۔ صبح سے رات تک اس کے پاس سوچیں ہی سوچیں ہوئی تھیں۔ کسی کسی پل پر پچھتاوے بھی ہوتے تھے۔ کاش! وقت ایک بار پھر پچھنے کی طرف چلا جائے، کاش! اب کی بار وہ سب کچھ کرے کی پھر اس سے چاہتے ہیں۔ وہ بھی کا گھر خراب نہیں کر دے گی۔ وہ بھی کے شوہر کو اپنی طرف انکل نہیں کر دے گی۔ وہاں کے پاس لائی ہوئی چلی جانے کی۔ اپنے اندر سب خدایاں پیدا کر کے کی پھر اس میں ہیں۔

دلیرا سے لے کر اس کی بیعت لے لے اس کا حسن۔ لے لے سیدھے اس پناہ است عام اور معمولی ہونا اسے دیکھتے۔ اپنا بے خوف ہونا اسے بدلتے۔ کوئی اسے بد زلف نہ لے اسے استعفیٰ کرے تو اسے چاہی نہ چلے مانتا اب اس کی لور سا ہونا اسے دیکھتے۔

اسے اس کے حسن اور ذہانت کے عوض محروم ہو گیا اور سمندر شہر اور دے دے۔ جب وہ لبراز بھی ہو گئی تو شمس کے میں گت محروم ہو گیا اور سمندر شہر اور؟ طہوں کی ہیں اسے کن دنوں کی محبتیں اور ان دنوں کا ساتھ؟

کاش! یہ مریم نہ ہوتی۔ کاش! یہ لبراز ہوتی۔ اسے حسن نہیں چاہیے۔ اسے نجات نہیں چاہیے۔ اسے لبراز چاہیے۔ دلیرا کیوں نہیں؟ اب لبراز نہیں

کہیں نہیں؟

پہلی میں ان کا آخری دن تھا۔ لیکن آئیہ اولوں میں
وادیوں میں لکڑیوں کے ٹکڑے لٹائے گئے تھے
جیسے غائب ہونے کو مان کر رہے ہوں۔ انہوں نے پہلے
ساتھ ہی لکڑی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ تب آدم میں دو
بچے جن کے بعد وہ باہر تھیں اب اسے رکھ دیا
تھی۔

دو لڑکے قلب پر ہی ٹھہرے ہوئے تھے جہاں پہلی
انہیں مزے مزے کے کھانے پکانا کر رکھا گیا کرتی
تھی۔ وہ بڑے ان دنوں کی اپنے گھر پر طوط کی
جی۔ ان دنوں کی شادی پر مست خوش تھا۔

"مجھے تب ہی لگا تھا" اسی جگہ ہے تم دونوں کے بیچ
پر لڑا جس طرح شہر کے ایک کھیل پر پریشان
ہوئی تھی، تھیں اپنے گھر کے مٹی مٹی میں تب ہی
سمجھ گیا تھا، "خدا کا کڑوا" "خدا نے ہونے والے دنوں
سے بولنا شروع کیا، "خدا کا کڑوا" "خدا کا کڑوا"

تو آدم میں اس آری دن دن دنوں زبانی
زبانی آئے ہوئے تھے لڑا بڑے اہتمام سے
پیش کش کا سامان ساتھ لائی تھی۔ وہ فوج بھری کو ہیں
مقرر کر رکھے ہوئے اس کی پیشکش کا نام ہی تھی۔

"پچھلی؟" اس نے مسکرا کر لڑا سے پوچھا۔
"ہاں پچھلی منہور مسکرو۔" وہ شرارتی انداز میں
کہی۔

"ہاں میں بھول گیا تھا، "خدا نے اپنی لڑکھ میں مست
کہ ایک جیسا لگا ہے۔" وہ دونوں ٹاؤن میں کے
زوبک گھڑتے تھے۔ پیش کش کی طرح وہیں سیاحوں کی بڑی
تعداد موجود تھی۔

"تو اسکا اچھا وہی؟" سکندر نے اس سے پوچھا۔
لڑا ایک طرف اپنا اور نیل اہلی مہوت کر رہی تھی۔
"خدا کا کڑوا" "خدا کا کڑوا"

"خدا کا کڑوا" اس نے مسکرا کر ایک مسک
کہی۔

نکالا۔ کسی ٹورسٹ کی طرح کیمرا اس کے گھٹے میں رکھا
اور اٹھا۔ اس نے وہ لڑکا کو پکڑا ہوا ایک سیخ انداز سے
سک پکڑ کر کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر تھیں کی طرف تھی
ہاتھ کھدے سے اڑنا خالور اس میں اس نے
مقبوطی سے سک پکڑ کر کھڑا تھا۔ اس نے سک پائی میں
اپنا لڑکا لڑا اس کی کئی نصیحتیں تھیں۔ نصیحتیں
لینے کے بعد وہ اس کے پاس آئی۔
"اس نے کہا تھا اس کی؟"

"نیل لڑکا؟"

"ہاں لڑکا۔"

"تمہیں شگ ہے اور مجھے کچھ بھی نہ چھوڑنا۔
کی ہے میں نے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر لڑکا۔
اس کی آنکھوں میں چاندنی کے ہزار رنگ تھے۔
تھے لڑکا کھلا کر رہی۔

"جانتی ہو لڑکا تمہارا دادا مجھے کہوں یا رہا ہے؟"
اس نے لڑکا کھاتے تھا۔
"کیوں؟"

"اس لیے کہ لڑکا کو اپنا دادا بہت چاہا ہے۔ میں
تمہارے ساتھ یہاں رہا رہا آتا تھا وہ لڑکا۔"
لڑکا اس کی آنکھوں میں اپنے لیے کچھ نہیں ہی
محبوبی رہی تھی۔

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بیوں کے لیے
آرٹھریٹک فرم کے 3 رنگر بدل

کتاب کا نام	قیمت
دوستی و برائی	600/-
نادر کھڑائی	500/-
خودی اور ساتھ چلو	400/-

یہ کتابیں کے لئے کتاب خانہ کھڑائی 452 ہے

تعداد

کھڑائی اور ساتھ چلو: 31، نادر کھڑائی: 22، دوستی و برائی: 22

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1